ہمارے چند لکھنے والے

غلام ربانی تاباں

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

سید حرمت الاکرام

اقبال مہدی

عائشہ یوسف ناظم

علیق انجم اشرفی

عائشہ (بمبئی)، عمر ۵ سال

لطیف احمد (بمبئی)، عمر ۳ سال

ممتی (بمبئی)، عمر ۲ سال

شاہین دلشاد (دہلی)، عمر ۳ سال

انجم جمال (اٹاوہ)، عمر ۴ سال

صبیحہ (رائچور)، عمر ۱ سال

گلفشاں (دہلی)، عمر ۶ ماہ

خورشید عالم عثمانی (سہارنپور)، عمر ۱۴ سال

مینا (کلکتہ)، عمر ۶ ماہ

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ نے بھی اداروں کیلئے منظور شدہ

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
ایٹم کیا ہے	پ۔ گنا سیکر	۰/۶۵	سورج کا گھرانا	اے۔ وی۔ ایس۔ راما راؤ	۰/۷۵
اکبر اور بیربل کے لطیفے	مرتبہ اطہر پرویز	۰/۴۰	سائنس کی دنیا	وزارت حسین	۲/۵۰
انوکھی مشین	دیوداس داس گپتا	۱/۲۵	سائنس کے کرشمے	"	۲/۰۰
باپو کے قدموں میں	منوبہن گاندھی	۱/۰۰	ستاروں کی دنیا بہت دور تک	اطہر پرویز	۲/۰۰
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	[illegible]	"	۰/۵۶
بچوں کے اقبال	مرتبہ اطہر پرویز	۰/۵۰	[illegible]	نرلیشور شرما	۰/۷۵
بچوں کے حالی	"	۰/۷۵	کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/۲۵
بچوں کی معلومات	قدسیہ بیگم	۰/۷۵	شہد	وسنت نیل کنٹھ گدرے	۰/۷۵
بچوں کی سائنس	اطہر پرویز	۱/۰۰	مصنوعی چاند	اطہر پرویز	۱/۵۰
پنچ تنتر کی کہانیاں اوّل	شکنتلا دیوی	۰/۷۵	[illegible]	فصاحت حسن خاں	۱/۰۰
پنچ تنتر کی کہانیاں دوم	"	۰/۷۵	[illegible]	راجندر اوستھی ترشت	۱/۰۰
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	۰/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	۰/۷۵
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین	۲/۰۰
چار درویش	بدرناتھ [illegible]	۰/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیرج موہن سیناپتی	۱/۰۰
خلا کا سفر	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہمارا ذہن	[illegible]	۱/۰۰
روشنی کے مینار	بے بھکو	۰/۷۵	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسن	۱/۰۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

فہرست

بچوں سے باتیں

خدا کا شکر ہے کہ ہماری دن رات کی محنت
آپکی نظر میں مقبول ہوئی۔ سالنامے کو آپ نے پسند
کیا۔ آپ کے بڑوں نے پسند کیا۔ اسے سچ مچ نیے
سال کا عید کا تحفہ سمجھا۔ بہت اچھا تحفہ!

اس تحفے کے بارے میں آپ کے بہت سے
خط آئے ہیں۔ ان بزرگوں کے خط آئے ہیں جنھیں
بچوں کے ادب سے دلچسپی ہے، جو آپ کی تعلیم و تربیت
کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس طرح کے کچھ خط ہم اس
رسالے میں چھاپ رہے ہیں۔ گنجائش کم تھی، بہت سے
خط نہ چھپ سکے۔ ممکن ہوا تو اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

سالنامے کو شایع ہوئے کافی مدت گذر چکی
ہے۔ سبھی پیامیوں نے اسے شروع سے آخر تک
پڑھ لیا ہوگا۔ جو پیامی ہمیں ابھی تک اپنے خط نہیں
بھیج سکے وہ بھی ضرور بھیجیں۔ اس کے بارے میں
ٹھیک ٹھیک رائے لکھیں۔ ہمیں اچھے اچھے مشورے
دیں۔ ہم ان کے بہت احسان مند ہوں گے۔

اس مرتبہ سالنامے کی کاپیوں اور پروفوں
کی اصلاح میں غیر معمولی احتیاط برتی گئی۔ کئی کئی
بار کاپیاں دیکھی گئیں، کئی کئی بار پروف پڑھے گئے
تھوڑی بہت غلطیاں پھر بھی رہ گئیں۔ کچھ پیامیوں نے
اور چند بزرگوں نے ان کی طرف اشارے کیے ہیں۔
ہمیں اس کا افسوس ہے۔ آیندہ اور بھی احتیاط کی جائیگی۔

اس سلسلے میں ایک غلطی بہت دلچسپ
ہوئی۔ ٹائٹل کے تیسرے صفحے پر (صفحہ ۱۸۴ کے
مقابل) دو تصویریں چھپی ہیں۔ ان کے کیپشن یا نیچے
لکھی ہوئی عبارتوں میں غالباً غلط فہمی کی وجہ سے
بڑی چوک ہوگئی۔ اوپر والی تصویر کی عبارت میں
"گاندھی ٹرافی" کی جگہ "نہرو ٹرافی" ہونا چاہیے اور نیچے

والی تصویر کی عبارت میں نہر ڈٹرانی کی جگہ گاندھی ٹرائی ہوگا۔ پیامی تصحیح کرلیں۔

اس پرچے میں کوئی پانچ نظمیں اور سات مضمون وہ ہیں جو سالنامے میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ حکیم یوسف صاحب کی نظم کاتب صاحب کے کاغذات میں کھو گئی تھی اور بہت تلاش کے بعد سالنامہ شایع ہونے کے بعد ملی۔ اس سلسلے کے بہت سے مضمون ابھی باقی ہیں انھی میں ایک دلچسپ ڈراما بھی ہے 'بھاپ کی قیمت' یہ ۱۱ صفحے کا ہے۔ اتنی ضخامت کی وجہ سے اس پرچہ میں جگہ نہ نکل سکی، انشاء اللہ اگلے پرچے میں چھپے گا۔ ابنِ محمود کا ڈراما یقین ہے کہ آپ کو خاص طور پر پسند آئے گا۔

ہم نے سالنامے میں ایک خاص نظم کا ذکر کیا تھا۔ ظ۔ انصاری صاحب نے یہ نظم سالنامے کے لیے بھیجی تھی۔ بہت دیر میں ملی تھی اس لیے ہم سالنامے میں شایع نہ کر سکے۔ نظم بہت دلچسپ ہے۔ مشہور روسی شاعر پوشکن نے نظم میں ایک سبق آموز کہانی لکھی ہے مچھوا اور مچھلی۔ ظ۔ انصاری صاحب نے براہِ راست روسی زبان سے ترجمہ کیا ہے۔ آپ اسے غور سے پڑھیے کیسی رواں دواں ہے ترجمہ پن ذرا نہیں ٹپکتا۔ اگر آپ کو اصل بات نہ بتائی جاتی تو آپ اسے ظ۔ انصاری صاحب کا کارنامہ سمجھتے۔

جو سچ پوچھیے تو ظ۔ انصاری صاحب نے بہت بڑا کام کیا ہے۔ کسی نظم کا نظم ہی میں ترجمہ کرنا ہنسی کھیل نہیں ہے اور پھر ایسی صاف، سادہ دلچسپ اور گھریلو زبان میں۔ ہم اس کامیابی پر جناب ظ۔ انصاری کو مبارکباد دیتے ہیں۔

ظ۔ انصاری صاحب نے اپنے وعدے کے مطابق حاجی بابا کی ڈائری کی دوسری قسط بھی بھیج دی ہے۔ ہمارے دیس میں تھوڑے دنوں میں (فروری کے آخر میں) عام چناؤ یا الکشن ہو رہے ہیں۔ ظ صاحب نے بے چارے حاجی بابا کو الکشن کے میدان میں لا کھڑا کیا ہے اور اس سلسلے میں ان پر جو بیتی ہے اسے بس پڑھنے ہی میں مزا آئے گا۔

پیامِ تعلیم میں ایک ہی مضمون نگار کے دو مضمون ایک ساتھ شایع نہیں کیے جاتے

مگر آپ کی دلچسپی کی خاطر ایسا کیا جا رہا ہے۔ نظر صاحب
کی دو چیزیں شایع کی جا رہی ہیں۔

کچھ دنوں سے ہمارے ایک خاص مضمون
"چاند پر اترنا" کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ آپ کی
نگاہیں اسے ضرور ڈھونڈتی ہوں گی۔ بات یہ
ہوئی کہ ہمارے عزیز ساتھی اور دوست اتھوپیا
یا حبشہ تشریف لے گئے ہیں۔ یہ روانگی اتنی جلدی
میں ہوئی کہ مضمون لکھنے کا موقع نہ مل سکا اور آپ
جانتے ہیں کہ کسی نئی جگہ پہنچنے کے بعد آدمی کو اطمینان
اور سکون کہیں ہوتے ہوتے نصیب ہوتا ہے
پر اب ان کے رہنے سہنے کا معقول انتظام ہو گیا
ہے۔ ابھی ابھی ان کا ایک مفصل خط ہمیں ملا ہے
خط میں انھوں نے اس مضمون کا خاص طور سے
ذکر کیا ہے۔ ہمیں لکھا ہے کہ سفر یا حضر کسی وقت
بھی وہ اپنے پیامیوں کو نہیں بھولے ہیں اور پیامیوں
کے لیے اس سلسلے کے مضامین بہت جلد مرحمت
فرمائیں گے۔ پیامیوں کی دلچسپی کے لیے اتھوپیا کے
سفر کے حالات، وہاں کے رہن سہن، تہذیب و تمدن
اور جغرافیے وغیرہ پر بھی مضامین کا سلسلہ شروع کریں
گے۔ یہ خط بہت دل چسپ ہے۔ اس کے
کچھ حصے ہم مارچ کے پیام تعلیم میں شایع کریں گے۔

سالنامہ چھپتے ہی دفتر میں سالانہ خریداری
کے لیے آنے والے خطوں کی تعداد بہت بڑھ گئی
ہے۔ پیام تعلیم کے منیجر صاحب نے ازراہِ نوازش
ہمیں یہ اعلان کرنے کی اجازت دی ہے کہ جو پیامی
۲۸ فروری تک پیام تعلیم کے خریدار بنیں گے ان
سے سالنامے کی قیمت الگ سے نہ لی جائے گی۔
ان کی خریداری کی مدت جنوری سے شروع ہوگی۔

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جموں کشمیر،
مدھیہ پردیش اور میسور کی ریاستوں کی طرح ہریانہ کی
(نئی) ریاست نے بھی پیام تعلیم کی سرکاری طور پر سرپرستی
منظور فرمائی ہے۔

اور ہاں ابھی ایک بات تو سنیے۔ سرورق پر
کچھ پیامیوں کی تصویریں آپ کو نظر آئیں گی۔ یہ تصویریں
پیام تعلیم کے پچھلے پرچوں میں چھپ چکی ہیں۔ آپ ذرا
ان کے نام تو لکھ کر بھیج دیجیے۔ ۲۰ فروری تک ہمیں
مل جانے چاہییں۔ آپ میں سے جس پیامی کا جواب مکمل
صحیح ہوگا اسے ایک روپے کی کتابیں انعام میں دی جائیں گی

جناب نثار احمد اعظمی

ننھا منّا چاند

اک بچے نے چاند جو دیکھا — دیکھ کے اس کو اچھلا کودا

کہنے لگا امی سے جا کر — لاؤں گا میں چاند کو گھر پر

امی نے سمجھایا اس کو — تو کیسے پائے گا اس کو

وہ تو یہاں سے دور بہت ہے — یوں بھی وہ پُر نور بہت ہے

تو تو خود ہے میرا چاند — ننھا منّا پیارا چاند

پڑھ لکھ کر اے میرے لال — حاصل کر لے یہ بھی کمال

اپنی زمیں پر تو بھی چمکے — جیسے فلک پر چندا چمکے

علم کا سورج بن کر ابھرے — جہل کے جس سے بھاگیں اندھیرے

حاجی بمبا کی ڈائری

جناب ظ۔ انصاری

لڑکپن میں کہیں رامو کے کھیت میں ایک
باولے کتے نے کاٹ کھایا تھا۔ دوا دارو کچھ ہوئی نہیں
ـــــ تو اب ستر برس بعد اس نے اثر دکھایا۔ ہم نے
الکشن لڑ لیا۔

گئے تھے یہاں سے نقد دم آئے تو چیل گاڑی
ساتھ اور سکریٹری گلگلا بی اس میں سوار۔ دور دور تک
خبر ہو گئی۔ تقدیر دیکھو کہ ہمارے خاص وطن پھپھوند پور
والوں کے کان میں، جہاں مکھیاں بھنکتی تھیں، ہمارے
اس کارنامے کی بھنک پڑی۔

ایک دن صبح سویرے کوئی مرد قدر دان،
خوش بیان، تیز زبان، اپنی شیروانی سے پاندان اور
لیے خاصدان، ہمارے آشرم میں وارد ہوئے۔
معلوم ہوا کہ ایک ہم وطن ہیں اور بڑے چاؤ سے بلانے
آئے ہیں۔ اگر ہم نہ گئے تو پھپھوند شریف میں دو چار
آدمی بھوک ہڑتال کر دیں گے اور گئوویں گھاس چارہ
چھوڑ دیں گی۔

آخر کو ہم نے ایک ڈبہ اصلی دیسی گھی اور
دو ڈبے پٹرول ٹنکی میں بھرا، تین گھنٹے کی اڑان والا
منتر پڑھ کر پھونکا، اپنے پہنچنے کا تار بھجوایا اور ہم چاروں
چیل گاڑی میں سوار ہو گئے۔

پوچھو چوتھا کون؟ تو چوتھا ہمارا طوطا۔
یہ وہی مشہور ایرانی پرندہ ہے جو ہر بات پر کہتا ہے:

دریں چہ شک! دریں چہ شک!

(ہجے، معنی اور مطلب استاد سے پوچھو)

پھپھوند پور کے باہر ارہر کے کھیت میں
ہم نے چیل گاڑی اتاری تو آس پاس کے ہزاروں
کسان کاندھے پر لاٹھیوں میں جوتے لٹکائے،

ہاتھوں میں ہار پھول لیے سواگت کو موجود تھے۔
حاجی بَبا ——— زندہ باد!
حاجی بَبا ——— بجلی کا کھبا ——— جیت
کے رہیں گے! اس زور زور سے نعرے لگائے کہ بچاری
گُلگُلا، بدیسی لڑکی بوکھلا گئی۔ وہ سمجھی بلوہ ہو گیا ہے۔
ہم نے سمجھایا:

اے نادان لڑکی۔ یہ ہمارا ہندوستان جنت نشان
ہے۔ اس میں خالی پیٹ والا آدمی بڑا جوشیلا ہوتا ہے۔
جس سے بھی ذرا فایدے کی امید یا نقصان کا
اندیشہ ہو اسے کھمبے پر چڑھا دیتے ہیں، اس کی
پوجا کرتے ہیں۔ آخر ہم پیپل دیوتا اور ناگ دیوتا
سے گئے گزرے تو نہیں ہیں۔ ہم سے انھیں
کچھ فایدے کی امید ہو گی۔ تبھی تو کھمبے پر چڑھاتے
ہیں، ہار پھول لے کر آتے ہیں۔ اب یہ میرا فرض
ہے کہ کوئی فایدہ نہ ہونے دیں اور دعوتیں کھا کر،
بھاشن ٹرشنا کر، فوٹو کھنچوا کر چلتے بنیں۔

گُلگُلا بولی:

واقعی، اے حاجی بَبا، یہ کہانیوں کا دیس ہے
ورنہ پچھلے سال جب میں لندن میں تھی تو دسمبر کی عین
پچیس تاریخ کو مسٹر خداوند عالم دی گریٹ ایک دفعہ نیلی
چھت سے اُتر آئے۔ اخباروں میں اعلان چھپ گیا۔
ریڈیو اور ٹیلی وژن والوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر لوگوں
کو عالی شان استقبال کے لیے اُکسایا پر دو چار نامہ نگاروں
کے سوا کوئی نہ آیا۔

دوکاندار، کلرک، مزدور، طالب علم سب کے
سب کرسمس منا رہے تھے ——— یعنی خداوند کے
فرزند کی یاد میں ناچ گا رہے تھے۔ فرصت کس کو؟
ووکنگ کی مسجد کے مُلّا سے جا کر کسی نے کہا:

اے بھائی مسلمانو، ایک تم ہو کہ روکھا پھیکا
تہوار مناتے ہو۔ نہ پیتے ہو، نہ ناچتے گاتے ہو۔ تم ہی
کچھ پیغمبر مسیح کے والد بزرگوار کے سامنے ہماری لاج رکھو
——— جاؤ استقبال کو دوڑے چلے جاؤ۔

مُلّا جی کے منھ میں پہلو کی یہ موٹی مسواک تھی، وہ
نہ بولے۔ مسجد کا مؤذن شیخ گھسیٹا روزے کی جھلاہٹ
میں حجرے سے نکل پڑا اور ڈانٹ کر خالص پنجابی میں
"قُلْ ھُوَ اللّٰہ" پڑھ گیا۔ مطلب یہ کہ بھئی ——— وہ تو
ایک ہے اسے کسی کی پرواہ ہی نہیں۔ نہ وہ کسی کا باپ
نہ بیٹا، نہ اس جیسا یا اس کے برابر کا کوئی۔
ہم نے گُلگُلا کو بتایا:

ہاں ——— مسلمان لوگ اپنے خدا کو دیکھنے دکھانے
کی چیز بھی نہیں مانتے اس لیے کسی کو یقین نہ آیا ہو گا کہ
نیلی چھت سے اُترنے والا خدا بھی ہو سکتا ہے۔ یہ بچا

وجہ ہے کہ ان کے تہواروں میں غل غپاڑہ بہت نہیں ہوتا۔ صرف جوتے اگر بغل میں نہ دابو تو چوری چلے جاتے ہیں۔ عقل اگر یونہی چھوڑ دو تب بھی اس کا نقصان نہیں کوئی نہیں چراتا۔

"اچھا تو پھر کیا ہوا؟" ہم نے چیل گاڑی کے انجن کی چابی کمر بند میں باندھتے ہوئے پوچھا۔

"پھر کیا ہوتا ــــ خداوندِ عالم دی گریٹ ناراض ہو کر واپس چلے گئے۔ اب کوئی بلائے بھی تو نہیں آنے والے۔"

"انگریزوں کو غصہ نہیں آیا؟" ہم نے چیل گاڑی سے اترتے ہوئے سوال کیا۔

گُلگُلہ بولی، غصہ بہت آیا۔ کن زر دے ٹیو پارٹی نے لیبر پارٹی پر الزام لگا دیا کہ اس نے خداوند کو ناراض کر کے انگریزوں کی قوم کو سلطنت کی برکت سے محروم کر دیا ہے اب ہانگ کانگ بھی ہمارے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ لیبر پارٹی نے جواب دیا "خداوندِ عالم دی گریٹ کا سایہ اب بھی انگریز قوم کے سروں پر رہے گا کیوں کہ ہم خداوند خدا ــــ دی گریٹ کے فرزند کی یاد میں ایسے لگے ہوئے تھے کہ ہمیں موصوف کے آنے جانے کی خبر ہی نہ ہوئی ــــ کئی دن ریڈیو نے ہندوستانی دھن بجائی:

آئے بھی وہ گئے بھی وہ ختم فسانہ ہو گیا

"بس؟" ہم نے ایک پاؤں زمین پر رکھتے ہوئے پوچھا

گُلگُلہ دھم سے زمین پر کود کر بولی:

"بس کیسے! ابھی سوال پر تو الکشن لڑا گیا پھر........"

"الکشن ہوگا ــــ الکشن ہوگا ــــ جیت کے رہیں گے"۔ پانچ ہزار گلوں سے آواز نکلی اور گُلگُلہ کی آواز ڈوب گئی اور ہم پر چار طرف سے پھول برسنے لگے۔ اب پتہ چلا کہ ہم جو بمبئی سے پھپھوندپور بلائے گئے ہیں تو ہم سے

"........ زمانہ چال قیامت کی چل گیا"

ہم نے بہتیرا سمجھایا کہ

اے عزیزو، ہم الکشن لڑنے سے گھبراتے ہیں کیوں کہ بُمبا ہوئے تو کیا، ہیں تو آخر حاجی آدمی۔ دین دار آدمی۔ جو باتیں ویسے بُری ہیں وہی الکشن میں اچھی ہو جاتی ہیں۔ بھلے آدمی کا کام ہے کہ اپنی بُرائی اور دوسرے کی بھلائی نظر میں رکھے۔ الکشن میں اس کا الٹ ہوتا ہے مخالف امیدوار میں جتنے کیڑے نکالو اتنی ہی اپنی جیت کی امید بڑھتی ہے۔ اپنی خوبیاں گنوانا چھچھورپن ہے ــــ اور الکشن میں جھوٹی سچی ہزار خوبیاں اپنے اندر گنوانی پڑتی ہیں ــــ نا بھائی ہم سے یہ نہیں ہونے کا۔

وہ مردِ قدر داں، خوش بیان تیز زبان بولا:
"اے حاجی ببا! الکشن میں اگر آپ جیت گئے تو پبلک کی جی بھر کے سیوا کریں گے گھر گھر ٹیوب ویل لگوادیں گے، پھپھوند پور میں ریل کا اسٹیشن بنوادیں گے —— جہاں بمبئی کلکتہ مدراس میل رکنے لگے گا —— یہاں کی روئی بمبئی کو، پٹ سن کلکتے کو اور ریشم میسور کو جایا کرے گا۔ گاؤں والے مالا مال ہوجائیں گے۔ بڑی نہر کاٹ کر ایک رج بہا (برانچ کینال) پھپھوند پور تک نکلوادیں گے۔ جس میں کھیتی کے لیے پانی اور بچوں کے لیے دودھ وقت وقت سے آیا کرے گا۔ گاؤں گاؤں بجلی بٹے گی بمبئی سے لاکر یہاں آم کے اچار اور مربے کا ایک کارخانہ لگوادیں گے، جس کے مربے ماسکو سے نیویارک تک بھر بھر کر جائیں گے اور دنیا بھر کی دولت بٹور کر لائیں گے بوڑھی مریل گائیں آم کا مشینی چارہ کھاکر زیادہ دودھ دیا کریں گی۔ اسکول کے لڑکے چلتی ریل پر کنکر پتھر مار کر خوش ہوں گے۔

"بولو بھائی —— حاجی ببا کی —— جے"

"ہمارا امیدوار ! حاجی ببا"
"جیت کے رہیں گے ، بجلی کا کھمبا"
"—— مخالفوں کا ، بناؤ دُنبہ"

ہمارے ماتھے پر بل آگیا۔ "ببا کا قافیہ دُنبہ ہرگز نہیں ہوسکتا" ہم نے اس مردِ قدر داں سے کہا جس نے دوسروں کو نعروں میں لگاکر خود پان کی گلوری منھ میں رکھ لی تھی "اے برادر! بجان برابر، قافیہ درست کرو۔ ببا کا قافیہ "دُنبہ" نہیں ہوسکتا، کھمبا ہو تو کوئی مضائقہ نہیں۔"

"قافیہ تو میں درست کرلوں گا —— پر وعدہ کیجیے کہ اگر جتوا دیا تو آم کے اچار والے کارخانے کا لائسنس مجھے دلوائیں گے" چپکے سے وہ کان میں بولا۔

"اچھا بھائی دلوادیں گے" ہم نے جان چھڑانے کو کہا پھر حلق میں اٹکی ہوئی ایک تقریر نکالنے کے لیے ہم مچان پر چڑھ گئے یہ مچان پہلے سے ایک آم کے جھنڈ میں باندھ دیا گیا تھا۔ جس رئیس نے یہ بندھوایا تھا وہ بھی ہمارے برابر اس شان سے بیٹھے رہے جیسے اصلی امیدوار وہی ہیں۔ ہمیں کالے چشمے پر جو غصہ ہے وہ اور زیادہ ہوگیا کیوں کہ معلوم نہیں قصبے کے یہ رئیس صاحب مجمع کو گھور رہے تھے یا ہماری سکرٹری کو کیونکہ ذرا دیر بعد وہ مچان چھوڑ کر آم کے درخت پر جا بیٹھی۔ ہم نے تقریر گلے سے نکالی:

"اے دیویو اور سجنو! تمھاری بھاونا اور پریم کا ہردے سے دھنیواد' پرنتو ——

طبل و علم ہے پاس ہمارے نہ ملک و مال
لکشن ہمیں لڑا کے کرے گا زمانہ کیا!

سارا ہجوم شعر سنتے ہی اچھل پڑا۔ جب سے اردو کے

اسکول چٹ ہونے لگے ہیں اردو شاعری بہت پاپولر ہو چلی ہے۔ جس علاقے میں اردو لکھنے پڑھنے والے جتنے کم ہوں گے اتنا ہی وہاں اردو شاعر اور شاعری کا بول بالا ہوگا۔ ہم نے شعر غلط پڑھا اور الکشن کو ٹکشن کر دیا' پھر بھی سب کو مزہ آگیا۔

ہم نے کہا — "دیکھو بھائیو' اور (ایک کو چھوڑ کے) باقی میری بہنو! الکشن بڑے مزے کی چیز ہے' ضرور کرو۔ پر ہمیں الکشن نہ لڑاؤ' ہم نے لڑکپن میں بھی مرغوں کی پالی نہیں لڑی۔ ہم تو یہاں رہنے کے ارادے سے آئے بھی نہیں۔ بہت ہوا تو الکشن تک ٹھہریں گے' پھر اپنے رستے چل کھڑے ہوں گے۔"

مجمع میں سے آوازیں آئیں: آپ اس کی چنتا مت کیجیے! بہت سارے امیدوار الکشن کے بعد اپنے رستے ہو لیتے ہیں۔ اصلی امیدوار وہی ہے جو الکشن سے پہلے اور اس کے بعد اپنے حلقے میں نظر نہ آئے' صرف لوگوں کی زبانی سُنا جائے اور اخباروں میں پڑھا جائے۔

پھر ہم نے سمجھایا: بھائی میرے' اگر الکشن لڑنے کا مطلب یہ ہو کہ جیتنے کے بعد پبلک کی کچھ خدمت کی جائے تو ہم الکشن میں جیتے بغیر بھی جیتے جی یہی کرنے والے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اور کیا سیوا ہو گی کہ ہم کیا لکھا کر سڑک پر چھلکا نہیں پھینکتے' آنگن اور گلی میں تھوکتے نہیں۔ اپنے آشرم میں اس زور زور سے خواہ مخواہ کا مشاعرہ' قوالی یا کیرتن نہیں کراتے کہ بیمار کو سنے دیں اور تندرست گالیاں۔ نیند ساری بستی کی حرام۔

"مشاعرہ یا قوالی" کا نام لینا تھا کہ مچان کے پاس منڈلانے والوں نے نعرۂ مستانہ لگا دیا۔

"یہ آپ شاعروں کا مذاق اڑا رہے ہیں بند کیجیے!"

"اجی حاجی بابا — قوالی تو عبادت کی رات ہوتی ہے — یہ آپ کیا کفر بک رہے ہیں؟"

مردِ قدر دان خوش بیان نے کان میں کھسر پسر کی:

"اے حاجی بابا — آپ نے کہاں بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا؟ پچھلے پندرہ بیس برس میں پھپھوند پور میں شاعر اور قوال بہت اُگا ہے۔ آج کل ان کی دوکان ایسے زور میں ہے جیسے لکھنؤ والے تُنڈے کبابی کا خونچہ۔ ان سے کسی طرح بنا کر رکھیے!"

ہمیں اتفاق سے بہت جوش آگیا اور ایسی دھماکہ دار تقریر کی کہ شاعر' شاعرے باز' کھٹ بُنے اور قوال تک سب اپنے اپنے کان سہلا کر اور ہم اپنی زبان چاٹ کر رہ گیے۔

قصہ مختصر اسمبلی کا الکشن لڑنا ٹھہر گیا۔ ہم نے

الکشن کا نشان چننا چاہا تو جماعتِ اسلامی والوں نے
مشورہ دیا آپ حاجی آدمی ہیں ـــ اپنا نشان "اونٹ"
رکھیے، مسلمانوں کا قومی جانور! ہندو ہمدردوں
نے کہا، حاجی حاجی جی، مذہب کو بیچ میں کیوں لاتے ہو،
گئو پالن سب کسانوں کا دھرم ایمان ہے، آپ
گائے کا سمبل بناؤ، نوٹ ہم دیں گے اور ووٹ ہم
دلوائیں گے۔ عیسائی مشن والوں نے عقل سمجھائی کہ
حاجی بابا آپ کہاں سادھو سماج کے چکر میں پڑتے
ہیں، پبلک سروس کرنے سے غرض ہے تو "گدھے"
کا نشان رکھیے۔ گدھا بے زبان اور خدمت گزار وفادار
جانور حضرت عیسیٰ کی سواری میں رہا ہے ـــ ہم نے
سوچا مذہب تو خدا اور بندے کا پرائیویٹ معاملہ
ہے۔ ہم کیوں اس میں پڑیں۔ "ریچھ" کا نشان اچھا رہے
گا ـــ ابھی فیصلہ نہیں کیا تھا کہ معلوم ہوا وہ بھی کسی
کا قومی جانور ہے۔ پنجاب کی پہلے ہی بہت دلآزاری
ہو چکی ہے۔ ہم یہ نشان بھی ٹال گئے اور دل سے
پوچھا ـــ بول بھئی ـــ "خرگوش" ٹھیک رہے گا؟
طوطے نے دور سے رٹ لگائی:
"دریں چہ شک، دریں چہ شک"
"خرگوش" کا نشان لے کر جو ہم نے دھواں دھار
الکشن لڑا تو بس گھنٹوں گھنٹوں مزا آگیا۔ جواب میں مخالف
امیدوار نے "کچھوا" لے لیا۔
خوب مشاعرے ہوئے قوالیاں رچی گئیں۔
پلاؤ کی دیگیں ٹھنکیں پمفلٹ بٹے، ووٹ گھٹے، لاٹھی
پونگا ہوا، جلوس نکلے۔ ہم تو جگہ جگہ ہو کر گنا رہے
بیٹھ رہے۔ یار لوگوں کو پنڈال کے ارمان [illegible] تھے
نکال لیے۔ ہمیں الکشن میں کھڑا کر کے اپنی پرانی دوستی
دشمنی کا حساب چکا لیا۔
"کچھوے" والے کے پاس ورکر بہت اچھے
تھے، اس کے حصے میں آئے مستری لوگ، کاریگر،
ترکھان، انجینئر، ڈاکٹر، میلے کچیلے، مضبوط بدن کے
اکھڑ، ان گڑھ ووٹر۔ ان لوگوں میں کام کے آدمی زیادہ
اور لیڈر آدمی کم ہوتے ہیں۔ ہمارا چیف ورکر وہی مرد
قدردان، خوش بیان۔ سارے شاعر اور قوال ہماری
طرف ڈھلک پڑے ـــ مگر کہا ہے کہ وہ جس کے
دوست ہو جائیں اس کا دیوالہ نکلوا دیں اور جس کے
دشمن ہوں اسے بدنام کر ڈالیں:

نہ اُن کی دوستی اچھی نہ ان کی دشمنی اچھی

میاں "خرگوش" شرط بد کر چلے تو رستے میں
سوتے رہ گیے۔ اُس کا "کچھوا" یہ جا وہ جا!
ہم نے سوچا تھا
"چت بھی اپنی ہے پٹ بھی اپنی ہے"

اگر جیت گیے تو اسمبلی میں پہنچتے ہی نئی فیشن ایبل چیل گاڑی کا لائسنس بنوائیں گے، جوڑ توڑ کر کے کچھ منسٹر و منسٹر ہو جائیں گے —— اور اگر ہار گیے تو الکشن کے لئے سیدھے پروپیگنڈے میں نام ایسا روشن ہوگا کہ سارے حلقے میں اثر بن جائے گا پنچوں میں ہماری پروی اونچی رہے گی۔ ہم ایسے بھرے میں آ گئے کہ بزوں کو چت کرنے کی فکر میں خود چت ہو گیے۔

خیر جو ہونا تھا سو ہوا۔ بڑی بپتا یہ آن پڑی ریزلٹ آؤٹ ہوتے ہی ہمارے کارکنوں کی آنکھ بدل گئی۔ ہمدردی کے دو آنسو تو رہے ایک طرف، سب ہم پر پل پڑے۔

"تم کون ہو بھئی، کیا کام ہے؟" —— جی میرے مائکروفون اور بھونپو اور دری اور قالین کا دو مہینے کا کرایہ باقی ہے۔"

"اور تم کیوں کھڑے ہو؟" —— "حاجی جی میں نے بوگس ووٹ ڈلوانے کا دس روپیہ فی ووٹ طے کیا تھا۔ ۸۵، ووٹ کا حساب آپ کی طرف نکلتا ہے۔"

"ارے تجھے کیا چاہیے —— بول" —— "حاجی بابا آپ بمبئی کے سیٹھ ہیں آپ کی طرف پلاؤ کی ۹ اور قورمے کی ۸ دیگیں نکلتی ہیں مشاعرے والوں کے لیے پکوائی تھیں —— مجھے تو نقد ہی گن دیجیے۔

اگر ہم اپنی چیل گاڑی نیلام بھی کرتے تو نقد گنوانے والوں کی پلٹن میں کسی ایک جوان کا حساب بے باق نہ ہوتا۔ لاحول ولا۔ سکرٹری نے سُنا تو "ہائے اللہ" کر کے رہ گئی۔ "واقعی حاجی بابا آپ کا ملک عجیب ہے۔ ہمارے یورپ میں ایسے الکشن نہیں لڑے جاتے۔ الکشن تو وہ ہے جو کچھ اصولوں کی خاطر ہو۔" ہم نے داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ماتھا ٹھونکا بجایا تو غیبی آواز آئی کہ راتوں رات چیل گاڑی اسٹارٹ کر دو، پھر اِدھر کا رُخ نہ کرنا۔ آیندہ کو ہماری توبہ۔

پھپھوندپور میں جو عزت ملی اُس سے تو ہم بے وطن اچھے!

طوطے نے سُنا تو وہی رٹ لگائی:

دریں چہ شک، دریں چہ شک!!

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے ورنہ تعمیل یا جواب میں تاخیر کا امکان ہے۔

مینیجر

بچو اور بزرگو!

حسان صاحب بہت دنوں سے نظم کے لیے تقاضا کر رہے تھے لیکن میں کچھ "عجیب" نظمیں لکھتا ہوں اس لیے ڈر رہا تھا کہ نہ معلوم تم پسند کرو یا نہ کرو۔ وقار میاں نے کہا کہ مجھے پیام تعلیم کو ضرور نظمیں بھیجنی چاہییں البتہ پہلے پہل ان کے متعلق تمھیں تھوڑا بہت بتا دینا چاہیے کہ اصل میں ان کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ یہ تجویز مجھے پسند آگئی کیوں کہ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ میری نظمیں بھی پڑھو اور میرا لکھا ہوا بھی پسند کرو۔

میں وہ نظمیں لکھتا ہوں جن کو آج کل نئی نظمیں کہتے ہیں۔ ان میں قافیہ ردیف کم ہوتے ہیں۔ ایک مصرع چھوٹا ایک بہت بڑا بھی ہو سکتا ہے لیکن ان نظموں میں دو باتیں خاص ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ اصلی بات ایسے کہی جاتی ہے کہ بس دل میں بیٹھ ہی جائے اور دوسرے یہ بات علامت یا اشاروں میں کہہ دی جاتی ہے جو پرانے نہیں ہوتے، نئے بنائے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ زبان میں نئی ترکیبوں اور نئی باتوں کا اضافہ ہوتا رہے۔

میں اپنی ایک نئی نظم تمھارے لیے دے رہا ہوں یہ اتنی آسان ہے کہ سب ان کو اطمینان سے سمجھ سکتے ہیں اگر یہ تمھیں اچھی لگے تو حسان صاحب کو خبر کر دینا پھر میں آئندہ بھی ایسی ہی نئی نظمیں تمھارے لیے لکھوں گا۔

جناب حکیم یوسف حسین خاں

دولت مشترکہ

ہم کو خدا نے کھیت دیے ہیں
اور یہ بھوکی ننگی چڑیاں
ایک ایک کر کے آجاتی ہیں
دانہ دانہ کھا جاتی ہیں
ان کو ذرا بھی عقل نہیں ہے
ان کو سوچ سمجھ سکھلاؤ
ان کی ایک "سبھا" بنواؤ
ان کو ایک مرکز پر لاؤ
"جال بچھاؤ۔ جال بچھاؤ!"

جناب غلام ربانی تاباں

چند دن قاہرہ میں

ابھی چند دن (نومبر ۱۹۶۶ء) ہوئے مجھے مصر یا متحدہ عرب جمہوریہ کی راجدھانی قاہرہ جانے کا اتفاق ہوا۔ آپ پوچھیں گے کیوں؟

اور آپ کے سوال کا جواب یہ ہے کہ افریقہ اور ایشیا میں یکجہتی پیدا کرنے کے لیے ان دونوں براعظموں کے ادیبوں نے ایک انجمن یا کمیٹی بنائی ہے۔ اور اس کا نام ہے "رائٹرس کمیٹی فار افرو ایشین سالی ڈرٹی"

یہ انجمن ایشیا اور افریقہ کے ادیبوں کی دو کانفرنسیں اس سے پہلے کر چکی ہے۔ پہلی کانفرنس تاشقند میں ہوئی تھی دوسری قاہرہ میں۔ اب تیسری بیروت میں ہونے والی ہے۔

اسی تیسری کانفرنس کا ایجنڈا تیار کرنے کے لیے قاہرہ میں "تیاری کمیٹی" کا جلسہ تھا اور اسی جلسے میں شرکت کے لیے قاہرہ جانا ہوا۔

یوں تو قاہرہ دلی سے کافی دور ہے پر ہوائی جہازوں نے تو جیسے زمین کی طنابیں کھینچ دی ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ۱۲ر نومبر کی شام کو ہوائی جہاز دلی سے بمبئی پہنچا۔ وہاں ایک بجے دوسرا جہاز ملا۔ اس نے تقریباً چار بجے صبح قاہرہ پہنچا دیا۔ حساب لگائیے تو

کل تین گھنٹے میں بمبئی سے قاہرہ پہنچ گئے۔ پر جو سچ پوچھو تو پانچ گھنٹے لگے۔

وہ کیسے؟

قاہرہ ہمارے دیس ہندوستان کے پچھم میں ہے! یہاں سورج قاہرہ سے کوئی سوا دو گھنٹے پہلے نکلتا ہے۔ یوں ہمارا وقت قاہرہ سے کوئی سوا دو گھنٹے آگے ہے۔ یعنی میں سوا چار بجے قاہرہ پہنچا ہوں تو اس وقت ہندوستانی گھڑی میں سوا چھ بجے تھے۔ یہ جہاز راستے میں کہیں رکا نہیں۔ بمبئی سے جو اس نے اڑان کی ہے تو بس قاہرہ کے ہوائی اڈے پر ہی اترا۔ یہ میں آپ کو بتا دوں کہ قاہرہ میرے لیے کوئی نئی جگہ نہیں تھی۔ پچھلے سال یورپ جاتے ہوئے میں قاہرہ میں ٹھہر چکا ہوں اور یہاں کی سیر بھی کر چکا ہوں۔

ہمارے میزبانوں نے ٹھہرنے کا انتظام ایک اچھے ہوٹل میں کیا تھا۔ اس کا نام ہوٹل اٹلس ہے۔ یہ ہوٹل دلی کے مشہور ہوٹل جن پتھ کے معیار کا ہے۔ کھانا وغیرہ انگریزی ملتا تھا۔ مصری کھانے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہاں انگریزی زبان لوگ عام طور پر سمجھتے ہیں اس لیے بات چیت میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

تیاری کمیٹی میں شرکت کے لیے ایشیا اور افریقہ کے تقریباً ۲۵ نمائندے آئے تھے۔ یہ سب اپنے اپنے ملکوں، اپنی اپنی زبانوں کے اچھے ادیب تھے۔ ان کے علاوہ مصر کے بہت سے ادیبوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان میں جناب یوسف السباعی، جناب موری سعد الدین، محترمہ ملک عبدالعزیز خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ یہ سب مصر کے مشہور ادیب ہیں اور وہاں کے ادبی حلقوں میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

مصری، عام طور پر بہت خوش مذاق اور مخلص ہوتے ہیں۔ ان سے مل کر اجنبیت کا احساس بالکل نہیں ہوتا۔ عربوں کی مہمان نوازی تو مشہور ہے۔ اور انھوں نے اس کا پورا پورا ثبوت دیا۔

قاہرہ کے لوگوں کا رہن سہن ان کا پہناوا بالکل مغربی ہے۔ سڑکوں پر مرد یا عورتیں عربی لباس پہنے خال خال نظر آتے ہیں۔ عورتیں بھی عام طور پر مغربی لباس پہنتی ہیں لیکن یہ ظاہری چیز ہے آپ ٹٹول کر دیکھیں تو عرب ہماری طرح مشرقی ہیں ہماری بہت سی خامیاں ان میں بھی ہیں۔ مثلاً دوپہر کو سونے یا قیلولہ کرنے کی عادت۔ مصر کے بازار عام طور پر دن کے ایک بجے بند ہو جاتے ہیں۔ ایک سے تین تک ہر مصری ضرور سوتا ہے۔ اس عرصے میں قاہرہ کے بازار

اور سڑکیں سنسان نظر آتی ہیں۔

مصر میں دفتروں کا وقت بھی آٹھ بجے سے دو بجے تک ہے۔ دو بجے دفتر بند ہو جاتے ہیں اور لوگ سونے کے لیے اپنے گھروں کو چلے جاتے ہیں — دفتروں میں کافی پینے اور خوش گپیاں کرنے کا عام رواج ہے۔

جامعہ ازہر، اہرام۔ امریکن یونیورسٹی اور عجائب خانہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس مرتبہ صرف جامعہ ازہر اور اہرام جا سکا۔ ازہر دنیا کی سب سے پرانی اور مشہور یونیورسٹی ہے۔ مصر کی آزادی کے بعد یہاں بہت سی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ پرانے طریقۂ تعلیم کے ساتھ نئے طریقۂ تعلیم اور نئے مضامین مثلاً سائنس وغیرہ کا ایک الگ شعبہ کھول دیا گیا ہے۔ شیخ الازہر کی مذہبی حیثیت پورے ملک میں بہت اونچی سمجھی جاتی ہے۔

جامعہ ازہر میں ہندوستانی طالب علموں سے ملاقات ہوئی۔ سب خوش اور یہاں کی تعلیم سے مطمئن تھے۔ ہاں ایک اور ہندوستانی عبدالباری صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ یہ قاہرہ ریڈیو میں کام کرتے ہیں۔ دس بارہ سال سے قاہرہ میں مقیم ہیں۔ شعر بھی کہتے ہیں اور اچھے خاصے کہتے ہیں انجم تخلص ہے۔ مجھ سے ہوٹل میں بھی کئی بار ملنے آئے۔

ایک اور ہندوستانی مسٹر چیتر نرائن ملویہ بہت مخلص قسم کے دوست ہیں۔ قاہرہ میں عام طور سے میرے ساتھ رہے۔ ان کی وجہ سے قاہرہ میں گھومنے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں بہت سہولت رہی۔

قاہرہ کے ہندوستانی سفارت خانے میں مسٹر استھانا ہمارے کلچرل اتاشی میں بہت باذوق اور مخلص انسان ہیں۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ ہماری حکومت دوسرے ملکوں کے سفارت خانوں میں ایسے اچھے ایسے شائستہ لوگوں کو بھیجتی ہے۔ ان کی بدولت دوسرے ملکوں میں ہندوستان کے بارے میں اچھی رائے قائم کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

مسٹر استھانا نے میری پر تکلف دعوت کی۔ اس دعوت میں ہندوستانیوں کے علاوہ مشہور مصری شاعر محترمہ ملک عبدالعزیز بھی مدعو تھیں ہم سب کی درخواست پر انھوں نے اپنا کلام اور اس کا انگریزی ترجمہ سنایا۔ آپ جانتے ہیں شعر کا ترجمہ مشکل ہے۔ عام طور پر شعر کی روح غائب ہو جاتی ہے۔ تاہم اس ترجمے سے یہ اندازہ ضرور ہوا کہ وہ اچھے شعر کہتی ہیں۔

*

قاہرہ میں مسجدیں بہت ہیں ہمارے ہوٹل کے قریب ہی ایک شاندار مسجد تھی صبح شام مصری لہجے میں اذان کی آواز بہت بھلی لگتی تھی مغربی وضع قطع کے باوجود مصری لوگ بہت مذہبی ہوتے ہیں۔ مسجدیں نمازیوں کی اچھی خاصی تعداد ہوتی ہے۔

ہاں قاہرہ میں دریائے نیل کے کنارے ایک مینار بھی ہے۔ مصری اسے برگ قاہرہ یعنی برج قاہرہ کہتے ہیں۔ مصر میں اور غالباً دوسرے عرب ملکوں میں بھی ج کا تلفظ گ سے کیا جاتا ہے۔

یوں تو دنیا میں اونچے اونچے مینار اور بھی ہیں مثلاً ہمارا قطب مینار یا پیرس کا ایفل ٹاور قطب مینار پتھر کا بنا ہوا ہے۔ ایفل ٹاور میں لوہا ہی لوہا ہے۔ اور یہ برج قاہرہ تمام تر سمینٹ اور کنکریٹ یعنی گچ کا بنا ہوا ہے یوں سمجھیے کہ سمینٹ اور گچ سے اتنا اونچا مینار اب تک تعمیر نہیں ہوا ہے۔ مینار پر چڑھنے کے لیے لفٹ لگا ہے۔ اس لفٹ کے ذریعے آپ چوٹی پر چڑھ سکتے ہیں۔

چوٹی پر ایک چائے خانہ ہے جہاں آپ بیٹھ کر چائے پی سکتے ہیں۔ میں اس مینار پر رات کے وقت گیا تھا۔ میلوں تک پھیلی ہوئی قاہرہ کی روشنی اور شہر کے بیچ سے بل کھاتے ہوئے دریائے نیل کا منظر بہت حسین معلوم ہوتا تھا۔

قاہرہ کی آبادی تقریباً ۳۵ لاکھ ہے اور دلی کی طرح دور دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ مینار شہر کے بیچ میں ہے۔ یہاں سے میلوں تک روشنی کا جال سا بچھا نظر آتا ہے۔

کل چھ دن میں قاہرہ میں ٹھہرا۔ اور ایرانڈیا کے آرام دہ جہاز سے واپس ہندوستان آگیا۔ واپسی میں وقت نے ایک دفعہ پھر اپنا کرشمہ دکھایا۔ جہاز دس بجے قاہرہ سے روانہ ہوا اور پانچ بج کر کچھ منٹ پر بمبئی پہنچ گیا۔ حساب سے سات گھنٹے ہوتے ہیں۔ حالانکہ لگے کل پانچ سوا پانچ گھنٹے۔ گویا قاہرہ کی گھڑیوں کے اعتبار سے میں سوا تین بجے بمبئی پہنچا۔ لیکن ہندوستان کی گھڑیوں میں اس وقت سوا پانچ بجے تھے۔

جناب [illegible] سہرامی

ایک پتنگا

دیکھا میں نے ایک پتنگا — چم چم چمکے جیسے تارا
چھوٹا سا یہ ایک پتنگا — گھر میں چمکا باغ میں چمکا
کتنا دلکش یہ لگتا ہے — تاریکی میں جب اڑتا ہے
کتنا سُندر کتنا پیارا — نیلے گگن کا جیسے تارا
دن میں شاید شرماتا ہے — اپنے گھر میں چھپ جاتا ہے
شاید یہ بھی ہو سکتا ہے — سورج سے وہ ڈر جاتا ہے
جیسے تارے چھپ جاتے ہیں — سامنے آتے شرماتے ہیں

پیارے بچّو! سوچو تو
کون پتنگا بولو تو
کیا بولے تم؛ جگنو! جگنو!!
ہاں ہاں! سچ مچ ہے یہ جگنو!!

اسے پہنو تو سہی

جناب انور اشفاق

کم بخت — نالائق — روبی کے بچے —
اندھا ہے کیا؟ — تیری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں کیا؟
— شکار کا اتنا ہی شوق ہے تو جا کسی جنگل میں!
غلیل سے ہم لوگوں کے سروں کو کیوں نشانہ بناتا ہے۔
بے شرم کہیں کا — بڑوں کا مذاق اڑاتا ہے!

بنگالی بابو اپنا سر پکڑے غصہ میں بھرے چیخ رہے تھے اور روبی غلیل ہوا میں ہلا رہا تھا اور کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔

روبی کی یہ حرکت کوئی پہلی حرکت نہیں تھی — اس کی شرارتوں سے تو محلے کے بچے، جوان اور بوڑھے — سبھی بے زار تھے — اس کے پتا نے ہر طرح کی سزا دی لیکن وہ اپنی شرارت سے باز نہ آیا — محلے والے روزانہ آ کر کوئی نہ کوئی شکایت ضرور کرتے — اور روبی کے پتا کو روز معافی مانگنی پڑتی —

اس کی ماتا نے بھی روبی کو سدھارنے کی بہت کوشش کی۔ — کبھی کبھی تو وہ اس کی "ایز نوں سے" اکتا کر طے کرتیں کہ اسے زہر کھلا کر ختم کر دیا جائے مگر ماں کی ممتا آڑے آجاتی۔ بے چاری کوس کوس کر خود رو لیتیں۔

کبھی لالہ بابو آ کر شکایت کرتے کہ روبی نے کنکر مار مار کر ان کے مکان کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے کبھی ملا جی آ کر کہتے کہ وہ مدرسے جا رہے تھے کہ راستے میں ایک درخت پر روبی نے بیٹھ کر پگڑی اٹھالی اور درخت کے اوپری سرے پر رکھ کر بھاگ گیا۔ کبھی للو حلوائی آ کر روتا کہ جب وہ جلیبی بنانے کے لئے کڑھاؤ میں تیل گرم کر رہا تھا اس وقت روبی نے ایک چوہیا کڑھائی میں ڈال دی۔ سارا تیل بے کار ہو گیا — کبھی استانی جی آ کر چیختیں کہ جب وہ اسکول جا رہی تھیں تو روبی نے نہ معلوم کیسے ان کی ساڑی کے

پلو سے ایک مرا ہوا سانپ رسی سے باندھ دیا۔
اس کے ماتا پتا نے شکایت کرنے والوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ روپی کی شرارت پر چاہے کیسی سزا دیں انہیں کوئی شکایت نہ ہوگی۔ پر بھلا کس کی ہمت تھی جو اس کی مرمت کرتا۔ پھر تو وہ اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتا۔ پہلے سے زیادہ پریشان کرنے لگتا۔

ایک بار شیرو پہلوان اکھاڑے سے ورزش کرکے آرہے تھے۔ گلی کے موڑ پر ان کا پیر پھسل گیا۔ وہ دھم سے گر پڑے۔ انہوں نے راستے میں کیلے کے چھلکے پھینکنے والے کو کوسنا شروع کیا اچانک ان کی نظر روپی پر پڑی جو کھلکھلا کر ہنس رہا تھا۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ انھیں حضرت کی کارستانی ہے انہوں نے روپی کو پکڑ کر خوب کان گرم کیے، دو ایک چپتیں لگائیں۔

اب لیجیے روپی کو تاؤ آگیا۔ وہ شیرو پہلوان کے پیچھے پڑ گیا۔ جہاں شیرو پہلوان نظر آتے۔ وہ اپنی ایک انگلی ان کی توند کی طرف بڑھاتا۔ شیرو پہلوان کو گدگدی شروع ہوجاتی۔ وہ ناچنا کودنا شروع کر دیتے۔ یہ تماشا دیکھنے والے ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ روپی بہت خوش ہوتا اور شیرو پہلوان شرما کر بھاگ جاتے۔ آخر ایک دن شیرو پہلوان نے روپی سے ہار مان لی۔ خوشامد کی۔ معافی مانگی۔ تب روپی نے شیرو پہلوان کا پیچھا چھوڑا

آخر محلے والوں نے میٹنگ کرکے روپی کے پتا سے کہہ دیا کہ اگر روپی اپنی شرارتوں سے باز نہ آیا تو اسے محلے سے نکال دیا جائیگا۔ محلے والے تو نکالنے کی بات ماننے کے لیے تیار تھے لیکن مندر کے پجاری نے اتفاق نہیں کیا۔ پجاری جی کی بات مان لی گئی۔

لیکن ایک دن تو روپی نے پجاری جی کو بھی نہ چھوڑا۔ وہ کنویں پر ہاتھ پیر دھو رہے تھے کہ روپی ان کی کھڑاؤں لے کر نو دو گیارہ ہوگیا۔ پجاری جی نے روپی کو بھاگتے ہوئے دیکھ لیا تھا کچھ کہا نہیں۔ ننگے پیر مندر لوٹ آئے۔

رات کو جب روپی اپنے ماتا پتا کے ساتھ کھانا کھا رہا تھا تو اس کے پتا نے خوش ہوکر کہا۔ "روپی آج میں بہت خوش ہوں۔ آج تمھاری کوئی شکایت نہیں ملی۔ اب اسی طرح رہو۔ تم شرارت نہیں کروگے تو محلے والے بھی تم سے خوش رہیں گے۔ اور تمھاری قدر کریں گے۔ تم سے

کی عزت کرو — سب سے ہمدردی کے ساتھ پیش آؤ
— سب خود ہی کہیں گے کہ رونی نیک لڑکا ہے کوئی
تمھیں شریر نہ کہے گا — لیکن اسی دوران میں
مکان کے باہر پجاری جی کھڑے رونی کے پتا کو بلا
رہے تھے۔

رونی سہم گیا — لیکن اس نے ہوشیاری
سے کام لیا اور زور سے آواز لگائی کہ پتا جی باہر
گیے ہیں۔ پر دوسرے ہی لمحے میں پجاری جی
خود مکان کے اندر داخل ہو گیے۔

رونی نے سمجھ لیا کہ اب مصیبت آنے والی
ہے۔ اس کے پتا نے اٹھ کر پجاری جی کا استقبال کیا
— پجاری جی مسکرا رہے تھے۔

انھوں نے رونی کو قریب بلایا — رونی
کو معلوم تھا کہ پجاری جی بچوں کو بری طرح پیٹتے
ہیں — ہلدی اور گڑ کا پلاسٹر چڑھانے کی نوبت آجاتی
ہے — وہ ان کے قریب نہیں جا رہا تھا لیکن
جب اس کے پتا اور ماتا نے زور دیا' وہ سہمتے ہوئے
قریب گیا۔

پجاری جی نے رونی کو پیار کرتے ہوئے کہا:
بیٹا تم کو کھڑاؤں چاہیے تھی — لو میں تمھارے پیر
کے ناپ کی کھڑاؤں لے آیا ہوں — میری کھڑاؤں
واپس کر دو — تمھارے پاؤں میں بڑی ہوگی —
تم پہن کر چلوگے تو گر جاؤگے — کیا عجب جو چوٹ
بھی لگ جائے — لو اسے پہنو تو سہی —
تمھارے پیر میں ٹھیک آتی ہے!

جناب ظ۔ انصاری

(مشہور روسی شاعر الکسانڈر پوشکن کی ایک نظم کا براہ راست روسی زبان سے ترجمہ)

نیلے ساگر کے بالکل ہی
پاس پرانی سی کٹیا تھی
اس کٹیا میں بوڑھا بڑھیا، دونوں ساتھ رہا کرتے تھے
پورے تیس اور تین برس تک رہتے اور مزا کرتے تھے
بوڑھا جال اٹھا کر جائے
مچھلی پکڑے گھر کو لائے
بڑھیا بیٹھی چرخہ کاتے
چرخہ چرخ چوں چوں گائے
ایک دن بڈھے مچھوے نے
پانی میں سے جال سمیٹا
لے دے کے بس نکلی کائی
پھر سے جال بچھا کر کھینچا
[illegible] آئی

تیسرے کے بوڑھے نے اپنا
جال سمندر میں پھیلایا
اب جو جال سمیٹا تو اس میں نکلی کیسی مچھلی
سچ پوچھو تو سونے کی، دیکھا تھی کوئی ایسی ویسی مچھلی
مچھلی منت کر کے بولی
آدمی کی سی بولی ٹھولی
کہنے لگی اے بوڑھے بابا
"جال کا پھندا کر دو ڈھیلا
نیلا ساگر ہے گھر میرا مجھ کو میرے گھر جانے دو
اپنا مول چکا دوں گی میں
میرا کہنا مانو گے تو منہ مانگا بدلہ دوں گی میں
بوڑھا چونکا، ہچکا، سہما [illegible]
جال اٹھاتے جال بچھاتے [illegible]

بولنا مچھلی کا سننے میں آیا اور نہ آنکھوں دیکھا
ڈھیلا کر کے جال کا پھندا
پیار سے بولا بوڑھا مچھوا
اچھا بھئی سونے کی مچھلی،
جا، تو بھی کیا یاد کرے گی!
لینا دینا کا ہے کا ہے، مجھ پر کیا ہُن برسا دے گی!
جل تھل تیرا سارا آنگن"
سیر سپاٹے کر، بہلا من"

—— ٥ ——

لوٹ کے بوڑھا گھر کو آیا
بڑھیا کو احوال سنایا
بولا — سنتی ہو جی بڑی بی
آج اک مچھلی جال میں آئی
کیا بتلاؤں، کیسی تھی وہ
کیا کچھ ایسی ویسی تھی وہ؟
سونے کی مچھلی اور بولے!
سچ مچ جیسے ہم تم بولیں
کہنے لگی "اے بوڑھے بابا جال کا پھندا کر دو ڈھیلا
نیلا ساگر ہے گھر میرا، مجھ کو میرے گھر جانے دو
اپنا مول چکا دوں گی میں، منھ مانگا بدلہ دوں گی میں"
میری بھلا کیا ہمت تھی جو
اس سے دام چکاتا، بولو؟
یوں ہی چھوڑ دیا میں نے تو
یہ سنتے ہی گرجی بڑھیا، بوڑھے کو پھٹکارا کس کر
"ہت تیرے کی جنم کے بدھو عقل پہ تیری پڑ گئے پتھر"
تجھ کو مانگنا بھی نہ آیا
موقع پایا اور گنوایا
منھ پھوٹے سے اتنا کہتا" دلوا دو اچھا سا تسلا
اور ہمارا تو بی چھلی، ہو گیا چھلنی سارا تسلا
بوڑھا پھر چپ چاپ سدھارا
نیلے ساگر پر جب پہنچا
دیکھا کیا، نیلے ساگر میں
اٹھیں، ہلکی ہلکی لہریں
بوڑھے نے آکر بانگ لگائی، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دُم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ بولی۔ "کیوں بابا کیا چاہیے تم کو؟"
بوڑھا گردن نیچی کر کے
بولا یہ اک بول ادب سے
"رحم کرو تم مچھلی رانی
بڑھیا میری ہے بوڑاتی
اس نے ایسے فیل مچائے

جن سے ناک میں دم آجائے
کہتی کیا ہے جاؤ، مانگ کے لاؤ ایک نیا سا تَسلا
اور ہمارا تو بالکل ہی چھلنی ہو گیا سارا تَسلا"
مچھلی بولی: "اچھا بابا
جو مانگا ہے مل جائے گا
غم نہ کرو، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ"

—— ٥ ——

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
ایک نیا تسلا دیکھا جو
بڑھیا کے آگے رکھا تھا
دیکھتے ہی وہ کھوسٹ بڑھیا
اور ہوئی آپے سے باہر
"بھت تیرے کی جنم کے بدھو، عقل پہ تیری پڑ گئے پتھر
تجھ کو لینا بھی نہ آیا
بس اک تسلا مانگ کے لایا
تسلا چار ٹکے کی مایا — تسلے سے ہو گئی تسلی
الٹے پاؤں چلا جا بدھو اور مچھلی سے جھک کر کہیو
تسلا کیا دلوایا تم نے، اک اچھا سا گھر دلوا دو"

—— ٥ ——

بوڑھا پھر وا اللہ کر سیدھا
پھر نیلے ساگر پر پہنچا
دیکھا تو نیلے ساگر میں
اب کے اٹھیں زور کی بریں
بوڑھے نے اک ہانک لگائی، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بَل کھاتی آئی

اور یہ بولی:
"کیوں بابا کیا چاہیے تم کو"
بوڑھا گردن نیچی کر کے
بولا یہ اک بول ادب سے
"رحم کرو سرکار میری تم، جورو نے جنجال میں ڈالا
اب تو میری بڑھیا اور بھی ہو گئی آفت کی پرکالا
تریاہٹ سے جینا دوبھر
مانگ رہی ہے ایک نیا گھر
مچھلی بولی — "اچھا بابا
جو مانگا ہے مل جائے گا
یونہی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ"

—— ٥ ——

بوڑھا لوٹ کے گھر کو آیا
دائیں بائیں کٹیا ڈھونڈھی

پھر بھی اس کا کھوج نہ پایا
آتے دیکھا ایک ایسا گھر
جس میں روشندان تھا اوپر
پکی اینٹوں کا چوبارہ
اوپر سے چونے کا پچارہ
شیشم کی لکڑی کے پھاٹک
پالش اوپر سے نیچے تک
جگ مگ، جگ مگ، جگ مگ جگ مگ
کھڑکی اوپر جھل مل بتی
نیچے گھر والی کا مکھڑا
(بوڑھا من میں سوچے،
لو بھئی ۔ اب تو مٹ گیا سارا دکھڑا)
لیکن بوڑھے کو دیکھا تو
اور چڑھا بوڑھیا کا پارہ
خوب اُسے ڈانٹا پھٹکارا
"ہت تیرے کی جنم کے بدھو عقل پر تیری پڑ گئے پتھر
مورکھ تو نے مچھلی سے مانگا بھی تو مانگا اک گھر
جا اب الٹے پاؤں چلا جا، اور مچھلی سے جاکر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا اب دو کوڑی کی نیچ دباتن رہنا
میں تو بنوں گی اونچے گھر کی، جس کا محل میں رہنا سہنا"
بوڑھا کان دبائے نکلا

سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھا ساگر ہے کچھ بے کل
ہوتی ہے لہروں میں ہل چل
بوڑھے نے ایک بانک لگائی، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دُم لہراتی آتی
جلدی سے بل کھاتی آئی

اور یہ پوچھا:-
"کیوں بابا کیا چاہیے تم کو؟"
بوڑھا گردن نیچی کر کے
بولا یہ ایک بول ادب سے
"رحم کرو سرکار میری. تم
بڑھیا کی تو عقل ہوئی گم
مجھ بوڑھے کا اس جھنجھٹ سے
ناک میں دم ہے تریاہٹ سے
بننے چلی ہے اونچے گھر کی، جس کا محل میں رہنا سہنا
اس کو نہیں بھاتا اب دو کوڑی کی نیچ دباتن رہنا"
مچھلی بولی: "اچھا بابا
یہ بھی سہی، تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ

بوڑھا پھوا گھر کو آیا

سارا نقشہ بدلا پایا
دیکھتا کیا ہے
یہ اونچا سا محل کھڑا ہے
آگے کو چھجہ نکلا ہے
اور چھجے پر اس کی بڑی بی
ہے موجود بڑے ٹھسے سے
بڑھیا بڑھیا زیور پہنے
سر پر جوڑا ایسا موٹا
اور جوڑے میں سچا گوٹا
تن پر بڑھیا، عمدہ دگلا
جیسے نرم روئیں کا بگلا
گردن میں مالا موٹی سی، اور مالا میں سچے موتی
ہاتھوں میں سونے کی انگوٹھی
جوتی جیسے بیر بہوٹی
آگے پیچھے نوکر چاکر
جلدی جلدی دوڑ رہے ہیں
سب اس کی خاطر میں لگے ہیں
اور بڑی بی ناک چڑھائے
گالی دے، کوسے، دھمکائے
اس کو مکا، اس کو چانٹا
اس کے جھونٹے کھینچے، ڈانٹا

بوڑھا پاس گیا بڑھیا کے اور پوچھا ڈنڈوت بجا کے
"خیر بڑی سرکار کی ہووے، اب تو منوا راضی ہے نا؟"
بڑھیا سن کر زور سے بگڑی
بڈھے کو ڈپٹا، دھتکارا
حکم دیا نوکر چاکر کو
اس کو تم اصطبل میں رکھو
کاٹے جائے بھوسا چارہ

ـــــــ ٥ ـــــــ

ایک دن بیتا دو دن بیتے بیتے آخر دو اٹھوارے
اب کے تو بڈھے پر اس نے اور بھی بڑھ کر پنجے جھاڑے
"بڈھے تجھ سے کہا جاتا ہے
سن جو حکم دیا جاتا ہے
جا اب الٹے پاؤں چلا جا
اور مچھلی سے جھک کر کہنا
مجھ کو نہیں بھاتا یوں جھوٹی موٹی نام کی رانی رہنا
میں ہوں گی سچ مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاہوں حکم چلاؤں
سارے میرا کہنا مانیں"
بوڑھا سنتے ہی بھونچکا ہو گیا اور دھیرے سے بولا
"گھاس کہیں تو کھا گئی جورو

میں جانوں سٹھیا گئی جورو
ہنسا آئے، نہ بیٹھا جائے
منھ کھولے تو بول نہ پائے
لال لگام اور بوڑھی گھوڑی، تجھ پر سارا راج ہنسے گا"
دل میں چبھا بڑھیا کے کانٹا
نیک میاں کے منھ پر چانٹا
دے کر بولی، کیا بکتا ہے
ہوش ٹھکانے کردوں گی میں
اُفوہ بڑھی اتنی ہمت
بول بڑا سرکار کے آگے
اٹھ کر جیبھ کتر دوں گی میں
جا، عزت کے ساتھ چلا جا
سُن جو حکم دیا جاتا ہے
اور اگر انکار کیا تو
باندھ کے لے جائیں گے تجھ کو
اس میں میرا کیا جاتا ہے"

بوڑھا اپنے کان دبائے
پھر نیلے ساگر کو پہنچا
لہروں نے وہ پلٹے کھائے
ہو گیا سارا پانی کالا
بوڑھے نے ایک ہانک لگائی، سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور پوچھا :۔
"کہون بابا — کیا چاہیے تم کو؟"
بوڑھا گردن نیچی کر کے
بولا یہ دو بول ادب سے
"رحم کرو سرکار میری تم — جان کو آئی کھوسٹ بڑھیا
اس نے اور مچایا اودھم، اور ہوئی آفت کی پڑیا
دیکھو تو اب کہتی کیا ہے
اونچے گھر میں خاک دھرا ہے
درشن تھوڑے نام بڑا ہے
میں ہوں گی سچ مچ کی رانی
جس کو راج کا مالک جانیں
جیسے چاہوں حکم چلاؤں
سارا میرا کہنا مانیں"
مچھلی بولی — "اچھا بابا"
یونہی سہی تم من نہ دکھاؤ
خیر سے اپنے گھر کو جاؤ
بڑھیا کو مہارانی پاؤ"

بڈھا لوٹ کے گھر کو آیا
دیکھتا کیا ہے
آگے شاہی محل کھڑا ہے
اور محل میں اس کی بڑی بی
سر پر تاج لگائے بیٹھی
سامنے دسترخوان سجا ہے
دائیں بائیں ہیں درباری
پنج ہزاری ہفت ہزاری
بانکے ٹیڑھے پگڑی والے
مونچھوں والے، ڈاڑھی والے
سب اس کی سیوا میں لگے ہیں
جام میں مُدرا ڈھال رہے ہیں
سات سمندر پار کے تحفے
شکر پارے رنگ برنگے
بڑھیا بیٹھی ٹونگ رہی ہے
چو طرفہ ہے گارڈ کا پہرا
پھرسے اور کلہاڑے تولے
کس کی ہمت جو کچھ بولے
بڈھا دیکھ کے ٹھٹکا، سہما
بڑھیا کے چرنوں میں جھک کر
بس اتنا پوچھا رک رک کر

"رعب بہت گانٹھا مہارانی، پر جو پوچھوں سچ سچ کہنا
اب تو کلیجے میں ٹھنڈک ہے، اب تو منوا راضی ہونا؟"
سن کر ایسی تنکی بڑھیا
مڑ کر اس کی اور نہ دیکھا
حکم کیا آنکھوں آنکھوں ہیں
اس کو دھکے دے کے نکالو
آئی بلا ہے جلدی ٹالو
ایک اشارہ سا پاتے ہی
لپکے مُسٹنڈے درباری
جھٹ سے بڈھے کو جا پکڑا
گُدّی پر دو ہاتھ جمائے
دھکے دیتے باہر لائے
اور ڈیوڑھی پر لپ جھپ دوڑے چوکی پہرے گارڈ والے
کوئی کلہاڑا تھامے نکلا، کوئی تانے بلم بھالے
بوڑھے کی تو جان کے لالے
اور اوپر سے ہنسنے والے
جملے پھینکیں، طعنے ماریں
کوئی کہے سٹھیایا بڈھا
کوئی کہے دیہاتی گنڈا
کام کیا جوتے کھانے کا
جان بچی تو چھوٹا سستا

اب آگے کو آنکھیں ہو گئیں
دیکھ کے چلیو اپنا رستہ

———— O ————

پھر جیسے تیسے دن گزرے
ایک دن گذرا دو دن گذرے، گذرے آخر دو اٹھوارے
اور بھی کچھ سٹھیائی بڑھیا
اور کھلی آفت کی پڑیا
حکم ہوا بوڑھے کو لاؤ
چار طرف ڈگی پٹولوی
بوڑھے کی ڈھونڈھیا مچوا دی
جال کنووں تک میں ڈلوائے
آخر اس کو لے کر آئے
بڑھیا حکم چلا کر بولی "سنتا ہے اے بڈھے مچھوے
الٹے پاؤں چلا جا اور جھک کر کہیو مچھلی سے مچھوے
میں رانی بن کر بھر پائی
راج سنگھاسن سے اکتائی
بس اب تو یہ جی میں سمائی
راج کروں نیلے ساگر پر
قبضے میں ہوں ساتوں ساگر
بیچوں بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
وہ جو ہے سونے کی مچھلی
میری خدمت گار رہے وہ
جیسے چاہوں حکم چلاؤں، آٹھ پہر تیار رہے وہ"

———— O ————

سنتا تھا وہ سانس کو روکے
کیا ہمت جو بیچ میں ٹوکے
وہ تو مہارانی تھی —— اور یہ
اک بڈھا مچھوا بے چارہ
حکم مہارانی کا سن کر
مچھوا ہو گیا نو دو گیارہ
سیدھا نیلے ساگر پہنچا
دیکھتا کیا ہے کالی لہریں
طوفانی غصیلی —— لہریں
زور کے شرّاٹے بھرتی ہیں
بپھری ہیں، فوں فوں کرتی ہیں
بڈھے نے اک ہانک لگائی سونے کی مچھلی کو پکارا
مچھلی دم لہراتی آئی
جلدی سے بل کھاتی آئی
اور یہ پوچھا
"کیوں بابا —— کیا چاہیے تم کو؟"
بوڑھا گردن نیچی کر کے

بولا یہ ڈو بول ادب سے
رحم کرو سرکار میری تم، ناک میں دم ہے مچھلی رانی
اب کم بختی ماری جورو نے کچھ اور ہی دل میں ٹھانی
کہتی کیا ہے :-
میں رانی بن کر بھر پائی
بس اب تو جی میں یہ سمائی
قبضے میں ہوں ساتوں ساگر
بیچوں بیچ لگاؤں ڈیرا
حکم چلے پانی پر میرا
اور اچھی سونے کی مچھلی اس کی خدمت گار رہے تو
جیسے چاہے حکم کرے وہ آٹھ پہر تیار رہے تو

o

مچھلی پٹ پٹ آنکھیں کھولے
سنتی رہی سب کچھ بن بولے
پانی پر دُم چھپ سے ماری
اور ہولے سے پلٹا کھا کر
ساگر کو چپ چاپ سدھاری
دیر تلک امید میں بڈھا
ساگر کے تٹ پر ہی ٹھہرا
جب نہ پتہ کچھ اس کا پایا
منھ لٹکائے گھر کو آیا
دیکھا کیا، آنکھوں کے آگے ایک پرانی سی کٹیا ہے
اور اس کٹیا کی چوکھٹ پر بیٹھی وہ کھوسٹ بڑھیا ہے
ٹوٹا پھوٹا اس کے آگے ایک وہی تسلا رکھا ہے

سال نامہ جناب شفیع الدین صاحب نیرؔ کی نظر میں

برادرم حسین حسان صاحب - السلام علیکم

نیا سال مبارک ہو !

پیام تعلیم کا سالنامہ ملا۔ ٹائیٹل دیکھ کر آنکھوں کو نور اور دل کو سرور حاصل ہوا۔ میں نے شوق میں آکر اسی وقت بہت سے مضمون پڑھ ڈالے۔ وہ تھے ہی اتنے دلچسپ کہ بغیر پڑھے چھوڑنا مشکل تھا۔

میں خوش ہوں کہ تفریح کے ساتھ آپ نے بچوں کی تعلیم کی طرف خاص توجہ فرمائی ہے۔ اور ہر قسم کے مضامین نظم و نثر شائع کیے ہیں۔ اس میں ادب کے ساتھ سائنس اور دوسرے علوم کا خیال بھی رکھا ہے۔

میں یقین کرتا ہوں کہ اس سالنامے سے طلبا، اور طالبات بہت فائدہ اُٹھائیں گے۔ اور جس گھر میں بھی جائے گا بڑے شوق سے پڑھا جائے گا میں آپ کو اور پیام تعلیم کے دیگر کارکنوں کو ایسا حسین اور مفید گلدستہ یعنی سالنامہ پیش کرنے پر مبارکباد دیتا ہوں۔

والسّلام۔ آپ کا مخلص

محمد شفیع الدین نیرؔ

ب شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

بچوں کا شاعر

یہ ۲ مارچ ۱۹۳۷ء کی بات ہے شام کا وقت تھا کلکتہ یونیورسٹی کا ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا اور جلسے کی کاروائی ہو رہی تھی مہمان خصوصی بلبل ہند سروجنی نائڈو کی پرجوش تقریر کے بعد جنابِ صدر نے اپنی تقریر شروع کی۔ جناب صدر کی تقریر نے سب کے دلوں کو موہ لیا تھا۔ پورا ہال خاموشی سے تقریر سن رہا تھا۔ اچانک جناب صدر نے اپنی تقریر بند کر دی۔

سب لوگ حیران رہ گیے۔ "کیا ہوا؟" "کیا ہوا؟" مجمع میں کھلبلی مچ گئی۔ جنابِ صدر کی نگاہیں اس دروازے کی طرف لگی ہوئی تھیں جہاں ایک لڑکا جناب صدر کو دیکھنے کے لیے اندر آنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

چند لمحے بعد جنابِ صدر نے کہا "اگر آپ لوگ میری تقریر سننا چاہتے ہیں تو اس بچے کو میرے پاس لاکر بٹھا دیجیے ورنہ میں تقریر یہیں ختم کرتا ہوں۔"

پھر کیا تھا فوراً ایک والنٹیر اس لڑکے کو جناب صدر کے پاس لے آیا اور جناب صدر نے بخوشی پھر سے اپنی تقریر کا سلسلہ شروع کر دیا۔

جانتے ہو اس جلسے کا صدر کون تھا؟ شاعر جہاں رابندر ناتھ ٹیگور ہندوستان ہی نہیں بلکہ ایشیا کا وہ پہلا شاعر جسے ادب کا نوبل انعام ملا۔ ٹیگور کو بچوں سے بے انتہا محبت تھی۔ انھوں نے تمھارے لیے بے شمار کہانیاں اور پیاری پیاری نظمیں لکھی ہیں تمھیں چاہیے کہ تم ان کی کہانیاں ضرور پڑھو اور جب تم بڑے ہوگے تو ان کی تمام کتابیں پڑھ سکو گے اور جان سکو گے کہ انھوں نے وطن کی آزادی اور انسانیت کی بھلائی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا ہے۔

سبق ایک ہی ہوگا

ابنِ محمود

کام کرنے والے

رشید .... گاؤں کے ایک رئیس
جاوید .... رشید کا بڑا لڑکا
پرویز .... رشید کا چھوٹا لڑکا
ماسٹر صاحب .... گاؤں کے اسکول ماسٹر
طارق، شمیم، اطہر .... جاوید پرویز کے ساتھی
بنارسی لال .... گوالا

پہلا سین

(اسکول میں)

وقت .... صبح کے آٹھ بجے
مقام .... گاؤں کا اسکول

(بچے اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے پڑھنے لکھنے کا سامان درست کر رہے ہیں۔ اتنے میں ماسٹر صاحب کلاس میں داخل ہوتے ہیں۔ تمام بچے انہیں سلام کرتے ہیں۔)

آواز :- السلام علیکم!
ماسٹر صاحب :- وعلیکم السلام!
(تمام بچے اپنی اپنی کتابیں نکال لیتے ہیں)
پرویز :- ماسٹر صاحب! آج سبق میں پڑھوں؟
ماسٹر صاحب :- تم نے سبق کا مطالعہ کر لیا ہے؟
پرویز :- جی ہاں ماسٹر صاحب۔
ماسٹر صاحب :- اچھا چلو پڑھو۔
پرویز :- (بسم اللہ کرکے) جھوٹ کا نتیجہ۔
ماسٹر صاحب :- ذرا ٹھہرو! —— پہلے بتاؤ آج کا سبق نظم ہے یا نثر؟
شمیم :- (جلدی سے) میں بتاؤں ماسٹر صاحب؟
ماسٹر صاحب :- اچھا چلو تم ہی بتاؤ!
شمیم :- نثر۔
ماسٹر صاحب :- شاباش —— اچھا بھئی طارق تم بتاؤ آج کا سبق مضمون ہے یا کہانی؟
طارق :- مضمون۔
ماسٹر صاحب :- پرویز تم بتاؤ طارق ٹھیک کہہ رہے ہیں نا؟
جاوید :- میں بتاؤں ماسٹر صاحب؟
ماسٹر صاحب :- بتاؤ۔
جاوید :- کہانی

ماسٹر صاحب :- شاباش (لڑکوں سے مخاطب ہوکر) سمجھے بچو! آج کا سبق کیا ہے؟
لڑکے :- (ایک آواز ہوکر) کہانی!
ماسٹر صاحب :- یاد رکھو جس سبق میں کوئی واقعہ یا قصہ بیان کیا جاتا ہے اس کو کہانی کہتے ہیں۔
لڑکے :- جی جی۔
ماسٹر صاحب :- اچھا چلو پرویز اب سبق پڑھو!
پرویز :- جھوٹ کا نتیجہ۔
ماسٹر صاحب :- اچھا ذرا یہ تو بتاؤ کہ سبق کے اوپر شروع میں موٹے موٹے حرفوں میں جو عبارت لکھی جاتی ہے اس کو کیا کہتے ہیں؟
جاوید :- آپ نے پرسوں بتایا تھا کہ اسے عنوان یا سرخی کہتے ہیں۔
ماسٹر صاحب :- شاباش۔
پرویز :- (کہانی پڑھتا ہے) خالد ایک ننھا منا بچہ تھا، اسے میٹھی چیزیں بہت پسند تھیں۔ اس کی امی اسے ہر روز کوئی نہ کوئی میٹھی چیز ضرور کھانے کو دیتیں۔ خالد کا جی نہ بھرتا، طبیعت سیر نہ ہوتی۔ ایک دن اس کے ابو جان بازار سے ڈھیر سی مٹھائی لائے۔ مٹھائی دیکھ کر خالد کے منہ میں پانی بھر آیا۔

ماسٹر صاحب :۔ شمیم بتاؤ "منہ میں پانی بھر آیا" کا کیا مطلب ہے ؟

شمیم :۔ خالد نے پانی پی لیا ہوگا۔

ماسٹر صاحب :۔ (مسکرا کر) طارق تم بتاؤ !

طارق :۔ منہ میں تھوک بھر گیا۔

ماسٹر صاحب :۔ (مسکراتے ہوئے) بات تو تم نے ٹھیک ہی کہی مگر اس کا مطلب نہیں سمجھے۔

جاوید :۔ کیا مطلب ہے ماسٹر صاحب ؟

ماسٹر صاحب :۔ دیکھو بھئی کسی چیز کو دیکھ کر منہ میں پانی کیوں بھر آتا ہے ؟

بچے :۔ ماسٹر صاحب اس چیز کو کھا لینے کو جی چاہتا ہے۔

ماسٹر صاحب :۔ ٹھیک سمجھے ! اسی جی چاہنے کو کہتے ہیں لالچ کرنا یا للچانا۔ اچھا تو اب بتاؤ کیا مطلب ہوا ؟

جاوید :۔ مٹھائی دیکھ کر خالد لالچ میں آگیا۔

ماسٹر صاحب :۔ ٹھیک ہے۔ شاباش۔

پرویز :۔ (آگے سبق پڑھتا ہے) خالد کا جی چاہا کہ وہ ساری مٹھائی اکیلے ہی کھالے پر اس کی امی نے روز کی طرح اسے تھوڑی سی مٹھائی دی۔ باقی تمام مٹھائی الماری میں بند کر دی۔ خالد دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ وہ اور مٹھائی کیسے حاصل کرے۔ سوچتے سوچتے ایک ترکیب سمجھ میں آئی۔ اس نے دل میں ٹھان لیا کہ رات میں جب امی سو جائیں گی تو وہ چپکے سے اٹھ کر ساری مٹھائی کھائے گا۔ بس پھر کیا تھا رات میں ادھر اس کی امی سو گئیں اور ادھر خالد نے چپکے سے ساری مٹھائی صاف کر دی۔

ماسٹر صاحب :۔ "مٹھائی صاف کر دی" کا کیا مطلب ہوا ؟

پرویز :۔ سب کھا کر ختم کر دی۔

ماسٹر صاحب :۔ شاباش !

اطہر :۔ ماسٹر صاحب یہ بھی تو محاورہ ہے نا ؟

ماسٹر صاحب :۔ ہاں ہاں یہ بھی محاورہ ہے۔

پرویز : (آگے سبق پڑھتے ہوئے) دوسرے دن صبح اٹھ کر خالد کی امی نے ساری مٹھائی غایب پائی۔ وہ بہت پریشان ہوئیں۔ خالد سے پوچھا بیٹے رات تم نے تو الماری سے مٹھائی نہیں نکالی تھی ؟

خالد نے جواب دیا "میں کیا جانوں امی میں نے تو نہیں نکالی۔"

امّی نے کہا۔ تعجب ہے پھر مٹھائی ہوئی کیا؟
خالد نے کہا۔ امّی کہیں (بانو بلّی) نے نہ کھائی ہو۔
خالد کا یہ جواب سُن کر اس کی امّی مسکرا کر خاموش
ہو گئیں۔ دوسرے دن انہوں نے مٹھائی کے
تھال میں خوب مرچیں لگی ہوئی پکوڑیاں تل کر
رکھ دیں۔ خالد میاں کو تو ایک دن مٹھائی
کھا کر چسکا لگ ہی چکا تھا....

ماسٹر صاحب :۔ چسکا لگ چکا تھا؟
بچے :۔ عادت پڑ گئی تھی۔
ماسٹر صاحب :۔ ٹھیک ہے شاباش۔
پرویز :۔ (اور آگے سین پڑھتے ہوئے) بس پھر کیا تھا
دوسرے دن بھی جب امّی سو گئیں تو خالد چپکے
سے اُٹھ کر مٹھائی چرانے جا پہنچا۔ ارے
یہ کیا؟ ــــ ایک ہی ٹکڑا مُنھ میں رکھ
کر خالد کو چھٹی کا دودھ یاد آگیا۔ اس کی چیخیں
نکل گئیں۔

ماسٹر صاحب :۔ بچو چھٹی کا دودھ یاد آگیا بھی محاورہ
ہے۔ اس کا مطلب ہے بہت زیادہ تکلیف
ہوئی۔ سمجھے نا!
بچے :۔ جی ہاں ماسٹر صاحب سمجھ گیے۔
پرویز :۔ خالد کی چیخ سن کر اس کی امّی جاگ گئیں

دیکھا تو خالد میاں الماری کے پاس کھڑے
سی سی کر رہے ہیں اور ناک اور مُنھ سے
پانی جاری ہے۔ انھوں نے اٹھ کر پہلے تو
اچھی طرح اس کا مُنھ دھلایا پھر تھوڑی
سی مٹھائی کھانے کو دی تب کہیں جاکر ذرا
آرام آیا۔ جب وہ ٹھیک ٹھاک ہو گیے تو امّی
نے پوچھا کہو بیٹے کیا ہوا تھا؟ اب تو خالد میاں
بہت شرمندہ ہوئے اور امّی سے معافی
مانگنے لگے۔ امّی نے خالد کو کلیجے سے لگا لیا
اور کہا۔ میرے لال یہ سب جھوٹ بولنے کا
نتیجہ ہے۔ خالد میاں نے بھی اپنے کان پکڑ
کر وہ اب کبھی جھوٹ نہ بولیں گے۔

(کہانی پڑھ کر سب بچے مسکرانے لگے)

ماسٹر صاحب :۔ (بچوں سے) کہو ہے نا مزیدار کہانی!
لڑکے :۔ (ایک آواز ہو کر) بہت مزیدار، بہت مزیدار
ماسٹر صاحب :۔ ہاں بچو! کہانی تو ہوتی ہی اس لیے
ہے کہ اسے پڑھ کر مزا آئے اور جی خوش ہو۔
مگر یاد رکھو کہانی میں کچھ کام کی باتیں بھی
جاتی ہیں۔ اچھا بتاؤ اس کہانی کو پڑھ کر تم
نے کون کون سی کام کی باتیں سیکھیں؟

اطہر :- میں بتاؤں ماسٹر صاحب!
ماسٹر صاحب :- ہاں ہاں بتاؤ۔
اطہر :- جھوٹ بولنا بُری بات ہے۔
ماسٹر صاحب :- اور؟
شمیم :- جھوٹ بولنے کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔
ماسٹر صاحب : اور؟
جاوید :- اور کیا ماسٹر صاحب؟
ماسٹر صاحب :- اس کہانی کو پڑھ کر سب سے بڑی
جو کام کی بات معلوم ہوتی وہ یہ ہے کہ
"جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے"
دیکھو نا! کس طرح خالد نے ایک جھوٹ بول
کر پانچ بُرے کام کیے۔
پہلا بُرا کام تو اس نے یہ کیا کہ چوری کی۔
دوسرا اپنے آپ کو بچانے کے لیے بچاری بے
قصور بلی بانو پر جھوٹا الزام لگایا تیسرا اپنی امی
کو دھوکا دیا کہ مٹھائی اس نے نہیں کھائی بلی
نے کھائی ہوگی چوتھا اپنی امی کی نافرمانی کی
پانچواں چوری کی مٹھائی کھا کر وہ لالچی بن گیا۔
لڑکے :- (ایک آواز ہوکر) جی ہاں، جی ہاں۔
ماسٹر صاحب :- اور یہ بھی یاد رکھو کہ جھوٹ بولنے سے
آدمی کو بہت سے نقصان بھی اٹھانا پڑتے
ہیں۔ پہلا نقصان تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی نہ کبھی
آدمی کو جھوٹ کی سزا بھگتنی ہی پڑتی ہے۔
جیسے خالد کو کوڑیاں کھا کر سزا ملی۔ دوسرا
نقصان یہ ہوتا ہے کہ جھوٹ بول کر آدمی کو ایک
دن شرمندہ اور ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ تیسرا
نقصان یہ ہوتا ہے کہ جھوٹے آدمی کا اعتبار ختم
ہو جاتا ہے اور کوئی اس کی بات کو نہیں مانتا۔
لڑکے :- جی ہاں، ماسٹر صاحب!
ماسٹر صاحب :- اچھا تو بتاؤ پھر ان باتوں کے جاننے
کا فایدہ کیا ہے؟
لڑکے :- (ایک آواز ہوکر) ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے،
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے۔
ماسٹر صاحب :- ہاں شاباش بچو! جاؤ اس بات کو ہمیشہ
یاد رکھنا اور اپنے اس عہد پر قایم رہنا۔ بلکہ
بہتر تو یہ ہے کہ ایک چوکور دفتی پر یہ عبارت
موٹے موٹے حرفوں میں لکھ کر اپنے کمرے
کی دیوار پر ٹکا دو کہ:
"جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔
اور
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے"
یہ عبارت تمھیں ہمیشہ خالد کی کہانی اور تمھارے

اس عہد کو یاد دلاتی رہے گی۔

لڑکے :۔ بہت اچھا ماسٹر صاحب! بہت اچھا۔

(پردہ گرتا ہے)

دوسرا اسین

گھر میں

وقت .... شام کے ۷ بجے

مقام .... پرویز کا کمرہ

(پرویز پڑھنے کے لیے کرسی پر بیٹھا ہے۔ سامنے میز پر لالٹین جل رہی ہے۔ کتابیں ترتیب سے رکھی ہیں مگر پرویز کسی اور ہی خیال میں گم میز کے نچلے ڈنڈے پر پیر پھیلا۔ کرسی کی پشت سے سر ٹکائے چھت کو گھور رہا ہے اور گنگنا رہا ہے۔)

پڑھنے سے اگر جی گھبرائے ؛ اسکول میں ہم پھر کیوں جائیں
استاد کی جھڑکی کون سہے ؛ بیکار میں ڈنڈے کیوں کھائیں

میدان میں جاکر دوڑیں گے ؛ تالاب میں جاکر تیریں گے
جنگل میں نہائیں گے منگل ؛ پھل باغ میں جاکر توڑیں گے

استاد نے تو کہہ دیں گے ؛ اف درد ہمارے سر میں ہے
گھبرا کے ذرا اک نکلے ہیں ؛ گرمی تو بلا کی گھر میں ہے

گھر جا کے کہیں گے ابو سے ؛ اسکول سے پڑھ کر آتے ہیں
منظور چچا کی موٹر پر ؛ ہم آج تو چڑھ کر آتے ہیں

اک اور الٹی دیجے اب ؛ اک اور ہے الٹا آج ورق
ہم عہد یہ کر کے آتے ہیں ؛ اسکول سے پڑھ کر آج سبق

ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے ؛ ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے ؛ ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے

(مصرعہ بار بار دہراتا ہے اور آواز تیز ہو جاتی ہے۔)

آواز :۔ (جوتوں کی آواز آتی ہے) کھٹ کھٹ کھٹ کھٹاک، کھٹ کھٹ کھٹ کھٹاک۔

(جاوید کمرے میں داخل ہوتا ہے)

جاوید :۔ (غصے سے) پرویز!

پرویز :۔ (چونک کر جاوید کی طرف دیکھتا ہوا ہکلا ہکلا کر) کیا ..... کیا ..... کیا ..... بھائی ..... جان؟

جاوید :۔ تم یہاں بیٹھے الاپ رہے ہو اور ادھر ابو جان ......

پرویز :۔ (اپنے اوپر قابو پاکر بھائی کی بات کاٹ کر) واہ بھائی جان میں الاپ رہا تھا یا پڑھ رہا تھا"

آخر آپ ہر وقت کیوں میرے پیچھے پڑے رہتے ہیں؟

جاوید :- لو آج تم پھر جھوٹ بولے۔ میں کہتا ہوں آخر اس پڑھنے سے کیا حاصل جب آدمی اچھی باتیں جان کر بھی بُری عادتیں نہ چھوڑے۔

پرویز :- (ڈھٹائی سے لڑنے کے انداز میں) واہ بھائی جان جھوٹ میں بول رہا ہوں یا آپ؟ آپ نے مجھے الاپتے سنا ہے؟ میں تو پڑھ رہا تھا۔ (گنگنا کر)

ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے
ہم جھوٹ نہ ہرگز بولیں گے

جاوید :- (مسکرا کر) بس کرو، رہنے بھی دو میں سب سُن چکا ہوں کہ تم کیا پڑھ رہے تھے۔

اُستاد ملے تو کہہ دیں گے
اُف درد ہمارے سر میں ہے

کہو یہی تو تم ہی پڑھ رہے تھے نا!

(پرویز کھسیا کر چپ ہو جاتا ہے اور پیر کے انگوٹھے سے فرش کریدنے لگتا ہے۔)

جاوید :- اچھا چلو چھوڑو اس بات کو میں کہتا ہوں تم نے ابو جان کا قلم کہاں رکھ دیا ہے؟ وہ اس کے لیے گھنٹہ بھر سے پریشان ہیں۔

پرویز :- واہ بھائی جان اب چوری بھی لگائیں گے میں کیا جانوں ابو جان کا قلم!

جاوید :- لو تم ایک بار پھر جھوٹ بولے! میں پوچھتا ہوں آخر تم یہ عادت کب چھوڑو گے؟

پرویز :- (غصے سے) پھر وہی جھوٹ بولنے جھوٹ بولنے کی رٹ لگا رکھی ہے! بتائیے نا میں کیا جھوٹ بول رہا ہوں؟

جاوید :- اچھا تو کیا تم ابو جان کا قلم نہیں جانتے؟

پرویز :- تو کیا میں نے ابو جان کا قلم لیا ہے؟

جاوید :- نہیں لیا ہے؟

پرویز :- نہیں تو۔

جاوید :- دیکھو ابھی تمھارا جھوٹ کھل جاتا ہے۔ میں دیکھ چکا ہوں صبح ہی صبح تم ابو جان کا قلم لا کر بونے والی نظم نقل کر رہے تھے۔ لو دیکھو!

(لپک کر میز سے ایک کاپی اٹھاتا ہے)

اس کاپی پر تم نے بونے والی نظم نیلی روشنائی سے لکھ رکھی ہے۔

بونا

ایک تھا بونا گویا کھلونا
بغل میں اپنے لیے بچھونا
ایک دن چلا سفر کو

باندھے ہوئے کمر کو
بولا کوئی مجھے نہ روکو
دیکھو کوئی مجھے نہ ٹوکو
میں ہوں اپنے من کا
ماہر اپنے فن کا
دیس دیس میں جاؤں گا میں
ڈھیروں پیسے لاؤں گا میں
کھیل کود دکھلاکر * بھید بھاؤ بتلاکر

اب بولو اگر یہ ابو جان کے قلم سے نہیں لکھی ہے
تو پھر نیلی روشنائی تمھیں کہاں سے ملی؟ کہو اب
بھی تمھارے جھوٹے ہونے میں کچھ شک ہے؟

پرویز :۔ (غصے میں تیزی سے) بلئیے جھوٹا ہوں تو کیا
جھوٹ تو سبھی بولتے ہیں۔

جاوید :۔ سبھی کون؟

پرویز :۔ خود ابو جان ....

جاوید :۔ ارے ارے ...... ابو جان کو جھوٹا کہہ رہا ہے
..... توبہ توبہ۔

پرویز :۔ ابھی کل آپ ہی کے تو سامنے کی بات ہے
جب بنارسی لال دودھ کے پیسے لینے آیا تھا
تو ابو جان نے صاف جھوٹ کہہ دیا کہ آج تو
پیسے نہیں ہیں پرسوں آکر لے جانا اور آپ
کو اچھی طرح معلوم ہے کہ ابو کے پاس اس وقت
پیسے موجود تھے۔ آپ نے بھی تو انھیں ٹیبل
میں پیسے رکھتے ہوئے دیکھا تھا۔

(جاوید پرویز کا یہ جواب سن کر اور واقعہ کو یاد کر کے
لاجواب ہو جاتا ہے اور جیسے اس کے منہ پر چپ لگ
جاتی ہے۔)

پرویز :۔ اب بولیے بھائی جان چپ کیوں ہو گئے؟

جاوید :۔ (پریشانی کے ساتھ) پرویز تمھاری بات سن
کر میں کچھ اور سوچنے لگا تھا۔

پرویز :۔ (طنز سے) کیا سوچنے لگے تھے؟

جاوید :۔ (نرمی سے) چھوڑو اسے جانے دو میرے
عزیز بھائی! میں جو تمھیں جھوٹ بولنے پر ٹوکتا
ہوں تو خدانخواستہ میں تمھارا دشمن نہیں بلکہ
یقین جانو مجھے اس سے دلی دکھ ہوتا ہے
کہ یہ بُری عادت میرے پیارے بھائی کو بگاڑ
کر رکھ دے گی۔

پرویز :۔ بھائی جان یہ اگر بُری عادت ہے تو ابو جان
کیوں جھوٹ بولتے ہیں؟

جاوید :۔ یہ تو ابو جان جانیں تمھیں اس سے کیا مطلب
تم تو یہ سوچو کر تم نے کتاب میں کیا پڑھا ہے
اور اسکول میں کیا سیکھا ہے۔

پرویز :- کتاب میں پڑھنے سے کیا ہوا! کیا ابو جان نے نہیں پڑھا ہے؟

جاوید :- (زچ ہوکر) میں تمھیں کیسے سمجھاؤں' میں کہتا ہوں تم نے جو بات پڑھی ہے وہ اگر ٹھیک ہے تو اسے مانو۔ ابو جان نہیں مانتے تو غلطی کرتے ہیں۔

پرویز :- واہ بھائی جان! بھلا ابو جان بھی غلطی کرتے ہیں؟

جاوید :- دیکھو پرویز تم یہ بات اس لیے کہہ رہے ہو کہ تم سمجھتے ہو کہ ابو جان سب سے بڑے ہیں اور وہ کبھی غلطی نہیں کر سکتے۔

پرویز :- تو کیا ابو جان بڑے نہیں ہیں؟

جاوید :- ضرور بڑے ہیں لیکن اللہ میاں تو ان سے بھی بڑے ہیں اور اللہ میاں کا کہنا ہے کہ جھوٹ نہ بولو' جھوٹ بولنا بری بات ہے۔ اب بتاؤ تم اللہ میاں کا کہنا مانوگے یا ابو جان کو دیکھ کر غلط کام کروگے؟

پرویز :- تو کیا ابو جان اللہ میاں کا کہنا نہیں مانتے؟

جاوید :- تمھیں سوچو اگر مانتے ہوتے تو اس دن روپیہ رکھ کر کیوں جھوٹا بہانا کرتے؟

پرویز :- تب آپ ابو جان سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ جھوٹ نہ بولا کریں۔

جاوید :- چاہتا تو ہوں کہ ان سے بھی کہوں مگر سوچتا ہوں کہ میرے ٹوکنے پر جب تم چھوٹے ہوکر اتنا برا مان جاتے ہو تو وہ بڑے ہوکر نہ جانے کتنا برا مانیں۔

پرویز :- پھر کیا ہوگا؟

جاوید :- پرویز! دیکھو میں نے سوچا ہے کہ پہلے تم خود اس بری عادت کو چھوڑ دو۔ پھر کسی ترکیب سے ہم دونوں بھائی مل کر ابو جان کو سمجھائیں گے۔

پرویز :- یہ بات ہے تو بھائی جان! میں سچے دل سے توبہ کرتا ہوں کہ اب کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ بس اب تو چلیے ابو جان کو سمجھائیں کہ وہ بھی جھوٹ نہ بولا کریں۔

جاوید :- ٹھہرو پرویز! ایسے نہیں اس طرح ہمارے کہنے کو تو وہ بے ادبی سمجھیں گے اور ہماری بات پر ذرا دھیان نہ دیں گے۔

پرویز :- پھر کس طرح کہنا ہوگا بھائی جان؟

جاوید :- اس کے لیے کوئی ترکیب کرنی ہوگی۔

پرویز :- (بیتابی سے) وہ کیا بھائی جان؟

جاوید :- وہ تو میں نے سوچ لی ہے مگر تمھیں کل بتاؤں گا۔ لاؤ تم تو اس وقت ابو جان کا قلم دے دو تاکہ میں انھیں دے آؤں وہ اس کے لیے پریشان بیٹھے ہیں۔

پرویز :- (الماری سے قلم نکال کر دیتے ہوئے) مگر وہ ترکیب

کل مجھے ضرور بتایئے۔

(پردہ گرتا ہے)

تیسرا سین

(ایک سبق)

وقت .... شام کے ۵ بجے

مقام .... رشید کا مکان

(رشید اپنے کمرے میں لیٹے کوئی کتاب دیکھ رہے ہیں۔ باہر صحن کے حوض پر جاوید اور پرویز بیٹھے ہوئے کاغذ کی ناؤ بنا کر تیرا رہے ہیں ساتھ ہی ساتھ دونوں بھائی گنگنا بھی رہے ہیں۔)

اڈا ہوا دھارا ہے　　ناپید کنارا ہے
مانا کہ ابھی بازو　　کمزور ہمارا ہے
پر خوف نہ کھائیں گے
ہم ناؤ چلائیں گے

گھنگھور گھٹائیں ہیں　　پر شور ہوائیں ہیں
طوفان بلا کا ہے　　تاریک فضائیں ہیں
ہم دیپ جلائیں گے
ہم ناؤ چلائیں گے

پتوار نہ چھوڑیں گے　　رخ موج کا موڑیں گے
ساحل پہ پہنچنے کی　　ہم آس نہ چھوڑیں گے
ہم جان لڑائیں گے
ہم ناؤ چلائیں گے

دریا کی روانی میں　　بپھرے ہوئے پانی میں
بل کھاتی ہوئی کوثر　　لہروں کی جوانی میں
ہم آگ لگائیں گے
ہم ناؤ چلائیں گے

آواز :۔ (دروازے سے بنارسی لال پکارتا ہے) بابو جی! بابو جی!!

(آواز سن کر رشید کمرے سے نکل کر صحن میں آجاتے ہیں اور پرویز سے آہستہ سے کہتے ہیں)

رشید :۔ دیکھو بیٹے، باہر شاید بنارسی لال پکار رہا ہے جاؤ اس سے کہہ دو کہ ابو جان گھر پر نہیں ہیں۔

(یہ کہہ کر رشید پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں پرویز جانے کے لیے اٹھتا ہے۔ جاوید اس کے پیروں کی انگلی دبا کر روک لیتا ہے اور آہستہ سے اس سے کہتا ہے)

جاوید :۔ دیکھو پرویز اب موقع آگیا ہے۔ میں نے کل تم سے ترکیب بتانے کے لیے کہا تھا ترکیب یہ ہے کہ تم بنارسی لال سے اسی طرح کہنا کہ ابو کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔

پرویز :۔ (حیرت سے) اس سے کیا ہوگا؟

جاوید :۔ ارے بھائی تم جاؤ اسی طرح کہہ دینا! پھر دیکھو کیا ہوتا ہے۔

پرویز :۔ (دروازے پر پہنچ کر) بنارسی لال! ابو جان

کہہ رہے ہیں کہ ابو جان گھر پر نہیں ہیں۔

بنارسی لال۔ ہو ہو ہو (ہنستا ہے) بابو! جاؤ ابو جان سے کہہ دو کہ بنارسی لال ہاتھ جوڑتا ہے اور اپنے پیسے مانگتا ہے۔

پرویز:۔ (واپس آکر) ابو جان! ابو جان!!

رشید:۔ کیا ہے بیٹے، بنارسی لال چلا گیا؟

پرویز:۔ نہیں وہ تو ہاتھ جوڑ رہا ہے اور اپنے پیسے مانگ رہا ہے۔

رشید:۔ (حیرانی سے) تم نے اس سے کیا کہا تھا؟

پرویز:۔ (بناوٹی بھولپن سے) میں نے اس سے کہا تھا کہ ابو جان کہہ رہے ہیں کہ وہ گھر پر نہیں ہیں

رشید:۔ (غصے سے دانت پیس کر) کمبخت گدھا کہیں کا!

(اٹھ کر باہر جاتے ہیں پیچھے پیچھے جاوید اور پرویز بھی دروازے پر آجاتے ہیں۔)

رشید:۔ (بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ) بھئی بنارسی لال معاف کرنا میں اپنے کمرے میں تھا اور بچوں کو پتہ نہ تھا وہ سمجھے شاید میں گھر پر نہیں ہوں اس لیے نہ جانے کیا الٹی پلٹی بات تم سے آکر کہہ دی۔

بنارسی لال:۔ کوئی بات نہیں بابو جی! لائیے میرے پیسے دلا دیجیے، مجھے بڑی ضرورت ہے ورنہ تقاضہ نہ کرتا۔

رشید:۔ وہ تو ہے ہی، اور میں نے خود بھی تو آج تمہیں بلایا تھا لیکن کیا کروں اتفاق کی بات ہے کہ آج بھی گھر پر پیسے نہیں۔۔۔۔۔۔

جاوید:۔ (بات کاٹ کر) ابو جان! شاید آپ بھول گئے اس دن جو ڈیسک میں آپ نے پیسے رکھے تھے وہ تو موجود ہیں۔ ٹھہریے میں انھیں لئے آتا ہوں۔

(دوڑ کر گھر میں جاتا ہے اور پیسے لاکر رشید کو دیتا ہے)

رشید:۔ (اندر سے جل بھن کر مگر ظاہر میں ہنستے ہوئے) ارے سچ بیٹے میں تو ان پیسوں کو رکھ کر بالکل ہی بھول گیا تھا۔ اچھا لو بنارسی تمھارے کتنے پیسے ہوتے ہیں؟

بنارسی لال:۔ سات روپے آٹھ آنے بابو جی۔

رشید:۔ (گن کر دیتے ہوئے) لو دیکھو ٹھیک ہیں نا؟

بنارسی لال:۔ (پیسوں کو لے کر) ہاں ہاں ٹھیک ہیں بابو جی۔۔۔۔۔۔ اچھا سلام۔

(چلا جاتا ہے)

رشید:۔ (غصے سے) جاوید، پرویز! چلو ادھر آؤ!

(دونوں ساتھ ساتھ کمرے میں آجاتے ہیں۔)

رشید:۔ (بگڑ کر) تم لوگ کتنے بڑے گدھے ہو، آخر تم لوگوں کو سمجھ کب آئے گی!

جاوید:۔ (سادگی سے) کیا ہوا ابو جان؟

رشید :- مجھے ان پیسوں کی ضرورت تھی۔ میں آج نہالکی کو پیسے نہیں دینا چاہتا تھا اسی لیے تو کہلایا تھا کہ جاکر کہہ دو کہ ابو جان گھر پر نہیں۔ مگر تم لوگوں نے سارا کھیل بگاڑ دیا اور مجھے رسوا اوپر سے کرایا۔

جاوید :- (ادب کے ساتھ) ابو جان یہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی کہ اسکول میں تو ہمیں پڑھایا جاتا ہے کہ جھوٹ کبھی نہ بولو کیونکہ یہ بہت بڑا گناہ ہے اس سے آدمی دنیا میں بھی ذلیل ہوتا ہے اور اللہ میاں کے یہاں بھی اور آپ ہمیں گھر میں سکھاتے ہیں کہ جھوٹ بولو کیوں کہ اسی سے کام بنتا ہے ۔۔۔۔

پرویز :- ہاں ابو جان! چاہے آپ ہمیں جو چاہیں سزا دے دیں لیکن یہ آج اچھی طرح سمجھا دیں کہ کونسی بات ٹھیک ہے۔ اگر آپ کی بات کی بات ٹھیک ہے تو پھر ہمیں اسکول نہ بھیجیے ہم وہاں پڑھ کر کیا کریں گے اور اگر اسکول کی بات ٹھیک ہے تو پھر آپ ہمیں گھر میں ایسا سبق نہ دیجیے اس سے تو ہم بہت بڑے بن جائیں گے۔

(رشید محو ہوکر بچوں کی یہ باتیں سنتے ہیں اور پھر لپک کر دونوں کو سینے سے لگا لیتے ہیں)

رشید :- میرے عزیز بچو! خدا کا شکر ہے کہ تم نے آج میری آنکھیں کھول دیں۔ افسوس! میں بھی کتنی بھول میں تھا اور مجھے پتہ نہ تھا کہ میرے خدا نے مجھے کتنی بڑی دولت دے رکھی ہے جسے میں نادانی میں خود اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر رہا ہوں۔

میرے لایق اور ہونہار بچو! مجھے معاف کر دو! میں تمھارا قاتل بن گیا تھا اور تمھاری عادتیں بگاڑ رہا تھا۔ مگر میں آج خدا کو گواہ بنا کر عہد کرتا ہوں کہ اب انشاء اللہ تمھارے اسکول اور تمھارے گھر کا سبق ایک ہی ہوگا۔

جناب
احسن رضوی
دانا پوری

گورخر

میں تو گھوڑا بنتے بنتے بس گدھا سا ہو گیا
گھانس کھا کر سوچ بھی سکتا نہیں کیا ہو گیا

عقل چرنے کو گئی رخصت ہوئے ہوش و حواس
ایسا بگڑا ہوں کہ بننا کچھ نہ آیا مجھ کو راس

بگڑے جب تقدیر پھر کوئی ادا بھاتی نہیں
اندھی دنیا کو مری صورت نظر آتی نہیں

چال بھی موزوں ہے میری اور پھرتیلا بھی ہوں
کیا کہوں جب غور کرتا ہوں کہ کیا گھوڑا بھی ہوں

جسم پر ہیں خوشنما کیا کالی کالی دھاریاں
حاشیہ چھوڑی ہوئی جیسے کشیدہ کاریاں

مشق کی تختی پہ جیسے ڈال دیں خط اہلِ فن
دیکھیے کتنا بھلا لگتا ہے میرا بانکپن

یہ تو سب کچھ ہے مگر جیسا ہوں میں ویسا نہیں
گورخر کا گورخر ہوں کیا کہوں گھوڑا نہیں

روضۂ مقدسہ کے اندر چھوٹا سا سنگِ مرمر کا حوض ہے۔ اس کی شکل محراب جیسی ہے۔ کہتے ہیں اس جگہ سیدہ فاطمہ زہرا کا مکان تھا۔ دراصل مرقد مبارک یہی ہے۔

مسجد کے بیچ میں ایک تہہ خانہ ہے۔ اس پر ایک گول ہموار ڈھکنا ہے۔ اس میں سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کا سلسلہ حضرت ابوبکرؓ کے مکان تک چلا جاتا ہے۔ اسی تہہ خانے سے حضرت عائشہ صدیقہ اپنے باپ کے گھر تشریف لے جایا کرتی تھیں۔

حضرت ابوبکرؓ کے مکان کے سامنے حضرت عمرؓ اور عبداللہ ابن عمرؓ کے مکان ہیں۔

مسجد النبی سے پورب کی طرف حضرت مالک بن انسؓ کا مکان ہے۔ باب السلام کے قریب ایک سقایہ ہے۔ اس میں اترنے کے لیے زینہ ہے نیچے نہر زرقا بہتی ہے۔

مسجد کی آرائش و زیبائش حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوئی اور وقتاً فوقتاً اسے بڑھایا بھی گیا حضرت عثمانؓ اپنی خلافت کے زمانے میں سارا سارا دن قلعی اور چونے میں گزار دیتے تھے۔ پتھر کے ستون بنے، لوہے اور رنگ سے انھیں مضبوط کیا۔ ساگون کی لکڑی کی چھت اور محراب بنائی۔

کہتے ہیں پہلا شخص مروان ہے جس نے چونے اور پتھر کی محراب بنائی کچھ لوگ کہتے ہیں۔ ولید کی حکومت میں حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے محراب بنائی تھی اور مسجد کو وسیع اور خوب صورت کیا تھا۔ تمام کام ساگون کی لکڑی سے تیار کرایا۔ سنگ مرمر لگایا اور اس پر سونا چڑھایا۔

ولید نے شاہ روم سے بھی مسجد کی تعمیر میں مدد مانگی تھی اور لکھا تھا کہ مسجد کو ایسا بنانا چاہتا ہوں کہ دنیا میں جواب نہ ہو۔ شاہ روم نے اکیاسی من پندرہ سیر سونا

سجانے کے لیے بھیجا تھا جس سے مسجد کو جگمگا دیا گیا۔
شاہِ روم نے یہ بھی لکھا تھا کہ رسول اللہ کی بیویوں کے
مکان خرید کر مسجد میں شامل کر لیے جائیں تو مسجد کی وسعت
بڑھ جائے گی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مکانات خرید کر مسجد
میں شامل کر لیے۔ کچھ دنوں بعد المہدی نے مسجد کو بڑھایا۔
ولید کے زمانے میں مسجد کی لمبائی دو سو گز تھی المہدی نے
سو گز بڑھا کر اسے تین سو گز کر دیا۔ اس کے بعد ملک
منصور نے باب السلام کے قریب ایک وضو خانہ بنایا جس
کے چاروں طرف حجرے ہیں اور جن سے ہر وقت پانی
مہیا ہوتا رہتا ہے۔ ملک منصور کا ارادہ مکہ معظمہ میں بھی
ایسا ہی وضو خانہ بنانے کا تھا مگر حسرت دل میں رہی
اور وفات ہو گئی۔

مسجد کا رخ قطعی کعبے کی طرف ہے۔ کہتے ہیں کہ
سرکارِ دو عالم جس وقت مسجد کی سمت متعین فرما رہے تھے
خدا کے مقرب فرشتے حضرت جبریل بتاتے جاتے
تھے۔ حضرت جبریل نے اشارہ کیا تمام پہاڑ، در و دیوار
اور کعبے کے بیچ کی سب چیزیں جھک گئیں کعبہ سامنے نظر
آنے لگا اسے دیکھ کر سمت کا صحیح تعین کر دیا گیا۔

مسجد کے خادم کالے کلوٹے حبشی بھی ہیں اور حسین و
خوش رو بھی ہیں۔ ان کے امیر کو شیخ الخدام کہتے ہیں۔
بڑے بڑے امیروں جیسی زندگی گذارتے ہیں اور مصر و شام
کی حکومتیں انھیں وظیفہ دیتی ہیں۔

اذان دینے والوں کے سردار

اذان دینے والوں کے سردار مضافات مصر کے
رہنے والے ہیں۔ فاضل محدث جمال الدین نام ہے۔ ان
کے دو بیٹے بھی مجاور ہیں۔

مسجد النبی کے مجاوروں میں ایک بزرگ بے حد
عبادت گزار ہیں میں نے جب انھیں خانہ کعبہ میں دیکھا
تھا تو سب سے زیادہ کعبے کا طواف ہی کرتے تھے۔ سخت
گرمی اور تپش کی وجہ سے سیاہ پتھر کا فرش اتنا گرم ہو جاتا
تھا کہ پاؤں رکھنا دشوار ہو جاتا تھا۔ پانی ڈالتے تھے
تو جیسے آگ پر پانی کی آواز چھن سے نکلتی ہے اور پانی
آن کی آن میں سوکھ جاتا ہے یہی حال کعبے کے اطراف
کی زمین کا تھا مگر یہ بزرگ اس حال میں بھی اطمینان
سے طواف کرتے رہے۔

ایک دفعہ ہمت باندھ کر میں نے ان کا ساتھ دیا
مگر ایک چکر بھی پورا نہ ہو سکا حجر اسود کو چومنا چاہا تو آگ
کی سی لپٹیں نکل رہی تھیں۔ مجبوراً کمبل ڈالتا جاتا تھا
اور پاؤں بڑھاتا جاتا تھا۔ ان بزرگ کا نام ابوالعباس
احمد بن محمد ہے۔

بقیع :- بقیع جسے جنت البقیع کے نام سے لوگ پکارتے ہیں۔ مدینہ پاک سے پورب کی طرف بستی سے باہر ہے۔ اس میں مہاجرین، انصار، رسول اللہؐ کے عزیزوں ازواج مطہرات اور بعض اکابر بزرگوں کے مزار ہیں۔ بہت لمبا چوڑا قبرستان ہے۔

گنبد والے مزار :-

حضرت صفیہؓ رسول اللہ کی پھوپھی کا مزار، امام الہجرۃ حضرت مالک بن انس، جن کی مذہب مالکیہ کی وجہ سے شہرت ہوئی۔ رسول اللہ کے فرزند سیدنا ابراہیمؓ کی قبر، ازواج مطہرات کے مزار، حضرت عباسؓ، سرکارِ دو عالمؐ کے چچا کا مزار، حضرت عثمانؓ، حضرت امام حسنؓ کے مزار۔

بغیر گنبد کے مزار :-

عبدالرحمن بن عمر بن الخطابؓ، عقیل بن ابی طالبؓ۔ مہاجرین و انصار کے مزار جن کے نام معلوم نہ ہوسکے عبداللہ بن جعفر طیار، فاطمہ بن اسد، حضرت علی کی والدہ ماجدہ۔

مسجد قبا :-

یہ مسجد اسلام میں پہلی مسجد ہے۔ مدینہ پاک سے دو میل پچھم کی طرف نخلستان سے گذر کر جاتے ہیں۔

مسجد کے ساتھ وہ کنواں ہے جس کا کھاری پانی رسول اللہ کے لعاب دہن سے میٹھا ہوگیا ہے۔ اسی کنویں میں حضرت عثمانؓ کی مہر خلافت گر گئی تھی اور ڈھونڈنے پر نہیں ملی تھی۔

مسجد کے بیچ میں وہ جگہ ہے جہاں رسول اکرمؐ کی اونٹنی بیٹھ گئی تھی۔ لوگ یہاں برکت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتے ہیں اس کے پچھم کی طرف ایک مکان ہے جسے حضرت ایوب انصاریؓ کا بتایا جاتا ہے۔

اُحد کا پہاڑ :-

مدینہ کے شمال کی طرف تقریباً ڈیڑھ میل پر اُحد کا پہاڑ ہے یہاں سید الشہداء حضرت حمزہؓ اور دوسرے شہیدوں کے مزار ہیں جو اُحد کی جنگ میں شہید ہوئے تھے۔

اُحد کے راستے میں مسجد علیؓ، مسجد سلمان فارسی بھی ہے۔ وہ مسجد بھی ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سورۂ فتح نازل ہوئی تھی۔

مدینہ منورہ میں میرا قیام چار دن رہا۔ رات کو مسجد میں کچھ لوگ کلام پاک کی تلاوت میں مصروف رہتے تھے۔ کچھ روضۂ پاک کو دیکھتے رہتے۔ کچھ اللہ اللہ کرتے رات بھر شمعیں روشن رہتی ہر طرف سے درود و سلام کی اور خوش آواز لوگوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ (باقی آئندہ)

جناب مسعود النبی خاں امروہوی

گولیوں کا ناچ

آپ نے بہت سے جادوگروں کو طرح طرح کے شعبدے دکھاتے دیکھا ہوگا اور انھیں دیکھ کر آپ حیران بھی رہ گئے ہوں گے۔ اگر چھوٹے منہ کی بوتل میں انڈا ڈال دیا جائے، سفید کاغذ کو پانی میں ڈالتے ہی اس پر خوب صورت سا پھول بن جائے، سفید سفید گولیاں گلاس میں بھرے پانی میں ڈالتے ہی ناچنا شروع کر دیں۔ ایک چھوٹی شیشی میں بھرا پانی سامنے رکھے ایک برتن میں شیشی کو ڈبوتے ہی لال ہو جائے لیکن دوسرے برتن میں ڈبوتے ہی وہ پھر اپنی پہلی حالت میں آ جائے یا اسی طرح کے اور بہت سے دوسرے کھیل دیکھ کر یقیناً آپ اچنبھے میں پڑ جائیں گے۔

لیکن اگر ہم آپ کو ان کی اصلیت سے آگاہ کر دیں تب؟ تب تو آپ بھی ان کھیلوں کی تھوڑی سی مشق کر کے خود بھی جادوگر بن جائیں گے اور ایسے کھیلوں سے دوسروں کو حیرت میں ڈال دیں گے۔ اگر آپ جادوگر بننا پسند کریں گے تو ہم اس مستقل عنوان "کرو

دیکھو اور دکھاؤ" کے تحت اسی طرح کے اچھے اچھے
اور دلچسپ کھیل پیش کیا کریں گے۔
آئیے آج ہم آپ کو بے جان گولیوں کا
ناچ دکھائیں۔ اچھا تو پھر چیزیں جمع کر لیجیے —
۱۔ شیشے کا ایک بڑا گلاس ۲۔ ایک چمچہ ۳۔ ایک
پچکاری ۴۔ کپڑا دھونے کا سوڈا ۵۔ شورے
کا تیزاب ۶۔ پانی ۷۔ کپڑوں میں رکھنے والی
سفید سفید فینو تھلین کی ۳ یا ۴ گولیاں۔
ان سب چیزوں کو ایک میز پر سجا لیجیے۔
بڑے گلاس میں ۳/۴ حصہ پانی بھر کر بیچ میں
سامنے کی طرف رکھ لیجیے۔ سوڈا، تیزاب، گولیاں
اور دوسری چیزیں میز پر ایک طرف داہنے
ہاتھ کے پاس رکھ لیجیے۔ بس اب کھیل تیار ہے۔
اب اپنے ساتھیوں کو بلا کر دکھا سکتے ہیں۔ اپنے
ساتھیوں کو گولیاں دکھلائیے اور کہیے کہ یہ
بے جان گولیاں شیشے کے جادوئی گلاس میں
ڈالتے ہی ناچنا شروع کر دیں گی۔ آپ کے
بہت سے ساتھیوں کو مشکل سے یقین آئے گا۔
آپ اپنی باتوں کے دوران ہی دو تین چمچہ جادوئی
سفوف (کپڑا دھونے کا سوڈا) گلاس کے پانی
میں ملا دیجیے۔ اس کے بعد گلاس میں گولیاں
ڈال کر پچکاری کی مدد سے چار پانچ بوندیں شورے
کے تیزاب کی احتیاط سے ڈال دیجیے۔ دھیان
رکھیے کہ شورے کا تیزاب جسم کے کسی حصے کو نہ
لگنے پائے ورنہ اس حصے کے جلنے کا اندیشہ ہے۔
تیزاب ڈالتے ہی گولیاں اوپر نیچے بڑی تیزی
سے ناچنا شروع کر دیں گی۔ آپ کے ساتھی
حیران رہ جائیں گے جیسے ہی ناچ میں سستی
پیدا ہو آپ تھوڑا سا سوڈا اور دو تین قطرے
تیزاب اور ڈال دیجیے ناچ پھر شروع ہو
جائے گا۔ کھیل ختم کرنے پر گولیوں کو گلاس
سے نکال کر پانی سے دھو کر جاذب سے سکھا
کر روئی میں لپیٹ کر کسی ڈبیہ میں رکھ لیجیے۔
تاکہ دوبارہ کام آسکے۔ گلاس کا پانی پھینک
دیجیے۔

ہے نا دلچسپ کھیل؟ اب دو تین
بار اس کی مشق کر دیکھیے اور پھر دوسروں
کو دکھا کر اپنی جادوگری کا رعب جمائیے۔
اگر کوئی پریشانی ہو تو فوراً ہمیں لکھ بھیجیے۔
فوراً دور کر دی جائے گی۔

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

صبح کو جب ہماری آنکھ کھلی تو معلوم ہوا ہمارا جہاز چل رہا ہے اور ہم سمندر کے بیچ میں ہیں۔ زمین کا کہیں نام نشان نہیں۔ معلوم ہوا کہ صبح چار بجے سے چل رہے ہیں اور اب تک کوئی تیس میل کا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔

ٹوٹی کورن سے ہمارا جہاز اب کوچین کی طرف جا رہا ہے یہ دو سو میل کا سفر ہے اور ہم ۲ جون کو قریب ۶ بجے صبح کوچین میں ہوں گے۔ آج ۱ جون ہے۔ دن بھر سمندر کی حالت ٹھیک رہی کوئی خاص بات پیش نہیں آئی۔ راستے میں ہمیں دو ایک جہاز ملے جو شاید بمبئی سے کولمبو جا رہے تھے۔ دن بھر کتابیں دیکھنے اور گپیں ہانکنے میں مصروف رہے۔

ہم دن بھر ہندوستان کے مغربی ساحل کے کنارے چلتے رہے اور ہمیں ہندوستان کا مغربی ساحل برابر نظر آرہا تھا لیکن ہم زمین سے چار میل دور چل رہے تھے۔ کوئی بارہ بجے دن کے ہمارا جہاز ہندوستان کی زمین کے بہت نزدیک آگیا اور ہم نے دیکھا کہ کنارے پر کافی اونچے اونچے پہاڑ ہیں اور جہاں پہاڑ ختم ہوتے ہیں اور سمندر شروع ہوتا ہے اس کے درمیان کافی ریت بھی ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ہم کیپ کامرین Cape Comorin سے گذر رہے ہیں۔ یہ جنوب میں ہندوستان کا آخری حصہ ہے۔

نقشے میں تو اس جگہ کو کئی مرتبہ دیکھا کتابوں میں بھی پڑھا تھا لیکن آج خوشی اس بات کی ہے کہ آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ پہاڑوں کے نزدیک ہمیں کوئی گاؤں سا بھی دکھائی دیا۔ کچھ جھونپڑیاں نظر آتی تھیں۔

ہمیں جہاز کے ایک افسر نے بتایا کہ یہ ریت کسی زمانے میں جہازوں میں بھر کر انگلستان لے جائی جاتی تھی کیونکہ اس میں عجیب عجیب دھاتیں پائی جاتی تھیں۔ یہ ہمارے لیے کوئی تعجب کی بات تو تھی نہیں۔ نہ جانے ہندوستان سے کیا کیا چیزیں یہ انگریز لے گیے اور اسی کی بدولت مالامال

ہو گیے۔

خیر اسی طرح ہمارا جہاز کنارے سے دور چلتا رہا اور زمین ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہی۔ دن بھر اسی طرح دیکھتے دکھاتے رہے۔ جب رات آئی تو پڑ کے سو رہے جب صبح کو آنکھ کھلی تو معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز کوچین کے نزدیک کھڑا A102 کا انتظار کر رہا ہے۔ تھوڑی دیر میں A104 صاحب بھی تشریف لے آئے اور ہمارا جہاز آہستہ آہستہ کوچین کی بندرگاہ کی طرف چلنے لگا۔

ہمیں معلوم ہوا کہ ساحل ایک جگہ سے کچھ کٹا ہوا ہے اور سمندر کا پانی زمین کے اندر تک چلا گیا ہے۔ ہم نے جو اٹلس (Atlas) میں دیکھا تو معلوم ہوا کہ کوچین کا بندرگاہ قدرتی بندرگاہ ہے اور سمندر کے ساحل کے متوازی اندر بھی دونوں طرف سمندر چلا گیا ہے۔ شمال کی طرف سمندر کوئی بیس میل اندر گیا ہوگا مگر جنوب کی طرف کم سے کم تیس میل۔ ہم جوں جوں کوچین کی بندرگاہ کے نزدیک ہوتے جاتے تھے بندرگاہ کی عمارتیں اور بھی صاف نظر آتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہمارا جہاز بندرگاہ تک پہنچ گیا اور ایک جگہ جا کر کھڑا ہو گیا۔

اس مرتبہ بھی جہاز ساحل سے دور کھڑا تھا یہی کوئی ۱۰۰ گز دور ہوگا۔ ہماری خواہش تھی کہ بندرگاہ سے لگ کر کھڑا ہو اور ہم جہاز سے سیدھے زمین پر جا سکیں لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ کنارے پر سمندر کم گہرا تھا جہاز وہاں نہیں جا سکتا تھا۔

منظر کے لحاظ سے کوچین کا بندرگاہ کولمبو کے بندرگاہ سے زیادہ خوب صورت ہے کولمبو سے چھوٹا ہے۔ زمین کے نزدیک پانی کے اندر کئی جزیرے ہیں جن پر عمدہ عمدہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔

ساحل بہت کٹا کٹا سا ہے اس لیے اس سے پورا فایدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہاں بھی ہم نے کئی جہاز دیکھے اور کئی موٹر کشتیاں۔ جہاز رکتے ہی پھر وہی پائلٹ ڈاکٹر اور کسٹم والے آموجود ہوئے۔ یہ لوگ ہمیشہ جہاز کے پیچھے لگے رہتے ہیں اور انتظار کرتے رہتے ہیں۔ جیسے ہی کوئی جہاز آیا اور یہ پہنچے۔ جب تک یہ لوگ معائنہ نہ کرلیں اس وقت تک دوسرے لوگوں کو جہاز سے اترنے چڑھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ چونکہ ہم پھر ہندوستان آگیے تھے اس لیے پھر ہمارا ڈاکٹری معائنہ ہوا۔ معائنہ وغیرہ ہو گیا تو ہم لوگ سیدھے ہی کشتی میں بیٹھ کر زمین پر پہنچے اور میں تو سیدھا کسٹم کے دفتر گیا۔ یہاں مجھے گوون برادرس کا تار مل گیا تھا جس میں انہوں نے ریزرو بینک کے نمبر بھیج دیے تھے مجھے یہ نمبر کسٹم کے دفتر میں دکھا کر ڈالر یا پونڈ میں [illegible] کرانے تھے۔ وہاں انہوں نے بتایا کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔ جب آپ کے پاس پیسہ یا

اجازت نامہ موجود ہے تو پھر کس کا ڈر۔ دیکھا تم نے کلکتہ کسٹم
کے دفتر اور کوچین کے دفتر میں فرق۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ
کلکتہ والے کی نیت کچھ خراب تھی۔ خیر یہاں سے سیدھے ہم
لوگ ڈاک خانے پہنچے اور اپنے خط ڈاک میں ڈالے۔ دوسری
ڈائری بھی ہم نے تمھیں کوچین سے ہی بھیجی تھی وہ بھی مل گئی
ہوگی۔ ہمیں واپس جلد ہی جہاز پر لوٹنا تھا اس لیے ہم شہر
دیکھنے کی خواہش کم رکھتے تھے، پھر بھی شہر کا جو حصہ ڈاکخانہ
اور کسٹم جیٹی کے درمیان ملا اسے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ
شہر اچھا خاصا ہے۔ سڑکیں پختہ نہ تھیں لیکن درخت بڑے
خوشنما تھے۔ سمندر کے ساحل پر مچھلی پکڑنے کے بڑے بڑے
جال بلیوں کے ذریعے پانی میں ڈال رکھے تھے۔ ڈاک خانہ
سے لوٹتے وقت ہم ایک دو دکانوں پر بھی گیے اور چیزیں
دیکھنے لگے۔ یہاں سیلون کے ہاتھیوں کی جگہ ہاتھی دانت
کا بہت کام تھا۔ قیمت بھی بہت زیادہ نہ تھی۔ ہمارے
خان برادرس نے ایک مجسمہ خریدا جو تقریباً ۵ انچ لمبا ہوگا
کوئی ۸½ روپے دیے۔ بس اس کے بعد ہم جہاز پر لوٹ گیے۔

اس وقت تک جہاز پر لادنے کے لیے کوئی سامان
نہیں آیا تھا۔ کوئی ۵ بجے کے قریب سامان آیا اور رات
کے ۸ بجے تک لدتا رہا۔ نو بجے ہمارا جہاز پھر کوچین
سے عدن کے لیے روانہ ہوگیا۔ کوچین سے عدن کا سفر
کوئی ایک ہفتے کا ہے۔ یہ فاصلہ تقریباً ۲۰۰۰ میل ہے
دیکھیے کب عدن پہنچتے ہیں اور راستے میں کیا لطف آتا
ہے۔ اب رات کے ۱۰ بجے ہوں گے نیند آرہی ہے۔ اچھا
خدا حافظ

رات کو جو سوئے تو صبح کو اٹھے آج ۵ رجون ہے
اور ہفتہ کا دن۔ صبح سے آسمان پر کافی بادل چھائے ہوئے
ہیں۔ یہ بادل دھیرے دھیرے بڑھتے گیے اور اتنے
بڑھے کہ کہرا سا معلوم دینے لگا۔ جہاز پر ہم کوئی دس گز سے
زیادہ دور نہیں دیکھ پاتے تھے۔ ایسی حالت میں جہاز کے
لیے بہت خطرہ ہوتا ہے، مبادا کوئی جہاز سامنے سے
آجائے اور ٹکر ہو جائے۔ اس لیے ایسی حالت ہوتی ہے
تو جہاز برابر سیٹی بجاتا رہتا ہے تاکہ سامنے سے کوئی جہاز
آرہا ہو تو معلوم ہو جائے۔ بادل جب کافی گھر گیے تو پھر
بارش شروع ہوئی۔ کیا کہنے بھائی واہ واہ خوب مزہ آرہا تھا۔
ہر طرف یہی معلوم ہوتا تھا گویا بارش کا سمندر ہے اور جہاز
اندر سے گذر رہا ہے۔ بارش بھی کافی زور کی تھی۔ کوئی
۳-۴ گھنٹے تک رہی اور اس وقت تک یہی سماں رہا۔
بارش کے ساتھ ساتھ جب بجلی چمکتی تھی تو دل دہل جاتا
تھا۔ خدا کی پناہ کیا آواز ہوتی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے جہاز
پر ہی گری ہے اور بجلی کا شعلہ بھی کافی روشن دکھائی دیتا
تھا۔ اس طرح کافی دیر تک بارش ہوتی رہی اور بجلی چمکتی
رہی۔ بجلی کی چمک اور اس کی ڈراونی آواز نے سارا مزہ کرکرا

کر دیا۔ شام کے وقت موسم کچھ بدلنے لگا لیکن رات کو
پھر وہی حالت ہو گئی۔ ایک بجلی تو اتنے زور سے اتنے
نزدیک گری کہ ہم لوگ کانپ اٹھے۔ اس دن کھانا کھاتے
وقت ہم نے کپتان سے پوچھا کیسے صاحب بجلی کے لیے
جہاز سے بہتر کیا نشانہ ہو سکتا ہے۔ وہ ہنسے اور فرمانے
لگے جی جناب جہاز پر بجلی گرنے سے کوئی نقصان نہیں ہوتا
اگر خدا نخواستہ بجلی گرے بھی تو وہ نیچے پانی میں سے گذر
کر زمین میں چلی جائے گی۔ بجلی اس جگہ نقصان کرتی ہے
جہاں اسے زمین کی بجلی سے ملنے کا موقع نہ ملے جیسے چھت
وغیرہ وہاں وہ زمین کی بجلی سے ملنے کے لیے چھت پھاڑ
کر زمین تک پہنچتی ہے۔ کپتان نے جب یہ بات بتائی تو ہمیں
ذرا تسلی ہوئی۔

شام کو ہم نے ایک اڑنے والی مچھلیوں کا غول
بھی دیکھا تھا۔ یہ غول سمندر کے پانی پر چھلانگیں مارے
چلا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر اڑتا اور پھر پانی میں ڈوب جاتا۔ پھر
اڑتا اور پھر ڈوبتا اسی طرح ڈوبتا اچھلتا چلا جاتا تھا۔ پوچھنے
پر معلوم ہوا کہ جب مچھلیوں کے پر ہوا میں اڑنے سے سوکھ
جاتے ہیں تو وہ اپنے پروں کو تر کرنے کے لیے پھر پانی
میں کود پڑتی ہیں۔ یہ مچھلیاں اسی وقت تک اڑ سکتی ہیں
جب تک ان کے پر تر رہتے ہیں۔ دیکھئے خدا کی قدرت!
آج رات کو بھی پانی برستا رہا، بجلی چمکتی رہی لیکن دن
کے مقابلے میں کم۔ خیر ہم تو خوب سوتے ہیں۔ نیند آنے
کے بعد چاہے جو کچھ ہو۔ ہاں ایک بات تو بھول ہی گیے!
دن میں ہمیں مطلع کیا گیا تھا کہ آج شام کو چار بجے خطرے کا
بھونپو بجے گا۔ آپ سب لوگ اپنی اپنی لائف بیلٹ
کسے ہوئے اپنی کشتی پر پہنچ جائیں۔ ہم نے کہا یہ تو ایک
اور آفت بیٹھے بٹھائے آگئی۔ جب ۴ بجے تو میں نے اپنی
بیلٹ کس لی اور تیار ہو بیٹھا۔ میرے دوست مذاق اڑانے
لگے تو میں نے جواب دیا۔ بھائی اس وقت ہمیں Alert
رہنا چاہیے۔ اگر اس وقت دیر ہو گئی تو کپتان کیا کہے گا۔
بڑے سست لوگ ہیں! اچھا ہے پہلے سے ہی تیار ہو
جائیں۔ لیکن میرے دوستوں کو یہ خیال پسند نہیں آیا۔

جب بھونپو بجا تو ہم لوگ دوڑ کر اپنی اپنی کشتی پر
پہنچے اور وہاں ایک کشتی کو سمندر میں ڈال کر مظاہرہ کیا گیا
اچھا ہے کبھی کبھی اس طرح کچھ دوڑ دھوپ ہو جایا کرے۔

ارے یہ تو میں بتانا بھول ہی گیا۔ کوچین سے ایک
صاحب اور ہمارے جہاز پر چڑھے ہیں۔ یہ ہندوستانی ہیں
اور بمبئی کے رہنے والے یہ ناچ کے ماہر ہیں۔ امریکہ ایک
دفعہ پہلے ہو آئے ہیں۔ ان کی بیوی نیویارک میں تعلیم حاصل
کر رہی ہیں۔ ان سے ملاقات کی غرض سے جا رہے ہیں۔
امریکہ میں کئی شو (show) دے چکے ہیں۔ اپنے آپ کو بہت
مشہور و معروف ناچنے والا کہتے ہیں۔

(باقی)

جناب افتخار احمد اقبال

امّی مجھے بتاؤ، مجھ سے نہ اب چھپاؤ
یہ آسمان کیا ہے؟ پیارا یہ چاند کیا ہے؟

تاروں کی انجمن میں کیا بات چل رہی ہے؟
یا چاند کی فلک پر بارات چل رہی ہے؟

بڑھیا کہاں ہے اس پر؟ چرخہ کہاں ہے اس کا؟
خرگوش کی کہانی، جادو کا ہے فسانا!

امّی مجھے بتاؤ، مجھ سے نہ اب چھپاؤ!!
بھیّا تو کہہ رہے تھے جائیں گے چاند پر ہم!

وہ بھی ہماری جیسی دنیا ہے آسماں پر؟
راکٹ میں بیٹھ، اک دن جاؤں گا میں وہاں پر؟

لیکن اکیلا میں ہی جاؤں گا کیسے امّی؟
تم کو بھی ساتھ لوں گا! سب کو بھی ساتھ لوں گا!

سید حرمت الاکرام

بچوں کے رسالے

پیام تعلیم کے بارے میں بچے اور بڑے بڑی آزادی سے اپنی رائے ظاہر کرتے ہیں طرح طرح کے مشورے دیتے ہیں۔ ہم انھیں "آدھی ملاقات" کے عنوان سے شایع کرتے ہیں۔ کسی دوسری جگہ اس پرچے میں بھی شایع کر رہے ہیں۔ ہمارے محترم حرمت الاکرام صاحب نے اس سلسلے میں کچھ اہم مشورے دیے ہیں۔ بہت اہم مشورے۔ اسی لیے ہم انھیں علیحدہ مضمون کی شکل میں چھاپ رہے ہیں۔ ہمارے پیامی مضمون نگار اور شاعر حضرات امید ہے کہ اس مضمون کو غور سے پڑھیں گے ------------ ایڈیٹر

ہمارے ملک میں بچوں کے رسالے زیادہ عرصے سے نہیں نکل رہے ہیں لیکن یہ ضرور ہے کہ تھوڑے ہی دنوں میں اس صنعت نے اچھی خاصی ترقی کرلی ہے۔ اس لیے کہ جہاں بچوں کے رسالوں کی تعداد بڑھی ہے وہیں ان رسالوں کی ظاہری حالت' خوبصورتی اور سجاوٹ نے بھی ترقی کی راہ پر کتنے قدم بڑھائے ہیں۔ بچوں کے رسائل کی بات تو ذرا الگ ہے لیکن کوئی کتاب' رسالہ یا اخبار چاہے وہ بڑوں ہی کے لیے کیوں نہ ہو لکھائی چھپائی اور ظاہری حالت کے اعتبار سے دلکش نہ ہو تو پڑھنے والوں کی رغبت میں کمی آجاتی ہے۔ بعض اوقات اچھی سے اچھی کتاب یا اچھے سے اچھا رسالہ اور اخبار پڑھنے کو صرف اس لیے جی نہیں چاہتا کہ اس کی لکھائی اور چھپائی بدنما اور ناقص ہے دوسری ظاہری سجاوٹوں مثلاً خوش نما تصویروں مضمونوں کے ساتھ باموقع اور موزوں نقش و نگار یا بیلے بوٹوں کی وجہ سے ایک طرف مطالعہ کا شوق رکھنے والوں کی دلچسپی زیادہ بڑھ جاتی ہے اور دوسری طرف بعض شوق نہ رکھنے والے بھی توجہ دینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اس لیے کتابوں اور

رسالوں کی کم سے کم لکھائی اور چھپائی ضرور اچھی ہونی چاہیے۔ ہمارے ملک کی کاروباری اور مالی حالت ابھی اتنی اطمینان بخش اور پایدار نہیں ہے اور نہ وہ اتنا ترقی یافتہ ہے کہ نئی سائنس کے میدان میں کافی آگے بڑھے ہوئے دولت مند ملکوں کی طرح شاندار اور زیادہ خوشنما رسالے شایع ہو سکیں۔

اس وقت اردو زبان میں بچوں کے جو رسالے نکل رہے ہیں ان میں بعض بعض بڑی ظاہری خوشنمائی اور دلکشی رکھتے ہیں لیکن کتابوں رسالوں اور اخباروں کا صرف خوشنما ہونا کافی نہیں، ضروری ہے کہ ان میں چھپنے والے مضامین بھی اتنے ہی اچھے ہوں۔ خصوصاً بچوں کے رسالے کہیں زیادہ توجہ، احتیاط اور ذمہ داری چاہتے ہیں۔ یہ کون نہیں جانتا کہ آیندہ زندگی کی بہتری اور بھلائی کا دار و مدار بچپن کی اچھی تربیت اور اچھے ماحول پر ہوتا ہے۔ بچوں کے دل و دماغ ہر بات کا عکس بالکل اسی طرح قبول کرتے ہیں جس طرح کوئی کیمرہ کھٹکا دباتے ہی سامنے کے منظر یا چہرے کی تصویر اتار لیتا ہے۔ بچپن کے زمانے میں جو نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے وہ مشکل ہی سے مٹ سکتا ہے بلکہ عام طور پر اس کا مٹنا ممکن نہیں ہوتا۔ بچپن میں ذہن غلط راہ پر جا پڑے تو بعد میں اس کی اصلاح اچھی سے اچھی تعلیم اور اچھے سے اچھے ماحول کے باوجود بھی مشکل سے ہوتی ہے۔

اسی لیے ابتدائی درجوں میں پڑھائی جانے والی کتابیں بڑی توجہ اور محنت سے لکھی جاتی ہیں تاکہ بچے ان سے زیادہ سے زیادہ روشنی پا سکیں۔ ابتدائی کتابوں میں اس بات کا پورا پورا دھیان رکھا جاتا ہے کہ بچوں کے نرم ذہنوں کو حب الوطنی، خوش اخلاقی، راست بازی، دیانت داری، بھائی چارگی اور انسانی ہمدردی سے مانوس کیا جائے تاکہ ان کی جڑیں گہرائی تک پہنچ کر زیادہ ٹھوس اور مضبوط ہو سکیں۔ کہانیوں نظموں اور کہاوتوں کے ذریعے ان کو لالچ، بدزبانی، بدتہذیبی، بزدلی اور دوسری برائیوں سے بچنے کی ترغیب دی جائے۔ انہیں بتایا جائے کہ والدین کی خدمت و اطاعت، بزرگوں کی تعظیم اور چھوٹوں سے شفقت کس قدر ضروری ہے کیوں کہ یہ تمام باتیں زندگی کو خوشگوار اور دلچسپ بنانے کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح بچوں کے لیے شایع کیے جانے والے رسالوں پر بھی پوری توجہ دینی چاہیے۔

رسالوں کا ایک خاص پہلو کاروبار سے تعلق رکھتا ہے اور بلا شبہ ان کی مالی بنیاد مضبوط ہونی چاہیے ورنہ کوئی ٹھوس خدمت انجام نہیں دی جا سکتی۔ اس کے لیے رسالوں کو خوشنما اور دلچسپ بنانا ضروری ہے چاہے وہ بڑوں کے لیے ہوں یا بچوں کے لیے لیکن

یہ لحاظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ کم از کم بچوں کے رسالے کسی پہلو سے ایسے نہ ہوں جن کا ان کے مستقبل پر کوئی ناخوش گوار اثر پڑے۔ ان کے لیے جو کہانیاں اور نظمیں لکھی جائیں وہ دلچسپ اور چٹپٹی ہی نہ ہوں، اُن میں کوئی نہ کوئی سبق بھی ہو۔ بچوں کو ہنسا کر بہت اچھا سبق دیا جا سکتا ہے اور جہاں تک ممکن ہو اس پر ضرور عمل ہونا چاہیے لیکن ان کے لیے جو چیزیں لکھی جائیں وہ صرف ہنسنے ہنسانے کے لیے نہ ہوں، یا بچوں کو خوش کرنے اور ہنسانے کے لیے ایسی چیزیں نہ لکھی جائیں جن میں کسی کا مذاق اڑایا گیا ہو یا کسی پر پھبتی کسی گئی ہو۔ صرف ہنسنے ہنسانے والی چیزیں آسانی سے لکھی جا سکتی ہیں لیکن ایسی چیزیں لکھنا مشکل ہے جن میں مزاح اور سبق دونوں ساتھ ساتھ ہوں۔

بعض رسالوں میں ایسی کہانیاں اور نظمیں نظر آتی ہیں جن میں کوئی لڑکا والدین کو دھوکا دے کر کسی دوست یا ہم سبق کو پیٹ کر کسی باغ سے پھل چرا کر، بزرگوں کو بے وقوف بنا کر یا کسی پھیری والے کا خوانچہ الٹ کر خوش ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی چیزیں بچوں کے لیے کسی لحاظ سے فائدہ بخش نہیں بلکہ ان کا اثر کچھ اور ہی پڑتا ہے۔ لطیفوں اور چٹکلوں کا مقصد بلاشبہ ہنسنا ہنسانا اور خوش ہونا ہے لیکن بچوں کے لیے لکھے جانے والے لطیفوں میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ بہتر ہے کہ ان میں کوئی سبق ہو ورنہ کم از کم کوئی ایسی بات بھی نہ ہو جو بچوں کی عادتوں کے لیے نقصان دہ ہو سکے۔

ان باتوں کے علاوہ ایک بات یہ بھی کہ بچوں کے کے لیے لکھے جانے والے مضمونوں کہانیوں اور نظموں وغیرہ کی زبان جہاں رواں اور سلیس ہونی چاہیے وہیں اس کا صحیح ہونا بھی حد درجہ ضروری ہے۔ یہ خیال ہر حال میں رکھنا چاہیے کہ محاورے اور ان کا استعمال صحیح ہو، مثلیں اور کہاوتیں صحیح ہوں، جملے قواعد کی رو سے صحیح ہوں۔ بعض کہانیوں اور نظموں وغیرہ میں زبان اور قواعد کی بڑی موٹی موٹی غلطیاں نظر آتی ہیں۔ انتہا یہ ہے کہ املا تک بدلا ہوا ملتا ہے۔ جملے صاف سیدھے اور سلجھے ہوئے ہوں۔ عبارت کو خواہ مخواہ توڑا مروڑا نہ جائے۔ نظموں کے شعر رواں اور دلچسپ ہوں، شعر اور مصرعے موزوں ہوں۔ آج کل بچوں کے لیے لکھی جانے والی نظموں میں جا بجا ناموزوں شعر اور ناموزوں مصرعے ملتے ہیں۔ بچے انہیں چیزوں سے زبان سیکھتے ہیں اور شاعری کا شعور پاتے ہیں۔ ان چیزوں کی زبان صحیح ہو تو بچے رفتہ رفتہ صحیح اور غلط زبان کا فرق خود ہی سمجھنے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ضرورت بھی نہیں ہوتی کہ بعد میں ان کی زبان کی اصلاح

(باقی ص۶۵ پر)

جناب خلیق انجم اشرفی

دو حیرت انگیز گیسیں

کاربن اور آکسیجن دو عنصر ہیں۔ یہ دونوں جب ملتے ہیں تو دو گیسیں بنتی ہیں۔ اگر ایک حصہ کاربن اور ایک حصہ آکسیجن آپس میں ملیں تو "کاربن مونو آکسائڈ گیس" بنتی ہے۔ اور اگر ایک حصہ کاربن اور دو حصے آکسیجن ملیں تو "کاربن ڈائی آکسائڈ گیس" بنتی ہے۔ ان دونوں گیسوں کی خاصیتیں ایسی دل چسپ اور حیرت انگیز ہیں کہ ان کا علم نہ صرف علم الکیمیا (کیمسٹری) سے دل چسپی رکھنے والوں کے لیے بلکہ ہر ایک کے لیے دل چسپ ثابت ہوتا ہے۔

آیئے آج آپ کو ان دونوں گیسوں کے بارے میں کچھ بتائیں۔ پہلے "کاربن مونو آکسائڈ" کو لیتے ہیں۔ کیا آپ نے کبھی کوئلے کی انگیٹھی سے نیلے شعلے اٹھتے دیکھے ہیں؟ ضرور دیکھے ہوں گے۔ یہ شعلے کاربن مونو آکسائڈ ہی کے ہوتے ہیں۔ دراصل، کوئلہ کاربن ہی کی ایک شکل ہے۔

یہ تو شاید آپ جانتے ہیں کہ کوئی چیز آکسیجن کے بغیر نہیں جل سکتی۔ لہٰذا جب یہ کاربن آکسیجن سے ملتی ہے تو کاربن مونو آکسائڈ بنتی ہے اور چونکہ یہ گیس خود جلنے والی گیس ہے اس کے شعلے نیلے ہوتے ہیں اس لیے ہمیں انگیٹھی سے نیلے شعلے اٹھتے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ گیس سب سے پہلے ایک سائنس داں "لیسونے" نے ۱۷۷۶ء میں بنائی۔ بعد میں اس کی خاصیتوں کا مکمل جائزہ ایک دوسرے کیمیاداں "کرک شینک" نے ۱۸۰۰ء میں لیا۔

یہ ایک بے رنگ بے مزہ گیس ہے اور بہت زیادہ زہریلی ہے۔ اگر اسے اتفاق سے سونگھ لیا جائے تو دم گھٹنے لگتا ہے اور زیادہ مقدار میں سونگھنے سے موت تک واقع ہو جاتی ہے۔

اخباروں میں اکثر ایسی موتوں کی خبریں آتی رہی ہیں۔ یہ موتیں اسی کاربن مونو آکسائڈ کی وجہ سے ہوتی ہیں۔

سخت سردی کے موسم میں لوگ پتھر کے کوئلوں کی انگیٹھی سلگا کر کھڑکیاں بند کر لیتے ہیں اور اندر تازہ آکسیجن نہیں آنے پاتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کمرے میں آکسیجن اور کاربن کی مقدار برابر ہوتی جاتی ہے۔ دونوں عنصر مسلسل کاربن مونو آکسائڈ بناتے رہتے ہیں۔ اور سوتا ہوا انسان سانس میں آکسیجن اندر لینے کے بجائے کاربن مونو آکسائڈ لیتا ہے اور تھوڑی دیر بعد مر جاتا ہے۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کاربن مونو آکسائڈ اندر لینے سے آدمی کیوں مر جاتا ہے۔؟ آیئے اسے بھی سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہمارا خون ظاہر میں سرخ رنگ کا ایک رقیق نظر آتا ہے مگر یہ دو حصوں سے مل کر بنا ہے ـــــــ پلازمہ سے اور ہیموگلوبین سے۔ ہیموگلوبین کا کام یہ ہے کہ اس آکسیجن کو جو سانس کے ذریعہ اندر پہنچتی ہے جذب کرے اور آکسیجن کا کام ہے خراب خون کی صفائی۔ یہ آکسیجن خراب خون کو صاف کرتی رہتی ہے۔ لیکن جب کاربن مونو آکسائڈ خون کے اندر پہنچتی ہے تو یہ ہیموگلوبین کو آکسیجن جذب کرنے سے روک دیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ خون صاف نہیں ہوتا اور یہی خراب خون سارے جسم میں گردش کرتا ہے اور انسان مر جاتا ہے۔

اگر کوئی شخص اس طرح بند کمرے میں کوئلے کی انگیٹھی سلگا کر سو جائے اور اسے کسی طرح نکال لیا جائے تو اس کا علاج یہ ہے کہ اسے کھلی ہوا میں رکھا جائے۔ اگر ہو سکے تو اسے ۹۰ حصے آکسیجن اور ۵ حصے کاربن ڈائی آکسائڈ گیس کا ایک آمیزہ بطور مصنوعی سانس دیا جائے۔

اس گیس کے کئی استعمال ہیں۔ یہ ایک خطرناک اور بہت زیادہ زہریلی گیس فاسجین گیس بنانے میں استعمال کی جاتی ہے۔ فاسجین گیس عموماً جنگ کے دنوں میں دشمن کے خلاف استعمال کی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ الکوحل اور سنتھیٹک پیٹرول (مصنوعی پیٹرول) وغیرہ بنانے میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔

کاربن ڈائی آکسائڈ:۔

آپ نے ریلوے اسٹیشنوں، سرکاری اور غیر سرکاری دفتروں اور سینما گھروں میں سرخ رنگ کے سلنڈر لٹکتے دیکھے ہوں گے شاید آپ کو یہ

بھی معدوم ہو کر یہ آگ بجھانے کے کام آتے ہیں لیکن
کیا آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کے اندر کیا ہوتا ہے۔
بالکل ٹھیک! کاربن ڈائی آکسائڈ۔ تو اس کا مطلب
یہی ہوا کہ کاربن ڈائی آکسائڈ آگ کو بجھا دیتی ہے۔
پھر تو یہ بڑے کام کی گیس ہوئی۔

اس مفید گیس کو سب سے پہلے دریافت
کرنے کا سہرا ایک کیمیادان " وان ہلمونٹ" کے
سر ہے۔ اس نے ۱۶۳۰ء میں اسے سب سے پہلے
تیار کیا۔ بعد میں ایک دوسرے مشہور کیمیادان
"لووزیر" نے ۱۷۸۳ء میں اس کی خاصیتوں کا
مکمل جائزہ لیا۔ اور یہ دکھلایا کہ جب کوئلہ او ہیرے
کو کھلی ہوا میں جلاتے ہیں تو کاربن ڈائی آکسائڈ
گیس بنتی ہے۔

اور ہماری یہ ہوا بھی مختلف گیسوں مثلاً آکسیجن
ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن ڈائی آکسائڈ وغیرہ
مختلف گیسوں سے مل کر بنی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائڈ
۳ء۰ فی صدی شامل ہے۔ اس کے علاوہ دنیا میں
بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں یہ زمین سے کئی
فٹ اوپر تک فضا میں پھیلی ہوئی ہے۔

جاوا (انڈونیشیا) میں ایک وادی ہے جسے
"وادیٔ زہر" کہتے ہیں۔ پہلے یہ بھوتوں کا علاقہ مشہور
تھا۔ جو آدمی وہاں جاتا گر کر مر جاتا۔ لیکن بعد میں
اس حقیقت کا انکشاف ہوا کہ دراصل اس وادی میں
بیس فٹ سے بھی اوپر تک صرف کاربن ڈائی آکسائڈ
گیس پھیلی ہوئی ہے۔ آکسیجن کا نام و نشان نہیں ہے۔
اسی لیے جب کوئی شخص اس وادی میں داخل ہو کر
سانس لیتا تو بجائے آکسیجن کے کاربن ڈائی آکسائڈ
گیس اندر جاتی ہے۔

کاربن ڈائی آکسائڈ گیس زہریلی تو نہیں ہے
لیکن یہ خون کو صاف تو نہیں کر سکتی۔ نتیجہ ظاہر ہے۔
خون خراب ہو جاتا ہے اور انسان مر جاتا ہے۔

اس طرح کی کئی وادیاں اٹلی میں بھی ہیں جن
میں سے ایک کا نام "گروٹو ڈل کین" ہے۔ اس
کے علاوہ امریکہ میں ایک وادی "وادیٔ موت"
ہے۔ اس کے متعلق پہلے لوگوں میں طرح طرح کی
روایتیں مشہور تھیں کوئی کہتا کہ وہ بھوتوں کی بستی
ہے اور جو اس میں قدم رکھتا ہے اسے بھوت
کھا جاتے ہیں۔ کوئی کہتا وہاں جادوگر رہتے ہیں
جو وہاں جانے والے ہر انسان کو مار ڈالتے ہیں۔
غرض جتنے منہ اتنی باتیں اور چونکہ یہ حقیقت تھی
کہ وادی میں قدم رکھتے ہی آدمی گر کر مر جاتا تھا اس
لیے یہ باتیں لوگوں کا ایک مضبوط عقیدہ بن چکی

تھیں۔ بعد میں اس حقیقت کا پتہ چلا کہ یہ بھی اسی طرح
کی ایک وادی ہے اور اس میں بھی کاربن ڈائی آکسائیڈ
بھری ہوئی ہے۔

آپ نے اپنی دادی اماں، نانی اماں یا کسی
بھی بڑے بوڑھے سے اس قسم کی کہانیاں ضرور سنی
ہونگی کہ فلاں باغ میں بھوت رہتے ہیں۔ یہ رات
میں باغ میں سونے والوں کا گلا گھونٹتے ہیں۔ یہ بات
ٹھیک بھی ہے۔ کسی گھنے باغ میں سونے سے
رات کو گلا گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

لیکن یہ کسی بھوت کی کارفرمائی نہیں ہے۔
"کاربن ڈائی آکسائیڈ کا کارنامہ" ہے۔ اسی کو بھوت
کہہ لیجیے۔ دیکھیے انسان سانس کے ذریعہ آکسیجن
اندر لیتا ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکالتا
ہے۔ لیکن پیڑ پودے اس کے برعکس دن کے
وقت کاربن ڈائی آکسائڈ اندر لیتے اور آکسیجن باہر
نکالتے ہیں۔ لیکن رات کو انسانوں کی طرح آکسیجن
اندر لیتے اور کاربن ڈائی آکسائڈ باہر نکالتے ہیں یہی
وجہ ہے کہ دن میں تو پیڑوں کے سائے میں بیٹھنا بہت
خوش گوار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن رات میں پیڑوں کے
گھنے جھنڈ کے نیچے اس وقت سوئیں جب ہوا نہ
چل رہی ہو تو رات میں کسی وقت ایسا محسوس ہوتا
ہے۔ جیسے کوئی دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹ
رہا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ پیڑوں کی خارج کی ہوئی
کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار بڑھ جاتی ہے اور
اتنی جگہ میں موجود ساری آکسیجن وہ درخت جذب
کر لیتے ہیں۔ لہٰذا آکسیجن کی اس کمی اور کاربن ڈائی
آکسائیڈ کی زیادتی سے دم گھٹتا ہوا لگتا ہے اور
لوگ اسے بھوت کی شرارت سمجھتے ہیں۔

جناب اقبال مہدی

ایک دن کیا ہوا

سلیم اور سلمہ کچھ ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس الماری کے پاس پہنچ گیے جس کے نچلے خانے میں جوتے رکھے رہتے تھے۔

اچانک سلیم نے سلمہ سے کہا: "آؤ سب جوتوں پر پالش کر دیں۔ ابا دیکھیں گے تو بہت خوش ہوں گے امی بھی خوش ہوں گی۔"

سلمہ کو تجویز پسند آئی۔ سلیم نے حکم دیا: "جاؤ پالش کی ڈبیاں اور برش اٹھا لاؤ۔ میں جوتے نکالتا ہوں۔"

سلمہ پالش اور برش لائی۔ سلیم نے الماری سے سب جوتے نکالے۔ اور برش سے دھول صاف کرنی شروع کی۔

سلمہ بے کار نہ بیٹھا گیا۔ جس جوتے کو سلیم برش سے صاف کر چکتا سلمہ اس پر انگلی سے پالش لگانے لگتی۔

سلیم نے سوچا پالش لگانا زیادہ دلچسپ کام ہے۔ اس نے سلمہ سے کہا تم برش پھیر دو میں پالش لگاتا ہوں۔ سلمہ نہ مانی۔ سلیم نے سمجھایا۔ سلمہ نہ مانی۔ سلیم نے ڈانٹا۔ وہ پھر بھی نہ مانی۔ آخر سلیم نے برش رکھ دیا اور بغیر صاف کیے جوتوں پر خود بھی پالش لگانے لگا۔ اب تو جیسے دوڑ شروع ہو گئی۔ دیکھیں کون زیادہ جوتوں پر پالش لگائے۔

اس جلدی میں کالے جوتوں پر لال پالش اور لال جوتوں پر کالی پالش لگ گئی۔

یہ دیکھ کر دونوں بہت گھبرائے۔ اب کیا ہو؟ پہلے خیال یہ آیا کہ پونچھ دیں۔ یہ خیال آتے ہی برش اٹھا کر جوتے پر رگڑا۔ لال جوتے پر کالا پالش اور پھیل گیا سوچا کپڑے سے پونچھیں کوئی کپڑا نہیں ملا۔ قمیص اور جمپر کے دامن سے رگڑا پھر نہ کپڑے پر آیا بے

رنگ اتر رہا ہے۔ اور رگڑا۔ کچھ کپڑے پر اور رنگ اترا
خوب رگڑا۔ لیکن جوتے پر سے رنگ نہ اترا۔ دونوں پھر
سوچ میں پڑ گیے۔ اتنے گھبرائے ہوئے تھے کہ پالش
میں سنی ہوئی انگلی سے جو نشان ماتھے، گال، ناک، تھوڑی
وغیرہ پر لگ گیے تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے
چہرے کو دیکھ کر ہنسی بھی نہ آئی۔

"شاید صابن سے اتر جائے"۔ سلیم بولا۔
سلمہ چپکے سے اٹھی صابن دانی اور گیلا کپڑا لائی۔ یہ
ترکیب بھی کام نہ آئی۔

دونوں نے ہار مان لی بہت اداس ہوئے
جوتے وہیں الماری میں رکھے، چھپانے کے خیال سے
انھیں الٹ کر رکھ دیا۔ پالش کی ڈبیاں اور برش بھی
الماری میں ڈال دیے۔ غسل خانے میں جاکر ہاتھ منھ پر
سے دھبے مٹانے کی کوشش کی۔ اس میں بھی کامیابی
نہ ہوئی۔ اکتا کر گھر سے باہر بھاگ گیے کھیل میں لگ
گیے اور سب کچھ بھول گیے۔

کچھ دیر بعد گھر میں آئے تو امی دیکھتے ہی بولیں
"یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ پالش کی بو! کیا پالش کا ستیاناس
کیا ہے؟ بتاؤ؟"

آخر سب راز فاش ہو گیا۔ خوش ہونے کے بجائے
امی ناراض ہوئیں۔ تعریف کرنے کے بجائے الٹا ڈانٹا۔

بقیہ صفحہ ۵۹

کی جائے۔ اس وقت یہ کام مشکل بھی ہوتا ہے۔

اسی طرح بچوں کے رسائل میں دی جانے والی
تصویروں پر بھی زیادہ توجہ دی جانی چاہیے۔ ان تصویروں
میں دلکشی کے ساتھ سنجیدگی اور شائستگی بھی ہونی چاہیے
ان سے کوئی سبق ملتا ہو، اچھی عادتیں سیکھنے میں مدد
ملتی ہو، ہمت اور حوصلہ بڑھتا ہو۔ یہ تصویریں تاریخی
بھی ہو سکتی ہیں اور خیالی بھی لیکن مقصد سب کا ایک
ہونا چاہیے۔ مضمونوں، کہانیوں وغیرہ کی طرح تصویروں
سے بھی بچے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں بلکہ زیادہ سیکھ
سکتے ہیں اور زیادہ آسانی سے سیکھ سکتے ہیں۔ بچوں کو
تصویروں سے خاص دلچسپی ہوتی ہے اس لیے ان
کی تعلیم و تربیت میں تصویریں زیادہ کارآمد ہو سکتی ہیں۔
شرط یہ ہے کہ ان کو کارآمد بنانے پر ذمہ داری اور ذہانت
دونوں صرف کی جائیں۔ ایک ضروری بات اور ہے کہ
بچوں کے رسالوں کی قیمت زیادہ نہ ہونی چاہیے کیونکہ
ہمارے ملک کے باشندے اور خاص طور پر اردو
والے زیادہ پیسے نہیں خرچ کر سکتے۔ بہرحال بچوں کے
رسالے شایع کرنے والوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ان
موٹی موٹی باتوں کا دھیان رکھیں اور رسالہ کو بچوں
کے لیے زیادہ سے زیادہ مفید بنانے کی کوشش کریں۔

میرا وطن

مشہود انوار سہیل

میری امیدوں کا چمن
میرا وطن میرا وطن

یہ لہلہاتی کھیتیاں * یہ مسکراتی ندیاں
یہ ہنستی گاتی تتلیاں * یہ کوئلیں یہ ہرنیاں
یہ کھیت اور یہ سبزیاں * کھلیان اور یہ منڈیاں
یہ باغ باغیچے چمن * یہ ندی نالے اور بن
یہ گنگناتی وادیاں * یہ شہر کی آبادیاں
یہ خوبصورت بلڈنگیں * یہ جگمگاتی ہوٹلیں
یہ گاڑیاں رکشے بسیں * یہ سائیکل یہ موٹریں
ان سب سے مجھ کو پیار ہے * انسان بڑا فن کار ہے

میری امیدوں کا چمن
میرا وطن میرا وطن

چمپانزی

اعجاز اختر

کیا آپ کو معلوم ہے کہ انسان کا سب سے قریبی رشتہ دار کون ہے۔؟ جی ہاں! معلوم ہے۔ یہ چمپانزی ہے۔ اس کا سب سے بڑا ثبوت یہی ہے کہ دونوں کی جسمانی بناوٹ تقریباً ایک سی ہے لیکن جہاں دونوں میں یکسانیت ہے۔ وہاں فرق بھی ہے۔ انسان آرام سے اپنے دو پیروں پر چلتا ہے مگر چمپانزی نہیں چل سکتا۔ دوسرا فرق دونوں کے دماغوں میں ہے۔ انسان کا دماغ چمپانزی کی بہ نسبت زیادہ بڑا ہوتا ہے لیکن یکسانیت تو بہت زیادہ ہے۔ یہاں تک کہ اگر انسان کا خون چمپانزی کے جسم میں اور چمپانزی کا خون انسان کے جسم میں داخل کیا

جائے تو ان دونوں میں سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

کہتے ہیں سکھایا ہوا چمپانزی تو اپنی عمر کے انسان سے بھی کہیں زیادہ عقل مند ہوتا ہے۔

جرمنی کے سائنس داں "کولر" کا کہنا ہے کہ چمپانزی بہت ہی سمجھ دار جانور ہے۔ اس نے اپنے "سلطان" نامی چمپانزی پر کئی تجربے کیے۔ ایک بار اس نے سلطان کے پنجرے میں اس کی پہنچ سے باہر کیلے ٹانگ دیے۔ اور پنجرے میں دو ڈنڈے بھی رکھ دیے۔ جنھیں آپس میں جوڑا جا سکتا تھا۔ سلطان نے کیلے دیکھے اور ان دونوں ڈنڈوں کو آپس میں جوڑ کر کیلے اتار لیے۔

"مادام کوٹس" نے اپنے "یونی" نامی چمپانزی پر کئی تجربے کیے۔ اس نے بتایا کہ یونی ۲۰ طرح کے رنگ پہچانتا ہے۔ ان میں ۲ لال، ۴ نارنگی، ۳ پیلے، ۲ آسمانی، ۳ نیلے، ۳ ہرے، ۲ کاسنی اور ۳ بسنتی رنگ ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جیومیٹری کی شکلیں بھی پہچان سکتا تھا۔

چمپانزی کے پاس ہماری طرح کی زبان تو نہیں۔ لیکن طرح طرح کی آوازوں سے وہ اپنے جذبات ظاہر کرتا ہے۔ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کی بُری حرکت دیکھتا ہے تو گرجتے ہوئے ڈانٹتا ہے۔

اس پر ڈر کا اثر بھی ہو جاتا ہے۔ "کولر" کے چمپانزی گائے اور اونٹ دیکھ کر ڈر گیے۔ ایک بار "کولر" اپنے منھ پر بھوت جیسا چہرہ لگا کر ان کے کٹہرے کے پاس آیا تو وہ اسے دیکھ کر بے جان سے ہو گیے۔

لندن کے چڑیا گھر میں "کانگو" نام کا ایک چمپانزی تھا۔ وہ بہت سمجھ دار تھا۔ اسے مصوری کی مشق بھی تھی۔ اسی چڑیا گھر میں ایک اور چمپانزی ٹائپ بھی کر لیتا تھا۔

چمپانزی بہت سی باتوں میں انسانوں سے قریب ہے مگر وہ انسانوں جیسی حرکتیں تو کرتا ہے۔ مگر بے چارے نے دماغ انسان جیسا نہیں پایا۔ (ہندی سے)

"سادگی"

ہمارے منّے میاں نے ایک طوطا پکڑا چھوٹا سا، منّا سا، بے چارے کے بدن پر ابھی بال نہیں اُگے تھے، پَر تھے مگر ایسے جیسے نوچ ڈالے گیے۔

ہوں، بس چمڑے کی جھلی لگتے تھے بالکل، اڑنے سے معذور، چلنے سے لاچار، بالکل ایسا کہ دیکھو تو متلی آئے۔ چھوڑو تو گھن لگے، ہم نے کہا "منے میاں! کیا واہیات سا جانور پکڑ لائے ہیں آپ؟" ارے اسے وہیں پھینک آؤ جہاں سے لائے ہو" مگر منے میاں بضد تھے کہنے لگے "آپی! دیکھنا تو جب یہ طوطا بڑا ہوگا۔ بڑے پیارے، ہرے ہرے پر ہونگے اس کے، گردن پر سرخ رنگ کا کنٹھ ہوگا۔ ہم جو اپنی کتاب میں پڑھیں گے وہ اس کو بھی پڑھائیں گے، پھر تو آپا! یہ اتنا اچھا، اتنا اچھا، لگے گا کہ تم بھی دیکھ کر للچا جاؤ گی، اسے خوب سا کھانے کو دو گی، پیار کرو گی" اور ہم! ہم تو اس کے ساتھ سارے گھر میں کھیلیں گے، کودیں گے، ہاہا کتنا مزا آئے گا اس وقت۔"

منے میاں کی پیاری پیاری باتیں سن کر ہم چپ ہو رہے۔ لیکن اس جانور کی طوطا چشمی کے قصے سن رکھے تھے، ہم نے کہا "پالو میاں! طوطا چشموں سے بھی کھیل کر دیکھو" چنانچہ ہمارے منے میاں نے طوطے کو کھلانا شروع کیا، پڑھانا شروع کیا، اسکول سے آتے اور اپنا پڑھا ہوا سبق اس کو بھی پڑھاتے دھیرے دھیرے طوطے کے پر نکلے، اس کا رنگ سبز ہوا، گردن پر سرخ رنگ کا کنٹھ نکلا، قد و قامت بڑھا، اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ واہیات سا بچہ، جس کو دیکھنے سے گھن آتی تھی، ایک خوبصورت پرندہ بن گیا۔ پھر لطف یہ کہ منے میاں کا ہم سبق بھی بن گیا۔ اس کے بہت سے سبق طوطا اکثر پڑھتا، جتنا منے میاں، کی دل چسپیاں بھی اس کے ساتھ بڑھتی گئیں، ایک دن انھوں نے سوچا کہ لاؤ اب طوطا بڑا ہو گیا ہے۔ پنجرے سے باہر نکال کر اس کے ساتھ کھیلیں، مگر توبہ! جونہی پنجرے کا دروازہ کھلا طوطے میاں پھر سے اڑ گیے اور لگے منے میاں بسور، بسور کر رونے، ہم نے کہا "منے میاں مت روؤ! ان کے بارے میں چچا غالب کہہ گیے ہیں۔ سہ

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

رائے خالدہ محمد صدیق

انوکھی شکایت

"رام پور کا ایک ٹکٹ دے دیجئے" پروفیسر صاحب نے بکنگ کلرک سے کہا "رام پور کا ٹکٹ!" بکنگ کلرک نے پہلے عینک درست کی پھر پروفیسر

صاحب کو غور سے دیکھتے ہوئے....."رام پور کا
ٹکٹ تانگے والوں میں ملے گا"....."میں رام پور کا ٹکٹ
مانگ رہا ہوں"....."میں بھی عرض کر رہا ہوں کہ
تانگے والوں میں ملے گا"... کلرک نے بھی اسی انداز
میں جواب دیا۔ وہ کبھی تو پروفیسر صاحب کی عمدہ
پوشاک کو اور کبھی ان کے چہرہ کو دیکھتا ہوا بولا "آپ
مجھ سے مذاق کرتے ہیں"

پروفیسر صاحب نے غضب ناک ہو کر کہا۔
"میں تمھاری شکایت کروں گا"۔ اور پروفیسر صاحب
کلرک کو حیرت زدہ چھوڑ کر پیر پٹختے ہوئے اسٹیشن
ماسٹر کے پاس پہنچے اور اندر داخل ہوتے ہی.....
"کمپلینٹ بک" کا مطالبہ کیا۔ اسٹیشن ماسٹر نے
جوان کے تیور دیکھے تو کرسی پیش کرتے ہوئے وجہ
معلوم کی......"میں نے بکنگ کلرک سے ٹکٹ
مانگا تو وہ بولا۔ تانگے والوں میں ملے گا"

اسٹیشن ماسٹر کو بھی غصہ آگیا۔ لیکن
پروفیسر صاحب سے نرمی سے پوچھا۔ "کہاں کا
ٹکٹ مانگا تھا جناب نے"

"رام پور کا" پروفیسر صاحب نے کہا۔
اور اسٹیشن ماسٹر اپنا قہقہہ نہ روک سکا۔ پروفیسر
صاحب کا چہرہ مارے غصے کے سرخ ہو گیا۔

لیکن جب اسٹیشن ماسٹر نے کہا "جناب رام پور
کے اسٹیشن پر آپ خود موجود ہیں"

اور پھر پروفیسر صاحب کا حال......؟
خود ہی اندازہ لگا لیجیے۔

محمد عبدالقادر۔

ایک ذہین قاضی

اقضی العرب کے نام سے ایک مشہور قاضی،
اسلام حضرت شریح بن حارثؒ گذرے ہیں یہ قاضی
یمنی النسل اور تابعی ہیں آپ دور فاروقی سے لے کر
سلطان عبدالملک اموی تک مسلسل ساٹھ سال قاضی
کے عہدے پر رہے۔ آپ بہت ذہین اور سمجھ دار
عالم تھے۔ ایک دفعہ ایک عورت نے مرد پر
اپنا دعویٰ قاضی کے عدالت میں پیش کیا اور عورت
عدالت میں حاضر ہو کر زار زار رونے لگی۔ اس وقت
وہاں حضرت امام شعبیؒ حاضر تھے۔ عورت کے رونے
کو دیکھ کر رہا نہ گیا فرمایا یہ عورت بڑی مظلوم معلوم
ہوتی ہے۔ اس پر حضرت قاضی شریح نے کیا خوب
فرمایا "رونا مظلومیت کا ثبوت نہیں" اس بات کو
آپ نے قرآنی تمثیل سے سمجھایا فرمایا یوسف کے بھائی
اپنے باپ کے پاس روتے ہوئے آئے تھے "اہن

حاضر جوابی پر امام شعبیؒ قاضی صاحب کا لوہا مان گیے.

صفیہ بیگم مولائی - ورنگل

کیا آپ جانتے ہیں کہ.

۱- ہمنگ چڑیا دنیا کی سب سے چھوٹی چڑیا ہے.
۲- شترمرغ دنیا کا سب سے بڑا پرندہ ہے.
۳- سب سے تیز اڑنے والا پرندہ کرو ڑ ہے.
۴- جاپان کے کوہاما مرغ کی دم لگ بھگ ستر فٹ لمبی ہوتی ہے.
۵- تین انچ والی مکھیاں وینزویلا میں پائی جاتی ہیں.

حسن نظامی - جمشید پور

اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو اُردو اخبار اور رسالے خرید کر پڑھیے.

سال نامہ ملا

ابو تمیم صاحب فریدآبادی، مرزا سلمان، غلام ربانی، خالد عرفان، قیصر سرمست، مشہود مفتی، اطہر پرویز، اور رشید نعمانی، کی تحریریں سالنامے کا حاصل ہیں۔ ابو تمیم صاحب تو اس فن کے حاضر امام لگتے ہیں۔ انھیں نہ چھوڑیئے۔ سائنسی ٹکڑے بہت مفید اور دلچسپ ہیں۔ پہیلیاں بوجھنے کی تجویز کامیاب رہے گی۔

ظ۔ انصاری بمبئی

سال نو مبارک۔

"پیام تعلیم" کا سالنامہ اپنی تمام رنگارنگ رعنائیوں کے ساتھ موصول ہوا۔ شکریہ۔

بلا شبہ یہ سالنامہ بچوں کے ادب میں ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ یقین مانیے آپ اپنی کوششوں میں مکمل طور سے کامیاب ہیں۔ میری طرف سے اتنے خوبصورت سالنامے پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

یوں تو "پیام تعلیم" کی کہانیاں، نظمیں اور معلوماتی مضامین دلچسپ ہوتے ہی ہیں۔ لیکن بچوں کی مزید دلچسپیوں کے پیش نظر لطائف اور دماغی ورزش کے لیے کچھ مزیدار پہیلیوں کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ "پیام تعلیم" کا مقصد بچوں کے سامنے مفید مواد پیش کر کے انھیں تہذیب یافتہ بنانا ہے مگر ہنسی ہنسی میں بھی انھیں بہت سی اچھی باتیں بتا کر اخلاقی تربیت دی جا سکتی ہے۔ حالانکہ "پیام تعلیم" میں اب تک جو مواد شائع ہوا ہے اس نے بھی کافی اس کام کو انجام دیا ہے۔ امید ہے آیندہ شماروں اور بھی پہیلیاں ہوں گی۔

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

مخلص۔ کیف احمد صدیقی۔

"پیام تعلیم" کا دلکش اور پرکشش سالنامہ مل گیا ہے شکریہ! بے حد مسرت محسوس کر رہا ہوں۔ مسرت سے زیادہ حیرت ان حالات میں اتنا شاندار نمبر پیش کرنا آپ کے عزم جواں کا اعجاز ہے! سچ پوچھیے تو سالنامہ فردوس ورح ہے اور جنت نظر بھی۔ کیونکہ آپ نے بہاروں کے تبسم اور کہکشاں کی تابناکیوں کو اپنی طلسماتی شخصیت کے زور سے یکجا کر دیا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ظاہری اور باطنی حسن کی یکسانیت سب سے پہلے پڑھنے والے کو متاثر کرتی ہے۔ پھر مواد کی کشش حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ پیام تعلیم کے اس شاندار سالنامہ کو ہاتھ پر تھامے سوچ رہا ہوں کہ کیا پڑھوں کیا نہ پڑھوں۔ نہ پڑھنے کا تو سوال ہی نہیں کیونکہ ایک ایک ورق میں اتنی چاشنی محسوس کرتا ہوں کہ پڑھے بنا کوئی چارہ نہیں۔

اس ضخیم اور خوبصورت نمبر کی پیش کش پر ایک بار پھر اپنی دلی مبارک پیش کرتا ہوں اور آپ کے عزم جوان کی داد دیتا ہوں۔!!

امید ہے مزاج اطہر بخیر ہوگا؟

خاکسار

مناظر عاشق۔ ہرگانوی۔

مکرم بندہ جناب حسین حسان صاحب ندوی
تسلیم اور مبارک باد قبول فرمایئے۔
نئے سال کی، عید کی اور سالنامہ کی۔

عید سے پہلے عید ہونے کا مفہوم میری سمجھ میں آج تک نہیں آیا تھا۔ مگر کل آپ نے "پیام تعلیم" کا سالنامہ بھیج کر سمجھا دیا کہ ۲۴ رمضان کو بھی عید ہو سکتی ہے۔

سالنامہ نئے سال کی رنگا رنگیوں اور عید کے چاند سے کچھ کم مسرت بخش و خوب صورت نہیں۔

سرورق شاندار، لکھائی چھپائی جاندار اور مضامین و نظمیں وغیرہ مزیدار ہیں۔ یہ آپ ہی کا حق اور ہمت ہے جو ہاتھ کی تکلیف کے باوجود ایسا جامع اور جاذبِ قلب و نظر سالنامہ نکال سکے۔

آپ کا اور تمام پیامیوں کا
قیصر سرمست

میں ان چھٹیوں میں ۲۵ دسمبر سے ۳ جنوری تک ہونے والے این۔ سی۔ سی کے دس روزہ کیمپ میں شرکت کرنے دلی سے تیرہ میل دور ایک جگہ سرس پور (بادلی) گیا ہوا تھا۔ پچھلے جمعہ کو جو کیمپ میں ہی گزرا تھا۔ جمعہ کی نماز کے لیے ہم آٹھ مسلمان لڑکے چھٹی لے کر دلی آئے۔ نماز سے فارغ ہو کر مجھے پیام تعلیم کی یاد نے ستایا اور سیدھا مکتبہ جامعہ پہنچا۔ سامنے ہی سالنامہ پیام تعلیم اپنے دیدہ زیب و خوش رنگ ٹائیٹل کے ساتھ لٹکا نظر آیا۔ ریحان صاحب سے رسالہ لے کر ورق گردانی کرتا روانہ ہوا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ پیام تعلیم کا یہ سالنامہ پچھلے سالنامہ سے بدرجہا بہتر ہے اور آپ کے اور ہمارے پیام تعلیم کی ایک سالہ ترقی کا ایک مکمل ثبوت۔ ٹائیٹل مجھے تو بہت پسند آیا۔ اس بار ایک ندرت اور جدت آپ کے آرٹسٹ نے اس سرورق میں پیش کی ہے۔

یہ معلوم کر کے آپ کو مسرت ہوگی کہ ۳۱ دسمبر ۹۶ء کی رات میں جب کیمپ میں نئے سال کی آمد کا جشن منایا تھا تو پروگرام میں میں نے نئے سال پر خورشید جامی کی نظم سنائی جسے پسند کیا گیا۔ رسالہ میں اپنے ساتھ کیمپ لے گیا تھا۔

نظموں میں منظور صاحب کا ترانہ۔ نیاز صاحب کی نظم غرور کی ہار۔ تمکین صاحب کی "کبڈی" اور کوثر اعظمی کی "بچپن کا دانہ" بہت پسند آئیں۔ صفدر آہ صاحب کی رباعیاں تو یوں کہیے۔ حصہ نظم کی جان ہیں۔ آخری رباعی مجھے بہت پسند آئی ایک عجیب سا درد ایک انوکھا سوال اس رباعی کے مصرعوں میں بند کر دیا گیا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ زیر، زبر، تشدید، جزم پر اتنی کامیاب اور پیاری نظم لکھنے پر مولانا بدرالدین صاحب کو مبارک باد دوں یا اسے شائع کرنے پر آپ کو۔ خیر آپ دونوں حضرات مبارکباد قبول فرمائیں۔ افتخار اعظمی کی نظم "بھارت کی تقدیر" امید ہے کہ ننھے پیامیوں کے حلقہ میں بہت پسند کی جائے گی۔

تایا جان بدستور اپنے مضمون میں طنز و مزاح کے تیکھے تیر چلاتے ہیں۔ ان کا مضمون پسند آیا۔ کہانیوں میں رضیہ سجاد ظہیر کی کہانی "آنسو کی روشنی" اور "کتے کی کہانی" بہت پسند آئیں سلیم تمنائی کا ڈرامہ یا کہانی جو کہیے ایک اچھی دلچسپ اور کامیاب کوشش ہے انھیں مبارک باد۔

سفرنامے اس بار بھی سب ہی دلچسپ ہیں۔ ابن بطوطہ دہلی سے نیویارک تو پیام تعلیم کے ہر شمارہ کی جان ہو گئے ہیں مگر

اس بار "حاجی بابا کی ڈائری" اور "ترکی کے ایک اسکول میں" نے لطف دوبالا کر دیا۔ مجھے یہ دونوں سفرنامے بہت پسند آئے۔ امید ہے کہ ظ۔ صاحب سے تو ملاقات ہوتی ہی رہے گی محترم مجیب صاحب بھی اس سیاحت سے متعلق اور مضامین مرحمت فرمائیں گے۔ سائنسی مضامین میں "الہ دین کا چراغ" زیادہ پسند آیا جب کہ معلوماتی مضامین میں "نمک کی نمکین داستان" خوب اور خوب ہے۔ شانتی رنجن صاحب کو دلی مبارک باد امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ایسے دلچسپ مضامین لکھتے رہیں گے۔

"پھلوں کی انجمن" "جانوروں کے مشاعرہ" ہی کی طرح ایک نئی چیز ہے۔ مضمون نگار کو مبارک باد۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک ایک چیز کس طرح گناؤں مجموعی طور پر سالنامہ بہت کامیاب ہے اور ہر حلقہ کی پسند کا سامان اس میں مہیا کیا گیا ہے۔ نہ تو اسے کہانیوں کا پلندہ بنایا گیا ہے نہ ہی مضمون کا خشک ڈھیر اور نہ ہی کسی شاعر کا دیوان۔ اسے آپ نے گل ہائے رنگا رنگ سے مزین ایک حسین گلدستہ بنانے کی کوشش کی ہے اور آپ اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب ہیں۔ ہر چیز کلاسیکل تو نہیں ہو پائی ہے مگر مجموعی طور پر سالنامہ ضرور کلاسیکل بن گیا ہے۔

فقط آپ کا خادم
خلیق انجم اشرفی

نیا سال مبارک

"پیام تعلیم" کا خوبصورت سالنامہ دستیاب ہوا دیکھتے ہی آنکھیں چندھیا گئیں۔ پہلے تو یقین نہیں آیا کہ یہ "پیام تعلیم" ہے تھوڑی دیر کے لیے دوسری دنیا میں کھو گیا۔ میرے وہم

گمان میں بھی نہ تھا کہ "پیام تعلیم" کا سالنامہ اتنا خوبصورت، حسین و دیدہ زیب ہوگا۔ خدا نظر بد سے بچائے۔

سرورق اور چھپائی کے تو کیا کہنے جتنی تعریف کی جائے کم ہے جیسے جیسے صفحات پلٹتے جائیں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔ اول تا آخر ختم کیے بغیر نہ رہ سکا۔ واقعی آپ لوگ مبارک باد کے مستحق ہیں جو سالنامے کو سجانے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رکھی۔ واقعی اب تو ماننا پڑا کہ چھپائی خوبصورتی اور دیدہ زیبی میں "پیام تعلیم" کا ہندوستان بھر میں کوئی بھی اردو رسالہ، چاہے وہ بڑوں کا ہو یا بچوں کا، ثانی نہیں۔ شاید اسے کچھ لوگ خوشامد سمجھیں گے۔ مگر سچ بات کہنے میں ڈر کیسا۔ ...سالنامہ کی سب ہی تخلیقات پسند آئیں مگر خاص طور سے "اُردو کی فریاد" "سب سے بڑا کون ؟" "ابن بطوطہ" "مادری زبان" "اورنگ آباد کے تاریخی مقامات" "جان بچی لاکھوں پائے" "چراغ سے چراغ جلتا ہے" "آنسو کی روشنی" اور "میری زندگی" بے حد پسند آئی۔ آپ ان کے لکھنے والوں تک دلی مبارک باد پہنچا دیجیے۔

آخر میں چلتے چلتے ایک بار پھر آپ کو اور آپ کے اسٹاف کو نئے سال کا حسین ترین "تحفہ سالنامہ" پیش کرنے پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ "پیام تعلیم" کو اور ترقی دے۔ آمین۔

فقط آپ کا اپنا
واحد علی خان — خریداری نمبر ۶۹۷

عرض ہے کہ "پیام تعلیم" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ سالنامہ ہر لحاظ سے خوب ہے۔ آپ نے اس میں بچوں کی دلچسپی کا بھی سامان اکٹھا کر دیا ہے۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔

امانت - داڑیا کا کھیڑا

عزت مآب جناب محمد حسین حسان ندوی صاحب!
ایڈیٹر پیام تعلیم دہلی۔

السلام علیکم:۔ عید مبارک کا دن قریب آرہا ہے۔
اس مبارک خوشی پر میری طرف سے ہدیہ عید مبارک قبول فرمائیے۔
عرصہ دو سال سے پیام تعلیم کا مستقل خریدار ہوں پرچہ ٹھیک
طرح ملتا ہے یوں تو اردو میں کئی رسالے بچوں کے لیے نکلتے
ہیں۔ لیکن ان میں اکثر مضامین نظم و نثر ایسے بچوں کے لیے شائع
ہوتے ہیں جن کی عمر اب کھیلنے کودنے کی باقی نہیں ہے۔ کچھ رسالے
ایسے بھی ہیں۔ جو ہیں تو ضرور بچوں کے لیے۔ لیکن غالباً وہ محض
دینی تعلیم کے لیے! لیکن آج کل کے زمانے میں صرف دینی
یا مذہبی تعلیم کافی نہیں۔ بلکہ سماجی طور پر بھی کچھ تعلیم حاصل کرنا
ضروری ہے۔ میری ناچیز رائے میں "پیام تعلیم" کے مضامین میں
بہت حد تک ایسی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ "پیام تعلیم" کے لیے
کتنی تعریفیں کروں کن الفاظ میں! "سورج کے سامنے شمع
کی تعریف کرنا" کے برابر ہوگا میں سمجھتا ہوں "پیام تعلیم" کی
مقبولیت اس کی شہرت کا سہرا ان ادیب دوستوں کی جانفشانی
کا نتیجہ ہے۔ جن کی رہبری جناب کر رہے ہیں۔
سالنامہ "پیام تعلیم" ابھی ابھی میری نظر سے گذرا۔
دیکھ کر طبیعت خوش ہوئی۔ میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ
ہندوستان بھر میں بچوں کے لیے جتنے بھی رسالے شائع
ہوتے ہیں۔ ان میں "پیام تعلیم" کا مقام سب سے اونچا ہے۔
چھپائی، مواد۔ اور میٹھی زبان کے لحاظ سے مجھے میرے
دوستوں اور بچوں کو آپ کا پرچہ "پیام تعلیم" بے حد پسند آیا
میری طرف سے مبارک باد قبول فرمائیے۔
غلام احمد نثار منیجر اورینٹ ہوٹل لال چوک سرینگر کشمیر

عید کی مبارک باد تو عرض ہے ہی لیکن ایک او
مبارکباد بھی قبول فرمائیے، اس عید پر اس قدر گراں قدر
تحفہ پیش کرنے کے لیے، سچ تو یہ ہے وہ دن بیت گئے جب
عیدی وصول کرنے میں لطف آیا کرتا تھا۔ اب کے عید
وصول کرنے سے زیادہ لطف آیا سال نامہ پاکر
سچ کہتا ہوں آپ نے کمال کر دیا ہے۔ لگن ا
مقصد کے تحت کام کرنے کا یہی پھل ہوتا ہے! اس
دو باتوں نے مجھے زیادہ متاثر کیا گٹ اپ اور معیار
اس بار ٹائیٹل ہی انوکھا، جدت آمیز اور جاذب توجہ
جہاں تک مضامین کا تعلق ہے ایک سے ایک بڑھ
فائدہ مند اور بچوں کی سمجھ میں آنے والا۔ مضامین اس
کی جان ہیں! کہانیوں کا حصہ بھی خوب ہے لیکن ایک
کہانی میں بعض باتیں ذرا کھٹکتی ہیں۔ مثلاً جناب ظ۔ انصا
صاحب کے مضمون یا جناب سلیم تمنائی صاحب کے ڈرا
میں، نظموں کا حصہ معمول کے مطابق کمزور ہے ان
وہ شوخی، شرارت اور چلبلا پن نہیں ہے۔ جس کی ضر
ہے، بس ایک طرح کا وقار ہے جو عموماً بڑی عمر کے
میں پایا جاتا ہے آپ پاپا صاحب کی چند ایک شوخ نظمیں
وہ تو بڑے کام کی بڑی مزیدار نظمیں کہتے ہیں۔ ایک ا
بات کھٹکتی ہے، اداریہ سے لے کر آخری صفحہ تک کہ
کتابت کی ایک آدھ غلطی پائی جاتی ہے۔ اس کی ط
بھی توجہ دیا کیجیے۔ گلیڈون عیسی صاحب مبارکباد کے
ہیں کہ انھوں نے صوری اعتبار سے اس کو بہتر بنا
کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ میرا اندازہ ہے وہ
کمرشیل آرٹسٹ ہیں۔ خالد عرفان۔

محترمی حسین حسان صاحب۔

"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا، بڑے شوق سے دیکھا اور پڑھا۔ اس کو دیکھ کر "پیام تعلیم" کا ابتدائی دور یاد آگیا۔ ۱۹۳۵ء-۱۹۳۶ء میں جب میں اسکول میں پڑھتا تھا تو پیام تعلیم بڑے شوق سے پڑھا کرتا، ایک پرچہ آتا تو دوسرے کا انتظار شروع ہوجاتا۔ اس وقت ہندوستان میں اس جیسا کوئی پرچہ نہیں تھا۔ مجھ جیسے بہت سے لوگ ہیں جنھوں نے پیام تعلیم سے مضمون لکھنا سیکھا ہے اور اس میں ذرا بھی مبالغہ نہیں کہ اس کی کوششوں سے بچوں کے ادب میں مفید اور دل چسپ مضامین اور کتابوں کے اضافے ہوئے ہیں۔ اب حالات بہت بدل گئے ہیں، کوئی اچھا رسالہ نکالنا بہت مشکل کام ہے، اچھے مضمون حاصل کرنا اس سے بھی مشکل ہے، خصوصاً بچوں کے لیے مگر آپنے اتنا ضخیم اور اچھا سالنامہ نکال کر ثابت کردیا کہ اگر خلوص اور دل و جان سے کوئی کوشش کی جائے تو بڑی سے بڑی مشکل پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میں آپ کو اس کامیاب سالنامے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

عبداللطیف اعظمی (مدیر ماہنامہ "صبح") جامعہ نگر

اچانک "پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ مجھے تو قطعی امید نہ تھی کہ آپ سالنامہ عام پرچوں کی طرح اسی دن اسی تاریخ کو روانہ کردیں گے جیسا عام پرچے کرتے ہیں۔ اتوار جنوری ۹۶ء کوئی کام تھے مگر میں سارا دن "پیام تعلیم" پڑھتا رہا،

آپ نے تو سارے ہی منتخب لوگوں کو جمع کرلیا ہے، اس بار مضامین کا انتخاب اور ترتیب بھی لاجواب ہے، نظموں میں نیا سال، جی چاہتا ہے، زیر زبر، باغ کی سیر، گاندھی جی، فریاد، مادری زبان، سورج، گلہری، سہانا موسم، علم وغیرہ خوب ہیں۔ نظم کبڈی نے بڑا متاثر کیا سچ مچ انسان کی ساری زندگی ایک کبڈی ہی تو ہے۔

گدھے کی سواری، پہچانئے تو سہی، آنسو کی روشنی، نرگی اسکول، پھلوں کی انجمن، گول گنبد، تارے، ابن بطوطہ، چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ بینا، حاجی بابا کی ڈائری، اور تعلیمی میلہ وغیرہ بے حد دلچسپ ہیں۔ ہر اس گھر میں جہاں بچے ہوں "پیام تعلیم" کو فوراً پہنچنا چاہیے۔ میری طرف سے اس قدر کامیاب سالنامہ پر مبارکباد قبول فرمائیے۔

اظہر افسر۔ (آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد)

پیام تعلیم کا سالنامہ اس وقت اپنے دامن میں ڈھیر سارے مضامین سمیٹے میرے سامنے ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس کس کی تعریف کروں فن کی، فن کار کی، یا آپ کی؟

میں جھوٹی تعریف کرنے کا قائل نہیں پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ اس گرانی میں اتنا خوبصورت سالنامہ اور وہ بھی صرف ایک روپیہ پچاس پیسے میں نکالنا بس آپ ہی کے دل گردے کا کام ہے میری نیک خواہشات آپ کے ساتھ ہیں۔

شفیع احمد جوہر۔ جھریا۔

قلمی دوستی

نام - ڈبلو. ایم. پرویز
عمر - پندرہ سال
مشغلہ ہنسنا اور ہنسانا۔ دوستی کا شوق کہانیاں لکھنا۔
پتہ - مسلم ہوسٹل ۲۰۲ تیسرا مالا بھنڈی بازار بمبئی ۳

*

نام - منہاج الہدیٰ
پتہ - لائن کشن گنج (پورنیہ)
عمر - گیارہ سال
کتابیں جمع کرنا اور ان کا مطالعہ کرنا۔ حدیث کی کتابیں پڑھنا۔ ہر طرح کے کھیلوں کو کھیلنا سب کے ساتھ محبت سے پیش آنا۔

*

نام - مبشر احمد
عمر - ۱۳ سال
پتہ - مبشر احمد ارشد منزل پاپا پیٹ (ورنگل)
شوق - پیام تعلیم پڑھنا۔ قلمی دوستی۔ کہانیاں لکھنا اور لائبریری قایم کرنا۔

*

نام - منہاج الہدیٰ
عمر - بارہ سال
پتہ - لائن کشن گنج (پورنیہ)
مذہبی کتابیں جمع کرنا، بیڈمنٹن، کرکٹ، ہاکی کھیلنا قلمی دوستی کے سلسلے میں جواب دینا۔

*

نام - اختر الواسع عرف راحت بن حیرت
عمر - ۱۵ سال
پتہ - اختر الواسع صدر لٹریری سوسائٹی
ایم. یو. سٹی ہائی اسکول علی گڈھ۔
مشغلے - تقریر کرنا۔ اچھے ادبی رسالے پڑھنا۔ مضمون لکھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

*

پی. ایم. یوسف
عمر - ۱۵ سال
پتہ - حاجی فرزند علی مارکیٹ (ابرڈین)
پورٹ بلیر۔ انڈمان
ہر قسم کے رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ نماز پڑھنا۔ ٹکٹیں جمع کرنا اور البم بنانا۔

*

نام - فضل الرحمٰن
عمر - ۱۵ سال
مشغلہ - اچھے ماہناموں کو پڑھنا اور قلمی دوستی کرنا ٹکٹ جمع کرنا وغیرہ
پتہ - مقام اور پوسٹ سالتوڑہ
بھایا۔ آدرہ
ضلع۔ پرولیہ (مغربی بنگال)

*

نام - محمد عدیل انصاری۔ عمر - گیارہ برس
مکان نمبر ۱۵ محلہ سکراول پورب، ٹانڈہ (یو. پی)
تعلیمی تاش کھیلنا۔ علمی و ادبی رسالوں کا مطالعہ کرنا *

اِدھر اُدھر سے

ایک انوکھا جانور

گواناکو

دلی کے چڑیا گھر میں ایک انوکھا جانور آیا ہے بہت انوکھا۔ گواناکو۔ اسے نہ آپ ہرن کہہ سکتے ہیں نہ اونٹ۔ ایسا لگتا ہے جیسے قدرت نے دونوں کو مِلا جُلا کر بنایا ہے اس کی گردن اونٹ جیسی لمبی ہے، کان اس کے باقی جسم کو دیکھتے بہت بڑے ہیں۔ دھڑ ہرن جیسا ہے۔

یہ انوکھا جانور گواناکو جنوبی امریکہ کا باسی ہے دہلی کے چڑیا گھر میں یہ نہرو زولاجیکل پارک حیدر آباد سے آیا ہے۔
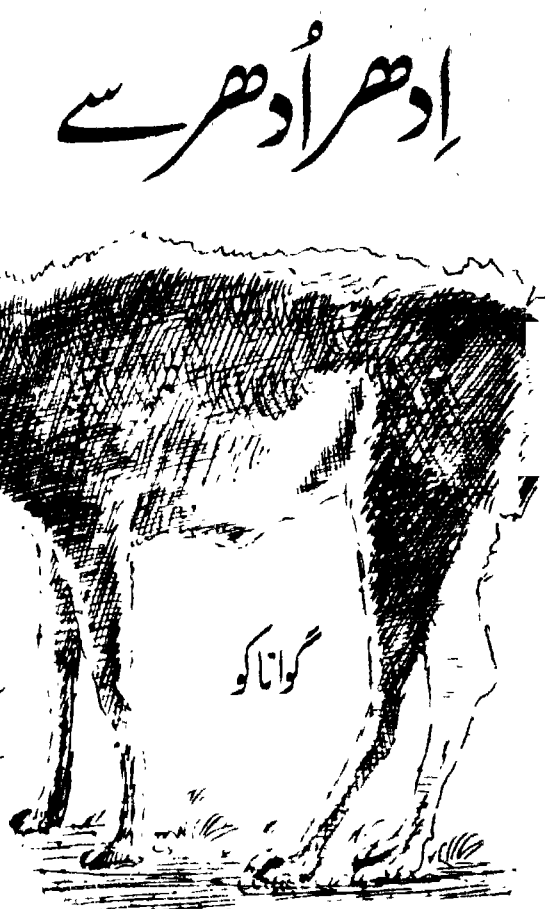
دہلی کے چڑیا گھر نے سرخ کانگو سے اس کا تبادلہ کیا ہے۔

کہتے ہیں میسور کا ایک جانور پالنے کا شوقین گواناکو کا ایک جوڑا پہلے پہل ہندوستان لایا تھا اور اس جوڑے نے بچے دیے۔

یہ جانور جنوبی امریکہ کیسے پہنچا اور کیسے وہاں زندہ اور سلامت ہے یہ بھی ایک لمبی داستان ہے۔ تاریخ جاننے والوں کا کہنا ہے کہ اب سے لاکھوں لاکھ سال پہلے اونٹ کا کنبہ اس علاقے میں رہتا تھا جسے اب مغربی امریکہ کہتے ہیں۔ گواناکو اور دکونا بھی اسی کنبے میں شامل ہیں۔

پھر کیا ہوا کہ نہ جانے کس وجہ سے اونٹ صاحب ایشیا اور افریقہ کی طرف چل پڑے۔ کہتے ہیں اب سے لاکھوں برس پہلے الاسکا کے مقام پر ایشیا اور امریکہ کے خشکی کے علاقے ایک دوسرے سے جُڑے ہوئے تھے بس اسی راستے سے کچھ جانوروں نے تو ایشیا کا رخ کیا اور کچھ

جانور جنوبی امریکہ پہنچ گئے ہوتے ہوتے امریکہ میں تو اونٹ کی نسل نیست و نابود ہو گئی مگر ایشیا اور شمالی افریقہ میں یہ اب تک باقی ہیں اور پالتو جانور کی حیثیت سے بہت مفید اور کارآمد ہیں مگر اسی کنبے کے دو جانور گواناکو اور وکونا جنوبی امریکہ میں اب تک باقی ہیں۔

اس علاقے کے پرانے .... بہت پرانے زمانے کے لوگ گواناکو سے عجیب عجیب کام لیتے تھے۔ جیسے ہمارے دیس میں کبوتروں سے پیغام رسانی کا کام لیا جاتا تھا یہ کام یہاں کے لوگ اس جانور سے لیتے تھے۔ بہت دور دور پیغام اسی کے ذریعہ بھیجتے تھے۔ رسی میں بہت پیچیدہ گرہیں لگا کر گواناکو کی فر کے اندر کے حصے میں باندھ دیتے تھے اور پھر کبوتر کی طرح گواناکو بھی پیام صحیح ٹھکانے پر پہنچا دیتا تھا۔ اونٹ کی طرح یہ باربرداری کے کام بھی کرتا تھا اور بھاری سامان ادھر ادھر لاتا لے جاتا تھا۔

نر گواناکو بہت بڑے کنبے کا سردار ہوتا ہے۔ اپنے دیس میں یہ بہت بڑے گلے کو چرانے لے جاتا ہے مادائیں اور بچے میدان میں چرتے رہتے ہیں اور یہ ان کی نگرانی کرتا ہے۔

اس کا قد (کندھوں سے) یہی کوئی تین فٹ سات انچ کا ہوتا ہے۔ پورا جسم بھورے رنگ کے اون سے ڈھکا ہوا، دم چھوٹی سی۔ (انڈین ایکسپریس)

ٹائپ مشین کے حرف 'ایم' سے تصویریں

فرنکفرٹ شہر کے ہر یوسف ایل نے چودہ ہزار مرتبہ اپنی ٹائپ مشین کے حرف 'ایم' پر انگلی لگائی اور اداکارہ برگیٹی باردوٹ کی تصویر بن گئی۔ وہ اپنی ٹائپ مشین کے حرف ایم کو بار بار دبا کر نہایت اعلیٰ تصاویر بنا لیتا ہے۔ مسٹر ایل اپنے سامنے فوٹو رکھ کر ٹائپ کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اس کی مہارت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی بھی ربر کا استعمال نہیں کرتا وہ اپنی تصویریں ٹائپ کے ایک ہی حرف ایم پر ہلکے اور بھاری دباؤ سے بناتا ہے۔

پتھر کے عہد کے پتھر والے اوزاروں کی دریافت

سمرقند نخستان (ازبکستان) میں ایک چھوٹے دریا کے کنارے ایک قدیم مقام کی دریافت کی گئی ہے جو چوتھے عہد ہزار سال قبل مسیح سے تعلق رکھتا ہے۔ سمرقند کے ماہرین نے کھدائی کے دوران یہاں چھوٹے چھوٹے اوزاروں کا ایک بڑا ذخیرہ بھی حاصل کیا جو بڑی ہنرمندی کے ساتھ بنائے گئے ہیں۔

اس دریافت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دریائے زرفشاں کی وادی میں ایک لاکھ برس سے بھی زیادہ پہلے قدیم انسانوں کی آبادی موجود تھی جو اس جگہ پر اتنے طویل عہد میں مسلسل آباد ہوتے رہے تھے۔

پتھر کے عہد میں نشانے بازی۔

باکو (تاس) آذربائیجان کے آرٹ اسکالر ناصر رضائیف یقین کرتے ہیں کہ پتھر کے عہد میں بھالے اور تیر اندازی کی مشق کے لیے نشانے بنائے جاتے تھے جہاں ہمارے پرکھے اپنے ہاتھوں کی سختی اور آنکھوں کی ہوشیاری کی مشق کرتے تھے۔ کوہستان پہاڑوں میں جو دیواری غار کے ملے ہیں ان میں ایک بیل کی تصویر بھی ہے ناصر رضائیف کا خیال ہے کہ بیل کے نقش

کی نوعیت یہ ثابت کرتی ہے کہ اسے نشانے بازی کے لیے بنایا گیا تھا۔

۸۱۰ گرام کا لیمو۔

سوردلوسک (تاس) یہاں ایک شوقیہ باغبان اناتولی اسکوف نے اپنے مکان میں ایک بہت بڑا لیمو پیدا کیا ہے جس کا وزن ۸۱۰ گرام ہے۔

یوپیا کے تقریری مقابلے میں ہاشمیہ ہائی اسکول نے شیلڈ جیتی

۹ دسمبر کو ۴ بجے شام یوپیا اسٹوڈنٹس سرکل کے زیر اہتمام انجمن اسلام ہائی اسکول کے ہال میں کالجوں اور اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے درمیان تقریری مقابلہ ہوا۔ مشہور اردو ادیب کرشن چندر نے صدارت کی۔ عباس شھوانی صاحب مہمان خصوصی تھے۔ جج کے فرائض مسز نور جہاں رضوی، ابراہیم فطرت صاحب اور سلمہ صدیقی صاحبہ نے انجام دیے

مقابلے کی ایک جج سلمٰی صدیقی صاحبہ نے ججوں کا فیصلہ سنایا۔ عباس شھوانی صاحبہ نے انعام تقسیم کیے۔ شیلڈ ہاشمیہ ہائی اسکول نے جیتی۔

کالج کے طالب علموں میں حسن بھوسلے نے پہلا انعام زہرہ کڈالکر نے دوسرا اور رفیعہ شبنم نے تیسرا انعام حاصل کیا۔ ظہیر صدیقی مومن، جان عالم اور شبیر حسین کو خصوصی انعام دیے گیے۔

ہائی اسکول کے لڑکوں میں پہلا انعام قاضی مغیث الدین کو دوسرا تنویر اختر آفندی کو اور تیسرا کڈالکر کو ملا۔ جمیل گلریز اور امتیاز احمد نے خصوصی انعام حاصل کیے۔

تحریری مقابلے میں نادرہ، غلام محمد سودا گر، خورشید قریشی اختر جمال، ابو زبیر، صبیحہ سلطانہ، عرفان احمد، عبدالرحمٰن مومن، زہرہ کڈالکر، محمد نذیر صدیقی، میمونہ، رفیعہ شبنم، عاشق حسین قریشی اور محمد امین خاں نے انعام حاصل کیے۔

مدرسہ فرقانیہ واکولہ سانتا کروز کا شاندار جلسہ اور مشاعرہ

۱۰ دسمبر کو اس مدرسے کے لڑکوں اور لڑکیوں نے قرأت، نظم پڑھنے اور تقریر کے انعامی مقابلے میں حصہ لیا۔ قرأت کے مقابلے میں محمد حنیف، عبادت حسین اور نور الدین کو انعام ملا۔ نظم خوانی کے مقابلے میں سلمہ بی، مرزا عزیز، محمد فاروق اور چھوٹو میاں کو۔ تقریر میں عبدالغفور، اقبال احمد، اختر، محمد یوسف کو۔

شبیر احمد راہی جلسے کے صدر تھے۔ قاضی اطہر مبارکپوری اور جناب مولانا انیس الرحمٰن نے ججوں کے فرائض انجام دیے جلسے کے بعد جناب شبیر احمد راہی کی صدارت میں بہت کامیاب مشاعرہ ہوا۔

اردو ہائی اسکول چالیس گاؤں کی نئی عمارت کا افتتاح۔

۲۹ نومبر ۱۹۶۶ء کو ۳ بجے سہ پہر جناب سردار سیٹھ نے اس نئی عمارت کا افتتاح کیا۔ ہیڈ ماسٹر جناب مظہر علی اور جناب ماسٹر طالب علی نے پر زور تقریریں کیں اور سردار سیٹھ کا شکریہ ادا کیا۔ انھی کی بدولت یہ نئی عمارت وجود میں آئی ہے شہر کے معززین اور بہت سے لوگوں نے جلسے میں شرکت کی۔

نگر پریشدار دو پرائمری اسکول میں تعلیمی فنڈ کا قیام

غریب طالب علموں کی تعلیمی رکاوٹ دور کرنے کے لیے اس مدرسے میں ایک تعلیمی فنڈ کمیٹی [illegible] اس سلسلے میں ایک جلسہ جناب شیخ محمود حسن صاحب کی صدارت میں ہوا۔ اسی میں کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ صدر جناب محمود صاحب [illegible] نائب صدر سید یعقوب، خازن منصور خاں، سکریٹری محمد اصغر، معاون سکریٹری شیخ رسول۔ ممبران جناب عبدالقیوم صاحب، محمد سلیمان صاحب، محمد یوسف صاحب، قاضی سلیم صاحب، غلام جیلانی صاحب، عباس خاں صاحب۔

مدرسہ اسلامیہ واکلہ ضلع اورنگ آباد کا سالانہ جلسہ

۵ شعبان کو اس مدرسہ کا سالانہ جلسہ ہوا شیخ الحدیث مولانا محمد عثمان صاحب مالیگانوی صدر تھے۔ حاجی احمد کمال بن عقیل نے بہت اچھی تقریر کی۔ مدرسے کے دوسرے طالب علموں نے اپنا پروگرام حسن و خوبی سے پیش کیا۔ علمائے کرام کی تقریریں بھی ہوئیں۔ جلسہ ہر لحاظ سے کامیاب رہا۔

انجمن ہائی اسکول کرلا نے چھوٹی بچت میں اعزاز حاصل کیا۔

کرلا کے علاقے کی چھوٹی بچت کی مہم کی افتتاحی تقریب ۸ بجے رات کو انجمن ہائی اسکول میں منعقد ہوئی چھوٹی بچت کے محکمے کے وزیر جناب طالع یار خاں صاحب نے پاس بکیں تقسیم کیں۔ اس مہم میں کرلا کے دس اسکول حصہ لے رہے ہیں۔ انجمن ہائی اسکول نے اس سلسلے میں اعزاز حاصل کیا۔

سب سے چھوٹا اسکول

دنیا کا سب سے چھوٹا اسکول مغربی جرمنی کے شمالی فاریزین ساحل پر ایک چھوٹے سے جزیرے میں ہے۔ اس جزیرے کا نام گریڈے ہے اور اس کا رقبہ چھ سو پچاس ایکڑ ہے۔

حال ہی میں اس اسکول کے طالب علموں کی تعداد دگنی ہوگئی ہے پھر بھی یہ دنیا میں سب سکولوں سے چھوٹا ہے۔ اب تک اس سکول میں صرف ایک ہی طالب علم تھا اب اس کی چھوٹی بہن بھی داخل ہوگئی ہے۔

جزیرے میں کل ۹ کنبے آباد ہیں یعنی ۹ بالغ اور ۴ بچے یہ کنبے یہاں کئی پشتوں سے بس رہے ہیں کیل کی صوبائی سرکار کے پروگرام کے تحت جزیرے میں بہت سے بہتری کے کام ہو چکے ہیں ٹیلی فون لگایا جا چکا ہے ایک کشتی ہفتے میں تین دفعہ ڈاک پہنچاتی ہے، ایک جنریٹر بجلی مہیا کرتا ہے، اور پھر یہ اسکول ہے۔

سکول کی استانی کا نام فردسلویا نیوہٹر ہے وہ بیوہ ہے اور ڈرسڈن کی رہنے والی ہے اس کا خاوند ڈاکٹر تھا۔ فرد نے کچھ عرصے کے لیے پڑھانے کی ٹریننگ حاصل کی اور پھر کچھ عرصہ منسٹر میں پڑھاتی رہی۔ بعد میں وہ اپنے بیٹے کے پاس برازیل چلی گئی اسے وہاں پتہ چلا کہ گریڈے کے اسکول میں ٹیچر کی ضرورت ہے۔ اس نے درخواست دی اور وہ ٹیچر مقرر کر دی گئی۔

اس اسکول میں زیادہ نقشوں اور چارٹوں کی ضرورت نہیں ہے تینوں ایک ہی اٹلس سے کام چلا لیتے ہیں تاہم اسکول کو اتنا ہی لٹریچر مہیا کیا جاتا ہے جتنا مغربی جرمنی کے کسی اور اسکول کو کیا جاتا ہے اسکول کو ٹریفک سے متعلق تازہ ترین سرکلر تک بھیجے جاتے ہیں حالانکہ گریڈے کی ٹریفک دو عدد ٹریکٹروں تک محدود ہے۔

(بحوالہ ورسل پریس سروس)

پرنٹر پبلشر [illegible] نے مکتبہ جامعہ [illegible] جامعہ نگر نئی دہلی [illegible] سے شائع کیا

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کیلئے منظور شدہ

فہرست

بچوں سے باتیں

سال نامے کے سلسلے میں خطوں کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ ہم نے کتابت باریک کردی ہے پھر بھی بہت سے خط چھپنے سے رہ گیے۔ یہ اگلے پرچے میں چھپیں گے۔

ہمیں خوشی اس بات کی ہے کہ سال نامے کی طرف ان بزرگ ادیبوں نے بھی توجہ فرمائی ہے جن کی اردو ادب میں بڑی حیثیت ہے۔ جناب رشید حسن خاں صاحب کا نام ان صفحوں میں بار بار آیا ہے۔ بے لاگ بات کہنے میں مشہور ہیں۔ لگی لپٹی نہیں رکھتے۔ اب کے انھوں نے بھی آپ کے سالنامے پر توجہ فرمائی ہے۔ آپ ان کا خط ضرور پڑھیے۔ ہماری بات کی تصدیق ہو جائے گی۔ بحیثیت مجموعی انھوں نے آپ کے خاص نمبر کو پسند کیا ہے۔ مگر جو باتیں انھیں کھٹکی ہیں ان کے بارے میں بھی صاف صاف لکھا ہے۔

پہلی بات چھپائی کی ہے اور سچ مچ چھپائی جیسی اچھی ہونی چاہیے، نہیں ہے خاص طور سے سالنامے کی۔ اصل میں پچھلے مہینے ہمارے پریس میں آفسٹ کی دو مشینیں اور آگئی ہیں۔ ان کے لیے پریس کی عمارت میں جس جگہ لگانی تھی موجودہ مشین کو ادھر سے اُدھر کرنا پڑا۔ ادھر سال نامہ چھاپنے کی جلدی تھی۔ بس اسی بھاگ دوڑ میں چھپائی ہوئی۔ پر اب ہمارے جنرل منیجر صاحب نے امید دلائی ہے کہ انشا اللہ چھپائی کا انتظام دن پر دن بہتر ہوتا جائے گا۔ دعا کیجیے ان کی یہ توقع صحیح ثابت ہو۔

۲۔ تصویروں والا پیراگراف آرٹسٹ صاحب کو دکھا دیا گیا ہے وہ چوکنے ہوگیے ہیں۔ آیندہ زیادہ توجہ سے کام کریں گے۔

۳۔ ایسا لگتا ہے کہ رشید صاحب کو اتفاق

سے جو پرچہ ملا وہ دفتری صاحب کی کارگزاریوں کا شہکار تھا۔ انھوں نے جن جن صفحوں کا حوالہ دیا ہے ہم نے اپنے ہاں کے پرچوں میں دیکھا ایسی کوئی خرابی نظر نہ آئی۔ رشید صاحب کی خدمت میں دوسرا پرچہ بھیجا جا رہا ہے۔

۴۔ پیام تعلیم کی کاپیاں عموماً تین بار پڑھی جاتی ہیں۔ پھر بھی بھول چوک ہو جاتی ہے کبھی تصحیح کرنے والے کی نظر چوک جاتی ہے کبھی کاتب صاحب سے تسامح ہو جاتا ہے۔ مثلاً رشید صاحب نے جس مصرعے کا حوالہ دیا ہے اُجلی اُجلی سی ڈھلی ڈھلی سی یہ چاندنی رات۔ خوب یاد ہے کہ اس میں ایک "اجلی" کو کاٹ دیا گیا تھا۔ مگر کاتب صاحب نے جوں کا توں رہنے دیا۔ دوسرا مصرعہ اصل کے مطابق ہے۔ میں تمام نظمیں اپنے یہاں کے شاعروں کو دکھا لیتا ہوں۔ غالباً نظم پڑھتے وقت ان کی نظر نہ گئی۔

اور جہاں تک موقع کی یا گذشتن اور گزاشتن کی بات ہے تو ہمارے بہت کم مضمون نگار حضرات ان باتوں کی طرف توجہ فرماتے ہیں۔ ہمارے کاتب صاحبان بھی اسی ڈگر پر چلنے کے عادی ہیں۔ مسودے پر نظر ثانی کرتے وقت میں ٹھیک کر دیتا ہوں مگر گذشتن اور گزاشتن کے سلسلے میں بھی چوک جاتا ہوں۔ بہرحال میں رشید صاحب کا بہت ممنون ہوں کہ انھوں نے ان غلطیوں کی نشان دہی فرمائی۔

اچھا یہ بتایئے حاجی بابا والی کہانی آپ کو کیسی لگی۔ بہت سے بچوں نے اسے پسند کیا ہے۔ یہ حاجی صاحب اس پرچے میں تشریف رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ بڑی بی والا مضمون پڑھیے۔ کپڑوں والا مضمون پڑھیے اور ہاں "بھاپ کی قیمت" کا ذکر ہم نے پچھلے پرچے میں کیا تھا۔ وہ بھی اس پرچے میں پڑھیے۔ اتنا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کیے بنا آپ کو چین نہ آئے گا۔ یہ ڈراما ہمارے تعلیمی میلے میں دکھایا جا چکا ہے۔ بہت کامیاب رہا تھا۔

ان کے علاوہ بھکاری والی کہانی ہے۔ آپ کو خاص طور پر پسند آئے گی پھر اچھی اچھی نظمیں ہیں۔ راجہ پکوڑی مل۔ عقل بڑی یا بھینس وغیرہ یہ بھی آپ کو بہت اچھی لگیں گی۔

جناب سعادت نظیر

ترنگا

(ہمارا قومی جھنڈا)

لہرا ترنگے لہرا ہوا میں
بھر دے رنگ و نور فضا میں

میرے ترنگے تیری لالی
جاں بازوں کے خون کی سرخی
آزادی کی ایک نشانی
آزادی ہے جان وطن کی

لہرا ترنگے لہرا ہوا میں
بھر دے رنگ و نور فضا میں

میرے ترنگے تیری سفیدی
ایک علامت امن و اماں کی
امن و اماں ہے بستی بستی
قصبہ قصبہ ، نگری نگری

لہرا ترنگے لہرا ہوا میں
بھر دے رنگ و نور فضا میں

میرے ترنگے تیرا ہرا پن
صحرا صحرا گلشن گلشن
دانہ دانہ خرمن خرمن
کھیت بنا ہے تجھ سے ہر بن

لہرا ترنگے لہرا ہوا میں
بھر دے رنگ و نور فضا میں

میرے ترنگے تو ہے سُندر
چکر ہے تیرا سچ کا پیکر
انساں کی منزل کا رہبر
چاند اور سورج صدقے تجھ پر

لہرا ترنگے لہرا ہوا میں
بھر دے رنگ و نور فضا میں

جناب
ظ۔ انصاری

حاجی کمبا کی ڈائری

جو ظ۔ انصاری نے نقل کر کے بھیجی

آپ دل کیوں میلا کرتے ہیں۔ ہار جیت تو زندگی میں چلتی ہی رہتی ہے۔ الیکشن تو ایک طرح کا سپورٹ ہے۔ اس میں ہارنے کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ آدمی کام سے گیا۔ ہمارے یورپ میں تو الیکشن ہارنے والے کبھی کبھی جیتنے والوں سے زیادہ کام کر جاتے ہیں۔ جارج برنارڈ شا جیسا قلم کا دھنی معمولی الیکشن میں ہار گیا لیکن دنیا میں اتنا نام کر گیا کہ دو سو جیتنے والوں نے مل کر نہیں کیا ہوگا۔

پنجرے میں طوطا بھی پَروں کے اندر چونچ دیے بیٹھا رہا۔ اُسے بھی ہماری ہار کا غم معلوم ہوتا تھا۔

راتوں رات ہم پھپھوند پور سے نکل آئے ریل گاڑی آڑی چلی جا رہی تھی، لیکن جی بیٹھا جا رہا تھا۔ مگر ہماری سکریٹری سمجھانے لگی کہ حاجی بابا

ہم نے پچھلی سیٹ کے نیچے سے بکس نکالا حقّے کے پرزے جوڑے اور پیچوان منہ سے لگا لیا۔ اس میں لکھنوی قوام کی جگہ تماکو کا حلوا جم سکے

پھول پچ جاتے ہیں تب سُلگتا ہے۔ تباکو سے ہمیں
سخت پرہیز ہے، کم بخت دانت گندے کرتا ہے اور
آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں، کھانسی آتی ہے؛ اس لئے
دادامیاں نے تمباکو کی جگہ گاجر کے حلوے کا نسخہ بتایا
تھا۔ ستّر برس سے ہم وہی چلا رہے ہیں۔ پریشانی
میں آدمی طرح طرح کی حرکتیں کرتا ہے۔ کچھ لوگ اپنے
ہی ہاتھ کے ناخن کھانے لگتے ہیں، کچھ سر کھجاتے ہیں، کچھ
بیڑی سگریٹ دھونکتے ہیں، کچھ آستین سے ناک رگڑتے
ہیں۔ یہ سب بُری عادتیں ہیں۔ دادا ابّا نے منع کیا تھا کہ
بیٹا، یہ سب نہ کرنا۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ گاجر کا
حلوا نصیب کرے، مرنے سے گھنٹہ بھر پہلے پاس بلایا،
سر سہلایا اور تین سو برس پرانا حقّہ ہمارے سپرد کیا کہ لو
پریشانی کے وقت کام آئیگا۔ اس میں تازہ گاجر کا حلوا
جما کر سلگایا کرنا۔ ہم نے ادب سے منہ لٹکا کر عرض کیا
"حضور دادا ابّا اس میں سے تو تمباکو کی بو آتی ہے۔"
فرمایا، ہاں برخوردار، یہ بڑا تاریخی حقّہ ہے۔ تین سو برس
سے اس میں تباکو کا قوام پیا گیا تو نس نس میں اس کی
بو بھری ہے۔ تم کبھی تمباکو منھ سے نہ لگانا اور اس حقّے
کا کرشمہ دیکھنا۔

دادا جان کے انتقال کے بعد حقّے کی زیارت
کے لئے دور دور سے لوگ آنے لگے تانتا بندھ گیا۔
ایک بزرگوار جو کسی امریکی عجائب خانے کے
سپرنٹنڈنٹ معلوم ہوتے تھے، بولے کہ یہ عین مین وہی
حقّہ ہے جو ہلدی گھاٹی کی لڑائی کے وقت جہانگیر
نے اپنے ہاتھی کے ہودج میں سنبھال رکھا تھا۔ اودے پور
کے ایک چترکار نے حقّے کے ساتھ جہانگیر کی تصویر
بنا کر رانا کے دربار میں پیش کی تھی ـــ اور شاہجہاں
نے اُس سے خرید لی تھی۔

ایک اور شخص نے تحقیق سے بتایا کہ یہی وہ
حقّہ تھا جو شاہجہاں سے داراشکوہ کو وراثت میں پہنچا۔
اور سموگڑھ کی لڑائی سے پہلے داراشکوہ اسی حقّے
کے دم لگا رہا تھا۔

پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد لال قلعے
کی لوٹ میں احمد شاہ ابدالی کو یہ حقّہ بھی ہاتھ آیا تھا اور
اس نے غصّے میں زور سے پٹک دیا "خو، تم شیر بچے کو
حقّہ پینا سکھا کر برباد کروگے؟" پٹکتے ہی حقّے کے
جوڑ بند کھل گئے اور خادموں نے ہیرے موتی چُن
لیے۔ ٹوٹا حقّہ پڑا رہ گیا۔

پرانے لوگ اس حقّے کی ایسی ایسی کہانیاں
سناتے ہیں کہ لکھیں تو طلسموں کی کتاب بن کر رہ جائے۔
اصل میں بات یہ ہے کہ جس طرح شیرنی بارہ برس
میں ایک دفعہ بچّے دیتی ہے اسی طرح بڑے آدمیوں

کی باتیں بھی دس بیس برس میں ایک بار ضرور بیاہتی
ہیں، ایک ساتھ دو دو بچے دیتی ہیں۔ آگے حساب
کا سوال ہے۔ ضرب تقسیم کرکے پتہ لگاؤ کہ ایک اصلی
بات تین تین سو سال میں کتنی باتیں پیدا کرے گی۔ سو
کسی ایک بات کی اولاد، یا تنی بہت سی باتیں ہمارے
چھتے کے بارے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہی ہوتا ہے۔
اصلی بات تو گم ہوگئی اولاد چھوڑ گئی۔

خیر جی، ہمیں کیا، دنیا کو تو من گھڑت میں مزہ
آتا ہے ــ ہمیں اپنے چھتے میں۔

ابھی ہم چھتہ گڑ گڑا رہے تھے کہ انجن سے
زور کا بھبکا اٹھا اور کھڑ کھڑ آواز آئی۔ بچاری گلگلہ
کے منھ پر ہوائیاں اڑنے لگیں کہ "گوڈ سیو دی حاجی
بمبا" (God save the Haji Bamba)

ہم نے بھی جلدی جلدی چھتے کے کش
لیے۔ اور چلم بجھا دی۔

چیل گاڑی ہوا میں ایسے دھچکے کھانے لگی
جیسے بھیونڈی نور کی سڑک پر بیل گاڑی۔ ہم نے
جلدی سے انجن بند کیا اور گاڑی اتارنے لگے
نہ جانے کون سی نیکی کام آئی کہ چیل گاڑی کپاس
کے نرم کھیت کی کالی مٹی میں پکے آم کی طرح بھد
سے ٹپک پڑی۔ بس گلگلہ کی چیخ نکل گئی۔

داہنی طرف کی ٹنکی دیکھی سب ٹھیک، پٹرول
بمبئی تک کے لیے کافی۔ بائیں طرف کی ٹنکی دیکھی،
گھی موجود ــ وہ بھی پٹرول کے ساتھ رس رس
کر انجن میں جا رہا تھا۔ پھر کیا ہوگیا؟ منتر غلط پڑھ
دیا تھا کیا؟

گلگلہ نے اپنا ماتھا ٹھونکا اور کچھ سوچ کر
بولی: "میں نے یہ اصلی دیسی گھی لالہ لکھن لال کی
دوکان سے منگایا تھا۔ وہی جو آپ کے الیکشن کے
لیے کام کر رہے تھے۔ کہیں گھی میں تو ملاوٹ نہیں
ہے؟"

طوطا زور سے چہکا: دریں چہ شک،
دریں چہ شک!!

ہم نے اپنی ایک مشت پنج انگشت داڑھی
تھپتھپائی۔ لالہ لکھن لال کے گھی نے ہمارا انجن
بگاڑ دیا۔ ظالم سے کہا تھا اصلی دیسی گھی دینا معلوم
ہوتا ہے، دیسی تو دیا، اصلی نہ دیا۔ اس سے تو اچھا
تھا کہ دیسی نہ دیتا اصلی دیتا۔

اب ہم کہاں ہیں اے پروردگار؟ دور جنگل میں ریل کی پٹری نظر آئی۔ پاس گیے تو اسٹیشن کا بچہ دکھائی دیا۔ نام کے بورڈ پر لکھا تھا "چاندنی" چھوٹا سا صاف ستھرا اسٹیشن، آدمی نہ آدم زاد۔ کانٹے والا، نہ پانی والا۔ ہم نے سوچا کانٹے والا اور پانی والا تو یوں بھی اسٹیشن ماسٹر کے گھر کے کام کاج میں لگے رہتے ہیں۔ کبھی فرصت ہوئی تو ٹہلتے ہوئے اسٹیشن دیکھنے چلے آتے — مگر خود اسٹیشن ماسٹر کہاں ہے، اس سے ملا جاتے۔ گاؤں کا اسٹیشن ماسٹر ہمیشہ گائے بھینس پالتا ہے اور اصلی دودھ گھی رکھتا ہے، اور بیوپاریوں کو دودھ دیتا ہے۔

عجیب اسٹیشن کا بچہ تھا۔ چاروں طرف گھنا جنگل سامنے کپاس کا ایک آدھ کھیت — اور بس!

وہ جو پینسٹھ ۶۵ برس پہلے ہم نے تاریخ جغرافیہ جی لگا کر پڑھا تھا وہی کام آیا۔ اُڑان کے گھنٹے دیکھنے سے اندازہ ہوا کہ یہ لکھنؤ اور بمبئی کے راستے میں بُرہان پور کا جنگل ہونا چاہیے۔ یہاں پاس ہی اَسیر گڑھ کا قلعہ ہوگا۔ اسی قلعہ کے باہر بائی چیتو خاں کو خونخوار چیتا کھا گیا تھا اور بعد میں انگریزوں کو اُس بہادر کی ہڈیاں ملی تھیں۔

اب سمجھے کہ ہم "نیپا نگر" کے پاس والے گھنے جنگل میں ہیں۔ جہاں کے درختوں سے ہندوستانی کاغذ بنتا ہے اور دور دور سے صاحب اور میم صاحب لوگ شیر اور چیتے کا شکار کھیلنے آتے ہیں۔

ہمارے پاس تو بندوق کیا، غلیل بھی نہیں کاش دادا جان نے ہمیں تحفے کے بجائے اپنی بندوق دی ہوتی جو وہ سَن گیارہ کے دربار کے وقت پرنس آف ویلز کو تحفے میں دیے آئے — دلی دربار میں گیے اور شہزادے کو بندوق بخش کر، کوٹ میں رانگ کا میڈل ٹنکوا کر پھپھوند پور چلے آئے۔ کیسے بھولے لوگ تھے۔ ہائے!

"ارے میاں ٹےسَن ماسٹر!"

"ٹےشن ماسٹر!"

دیہاتیوں کے انداز میں ہم نے بہتیری ہانک لگائی۔ کچھ جواب نہ پایا۔ آخر اسٹیشن میں پیچھے کی طرف سے داخل ہوئے کہ دیکھیں تو سہی! اسٹیشن ماسٹر کا کمرہ چاروں طرف سے بند تھا۔ اوپر روشن دان سے ٹیلی گراف کی ٹھک ٹھک کھٹ کھٹا کھٹ کھٹا کھٹ سنائی دی۔

مس گلگلہ نے سوئٹزرلینڈ میں ایک بار ٹیلی گراف کے اسکول میں ٹریننگ لی تھی۔ وہ یہ زبان سمجھتی تھی۔ اس نے بجلی کے کھمبے کو کان لگائے۔ منٹ بھر نہ ہوا کہ وہ چونک گئی۔ ہمارے کان کے پاس منھ لا کر بولی:

"سُنا؟"

"نہیں سُنا"

"نہیں سُنا"

شیر بیٹھا ہے پلیٹ فارم پر ــــــ اُدھر اسٹیشن ماسٹر پچھلے اسٹیشن کو خبر دے رہا ہے:

"ہلو، ہلو، "چل کہاں" اسٹیشن ریل کو آگے کے اسٹیشن جانے دو "چاندنی" پر نہیں روکنا پلیٹ فارم پر شیر آگیا ہے۔ ہم سب اندر بند ہیں۔ کسی آدمی کے پکارنے کی آواز باہر سے آتی ہے۔ دیہاتی معلوم ہوتا ہے۔ ریل تیزی سے آگے جانے دو۔ ٹرالی پر شکاری بھیجو۔ بندوقچی شکاری!"

ہم اُلٹے پاؤں وہیں سے نکل آئے، لیکن جی میں سوچ لیا کہ یہاں سے شیر کا شکار کیے بغیر ہم نہیں جائیں گے۔

(باقی پھر) نقط حاجی بابا

ڈنگو۔

ترجمہ: قرۃ العین حیدر

بچپن اور اسکول کے زمانے کی محبّت کے نقوش بڑے گہرے اور دیرپا اثر رکھنے والے ہوتے ہیں جن کو یاد کرکے بڑے لوگ بھی لطف اندوز ہوتے ہیں "ڈنگو" ان واقعات کی ایک سچی تصویر ہے۔

قیمت: ۲/۲۵

اچھی کہانیاں

ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲/[illegible]
اس نے کیا کرنا جانا	آصف مجیب	[illegible]
بچّوں کی کہانیاں	عبدالواحد سندھی	۰/۲۷
پاک کہانیاں (اوّل)	مقبول احمد سیوہاروی	۰/۹۵
" " (دوم)	"	۱/۱۵
تانبیل خاں	محمد حسین حسّان	۰/۳۰
ترکوں کی کہانیاں		۰/[illegible]
جنگو کی بلّی	عبدالواحد سندھی	۰/۲۵
چوہوں کی کانفرنس	احسن عثمانی	۰/۴۵
چنبیلی	محمد حسین حسّان	۰/۵۰
خربوزہ شہزادہ کا سر بن گیا	کوثر بانو	۰/۳۰
شہزادہ اور ٹھگ		۰/۴۵
شہزادی گلنار	پروفیسر عطاء اللہ	۰/۴۰
شہزادی گلفام	ثریا بیگم	۰/۵۰
شیدلا	پروفیسر محمد مجیب	۰/۵۰
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	۰/۵۰
مزہ چکھائیں گے		۰/۳۵
مرغی اجیر حلی	ڈاکٹر ذاکر حسین	۰/۲۵
ننھا ٹٹو	خورشید سلطانہ	۰/[illegible]

جناب منظر انصاری

عقل بڑی یا بھینس!

(۱)

کل میں نے مادھو سے پوچھا عقل بڑی یا بھینس ۔۔۔ بھینس بڑی جھٹ بولے مادھو بھینس بڑی سرکار
لہک لہک کر مادھو نے پل تعریفوں کے باندھے ۔۔۔ بھینس کے گن یوں گائے جیسے رم جھم پڑے پھوار
گن گن اک اک بات بتائی سارا گر سمجھایا ۔۔۔ مادھو کے دل میں جاگا بھینسوں کا کومل پیار
دیدوں کو مٹکا کر مادھو سینہ تان کے بولے ۔۔۔ بھینس نہ ہو تو جینا مشکل بھینس سے ہے سنسار
کالی کالی بھینسوں سے ہے نگر نگر اجیارا ۔۔۔ بھینس نہ ہو تو چوپٹ ہو کر رہ جائے بیوپار
بھینس کے گن مورکھ کیا جانیں یہ مادھو سے پوچھو ۔۔۔ اس کے سوکھے گوبر میں ہے چاندی کی جھنکار
بھینس کے تھن میں کروٹ لیں جیون کے کومل گیت ۔۔۔ مند اندھیارے نغمہ بن کر پھوٹے دودھ کی دھار

(۲)

بھینس کا تازا گاڑھا گاڑھا میٹھا میٹھا دودھ ۔۔۔ دودھ کا نام آتے ہی لی مادھو نے اک انگڑائی
اور زباں ہونٹوں پر اپنی پھیر کے بولے مادھو ۔۔۔ دودھ سے گھی اور دودھ سے مٹھا مکھن اور ملائی
دودھ سے جاگے گھر گھر سکھ کی ٹھنڈی ٹھنڈی جوت ۔۔۔ دودھ نہ ہو تو گھر کی تریا روز کرے لڑائی
دودھ ہی سب کا من بھاتا ہے کیا راجا کیا پرجا ۔۔۔ دودھ کے ناطے قایم ہے انسانوں میں ایکائی
دودھ کے دھاروں سے ٹھنڈی ہو نفرت کی چنگاری ۔۔۔ دودھ کے رشتے آپس میں سب انساں بھائی بھائی
دودھ نہ ہو تو ناممکن ہے جیون کا کلیان ۔۔۔ دودھ سے دھرتی والوں نے بل پایا شکتی پائی
عقل بڑی ہو چاہے جتنی بھینس مگر ہے بھینس ۔۔۔ بھینس مری بدھائی تجھ کو بھینس مری بدھائی

(۳)

بھینس سے ہے جنگل میں منگل مادھو ناچ کے بولے ۔۔۔ اور نگوڑی عقل تو جیسے بھس میں اک چنگاری

بھینس بنائے سب کی بگڑی آئے سب کے کام
اور یہ ظالم عقل بگاڑے بنے بنائے کام
تن کی کالی بھینس مگر من اُجلا جیسے دودھ
اور یہ ناگن عقل یہ بِس کی پوٹ ارے بھگوان
عقل چلائے بان تو آئے دنیا میں بھونچال
بھینس شفقت کا بدرا دے بانٹے سونا چاندی
سیدھی سادی بھینس بچاری گھاس چرے بگرائے
عقل بڑی ہو بھی تو کیا ہے بھینس بڑی اچھی سرکار

لے کر سب کا دل مٹھی میں کرتی ہے دل داری
پھیر دے پانی کیے کرائے پر سب کے ہتیاری
دنیا بھر کے سکھ کی خاطر دکھ سہتی دکھیاری
جس کو چھو لے وہ کر دے دنیا پر جینا بھاری
بھینس جہاں ڈکرائے جاگ اٹھے کھیتی پھلواری
عقل زمانے بھر کو لوٹے پھیلائے بے کاری
قدم قدم پر بین بجا کر عقل کرے بٹ ماری
اتنا کہہ کر مادھو نے کی چلنے کی تیاری

(۴)

جانے سے پہلے مادھو نے ہم کو ایسے دیکھا
اور میں تکتا تھا مادھو کا منہ بیٹھا چپ چاپ
آخر ہم نے پوچھا! لیکن یہ بتلاؤ مادھو
عقل نہ ہوتی گر تم کو تو یہ سمجھاتے جاؤ
عقل بہت ہی پیاری سندر کومل اور معصوم
عقل بڑی اچھی ہے مادھو جیسے ماں کی ممتا
یہ اپنی ہی کرنی کا پھل ہے مٹی کے مادھو
عقل بڑی نعمت ہے مادھو عقل کو تم پہچانو
اس کی نظر میں ایک ہیں دونوں بھینس ہو یا بھگوان

جیسے اپنی جیت پہ کوئی ویر کھڑا للکارے
مادھو ہانکے جاتے تھے اپنی سی پاؤں پسارے
عقل نہ ہو تو کون کرے دنیا کے وارے نیارے
ایسی پیاری باتیں کیسے کرتے مادھو پیارے
جیسے تیرا ننھا مہک مہک کل کاری مارے
اس کی دنیا میں ہم انسانوں نے ڈاکے مارے
خود ہی بچھائے ہم نے تلووں کے نیچے انگارے
عقل نہ ہو تو بھینس کے گن کیا جانو تم بے چارے
عقل نہ ہو جس مورکھ کو وہ چاہے جس کو پکارے

(۵)

سُن کر میری باتیں مادھو بولے سچ ہے رام
عقل تجھے پرنام ہمارا عقل تجھے پرنام

جگل کرے

بڑی بی

بڑی بی کا آنا اور طوفان کا آنا برابر ہے۔
دس پندرہ دن میں ان کا ایک مرتبہ ہمارے ہاں آنا
اور دو چار دن مہمان بن کر رہ جانا ضروری ہے۔
بڑی بی یوں تو ہیں کوئی ساٹھ سال کی لیکن
کیا کاٹھی پائی ہے! معلوم ہوتا ہے ابھی چالیس کی
بھی نہیں ہوئیں۔ کیوں نہ ہو فکر ہی کون سی ہے انھیں۔
ایک لڑکی تھی اس کا بھی بیاہ کر دیا تھا۔ ڈھونڈ ڈھانڈ
کر ایک گھر داماد لے آئی تھیں۔ اور گھر دامادی کی بات
اتنی پرانی ہو گئی کہ اب یہ خود "گھر ساس" بن کر رہ گئی
ہیں۔

داماد کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں۔ یہ
گھر پر رہتی ہی کب ہیں؟ کسی نہ کسی کے ہاں مہمان
بنی رہتی ہیں۔ اور کمال یہ ہے کہ مہمان بننے کا گُر انھیں
خوب آتا ہے۔ کس گھر میں کیا بات کرنی چاہیے انھیں

اچھی طرح معلوم ہے ہر کسی کی کمزوری سے واقف ہیں۔
یہ بھی جانتی ہیں کہ کون کس بات سے خوش ہوتا ہے مثلاً
ہماری ہی بات لے لو۔ بڑی بی جانتی ہیں کہ اپنے بچوں
کی تعریف سن کر ہم پھولے نہیں سماتے۔ جب وہ دوسروں
کے مقابلے میں ہمارے بچوں کو زیادہ قابل، نیک اور محنتی بتاتی
ہیں تو ہمارا جی چاہتا ہے کہ سارے محلے والوں کو بلوا کر
ان کے سامنے بڑی بی سے تقریر کروائیں۔ اور پھر
تعریف کرنے کا ڈھنگ بھی ایسا پیارا ہوتا ہے کہ جی
خوش ہو جاتا ہے۔ کیا دماغ پایا ہے بڑی بی نے بھی!
ایک دن کہنے لگیں: "بی بی! سنا آپ نے سلمیٰ بی بی
کے بڑے لڑکے منے میاں نے پرسوں کیا ہنگامہ کر
دیا ارے وہ تو اچھا ہوا کہ محلے والے بیچ میں آ گئے
ورنہ بات پولیس چوکی تک پہنچتی۔
چلو اب ہمارے دل میں کرید شروع ہو

بڑی بی جب بھی بات کریں گی درمیان ہی سے اب ہمیں پوچھنا پڑے گا "بڑی بی یہ تو بتاؤ ہوا کیا ؟"

تو خیر مجبوراً ہم نے پوچھا "بڑی بی کیا ہنگامہ ہوگیا" بڑی بی نے پہلے تو ہمارے سامنے سے پان دان اپنے سامنے کھسکایا۔ دو پانوں کا ایک بیڑا بنایا اور منہ میں ایک طرف دبا کر بولیں "بی بی! آپ کو معلوم ہے منو کیسا لڑکا ہے؟ سارے محلے والے اس سے پناہ مانگتے ہیں چھوٹے بچے تو اس کی صورت دیکھ کر یوں گھروں میں بھاگ جاتے ہیں جیسے کسی جانور کو دیکھ لیا ہو۔ وہ حرکتیں بھی تو ایسی ہی کرتا ہے۔ کسی کا کان اینٹھ دیا۔ کسی کے دھول جمادی، کسی کی گڑیا چھین لی کسی کی گوٹیاں پھینک دیں۔"

لیجیے اب چلی بڑی بی کی گاڑی۔ اس ہنگامہ کا ذکر تو ایک طرف رہا منے میاں کی عادتوں کی داستان چھڑ گئی۔ لیکن بڑی بی کو بیچ میں ٹوکا بھی نہیں جاسکتا بس ہم ہوں ہاں کرتے رہے۔ "اور کیا کہوں بچے تو خیر بچے ہیں بڑے بھی ان سے ڈرنے لگے ہیں منے میاں راستے میں ہوں تو وہ بھی راستہ کترا جاتے ہیں کہ کہیں یہ ان کی بے عزتی نہ کر دیں۔ ان باتوں سے ان کی ہمت بڑھ جاتی ہے۔ اب تو وہ محلے میں کسی کو مانتے ہی نہیں۔"

پھر ہم نے کہا "بڑی بی وہ آخر پرسوں والی بات کیا ہوئی؟" بڑی بی بولیں "ارے وہی تو بتانے جا رہی ہوں۔ اس دن منے میاں اسکول نہیں گیے معلوم نہیں کیا بہانہ کر کے گھر پر ہی رہ گیے۔ ان کے ابا کام پر چلے گیے تو منے میاں اپنے کام پر نکلے اور تھوڑی ہی دیر میں سڑک پر سے بازو کے گھر والے مولوی صاحب کا مرغ پکڑ کر لے آئے۔ گھر لا کر انھوں نے مرغ ذبح بھی کر ڈالا اور امی کو بتائے بغیر ماما کے حوالے کر دیا کہ پکا ڈالے ماما نے جب سلمیٰ بی کو بتایا تو ان کے پوچھنے پر منے میاں نے ان سے کہا کہ ان کے دوست نے انھیں تحفہ دیا ہے لہٰذا آپ بلا تکلف اسے پکا کر کھایئے، سلمیٰ بی بی کو اطمینان ہوا اور انھوں نے ماما کو بازار بھیجا کہ جا کر روغن اور مصالحے لے آئے۔ ماما جب بازار سے واپس ہو رہی تھی تو اس نے دیکھا کہ مولوی صاحب کا لڑکا اپنا مرغ ادھر ادھر ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ ماما سمجھ گئی کہ منے میاں نے ضرور مولوی صاحب کے مرغ پر ہاتھ صاف کیا ہے۔ لیکن وہ بے چاری انجان بن گئی۔

تھوڑی ہی دیر بعد کسی لڑکے نے مولوی صاحب کی بیوی کو بتلا دیا کہ منے میاں ان کا مرغ لے گیے ہیں بس پھر کیا تھا۔ مولوی صاحب کی بیوی نے مولوی صاحب کو گھر بلوا بھیجا اور پھر دونوں گھروں میں وہ طوفان مچا ہے کہ سارا محلہ جمع ہوگیا۔ سلمیٰ بی بی نے مرغ اٹھا کر

مولوی صاحب کے گھر میں پھنکوا دیا اور پھر مولوی صاحب کی بیوی نے مرغ دوبارہ ادھر پھنکوا دیا۔ بے چارہ مرغ دیوار پر سے ادھر سے اُدھر پھینکا جاتا پھر اُدھر سے ادھر پھینکا جاتا۔ کوئی چار چھ مرتبہ تو ایسا ہی ہوا ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ سلمٰی بی بی اور مولوی صاحب کی بیوی کوئی کھیل کھیل رہی ہیں۔ مولوی صاحب کی بیوی کی بس ایک ہی فریاد تھی کہ میں تو اپنا مرغ زندہ لے کر رہوں گی۔ اب سلمٰی بی بی زندہ مرغ کہاں سے لے کر آتیں بڑی مشکل سے لوگوں نے بیچ میں پڑ کر جھگڑا چکایا اور طے یہ پایا کہ سلمٰی بی بی سات روپے دیں اور مرغ رکھ لیں۔ بی بی اب آپ ہی دیکھیے نا منے میاں کی وجہ سے سارے محلہ والوں کے سامنے سلمٰی بی بی کی بے عزتی ہو گئی لڑکا ہو تو آپ کے لڑکے جیسا ہو۔ میں تو کہتی ہوں کہ بی بی ایسا نیک اور سیدھا لڑکا تو پورے مراد آباد میں نہ ہوگا جو بھی تمھارے بیٹے کو دیکھتا ہے بس خوش ہو جاتا ہے۔"

شروع ہو گیا بڑی بی کا کاروبار۔" میں تو جب بھی تمھارے انو کو دیکھتی ہوں دعائیں ہی دیتی رہ جاتی ہوں۔ ہمیشہ صاف ستھرے کپڑے پہنے یوں نظر آتا ہے جیسے نماز پڑھ کر آرہا ہو۔ بی بی ذرا ماما سے کہہ کر ایک پیالی چاء تو منگواؤ اور ہاں بی بی میں آج رات اپنے گھر بھی نہ جاؤں گی یہیں ٹھہروں گی۔ اب ہماری کیا مجال جو بڑی بی سے کچھ کہہ سکیں اور بڑی بی تو نظر پہچانتی ہیں۔ انھیں ذرا بھی شک ہو جائے کہ ہمارا دل انھیں ٹھہرانے پر رضامند نہیں ہے تو وہ فوراً ہماری لڑکی کی تعریف شروع کر دیں گی "اور بی بی کل میں وہ قاضی صاحب ہیں نا ان کے ہاں گئی تھی۔ ان کی لڑکی بھی اسی اسکول میں پڑھتی ہے جس میں تمھاری نجمہ جاتی ہے لیکن کیا بتاؤں کہاں نجمہ اور کہاں وہ قاضی صاحب کی لڑکی عذرا دونوں میں کتنا فرق ہے۔ قاضی صاحب کی بیوی کہہ رہی تھیں کہ عذرا کے دماغ میں کچھ گھستا ہی نہیں جتنا پڑھتی ہے سب بھول جاتی ہے اور تمھاری بی بی نجمہ عذرا سے چھوٹی ہی ہوگی لیکن کیا پڑھتی ہے ہر سبق اسے فر فر یاد ہے۔ قاضی صاحب کی بیوی ہی کہہ رہی تھیں کہ اسکول کی اتنی ساری استانیاں نجمہ کی تعریف کرتی تھیں کیوں نہ ہو بی بی تم خود بھی تو کتنی محنت کرتی ہو"

چلیے قصہ ختم ہوا اب بڑی بی نے ہماری بھی تعریف کر دی۔ ہم نے فوراً ماما کو حکم دیا۔ ماما جی دیکھو بڑی بی آج یہاں ٹھہریں گی۔ کھانے میں چاول چپاتی بنھا دینا اور پہلے انھیں ایک پیالی چائے تو لا دو۔ تو یہ ہیں جناب ہماری بڑی بی۔ ان کا آنا قسمتی ہے مگر جانا قسمتی نہیں۔

جناب انور برہانپوری

اے ہند کے ستارو

ماں باپ کی اطاعت　　سب سے بڑی ہے خدمت
گر چاہتے ہو عزت　　بھولو نہ یہ نصیحت
اے ہند کے ستارو

اسکول روز جانا　　کرنا نہ تم بہانا
جاہل کو بھی پڑھانا　　عالم اسے بنانا
اے ہند کے ستارو

چوری بری بلا ہے　　غیبت میں کیا رکھا ہے
سچائی میں مزا ہے　　سچوں سے خوش خدا ہے
اے ہند کے ستارو

نیکی کی راہ چلنا　　خوفِ خدا سے ڈرنا
انور کی نظم پڑھنا　　پڑھ کر عمل بھی کرنا
اے ہند کے ستارو

بھاپ کی قیمت

جناب احسان الحق

کام کرنے والے :-

۱۔ چنا جور گرم والا
۲۔ چورن والا
۳۔ غبارے والا
۴۔ بندر والا
۵۔ بندر
۶۔ ہوٹل والا
۷۔ ڈبل روٹی والا ۔ ۸۔ چھتری والا
۹۔ استاد ۔ ۱۰۔ بہت سے گاہک ۔ ۱۱۔ پہلا آدمی۔ ۱۲۔ دوسرا آدمی ۔ ۱۳۔ تیسرا آدمی
۱۴۔ چوتھا آدمی ۔ ۱۵۔ پانچواں آدمی ۔ ۱۶ فجو۔ باورچی کا ملازم ۔ اور دوسرے ساتھی.

(اسٹیج کا پردہ اٹھتا ہے۔ ایک بازار کا منظر دکھایا گیا ہے۔ ایک سرے پر ایک ڈبل روٹی والے کی دوکان ہے۔ لوگ ڈبل روٹیاں خرید کرلے جارہے ہیں۔ صرف ایک چھوٹی ڈبل روٹی بچ رہتی ہے۔ اسٹیج کے دوسرے سرے پر ایک کھلونے والے کی دوکان ہے جو رنگ برنگے غباروں اور کھلونوں سے سجی ہوئی ہے۔ ننھے بچے بڑے شوق سے کھلونوں کو دیکھ رہے ہیں۔ ان دونوں دوکانوں کے بیچ ایک نان بائی کی دوکان ہے۔ بڑی بڑی دیگچیاں چولہوں پر چڑھی ہیں۔ نان بائی ایک پھٹی بنیان پہنے ایک میلا تہمد باندھے دوکان پر بیٹھا پیاز کاٹ رہا ہے کبھی کبھی وہ دیگچیوں کے ڈھکنے کھول کر دیکھ لیتا ہے۔ دیگچیاں کھلتے ہی بہت سی بھاپ اٹھتی ہے

اور اسٹیج سے پورے پنڈال تک تورمہ کی لذیذ خوش بو پھیل جاتی ہے۔ بازار میں بڑی چہل پہل نظر آرہی ہے۔

اتنے میں ایک غبارہ والا آتا ہے۔ اپنے غباروں کی تعریف میں گا رہا ہے)

آؤ چھنو، آؤ منو
لے لو نیا غبارہ
کس کر ڈور پکڑنا بیٹا
مت کرنا نادانی
جیون ایک کہانی رے بھیا ——
جیون ایک کہانی
(بچے غبارے خرید رہے ہیں۔ غبارے والے کی آواز دھیمی ہوتی جارہی ہے اور اس کے ساتھ ہی چناجور گرم بیچنے والا اسٹیج کے ایک سرے سے اپنی بانی الاپتا ہوا نکلتا ہے۔)

چنے والا: - چناجور گرم - ہو چناجور گرم بابو میں لایا ہوں جی
دلی شہر بڑا البیلا
بیچے بھوبے چنا میلا
ادھر چلے ریل کا پہیا چناجور گرم۔ ہو چناجور گرم ۔۔۔ بابو میں لایا ہوں۔

(اس کی آواز مدھم ہوتی جاتی ہے اور چورن والا آتا ہے)

چورن والا: چورن کی آئی بہار
چورن بنا امنگے دار
تم بھی کھالینا سرکار
پیٹ کا بیڑا ہوجائے پار
چورن کی آئی بہار...

(یکایک پورا ماحول ڈگڈگی کی آواز سے گونجنے لگتا ہے۔ اسٹیج پر ایک بندر والا نمودار ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے پیچھے بندر ہے۔ اسٹیج کے بیچ میں پہنچ کر بندر والا اپنا کام شروع کر دیتا ہے)

بندر والا: - کیوں بے بچا لوگوں کو تماشہ دکھائے گا۔

بندر: (بڑی زور سے "ہاں" میں سر ہلاتا ہے)

بندر والا: چلو آج سب کا جی کھوش (خوش) کردو (ڈگڈگی)

(ڈگڈگی پھر تال میں بجنے لگتی ہے)

بندر والا: ہاں بیٹا سلام کرو سب کو۔ یہ سب

تمھارے بُجُ رگ (بزرگ) ہیں۔
بندر: "نہیں" میں سر ہلاتا ہے۔
بندر والا: کیا مطلب؟ سلام نہیں کرے گا
(ڈگڈگی) بچہ لوگوں کی طرح آج کا بندر
لوگ بھی کہنا نہیں مانتا۔ (ڈگڈگی) بھئی
سلام کیوں نہیں کرے گا کیا یہ لوگ
تیرے بُجُ رگ نہیں ہیں؟
بندر: بندر بڑی زور سے "نہیں" میں سر
ہلاتا ہے۔
بندر والا: بُجُ رگ نہیں ہیں! کیوں نہیں ہیں
بھائی
بندر: (اپنے سینے پر ہاتھ مار کر) "میں ہوں"
"میں ہوں"
بندر والا: کیا کہا تو بُجُ رگ ہے (ڈگڈگی)
ٹھیک کہتا ہے۔ بچہ لوگو، بابا لوگو یہ گیانی
بندر ٹھیک کہتا ہے۔ آدمی لوگ کا
بُجُ رگ تو بندر ہی لوگ تھا۔ (ڈگڈگی)
اچھا بول ادھر سب ماسٹر لوگ اور
بچہ لوگ ہے۔ تو بھی پڑھے گا؟
بندر: "ہاں" میں سر ہلاتا ہے۔
بندر والا: (ڈگڈگی) پڑھے گا بھی پڑھے گا کون سے
اسکول میں پڑھے گا۔ جامعہ ملیا میں پڑھے گا!
(خوش ہو کر ناچتا ہے)
تو بھئی اس کو بھی پسند ہے۔ اچھا
تو اب اپنے استاد لوگوں کو سلام کرو (بندر بیٹھا
رہتا ہے۔ بندر والا ڈنڈا اٹھاتا ہے۔
بندر ڈر کر بھاگتا ہے۔)
بندر والا: (ڈنڈے سے سلام کرے گا؟
(بندر ڈر کر کھڑا ہو جاتا ہے)
بندر والا: سلام کرے گا؟
بندر: ("ہاں" میں سر ہلاتا ہے)
بندر والا: تو پھر کر سلام (ڈگڈگی) بھائی
لوگ خفا نہ ہونا سلام کرے گا۔
بندر: (پھرتی سے مڑتا ہے اور تماشائیوں
کی طرف پیٹھ کر کے دُم سے سلام کرتا
ہے)
بندر والا: (لکڑی کو زور سے زمین پر مارتا
ہے۔ بندر ڈر کر لیٹ جاتا ہے۔ اس
کے ہاتھ، پیر اٹھے ہوئے ہیں اور ہوا
میں ڈگڈگی کی تال پر (ہلا رہا ہے) اچھا
بھائی خفا نہ ہو بول غبارے لے گا؟
ڈبل روٹی منگائے گا؟ یا نان لاؤں تیرے

لیے!

(بندر اٹھ کر ہوٹل والے کی طرف بھاگتا ہے۔ ہوٹل والا گھبرا کر کاونٹر کے پیچھے چلا جاتا ہے)

ہوٹل والا: (چلاّ کر) ہٹاؤ اس کو یہاں سے ورنہ ورنہ میں تمھاری مرمت کر دوں گا۔

ڈبل روٹی والا: ارے خفا کیوں ہوتے ہو۔ وہ کاٹے گا تھوڑی۔

بندر والا: (ڈگڈگی بجا کر) آج کل بندر لوگ نے کاٹنا چھوڑ دیا ہے۔ اب آدمی کاٹنے لگا ہے۔

ہوٹل والا: ہاں ہاں آدمی کاٹنے لگا ہے اس کو الگ کرو یہاں سے نہیں تو میں تمھاری بوٹی بوٹی کاٹ ڈالوں گا۔

(چھتری والا داخل ہوتا ہے۔ کچھ ٹوٹی ہوئی چھتریاں لیے ہوئے پھٹے کپڑے پہنے ہے۔ بندر ہوٹل والے پر جھپٹتا ہے۔ چھتری والا بیچ میں آجاتا ہے۔ بندر اسے دیکھ کر رک جاتا ہے)

بندر والا: (ڈگڈگی بجاتا ہے) لوٹ آجا لوٹ آ۔

(بندر لوٹ آتا ہے اور مداری کی چھتری اٹھا لیتا ہے)

(طرح طرح کے لوگ بازار سے آجا رہے ہیں)

ڈبل روٹی والا: (ہنستے ہوئے) ارے رے رے اتنا اچھا دن اور تم منہ لٹکائے پھر رہے ہو۔

چھتری والا: تمھارے لیے ہوگا اچھا دن۔

ڈبل روٹی والا: ارے بھئی ایسی بھی کیا بات ہے۔ تمھارے لیے بھی خدا اچھا کرے گا۔

چھتری والا: اچھا کیا خاک کرے گا۔ بھائی صاحب اچھے موسم میں کسی بھلے آدمی کو یہ خیال نہیں آتا کہ بارش سے بچنے کے لیے اپنی چھتری ٹھیک کرا کے رکھ لے اور پھر جاڑے میں کوئی چھتری کا کرے گا بھی کیا... آج کل جب میں آواز لگاتا ہوں "ٹوٹی پھوٹی چھتری ٹھیک کروا لو" تو خود مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں بے وقوف ہوں۔

ڈبل روٹی والا: لیکن بھئی روٹی کی تو ہر موسم میں ضرورت ہوتی ہے۔ جاڑا، گرمی،

برسات، اس کے بغیر تو کام چل نہیں سکتا۔
(ایک خالی ٹرے کو صاف کرتا ہے۔)
سب بک گیئں۔ بس بے چاری یہ چھوٹی سی
رہ گئی ہے۔ (وہ بچی ہوئی ایک چھوٹی ڈبل
روٹی کو ہاتھ میں اٹھاتا ہے)

چھتری والا: (روٹی کو دیکھتے ہوئے) شکر
ہے تمھارا دن بہت اچھا رہا۔ (جیب میں
ہاتھ ڈالتے ہوئے) شاید میرے پاس
اتنے پیسے تو ہوں گے کہ میں اس روٹی کو
خرید لوں۔ ایک وقت تو کٹ جائے گا۔

ڈبل روٹی والا: ارے بھئی میں تمھارے
پیسے نہیں چاہتا۔ بھئی پیٹ تو سب کو ہی
بھرنا ہوتا ہے۔ چاہے وہ روٹی والا ہو
چاہے چھتری والا۔
(وہ ڈبل روٹی اٹھا کر چھتری والے کی
طرف بڑھا دیتا ہے)

چھتری والا: (پریشان ہو کر) میرے
پاس صرف پانچ پیسے ہیں۔

ڈبل روٹی والا: (دکھ سے) بس پانچ
پیسے۔ اس کا مطلب ہے کہ آج تمھارا
دن بہت خراب گیا۔

چھتری والا: تو یوں کرو کہ مجھے آدھی روٹی دے
دو۔

ڈبل روٹی والا: نہیں بھئی کیسی باتیں کرتے
ہو تم یہ ساری لے لو اور اپنے پانچ پیسے
بھی جیب میں رکھو (وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر
اس کی جیب میں ڈال دیتا ہے۔) میرا
سارا مال بک چکا ہے اب میں اتنا کمینہ
نہیں ہوں کہ اپنے دوست کو اتنی سی
روٹی نہ دے سکوں

چھتری والا: (ہچکچاتے ہوئے روٹی لے
لیتا ہے) لیکن بھئی یہ پیسے تو لے لو۔
خدا نے چاہا تو کل زیادہ کماؤں گا۔ باقی
تب دے دوں گا۔

ڈبل روٹی والا: (روٹی اس کے ہاتھ پر رکھتے
ہوئے زبردستی) تم سب پیسے دے
دینا اور نہ بھی دو تو بھی ٹھیک ہے۔

چھتری والا: خدا تمھارے کاروبار میں
برکت دے۔

ڈبل روٹی والا: مجھے شرم آرہی ہے کہ یہ
اتنی چھوٹی ہے۔ کاش میرے پاس اور
بھی ہوتی۔ سوکھی روٹی کھانا ویسے بھی

مشکل ہوتا ہے۔

چھتری والا: خالی پیٹ میں یہ روٹی شاہی ٹکڑے کا مزہ دے گی۔ (سوچ کر) ایک ترکیب (وہ باورچی کی دوکان کی طرف بڑھتا ہے۔ ایک پتیلی سے بھاپ نکل رہی ہے) چھتری والا بھاپ سونگھنے کے لیے دو ایک لمبی لمبی سانسیں لیتا ہے۔ خوش بو سے معلوم ہوتا ہے کہ قورمہ پک رہا ہے۔ ایک زمانہ ہو گیا قورمہ کھائے ہوئے اور قورمہ ہی کیا کوئی بھی مزے کی چیز کھائے ہوئے لیکن آج .... آج تو میں اس قورمہ کا مزہ لے کر رہوں گا۔

ڈبل روٹی والا: (تعجب سے) یہ کیسے کر سکتے ہو تم؟ (دوکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہ کنجوس پانچ پیسے میں تمھیں چھوٹا چمچہ تک پونچھنے نہ دے گا۔

چھتری والا: اس سے پوچھے گا کون؟ ادھر دیکھو (وہ ڈبل روٹی کو چھتری میں لگا کر پتیلی کی بھاپ کے پاس لے جاتا ہے) اس بھاپ سے میری ڈبل روٹی میں قورمہ کا مزہ آ جائے گا۔ اس کے چاروں طرف قورمہ کی ایک ہلکی سی تہہ جم جائے گی۔ قورمہ اس کے اندر گھس جائے گا (اس کے منہ میں پانی بھر آتا ہے)

ڈبل روٹی والا: ہنستا ہے، واہ واہ واہ! ... کیا ترکیب نکالی ہے۔ میں بھی اسے اپنے گھر میں آزماؤں گا۔

چھتری والا: (ٹھنڈی سانس بھر کر) قورمہ کو سونگھے ہوئے بھی بہت دن ہو گئے ہیں کاش یہ مل جاتا تو مزہ آ جاتا۔

ڈبل روٹی والا: (ہنستا ہے) اچھا دوست اب میں چلتا ہوں اگر جلدی نہیں سوتا تو صبح تڑکے اٹھنا مشکل ہو جائے گا۔ خدا حافظ۔

چھتری والا: خدا حافظ بھائی ... خدا برکت دے تمھارے کاروبار میں۔

ڈبل روٹی والا: اور تمھارے کاروبار میں بھی (چلا جاتا ہے)

چھتری والا: (ڈبل روٹی کو چھتری کے نیچے کے حصے کی ڈنڈی پر لگا کر بھاپ پر سینک رہا ہے۔ اتنے میں دوکان کا مالک اندر کا دروازہ کھول کر باہر

نکلتا ہے۔ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا ہے۔)

چھتری والا: (ڈبل روٹی کو منہ میں رکھنے کے لیے جوں ہی ہاتھ اٹھاتا ہے پیچھے سے دوکان دار اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتا ہے۔)

دکان دار: بدمعاش کہیں کے یہ تمھارے باپ کا مال ہے دس پیسے نکالو جیب سے۔

چھتری والا: کیا کہا آپ نے؟

دکان دار: میں کہتا ہوں دس پیسے نکالو۔ سمجھے دس پیسے۔

چھتری والا: دس پیسے! کاہے کے دس پیسے؟

دکان دار: اس زعفرانی قورمہ کی بھاپ چرانے کے دس پیسے۔

چھتری والا: (پریشانی سے ہنستا ہے) قورمہ کی بھاپ کے دس پیسے؟ بھاپ تو ہوا کے ساتھ اڑ جاتی ہے اور ہوا تو مفت ہوتی ہے۔

دکان دار: (نقل کرتے ہوئے) مفت ہوتی ہے۔ یہ آگ تمھارے باپ نے جلائی تھی یہ مسالے یہ گھی سب کا سب تمھارا باپ لایا تھا اور یہ گوشت تمھارے باپ کا تھا۔

چھتری والا: گوشت تو آپ کا ہے حضور لیکن اگر میں نے اپنی روٹی اس کی بھاپ پر رکھ دی تو اس میں آپ کا کیا خرچ ہوا۔ میں نے آپ کا قورمہ تو لیا نہیں ہے اور بھاپ تو اڑ رہی تھی۔ سارے بازار میں پھیل رہی تھی خدا کی شان ہے صاحب۔ ہم نے تو کبھی سنا نہیں کہ کوئی قورمہ کی بھاپ بیچتا ہو۔

دکان دار: اور نہ ہم نے کبھی سنا کہ کسی چھتری والے کی پرورش مفت کے کھانے پر ہوتی ہو۔ یہ کھلی ہوئی چوری ہے ڈاکا ہے سمجھے مسٹر۔ اور اگر تم نے ابھی اس وقت پیسے نہ دیئے تو میں تمھاری چھتریاں یہاں دھروا لوں گا یہ سب کی سب جلانے کے کام آئیں گی۔

چھتری والا: (چھتریوں کو بغل میں دباتے ہوئے) ذرا لے کے تو دیکھو (دو اور گاہک وہاں آجاتے ہیں اور ان دونوں کی لڑائی غور سے سنتے ہیں)

دکان دار: اچھا تو اب تم مجھے دھمکی دے رہے ہو چوری اور اس پر سینہ زوری!

چھتری والا: اس کو چوری کہتے ہیں۔ تیرے گھر میں کہتے ہوں گے۔

دکان دار: (دوسرے گاہکوں سے مخاطب ہوکر) دیکھیے آپ نے چور کو دیکھا۔ ڈاکو ہے ڈاکو۔ میری چیزوں کی چوری کرتا ہے۔

پہلا آدمی: مارو اسے پکڑ کر۔

دوسرا آدمی: کیا چوری کی ہے اس نے۔

(یکے بعد دیگرے لوگ داخل ہوتے ہیں)

چھتری والا: میں نے کوئی چیز نہیں چرائی ہے۔ میں نے صرف اپنی ڈبل روٹی اس پتیلی سے نکلی ہوئی بھاپ پر رکھی تھی۔ بھاپ سے روٹی ذرا مزیدار ہو جاتی ہے۔

تیسرا آدمی: کیا معاملا ہے۔

دوسرا آدمی: اس نے کوئی چیز یہاں سے چرائی ہے۔

چھتری والا: (غصے سے) میں نے کوئی چیز نہیں چرائی ہے میں نے صرف اپنی روٹی قورمہ سے نکلتی ہوئی بھاپ میں سینکی ہے۔

دکان دار: میرا قورمہ، میری پتیلی اور میری بھاپ۔

چھتری والا: بھاپ تمھاری نہیں تھی وہ یوں ہی ہوا میں اڑ رہی تھی (کچھ لوگ اور جمع ہو جاتے ہیں)

دکان دار: تو کیا اس کا یہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ بھاپ تمھاری تھی۔

پہلا آدمی: (بہت سوچتے ہوئے) میرا خیال ہے کہ یہ بھاپ باورچی کی تھی جو اس قورمہ کا مالک ہے

دوسرا آدمی: لیکن پتیلی سے نکلنے کے بعد بھاپ کسی کی نہیں رہتی۔

پہلا آدمی: بھئی مجھے معلوم نہیں۔ کتا اگر تمھارے گھر سے نکل کر سڑک پر گھومے تب بھی وہ تمھارا ہی رہتا ہے۔

چوتھا آدمی: (معاملا سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے) اس نے کیا کیا ہے۔

پہلا آدمی: باورچی کی پتیلی کی بھاپ لے لی ہے۔

دوسرا آدمی: نہیں بھئی۔ اپنی روٹی کو مزیدار بنانے کے لیے اس نے صرف روٹی بھاپ کے اوپر سینکی ہے۔

دکان دار: دوکنوں سے اپیل کرتے ہوئے میں کہتا ہوں اسے اس کباب کی قیمت دینا چاہیے۔ آخر میں نے گوشت خریدا ہے۔ آگ جلائی ہے۔ مسالہ اور گھی خریدا ہے۔

تیسرا آدمی: ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔

دوسرا آدمی: لیکن جب کباب پتیلی سے نکل کر باہر آجائے تو وہ مفت ہو جاتی ہے سب کی ہو جاتی ہے۔

پہلا آدمی: لیکن وہ تمہاری نہیں ہو جاتی یہ بالکل کتے کی طرح ہو جاتی ہے۔

پانچواں آدمی: یہ تو ایک پہیلی ہو گئی۔

پہلا آدمی: بھئی آپ ہی بتلائیے۔ اگر آپ کی بلی باہر سڑک پر کسی کو ملے تو آپ کی ہو گی یا پلنے والے کی۔

دوسرا آدمی: کباب کوئی کتا یا بلی نہیں ہے اسے آپ سارے بازار میں سونگھ سکتے ہیں اور اگر یہ اس کی ہے تو اس سے کہو کہ اسے بند کر کے رکھے۔

پہلا آدمی: یوں تو آپ کتے کو بھی سونگھ سکتے ہیں لیکن اس سے وہ آپ کا نہیں ہو جائے گا۔

چوتھا آدمی: لیکن اس کی خوشبو لاحول ولا قوۃ۔ بدبو۔ اگر آپ کی ناک میں گئی تو وہ بدبو آپ ہی کی ہو گی۔

تیسرا آدمی: لاحول ولا قوۃ بدبو میری ہرگز نہیں ہو گی وہ کتے کی ہو گی۔

پہلا آدمی: اور جو چیز کتے کی ہو گی وہ کتے کے مالک کی ہو گی اور اس لیے میں کہتا ہوں کہ کباب قورمہ کی ہے اور قورمہ دکان دار کا ہے۔

چوتھا آدمی: لیکن قورمہ تو اپنی جگہ پر ہے نہ اس میں کچھ کمی آئی ہے اور نہ زیادتی ہوئی ہے۔

چھڑی والا: بالکل ٹھیک ہے۔ یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔ روٹی کو کباب پر سینکنے سے اس کا قورمہ خراب تو نہیں ہوتا۔

دکان دار: سب کے سب میاؤں میاؤں کیے جا رہے ہیں اگر میں قورمہ نہ پکا رہا ہوتا تو یہاں کوئی کباب نہ ہوتی اور میں نے ان سب چیزوں پر خرچ کیا ہے۔

حلال کی کمائی کے پیسے خرچ کیے ہیں،
یہ چھتری والا بھلا کیا جانے حلال کی
کمائی کیا ہوتی ہے!

چھتری والا: زبان سنبھال کر بات کرو۔ اپنی
زبان کو سنبھالو اور اپنے قورمہ کی بھاپ
کو سنبھالو۔

دوسرا آدمی: بھائی صاحب کچھ بھی ہو آپ
بھاپ کو بیچ نہیں سکتے۔

پہلا آدمی: اگر آپ کو بھاپ کی ضرورت
ہو اور یہ بھاپ کسی دوسرے کے
لیے تیار کرنا پڑے تو۔

پانچواں آدمی: آپ کا مطلب یہ ہے کہ کل
آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں اس ہوا
کے پیسے دینا چاہیے جو آپ کی زمین پر
چل رہی ہے۔

تیسرا آدمی: غلط۔ بالکل غلط۔ ہوا کو خدا نے
بنایا ہے لیکن بھاپ کو باورچی نے
تیار کیا ہے۔

پانچواں آدمی: لیکن باورچی نے اسے بیچنے
کے لیے نہیں بنایا ہے۔

پہلا آدمی: ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس
نے بیچنے کے لیے بنایا ہے اور یہ کوئی
تعجب کی بات نہیں ہے آخر آپ عطر
خریدتے ہیں اس میں بھی تو خوش بو
ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ بھی خوش بو ہے۔

چوتھا آدمی: عطر کی بات الگ ہے۔ عطر
کی خوش بو اچھی ہوتی ہے۔

دکان دار: (غصے سے آگے بڑھتا ہے)
کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ میرے قورمے کی
خوش بو اچھی نہیں ہے۔

پہلا آدمی: (ایک گہری سانس لے کر سونگھتے
ہوئے اور ہاتھ پیٹ پر رکھتے ہوئے)
میں کہوں گا کہ دنیا کے تمام عطروں
سے زیادہ لذیذ اور مزے دار ہے۔

چوتھا آدمی: مگر اس خوش بو کی کس کو
ضرورت ہے۔

پہلا آدمی: اس چھتری والے کو

چھتری والا: لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ
اس کی قیمت ہے تو ......

پہلا آدمی: تو تم نے اس کو ہرگز نہ لیا ہوتا
اس کا مطلب ہے کہ تم جانتے تھے کہ یہ
بھاپ تمھاری نہیں ہے یہ خالی پتیلی

یہاں پڑی ہے جیسے دکان دار کو اس
کی ضرورت نہ ہو اسے بھی اٹھا لے
جاؤ۔ لے جاؤ۔ اٹھائے جاؤ۔ لے
جاؤ گے نا!

دوسرا آدمی: نہیں ہرگز نہیں لے جائے گا۔

تیسرا آدمی: آپ کو کیسے معلوم؟ چور ہمیشہ
پہلے چھوٹی چیزیں چراتے ہیں۔

دوسرا آدمی: (خفا ہو کر) آپ جانتے ہیں
کہ آپ کیا بک رہے ہیں۔ آپ کے کہنے
کا مطلب یہ ہوا کہ اس وقت یہاں
جتنے لوگ ہیں یہ سب چور ہیں آخر یہ
سب کے سب بھی تو قورمہ کی خوش بو
سونگھ رہے ہیں۔

چوتھا آدمی: ہمیں چور بنایا تو ٹھیک نہیں
ہوگا۔

(ایک چھوٹا سا مست قسم کا آدمی داخل
ہوتا ہے اس کے کپڑے پرانے ہیں لیکن
دوسروں سے بالکل مختلف اس پر
تمغے وغیرہ لگے ہوئے ہیں جیسے کوئی
جادوگر ہو۔ ہنس مکھ ہے۔ اسے دیکھ
کر سڑک پر دوائیاں بیچنے والے کا
گمان ہوتا ہے)

پہلا آدمی: چور کی صورت پر لکھا ہوتا ہے۔

چوتھا آدمی: چور ہوں گے آپ، اپنی صورت
دیکھیے آئینے میں۔

پانچواں آدمی: (باورچی کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے) ارے یہ جھگڑے کھڑے
کر کے گاہکوں کو جمع کرتا ہے۔

دکان دار: گاہک کیا جمع کرتا ہے ہم
گاہک جمع کریں گے ایسا قورمہ کہیں
اور مل جائے تو جو چور کی سزا وہ
میری (اس کی نظر نئے آنے والے پر
پڑتی ہے اور وہ ایک دم اس سے
مخاطب ہوتا ہے)

ہوٹل والا: لو وہ استاد آ گئے۔ کہو استاد
سب خیریت ہے۔

استاد: سب خیریت ہے لیکن تمھارے
یہاں خیریت نہیں معلوم ہوتی۔

پہلا آدمی: اس سے پوچھا جائے اسے
معلوم ہوگا۔

دوسرا آدمی: ہاں اسے پنچ بنا دو۔

تیسرا آدمی: اوپر سے بے وقوف دکھائی

دینے والے اندر سے عقل مند ہوتے
ہیں۔

دکان دار: (چھتری والے سے) کیوں بے
ہم اپنے مقدمے میں استاد کو پنچ بنا
دیں منظور ہے؟

دوسرا آدمی: (چھتری والے کو کھینچ کر)
اندر سے بہت نیک بنا دے پنچ۔

چوتھا آدمی: (چھتری والے کو دوسری
طرف کھینچتا ہے) ٹھیک ہے یہ فیصلہ
کر دے گا۔

دکان دار: (چھتری والے سے) بول
تیار ہے؟

چھتری والا: (خفا ہو کر) میرے پاس ہے
کیا جو تو لے گا کسی کو بناؤ پنچ کیا فرق
پڑتا ہے۔

(استاد اسٹیج کے بیچ میں آگئے ہیں
اور ان کے دونوں طرف لوگ جمع ہو
جاتے ہیں)

دکان دار: ابے نجو استاد کے لیے اسٹول
تو لا۔

(نجو اسٹول لاتا ہے)

(استاد اس پر بیٹھ کر بڑے پر وقار
انداز میں بولنا شروع کرتے ہیں۔

استاد: (کرسی پر بیٹھ کر ذرا اونچی آواز میں)
کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس ہنگامے
کی وجہ کیا ہے؟
آپ لوگ جو صورتوں سے شریف دکھائی
دیتے ہیں اتنی گھٹیا باتیں کیوں کر رہے
تھے اور اس بدتمیزی کے پیچھے کون
بدمعاش ہے؟

دکان دار: (چھتری والے کو پکڑ کر سامنے
لاتا ہے) یہ بدمعاش ہے استاد۔

چھتری والا: میں نے جان بوجھ کر کچھ نہیں
کیا ہے۔

استاد: (اسے اوپر سے نیچے تک دیکھتا ہے
اس کی بغل میں چھتریاں دبی ہوئی ہیں) چھتریاں
بناتے ہو (چلا کر) کہو ہاں (ایک
چھتری لے کر کھولتا ہے جس کے اوپر
چھید ہے کھلی ہوئی چھتریوں کے چھید
میں ہاتھ ڈال کر وہ دکھاتا ہے پھر
ایک آدمی کو ہاتھ پکڑ کر اپنے پیچھے
کھڑا کرتا ہے اور چھتری اس سے

ہاتھ میں تھما دیتا ہے تاکہ وہ اس
کے سر پر سایہ کر سکے۔)
ہاں تو بھئی چھتری والے پہلے تم سناؤ۔
یہ قصہ کیا ہے؟
چھتری والا: (گھبرائے ہوئے) سرکار ہوا
یہ کہ میں ایک غریب آدمی ہوں۔
استاد: بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔
چھتری والا: آج میرا دھندا خراب رہا۔ میرے
پاس کھانے کے لیے کچھ نہیں تھا تو سامنے
والے میرے دوست نے مجھے ایک
ڈبل روٹی دے دی۔ خالی ڈبل روٹی
میں کوئی مزہ نہیں تھا ان کے یہاں
قورمہ پک رہا تھا۔ پتیلی میں سے جو
گرم گرم بھاپ نکل رہی تھی میں نے
سوچا کہ اپنی روٹی اس بھاپ پر رکھ
دوں اس کا کچھ مزہ بدل جائے گا
اور جب میں روٹی کو بھاپ پر سینک
کر کھا رہا تھا یہ باورچی نکل آیا اور
مجھے پکڑ لیا ـــ کہنے لگا تم نے میری
بھاپ چرائی ہے اس کے دس پیسے دو۔
استاد: (دکان دار سے) تم نے دس پیسے
کا مطالبہ کیا۔
دکان دار: میں نے صرف اتنا ہی کہا استاد
یہ بھاپ میرے قورمے کی تھی اگر میں
گوشت خرید کر اسے نہ پکاتا تو بھاپ
نکلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اگر یہ سمجھتا
ہے کہ قورمے کی بھاپ استعمال کے لائق
ہوتی ہے تو پھر وہ اس لائق بھی ہے
کہ اس کی قیمت دی جائے۔
استاد: ٹھیک ہے، بالکل ٹھیک۔
دکان دار: (بہت خوش ہوتا ہے جیسے اس
نے پالا مار لیا ہو۔)
پانچواں آدمی: آپ بتائیے ان میں کون حق
بجانب ہے۔
استاد: حضرات مجھے سوچنے دیجیے (چھتری
والے اور دکان دار سے مخاطب ہوتا
ہے) آپ دونوں اس بات سے متفق
ہیں کہ آپ کا پنچ بنوں۔
چھتری والا: (صرف سر ہلاتا ہے لیکن دکان دا
بہت زور سے تائید کرتا ہے)
دکان دار: (پُر امید) بالکل متفق ہیں استا
استاد: (چھتری والے سے) آپ میرے

فیصلے کو تسلیم کریں گے۔
چھتری والا: (سر ہلاتا ہے) جی ہاں (آہستہ سے)
استاد: اور آپ!
دکان دار: آپ کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا جو
ہم دونوں کو تسلیم کرنا پڑے گا۔
استاد: میری بے وقوفیاں اس سارے گاؤں
میں مشہور ہیں اور پھر بھی آپ لوگ
مجھے پنچ بنانا چاہتے ہیں۔
کئی آوازیں: جی ہاں۔
استاد: آپ لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ باورچی
اکثر میری خاطر مدارات کرتا رہتا ہے۔
ایک آدمی: جی ہاں جانتے ہیں۔
استاد: اور پھر بھی آپ لوگ مجھے پنچ بنانا
چاہتے ہیں؟
بہت سی آوازیں: جی ہاں چاہتے ہیں۔
استاد: (چلا کر) میں صورت سے بدھو لگتا
ہوں بدھو (آہستہ سے) اور پھر بھی آپ
لوگ مجھے پنچ بنانا چاہتے ہیں؟
بہت سی آوازیں: جی ہاں۔
استاد: ٹھیک ہے (استاد بندر والے کو بلا کر
اس سے ڈگڈگی لیتے ہیں اور بجانا شروع

کرتے ہیں۔ ڈگڈگی کی آواز پر بندر خود بخود
ناچنے لگتا ہے۔ استاد بھی مست ہو جاتے
ہیں۔ بندر بیٹھ جاتا ہے۔ استاد ڈگڈگی بجاتے
رہتے ہیں پھر چونک کر بندر کو دیکھتے ہیں۔
پھر قریب کھڑے لوگوں کو دیکھتے ہیں
انھیں بھیڑ میں چورن والا نظر آتا ہے۔
چورن والے کو دیکھ کر استاد پھر مسکرا
پڑتے ہیں۔)
استاد: (چورن والے سے) اے جی! ادھر آؤ۔
چورن والا: (تعجب سے) میں!
استاد: ہاں تم۔
(چورن والا قریب پہنچتا ہے)
استاد: تمھیں رونا آتا ہے؟
چورن والا: (نفی میں سر ہلا کر) اوں ہوں۔
استاد: تمھیں گانا آتا ہے؟
چورن والا: (ہنس کر) میرے خاندان میں
کوئی گویا نہیں ہوا۔
استاد: (غصے سے اپنا ڈنڈا اسٹول پر مار کر)
تم جھوٹ بولتے ہو۔
ابھی تم گا گا کر اپنا چورن بیچ رہے تھے
تم کیسے بیچتے ہو اپنا چورن؟

چلو... چلو... بچو... آوازیں لگاؤ۔

(چورن والا سہم کر گانے لگتا ہے۔ استاد خوش ہو کر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگتے ہیں گانا ختم ہونے پر استاد باورچی سے مخاطب ہوتے ہیں۔)

استاد: سنا تم نے

باورچی: جی ہاں بہت اچھا تھا۔

استاد: اگر تم نے اس کا گانا سنا ہے جیسا کہ تم کہتے ہو کہ سنا ہے تو پھر تم اس گانے کی قیمت ادا کرو۔ ابھی — اسی وقت اس گانے کی قیمت ادا کرو۔

باورچی: لیکن... لیکن....

استاد: لیکن ویکن کیا؟ گلا اس کا، آواز اس کی گانا اس کا تو پھر تم سننے والے کون ہوتے۔ اگر بھاپ کی قیمت ہو سکتی ہے۔ تو پھر گانا سننے کی بھی قیمت ہو سکتی ہے۔

بہت سی آوازیں: استاد ٹھیک کہتے ہیں۔ استاد ٹھیک ہیں۔

استاد: (ڈانٹ کر) خاموش۔

سب ایک دم خاموش ہو جاتے ہیں لیکن باورچی کی دکان کے آگے کتا رونے لگتا ہے۔ استاد اپنی عینک میں سے پہلے کتے کو گھورتے ہیں چھتری والے سے مخاطب ہوتے ہیں۔

استاد: تمہارے پاس کچھ پیسے ہیں۔

چھتری والا: پیسے... پیسے۔ میرے پاس صرف پانچ پیسے ہیں۔ آج کوئی مزدوری نہیں ملی۔

استاد: لائیے، لائیے پانچ پیسے کافی ہیں۔ بہت ہیں جلدی نکالیے۔

(چھتری والا جیب سے سکہ نکال کر دیتا ہے۔ باورچی بڑی امید سے آگے بڑھتا ہے جیسے یہ سکہ اسے مل جائے گا استاد باورچی کو آگے بڑھتا دیکھ کر اپنا سکے والا ہاتھ جلدی سے کھینچ لیتے ہیں)

استاد: اتنی جلدی نہیں ذرا صبر سے کام لو۔ ارے تمہارے یہاں سل کی قسم کی کوئی چیز ہے؟

ہوٹل والا: ہے کیوں نہیں استاد؟

استاد: تو پھر لے آؤ اسے۔

(باورچی دکان کے اندر جا کر پہلوانوں کی طرح سل اٹھا کر لاتا ہے۔ اور اسٹول پر رکھ دی جاتی ہے۔)

استاد: (سل پر سکہ بجاتے ہوئے) کھرا ہے سکہ
بالکل کھرا ہے (چھتری والے سے) یہ لیجیے۔
(چھتری والا خوشی خوشی جیب میں رکھنے
لگتا ہے) استاد پھر۔
استاد: ارے... رے... رے... اتنی جلدی
نہیں بھائی صاحب۔ سکہ نکالیے نکالیے
سکہ۔
(چھتری والے کے چہرے سے مسکراہٹ
غائب ہو جاتی ہے۔ وہ حیران ہو کر
استاد کی طرف دیکھتا ہے اور سکہ پھر
واپس کر دیتا ہے۔)
استاد: (چھتری والے سے) یہ سکہ آپ اس
سل پر اچھالیے۔) چھتری والا سکہ اچھالتا
ہے۔ آواز پیدا ہوتی ہے۔)
استاد: (باورچی سے) سنا آپ نے؟
(باورچی اقرار کے انداز میں سر ہلاتا
ہے)
استاد: (چھتری والے سے) ایک دفعہ اور۔
چھتری والا: پھر سکہ سل پر بجاتا ہے استاد
خود بھی سر جھکا کر آواز سنتے ہیں اور
ساتھ ہی باورچی کو گردن سے پکڑ کر
اس کا سر جھکاتے ہیں پھر باورچی سے
پوچھتے ہیں)
استاد: سنا آپ نے؟
(باورچی پھر اقرار کے انداز میں سر ہلاتا
ہے۔)
استاد: (چھتری والے سے) ایک... ایک
دفعہ اور...
(استاد ہوٹل والے کا سر سل کے
اوپر اتنا جھکا دیتے ہیں کہ سر سل پر ٹک
جاتا ہے۔ کرسی سے اتر کر استاد فیصلہ
سناتے ہیں)
استاد: میں سمجھتا ہوں کہ چھتری والے نے
دکان دار کے قورمے کی کو بھاپ کو
غلط طریقہ پر لیا ہے۔ یہ سراسر بے
ایمانی ہے۔ کھلی ہوئی چوری ہے۔
(باورچی خوش ہو کر پھدکتا ہے۔ استاد
زندہ باد۔ استاد زندہ باد کے نعرے
لگاتا ہے۔)
استاد: (ڈانٹ کر) ٹھہرو... ابھی نہیں۔
میں سمجھتا ہوں کہ بھاپ کی قیمت پیسے
سے ادا نہیں کی جا سکتی کیونکہ پیسہ تو

قورمے کی قیمت ہے (بھیڑ سے مخاطب ہوکر)

بہت سی آوازیں: بالکل ٹھیک ہے۔

استاد: قورمے کی بھاپ کی قیمت صرف پیسے کی آواز سے ادا کی جا سکتی ہے جو کہ چھتری والا ادا کر چکا ہے۔

باورچی: نہیں سرکار۔ اس نے تو ابھی ایک پیسہ بھی نہیں ادا کیا۔

استاد: (غصے سے چھتری اسٹول پر مار کر) تم جھوٹ بولتے ہو اس نے قیمت ادا کر دی ہے (پیسے کو زمین پر بجا کر) یہ آواز سنتے ہو۔

(باورچی سر ہلا کر اقرار کرتا ہے)

استاد: یہ آواز تمھارے قورمے کی بھاپ کی قیمت ہے جس طرح قورمہ تمھاری پتیلی میں رہا اور بھاپ اس کی روٹی میں چلی گئی اسی طرح اس سکے کی آواز تمھارے کانوں میں جا چکی ہے اور تمھارے کانوں میں رہے گی اور یہ سکہ چھتری والے کی جیب میں رہے گا۔ قورمے کی بھاپ کی قیمت صرف سکے کی آواز میں ادا کی جا سکتی ہے۔

(استاد زندہ باد، استاد زندہ باد کا شور بلند ہوتا ہے اور پردہ گرتا ہے۔)

شام کا سورج

اس طرح ہے دن کے ہنگاموں سے گھبرایا ہوا
زندگی سے جیسے کوئی شخص اکتایا ہوا
جان دینے کے لیے پانی میں ہو — آیا ہوا

— کوہ کی چوٹی سے اب، ساگر کے گہرے غار میں
شام کا غمگین سورج کود جائے گا مگر
جرم کے انجام کی اس کو نہیں ہے کچھ خبر

حاکم شب خودکشی کی یہ سزا دے گا اسے
کل سویرے پھر اسی دنیا میں پھینکے گا اسے

جناب
بدیع الزماں خاور

جناب احمد وصی

وطن کا گیت

کتنا سندر، کتنا پیارا، بالکل سوِرگ سمان ہے
دیکھ زمانے دیکھ یہی تو میرا ہندوستان ہے

ناج اگاتی دھان کی فصلیں سونا بنتی بالیاں
محنت والوں کے گن گاتی لہراتی ہریالیاں
سجی سجائی کیاریاں جیسے پوجا کی تھالیاں
ان ساری خوشیوں کا داتا صرف غریب کسان ہے
دیکھ زمانے دیکھ یہی تو میرا ہندوستان ہے

صبح بنارس گنگا کے پانی میں نہا کر آتی ہے
شام اودھ انگڑائی لے کر دھرتی پر لہراتی ہے
صبح و شام کے بیچ دوپہر ایسی دھنک لٹاتی ہے
طاق کے بیچوں بیچ ہیں جیسے سلگ رہا لوبان ہے
دیکھ زمانے دیکھ یہی تو میرا ہندوستان ہے

صبح چلے مزدور پلٹ کر شام کو گھر پہ آتے ہیں
دن بھر اپنے جسم کا سونا میلوں میں پگھلاتے ہیں
ان کے بازو مستقبل کے رنگیں خواب دکھاتے ہیں
اڑتا ہوا چمنی کا دھواں خوش حالی کا اعلان ہے
دیکھ زمانے دیکھ یہی تو میرا ہندوستان ہے
میرا ہندوستان ہے، میرا ہندوستان ہے
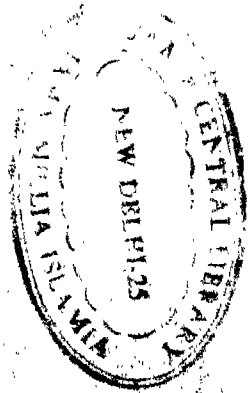
خوش ذوق خواتین
اپنے لباس 'سینفورائزڈ' کے
لیبل والے کپڑوں سے ہی بنواتی ہیں

· SANFORIZED ·
REGD TD MK

سینفورائزڈ کے لیبل والے خالص سوتی، نیم سوتی کپڑوں کے علاوہ واش اینڈ ویئر کپڑوں نے بھی اپنا ایک معیار قائم کیا ہے۔ یہ کپڑے بار بار دُھلنے پر بھی اپنی اصلی وضع قطع اور نئے پن کو قائم رکھتے ہیں۔ جب آپ نے 'سینفورائزڈ' چھاپ کپڑے خریدے تو آپ کو انہیں سلوانے سے پہلے پانی میں بھگونے کی ضرورت نہیں رہتی۔

'سینفورائزڈ' کا لیبل بہتر بنائی، بہتر چھپائی اور جدید فنشنگ کے معیاری کپڑوں اور تیار شدہ لباسوں پر ہی لگایا جاتا ہے۔ اور یہ تو آپ کے لباسوں کا پورا پورا نعم البدل ہے۔

'سینفورائزڈ' کا ٹریڈ مارک دُنیا کے ۶۵ ملکوں میں کروڑوں صارفین کا کپڑوں کیلئے کپڑا نہ سکڑنے کی ایک قابلِ اعتماد ضمانت کے طور پر پہچانا اور مانا جاتا ہے۔

رجسٹرڈ ٹریڈ مارک سینفورائزڈ کے مالکان کلیوٹ پیباڈی اینڈ کمپنی [illegible]

جناب م۔ ن۔ خان

کپڑے جو کپاس سے نہیں بنتے

آپ بھی سن کر تعجب میں پڑ گئے ہوں گے بھلا ایسے کون سے کپڑے ہیں جو کپاس سے تیار نہیں ہوتے۔ سب ہی کپڑے تو کپاس کی روئی یا پھر اون ریشم سے تیار کیے جاتے ہیں۔ پر بھی یہ کوئی تعجب کی بات نہیں آپ نے ایسے کپڑے دیکھے ہی نہیں بلکہ بہت سے لوگوں نے پہنے بھی ہیں۔ ہاں یہ بات آپ کو معلوم نہ ہوگی کہ یہ نفیس اور دیدہ زیب کپڑے دودھ، لکڑی، سویابین وغیرہ سے تیار ہوتے ہیں۔

لکڑی کے کپڑے

آج سے کوئی پچاس برس پہلے جرمنی کے ایک درزی کے اس اعلان نے لوگوں کو حیرت میں ڈال دیا تھا کہ ہمارے یہاں دل پسند کپڑے درختوں کی لکڑی سے تیار کیے جاتے ہیں۔ اعلان کا شائع ہونا تھا کہ سیکڑوں بچے بوڑھے عورت، مرد روزانہ اس کی دکان پر ان عجیب غریب کپڑوں کو خریدنے کے لیے آنے لگے۔ خریداروں کا تانتا بندھ گیا۔ درزی نے سب کو ان کی پسند کے نہایت نفیس چمکدار ریشم کی طرح ملائم رنگ برنگے نئے نئے فیشنوں کے کپڑے تیار کرکے دیے۔ پھر کیا تھا سارے ملک میں ہزاروں دکانیں اس طرح کی کھل گئیں جہاں لکڑی کے سستے کپڑے تیار کیے جاتے تھے یہ کپڑے بہت ہی پسند کیے گئے۔

لکڑی سے ریشم تیار کرنے کا سہرا فرانس کے ایک شخص کے ایچ۔ چارڈونیے کے سر ہے۔ ریشم کے کیڑوں کی غذا شہتوت کے پتے ہیں یہ

بات ہم آپ آج سے نہیں بہت دنوں سے جانتے ہیں۔
یہی بات دیکھ کر اس نے سوچا کہ اگر کوشش کی جائے
تو اسی اصول پر بڑے پیمانے پر لکڑی سے ریشم
بنایا جا سکتا ہے۔ چارڈونے اس کام میں جٹ گیا۔
اسے اس میں بڑی کامیابی ہوئی۔ آج کل لکڑی
سے کپڑا بنانے کے کارخانوں میں اسی کے اصولوں
کو کام میں لایا جاتا ہے۔

کپڑا بنانے کے لیے ٹمبر لکڑی بہت
موزوں ہے۔

جنگلی ٹمبر کے سوکھے درختوں کو کاٹ کر
دریاؤں میں بہا کر ایسے کارخانوں تک پہنچاتے
ہیں جہاں ان کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بدل
دیا جاتا ہے ان کی چھال الگ کر دی جاتی ہے۔ پھر
انھیں دواؤں میں اُبال کر اس کا رنگ اور میل
کاٹا جاتا ہے۔ اس طرح سفید لگدی بن جاتی ہے۔
اس لگدی کو بھاپ سے گرم کیے گئے بڑے بڑے
فولادی بیلنوں کے ذریعے دبا کر سکھا لیتے ہیں اس
کی شکل بلاٹنگ پیپر (جاذب) جیسی ہو جاتی ہے۔
اب اسے 'سیلیولوز' کہتے ہیں۔ اب یہ کپڑا بنانے کے
کارخانوں کو بھیج دیا جاتا ہے۔

وہاں سیلیولوز کی چادروں کو ناپ تول کر چھوٹے
چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر کاسٹک سوڈے
کے حوضوں میں ڈال دیتے ہیں اس طرح گندگی حوض
کی تہہ میں بیٹھ جاتی ہے اور صاف سیلیولوز کاسٹک
سوڈے سے مل کر 'الکلی سیلیولوز' بن جاتا ہے۔
مشینوں کے ذریعے دبا کر اس کا پانی نچوڑ دیا جاتا
ہے۔ پھر تیز بلیڈوں کی مدد سے مہین مہین ٹکڑوں
میں بدل دیا جاتا ہے۔ اسے تقریباً بیس گھنٹے ایسا
ہی پڑا رہنے دیتے ہیں تاکہ کاسٹک اپنا کام پورا
کرلے۔

اب سوکھے ہوئے الکلی سیلیولوز کے سو
حصوں میں آٹھ حصے کاربن ڈائی سلفائیڈ نامی
کیمیائی محلول ملا کر رکھ دیتے ہیں۔ سیلیولوز کے
سب سفید ٹکڑوں کا کچھ دیر بعد پھول کر ایک لال
رنگ گوند کی طرح کا گاڑھا رقیق بن جاتا ہے
اسے پھر پانی کے ٹب میں ڈال کر چرخی سے خوب
چلایا جاتا ہے۔ اس طرح پانی میں شہد کی طرح کا
ایک محلول بن جاتا ہے۔ یہ محلول وسکوز کہلاتا ہے۔
وسکوز کا کیمیائی تجزیہ کر کے بڑے بڑے ڈرموں
میں بھر دیتے ہیں کچھ دنوں بعد اسے روئی اور
کپڑے کی موٹی تہوں میں اچھی طرح چھان لیتے
اس چھنے ہوئے وسکوز سے کپڑا بننے کا دھاگا بنایا

ہے۔

وسکوز سے دھاگا ' اسپرنگ جیٹ کی مدد
سے بناتے ہیں اسپرنگ جیٹ ایک سخت قسم کی
دھات کی موٹی پلیٹ ہوتی ہے اس میں باریک
باریک سوراخ ہوتے ہیں یہ پلیٹ وسکوز کی
ٹنکی کی ایک دیوار میں لگی ہوتی ہے۔ اور یہ ٹنکی
ہلکے گندھک کے تیزاب میں ڈوبی رہتی ہے جب
ٹنکی کے اندر ہوا کا دباؤ مشین کی مدد سے بڑھایا
جاتا ہے تب دباؤ کی وجہ سے وسکوز کی مہین
دھاریں سوراخوں سے نکل کر گندھک کے تیزاب
میں پہنچتی ہیں۔ گندھک کے تیزاب میں یہ دھاریں
اسی طرح جم جاتی ہیں جیسے ریشم کے باریک باریک
تار۔ یہ تار یا دھاگے ایک ڈرم پر لپیٹ لیے
جاتے ہیں۔ اسی دھاگے سے کپڑا تیار کیا جاتا ہے۔

دھاگوں پر سے تیزاب اور دوسری
کیمیائی چیزوں کو اسپرے مشین کی مدد سے
دھوکر صاف کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد دوسری
مشین سے اس کا رنگ اڑاتے ہیں۔ پھر آخری
بار ان پونیوں کو صابن اور پانی کے محلول میں
دھو کر کپڑا بناتے ہیں۔

یہ دھاگے کافی ملائم چمکدار مضبوط خوبصورت
اور سستے ہوتے ہیں ان دھاگوں سے بنا ہوا کپڑا۔
کیلا سلک، نقلی سلک، یا "رے آن" کہلاتا ہے۔

یورپ میں یہ کپڑا ۱۹۰۴ء سے بن رہا ہے۔
لیکن ہندوستان میں سب سے پہلے یہ کپڑا ٹراونکور
رے آن فیکٹری نے ۱۹۴۶ء سے بنانا شروع کیا۔
اس کے بعد کان پور، گوالیار وغیرہ میں بھی
اس طرح کے کارخانے کھل گئے 'رے آن' نے
آج کل ریشم کی جگہ لے لی ہے اور یہ بہت ہی
پسندیدہ کپڑا بن گیا ہے۔

دودھ کے کپڑے

یہ تو تھے لکڑی کے کپڑے اب سنئے دودھ
کے کپڑوں کے بارے میں لکڑی کے کپڑوں
کا تذکرہ سن کر اٹلی کے ایک درزی نے سوچا
کچھ اس سے بھی حیرت انگیز بات کرنی چاہیئے۔ کچھ
دنوں بعد اس نے اعلان کیا کہ آپ اپنے پسندیدہ
جانور گائے، بھینس بکری وغیرہ کے دودھ
سے بنے تازہ ترین فیشن کے سستے اونی کپڑے
ہمارے یہاں سے خریدیئے...!

جرمنی کی طرح اٹلی میں بھی اس اعلان نے
ہلچل مچادی اور بازار میں لکڑی اور دودھ کے

نفیس رنگ برنگے، چکنے چمکدار، خوش نما ملائم
مضبوط اور سستے کپڑے بازاروں میں آگئے۔
ان کی مانگ روئی کے کپڑوں سے بھی زیادہ بڑھ
گئی۔ ان کپڑوں کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ اگر
انھیں اصلی اونی کپڑوں میں ملا دیا جائے تو
اصلی اور نقلی کی پہچان بھی ناممکن ہو جائے۔
دودھ کے کپڑوں کی ایجاد کا سہرا اٹلی
کے 'کمانڈ ٹیور انٹینیو فریبی' کے سر ہے۔ دنیا
کے سیکڑوں آدمی دودھ کے کپڑے بڑے شوق
سے پہنتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اگر انھیں یہ
حقیقت بتلائی جائے تو وہ بتلانے والوں کو
پاگل ہی سمجھ بیٹھیں۔
جن ملکوں میں دودھ زیادہ ہوتا ہے
مکھن نکالا ہوا دودھ (سپریٹا) پھاڑ کر پنیر جیسی
چیز جسے "کیسین" کہتے ہیں تیار کی جاتی ہے۔
ایک من دودھ میں تقریباً پانچ سیر 'کیسین' نکلتا
ہے اس کیسین کو اور دوسرے کیمیائی اجزاء کے
ساتھ ملا کر ایک دوسرا کیمیائی مرکب "لینی ٹل"
بنایا جاتا ہے جو کپڑا بنانے کے کام آتا ہے اس
سے بنے ہوئے کپڑے کا نام بھی 'لینی ٹل' ہے۔ یہ بالکل
اونی کپڑے کی طرح ہوتا ہے۔ آج کل 'ٹیری وول'
نامی اونی کپڑے میں بھی کچھ حصہ 'لینی ٹل' کا ملا
رہتا ہے۔

سویابین اور مچھلی کے کپڑے

دنیا بھر میں جاپان اپنی نئی نئی خوب صورت
اور سستی چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ وہاں کی
حکومت نے اپنے یہاں کے اصلی اون کی غیر ممالک
میں بکری بڑھانے کے لیے یہ قانون بنایا کہ ہر
جاپانی اپنے پہننے کے لیے 'اونی سلک' کے کپڑے
استعمال کرے گا۔ قیمت کے اعتبار سے یہ اونی
کپڑا اصلی اونی کپڑے سے پانچ گنا سستا ہوتا
ہے لیکن مال میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔ اس
کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بنانے میں اصلی اون
میں تیس فی صدی سویابین کی پھلیوں سے تیار
کیا ہوا نقلی اون ملا دیا جاتا ہے۔ ٹھنڈے
کپڑوں میں مچھلی سے بنائے ہوئے کپڑے بھی
جاپان میں کافی چلے۔ جاپان میں مچھلی اور سویابین
کافی مقدار میں پایا جاتا ہے۔

شیشے اور سیلوفین کاغذ کے کپڑے

امریکی سائنس داں تو ان سب سے

بازی لے گئے انھوں نے شیشے اور سیلولین کاغذ کے باریک ملائم اور پائیدار خوشنما کپڑے بنا ڈالے یہی نہیں بلکہ انھوں نائیلون کے موزے ٹرالین کے بشرٹ، پتلونیں ڈیکران کے شلوار قمیص اور ٹیرادول کے شلوار سوٹ کے لیے پلاسٹک کا سوٹ ایجاد کر کے کپڑے کی صنعت میں انقلاب پیدا کر دیا۔ لوگ سوتی کپڑوں کو بھول گئے اور ان کیمیائی کپڑوں کی طرف راغب ہو گئے۔

کہئے ہے نا تعجب کی بات کپڑے اور وہ بھی شیشے کے لیکن کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیجئے گا کہ یہ کپڑے شیشے کی طرح سخت ہوں گے پہننے میں پریشانی ہوگی ذرا سی ٹھیس لگنے پر ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے۔ جی نہیں بالکل نہیں۔ یہ کپڑے تو سوتی کپڑوں سے بھی زیادہ ملائم مضبوط خوش نما چمکدار اور دیدہ زیب ہیں۔ اب بتلائیے کس کس نے پہنے ہیں یہ دودھ لکڑی مچھلی اور شیشے کے کپڑے ....؟ بہت سے لوگوں نے پہنے ہیں نا؟

★

کچھ اچھے ناول

تین اناڑی	عصمت چغتائی	۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	ایل لاگن	۲/۰
" " (دوم)	"	۲/۰
خرگوش کا سپنا	کرشن چندر	۱/۷۵
ڈاکو کی گرفتاری		۰/۵۰
ستاروں کی سیر	کرشن چندر	۱/۷۵
کوے وادا	مجیب احمد خاں	۱/۷۵

پروفیسر امانت

دُم کٹا گدھا

سنائیں تمھیں اک کہانی گدھے کی ۔۔۔ وہ تھا خوب صورت مگر دُم کٹی تھی -

سمائی یہ دل میں کہ دُم ڈھونڈ لائے ۔۔۔ لگا کر اسے پھر غمِ دل مٹائے

اِسی دھن میں بس وہ چلا جا رہا تھا ۔۔۔ تصوّر سے دُم کے کھلا جا رہا تھا

گلی کوچے اُس نے سبھی چھان مارے ۔۔۔ وہ پھرتا رہا یونہی دُم دُم پکارے

نکل آیا جس دم وہ بستی کے باہر ۔۔۔ لُبھانے لگا اُس کو سرسبز منظر

نظر آئی اُس کو ہری ایک کھیتی ۔۔۔ جو ترکاریوں ہی سے یکسر بھری تھی

رہا دھیان دُم کا ذرا بھی نہ اُس کو ۔۔۔ ہُوا خوف انجام کا بھی نہ اُس کو

بڑے شوق سے گھُس کے کھیتی کے اندر ۔۔۔ وہ کھانے لگا سبزیاں گھر سمجھ کر

وہیں پاس کھیتی کا مالک کھڑا تھا ۔۔۔ درانتی اُٹھا کر وہ پھرتی سے لپکا

دکھائی جو بجلی کی سی اُس نے تیزی ۔۔۔ گدھے کے ہوئے ہوش گم کچھ نہ سُوجھی

اُچھل کر درانتی سے فوراً ہی اُس نے ۔۔۔ بچارے گدھے کے وہیں کان کاٹے

تڑپتا ہوا، تلملاتا وہ بھاگا ۔۔۔ یہ کہتا ہوا کہ "غضب ہے خدایا"

گدھے نے بُرائی کے جو بیج بوئے ۔۔۔ ملی دُم کہاں؟ مفت میں کان کھوئے

غلط راہ پر جو چلے یونہی روئے
بڑی سے بڑی چیز سے ہاتھ دھوئے

جناب حسن کمال بمبئی

بھکاری

بلال اور بانو ــــ یہ دونام میری زندگی میں دوستارے ہیں۔ زندگی کا اندھیرا جتنا بڑھتا ہے اتنی ہی ان ستاروں کی چمک بھی بڑھتی جاتی ہے۔ ایک آدمی کے چاروں طرف بہت سے آدمی رہتے ہیں۔ مگر ان سب سے کوئی آدمی ایک جیسی محبت تو نہیں کر سکتا، کسی کو کم چاہتا ہے کسی کو زیادہ۔ تو یہی حال میرا بھی ہے۔ میرے چاروں طرف بہت سے لوگ ہیں۔ میری اماں ہیں جنھیں میں آپا کہتا ہوں۔ میری دو بہنیں ہیں، میرے بڑے بھائی ہیں، اور پھر میری زندگی کا بہت اہم حصہ یعنی ان گنت دوست ہیں۔ اب اگر میں کہوں کہ میں ان سب کو ایک جیسی شدت سے چاہتا ہوں تو یہ بات تو جھوٹ ہوگی نا۔ مگر یہ سچ ہے کہ ان دونوں کو میں بے پناہ چاہتا ہوں بچو! تم سوچ رہے ہوگے کہ یہ دونوں آخر ہیں کون ؟ آؤ میں تمھیں ان سے ملا دوں۔ ان سے ملو۔ یہ آٹھ سال کے گورے چٹے صاحبزادے جن کی آنکھیں کسی نئی شرارت کے خیال سے چمک رہی ہیں۔ یہ ہیں ماسٹر بلال فرید یعنی میرے بھانجے۔

ہیں تو آپ آٹھ سال کے۔ مگر جب پلنگ پر لیٹ کر گھٹنے جوڑ کر آسمان کی طرف کر لیتے ہیں اور پھر ایک لمبی سانس لے کر اپنا دایاں پیر بائیں گھٹنے پر رکھ کر دادا جان کی طرح فرماتے ہیں "بھئی یہ سب کیا ہو رہا ہے" تب آپ کو ہر گز یقین نہیں آئے گا کہ ان کی عمر صرف آٹھ سال ہے، بلکہ شاید آپ یہ بھی سوچیں کہ کہیں یہ آٹھ کے دائیں طرف کا صفر شرارت میں کھو تو نہیں آئے ہیں۔

ویسے آپ کافی خوش مزاج ہیں۔ مگر یہ نہیں کہ آپ کو غصہ آتا ہی نہ ہو۔ تاؤ آجاتا ہے تو پھر مجھے

ماموں جان نہیں، کہتے کالے ماموں کہہ کر پکارتے ہیں گویا اس طرح وہ میری جی بھر کر مرمت کر دیتے ہیں۔ آپ کا دولت خانہ فی الحال علی گڈھ ہے۔ ویسے کبھی کبھی لکھنؤ کو بھی نوازتے ہیں۔

اور اب ان سے ملیے تین ساڑھے تین سال کی یہ جو ننھی سی، شرمائی لجائی اور خوب صورت سی شاہزادی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ہیں میری بھانجی۔ میں انھیں صوفیہ نشاط کہتا ہوں۔ ان کی امّی انھیں کچھ اور کہتی ہیں۔ ان کے ابّا انھیں خدا جانے کیا کہتے ہیں مگر ہم نے اب آپسی تکرار سے بچنے کے لیے انھیں مل جل کر بانو کہنا شروع کر دیا ہے آپ ابھی شارٹ ہینڈ میں بات کرتی ہیں۔ یا تو پوری بات کہہ نہیں پاتیں، یا کانگریس کے صدر کامراج کی طرح زیادہ بات چیت کے خلاف معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے اکثر آپ کو ان کی باتیں سن کر یہ خیال آئے گا جیسے یہ وہ زبان ہے جو پیسے بچانے کے لیے ٹیلی گرام میں لکھی جاتی ہے۔ آپ کا قیام مستقل لکھنؤ میں ہے۔

اچھا تو اب تم لوگ مل لیے نا ان سے، اب میری کہانی سنو۔ میں بمبئی میں ہوں۔ عرصہ چھ ماہ کا ہو گیا میں اپنے ان دونوں پیاروں سے نہیں مل پایا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ لکھنؤ کا ایک چکر لگا لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال آیا کہ میں ہلال اور بانو کے لیے یہاں سے کوئی چیز لیتا چلوں اس خیال سے میں بازار کے لیے نکل کھڑا ہوا اور یہیں سے میری پریشانی شروع ہوتی ہے

میں ایک دوکان پر جا کھڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ ہلال اور بانو کو کیا چیز دوں؟ یہ سوچتے سوچتے مجھے خیال آیا ہلال اور بانو اور ان کے جیسے بچّوں کو کیا دے سکتا ہوں؟ پھر کیا دے سکتا ہوں کا فقرہ اتنا لمبا چوڑا ہو گیا کہ جیسے سارے آسمان اور زمین پر یہی ایک جملہ لکھا ہو "کیا دے سکتا ہوں"

دیکھو نا! میرے بزرگوں نے مجھے بہت کچھ دیا۔ تہذیب، تمدن، نیک بننے کی ہدایت اپنی اور دوسروں کی عزت کرنے کا سبق۔ میرے والد مرحوم نے مجھے اتنی بڑی دولت دی کہ میں سات بار جنم لے کر بھی ان کا احسان نہیں چکا سکتا۔ انھوں نے مجھے یہ دولت دی کہ جب نیند آئے تو یہ مت دیکھو کہ بدن کے نیچے نرم گرم بستر ہے یا پتھر کا فرش۔ بس سو جاؤ جب بھوک لگے تو مت دیکھو کہ سامنے مرغن غذائیں ہیں یا دال روٹی۔ بس کھا لو۔ یہ دولت اتنی بڑی تھی کہ مجھے آج تک کسی ماحول میں کسی شہر میں کسی گھر میں تکلیف کا احساس نہیں ہوا۔ مگر میں اور میری عمر کے سارے لوگ اپنے چھوٹوں کو کیا دیں گے کیا دے سکتے ہیں؟؟

ہمارے پاس ہے کیا۔ یہ بھی سن لو۔ نفرت
ایک دوسرے سے بے پناہ نفرت، بیزاری ہر ایک سے
یہاں تک کہ اپنے سے بیزاری، حسد ہر ایک کی ترقی سے
حسد ہم لوگ تو ایک دوسرے کے خون اور ہڈیوں پر گذارا
کر رہے ہیں۔ ایک دوسرے کو گرا گرا کر دھکیل کے آگے
بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہم نے یہی تو کیا ہے کہ
جن خوب صورت اصولوں اور نعروں کو لے کر چلے تھے۔
ان کا سودا کرتے پھرتے ہیں۔ جن خوابوں کو اپنایا تھا آج
ان کو سرِ عام نیلام کر رہے ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے
ہوس کی بھوک، تو دوسرے کے نوالے جھپٹ لیتے
ہیں۔ جب پیاس لگتی ہے۔ شہرت کی پیاس، تو اپنے
اصول اپنے آدرش اور اپنے خوابوں کا خون پی جاتے ہیں۔
ایک ایک پیسے کے لیے ایک دوسرے کا گلا تک کاٹ
لیتے ہیں۔ انعاموں، خطابوں اور دولت کے لیے ایسی
ذلیل حرکتیں کرتے ہیں کہ توبہ بھلی۔ اب تم ہی بتاؤ میں
تمھیں کیا دوں۔ اپنے ہلال اور بانو کو کیا دوں؟ یہ نفرت،
یہ حسد، یہ سازشیں، یہ دولت کی ہوس، یہ غربت، یہ
بھوک، یہ کمینہ پن —— ارے نہیں یہ تو
تمھارے ساتھ دشمنی ہوگی۔

بس میں دوکان پر کھڑا ہوا یہی سوچ رہا ہوں
میں نے سوچا کہ ہلال اور بانو کو تم سب کو ایک دعا دوں
کہ خدا کرے تم ہم سب سے بہتر بنو۔ تیسری دنیا کے
اشرف انسان بنو۔ وہ سب بنو جو ہم نہ بن سکے۔ مگر پھر
سوچا کہ دعا دوں گا تو ہلال فرمائیں گے "واپس دعا"
اور بانو اپنی تار کی زبان میں کہے گی "دعا نہیں" تم سب
کہو گے کہ واہ صاحب خوب ٹرخایا آپ نے!

میں آج بھی اسی دوکان پر کھڑا ہوں۔ اس
انتظار میں کہ تم میں سے کوئی ادھر آ نکلے یا میرا ہلال
میری بانو ہی آ نکلے تو میں ان سے پوچھوں کہ "میں تمھیں
کیا دے سکتا ہوں"۔ شاید تم سب ہی کو کوئی ایسی چیز
دکھائی دے جائے کہ تم میری ساری برائیاں بھول
کر کہو "ہمیں یہ دیجیے"۔ بچو! میں اس دوکان پر کھڑا ہوا
کبھی روتا ہوں، کبھی ہنستا ہوں۔ آتے جاتے لوگ
مجھے دیوانہ سمجھ کر کترا جاتے ہیں۔

میں تو تمھارا بھکاری ہوں۔ ہلال اور بانو کا
بھکاری۔ میں تم سب سے تمھاری معصومیت، تمھاری
پیاری پیاری باتوں، تمھاری بھولی بھالی شرارتوں،
تمھاری آنکھوں کی بے گناہ چمک، ہلال کی بچپن نما بزرگی
اور بانو کی تتلی گرام والی گفتگو کی بھیک مانگ رہا ہوں تاکہ
پھر جی اٹھوں۔ میں اپنے خوابوں کو حقیقت میں بدل سکوں
اس سماج کو اپنے سپنے کا دیس بنا سکوں۔ بولو مجھے یہ
بھیک دوگے؟ نہیں مت کہنا میرا دل ٹوٹ جائے گا۔

میرے ساتھیوں میں بہت سے لوگ تھے ان میں ایک صاحب منصور بن شکل تھے۔ حلب اور بخارا کے سفر میں ان کا ساتھ رہا تھا۔ بہت عالم وفاضل تھے۔ قاضی اسریہ یہ شرف الدین قاسم ابن منان تھے۔ ایک صاحب کا ذکر خصوصیت سے کرنا چاہتا ہوں۔ ان کا نام علی بن حجر الدموی تھا۔ غرناطہ کے رہنے والے تھے۔ ایک رات انھوں نے خواب میں دیکھا کوئی اشعار پڑھ رہا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔

مرقد مبارک کے زیارت کرنے والوں کو مبارک ہو
کہ وہ ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے پاک
ہو گیے۔ مدینہ طیبہ میں پہنچ جانے سے بڑھ کر
کون سی نعمت ہو سکتی ہے!
زہے نصیب زائرین مدینہ کہ تمھاری
صبح وشام اس مقدس شہر میں گذرتی ہے۔

علی ہندوستان بھی آئے تھے۔ اور دارالسلطنت دہلی میں میرے پڑوس میں رہتے تھے۔ شاہ ہندوستان سے جب میں نے علی کا خواب بیان کیا تو بادشاہ نے خود ان کی زبان سے سنا اور بڑے اخلاق سے بات چیت کی۔ شاہی مہمان بنایا اور خلعت سے سرفراز کیا اور روزینہ مقرر کر دیا۔ ایک ہزار نقد کا عطیہ بخشا۔

علی نے ایک چھوکری اور ایک چھوکرا خریدا ان دونوں نے یہ رقم دیکھ پائی اور موقع پاکر لے اڑے علی نے روپیہ غائب دیکھا تو بہت سٹ پٹائے ایسا صدمہ ہوا کہ بیمار پڑ گیے۔ میں نے بادشاہ سے ذکر کیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اتنی ہی رقم اور دے دی جائے۔ آدمی رقم لے کر پہنچا تو بے چارے مرے پڑے تھے۔ خدا بخشے خوب آدمی تھے۔

مکہ معظمہ کا سفر۔

اب ہم مکہ معظمہ جا رہے ہیں پہلی منزل ذوالحل
ہے۔ جہاں احرام باندھا جاتا ہے۔ رسول اللہ نے بھی مدینے سے مکہ جاتے وقت اسی جگہ احرا

باندھا تھا۔ وادی خُلیفہ مدینے سے پانچ میل ہے۔
یہاں سے شعب علی میں گذر کر روحا پہنچے۔ روحا
میں ایک کنواں ہے۔ اس کی نسبت کہتے ہیں کہ یہاں
حضرت علی اور جن سے مقابلہ ہوا تھا۔
اب کی منزل بدر کی منزل ہے۔ جہاں سرکارِ
دوعالم کے تمام دشمنوں کا زور ٹوٹ گیا تھا۔ اور
مکے کے بڑے بڑے سرکش اور امیر مارے گیے
تھے۔

بدر ایک کنویں کا نام ہے۔ اب یہاں آبادی
ہے۔ جس کے آس پاس کھجوروں کے باغ ہیں۔ ایک
قلعہ ہے۔ بدر میں وہ تمام یادگاریں ہیں جنھیں تاریخ
بھلا نہیں سکتی۔

(۱) جس جھونپڑی میں سرکار دوجہاں نے خدا سے
عرض کیا تھا کہ اگر گنتی کے یہ چند مسلمان ختم ہوگیے
تو پھر تیری یکتائی کا اعلان کرنے والا
دنیا میں کوئی نہ رہے گا۔ اور خدا نے فتح
کی خوش خبری دی تھی۔
(۲) وہ گڑھا جس میں دشمنوں کی لاشیں گھسیٹ
گھسیٹ کر مسلمانوں نے پھینکی تھیں۔
(۳) جہاں فرشتوں نے نازل ہوکر مسلمانوں کی
مدد کی تھی۔
لوگ کہتے ہیں کہ ہر جمعہ کی رات کو اس
وادی میں ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے لڑائی کے
نقارے بجتے ہوں۔
بدر سے آگے چل کر ایک جنگل ملتا ہے۔ جسے قاع البزار
کہتے ہیں۔ اس جنگل میں مسافر اکثر راستہ بھول جاتے
ہیں۔ اس کے آگے رابغ ہے۔
بدر میں ایک چشمہ بھی ہے جس کا پانی برابر جاری
رہتا ہے۔

رابغ :۔

رابغ وہ مقام ہے جہاں مصر اور مشرق کے
حاجی احرام باندھتے ہیں۔ اس سے آگے عقبہ سویق
ہے۔ جہاں ہر ایک حاجی ستّو پیتا ہے اور سامان سفر
میں ستّو صرف اس لیے باندھ کر رکھتا ہے کہ سویق
پہنچ کر پیے گا۔ دولت مند بڑے بڑے حوضوں
میں ستو اور شکر ملا کر حاجیوں کو پلاتے ہیں۔
مشہور ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
اس جگہ سے گذرے تو صحابہ کے پاس کھانا ختم ہوگیا
تھا اور سب کے سب بھوک سے بیقرار تھے۔ سرکار
دوعالم نے اس جگہ کا ریت دے دیا کہ گھول کر
پی لیں۔ پیتا تو ستّو کا مزہ تھا۔ سویق کے معنی ستّو
کے ہیں۔ عقبہ ایسے راستے کو کہتے ہیں جس میں چلنا
دشوار ہو۔
عقبہ سویق سے آگے برکتہ الخلیص ہے یہاں
کھجوروں کے باغ بکثرت ہیں۔ ایک مضبوط قلعہ پہاڑ پر
اور ایک ہموار زمین پر ہے۔ پانی کا ایک چشمہ ہے۔ اس

سے نالیاں کاٹ کر زمین کو پانی دیا جاتا ہے۔

یہاں ہفتے میں ایک بازار لگتا ہے۔ اس میں بھیڑ، بکریاں، پھل اور کھانے پینے کا سامان بکتا ہے

برکتہ الخلیص کے آگے عسفان ہے۔ جہاں حضرت عثمان کا بنایا ہوا کنواں ہے۔ پھر مدارج آتا ہے۔ جہاں حضرت علی کا بنایا ہوا کنواں ہے۔ مدارج میں گوگل کی پیداوار ہوتی ہے

مرّ الظہران آتا ہے جہاں کھجوروں کے درختوں کی کثرت ہے۔ ایک چشمہ ہے جس کا پانی ہر وقت جاری رہتا ہے۔ اس سے آس پاس کی زمین سیراب ہوتی ہے لوگ اس وادی سے قسم قسم کی سبزیاں اور پھل لے جاتے ہیں۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں کے پر چڑھائی کرتے وقت رسول اللہ کی فوجوں نے پڑاؤ ڈالا تھا۔ اور مکے سے ابو سفیان دوڑے آئے تھے۔ اور فوجوں کی شان و شکوہ دیکھ کر رسول اللہ کی ہدایت پر مسلمان ہو گئے تھے۔

یہاں سے مکہ قریب ہے صبح ہوتے ہوتے قافلہ مکے پہنچ گیا۔

مکہ معظمہ:

مکہ معظمہ پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ جب تک بالکل قریب نہ پہنچ جائیں شہر نظر نہیں آتا۔

شہر کے بیچ میں حرم ہے چار سو گز لمبائی اور قریب قریب اتنی ہی چوڑائی ہے۔

بیس بیس گز اونچی دیواریں ہیں۔ اونچے کھمبوں پر چھت تلی ہوئی ہے۔ سنگ مرمر کے چار سو اکیانوے کھمبے ہیں یہی دیوار کے کنارے پر لکھا ہے۔

"خدا عبداللہ محمد ابن المہدی کا انجام بخیر کرے جس نے حاجیوں کی آسائش کے لیے حرم کو وسیع کیا" یہ تعمیر ۱۲۶ھ (مطابق ۷۸۳ء) میں ہوئی۔

وہ باتیں جو سمجھ میں نہیں آتیں:

۱۔ جہاں طواف کیا جاتا ہے اسے مطاف کہتے ہیں۔ اس جگہ کو آج تک کسی نے خالی نہیں پایا۔ دن ہو۔ رات ہو۔ آندھی ہو۔ مینھ ہو۔ جب بھی دیکھو کوئی نہ کوئی طواف کرتا نظر آئے گا۔ بہت سے لوگ اس خیال سے گئے کہ اس وقت مطاف خالی ہوگا۔ مگر کسی نہ کسی کو طواف کرتے پایا۔

۲۔ ان گنت مخلوق حج میں جمع ہوتی ہے۔ مگر جہاں دروازہ کھلا سب کے سب اندر سما جاتے ہیں اور کسی کو تکلیف نہیں ہوتی۔

۳۔ حرم میں لاکھوں کبوتر ہیں اور دوسرے جانور بھی اڑتے رہتے ہیں۔ مگر یہ کسی نے نہیں دیکھا کہ کوئی جانور کعبے کی چھت کو پار کر کے نکلا ہو۔ اڑتے رہتے ہیں اور کعبے کی چھت سے کترا کر نکل جاتے ہیں۔

۴۔ کسی نے کعبے کی دیواروں پر جانوروں کو بیٹھے

کی بیٹ تک نہیں دیکھی۔ حالانکہ لاکھوں کبوتر رہتے ہیں۔

۵۔ کوئی پرند بیمار ہوتا ہے تو کعبے پر بیٹھتا ہے یا تو اسی وقت مر جاتا ہے یا اچھا ہو کر اڑنے لگتا ہے۔

حضرت ابراہیم اور ان کی والدہ حضرت ہاجرہ کی قبر کعبے کے احاطے میں ہے اور ایک قبر کا دوسری قبر سے سات بالشت کا فاصلہ ہے۔

حجر اسود:-

مشہور ہے کہ یہ پتھر حضرت آدم کے ساتھ بہشت سے آیا ہے۔ زمین سے چھ بالشت اونچا لگا ہوا ہے۔ لمبا آدمی چومنا چاہے تو جھک کر چومنا پڑتا ہے۔ چھوٹے قد والا اچک کر چومتا ہے۔

حجر اسود کے چار ٹکڑے ہیں۔ انھیں چاندی کے پتروں سے کس کر ایک جگہ کر دیا ہے۔

حجر اسود کے چومتے ہی ایسی روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے جس کا بیان کرنا مشکل ہے۔ عجب برکت کی چیز ہے چومتے وقت ذوق و شوق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے پر ٹوٹا پڑتا ہے بمشکل سے رسائی حاصل کرتا ہے۔

کعبے کا طواف حجر اسود سے شروع کرتے ہیں۔ اول اسے چومتے ہیں۔ پھر الٹے پاؤں ہٹ کر اور کعبے کو اپنے بائیں کر کے دوڑتے ہیں۔ ذرا بڑھ کر رکن عراقی ملتا ہے۔ کعبہ اور رکن عراقی کے بیچ میں مقام ابراہیم ہے۔ یہ جگہ حضرت ابراہیم کے زمانے کی یادگار ہے۔ فتح مکہ کے وقت سردار دو جہاں کعبے میں داخل ہوئے تو سات مرتبہ بیت اللہ کا طواف فرما کر مقام ابراہیم میں تشریف لائے اور فرمایا۔

وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهِيْمَ مُصَلًّى

مقام ابراہیم میں مصلے بنالو۔

حجر اسود کے سامنے زمزم شریف کا قبہ ہے۔ یہ کنواں سنگ مرمر کا بنا ہوا ہے۔ اور سنگ مرمر کو سیسے سے جوڑا گیا ہے۔ گھیر چالیس بالشت اور اونچائی ساڑھے چار بالشت ہے۔ گہرائی گیارہ قد آدم ہے۔ ہر جمعے کی رات میں زمزم کا پانی بڑھ جاتا ہے۔ زمزم کے قبے کے پاس ایک اور قبہ ہے۔ اس میں زمزم شریف کا پانی آب خوروں میں ٹھنڈا کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جس کا جی چاہے پی لے۔ آب خوروں میں پکڑنے کا کنڈا بھی ہوتا ہے۔ اسے حضرت عباس کی سبیل کہتے ہیں۔

قرآن پاک کا معجزہ:-

حرم شریف میں ایک کتب خانہ بھی ہے جس میں حضرت زید بن ثابتؓ کا لکھا ہوا قرآن پاک حفاظت سے لکڑی کے بکس میں رکھا ہے۔ یہ کلام پاک حضرت زید بن ثابتؓ نے رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سات سال بعد ۵ھ میں تحریر فرمایا تھا۔

جب کوئی سختی ہوتی ہے یا قحط کے آثار نظر آتے ہیں تو اس قرآن پاک کو نکال کر کعبے کے آستانے میں اور مقام ابراہیم پر رکھتے ہیں اور سب لوگ ننگے سر ہو کر گریہ و زاری کرتے ہیں۔

جناب انوار انصاری

کمہار

چلا رہا ہے چاک کمہار
چلا رہا ہے چاک کمہار
کھیتوں سے ہے مٹی لاتا
گوندھ گوندھ کر اسے بناتا
رکھ دیتا اسے چاک پر
چھڑی لگا کر چاک گھماتا
چلا رہا ہے چاک کمہار
چلا رہا ہے چاک کمہار
ناند بناتا، گھڑے بناتا
اور سراہی کھڑے بناتا
دیے، صراحی، ہاتھی گھوڑے
کچھ چھوٹے کچھ بڑے بناتا
چلا رہا ہے چاک کمہار
چلا رہا ہے چاک کمہار
گھر چلانے کے لیے لگاتار
نریوں کھپڑوں کا انبار
چلا رہا ہے چاک کمہار
چلا رہا ہے چاک کمہار

کبھی دوڑ کر مٹی ڈھوتا
کبھی صاف کر اسے بھگوتا
کبھی سکھاتا رہتا برتن
کبھی "آواں" میں رکھتا ہوتا
کرتا رہتا کام سدا وہ
نہیں کبھی رہتا بے کار
چلا رہا ہے چاک کمہار
چلا رہا ہے چاک کمہار

(ہندی کی ایک نظم سے ترجمہ

جناب شمیم ہاشمی

کھانے کی میز

کافی ہاؤس میں لوگ بھوت پریت کی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں ایک بوڑھا جہازی بھی تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھوت نہیں دیکھا تھا اور نہ اسے بھوتوں پر یقین تھا۔ اس سلسلے میں اس نے کہا کہ وہ جوانی میں ایک عجیب و غریب حادثے سے دوچار ہوا تھا۔ ایک مرتبہ وہ چین گیا وہاں سے واپسی پر اس نے اپنے چچا کے ہاں ٹھہرنے کا فیصلہ کیا لیکن وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ فرانس گئے ہوئے ہیں۔ دو تین دنوں میں لوٹ آئیں گے۔ اس وقت تک کے لیے وہ وہیں ایک سرائے میں ٹھہر گیا۔

ایک دن صبح کو وہ گھومنے کے ارادے سے نکلا۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ چلتے چلتے کچھ دور نکل گیا۔ واپسی پر شام ہو گئی، اس نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ اُسے امید تھی کہ اس راستے سے وہ سرائے تک بآسانی پہنچ جائے گا۔ لیکن وہ راستہ بھول گیا۔ اندھیرا ہو گیا تھا اس لیے اس کا کمپاس بھی کام نہیں آ رہا تھا کچھ دور تک اسے دلدل بھی ملی۔

وہ کافی پریشان تھا، اُس کا دل دھڑک رہا تھا پر وہ چلتا ہی رہا۔ تھوڑی دیر میں اُسے سڑک مل گئی۔ اب اُس کے قدم تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ راستے میں اُسے ایک مقامی آدمی ملا اس نے بتایا کہ گاؤں یہاں سے تین میل دور ہے۔ وہ کافی تھک چکا تھا اس لیے یہ تین میل اس کے لیے دس میل سے کم نہ تھے۔

وہاں سے تھوڑی دور پر اسے روشنی دکھائی دی۔ اس کے متعلق اس نئے آدمی نے بتایا کہ وہ

ایک پرانی عمارت ہے وہاں کوئی ایسی مخلوق رہتی ہے جو نہ آدمی ہے نہ جانور، وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں — اس لیے اس نے (جہازی نے) وہاں جانا مناسب نہ سمجھا اور آگے بڑھ گیا۔

ابھی وہ زیادہ دور نہ گیا ہوگا کہ اسے ایک چوراہا ملا۔ یہاں اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کون سا راستہ اختیار کرے اس لیے مجبوراً وہ اسی عمارت کی طرف چل پڑا جہاں جانے سے اسے آدمی نے روکا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی۔ ایک لمبے تڑنگے عجیب سے آدمی نے دروازہ کھولا۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ اب اس کا دل دھڑک رہا تھا وہ سوچ رہا تھا کہ ہو نہ ہو وہ کسی جال میں پھنس گیا ہے لیکن بچنے کی کوئی ترکیب نظر نہ آئی۔

میزبان نے کچھ دیر بعد کہا کہ کھانا تیار ہے، ہم لوگ کھالیں تو بہتر ہوگا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ہم لوگ اندھیرے میں کھانا کھائیں گے اور کھانے کی میز پر ان کے علاوہ میزبان کا بیٹا بھی ہوگا، اور یہی ہوا۔ میز کے گرد تین کرسیاں لگائی گئیں۔ موم بتی بجھادی گئی اور آتش دان کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا گیا۔

جب بالکل اندھیرا ہوگیا تو میزبان کا لڑکا آیا۔ اندھیرے میں وہ اسے نہ دیکھ سکا کھانا شروع ہوگیا اسے کافی بھوک لگی تھی اس لیے خاموشی سے کھاتا رہا۔ کھانے کے بعد میزبان چائے لانے اندر گیا اور کچھ دیر کردی۔ جہازی نے میزبان کے بیٹے کی طرف دیکھا، اندھیرے میں اس کی آنکھیں بڑی بھیانک معلوم ہوئیں وہ ڈر کر کھڑا ہوگیا گھبراہٹ میں اس کا ہاتھ آتش دان کے پردے پر پڑا۔ پردہ ہٹ گیا۔ اس نے آگ کی مدھم روشنی میں ایک عجیب خلقت کو اپنے سامنے دیکھا اس کی سمجھ میں نہ آسکا کہ وہ جانور ہے یا آدمی!! اتنے میں میزبان چائے کر آگیا اس نے یہ حالت دیکھی تو موم بتی روشن کردی۔ روشنی میں معلوم ہوا کہ لڑکے کا چہرہ قریب قریب غائب ہے۔ آنکھ بھی ایک ہی بچ رہی تھی، اب اس کی سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکا بری طرح جل گیا ہے۔

میزبان نے بتایا کہ ایک مرتبہ اس کے پڑوس کے ایک گھر میں آگ لگی، لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے کچھ بچے اس جلتے ہوئے گھر میں رہ گئے تھے کسی کی ہمت نہ تھی کہ اس گھر میں جاسکے لیکن میرا بہادر بیٹا ان کی جان بچانے کے لیے کود پڑا

اور بچوں کی جان بچانے کی کوشش میں خود بُری طرح جل گیا۔ اب اس کی شکل سے لوگ ڈرنے لگے گویا اُسے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا اُسی وقت سے ہم لوگ آبادی سے دور اس عمارت میں رہنے لگے۔ آج اس لڑکے کی سالگرہ تھی اس لیے انھیں اجنبی کی مدد کرتے ہوئے خوشی ہوئی کہ اس سالگرہ کے موقع پر ان کے یہاں کوئی مہمان بھی کھانے کی میز پر ہوگا۔ لڑکا اس کے ساتھ کھانے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اجنبی اس کی شکل دیکھ کر ڈر جائے گا اس لیے اندھیرے میں کھانے کا انتظام کیا گیا۔!!

اب اس کے دل سے ڈر دور ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں اس بہادر بچے کی تعریف کر رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ اسے اس بات کا افسوس بھی تھا کہ اس بہادر کے ساتھ لوگوں نے کتنا برا سلوک کیا۔ پھر بھی انھیں کسی سے کوئی شکایت نہیں۔ وہ ان دونوں سے بہت متاثر ہوا۔

کھانا کھانے کے بعد یہ لوگ بہت دیر تک آپس میں بات چیت کرتے رہے۔ رات کافی گزر چکی تھی ـــــ اور جب یہ لوگ سونے لگے تو میزبان نے دعا مانگی کہ اے خدا! اُن بچوں کو صحیح وسالم اور تندرست رکھ جن کی میرے لڑکے نے جان بچائی تھی۔!!

(انگریزی سے)

بھاتی ہے ہر ایک دل کو صفائی میرے بھائی

جناب علی اختر

رمیش بڑا بھولا بھالا لڑکا تھا مگر بے انتہا ضدی تھا، بہت کاہل تھا۔ کسی کا کہنا ماننا جانتا ہی نہ تھا۔ صفائی سے اسے بیر تھا۔ نہ نہاتا، نہ کپڑے بدلتا۔ اسے ڈانٹ کھانا گوارا تھا لیکن منہ دھونا اور دانت مانجھنا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس کے بدن سے اور منہ سے بدبو آتی تھی۔ اس کے گندے کپڑے دیکھ کر یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی بھلے آدمی کا بچہ ہو سکتا ہے۔

پڑوس کے بچے اس کے ساتھ کھیلنا پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے ماں باپ بھی انھیں رمیش کے ساتھ کھیلنے کو منع کرتے۔

ایک دن پڑوس میں لڑکیاں اور لڑکے اکٹھا تھے۔ ڈھولک ٹھنک رہی تھی۔ گڑیا کی شادی رچائی جا رہی تھی۔

"چھوڑ بابل کا گھر موہے پی کے نگر
آج جانا پڑا" کی مدھر تان الاپنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ بیچ بیچ میں تالیوں کی تھاپ اور بچوں کے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ سارا محلہ بچوں کے شور و غل سے گونج رہا تھا۔

بھلا اس وقت کون بچہ تھا جو اپنے کو گڑیا کی شادی میں شریک ہونے سے روک سکتا۔ رمیش کے پیر بھی آج آپ سے آپ شادی کے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ وہ گڑیا کی شادی میں کھنچا چلا جا رہا تھا۔

ارے یہ کیا؟ رمیش گڑیا کی شادی میں پہنچا تو اک دم سناٹا چھا گیا۔ بچوں نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دیکھ کر مسکرائے۔ آپس میں کانا پھو-

ہوئی اور ایک دم سبھی بچے قہقہہ لگاتے اٹھ کر بھاگ گیے۔

رمیش کو بہت دکھ ہوا۔ دکھ کی بات بھی تھی۔ وہ الٹے پاؤں گھر لوٹا اور منھ لپیٹ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گیا۔ بہت دیر اسی طرح پڑا کچھ سوچتا رہا۔ آج کھانا کھانے بھی نہیں اٹھا۔

اتنے میں اس کا بڑا بھائی اسکول سے لوٹا۔ رمیش کو منھ لپیٹے پڑا دیکھ کر بولا "کیوں رمیش کیا بات ہے۔ آج منھ لپیٹے چپ کیوں پڑے ہو؟"

رمیش نے کچھ جواب نہیں دیا۔ سریش اس کے قریب آیا۔ اس کا ہاتھ چھو کر بڑے پیار سے اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا رمیش۔ کیا تمھاری کچھ طبیعت خراب ہے یا کسی نے تمھیں ڈانٹا یا مارا ہے؟"

اب تو رمیش پھوٹ پڑا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا پر آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سریش اسے چپ کرنے لگا۔ رمیش نے رو رو کر بڑی مشکل سے سارا قصہ سنایا۔

سریش ساری بات سمجھ گیا۔ اس نے کہا "دیکھو رمیش تمھارے کپڑے کتنے گندے ہیں۔ ان سے بدبو آتی ہے۔ تم دانت بھی نہیں مانجتے۔ تمھارے منھ سے بھی بدبو آتی ہے۔ تم صابن سے اپنے کپڑے دھو ڈالو۔ صابن مل کر نہاؤ۔ سر میں تیل ڈالو۔ آنکھوں میں کاجل لگاؤ۔ کسی اچھے منجن سے دانت مانجو یا داتون کرو۔ پھر دیکھو بچے تمھارے ساتھ کھیلتے ہیں یا نہیں۔"

رمیش کے اوپر ان باتوں کا بہت اثر پڑا۔ وہ فوراً اٹھ بیٹھا۔ سیدھا غسل خانے میں گیا۔ وہاں خوب نہایا۔ کپڑے بدلے۔ ماں سے سر میں تیل ڈلوایا۔ آنکھوں میں کاجل لگوایا۔ اس دن سے وہ روزانہ دانت بھی مانجنے لگا۔ سریش اس کے لیے بازار سے دانتوں کا برش اور منجن لے آیا۔ اور اسے بتایا کہ اوپر کے دانت برش سے اوپر سے نیچے اور نیچے کے دانت نیچے سے اوپر مانجنا چاہیے۔ رمیش اب دن میں دو مرتبہ دانت مانجتا تھا۔ صبح اٹھ کر اور رات کو سوتے وقت۔ اس کے منھ سے اب بدبو نہیں آتی تھی۔ وہ روزانہ نہاتا بھی تھا۔ کپڑے بھی صاف ستھرے پہنتا تھا۔ اس تبدیلی سے وہ اپنے اندر ایک عجیب زندگی اور خوشی محسوس کرتا۔ اور بچے اب اسے دیکھ کر بھاگتے اب تو وہ سارے کھیل کود میں محلے کے بچوں کے آگے آگے رہتا تھا۔ کسی نے سچ ہی کہا ہے۔

بھاتی ہے ہر اک دل کو صفائی مرے بھائی

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

۵ رجون کو بھی موسم بہت خراب رہا۔ ۶ رجون کو بھی یہی حالت رہی۔ ۷ رجون کو موسم کی حالت بد سے بدتر ہو گئی، دن رات ہوا اور بارش الہریں اتنی زور کی کہ جہاز پانی میں غوطے کھاتا معلوم ہوتا تھا، جہاز اتنے زور سے ڈگمگاتا کہ خدا کی پناہ۔ پانی اچھل اچھل کر جہاز میں آ جاتا تھا۔ ہم لوگوں کی حالت خراب تھی نہ کھانے میں مزہ آتا تھا اور نہ ہی اچھا لگتا تھا۔ طبیعت کچھ متلاتی رہتی تھی۔ تمام دن اور رات یہی حالت رہی۔

۸ رجون کو ہم کھانے کے کمرے میں بیٹھے دوپہر کا کھانا کھا رہے تھے کہ اطلاع آئی کہ جہاز کا اسٹیرنگ وھیل (جس سے جہاز موڑا جاتا ہے موٹر کے ہینڈل کی طرح) خراب ہو گیا ہے۔ کپتان اور چیف انجینئر دونوں کھانا چھوڑ کر چلتے بنے۔ ہمیں ذرا تعجب ہوا۔ پتہ نہیں کیا بات ہے۔ ہم نے کھانا ختم کر لیا۔ مگر وہ لوگ لوٹ کر نہ آئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسٹیرنگ وھیل خراب ہو گیا تھا۔ جہاز قابو سے باہر ہو گیا تھا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ بیچ سمندر میں خراب ہوا۔ خدانخواستہ کہیں بندرگاہ کے اندر خراب ہو جائے تو کیا حالت ہو تم بھی اندازہ لگا سکتے ہو۔

جہاز اس طرح قابو سے باہر ہو جاتا ہے تو جہاز کے مستول پر دو کالے کالے چکر ٹانک دیے جاتے ہیں۔ دن کے وقت جہاز کے قابو سے باہر ہونے کی یہی پہچان ہے۔ رات میں ایسی صورت پیش آئے تو دو لال روشنیاں اوپر تلے لگا دیتے ہیں۔ اس کو دیکھ کر دوسرے جہاز ذرا ہوشیار رہتے ہیں اور دور سے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جب جہاز قابو سے باہر ہو گیا تو چکر کاٹنے لگا۔ بس چکر پر چکر۔ اس وقت جہاز کو روک بھی سکتے تھے۔ بیچ سمندر میں تھے۔ اس لیے روکنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ تھوڑی سی دیر کے بعد وہ خرابی دور کر دی گئی۔ اور پھر جہاز اپنے راستے پر لگا دیا گیا۔ مگر اس درستی میں ایک گھنٹہ خراب ہو گیا۔ جو ہمیں بہت شاق گزرا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ جتنی جلدی ہو سکے امریکہ پہنچ جائیں اور جب بھی

اس طرح دیر ہو جاتی ہے تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔

خیر تو جناب جس وقت سے ہم کوچین سے روانہ ہوئے بحرِ عرب نے یہ ٹھان لی تھی کہ بس وہ طوفان ہی مچائے گا۔ اور جو اس نے ٹھانی اس پر اس نے پوری پابندی سے عمل بھی کیا۔ برابر سمندر کی حالت طوفانی رہی۔ آندھی۔ بارش اور جہاز کا ہلنا اس نے ہمیں بس تھکا مارا۔ ۹ رجون کو بھی حالت یہی رہی۔ سارا سماں طوفانی تھا۔ ہمارا جہاز برابر ہچکولے کھاتا ہے پر چلا ہی جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا سمندر اور جہاز میں مقابلہ ہو رہا ہے اور ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتا ہے

۱۰ رجون کو حالت قابو سے باہر ہو گئی۔ آج صبح سے آسمان پر گھٹا ٹوپ اندھیرا ہے۔ دن بھی رات معلوم ہوتا ہے۔ آندھی ہے بارش ہے اور پانی کی لہریں بس یہ چاہتی ہیں کہ جہاز کو ہڑپ کر جائیں۔ وہ وہ ٹکریں مارتی ہیں کہ خدا کی پناہ! بس جہاز غوطے کھاتا معلوم ہوتا ہے۔ اور اس وقت جہاز کی یہی کیفیت ہے جو کسی ڈوبنے والے کی ہوتی ہے جب وہ ڈوبنے سے بچنے کے لیے اپنی ہر کوشش کر کے ایک آخری کوشش کرتا ہے۔ یہی حالت ہمارے جہاز کی ہے۔

تم یہ سمجھ رہے ہو گے کہ ہمارا جہاز ڈوبنے والا ہوگا۔ یہ بات نہیں ہے۔ سمندری سفر میں ایسے مواقع بار بار آتے رہتے ہیں پتہ نہیں یہ جہاز ۲۵ سال کی زندگی میں کتنی مرتبہ ایسے شدید طوفانوں میں پھنسا ہوگا۔ لیکن ہمارے لیے تو یہ پہلا سمندری سفر ہے۔ اس لیے عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔

کوئی دن کے ۱۱ بجے ہوں گے کہ آندھی اور تیز ہو گئی۔ اتنی تیز ہوئی کہ جہاز کو چلانا مشکل ہو گیا۔ ایسی حالت میں جہاز روکنا پڑا۔ اور آندھی کے تھمنے کا انتظار کرنے لگے۔ آندھی نے اپنے وہ ہاتھ دکھائے کہ بس مزہ آگیا۔ ہم لوگ بھی ڈیک پر کھڑے یہ سب تماشہ دیکھ رہے تھے۔ دور سے جب پانی کی لہر آتی تھی تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ لہر ضرور جہاز کو ڈبو دے گی لیکن جب جہاز سے ٹکراتی تھی تو جہاز بھی لہر کے ساتھ اٹھ جاتا تھا۔ اور لہر سے اونچا ہو جاتا تھا۔

اس وقت ہم اپنے جہاز کا مقابلہ واسکوڈی گاما کے جہاز سے کر رہے تھے کہ اس زمانہ میں جب طوفان آتے ہوں گے تو جہاز کی اور جہاز پر سفر نے والوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی، آندھی تو کم ہوئی لیکن طوفانی حالت برقرار تھی۔ آندھی کا زور کم ہونے پر جہاز پھر چل پڑا کوئی آدھ گھنٹہ اسی میں ضایع ہوا۔

اتنے میں لنچ کا گھنٹہ بجا اور ہم سب لوگ کھانے کے کمرے میں جا دھمکے۔ کھانا شروع کیا۔ لیکن اس وقت بھی جہاز ہل رہا تھا۔ کھانا کچھ شروع ہی کیا ہوگا کہ جہاز ایک دم اس زور سے ہلا کہ کھانے کی میز پر جتنی چیزیں تھیں وہ سب آپس میں ٹکرا گئیں۔ ان میں سے بہت سی تو لڑھکتی لڑھکاتی ہم لوگوں پر آپڑیں۔ مثلاً کسی پر دودھ

دان آگرا تو کسی پر سالن کسی پر نمک تو کسی پر میٹھا۔ میری رکابی
کی تمام چیزیں زمین پر گر پڑیں اور کیپٹن کی رکابی کی چیزیں
میری رکابی میں آ گئیں۔ بڑا مزہ رہا۔ لیکن نقصان بھی کافی
ہوا۔ کھانے کی تمام چیزیں خراب ہو گئیں۔ کپڑے خراب
ہوئے اور میز پوش تو بالکل خراب ہو گیا۔ کیا کر سکتے تھے۔
ہمارا کیا قصور تھا۔ پھر سے میز سجائی گئی اور کھانا شروع ہوا۔
تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک دفعہ اور جہاز ہلا۔ لیکن اس مرتبہ
لوگ قریب قریب ہوشیار تھے۔ نقصان بہت کم ہوا صرف
چیف انجینئر کی چائے کپتان پر گر گئی۔ لیکن یہ بھی عجیب تجربہ
تھا۔ آج ہمیں معلوم ہوا کہ یہ کرسیاں اور میز کیوں جہاز کے
فرش میں نصب کی گئی ہیں۔ غرض بحر عرب خاموش نہیں
ہوا۔ بس رات بھر دن بھر وہی آندھی وہی طوفان۔ ہم اب
عاجز آ چکے تھے۔ اور بار بار سمندر کو کوستے تھے۔

دن کے وقت جب لہریں زور مار رہی تھیں اس
وقت پانی کے ساتھ ساتھ سمندر سے اُڑنے والی مچھلیوں
کا ایک غول کا غول ہمارے جہاز پر آ گیا۔ پھر کیا تھا۔ ہم تو
اسی تاک میں تھے ہی فوراً دوڑ کر کچھ پکڑ ہی لیں۔ باقی
سب اڑ کر پھر سمندر میں جا گریں۔ آج ہم نے دیکھا کہ
اُڑنے والی مچھلی کیسی ہوتی ہے۔ تمھیں کیا بتاؤں جسم تو
اس کا سنگھاڑے جیسا ہوتا ہے۔ منہ کھرپٹ جیسا اور پر
ٹڈی جیسے لیکن ٹڈی سے کہیں بڑے جسم پر سِنّے وغیرہ
نہیں ہوتے۔ اندر ایک ہی کانٹا ہوتا ہے۔

بس اس وقت گھر یاد آ رہا تھا۔ کاش گھر پر ہوتے
تو فوراً یہ مچھلیاں پک جاتیں۔ اور مزے لے کر کھاتے
لیکن یہ سب خواب کی سی باتیں تھیں کہاں گھر اور کہاں
بحر عرب! خان بردرس نے تو ایک مچھلی کو اسپرٹ میں
محفوظ بھی کیا ہے۔ شاید اُن کا ارادہ واپس ہندوستان
لے جانے کا ہے۔ ممکن ہے کامیاب ہو جائیں مجھے تو
امید کم نظر آتی ہے۔

یہ سب ۱۰ جون کا قصہ ہے۔ شاید ۱۰ جون سنہ ۱۹۵۵ء
کی تاریخ زندگی بھر یاد رہے گی، خوب دن کٹا۔ ہمیں
آج لنچ کے وقت کپتان نے بتایا کہ آج رات کو ہم
جزیرہ سقطرا سے گزریں گے۔ یہ گلف آف عدن کے
منہ پر واقع ہے اور انگریزوں کے قبضہ میں ہے اس
کا مطلب یہ تھا کہ اب ہم آج رات کو گلف آف عدن
میں ہوں گے۔

ہمارا خیال تھا جیسے ہی ہم اس گلف میں داخل
ہوں گے۔ شاید طوفانی حالت کم ہو جائے کیوں کہ ہمیں
بحر عرب میں جنوب مغربی ہواؤں نے تنگ کر رکھا تھا۔
گلف میں داخل ہونے سے شاید اس کی زد سے بچ
جائیں۔ اور یہ بات سچ ہی نکلی۔

جب ہم ۱۱ جون کو صبح اٹھے تو سمندر کی حالت
بہت بہتر تھی اور طوفانی کیفیت ختم ہوتی نظر آ رہی تھی۔
طوفانی کیفیت سے ہمیں خلیج بنگال میں سابقہ پڑا تھا
لیکن بحر عرب نے تو بس جان ہی نکال دی۔ یوں جوں
ہم گلف آف عدن کے اندر جاتے تھے طوفانی کیفیت

اُسی قدر کم ہوتی جاتی تھی۔ ۱۲ جون کو جب ہم صبح اٹھے تو سمندر کی حالت بہت اچھی تھی۔ اتنی اچھی کہ سمندر ایک خاصی جھیل معلوم ہوتا تھا۔ اور اسی جھیل پر ہمارا جہاز تیزی کے ساتھ پانی چیرتا چلا جاتا تھا۔ سمندر میں کہیں بھی کوئی لہر نہ تھی۔ صرف ہمارے جہاز کے چلنے کی وجہ سے تھوڑی بہت لہریں پیدا بھی ہوتی تھیں۔ وہ بھی تھوڑی دور جا کر ختم ہو جاتی تھیں۔

اس وقت ہمیں بہت مزہ آرہا تھا۔ ہم اس وقت گلف آف عدن میں کافی اندر آچکے تھے۔ اور افریقہ کے ساحل کو چھوڑ کر عرب کے ساحل کے زیادہ نزدیک تھے۔ ہمیں خبر ملی تھی کہ آج ۱۲ بجے ہم عدن پہنچنے والے ہیں۔ تم اندازہ نہیں لگا سکتے۔ یہ سن کر ہمیں کتنی خوشی ہوئی۔ ایک ہفتہ کے طوفانی سمندر میں سفر کے بعد آج ہمیں پھر زمین دکھائی دے گی۔ صرف خیال ہی ہمیں خوش کر رہا تھا۔ لیکن جب ہم یہ سوچتے تھے کہ جہاز رکتے ہی ہم لوگ عدن جائیں گے اور وہاں سے گھر کو اپنے دوست احباب کو خطوط لکھیں گے تو یہ خیال ہماری خوشیوں میں اور اضافہ کر رہا تھا۔

کوئی دن کے ۱۰ بجے ہوں گے کہ ہمیں بہت دور سے اونچے اونچے پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ یہ عرب کے پہاڑ تھے۔ اور جوں جوں ہم قریب ہوتے گئے۔ یہ پہاڑ اور بھی صاف ہوتے گئے۔ کوئی ۱۱ بجے کے قریب یہ پہاڑ ہم سے اتنی دور تھے جتنا اپنے گھر سے ابا ؤ گڑھ ہم پہاڑوں کو بالکل صاف دیکھ سکتے تھے۔ آس پاس میں کئی جزیرے بھی دکھائی دیے۔

کبھی کبھی تو ہم کو ایک طرف عرب کے پہاڑوں سے واسطہ پڑا اور دوسری طرف کسی جزیرہ سے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا دونوں طرف زمین ہے اور بیچ میں سمندر۔ یہ پہاڑ بالکل خشک تھے۔ پیڑ پودوں کا نام و نشان نظر نہ آتا تھا۔ یہاں بارش ہی نہیں ہوتی۔ جغرافیہ تو ہم نے بھی پڑھا تھا۔ لیکن اس وقت کسے یاد تھا۔ کیپٹن نے بتایا کہ یہاں برسوں بارش نہیں ہوتی۔ برسوں بعد کبھی کبھار ہو بھی جاتی ہے تو بس بوندا باندی۔

ہم ساحل کے اور قریب سے گزر رہے تھے۔ اور اب ہمیں عدن کا بندرگاہ بھی نظر آنے لگا۔ کچھ مکان دکھائی دیے، اور جہاز بھی جوں جوں ہم نزدیک آتے گئے یہ چیزیں اور بھی صاف ہوتی گئیں۔ ہم اسی طرح عدن پہنچ گئے۔

عدن کا بندرگاہ ایک کھاڑی کے اندر ہے اور کھاڑی کیا ہے یہ سمجھو پہاڑوں کا کنارہ۔ بس کنارہ پر پہاڑی پہاڑ ہیں اور اونچے اونچے ان ہی پہاڑوں پر مکان بنے ہوئے ہیں۔ اور پہاڑی پر سڑکیں بھی نکالی گئی ہیں۔ فوجی نقطۂ نظر سے یہ کتنا اہم مقام ہے۔ نقشہ دیکھنے ہی سے معلوم ہو سکتا ہے۔ پر یہ سمجھو کہ ریڈ سی یا بحر احمر کا دروازہ ہے اگر بند کر دیا جائے تو میڈی ٹرینین سی تو بالکل بے کار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان آنے کے لیے اٹلانٹک میں ہو کر اور افریقہ کا چکر لگانا لازمی ہوگا۔ اور کوئی راستہ نہیں۔

سلیم عمر سلیم لکھنوی

تتلی

رنگ برنگی تتلی پیاری　　قدرت کے ہاتھوں کی سنواری
نازک چنچل، شوخ چھبیلی　　چوندری اوڑھے نیلی پیلی
گلشن گلشن کی اوجیالی　　پھولوں کا رس چوسنے والی
اس کا کام مچلنا، اڑنا　　آگے بڑھنا، پیچھے مڑنا
کرنوں میں لہرانے والی　　کلیوں سے اٹھلانے والی
نور میں ڈوبے کپڑے سارے　　بکھرے پروں پر چاند ستارے
جب مستی میں پر پھیلائے　　سونے کے سکّے بکھرائے
کرنوں نے اس کے پر چومے　　ناچ سے اس کے بادل جھومے
شاخوں پر بھی مستی چھائی　　جوں ہی اس نے لی انگڑائی
اس کی دنیا میں خوشحالی　　اس پر عاشق باغ کا مالی
ہم جو سلیم اس کو پا جائیں
دل کی مرادیں سب بر آئیں

جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

کالا آدمی

اُن دنوں ہندوستان تو ہندوستان لگ بھگ آدھی دنیا پر انگریزوں کی حکومت تھی جنوبی افریقہ میں بھی انھی گوروں کی حکومت تھی یہاں ایک ہندوستانی نوجوان درجہ اوّل کا ٹکٹ لے کر ریل میں سفر کر رہا تھا. لیکن گورے ایک ہندوستانی کالے آدمی کی یہ مجال دیکھ کر خفا ہو گیے۔ اُن دنوں کوئی کالا آدمی درجہ اوّل کا ٹکٹ لینے پر بھی درجہ اوّل میں سفر نہیں کر سکتا تھا. گوروں نے پولیس کی مدد سے اس ہندوستانی کو نیچے اتار دیا وہ بے چارہ رات بھر سردی میں پڑا ٹھٹھرتا رہا۔

ایک بار اور وہ گھوڑا گاڑی میں سفر کر رہا تھا تو چند گورے بھی سوار ہوے اور گاڑی میں اس کالے آدمی کو دیکھ کر انھوں نے اس سے گاڑی سے اتر جانے کو کہا. مجبوراً وہ کالا آدمی کوچوان کی بغل میں جا بیٹھا لیکن یہ بھی انگریزوں سے برداشت نہیں کیا اور ایک انگریز نے اُسے وہاں سے بھی اٹھ کر کوچوان کے پاؤں کے قریب بیٹھنے پر مجبور کیا اور خود وہ انگریز کوچوان کی بغل والی سیٹ پر بیٹھا سگار کا دھواں اڑانے لگا۔

افریقہ میں کالے آدمیوں پر سخت مظالم ڈھائے جاتے تھے۔ انگریزوں کی ان ظالمانہ حرکتوں نے اس ہندوستانی نوجوان کے دل میں انگریزوں کے ان ظلموں کے خلاف نفرت کا بیج بو دیا. اور اس نے افریقہ ہی سے انگریزوں کے مظالم کے خلاف اپنی آواز بلند کی۔ وطن سے کوسوں دور رہ کر بھی اس نے افریقہ ہی کے دس ہزار کالے آدمیوں سے دستخط حاصل کر کے انگریزوں کے مظالم کے خلاف ایک اپیل ولایت کو روانہ کی اور اس طرح اس نے گوروں کے خلاف جدوجہد کا آغاز کیا۔ چند سال بعد وہ ہندوستان لوٹ آیا اور اس سرزمین پر اس نے آزادی کا نعرہ بلند کیا۔

اچھا بتائیے یہ کالا آدمی کون ہے۔ یہی تو ہمارے محبوب "باپو" ہیں جن کا اصلی نام موہن داس کرم چند گاندھی ہے اور آج دنیا والے انھیں مہاتما گاندھی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ وہ رنگ نسل اور مذہب کی بنا پر انسانوں میں اونچ نیچ کے خلاف تھے۔ وہ انسانیت کے علم بردار تھے اور انھوں نے انصاف کا پرچم لہرایا۔

سال نامہ ملا

پیامِ تعلیم کا سالنامہ ملا تھا۔ مضامین اور
منظومات کی عمدگی اور رنگا رنگی کی وجہ سے بہت
پسند آیا۔ میں نے اس دل چسپی کے ساتھ اس کو پڑھا
جیسے چھوٹے طالب علم پڑھا کرتے ہیں۔ ہندوستان
میں بچوں کے کئی رسالے نکلتے ہیں، لیکن اپنے خصوصی
انداز کی بنا پر یہ سب سے الگ نظر آتا ہے۔ سب سے
بڑی بات یہ ہے کہ یہ رسالہ ہر لحاظ سے کسی علمی ادارے
کا رسالہ معلوم ہوتا ہے، اس میں وہ ابتذال اور گھٹیا
پن کہیں نظر نہیں آتا، جو تجارتی مصلحتوں یا نفع نقصان
کے حساب کتاب کی وجہ سے بہت سے رسالوں میں راہ
پا لیتا ہے۔

آپ نے بہت سے اچھے لکھنے والوں کی عمدہ
تحریروں کو جمع کر دیا ہے۔ ان میں خاص طور سے قابل
ذکر شانتی رنجن بھٹاچاریہ صاحب ہیں۔ یہ خوشی کی بات
ہے کہ اب ہمارے خالص علمی کام کرنے والے حضرات
بھی بچوں کے ادب کی طرف توجہ کرنے لگے ہیں۔ اگر
بھٹاچاریہ صاحب بنگالی کی کچھ لوک کہانیوں کو بھی اُردو
میں پیش کریں، تو یہ بہت دل چسپ سلسلہ ثابت ہوگا
علاقائی زبانوں کا اچھا ادب ہمارے بچوں کے سامنے
آتا رہنا چاہیے۔ اس طرح اُن میں ابھی سے مختلف
زبانوں سے محبت کرنے اور اُن کو وسیع سمجھنے کا جذبہ
پیدا ہوگا، اور اس کی بڑی ضرورت ہے۔

نظموں میں مولانا بدرالدین مراد آبادی کی نظم
"زیر، زبر، تشدید، جزم" مجھے خاص طور سے پسند آئی۔ یہ
واقعہ ہے کہ موصوف نے دل چسپ ترین انداز میں بچوں
کو مخاطب کیا ہے اور مجھے یقین ہے کہ بعض بچوں کو
تو اب تک یہ نظم زبانی یاد ہو چکی ہوگی۔ اور ہاں سعادت
صدیقی صاحب نے تین چینی لوک کہانیاں پیش کی ہیں،
کہانیاں خوب ہیں لیکن آخری کہانی، جس میں تینوں
جانوروں کے دعا مانگنے کے بعد، جانوروں کا مالک یہ دعا
مانگتا ہے کہ "اے خدا! تو مجھے اندھا بنا دے تاکہ میں
ایسی سرکار نہ دیکھوں"۔ خاص طور سے پسند آئی۔ یہ تو لوک
کہانی کے بجائے آج کی کہانی معلوم ہوتی ہے۔ مختلف
زبانوں کی لوک کہانیوں کو اگر آئندہ بھی شامل کیا جاتا رہے
تو خوب ہو۔

محبِ مکرم رشید نعمانی صاحب کے مضمون کا عنوان
ہے "جنگ آزادی کے مجاہد ——— شاہ ولی اللہ دہلوی"
یہ عنوان مناسب نہیں۔ جنگِ آزادی سے مراد ۱۸۵۷ء کا
کا واقعہ ہوتا ہے یا اس کے بعد کی سیاسی جدوجہد۔ ان
سے شاہ صاحب کا تعلق نہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ بعض باتوں کی طرف خاص
طور سے توجہ دی جائے تو یہ رسالہ خوب سے خوب تر ہو سکتا
ہے۔ ان میں سب سے اہم مسئلہ طباعت ہے۔ آپ کا یہ

رسالہ آفسٹ میں چھپتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر طباعت کا ایسا بھدا پن بھی ہوتا ہے کہ بعض لیتھو کے اچھے پریس بھی اس سے اچھا چھاپ سکتے ہیں۔ بلکہ بعض صفحات کا تو یہ حال ہوتا ہے کہ ان کو آفسٹ کی چھپائی سے منسوب کرنا، ان پر پھبتی کسنا معلوم ہوتا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب کہ پریس خود آپ کا ہے۔ اِس سالنامے کا بھی یہی حال ہے، اس کے کچھ صفحات تو بھدی چھپائی کی اچھی مثال ہیں خاص طور سے ص ۷، ۸، ۴۷، ۱۷۷، ۱۲۸، ۱۴۴۔

سبق کے شروع میں اور بعض دوسرے مقامات پر تصویریں بھی ہوتی ہیں۔ ان کی ضرورت اور اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے آرٹسٹ صاحب سہل انگاری سے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کام لیتے ہیں۔ بعض تصویروں میں عدم تناسب بے طرح نمایاں ہوتا ہے۔ میں صرف ایک مثال پر اکتفا کروں گا۔ ص ۱۹ پر سائکل کی تصویر اتنی بڑی اور غیر متناسب ہے کہ "ہاتھی سے دُم بڑھ گئی" کی پھبتی ذہن میں آتی ہے۔ بے ہنگم اور بد ہیئت۔ یہ پہلو آپ کی خصوصی توجہ کا متقاضی ہے۔ مکرمی محمد حسین حسّان صاحب سے میری طرف سے یہ پوچھ لیجیے گا کیا خوش مذاقی اتنی بری چیز ہے؟

اور ہاں اب کے ایک چیز اور محلِ نظر معلوم ہوئی معلوم نہیں آپ کے ذمّے دار جلد ساز صاحب ہیں یا کوئی اور، کہ متعدد صفحات کی کٹائی کچھ اس طرح ہوئی ہے کہ حاشیہ یا بالکل شہید ہو گیا ہے یا نیم بسمل نظر آتا ہے۔

مثلاً ص ۶۱، ۶۲ کو دیکھیے اور پھر ص ۵۰، ۵۹ کو دیکھیے اندھیرے اُجالے کا فرق نظر آئے گا۔ یہی حال بعض اور صفحات کا بھی ہے۔ مثلاً ۱۰۸، ۱۱۴۔ اس سے بدصورتی کا عیب پیدا ہو جاتا ہے۔ ص ۱۱۵ پر ایک نظم ہے، جس کی کتابت معمول زیادہ جلی قلم سے ہوئی ہے اور کٹائی یا شیرازہ بندی یا طباعت کی ہنرمندی سے وہ ادھوری ہو کر رہ گئی ہے، کریلا اور نیم چڑھا۔

کاپیاں پڑھنے کی طرف کچھ زیادہ التفات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بعض مقالات پر اچھی خاص غلطیاں نظر آتی ہیں۔ مثلاً ص ۲۳ پر ایک نظم کا پہلا مصرع یوں چھپا ہوا ہے: چمن میں مژدہ بہار لاتا ہے۔ یہ ساقط الوزن ہے اور بہ ظاہر کتابت ہی کی غلطی معلوم ہوتی ہے۔

ص ۴۶ پر تین رباعیاں ہیں، ان میں سے دو رباعیوں کے مندرجہ ذیل مصرع بحر سے خارج ہیں:

ع۔ اُجلی اجلی سی دھلی دھلی سی یہ چاندنی رات[1]
ع کب تک پلٹ کے پھر سویرا ہوگا۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ کس کی غلطی ہے، غلطی کسی کی ہو، ذمّے داری آپ پر آتی ہے۔

ایک بات جو سب سے اہم ہے اُس کی طرف آخر میں آپ کو بہ طورِ خاص متوجہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ ہے صحت اِملا کا مسئلہ، جس کی طرف سے آج کل عموماً بے پروائی برتی جا رہی ہے۔ چوں کہ آپ کا رسالہ سراسر امتیازی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے مخاطب بچّوں کا دائرہ بہت وسیع ہے، اس لیے یہ بہت ضروری بات ہے کہ اس میں صحت املا کا بہت زیادہ خیال رکھا جائے

---

[1] یہ کتابت کی غلطی ہے۔ اجلی ایک بار ہونا چاہیے۔

اور اسی نسبت سے توقیف نگاری کا بھی۔ مثلاً ص ۲۲
پہلے کالم میں ایک جگہ "موقعہ" لکھا ہوا ہے یہ دراصل
"موقع" ہے۔ وعلی ہذا... بعض لفظ تو بے حد احتیاط
کے طلب گار ہوتے ہیں۔ مثلاً ۵۸ پر "خدمت گذار" کو
لیجیے اس کو ذ کے بجائے ز سے ہونا چاہیے۔ خدمت
گزار اور ایک جگہ "گزشتہ" لکھا ہوا ہے، اس کو "گذشتہ"
ہونا چاہیے۔ اس کا اعتراف ضروری ہے کہ پیام تعلیم میں
اور رسائل کے مقابلے میں صحتِ املا پر خاصی توجہ دی
جاتی ہے۔ لیکن جی چاہتا ہے کہ صحتِ املا کے لحاظ سے
یہ رسالہ مثال رسالہ نظر آئے۔

سرورق بہت جاذبِ نظر ہے اور بہت پسند آیا۔
اس کی داد نہ دینا کفر ہوگا۔

رشید حسن خاں۔
دہلی

"پیام تعلیم" کا مصوّر، دل پذیر اور گرانقدر سالنامہ
ملا۔ ۸۰ صفحات پر آپ نے جس سلیقے سے کائنات رنگ و
بو کو مختلف رنگوں، پھولوں سے مہکایا ہے اس کی داد
کن الفاظ میں دوں، سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔

سالنامہ زفرق تا بہ قدم، جدھر سے دیکھیے،
جس صفحہ سے پڑھیے توجہ، معلومات کا سلسلہ شروع ہو
ہو جاتا ہے۔ سالنامے کی ایک ایک تحریر مزے لے
لے کر پڑھی ہے، باوجود دیگر علمی و ادبی مصروفیات کے
میں نے تین راتوں کے دو دو گھنٹے مضامین پڑھنے
میں گزارے۔ زبان و بیان، سلاست و شیرینی اور معلومات
آفرینی ہر سطر سے نمایاں تھی۔ اس بار کا سالنامہ کچھ ایسا
عمدہ اور بیش بہا نکلا ہے کہ آپ کو حکومت سے اجازت
لے کر اور وافر سونا جمع کر کے سونے میں تولنے کو جی
چاہتا ہے۔ میری طرف سے گرم جوشانہ مبارک باد قبول
کیجیے۔

نظموں میں جناب خورشید احمد جامی، شفیع الدین
نیر صاحب، مولانا بدر، افتخار اعظمی، صفدر آہ، تمکین سرمست
صاحب اور تقدیس بالا کی صلاحیتوں نے دل و دماغ کو
تازہ کر دیا۔ یہ سب اور دیگر نظمیں بہت عمدہ، سلیس اور
لذیذ ہیں۔

کہانیوں میں فرید آبادی صاحب، یوسف ناظم
صاحب، رضیہ آپا، سلیم تمنائی، ظ. انصاری، شانتی رنجن
جی، شگفتہ اسلوب نگارش کے سب پسند آئے۔ مرزا اظہر
افسر کا فیچر نمبر ون رہا۔ اطہر پرویز کا ڈرامہ اور سعادت نظیر
کی نظم بھی موضوع کے لحاظ سے خوب ہیں۔

مضامین میں پروفیسر مجیب صاحب، سید محمد ٹونکی،
آصفہ صاحبہ، غلام یزدانی، خالد عرفان، غلام ربانی، اکبر
صدیقی، قیصر سرمست، مشہود مفتی اور حسیب حسان نے
بڑی محنت صرف کی ہے۔ ان چند مضامین کے سبب
رسالہ کا معیار خاصا بلند ہو گیا ہے۔ ہر مضمون بچوں کی
عین نفسیات کو پیش نظر رکھ کر سلیس اور روان انداز
میں قلم بند ہوا ہے۔ سائنسی معلومات پر مبنی الہ دین کا
چراغ، انگوٹھے کی کہانی، رشید نعمانی کا مضمون، چیتا چند
یادیں، دہلی سے نیویارک تک والا سفر نامہ، ابن بطوطہ
کا سلسلہ اور خاور جمیل پوری کی مشاعرہ کی رپورتاژ بھی خوب
ہے۔

جامعہ کی خبریں، خطوط اور دیگر کالم کے کیا کہنے بچوں کی رسیلی مسکراتی اور چہکتی تصویریں، جامعہ کی تقریبوں کی تصویریں غرض ہر چیز جاذب نظر، توجہ طلب اور خوب رہی۔ آپ کی تحریر اور تصویر نہ پاکر افسوس ہوا۔ ویسے سالنامہ کے ہر صفحہ اور ہر سطر پر آپ کی شبیہ واضح تھی

وقار خلیل

(ایوانِ اُردو - حیدرآباد - ۴)

بعد سلام مسنون عرض آنکہ پیام تعلیم کا بے بہا سالنامہ موصول ہوا۔ بے حد خوب صورت اور جامع بلند پایہ تخلیقات نظم ونثر اور گوناگوں دلچسپیات سے معمور یہ پیکر آب وتاب سالنامہ وسرورق قابلِ تعریف اور لائق ستائش ہے۔

ادارہ پیام تعلیم کو سال نو کے اس کامیاب نمبر کی اشاعت پر مبارک باد دیتا ہوں۔

مہر ورولی۔

"پیام تعلیم" کا سالنامہ نظر نواز ہوا۔ اس خوب صورت اور معیاری تحفہ کے لیے تہ دل سے شکر گذار ہوں۔

بچوں کے لیے میں بہت کم لکھتا ہوں پھر بھی آپ کے پرخلوص جذبات کی قدر کرنا ہی ہے۔ اس لیے پیام تعلیم کے لیے بھی میں ضرور لکھوں گا لیکن مارچ کے بعد

[illegible] ظفر اوگانوی پٹنہ

ماہنامہ پیام تعلیم کا سالنامہ اپنے دامن میں نت نئے انداز لیے موصول ہوا۔ شکریہ۔ پرچہ کا ٹائٹل (سرورق) بہت زیادہ پسند آیا۔ کہانیاں، مضامین نظمیں، ڈرامہ سب ہی بہت خوب ہیں۔ مگر کارٹون کی کمی کھٹکتی ہے۔

پرچے میں چار چاند لگانے کے لیے اچھے کاتبوں اور اچھے آرٹسٹ کی اہم ضرورت ہے۔ یوں تو پیام تعلیم ہر شمارہ فوٹو آفسٹ پر شائع ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ایسی سستی کتابت ہوتی ہے کہ قطعی لیتھو معلوم ہوتا ہے۔

پرچے کا حسن نکھارنے کے لیے اچھے اچھے خوش نویسوں کا انتظام کیجیے۔

شکیل جاوید - امروہہ

میرے پیارے رسالے "پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا اور توقع سے کہیں زیادہ بہتر نکلا۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اتنا ضخیم پرچہ اتنے ارزاں دام میں نکالنا کوئی آسان کام نہیں۔ واقعی آپ لوگوں نے بہت محنت کی ہے۔ اور یہ سالنامہ میرے لیے دلچسپی لیے نئی چیز ثابت ہوا۔

آپ میری دلچسپی کا اندازہ اس سے لگا سکتے ہیں کہ رات ۸ بجے جو پڑھنا شروع کیا۔ آخری نقطہ [illegible] ختم کرنے تک ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ دوسرے شاید [illegible] [illegible] پیام تعلیم [illegible] [illegible]

غیاث شمسی علیگڑھوی

ماں سے .... بچّوں کی کوششیں

میں نے مانا مری عمر کم ہے * فکر ہے مجھ کو نہ کوئی غم ہے
دور مجھ سے رہے گی جہالت * ہاتھ میں میرے جب تک قلم ہے
ماں مجھے بھی کتابیں منگا دو

نکھرے ستھرے بناؤں گا ساتھی * جن سے پھیلے گی ہر سو بھلائی
چاک کرکے بُرائی کا دامن * میں عبادت کروں گا خدا کی
ماں مجھے بھی کتابیں منگا دو

عزت استاد کی میں کروں گا * ہر اشارے پہ اس کے چلوں گا
گاندھی، آزاد نہرو کی طرح * میں وطن سے محبّت کروں گا
ماں مجھے بھی کتابیں منگا دو

علم سے زندگی ہے * علم سیکھوں یہ میری خوشی ہے
بن سکوں خادمِ ملک و ملّت * آرزو میرے دل میں یہی ہے
ماں مجھے بھی کتابیں منگا دو

انوکھا سوال

عفت آرا علی گڑھ

گاڑی آہستہ، آہستہ اسٹیشن کی طرف رینگ رہی تھی۔ ننھی شیلا بڑے انہماک سے باہر کھیلتے بچوں کو دیکھ رہی تھی۔

ایک تو ان میں بالکل اس کے چھوٹے بھائی بابی کی طرح تھا۔ اس نے سوچا...... ایسا لگتا ہے جیسے بابی اور یہ بھائی ہوں۔ اس نے پھر غور کیا۔

"شیلو" اس کی ممی کی نرم آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

"جی ممی" اس نے چونک کر کہا۔

"بیٹی لو یہ کیلا کھالو" انھوں نے ایک چتی دار کیلا اس کی طرف بڑھایا۔ شیلا اسے کھانے میں مصروف ہوگئی۔ اسٹیشن آگیا اور کئی مسافر چڑھے۔ آخر کار ٹرین نے سیٹی دے دی اور ٹرین ایک بار پھر رینگنے لگی۔ "بیٹی تم اِس سیٹ پر بیٹھ جاؤ اور ان فادر کو یہاں بیٹھنے دو۔"

"لیکن ممی پھر میں کھڑکی کے باہر کیسے دیکھ سکوں گی" اس نے روہانسی ہوتے ہوئے کہا؟

"تم ہماری گود میں بیٹھ جانا بے بی" فادر نے دھیمی اور کمزور آواز میں کہا "نہیں نہیں آپ کو تکلیف ہوگی" شیلا کی ممی نے شیلا کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "کیسی تکلیف" فادر مسکرائے "ہم تو ان بچوں کے لیے ہی زندہ رہتا ہے۔ ورنہ ہم کو کیس پڑا دنہ

میں اور کس سے INTEREST (دلچسپی) ہے! ہم گوڈ (خدا) کی WORSHIP (عبادت) کرتا ہے اور بچوں کو پیار کرتا ہے۔

"جی وہ تو ٹھیک ہے لیکن ......" "لیکن کیا۔ ...... آپ کا شیلا ہم کو بہت سوئٹ (پیارا) لگا: یہ ہمارا گود میں ضرور بیٹھے گا" اور یہ کہتے ہوئے انھوں نے شیلا کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ ممی اپنی سیٹ پر جا بیٹھیں اور نٹنگ کرنے لگیں۔ اب ٹرین پوری رفتار سے چل رہی تھی۔

فادر شیلا کو کھڑکی کے باہر کی چیزیں دکھاتے رہے۔ انھوں نے شیلا کو کئی پریوں کی کہانیاں بھی سنائیں آخر کار گاڑی کی رفتار سست ہو گئی۔ کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ فادر کی منزل قریب تھی لیکن وہ اونگھ رہے تھے۔

"بابا آپ اپنی داڑھی رات کو سوتے وقت لحاف کے اندر رکھتے ہیں یا باہر" شیلا نے بڑے غور و خوض کے بعد یہ سوال دریافت کیا؟

فادر چونک پڑے اور ہکلاتے ہوئے بولے "ان۔ ان۔۔ اندر یا..... با... با باہر" ایک دم گاڑی ایک دھکے سے رک گئی۔ فادر نے شیلا کو پیار کرتے ہوئے بڑی محبت سے کہا۔

"بے بی ہم آئندہ سوتے وقت غور کرے گا کہ ہم اپنی بیرڈ (داڑھی) کو لحاف کے اندر رکھتا ہے یا باہر۔ اس وقت تو سچ مچ ہمیں یاد نہیں آرہا ہے۔" یہ کہہ کر فادر اپنے گاؤن کو سنبھالتے ہوئے گاڑی سے نیچے اتر گئے۔

*

محنتی لڑکے

جو لڑکے کرتے ہیں محنت
دنیا میں پاتے ہیں عزت
کام نہیں پھر ان کو مشکل
کر لیتے ہیں سب کچھ حاصل
ان پر پڑھنا بار نہیں ہے
لکھنا بھی دشوار نہیں ہے
کام انھیں ملتا ہے جتنا
کر لیتے ہیں وقت پہ پورا
پہلے تو وہ پڑھ لیتے ہیں
کھیل تماشے پھر کرتے ہیں
ہوتے ہیں استاد کے پیارے
اماں کی آنکھوں کے تارے
ان کو سب ہی اچھا کہتے ہیں
کتنی عزت وہ پاتے ہیں

عبدالستار احمد آبادی

چوہے کے بل میں اشرفیاں

مشہور عالم ابوبکرؒ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ آدمی رات کے وقت بیٹھا ہوا فکر رہا تھا۔ اس زمانے میں میں تنگ دست تھا دفعتہً ایک چوہا نکلا اور گھر میں دوڑ

تک تھوڑی دیر کے بعد ایک اور چوہا نکلا دونوں چوہے جب میرے سامنے آئے اور اچھلنے کودنے لگے یہاں تک کہ چراغ کی روشنی کے قریب آگیے اور ایک ان میں سے ذرا اور آگے بڑھا۔ اس وقت میرے سامنے ایک طشت رکھا تھا۔ میں نے جھٹ اس کے اوپر طشت اوندھا دیا۔ اس کا ساتھی دوسرا چوہا اس طشت کو سونگھنے لگا اور اس کے ارد گرد پھرنے لگا اور اپنے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میں چپ بیٹھا لکھنے میں مشغول تھا۔

اس کے بعد وہ چوہا اپنے بل میں گیا تھوڑی دیر بعد ایک ثابت اشرفی منہ میں لیے ہوئے نکلا۔ اشرفی اس نے میرے سامنے ڈال دی میں اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہا۔ اور خاموشی کے ساتھ کتابت کرتا رہا۔ چوہے نے کچھ دیر تک مجھے دیکھا اور پھر اپنے بل میں گیا ایک اور اشرفی میرے سامنے لاکر ڈال دی پھر تھوڑی دیر تک بیٹھا دیکھتا رہا۔ میں بھی اسے خاموشی کی حالت میں دیکھتا رہا۔ پھر چوہا اسی طرح آمدورفت کرتا رہا یہاں تک کہ وہ چار یا پانچ اشرفیاں لے آیا اور اشرفیاں لاکر میرے سامنے وہ پہلے کی نسبت زیادہ دیر تک بیٹھا رہا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنے بل میں گھسا اور ایک چمڑے کی تھیلی منہ میں لیے ہوئے واپس آیا جس میں کافی اشرفیاں تھیں۔ اس تھیلی کو اس نے اشرفیوں کے اوپر رکھ دیا۔ اب میں سمجھ گیا کہ اس کے پاس اب کچھ باقی نہیں رہا میں نے طشت کو الٹ دیا اور وہ دونوں اچھلتے کودتے اپنے بل میں گھس گیے اور میں اشرفیوں کو اپنے کام میں لایا۔

عزیز الرحمٰن عقلی

*

سزا جو مجھے ملی :-

ابھی کوئی ایک سال پہلے کی بات ہے۔ چھوٹے بھائی ساجد کی سال گرہ منائی جا رہی تھی۔ میں اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا۔ ابا نے کہا: "آج تم چھٹی کے لو"

میں نے چھٹی کی درخواست لکھی۔ ابا سے چھٹی کی سفارش کروائی اور مدرسے میں دے آیا۔

گھر میں قدم رکھا تھا کہ ابا نے قریب بلایا اور دھیرے دھیرے کچھ کہنے لگے۔ میں نے خالہ صاحب، سبحان صاحب اور دعوت کے لفظ سُنے۔ سمجھ کا پھیر سمجھیے میں ان کے گھر جاکر کہہ آیا کہ آج آپ لوگوں کی دعوت نہیں

گھر لوٹا تو ابا نے پوچھا "کیا کہہ آئے" میں نے جو کچھ کہا تھا وہی بتا دیا۔ مگر یہ کیا —— ابا نے پاس پڑی کچی سے مجھے پیٹنا شروع کر دیا۔ اتنے میں میرے چچازاد بھائی آگیے۔ ابا نے ان سے کچھ کہا اور وہ فوراً گھر سے باہر چلے گیے۔

جب میں خوب رو دھو چکا تو امی نے بتایا۔ تمہارے ابا نے تو تمہیں دونوں گھروں کو دعوت کا بلاوا دینے بھیجا تھا اور تم الٹی بات کہہ آئے۔ یہ سن کر مجھے بے اختیار ہنسی آگئی۔ اب بھی جب یہ واقعہ یاد آتا ہے تو ہنسی بھی آتی ہے یہ خیال بھی آتا ہے کہ دوسروں کی بات ہمیشہ غور سے سنی چاہیے۔ ذرا سے ہیر پھیر میں بات کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

شاہ نواز علی ندوی تھانوی پھپھی

عثمانی

اِدھر اُدھر سے

تین خلاباز جل مرے

کیپ کینیڈی

۲۵ جنوری کو امریکہ میں ایک حادثہ ہوگیا بہت بڑا حادثہ بہت ہی دردناک بہت ہی الم ناک۔ امریکہ کے تین خلاباز، خلائی جہاز میں جل کر مر گیے۔ یہ خلائی جہاز زمین ہی پر تھا۔ یہ تینوں ریہرسل یا مشق کے لیے اس میں داخل ہوئے اور اچانک نہ جانے کیسے جہاز میں آگ لگ گئی اور یہ تینوں کے تینوں اس میں جل بھن کر رہ گیے۔

امریکہ اور روس ابھی چندہی برسوں سے چاند پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اب تک ان کے خلائی جہاز نہ جانے کتنی بار خلا میں کامیاب اڑان کر چکے ہیں۔ اکیلے امریکہ کے خلائی جہاز سولہ بار خلا میں اُڑ چکے ہیں اور کسی حادثے سے دوچار نہیں ہوئے۔ خلائی پرواز کی کوشش کے سلسلے میں یہ پہلی قربانی ہے۔

ان تینوں میں سے دو تو پرانے اور مشاق ہوا باز تھے۔ ورجل گریسم اور ایڈورڈ وہائٹ۔ تیسرے راجر چیفی تھے [illegible] ۲۵ [illegible] کی [illegible] کے سلسلے [illegible] ہوا ہے [illegible] تعلیم میں اڈورڈ وہائٹ کی تصویر چھپ چکی ہے۔

پروگرام یہ تھا کہ پہلے یہ خلائی جہاز ۱۴ دن تک خلا میں زمین کا چکر لگائے اور اس ریہرسل یا مشق کے بعد چاند کی سیدھ بھرے۔ جلدی اس لیے تھی کہ روس اس دوڑ میں بازی نہ لے جائے۔

پر نہ جانے کیا بات ہوئی۔ اچانک ایک دھماکا ہوا۔ اور خلائی جہاز دیکھتے دیکھتے آگ کی نذر ہوگیا۔ اور یہ تین قیمتی جانیں اس حادثے کا شکار ہوگئیں۔

دنیا کی ترقی کے لیے انسان نے بڑے بڑے ایڈونچر کیے ہیں۔ اپنی جانوں کو جوکھم میں ڈالا ہے۔ جب ہی تو دنیا نے اتنی ترقی کی ہے۔ یہ اتنا آگے بڑھی ہے۔ چاند پر پہنچنے کے لیے یہ پہلی قربانی ہے اور ان تینوں خلابازوں کا نام رہتی دنیا تک عزت و احترام سے لیا جائے گا۔

دہلی کے چڑیا گھر میں برفانی چیتے کا بچہ

پام پوش۔

ابھی پچھلی جنوری کے آخری ہفتے میں دہلی کے چڑیا گھر میں برفانی چیتے کا بچہ آیا ہے [illegible]

وزیر تعلیم جموں و کشمیر نے تحفۃً پیش کیا ہے۔ یہ تین ہفتے کا تھا جب چرواہوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ انہوں نے اس کا نام پوش رکھا تھا۔ اب یہ اٹھارہ مہینے کا ہے۔ شروع شروع میں اسے دودھ پلایا گیا پھر چھوٹا گوشت کھانے کی عادت ڈالی گئی اس کی فر زردی مائل سفید یا کریم کلر ہے۔ اس پر کالے کالے دھبے ہیں۔ چڑیا گھر میں اسے رکھنے کا خاص انتظام کیا گیا ہے ہندوستان کے کسی چڑیا گھر میں اب تک برفانی چیتا نہیں دیکھا گیا۔ دہلی کے چڑیا گھر میں یہ نئی چیز آئی ہے۔

برفانی چیتا سطح سمندر سے بارہ ہزار فٹ کی اونچائی پر پایا جاتا ہے۔ فر کی خاطر اس کا اتنا شکار کیا گیا ہے کہ اس کی نسل ختم ہونے کے قریب ہے۔ اسی لیے ہماری سرکار نے اس کا شکار ممنوع اور اسے محفوظ قرار دیا ہے۔ پام پوش اپنے مالک یا سدھانے والے سے تو بہت مانوس ہے بلی کی طرح اس کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ کسی اور کی مجال نہیں جو اسے چھو بھی لے بہت خونخوار ہے۔

میونسپل مدارس کے فائنل تقریری مقابلے

بمبئی ۵ جنوری میونسپل مدارس کے فائنل تقریری مقابلے امام باڑہ میونسپل اردو اسکول ہال میں منعقد ہوئے صدارت آل انڈیا ریڈیو کے بچوں کے پروگرام کے ڈائرکٹر شری پٹھو۔ دھن نے کی۔

ججوں کے فرائض اعجاز صدیقی (مدیر شاعر) جناب مظاہری اور مسز رضوی نے ادا کیے اور فیصلہ اعجاز صدیقی نے سنایا۔

گروپ ۱ چہارم تک (۱) شہناز اختر بیٹ ۳ کی طالبہ

گروپ ۲ چہارم (۱) سعیدہ ابراہیم کا بڑے بیٹ ۳

گروپ ۳ ہفتم تک (۱) سید نہال اختر حید رکرا بیٹ ۲

گروپ ۴ ہفتم تک (۱) نور جہاں محمد اکرام بیٹ ۵

انعام یافتہ طلبہ و طالبات کو نقدی کی صورت میں انعامات فوری طور پر تقسیم کیے گئے۔ اس موقعہ پر ہر بیٹ میں اول تا چہارم انعام حاصل کرنے والے بچوں کو بھی انعامات دیئے گیے۔

اعجاز صدیقی نے اردو کی بمبئی میں ترقی پر اظہار

خیال کرتے ہوئے بمبئی کارپوریشن کی تعریف کی جو ہندوستان
کا واحد کارپوریشن ہے جہاں ایک لاکھ بچے اُردو میں تعلیم
حاصل کرتے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ اُردو کے اساتذہ
کو سخت محنت کرنا چاہیے تاکہ اُردو زندہ رہے۔

صدر جلسہ شری پٹوردھن نے ریڈیو پروگرام کی
افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اسکولوں کے لیے جو
ریڈیو پروگرام ہوئے ہیں انھیں ضرور طلبا کو سنوایا جائے
تاکہ تعلیم کے میدان میں وہ جدید طریقوں پر مرتب ہونے
والے پروگرام سے افادہ حاصل کرکے آگے بڑھ سکیں۔

اس پروگرام میں تمام بیٹ افسران کے علاوہ
سپرنٹنڈنٹ لے فاروقی اور اساتذہ نے شرکت کی اے اے
فاروقی نے کارپوریشن کی طرف سے نقد انعامات تقسیم
کرنے کے بارے میں بتایا کہ یہ پہلا موقع ہے جب اس
بڑی تعداد میں یہ انعامات دیئے گئے ہیں۔

ہم اکیلے نہیں ہیں۔

اب تک تو باوجود سائنس دانوں کی لگاتار چھان
بین کے باوجود کسی ستارے یا سیارے پر جاندار مخلوق
کا پتہ نہیں لگا تھا۔ پر اب ایک امریکن سائنس دان
نے دعویٰ کیا ہے کہ کائنات میں سو ملین ستارے ایسے ہیں
گھاس بھی اگتی ہے پیڑ پودے بھی ہیں اور لوگ بھی
آباد ہیں۔

یہ سائنس داں ڈاکٹر ہارلو شیپ نے ستاروں
کے علم کا مشہور ماہر ہے۔ ابھی تھوڑے دن پہلے
ہارورڈ آبزرویٹری سے ریٹائر ہوا ہے۔ امریکہ کے تین
دوسرے سائنس داں بھی ڈاکٹر ہارلو کے ہم خیال ہیں۔

انڈین اکسپریس

حضرت آدم افریقی تھے:۔

ایک فرانسیسی پروفیسر کا خیال ہے کہ حضرت آدم
ایشیا میں نہیں افریقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ پروفیسر کا
خیال ہے کہ بوئر کے علاقے میں جو انکشافات ہوئے
ہیں۔ وہ ان کے اس دعوے کی تائید کرتے ہیں۔
ابھی تک عام خیال یہ تھا کہ حضرت آدم ایشیا میں پیدا
ہوئے تھے۔

(انڈین اکسپریس)

والدین کا اسکول:

بمبئی میں والدین کے لیے
بھی ایک اسکول ہے۔ اس اسکول میں والدین کو ایسے
سبق دئے جاتے ہیں جنھیں سیکھ کر وہ گھر میں اپنے
بچوں کو بہتر طریقہ پر تربیت دے سکیں۔ یہ اسکول آر۔
ام۔ بھٹ ہائی اسکول میں قائم کیا گیا ہے سوشل ورکر اور
اساتذہ بہت باقاعدگی سے اسکول چلاتے ہیں۔ والدین
کے لیے ایک سرٹی فکٹ کورس جاری کرنے پر بھی
غور ہو رہا ہے۔

فارم IV حسب قاعدہ ۸ بابت پیام تعلیم نئی دہلی

۱. مقام اشاعت۔ جامعہ نگر نئی دہلی
۲. وقفہ اشاعت۔ ماہنامہ
۳. پرنٹر کا نام۔ سید احمد ولی۔ قومیت: ہندوستانی پتہ جامعہ نگر، نئی دہلی
۴. پبلشر کا نام سید احمد ولی قومیت: ہندوستانی پتہ جامعہ نگر، نئی دہلی
۵. ایڈیٹر کا نام محمد حسین حسّان قومیت: ہندوستانی پتہ جامعہ نگر، نئی دہلی
۶. مالکان کے نام و پتے: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی چیرمین پروفیسر محمد مجیب جامعہ نگر، نئی دہلی

ڈائرکٹرز
۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر نئی دہلی
۲۔ ڈاکٹر عبدالعلیم ۶، یونیورسٹی روڈ، علی گڈھ
۳۔ مسٹر ایم آر چنائے مہر بلڈنگ چوپاٹی۔ بمبئی
۴۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور، کف پریڈ، کولابہ بمبئی
۵۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ۱۲/۱۱ جن پتھ لین نئی دہلی
۶۔ ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فی صدی سے زیادہ کے حصے دار

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

اسلام جیم خانہ۔ کنیڈی سی فیس، بمبئی

میں سید احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

دستخط احمد ولی
پبلشر

۲۸ فروری ۱۹۶۷ء

پرنٹر و پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

۱

یہ تینوں امریکی خلاباز ۲۷ جنوری ۱۹۶۷ء کو ۲
امریکن خلائی جہاز اپولو میں بیٹھے تھے کہ اچانک
حادثے کا شکار ہو گئے۔

۱۔ ورجل گریسم
۲۔ ایڈورڈ وہائٹ
۳۔ روجر شیفی

۳

March 1967. Regd. No. D. 1457.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

جب تک ابا آئیں اخبار ہی پڑھ لوں
فوٹو: انیل گجریا

ہمارے چند لکھنے والے

خالد عرفان

وقار خلیل

محمد حسیب حسّان

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کیلئے منظور شدہ

فہرست

سرورق کی تصویر: خبردار اگر کوئی قریب آیا تو.....

فوٹو شاہد علی خان

یہ پرچہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا آپ نے عید بھی منالی ہوگی ہولی بھی منالی ہوگی —— دونوں تہوار ہنسی خوشی منانے پر ہم آپ کو مبارکباد دیتے ہیں۔

○

اور ہاں بھئی حج بھی تو اسی یعنی ذی الحجہ کے مہینے میں ہوتا ہے۔ عید سے ایک دن پہلے۔ اتفاق دیکھیے ہمارے ابن بطوطہ صاحب آج کل وہیں پہنچے ہوئے ہیں اور مزے لے لے کر وہاں کے حالات بیان کر رہے ہیں۔ پیامیوں نے اور بزرگوں نے اس حسنِ اتفاق کو بہت سراہا ہے اور سفرنامے کا یہ حصہ بہت دلچسپی سے پڑھ رہے ہیں۔

○

مارچ کے پیام تعلیم میں ابن بطوطہ والے مضمون میں دو غلطیاں رہ گئی ہیں انھیں ضرور ٹھیک کرلیجیے۔ صفحہ ۴۹ سطر ۵ حضرت اسماعیل کی جگہ حضرت ابراہیم چھپ گیا ہے۔ بائیسویں سطر میں بجائے ننگے سر کے صرف ننگے لکھا ہے اسے بھی ٹھیک کرلیجیے۔

○

جناب ظ۔ انصاری کی نظم "قصہ مچھلی اور مچھوے کا" ہمارے پیامیوں کو خاص طور پر اچھی لگی۔ ان دنوں جتنے بھی خط آئے ہیں ان سب میں اس نظم کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ جناب ظ۔ انصاری صاحب نے ہمیں یہ خوش خبری دی ہے کہ ان کے پاس اسی طرح کی چند نظمیں اور بھی ہیں اور وہ ان نظموں کو بھی پیام تعلیم کی نذر کریں گے۔ یہ سب پشکن شاعر کی بہترین نظموں کا ترجمہ ہیں۔

○

ان کی مچھلی والی نظم میں بھی کچھ غلطیاں رہ گئی ہیں۔ فروری کا پیام تعلیم نکال لیجیے۔ نظم چوبیسویں صفحے سے شروع ہوتی ہے۔ پہلے ہی شعر کے دوسرے مصرعے میں "یا" چھپتے چھپتے مٹ گیا ہے۔ اسی صفحہ پر نویں سطر میں "ایک دن" کی جگہ 'ایک دفعہ' ہونا چاہیے۔ اسی صفحے پر دوسرے کالم میں دوسرا شعر

اس طرح ہونا چاہیے:

اب جو جال بیٹا اس میں نکلی کیسی مچھلی
سچ پوچھو تو سونے کی تھی، کوئی ایسی ویسی مچھلی!

صفحہ ۲۵ پر ساتویں سطر میں "آتنا کہتا" کی جگہ "آتنا کہتا" ہونا چاہیے۔ صفحہ ۲۶، سطر ۱۱ "میری" کی جگہ "مری" ہونا چاہیے۔ صفحہ ۲۷، سطر ۲ "آتے" کی جگہ "آگے" ہونا چاہیے۔ اسی صفحہ پر سترھویں سطر پورا مصرعہ اس طرح ہے۔ "مورکھ تو نے مچھلی سے جو مانگا بھی تو مانگا اک گھر" بیچ میں 'جو' چھوٹ گیا ہے۔ صفحہ ۲۹ سطر ۹ "بڑھی" کی جگہ "تیسری" ہونا چاہیے۔ صفحہ ۲۹ کالم ۲ سطر ۴ اور یہ پوچھا ایضاً سطر "کیوں" کی جگہ "کہوں" چھپ گیا ہے۔ اسی کالم میں سطر ۱۶ "سارے" کی جگہ "سارا" چھپ گیا ہے۔ صفحہ ۳۰ صحیح مصرعہ یوں ہے۔ چو طرفہ بے گار دہرا۔ سترھویں سطر میں "پھرے" پڑھیے۔ 'پھر' کے نقطے چھوٹ گئے ہیں۔ ایضاً ۱۹ویں سطر "سہا" پڑھیے۔ صفحہ ۳۱ سطر ۱۹ "ساتوں ساگر" کی جگہ "سات سمندر" پڑھیے۔

قربان میاں کی یاد بہت سے پیامیوں کو ستا رہی تھی۔ لیجیے آج وہ پھر آپ کی محفل میں دندنا رہے ہیں۔ ان کے کارنامے پڑھیے اور لطف اٹھائیے ان کے علاوہ سچے بہادر، قلم کی کہانی، عقل بچوں میں بھی ہوتی ہے، جنگل کا بادشاہ وہ مضمون ہیں جو سالنامے میں نہ چھپ سکے تھے۔ اجالے کے کرشمے سائنسی مضمون ہے اور بہت دلچسپ انداز میں لکھا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور مضمون ہے شوق اور لگن کی جیت۔ اسے پڑھ کر خدا کرے آپ میں بھی اچھے کام کا شوق اور لگن پیدا ہو۔

فروری کے پیام تعلیم میں ہم نے ٹائٹل پر چھپی ہوئی (ننھے پیامیوں کی) تصویروں کے سلسلے میں انعامی مقابلے کا اعلان کیا تھا۔ ان پیامیوں نے صحیح نام لکھ کر بھیجے ہیں:-

(۱) نہال احمد صدیقی الہ آباد (۲) محمد واحد شیر گھاٹی (۳) انجم آرا جامعہ نگر (۴) فرحت زمانی جامعہ نگر (۵) شگفتہ پروین جامعہ نگر (۶) رضا المرتضیٰ انصاری جمشید پور (۷) ندرت حسین سہارنپور (۸) محمد صغیر خاں الہ آباد (۹) ظفر الاسلام شمسی سرائے میر (۱۰) محمد ابراہیم صدیقی الہ آباد (۱۱) مرزا ظہیر بیگ نظام آباد (۱۲) محمد شفیق دہلی (۱۳) ہاشم الدین دہلی (۱۴) صغیر احمد دہلی (۱۵) علاء الدین دہلی (۱۶) محمد صغیر خاں دہلی (۱۷) نجمت علیمی الہ آباد (۱۸) محمد طاہر خاں دہلی (۱۹) مہتاب احمد دہلی (۲۰) محمد رئیس دہلی (۲۱) محمد سلیم خاں دہلی (۲۲) زینبہ پروین ملیان (۲۳) انیس اقبال نزہت گیا (۲۴) عابد اظہر رضوی سیتاپور (۲۵) نشاط قیصر پٹنہ (۲۶) سرور بیگ دہلی (۲۷) محمد شریف خاں دہلی (۲۸) محمد نسیم خاں دہلی (۲۹) فیاض بیگ دہلی (۳۰) مریم بائی بمبئی (۳۱) محمد حماد اللہ شریف حیدر آباد (۳۲) مبشر احمد اورنگ آباد (۳۳) بدر فاطمہ جامعہ نگر

(۳۴) محمد انور قادری جامعہ نگر (۳۵) سلطان عبدالقادر جامعہ نگر (۳۶) عتیق احمد اشرفی دہلی (۳۷) واجد علی خاں بمبئی (۳۸) محمد عمران بارہ بنکی (۳۹) محمد امین عثمانی سلہ گیا

ان سب پیامیوں کو اعلان کے مطابق ایک ایک روپے کی کتابیں انعام میں بھیج دی جائیں گی۔ ہاں ٹائٹل پر جن ننھے پیامیوں کی تصویریں چھپی ہیں ان کے نام یہ ہیں

(۱) شکیل احمد (۲) محمد مصطفیٰ (۳) گوگو (۴) جعفر رحیم (۵) جبیں (۶) عابد امام

اس سلسلے میں ایک بات بڑی دلچسپ ہے ایک خاص شہر سے ہمارے پاس دس بارہ خط آئے ہیں۔ نام مختلف ہیں، پتے مختلف ہیں مگر سب کی لکھاوٹ ایک سی ہے۔ خدا کرے یہ ہماری بدگمانی ہی ہو۔ ایسی گھٹیا بات کی ہمیں اپنے پیامیوں سے امید نہیں ہے۔

سالنامے کے سلسلے میں خط اب بھی آرہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو اس پرچے میں بھی چھپ رہے ہیں۔ گنجائش کی کمی کی وجہ سے یہ سلسلہ اب بند کیا جارہا ہے۔ ان کی وجہ سے اور بہت سے ضروری خط نہیں چھپ سکے ہیں۔

ان خطوں میں ہمارے بزرگوں نے اور پیامیوں نے کچھ اچھی اچھی باتیں بھی لکھی ہیں۔ مثلاً افتخار اعظمی صاحب کا خیال ہے کہ بہت سے مضمون نگار، بہت سے شاعر بچوں کے لیے لکھتے ہیں مگر زبان بڑوں کی استعمال کرتے ہیں۔ یہ بات انہوں نے کچھ ٹھیک ہی کہی ہے اگر ہمارے شاعر بچوں کی نفسیات، بچوں کی ذہنی سطح کا خیال رکھیں تو نہ تو زبان بھی آپ سے آپ سادہ ہو جائے اور شعر یا نثر کا مضمون بھی ایسا ہو کہ بچے آسانی سے سمجھ لیں۔

اس سلسلے میں پیامی بھی ہماری بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں وہ بے تکلف لکھیں کہ نظم کا کونسا شعر ان کی سمجھ میں نہیں آیا، کس شعر میں زبان زیادہ سخت استعمال کی گئی ہے۔ پھر کون سا مضمون کون سی نظم اچھی لگی اور کیوں؟ کون سی نظم اور کون سا مضمون پسند نہیں آیا اور کیوں پسند نہیں آیا۔

لے لیجیے حاجی بابا صاحب بھی تشریف لے آئے ایک بمبئی سے آتے آتے انھیں بہت دیر لگ گئی جیسے پیدل چل کر آئے ہوں۔ اصل میں ظ۔ انصاری صاحب ایک دوسرے ضروری کام میں لگ گئے تھے۔ ہم نے معذرت کر دی تھی مگر عزیز ساتھی شاہد علی خاں صاحب کے اصرار پر انھیں پھر جوش آگیا یقین ہے کہ یہ سلسلہ اب بند نہ ہوگا۔

تتلی

جناب کیف احمد صدیقی

اے دل فریب تتلی رنگوں کی شاہزادی
کس نے ترے پروں کو یہ دلکشی عطا کی

اے شاہکارِ فطرت کتنی حسین ہے تو
سرتاپا خوب صورت سی نازنین ہے تو

اللہ رے یہ تیری شوخی بھری ادائیں
ہر اک قدم پہ قدرت لیتی ہوئی بلائیں

کس کی تلاش میں تو پھرتی ہے ماری ماری
کیوں تیرے دل میں آخر آتی ہے بیقراری

جب تو چمن میں آئی ہر پھول مسکرایا
شاخوں نے بھی خوشی سے تجھ کو گلے لگایا

رودادِ رنگ و نکہت کی ترجمان ہے تو
سچ پوچھیے تو سارے گلشن کی جان ہے تو

دن بھر تو گلستاں میں تو جابجا پھرے گی
جب رات آئے گی تو جا کر کہاں رہے گی

آ میرے ساتھ تجھ کو میں گھر میں لے چلوں گا
اپنی طرح ہی تجھ کو آرام سے رکھوں گا
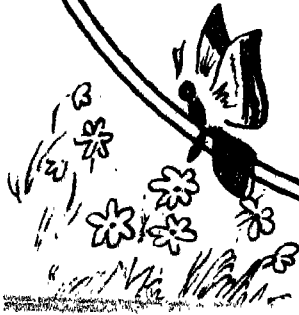
ڈائری
حاجی بابا
کی

جو ظ۔ انصاری نے نقل کر کے بھیجی

مِس گُلگُلہ ہماری سکرٹری ہے تو عقل کا پُتلا، بلکہ پُتلی لیکن ابھی ۱۶، ۱۷ برس کی بچی ہے اور وہ بھی یورپ کی پَلی بڑھی۔ ہمارے دیس کی ہر بات کو آنکھیں گھما کے، ہاتھ نچا کے دیکھتی ہے جیسے یہ بھی ایک عجوبہ ہوا۔ زبان بھی اچھی طرح نہیں سمجھتی سمجھانی پڑتی ہے۔

ٹیلی گراف کے کھمبے کو کان لگا کر، جو اس نے ہمیں بتایا کہ "پلیٹ فارم پر شیر آگیا ہے گاڑی یہاں مت روکو" تو ہم نے اپنا دیسی چشمہ اوپر نیچے کیا، ناک کھجائی، سوچ میں پڑ گئے کہ بھئی، شیر اتنا پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اب یا تو اس سے دوستی کریں یا اس کا شکار کریں۔ تم جانو، کسی کو شکار کرنا اسے جان سے مار ڈالنے کو نہیں کہتے۔ بعض وقت دوستی میں بھی شکار کیا جاتا ہے۔ بعضے بعضے دوست ایسے ہوتے ہیں کہ جسے پیار کرتے ہیں، اسی کو شکار کر لیتے ہیں۔ یہ بُرے آدمی کی خصلت ہے۔ شیر ایسا نہیں کرتا۔ شیر کے بچے بھی ایسا نہیں کرتے۔ یہ گیدڑوں کا کام ہے!

ہم ابھی سوچ رہے تھے کہ مس گُلگُلہ تالی بجا کر بولی۔ "آبا جی، مزہ آگیا، ہم تو زندہ شیر دیکھیں گے۔" ہم نے کہا "چُپ رہو جی، تم کو ماسکو

کے جانور خانے میں ہر وضع کا، ہر ایک نسل کا شیر دکھا چکے ہیں۔ سفید شیر تک دیکھ چکی ہو۔ تمھارا جی نہیں بھرا؟"

شرارت سے جلدی جلدی آنکھیں جھپکا کر بولی،

"وہ تو کٹہرے میں بند تھے۔ یہ جنگل کا رہنے والا آزاد شیر ہے۔ میں نے رڈیارڈ کپلنگ اور جم کاربٹ کے شکار نامے انگریزی میں پڑھے ہیں۔ واہ وا، کیا بادشاہی طبیعت کا ہوتا ہے شیر۔ میں تو پلیٹ فارم پر جا کر دیکھوں گی۔"

"اور اگر چیخ نکل گئی تو شیر چانٹا مار دے گا۔ سمجھیں؟"

"نہیں مارے گا۔ مجھے سب خبر ہے۔ جب تک شیر پر حملہ نہ کرو۔ وہ خود سے نہیں چھیڑتا ہو گا، زخمی اور چوٹ کھایا ہوا شیر خطرناک ہے، ورنہ تم اس کے سامنے سے نکل جاؤ۔ راستہ کترا کر چلا جائے گا۔ کمزور پر وار کرنا شیری نہیں ہوتی حاجی بابا۔"

ہم نے سوچا۔ لڑکی ضدی ہے، نہیں مانے گی۔ اپنی خاص الخاص ٹوپی اتاری، اس کو الٹا کیا، اَستر باہر نکالا، اَبرا اندر کیا اور بس گلگلا کے جھبرے سر پر جما دیا۔ "لے اب چلی جا پلیٹ فارم پر۔ تو شیر کو نظر نہیں آئے گی اور شیر تیرے سامنے بیٹھا رہے گا۔"

پنجوں کے بل، پیٹ اندر کو دبائے، ٹانگیں سکیڑ کر، ذرا بڑھی اور آہٹ کیے بغیر پیچھے کی دیوار کی آڑ میں ہو کر باہر جھانکی۔ جیسے شیر شکار کی طرف بڑھتا اور تاکتا ہے۔

دن چھپے کا وقت، شیر ذرا شام کا نظارہ کر رہا تھا اور شاعری کے موڈ میں لگتا تھا۔

شیر سے تاک جھانک کر کے دم بھر میں ہماری سکرٹری پکی ہوئی آئی۔ منھ لال آنکھیں چمکتی ہوئی ہانپتے ہانپتے بولی:

"حاجی بابا واقعی اصلی شیر ہے اور جس آرام سے بیٹھا ہے، لگتا ہے کہ پیٹ بھرا بھی ہے۔"

"اور جس آرام سے تم دیکھ بھال کر آئی ہو اس سے یوں لگتا ہے کہ گوشت نہیں کھاتا دودھ پیتا ہوگا۔"

(دودھ کو فارسی میں شیر کہتے ہیں۔ فارسی کے بڑے شاعر مولانا روم نے لکھا تھا "گرچہ باشد در نوشتن شیر شیر" یعنی لکھنے میں شیر (دودھ) اور شیر (پنجوں والا) ایک ہی ہے)

گلگلا بولی، کیا تعجب ہے جو ہندوستان کے شیر دودھ پینے اور گھانس کھانے لگیں —— اور صبح سویرے اٹھ کر بنجرا پول پہنچیں اور صدا لگائیں

"اے گئو ماتا، دو چار لٹر دودھ پلواؤ۔ میں بھی جن سنگھی ہوں۔"

تب تو گئو ماتا جواب دیں گی ——

"آں ہاں —— بھاگ جا ہے۔ دودھ مہنگا ہو گیا ہے۔"

پھر وہ سیدھا گھاس منڈی جایا کرے گا۔

— اور آخر میں دنیا سے تنگ آکر سادھو ہو جائے گا — ہے نا؟"

"آپ کو تو اُٹھتے بیٹھتے مذاق سوجھتا ہے۔ اب کوئی ایسی تدبیر کیجیے کہ شیر کو رسّی میں باندھ لیں اور لے چلیں ساتھ۔"

"یعنی شیر کو پکڑنے کی تدبیر بتاؤں؟"

"ہاں، ہاں God, grace you بتائیے نا۔"

"بس وہی ہے بگلا پکڑنے کی ترکیب۔ ایک موم بتی لاؤ۔ جلاؤ۔ دبے پاؤں سے بگلے کے پیچھے جاؤ۔ اور اس کی آنکھ پر جلتا موم ٹپکاؤ۔ موم ٹپکے گا تو جم جائے گا۔ آنکھیں چپک جائیں گی تو وہ بھاگ نہیں سکے گا۔ تم اطمینان سے پکڑ کر باندھ لینا۔"

"یہ ترکیب آپ کیجیے گا، میں تو جا کر اس کی پیٹھ سہلاؤں گی۔"

"ہاں — شوق سے شیر تھوڑی ہے، خرگوش ہے۔"

پھر ہم نے اسے بتایا کہ باؤلی نہ بنو۔ شیر سے مذاق کرنا اچھا نہیں۔ شیر خوبصورت سہی، پر خوبصورتی کو قبضانے کی کوشش کیا ضرور! دور سے دیکھو اور خوش ہو جاؤ۔ اپنا راستہ لو بھئی!

ابھی ہم سمجھا رہے تھے کہ اتنے میں ریل کی پٹریوں کے اندر سنسناہٹ ہونے لگی ہم سمجھ گئے کہ پچھلے اسٹیشن سے ریل آرہی ہے۔

ہم اور بس گلگلا اپنی چیل گاڑی کا غم بھول کر درخت کی آڑ میں چھپ کر بیٹھ گئے —

اور تماشے کا انتظار کرنے لگے۔

شیر نے ذرا گردن موڑ کر ادھر دیکھا جدھر سے ریل کا کالا دھبہ نظر آرہا تھا۔ پھر اور غور سے دیکھا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ کوئی بھالو ہے جنگل کا۔ وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ اُس کی دُم لاٹھی کی طرح سیدھی ہو گئی۔ جب وہ کوئلے اور بھاپ کا بھالو قریب آنے لگا تو شیر نے چاروں ٹانگیں اتنی نیچی کر لیں کہ پیٹ زمین کو چھونے لگا اور دُم کی لاٹھی داہنے بائیں ناگن کی طرح لہرانے لگی۔ اب میاں شیر کی شامت ہوا ہو گئی اور وہ دشمن پر جھپٹنے کے لیے دبے دبے آگے سرکنے لگے۔ کانوں کے کٹورے گھماتے ہوئے — اور چوکور منھ بناتے ہوئے۔

جب ریل نیچے پلیٹ فارم کے برابر سے گزرنے کو ہوئی تو فائرمین، جو دور سے آدھا لٹکتا چلا آرہا تھا، شیر پر نظر پڑتے ہی اندر گھس گیا — اور وہاں سے کوئلے کا بڑا سا ڈھیلا پھینکا — کہ لو بیٹا، ہم بھی شیر کے باپ ہیں۔

شیر نے وار خالی دیا اور داؤں لگا کر اُس لمبے کالے بھالو کی کمر پر چھلانگ لگا دی۔ جیسے بجلی کا بٹن دبتے ہی کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے، معلوم نہیں کب شیر زمین سے اچھلا، اور کب اس کی کمر پر ٹوٹ پڑا۔

مگر بھالو کی کمر موٹے لوہے کی تھی، شیر

نے گرتے گرتے دو تین بار جھنجھوڑا اور آخر جب
لمر کی ہڈی نہ ٹوٹی تو گردن کو پوری طاقت سے
دائیں بائیں موڑا اور انجن سے جڑے ہوئے ڈبے
کو جھنجھوڑا۔ ڈبے کے اندر سے چیخیں سنائی دیں۔
ہماری سکرٹری نے ڈر کے مارے آنکھیں بند کرلیں
اور ہماری سوا فیٹ لمبی ڈاڑھی میں جھول گئی۔
ہماری ولایتی ڈاڑھی جھڑ جھڑ کرنے لگی۔ چشمہ
ایک کان سے لٹک گیا۔

شیر غصّے میں بھرا ہوا اس حملہ آور بھالو
کو جھنجھوڑ رہا تھا کہ اس کی ٹانگ پھسلی پنجے لوہے
کے گوشت میں کیسے گڑتے، چھوٹ گئے اور
فرلانگ بھر کے فاصلے تک گھسٹ کر چھ فٹ لمبا
شیر چلتی گاڑی کے نیچے آرہا۔ وہ اس مصیبت سے
باہر زقند بھرنے کو تھا کہ آدھا اِدھر، آدھا اُدھر۔
گارڈ نے باہر کے سگنل پر پہنچ کر گاڑی روک لی۔
گاڑی رُکتے ہی گارڈ نے اپنی پتلون اوپر کو چڑھائی۔
سیٹیوں پر سیٹیاں دے کر اسٹاف کو بلایا۔ سہمے
سہمے ڈرائیور اُترے۔ پھر ہتھیار بند دو پولیس
والے ایک ڈبے سے کود ے — یہ ہمیشہ واقعے
کے بعد کود کر آتے ہیں۔ پھر گارڈ صاحب شان
سے گورا شاہی انگریزی بولتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر
کو پکارنے لگے،

"We have killed the tiger, Come on boys!"

اندر سے تار گھر کھلا۔ اسٹیشن ماسٹر ایسا
کانپتا ہوا نکلا جیسے بیوپاریوں سے رشوت لیتے پکڑا
گیا ہو۔

ایک دولھا میاں پھولدار بش شرٹ پہنے
ہوئے اپنے ڈبے سے باہر نکلے اور زنانے ڈبے
میں سے اپنی بیوی کو پکارنے لگے،

"ڈارلنگ، نیچے اُترو۔ ایک شیر کے دو شیر
دیکھو!"

وہ بچاری کانپ رہی تھی۔ پسینے پسینے ہورہی
تھی۔

شیر کے دونوں ٹکڑے کھینچ کھانچ کر باہر
لال بجری پر لائے گئے۔ تازہ لہو سے بجری اور
لال ہوگئی۔ ہماری سکرٹری نے آنکھیں کھولیں تو
دیکھتے ہی گلال ہوگئی۔ شیر کے دونوں ٹکڑے
ملاکر ڈال دیے گئے۔

گارڈ صاحب نے پولیس والے کی بندوق
مانگ کر دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور شیر کے
زیر دست دبانے پر جس میں لہو جم رہا تھا، شیرانہ
کھڑے ہوگئے۔ پھولدار بش شرٹ والے نے
کیمرہ کلِک کر دیا۔ تصویر کھنچ گئی۔

ہم پر نظر پڑتے ہی ٹکٹ چیکر لپکا۔
"اے بڈھے کہاں بھاگا جاتا ہے ٹکٹ دکھاؤ"
ہم تو راستے میں گاجر کا حلوا ہضم کیے ہوئے
تھے، دماغ میں روشنی آگئی۔ تدبیر سوجھ گئی۔

ہم ڈپٹ کر بولے ،

" خبر دار تمیز سے بات کرنا، ایک تو تمہاری بے پروائی سے ہمارا پالتو شیر گاڑی میں کٹ گیا' اوپر سے اکڑتے ہو۔ تم پر مقدمہ چلائیں گے بڑا کرا دیں گے ۔ کس کی اجازت سے شیر مارا؟ شیر مارنے کو سرکاری لائسنس چاہیے ۔ سمجھے!"

" پالتو شیر ؟" ریلوائی کے گیدڑ ایک ساتھ بھبکے

" اور کیا' ہم اس پر سوار ہو کر ریل دکھلانے لائے تھے ۔"

" شیر پر سوار ہو کر ؟ "

" ابے تو کیا سمجھتا ہے کہ درگا مائی ہی شیر کی سواری کرتی ہے ، آدمی نہیں کر سکتا ۔ مولانا روم نے شیر اور خرگوش کی کہانی میں لکھا ہے کہ نفس کے شیر پر قابو پانا ہی اصل میں شیر کی سواری کرنا ہے ۔ آدمی اپنی خواہش اور لالچ پر قابو پیدا کرے تو میاں شیر کیا چیز ہے !"

اتنا کہا اور ہم مثنوی مولانا روم کے شعر لہک لہک کر پڑھنے لگے ۔ پلیٹ فارم پر شور مچ گیا ۔ لوگ دوڑ دوڑ کر اکٹھے ہو گئے ۔

اسی آپا دھاپی میں بس گلگلہ کے سر سے ٹوپی گر گئی ـــــ اور وہ سب کے سامنے کھڑی تھی ۔

" ہائیں ـــــ یہ کون ؟ "

اب کوئی ہم سے کچھ نہ کہے ۔ یورپین لڑکی کو سب گھورنے لگے ۔

" اچھا یقین نہیں آتا تو پوچھ لو ہماری سکرٹری سے ۔" ہم نے فراٹے دار انگریزی میں کہا ۔

گارڈ مجمع کو دونوں کہنیوں سے ہٹاتا ہوا آگے بڑھا ۔ ڈنڈوت بجا لایا ۔ اور ادب سے عرض کیا ،

" مہاراج ! بڑی بھول ہوئی آپ تو پہنچے ہوئے پیر فقیر سادھو لگتے ہیں ۔ آئیے میرے ڈبے میں آجائیے ۔ آپ کی شاندار سواری تو بھگوان کو پیاری ہو گئی ۔ اب اسی کو اپنی سواری مانیے ۔ جہاں حضور کی آ گیا ہو گی وہیں اسی اسٹیشن پر اتار دوں گا ۔ ہم غریبوں کو بھی سیوا کا کچھ موقع دیجیے ۔" حضور کو اس نے ہجور کہا اور موقع کو موکا ۔ ہمیں اس کی نالائقی پر غصہ آنے ہی والا تھا کہ بس گلگلہ نے آنکھ کا اشارہ کیا ۔

مطلب اس اشارے کا یہ کہ :

" اے حاجی بابا ، موقع سے فائدہ اٹھاؤ تمہاری چیل گاڑی کا انجن بگڑا ہوا جنگل میں پڑا ہے ۔ ریل پر سوار ہو جاؤ ۔ اور اب کی بار ریل سے ، ساتھ خیریت کے بمبئی پہنچ جاؤ ۔"

پرسوں شام ہم بمبئی پہنچے ہیں اور آج صبح سے چاروں طرف اخباروں میں دھوم ہے کہ حاجی بابا جو دو دن پہلے برہان پور اور نیپا نگر کے جنگل میں شیر پر سواری کرتے دیکھے گئے تھے آج صبح کی گاڑی سے اپنی کرامات سمیت بمبئی نواسیوں کو درشن دینے کے لیے یہاں پدھارے ہیں ...

رہے نام سائیں کا !

فقط

جناب سعادت نظیرؔ

ہولی

یہ رُت، یہ رنگ، یہ ہوا!
یہ لطف سے بھری فضا!

بہار پر اُمنگ ہے
شباب پر ترنگ ہے

کھِلے ہیں پھول آگ میں
سبھی مگن ہیں پھاگ[1] میں

عبیر[2] کا اُچھالنا
ہر اک پہ رنگ ڈالنا

ہر ایک کا منہ ہے لال سا
یہ کھیل ہے گلال[3] کا

محبتوں کی جنگ دیکھ
مسرتوں کا رنگ دیکھ

روش روش پہ چہچہے!
قدم قدم پہ قہقہے!

لہک نئی ہے راگ میں
بلندیاں ہیں بھاگ[4] میں

یہ زندگی کی بات ہے
کہ دن کی جیسی رات ہے

[1] ہولی [2] ایک خوشبودار سفوف [3] ایک قسم کا سرخ پاؤڈر [4] قسمت

جناب یوسف ناظم

قربان میاں کے کارنامے

اس مضمون کے پڑھنے سے پہلے آپ اگست ۶۶ء (صفحہ ۶۔۷۔۸)
کے پیام تعلیم میں قربان میاں کے کارنامے پڑھ لیں تو زیادہ مزہ آئے گا۔ مختصر طور پر یوں سمجھیے کہ اُن کے ہیڈ ماسٹر صاحب نے انھیں کسی ضروری کام سے بھیجا جلد لوٹنے کی تاکید کی اور کہا سائیکل پر جانا۔ یہ دو گھنٹے میں لوٹے ہیڈ ماسٹر نے ڈانٹا اور کہا "تم سائیکل پر گیے، پھر اتنی دیر کیوں ہوئی؟" جواب دیا "سائیکل چلانا تو مجھے آتی نہیں۔" ہیڈ ماسٹر نے حیران ہوکر پوچھا "پھر سائیکل کیوں لے گیے تھے؟" انھوں نے بے ساختہ جواب دیا۔ "آپ نے حکم جو دیا تھا۔" اب آگے پڑھیے۔

ایڈیٹر

اسکول میں سب لڑکوں کے سامنے ہیڈ ماسٹر صاحب کی ڈانٹ پڑنے پر قربان میاں کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ لڑکے قربان میاں کے دشمن نہ تھے لیکن اُس دن تو سب ہی ان پر ہنسنے لگے کہ قربان میاں اتنے بڑے ہوکر بھی سیکل چلانا نہیں جانتے۔ دوسرے دن سے

تو لڑکے اِن کے پیچھے پڑ گیے کہ قربان میاں تم بھی عجیب گھن چکّر ہو اتنی عمر ہو گئی تمھاری، اونٹ جیسا قد نکل آیا تمھارا لیکن تمھیں سیکل چلانی نہیں آتی۔ غضب ہے۔ آج کل ڈیڑھ فٹ کا بچّہ بھی سیکل چلانا جانتا ہے اور تم کچھ نہیں تو پونے پانچ فٹ کے تو ہوگے ہی۔ کیوں نہیں

سیکل چلانا سیکھ لیتے۔ قربان میاں روز اپنے دوستوں سے یہ باتیں سُنتے اور خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ قربان میاں سیکل چلانا سکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اصل میں ان کی امّی۔ ابا۔ چچا میاں۔ بڑے بھیّا سبھی نے کہہ رکھا تھا کہ قربان میاں کو سیکل پر کبھی نہ بیٹھنے دیا جائے۔ وہ جانتے تھے کہ یہ حضرت پیدل چلتے ہیں تو ہر راستہ چلنے والے کو ٹکریں مارتے چلتے ہیں سیکل پر بیٹھ کر معلوم نہیں کیا گل کھلائیں گے۔ بڑے بھیّا نے تو کہہ دیا تھا کہ اگر قربان میاں سیکل پر بیٹھ کر بازار میں نکل جائیں تو ہر شخص زخمی ہو جائے اور خود قربان میاں کی صورت نہ پہچانی جائے۔ یہی وجہ تھی کہ امّی اور ابّا نے ان پر سختی سے نگرانی رکھی تھی اور قربان میاں اب تک سیکل چلانا نہ سیکھ سکے تھے۔ دو چار مرتبہ انھوں نے چھپ کر سیکل چلانی سیکھنی چاہی لیکن کسی نہ کسی ذریعہ سے ان کے ابّا کو اس کی اطلاع مل گئی اور پھر قربان میاں کی خوب خبر لی گئی۔ قربان میاں نے بھی سوچا کہ سیکل ایسی کون سی اعلیٰ درجے کی سواری ہے۔ جس کے لیے گھر میں سب کی ڈانٹ سنی جائے

انھوں نے خود ہی سیکل کا خیال چھوڑ دیا تھا ورنہ گھر میں ایک چھوڑ دو دو سیکلیں رکھی ہوئی تھیں۔ لیکن اب اسکول میں روزانہ دوستوں کی باتیں سُن سُن کر ان کا ارادہ پھر بدل گیا۔ انھوں نے سوچا اسکول کے سبھی لڑکے سیکلوں پر آتے جاتے ہیں۔ لڑکیاں تک سیکل چلاتی ہیں اور بڑے مزے سے بھرے بازاروں میں سے بھی بلا کسی ایکسی ڈنٹ کے گذر جاتی ہیں۔ بلکہ بعض لڑکے تو ایک سیکل پر دو دو بیٹھ کر آتے ہیں اور انھیں کچھ نہیں ہوتا۔ پھر انھوں نے یہ بھی سوچا اسکول میں سالانہ جلسے کے موقع پر کتنے ہی لڑکے سیکل کی تیز دوڑ اور سُست چلانے کے مقابلوں میں حصّہ لے کر انعامات لیتے ہیں۔ آخر وہ ان سب سے کیوں محروم رہیں۔ کب تک بسوں اور رکشاؤں کے پابند بنے رہیں۔ کیوں نہ سیکل چلانا سیکھ لیں۔ جب چاہا جہاں جی چاہا چلے گیے۔ نہ کوئی کرایہ نہ کوئی پٹرول کا خرچ۔ اب قربان میاں کو سیکل میں فائدے ہی فائدے نظر آنے لگے۔ انھیں کوفت بھی ہوئی کہ خواہ مخواہ اتنے دنوں تک اپنی بے وقوفی سے انھوں نے سیکل

چلانا تک نہیں سیکھا ——— انھوں نے طے کرلیا کہ وہ روزانہ اپنے دوست اظہار کے گھر جائیں گے اور ان کی سیکل لے کر صبح سویرے اسکول ہی کے میدان میں سیکل سیکھیں گے نہ کوئی دیکھے گا اور نہ گھر پر اطلاع ہوگی۔لیکن خود اظہار نے انکار کر دیا اور کہا میاں کون تمھارے ابا کی ڈانٹ سُننے گا۔تمھیں تو وہ چھوڑ دیں گے لیکن میری گت بن جائے گی۔نا بابا میں نہ اپنی سیکل تمھیں دوں گا اور نہ ہی سیکل چلانا سکھاؤں گا۔تم کوئی اور تدبیر سوچو۔ قربان میاں کرایے کی سیکل لینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ سیکلوں کی دوکان گھر کے بازو میں تھی اور خطرہ تھا کہ فوراً گھر والوں کو اطلاع مل جائے گی۔ لیکن انھوں نے ایک راستہ ڈھونڈ ہی لیا۔ اُن کے ایک دوست رضوی کو سیکل چلانے کا بڑا شوق تھا۔ لیکن سیکل اس کے پاس تھی نہیں۔ بس انھوں نے اُسے پکڑا۔ رضوی کے نام پر سیکل لی جاتی اور قربان میاں اسکول میں ان کا انتظار کرتے۔ یہ ایک آدھ گھنٹہ سیکل چلانا سیکھتے اور پھر رضوی ہی سیکل لے جاکر واپس کر دیتے۔ چار چھ دن تک یہ سلسلہ رہا

اور قربان میاں نے اعلان کر دیا کہ اب اُن کے جیسی سیکل کوئی اور چلا نہیں سکتا۔ ان چار چھ دنوں میں قربان میاں کے کئی چوٹیں لگیں۔ پنڈلی پہ زخم آیا۔ ایک دن تو دونوں گھٹنے بھی پھوٹ گیے۔ لیکن گھر جاکر انھوں نے بہانہ بنادیا کہ وہ فٹ بال کھیلتے میں گر گیے تھے۔ رضوی تو چاہتے تھے کہ قربان میاں اور ایک آدھ ہفتہ مشق کریں لیکن قربان میاں نے بس طے کر لیا تو طے کر لیا اور کہا نہیں جی اب مشق کی کیا ضرورت ہے۔اب تو میں دونوں ہاتھ چھوڑ کر بھی سیکل چلا سکتا ہوں"۔ رضوی نے کہا تمھاری مرضی لیکن ابھی سڑکوں پر سیکل نہ چلانا کوئی بچّا دچّا بیچ میں آگیا تو مفت میں پٹ جاؤ گے۔ قربان میاں بولے بس بس زیادہ شیخی نہ جتاؤ۔ جتنی سیکل چلانی تم نے سکھائی ہے اتنی تو میں خود جانتا تھا۔ تم کو تو میں نے اس لیے پکڑا تھا کہ میں کرایے کی سیکل اپنے نام پر لے نہیں سکتا تھا ——— اب کل ہی دیکھو میں اختر بھائی کی سیکل پر بیٹھ کر کس مزے سے اسکول آتا ہوں ——— رضوی نے کہا۔ اتنا جوش نہ دکھلاؤ۔ اختر بھائی

کی سیکل کو ہاتھ بھی لگایا تو وہ پٹائی ہوگی کہ
عمر بھر یاد رکھوگے۔ پہلے ذرا امّی سے تو کہہ
کر دیکھو کہ تم سیکل پر بیٹھ کر گھر سے نکلنے والے
ہو۔ شاید گھر سے باہر بھی نہ نکلنے پاؤ ——
—— لیکن اب قربان میاں تصفیہ کر چکے تھے کہ
چاہے دنیا اِدھر کی اُدھر ہو جائے وہ گھر
سے سیکل پر ہی سوار ہو کر نکلیں گے۔
اور بڑی سڑک پر سے ہو کر اسکول آئیں گے
تاکہ سب لوگ انھیں سیکل چلاتا دیکھ لیں۔ انھیں
صرف ایک فکر تھی کہ ابّا میاں گھر سے جلدی
چلے جائیں تو راستہ صاف ہے اور اتفاق بھی
کچھ ایسا ہوا کہ دوسرے دن ان کے ابّا ناشتہ
کرنے کے بعد ہی باہر چلے گیے اور اختر
بھائی تو دو دن سے تھے ہی نہیں۔ وہ اپنے
کسی دوست کی شادی میں بھوپال گیے ہوئے
تھے۔ بڑے بھیّا سے کوئی خطرہ تھا نہیں کیونکہ
بڑے بھیّا کو معلوم ہی نہیں ہوتا تھا کہ گھر
میں کون کیا کر رہا ہے۔ رہے چچا جان تو وہ
بھلے اور ان کا ڈارک روم بھلا۔ وہ ناشتہ
بھی ڈارک روم میں کرتے تھے۔ قربان میاں
نے ابّا کو جاتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ ۹

بچے صاف ستھرے کپڑے پہن کر تیار ہو گیے۔
کتابوں کا بستہ سنبھالا۔ اور امّی کو خدا حافظ
کہہ کر گھر سے نکل آئے۔ دالان میں اختر بھائی
کی سیکل رکھی تھی۔ بستہ انھوں نے ہنڈل
میں لٹکایا۔ سیکل کو چاروں طرف سے ٹھوک
بجا کر دیکھا۔ چین کا معائنہ کیا۔ ہنڈل کو دیکھا
کہ سیٹ کی سیدھ میں ہے یا نہیں۔ بریک
دبا کر دیکھا کہ ٹھیک سے لگتا ہے یا نہیں۔
دونوں پہیوں کا باری باری جائزہ لیا کہ
ہوا کافی ہے یا نہیں۔ جب پوری طرح اطمینان
ہو گیا تو پیڈل پر بایاں پاؤں رکھا جب سیکل
دو قدم آگے بڑھ گئی تو قربان میاں نے اپنا
سیدھا پاؤں پیچھے کی طرف ہوا میں لہرایا کہ اب
مزے سے سیٹ پر سوار ہو جائیں گے اور
سیکل چل پڑے گی لیکن ان کا پاؤں دالان
کے کھمبے ہی سے ٹکرا گیا اور قربان میاں سیکل
سمیت زمین پر آ رہے۔ بستہ دور جا گرا وہ تو
اچھا ہوا کہ امّی دروازہ بند کر کے باورچی خانے
میں چلی گئی تھیں ورنہ ان کے گرنے کی آواز
سن کر باہر آ جاتیں۔ قربان میاں نے جلدی جلدی
کتابیں سمیٹیں۔ بستہ پھر سے جمایا اور ہنڈل

سے لٹکایا اپنے کپڑے جھٹکے اور سیکل ہاتھ ہی میں لے کر سڑک پر آ گیے۔ بڑی سڑک پر آنے کے لیے انھیں مڑنا پڑتا تھا۔ پہلے تو انھوں نے سوچا بڑی سڑک پر مڑنے کے بعد ہی سیکل پر بیٹھیں گے لیکن پھر ارادہ بدل دیا اور سیکل پر سوار ہو گیے۔ لیکن ہنڈل میں بستہ لٹکنے کی وجہ سے اِن کا بیلنس خراب ہو رہا تھا۔ اب جو انھیں مڑنا پڑا تو اور بھی بیلنس بگڑ گیا۔ وہ بالکل گڑبڑا گیے اور سامنے سے جو صاحب شیروانی ٹوپی پہنے چلے آرہے تھے ان سے اس طرح ٹکرائے کہ وہ صاحب نیچے، ان کے اوپر سیکل اور سیکل کے اوپر قربان میاں۔

قربان میاں ابھی سمجھنے بھی نہ پائے تھے کہ کیا واقعہ ہوا کہ سیکل کے نیچے سے آواز آئی۔ ارے نالائق کس نے تم سے کہا کہ سیکل پر سوار ہو۔

قربان میاں نے دیکھا کہ سیکل جن سے ٹکرائی تھی وہ ان کے ابا میاں ہی تھے۔ جو معلوم نہیں کیوں اس وقت گھر واپس ہو رہے تھے۔

اس واقعہ کے بعد تین دن تک قربان میاں اسکول نہیں جا سکے۔

اپنی زمیں

جناب عبدالرحیم نشتر

مجھے چاند تاروں کی چاہت نہیں ہے
مجھے آسماں کی ضرورت نہیں ہے
مجھے اپنی دھرتی سے بڑھ کر جہاں میں
کسی اور شے سے محبّت نہیں ہے

اسی آب و گِل سے بنا جسم میرا
یہی آب ہے خون کی طرح تن میں
یہیں کی ہواؤں میں دم لے رہا ہوں
یہی خاک شامل ہے میرے بدن میں

اسی آب و گِل سے ہے میرا تعلق
اسی آب و گِل کے فسانے لکھوں گا
تمھیں آسمانوں کے قصّے مبارک
میں اپنی زمیں کے ترانے لکھوں گا

جناب ندا فاضلی

ڈاکٹر اقبال اور بچّے

پھول، صبح اور بچّے فطرت کے تین سندر روپ ہیں۔ فطرت جب مسکراتی ہے تو پھول ہو جاتی ہے۔ جاگتی ہے تو صبح بن جاتی ہے اور بولنا چاہتی ہے تو بچّے کا روپ دھار لیتی ہے۔

نہرو جی کا گلاب، ابوالکلام آزاد کی صبح اور مجاز لکھنوی کی ننھی پجارن جس پر انھوں نے ایک پیاری سی نظم لکھی ہے، ہمارے دیس کی جیتی جاگتی مثالیں ہیں۔

نہرو جی کے گلاب، ابوالکلام آزاد کی صبح اور مجاز لکھنوی کی ننھی منّی پجارن اور اس کے گڑیا گھر کی کہانی پھر کبھی سنائیں گے، اس وقت تو ہم صرف مشہور شاعر اقبال اور بچّوں کے لیے لکھی ہوئی ان کی پیاری پیاری نظموں کی باتیں کریں گے۔ اقبال اُردو کے بہت بڑے شاعر تھے۔

وہ سیالکوٹ نام کے شہر میں ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ ہندوستان میں اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد یورپ گیے اور وہاں کی یونیورسٹیوں سے پی۔ ایچ۔ ڈی۔ اور بیرسٹری کی ڈگری لی۔

یورپ سے واپسی پر گورنمنٹ کالج لاہور میں پروفیسر ہو گیے۔ پھر بیرسٹری شروع کر دی۔ پر اس کام میں ان کا جی نہ لگتا تھا۔ وہ تو بہت بڑے عالم تھے۔ بہت بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعری کی ان کی زندگی میں یورپ اور ایشیا میں دھوم تھی۔

ڈاکٹر اقبال بچّوں سے بھی بہت پیار کرتے تھے۔ اس کا ثبوت ان کی وہ بہت ساری نظمیں ہیں جو انھوں نے خاص طور سے بچّوں کے لیے لکھی ہیں۔ ہر ملک کے بچّے اپنی قوم کا مستقبل ہوتے ہیں۔ شور کرتی اِسکول کی جماعتوں، آنکھ مچولی کھیلتی جگہوں اور کٹی ہوئی پتنگوں پر غل مچاتی چھتوں میں ہی بھولے بھالے نہرو، چھوٹے موٹے ابوالکلام آزاد اور ننھے منّے ڈاکٹر اقبال چھپے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر اقبال کا دل دیس کے پیار اور قوم کے درد سے بھرا تھا۔ وہ ہندوستانی بچّوں میں اپنے خوابوں کی تعبیر دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ صرف بچّوں کے شاعر ہی نہیں بچّوں کے پیارے استاد بھی ہیں۔ ان کی نظمیں قہقہوں سے بھرپور ہونے کے ساتھ سبق آموز بھی ہیں۔ انھوں نے بچّوں کے لیے بہت سی

نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو بڑی میٹھی میٹھی کہانیاں سناتی ہیں۔ جیسے "مکڑا اور مکھی" "ہمدردی" اور "گائے اور بکری" وغیرہ۔

"مکڑا اور مکھی" میں مکڑا بہت بھوکا ہوتا ہے۔ مکھی کو دیکھ کر اس کا جی للچا جاتا ہے۔ وہ اُسے اپنے گھر بلاتا ہے مگر بی مکھی اُس کی چالوں سے واقف ہوتی ہیں اور مکڑے کو ٹکا سا جواب دیتی ہیں۔

اس جال میں مکھی کبھی آنے کی نہیں ہے۔

مکڑے کو فوراً ایک ترکیب سوجھتی ہے۔ بی مکھی کی جھوٹی جھوٹی تعریف کرنا شروع کر دیتا ہے۔ اپنی تعریف بھلا کس کو بری لگتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے مکھی بی کپا ہو جاتی ہیں اور جھٹ سے بھن بھن کرتی مکڑے کے دروازے پر جا پہنچتی ہیں۔ مکڑا تو اسی تاک میں تھا جیسے ہی قریب آئیں بے چاری کو اپنا نوالا بنایا۔

سو کام خوشامد سے نکلتے ہیں جہاں میں
دیکھو جسے دنیا میں خوشامد کا ہے بندا

اسی طرح دوسری نظم "ہمدردی" میں ایک بے چارہ بلبل اندھیرے میں کسی اکیلی ٹہنی پر اداس بیٹھا تھا۔ گھور اندھیرا..... گھر کا راستہ نہیں سجھائی دیتا تھا۔ اتنے میں جگنو میاں جلر جلر کرتے ادھر آ نکلے۔ انھوں نے بلبل کو دیکھا تو ترس آ گیا۔ وہ فوراً بلبل کے آگے اُڑ اُڑ کر اس کو گھونسلے کا راستہ دکھانے لگے۔ بلبل نے اپنے گھونسلے میں پہنچ کر چین کا سانس لیا اور جگنو میاں کو دعائیں دیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

ڈاکٹر اقبال کی اس قسم کی نظموں میں "بچے کی دعا" سب سے اچھی نظم ہے۔ اس میں اور نظموں کی طرح کوئی کہانی تو نہیں مگر اُن تمام اچھی باتوں کا ذکر ہے جو سچ مچ اچھا بچہ بننے کے لیے ضروری ہیں۔ اس نظم کو بہت سے اسکولوں میں بچے صبح کو ترانے میں گاتے ہیں۔ شاید آپ کو بھی یاد ہو۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری
دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے

ڈاکٹر اقبال صرف سننے ہنسانے کے لیے شعر نہیں کہتے تھے۔ ان کے ہر لفظ، ہر جملے، اور ہر شعر میں کوئی سیکھ، کوئی سبق، کوئی مقصد ہوتا ہے۔ یہ نظمیں کسی ایک مذہب اور ذات کے بچوں کے لیے نہیں ... یہ سب کے لیے ہیں۔ یہ رام کے لیے بھی ہیں، خالد کے لیے بھی ہیں۔ ومِلا بھی ان کو چارپائی پر لیٹ کر گاتی ہے اور مریم بھی گڑیا کو کپڑے پہناتے وقت ان کو گنگناتی ہے۔

جناب شمس کنول

سچے بہادر

ہماری آپ کی یہ دنیا پہلے بہت چھوٹی سی تھی۔
بہت ہی چھوٹی سی۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ایک بستی کے لوگ دوسری بستی کے لوگوں کو جانتے تک نہ تھے۔ لیکن کچھ بہادر انسان اپنی بستی سے باہر نکلے۔ اپنی بستی سے دوسری بستی میں اور اپنے ملک سے دوسرے ملک میں پہنچے۔

ان دنوں جب یہ دنیا نئی نئی بنی تھی، نہ موٹر تھی نہ ریل، نہ ہوائی جہاز تھا نہ پانی کا جہاز۔ حد تو یہ ہے کہ سائیکل تک نہ تھی۔ سوچیے تو ان دنوں سفر کتنا مشکل ہوگا۔ دھوپ اور بارش کا سامنا، تپتے ہوئے ریگستان اور گھنے جنگل میں سے ہو کر گذرنا اور دریا اور سمندر کو پار کرنا کوئی آسان بات تھی؟

لیکن انسان شروع ہی سے قدرتی رکاوٹوں کو دور کرتا آیا ہے اور لاکھوں مصیبتیں اٹھانے اور ہزاروں مشکلیں سہنے کے بعد وہ اپنے لیے راستہ بنانے میں کامیاب بھی ہوا ہے — ان جانی جگہوں کو کھوجنے کے لیے اس نے گرم ریت

سمندر کے طوفانی پانی اور ٹھنڈے برف پر مہینوں اور برسوں سفر کیا ہے، وہ ہواؤں میں اڑا ہے اور اس نے آسمان کی بھی یاترا کی ہے۔ یہ ہمارے بہادر بزرگوں ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم کو یہ دنیا

اتنی سہانی، اتنی خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔

تیرھویں صدی عیسوی میں قسطنطنیہ میں پولو نام کا ایک خاندان رہتا تھا۔ اس خاندان کے دو بھائی نکو اور مارفیو تجارت کرتے تھے۔ نکو کا بیٹا مارکو تھا۔ تاریخ میں یہ مارکو پولو کے نام سے مشہور ہے۔

مارکو کو اپنے باپ اور چچا کے ساتھ اکثر تجارتی دوروں پر جانے کا موقع ملا اور اس طرح مارکو کو سفر کرنے کا شوق پیدا ہو گیا۔

جب چین کے شہنشاہ قبلائی خاں نے عیسائی مذہب کی اشاعت کے لیے مارکو کے باپ اور چچا کو چین آنے کی دعوت دی تو مارکو بھی اپنے باپ اور چچا کے ساتھ چین کے سفر پر روانہ ہوا۔ اس وقت مارکو صرف سترہ برس کا تھا۔

اٹلی سے یہ بندرگاہ ہرمز پہنچے، قرمان اور خراسان پار کر کے بلخ پہنچ گئے۔ پھر انہوں نے اوکس دریا کی چڑھائی کی طرف بڑھنا شروع کیا اور داخاں ہوتے ہوئے یہ پامیر کی وادی میں داخل ہوئے۔

پامیر کی وادی کو دنیا کی چھت کہا جاتا ہے اس سے گزرنا جان جوکھم کا کام ہے۔ پامیر کو پار کرنے کے بعد یہ لوگ کاشغر، یارقند اور ختن کے را...

سے نیچے اترے۔ لوپ نور کے قریب سے ہوتے ہوئے یہ اس بھیانک ریگستان میں داخل ہوئے جس کو گوبی کا ریگستان کہتے ہیں۔ اس ریگستان سے گزرتے ہوئے ان تینوں مسافروں کو بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

آخر یہ چین کے ضلع تان گت میں پہنچ گئے اور جب یہ چین کے شاہنشاہ قبلائی خاں کی راج دھانی شان گوت میں پہنچے تو ان تینوں مسافروں کو سفر کرتے ہوئے تین برس اور چھ مہینے گزر چکے تھے۔

شہنشاہ چین نے خوش ہو کر ان مسافروں کا کھلے دل سے استقبال کیا۔ شاہی مہمان بنایا۔ کھانے کی دعوت دی اور مارکو کو اپنے دربار میں اعلیٰ منصب بخش دیا۔

دنیا کا سفر کرنے والوں میں مارکو کا بڑا نام ہے۔ اس نے اپنی زندگی میں ساری مشرقی دنیا کا سفر کیا۔ وہ مشرق میں جاپان تک گیا۔ جنوب میں سماترا، انکوبار، انڈمیان اور لنکا تک ...

انسان تھا جس نے ... دو سو برس بعد یعنی آج کا حال ۱۵۰ برس پہلے سوئٹزرلینڈ کی

بندرگاہ جنیوا کے قریب ایک لڑکا بیمار رہتا تھا۔ وہ لڑکا بڑا تیز اور ذہین تھا۔ وہ اس بندرگاہ پر آنے والے ہر جہاز کو بڑے غور سے دیکھتا۔ صبح سے شام تک وہ جہازوں سے اترنے والے مسافروں اور ملاحوں سے ان کے ملک کی باتیں کرتا۔ سمندری سفر کا حال پوچھتا اور یہ بھی جاننے کی کوشش کرتا کہ جہاز کیسے چلتا ہے! آپ جانتے ہیں وہ لڑکا کون تھا؟

اس کا نام کولمبس تھا! بچپن میں کولمبس کو کہیں سے وہ کتاب مل گئی جس میں مارکو پولو نے اپنے سفر کا حال لکھا تھا۔ کولمبس نے اس کتاب کو بڑی دلچسپی سے پڑھا۔

مارکو پولو نے یورپ کے لوگوں میں یہ بات مشہور کر دی تھی کہ پوربی ملکوں میں بہت دولت ہے اور وہاں پہنچ کر خوب دولت کمائی جا سکتی ہے۔ کولمبس [illegible] دنیا کا سفر کرنے، دنیا کے نامعلوم پیدا ہوئی۔ لیکن مشکل یہ تھی دولت کمانے کی خواہش کی طرف آنے کے لیے سمندری راستے [illegible] تھا۔ خشکی کے راستوں پر مسلمان بادشاہوں کی حکومت تھی اور وہ یورپ کے لوگوں کو آگے بڑھنے نہیں

دیتے تھے۔ مگر ان دنوں سمندر کی بھیانک چھاتی پر سفر کرنا آسان بات نہ تھی۔ پر کولمبس یہ سفر کرنے اور اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کے لیے تیار تھا۔

لیکن آپ جانتے ہیں قلم کا سپاہی ہو یا تلوار کا اس کو آگے بڑھنے کے لیے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔

کولمبس کو بھی اپنے سفر کے خرچ کے لیے خاصی دولت کی ضرورت تھی۔ کولمبس نے اپنے دولت مند دوستوں سے مدد چاہی، تاجروں سے امداد کی درخواست کی۔ اپنے وقت کے مذہبی لیڈروں سے بھی اپنے ارادے کا ذکر کیا مگر اس کے ارادے پر کوئی بھی اپنی دولت قربان کرنے پر تیار نہ ہوا۔

آخر کولمبس نے اسپین کے بادشاہ فرڈی نینڈ کے سامنے اپنے منصوبے کا ذکر کیا۔ شاہ اسپین نے اس کی باتوں کو دلچسپی سے ضرور سنا مگر وہ خود ان دنوں ایک دوسرے ملک سے لڑنے میں مصروف تھا اس لیے عملی طور پر وہ کولمبس کے لیے کچھ نہ کر سکا۔ لیکن بادشاہ فرڈی نینڈ کی رانی ایزابیل [illegible]ے سے دلی اتفاق کیا اور وہ [illegible]داشت کرنے کے

لیے تیار ہو گئی۔

لیکن شرط یہ تھی کہ کولمبس اپنے اس سفر میں جو جو ملک دریافت کرے گا ان پر اسپین کا قبضہ رہے گا۔ اور کولمبس اسپین کی حکومت کا نمائندہ بن کر ان نئے ملکوں کا انتظام کرے گا۔ آخر کولمبس کا بیڑا روانہ ہوا۔ اس بیڑے میں تین جہاز تھے سانتا میریا، پنٹا اور نی نا۔

یہاں یہ بات بھی جان لینا ضروری ہے کہ اس وقت تک لوگ زمین کو چپٹا سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا اور بڑا دلچسپ خیال تھا کہ جہاں زمین ختم ہوتی ہے وہاں پہنچ کر جہاز کا زمین سے گر جانا ضروری ہے۔ لیکن کولمبس زمین کو نارنگی کی طرح گول مان چکا تھا اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ جس طرح مشرقی سمت میں چلنے سے ہندوستان تک پہنچ سکتے ہیں اسی طرح پچھم کی طرف چلیں تب بھی ہندوستان پہنچ سکتے ہیں۔

کولمبس کے بیڑے نے ابھی تھوڑا ہی سفر طے کیا تھا کہ کولمبس کے ساتھی اسے پریشان کرنے لگے۔ اصل میں کولمبس کے ساتھی لالچ اور اسپین کی دولت کے دباؤ سے اس سفر پر روانہ ہوئے تھے۔ جیسے جیسے وہ اپنے گھر سے دور ہوتے گئے اور سمندری سفر تکلیف دہ بنتا گیا وہ گھبرا کر کولمبس کو واپس چلنے پر زور دینے لگے۔ کولمبس کے ایک ڈرپوک ساتھی نے تو جہاز کی ایک پتوار تک توڑ دی۔

یہ تو کولمبس ہی کی ہمت تھی کہ وہ اپنے ساتھیوں کی مخالفت برداشت کرتا رہا اور آگے بڑھنے کے لیے ان کی ہمت بڑھاتا رہا۔ اتنا ہی نہیں کولمبس اپنے اس سفر کا حال روزانہ اپنی ڈایری میں لکھتا تھا۔ مگر اس نے ایک دوسری ڈایری بھی بنا رکھی تھی۔ اس میں روزانہ وہ جو کچھ لکھتا وہ اپنے ساتھیوں کو دکھاتا۔ یہ اس کی جھوٹی ڈایری تھی۔ اس جھوٹی ڈایری سے کولمبس کے ساتھی سمجھتے رہے کہ وہ ابھی گھر سے بہت دور نہیں ہیں اور ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔

سمندر کے چوڑے سینے پر مہینوں سفر کرنے کے بعد اچانک ایک رات دور روشنی کی ایک کرن دکھائی دی۔ کولمبس کو یقین تھا کہ وہ روشنی خشکی پر ہے اور وہ کسی بستی کے قریب پہنچ رہے ہیں صبح ہوئی تو کولمبس کے چند ساتھیوں نے بھی مستول پر چڑھ کر دیکھا۔ وہ سب مل کر خوشی سے ناچنے لگے۔ سامنے زمین دکھائی دے رہی تھی!

کولمبس نے اپنا سب سے زیادہ خوبصورت

بھالیں پہنا ہاتھ میں اسپین کا شاہی پرچم لیا اور جہاز سے زمین پر بڑے فخر اور شکر کے ساتھ قدم رکھا۔

اس جزیرے کے انسانوں کا رنگ تانبے کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ وہ اپنی ناک میں سونے کی ایک موٹی بالی پہنتے تھے مگر تھے ننگے۔ کپڑا پہننا نہیں جانتے تھے۔ یہ لوگ اپنے بن بلائے گورے مہمانوں کو دیکھ کر بہت ڈرے اور دور بھاگ گیے۔ کولمبس نے عقل سے کام لیا۔ اس نے ان لوگوں کو ستایا نہیں۔ پیار بھرے اشاروں سے اور محبت بھری مسکراہٹ سے ان کو اپنے نزدیک بلاتا گیا۔ اور ان کے دلوں سے ڈر دور کرتا گیا۔

اس جزیرے کا نام "سین سلوا ڈور" رکھا گیا۔

اس جزیرے کے لوگوں نے کولمبس کو بتایا کہ اس زمین میں سونا بہت ہے۔ کولمبس یہاں کے چند لوگوں کو ساتھ لے کر مغرب کی طرف چلا۔ راستے میں اسے بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ملے۔

کولمبس جب کیوبا نام کے جزیرے میں پہنچا تو اس نے جزیرے کے لوگوں کو تمباکو پیتے دیکھا۔ اس وقت تک تمباکو جیسی چیز سے دنیا کے دوسرے لوگ ناواقف تھے۔ کولمبس اور اس کے ساتھیوں نے بھی تمباکو پی کر دیکھا۔ پہلے تو تمباکو کا دھواں ان کو بُرا لگا مگر دو تین بار پینے کے بعد ان کو مزہ آنے لگا۔ ہیٹی اور ہسپنیولا جزیروں میں جب یہ لوگ پہنچے تو وہاں ان کو کافی سونا ملا۔ یہ جگہ بھی ان کو پسند آئی۔ کولمبس نے اپنے ایک ٹوٹے ہوئے جہاز کے سامان سے وہاں ایک قلعہ بنایا اور اپنی طرف سے چالیس آدمیوں کو اس میں بسا کر ان جزیروں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

۴ر جنوری ۱۴۹۳ء کو کولمبس اپنے وطن کو روانہ ہوا۔

چند ہی دن بعد سمندر میں طوفان آگیا۔ طوفانی لہروں پر کولمبس کا پرانا اور کمزور جہاز بڑی طرح ہچکولے کھانے لگا۔ کولمبس کو یقین ہو چلا کہ اس کا جہاز ڈوب جائے گا۔ وہ اور اس کے ساتھی بھی اس طوفانی سمندر کی نذر ہو جائیں گے اور پھر دنیا کو یہ بتانے والا کوئی نہ ہوگا کہ کون لوگ سمندر کی یاترا کو نکلے تھے اور انہوں نے کون کون سے ملک یا جزیرے دریافت کیے۔

کولمبس بہادر بھی تھا اور عقل والا بھی۔ اس نے فوراً چمڑے کے ایک بڑے ٹکڑے پر اپنے سفر کا حال لکھا۔ اس چمڑے کو کپڑے میں لپیٹ کر اس کو موم سے مڑھ دیا اور پھر اسے لکڑی کی نلی میں رکھ کر

سمندر میں پھینک دیا۔ چمڑے کی اس چٹھی میں کولمبس نے
یہ بھی لکھا تھا کہ جس کسی کو یہ خط ملے وہ اسے اسپین کے
شہنشاہ یا اس کی رانی تک پہنچا دے۔
مگر باہمت لوگوں کی مدد قدرت کرتی ہے طوفان
رک گیا۔ سمندر پُرسکون ہوگیا۔ کولمبس کا جہاز ڈوبنے
سے بچ گیا۔ اور جب کولمبس کا جہاز واپس اسپین کے
بندرگاہ پالوز سے جا لگا تو کولمبس اپنے سفر کی ساری
پریشانیوں کو بھول گیا۔
اسپین کے شہنشاہ اور رانی ایزابیل نے
بڑے جوش اور بڑی محبت سے کولمبس کا استقبال
کیا۔ سچے بہادروں کے سامنے شاہی تاج بھی جھک
جاتے ہیں۔ اسپین کے شہنشاہ نے کولمبس کو ایک
اونچا عہدہ دے کر اپنے دربار کا ایک باعزت درباری بنا لیا۔
پر کولمبس سے ایک بھول بھی ہوئی!
اس نے جن جزیروں کو دریافت کیا ان کو ایشیا
ہی کا ایک حصہ سمجھا۔ اور مرتے دم تک یہی سمجھتا رہا کہ
اس نے ہندوستان اور چین پہنچنے کا راستہ ڈھونڈھ
نکالا ہے اس لیے آج بھی ان جزیروں کے رہنے
والوں کو ریڈ انڈین اور ان جزیروں کو ویسٹ انڈیز
کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ان جزیروں کا تعلق
امریکہ سے تھا اور امریکہ اس وقت تک دنیا کے
دوسرے لوگوں کے لیے ایک نامعلوم ملک تھا۔
کچھ دنوں کے بعد کولمبس پھر سمندری سفر کے
لیے روانہ ہوا۔ اس بار اس کے بیڑے میں سترہ جہاز
تھے اور اس کے ساتھیوں کی تعداد پندرہ سو تھی۔
اس کے سفر کا رُخ مغرب کی طرف تھا۔ ہوا بھی ان کے
جہازوں کے حق میں تھی۔ وہ جمائیکا نام کے جزیرے
میں پہنچا اور ہے ٹی میں داخل ہوا۔ ہے ٹی میں اس
نے نیا قلعہ بنوایا اور پھر اسپین واپس آگیا۔
اس کے بعد کولمبس نے دوبارہ اور سفر کیا
اور ٹرینی ڈاڈ اور نی کو کی اور جنوبی امریکہ کا شمالی
ساحل کھوج نکالا۔ وہ جنوبی امریکہ کو بھی پہلے محض
ایک جزیرہ ہی سمجھتا تھا مگر بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ
امریکہ ایک جزیرہ ہو سکتا ہے مگر یہ جزیرہ ہے بہت بڑا
دولت اور طاقت جب آتی ہے تو اپنے ساتھ
تھوڑا غرور بھی لاتی ہے اور غرور انسانی زندگی کا
توازن بگاڑ دیتا ہے۔
تیسرے سفر کے دوران میں کولمبس کے
ہم سفر دوستوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کے ساتھ
کولمبس ویسے اچھے برتاؤ سے پیش نہیں آتا جیسے وہ
پہلے پیش آیا کرتا تھا۔ چنانچہ کولمبس کے چند دوست
کولمبس کے دشمن بن گئے۔ واپسی پر انہوں نے ایک

۔۔۔ جا نور رانی کے کان بھرے۔ بات یہاں تک بگڑی کہ اسپین کی حکومت کی طرف سے ان نئے جزیروں کے لیے ایک دوسرے افسر کو گورنر بنا دیا گیا۔ اور کولمبس کو قید کر لیا گیا —— مگر بعد میں اسپین کی رانی نے کولمبس کی زندگی بھر کی قربانیوں اور کارناموں کا خیال کر کے کولمبس کو معاف کر دیا۔

۱۵۰۲ء میں کولمبس کو سمندری سفر کے لیے پھر بھیجا گیا۔ یہ اس کی زندگی کا چوتھا سمندری سفر تھا اس بار وہ پہلے جزیروں سے گذرتا ہوا میکسی کو کی خلیج میں پہنچا۔ پھر ڈے ری ین تک چلا گیا اور آخر وہ کیوبا ہوتا ہوا اسپین لوٹ آیا۔

کچھ دن بعد اسپین کی رانی ایزابیل کا انتقال ہو گیا۔

ایزابیل کو کولمبس سے سچی ہمدردی تھی۔ وہ ہی کولمبس کی خوبیوں کی قدر کرتی تھی۔

آخر زندگی بھر سمندر کی طوفانی موجوں سے جنگ کرنے والے بہادر اور کامران کولمبس کو ۱۵۰۶ء میں موت کی نیند آ گئی۔

جناب وقار خلیل

موذی مکھّی

بیماری کی کان ہے مکھّی
لیتی سب کی جان ہے مکھّی

مکھّی کو بھولی مت جانو
سدا جان کی دشمن مانو

گندی جگہ پہ بیٹھی رہتی
پھر کھانوں پر آکر گرتی

جو بھی ایسا کھانا کھائے
بیماری میں وہ پھنس جائے

ہیضہ پھیلاتی ہے مکھّی
تپِ دق کو بھی لاتی مکھّی

گھر کو صاف اور ستھرا رکھو
کوڑا کرکٹ باہر پھینکو!

بچّو! اس سے سدا بچو تم!
اور ہمیشہ دُور رہو تم
کر دیتی ہے ناس یہ جیون
موذی مکھّی، جان کی دشمن

بہت دنوں کی بات ہے سکھ داس پور گاؤں سے ڈو میل دور ایک چوڑے میدان کو پار کرنے کے بعد ترائی کے جنگل کے اس حصے میں جسے مصطفےٰ رنج کہتے ہیں شیروں کا ایک جھتّا رہتا تھا۔ شاید آپ کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ جس طرح انسان اپنے خاندان کے ساتھ رہتا ہے بالکل اسی طرح شیر بھی اپنے دس بارہ ساتھیوں کے ساتھ ایک جھتے میں رہتا ہے۔ لیکن انسان کے خاندان اور جانوروں کے خاندان کے دستور الگ الگ ہوتے ہیں۔

ہاں تو شیروں کے اس جھتے میں ایک جوڑا بھی تھا۔ ایک شیر اور ایک شیرنی۔ دونوں میں آپس میں بڑا میل ملاپ تھا۔ ان کے ڈو ننھے منے بچے بھی تھے۔ بالکل تمھاری طرح۔ مگر شیروں کے خاندان کے دستور کے مطابق ان ننھے منے بچوں کی پیدائش کے وقت بے چارے شیر اور شیرنی کو اپنے خاندان سے الگ ہونا پڑا تھا۔ انسانی رہ گزر سے کوسوں دور گھنی سبز اور

شاداب جھاڑیوں سے گھری ہوئی تر زمین پر
نازک نرکل بچھاکر شیر اور شیرنی نے تھوڑی سی
جگہ بنالی تھی اور اس ٹھنڈے اور روشنی سے
محفوظ گھر میں شیرنی نے بچے دیے تھے۔

بچوں کی پیدایش کے بعد بے چارے شیر
پر خوراک حاصل کرنے کی ذمہ داری اور زیادہ
بڑھ گئی۔ اب اسے نہ صرف اپنے پیٹ کی فکر رہتی
بلکہ شیرنی اور اپنے دونوں بچوں کے لیے بھی غذا
کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ شیرنی تو اپنے بچوں کی
حفاظت کے لیے گھر ہی رہتی تھی اور شیر شکار
کی تلاش میں جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا

خوراک کی تلاش میں شام کے سائے پھیلتے
ہی نکل جانا پڑتا تھا۔ اور بدقسمتی سے جب کسی
دن شیر کے ہاتھ شکار نہ لگتا تو وہ تھکن سے چور
مایوسی سے منہ لٹکائے واپس آتا۔ اُس دن شیرنی
شیر کو خالی ہاتھ واپس آتا دیکھ کر دور ہی سے
دہاڑنا شروع کردیتی۔ اور اس کے بدن پر
اپنے پنجے اور دانت مار کر اپنی خفگی کا اظہار
کرتی۔ بے چارہ شیر شرمندگی سے اپنا سر جھکائے
سب کچھ برداشت کرتا۔

لیکن جیسے ہی اس کے چھوٹے چھوٹے بچے
اس کی طرف لپکتے اور اس کی گردن پر چڑھ کر اچھلنے
کودنے لگتے تو وہ اپنی دن بھر کی تھکن اور شیرنی
کی ساری ناراضگی بھول کر اپنے بچوں کے ساتھ
کھیلنے لگ جاتا — اور جب وہ ان کو پیار
سے چاٹنے لگتا تب شیرنی کی آنکھوں میں بھی ممتا
جاگ اٹھتی۔ اور وہ ایک طرف بیٹھ کر اپنے
بچوں کو باپ کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھتی رہتی۔

ایک دن شیر صبح ہی صبح خوراک کی تلاش
میں روانہ ہوگیا — وہ ایک دریا کنارے
درخت اور جھاڑیوں میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ اس
امید پر کہ کوئی ہرن یا سانبھر پانی پینے آئے
تو اس پر اچانک حملہ کرکے خوراک کا بندوبست
کر سکے۔

سورج آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہا تھا۔
شیر کو جھاڑی میں بیٹھے بیٹھے بہت دیر ہوگئی۔ ہوا
میں گرمی بڑھتی جا رہی تھی اور بے چارا شیر دریا
کی طرف ٹکٹکی لگائے چپ چاپ بت کی طرح
بیٹھا تھا۔ اچانک اسے اپنے سے قریب کسی کے
قدموں کی آہٹ محسوس ہوئی۔ شیر نے چونک
کر چاروں طرف دیکھا مگر کوئی نظر نہ آیا۔ شیر
سوچ کر چپ ہو رہا کہ کوئی پرندہ ہوگا۔ پھر تھا

تھک کر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر گزر جانے کے بعد پھر کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ اب تو شیر کے بدن کے سارے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے اپنے کان کھڑے کر لیے اور آنے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ شیر اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ آواز کی سمت روانہ ہوا۔

تمام زمین بہت جھڑے کے سوکھے پتوں سے بچھی پڑی تھی۔ لیکن کیا مجال کہ شیر کا پیر غلط پڑ جائے۔ وہ بغیر ایک پتے کو بھی چرچرائے یا کھس کھسائے چل رہا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ بلی کی طرح شیر کے پنجوں میں بھی قدرت نے گدّی لگا دی ہے۔ کسی پر حملہ کرنے سے پہلے وہ بھی اپنے ناخنوں کو سمیٹ کر گدّی کے اندر کر لیتا ہے اور جب وہ حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھتا ہے تو گدّی

کی وجہ سے اس کے پیروں کی کوئی آواز نہیں ہوتی۔

غرض شیر نے غور سے آواز کی سمت دیکھا اسے وہاں ایک پانچ سال کا تمھاری طرح

کا ایک بچہ نظر آیا۔ جو جھاڑیوں کے اِدھر اُدھر تتلیوں
کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ شیر دبے قدموں آہستہ آہستہ
منے کی طرف بڑھا اور ایک ہی جست میں اس کے
قریب پہنچ گیا۔

اچھا بتایئے پھر آگے کیا ہوا؟

کیا کہا۔ شیر نے لڑکے پر جھپٹا مار کر اُسے
مار ڈالا؟

نہیں، نہیں! شیر ایسا ظالم جانور نہیں ہے۔
وہ کسی انسان پر کبھی جان بوجھ کر حملہ نہیں کرتا۔ اور
خاص طور سے وہ انسان کے بچوں کو تو کبھی نہیں
چھیڑتا۔ ہاں اگر تم اسے چھیڑو تو اُسے بھی غصہ
آ جاتا ہے۔ مگر ویسے شیر اس وقت تک کسی
انسان پر حملہ نہیں کرتا جب تک کہ وہ بہت
زیادہ بھوکا نہ ہو یا اسے اپنی جان جانے کا خطرہ
نہ ہو۔

جب شیر مُنّے کے قریب پہنچا تو مُنّے نے
مڑ کر شیر کو دیکھا اور فوراً اس کے پاس جا کر اس
کی گردن کے لمبے لمبے بالوں کو (جسے ایال کہتے
ہیں) پکڑ کر کھیلنے لگا ـــ شیر کو اس سے بڑی
راحت اور سکون سا محسوس ہوا۔ اس نے آرام
سے اپنی گردن زمین پر ڈال کر اپنی آنکھیں بند
کر لیں۔ اب تو مُنّے میاں اس کی گردن پر چڑھ کر
لگے اچھلنے کودنے۔ مگر شیر اسی اطمینان اور
سکون سے بیٹھا رہا۔ جب اچھل کود سے مُنّے
میاں کا جی بھر گیا تو وہ بھی شیر کی پیٹھ سے اتر
کر اس کے قریب ہی ہری ہری گھاس پر لیٹ گئے۔
کچھ دیر بعد شیر اٹھا اور اپنی اسی جگہ واپس
چلا گیا ـــ

اب سورج مغرب کی طرف ڈھلنے لگا تھا۔
شام کے سائے بڑھتے چلے آ رہے تھے۔ شیر کو اب
تک کوئی شکار ہاتھ نہ لگا تھا۔ شکار کی طرف
سے مایوس ہو کر شیر دوبارہ اُسی طرف آیا جہاں
مُنّے میاں بڑی معصومیت سے ہری ہری گھاس
پر پڑے سو رہے تھے۔ اس نے غور سے انھیں
دیکھا۔ ان کے گرد تین چکر لگائے اور پھر انھیں
پیار سے چاٹنے لگا۔ اس سے مُنّے میاں کی آنکھ
کھل گئی اور وہ اٹھ کر بیٹھ گئے۔ شیر اپنے گھر
جانے کے لیے مڑا تو مُنّے میاں بھی اس کے پیچھے
ہو لیے ـــ

آگے آگے شیر جا رہا تھا اور اس کے پیچھے
پیچھے مُنّے میاں بھی چلے جا رہے تھے۔ جیسے ہی
کا گھر قریب آیا۔ شیر ایک جست لگا کر گھر میں د

ہو گیا۔ منّے میاں پیچھے رہ گئے تھے۔ مگر انھوں نے
دور ہی سے شیر کا گھر دیکھ لیا تھا۔

جیسا کہ ہم نے آپ کو بتایا شیر کبھی انسان
پر حملہ نہیں کرتا۔ لیکن جب اسے دو یا تین دن تک
کوئی شکار نہیں ملتا تو مجبوراً انسان کو بھی اپنا
شکار بنا لیتا ہے۔ یہ خاصیت شیر سے زیادہ شیرنی
میں ہوتی ہے۔ کیونکہ بچّے والی شیرنی بہت زیادہ
غضبناک ہو جاتی ہے وہ اپنے بچّوں کے قریب
کسی کو بھی پھٹکنے نہیں دیتی چاہے کوئی انسان
ہو یا کوئی اور جانور۔

اب سنیے آگے کیا ہوا۔ جیسے ہی منّے میاں
آگے بڑھ کر شیر کے گھر سے قریب ایک جھاڑی کی
آڑ میں پہنچے ویسے ہی شیرنی نے ایک نئی بو محسوس
کر کے گھبرا کر شیر کی طرف دیکھا۔ لیکن شیر نے
کوئی نئی بو محسوس نہیں کی وہ اسی اطمینان سے
بیٹھا رہا۔ اتنے میں تیز ہوا کا ایک جھونکا آیا۔
اب شیر نے بھی اس بو کو محسوس کر لیا۔ شیرنی تو
پہلے ہی سے پریشان تھی اب تو ایک دم پریشان
ہو کر بو کی طرف جھپٹی مگر اس سے پہلے ہی شیر نے
بھی جست لگائی اور ناراض شیرنی کو اپنے پہلو
سے ڈھکیلتا ہوا ہٹائے گیا۔ منّے میاں کھڑے
یہ تماشہ دیکھ رہے تھے۔ لیکن جیسے ہی ان کی نظر
شیر کے چھوٹے چھوٹے بچوں پر پڑی وہ ان کی
طرف لپکے۔ شیرنی پھر پریشان ہونے لگی لیکن
شیر کی ایک ہلکی سی غزاہٹ سے وہ کچھ سمجھ کر
خاموش ہو رہی۔ اب جیسے ہی منّے میاں کو
شیرنی کے بچّوں نے دیکھا تو وہ دونوں ان کی
طرف لپکے اور تینوں بچّے مل کر ساتھ ساتھ
کھیلنے لگے۔

جتنی خوشی منّے میاں کو شیر کے چھوٹے
چھوٹے بچّے پا کر ہو رہی تھی اس سے کہیں
زیادہ خوشی دونوں بچّوں کو ایک عجیب
ساتھی پا کر ہو رہی تھی۔ تینوں بچّے خوش
خوش اِدھر سے اُدھر لوٹ لگانے لگے۔
اور اُچھلنے کودنے لگے — تینوں بچّوں کو
اس طرح خوشی سے کھیلتا ہوا دیکھ کر شیرنی
بھی خاموشی سے شیر کے قریب ہی بیٹھ گئی۔
مگر اب اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں غصّہ
کی جگہ ماتا چمک رہی تھی —

*

جناب حافظ باقوی رانچوی

بیر بہوٹی

پیاری پیاری بیر بہوٹی
مخمل جیسی بیر بہوٹی

نازک، سندر، نرم، گلابی
ہریالی کے نازک پالی

اُف کتنی مستانی ہے تو
برکھا رت کی رانی ہے تو

دھیمی دھیمی چال ہے تیری
اوڑھنی کتنی لال ہے تیری

ہاتھ میں تجھ کو جب لیتا ہوں
پیار سے حرکت جب دیتا ہوں

سمٹ کے تکمہ بن جاتی ہے
مجھ سے بے حد شرماتی ہے

میری سُندر بیر بہوٹی
ننھی منوہر بیر بہوٹی

کیا یہ سچ مچ ہے شرمانا
یا مرنے کا ڈھونگ رچانا

مجھ سے ہرگز خوف نہ کھا تو
مرنے کا مت ڈھونگ رچا تو

کوئی دُکھ میں تجھ کو نہ دوں گا
ہاتھ میں لے کر پیار کروں گا

پھر تجھ کو لے جاؤں گا میں
سبزے میں چھوڑ آؤں گا میں

جناب فرحت قمر ہاشمی

عقل بچوں میں بھی ہوتی ہے

ہر بچے کو خدا نے عقل دی ہے لیکن بچے کی عقل فطرت کے سیدھے راستے پر چلتی ہے۔ زندگی کے تجربے اور حالات بڑی عمر کے آدمی کو ڈپلومیٹ بنا دیتے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر بہت سی باتیں غلط کہتے ہیں اور غلط کرتے ہیں۔ بچہ ڈپلومیٹ نہیں ہوتا' اس کا دل صاف ہوتا ہے۔

ایک باپ نے اپنی مصروفیت کی بنا پر اپنے گھر والوں کو ہدایت کی کہ کوئی ملنے والا آئے تو اس سے کہہ دیا جائے کہ وہ گھر پر نہیں ہیں۔ گھر کے بڑے اس بات کو سمجھ سکتے تھے لیکن اتفاق سے آنے والے کو دروازے پر بچہ ملا۔ نو وارد نے پوچھا' "بیٹا تمہارے پاپا گھر پر ہیں؟" وہ الجھن میں پڑ گیا باپ تو گھر کے اندر موجود ہیں وہ کیسے کہہ دے کہ نہیں ہیں' دوسری طرف باپ کی ہدایت بھی ذہن میں تھی۔ اس نے کچھ سوچنے کے بعد کہا "آپ ذرا ٹھہریے میں پاپا سے پوچھ کر بتاتا ہوں کہ وہ گھر پر ہیں کہ نہیں۔"

بچوں کی اس قسم کی بھولی حرکت بڑوں کو کبھی کبھی تکلیف و پریشانی میں ڈال دیتی ہے۔ ابھی کل پڑوس کی ایک عورت نے بچے کو سمجھاتے ہوئے کہا "بیٹا کیچڑ میں ننگے پیر نہیں چلا کرتے!" بچے نے فوراً کہا: "اچھا ممی میں اب جوتے پہن کر چلا کروں گا۔"

بچے کبھی کبھی دوسروں کے سامنے گھر کے کچھ ایسے بھید بھی کھول دیتے ہیں جن سے ماں باپ کو بڑی شرمندگی اٹھانی پڑتی ہے۔ یہ سب کچھ ہوتا

بے بھولے پن کی وجہ سے۔ کبھی کبھی تو بچے ایسی عقل
کی بات کر بیٹھتے ہیں کہ بڑوں کی عقل بھی دنگ رہ
جاتی ہے۔ دوسری کلاس میں پڑھنے والے ایک
منّے صاحب نے اپنے پاپا سے پوچھا۔

"پاپا کیا آپ آنکھ بند کرکے اپنے دستخط کر
سکتے ہیں؟"

"ہاں کیوں؟"

"کچھ نہیں بس پوچھ رہا تھا۔ اچھا کرکے دکھائیے"

باپ نے آنکھیں بند کیں اور صاحبزادے
نے ایک جگہ ان کے دستخط کرالیے۔ بعد میں معلوم
ہوا کہ یہ ان کی اسکول کی رپورٹ تھی جس میں کئی مضمونوں
میں ان کے نمبر کم تھے۔

اوسط درجے کے ذہین بچے اکثر ایسی بات
کہہ جاتے ہیں یا ایسا کام کر جاتے ہیں کہ لوگ اچنبھے
میں پڑ جاتے ہیں۔ کتے کی دم میں پٹاخے باندھ کر آگ
لگا دینا یا گدھے کی دم میں ٹوٹا ہوا کنستر رسی سے باندھ
دینا تو عام بات ہے۔ ذرا تیز ذہن والے بچے
عجیب قسم کی شرارتیں کرتے ہیں۔ کچھ دن پہلے کی
بات ہے کہ میں بازار سے لوٹ رہا تھا۔ ایک بچہ
دھاگے کا ایک گولا لیے میرے پاس آکر رکا اور
بڑے ادب سے کہنے لگا۔

"معاف کیجیے، مجھے اپنے اسکول میں پڑوس کا ایک
نقشہ بنا کر دینا ہے جس کے لیے مجھے اس بلاک کی
لمبائی چوڑائی ناپنی ہے۔ کیا آپ اس دھاگے کا
ایک سرا تھوڑی دیر پکڑ کر کھڑے رہیں گے؟"

اچھا خاصا پیارا پیارا بچہ مہذبانہ انداز میں مجھ سے
ایک ذرا سے کام کے لیے کہہ رہا تھا۔ انکار کی گنجائش
کہاں تھی میں نے دھاگے کا سرا پکڑ لیا اور بچہ گولے
کو کھولتا ہوا پیچھے ہٹتا گیا۔ بلاک کے سرے پر پہنچ
کر وہ مڑ گیا۔ اب وہ میری نظروں کے سامنے
نہیں تھا مگر دھاگے کے ہلنے جلنے سے ایسا معلوم ہو رہا
تھا جیسے وہ اپنے کام میں لگا ہوا ہو۔ پانچ منٹ
گزرے اور پھر دس۔ مجھے جلدی بھی تھی کیا کروں
کیا نہ کروں اس سوچ میں چار پانچ منٹ اور گزر گئے۔
تنگ آکر میں نے ایک اینٹ میں دھاگے کا سرا
باندھ کر اینٹ وہاں رکھ دی جہاں سے پیمائش
شروع ہوئی تھی اور یہ دیکھنے کے لیے کہ لڑکا کہاں
گیا ہے میں دھاگے کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ بلاک
کے موڑ کے بعد پندرہ سولہ گز آگے دھاگا دروازے
کے ایک ہینڈل میں باندھ دیا گیا تھا۔ لڑکے کا
دور دور تک پتہ نہ تھا اور یہ بات واضح ہو چکی
تھی کہ لڑکا بڑی ہوشیاری سے مجھے بے وقوف

بچے ہر چیز کو دھیان سے دیکھتے سنتے رہتے ہیں مگر ان کی سمجھ میں نہ تو ساری باتیں آتی ہیں اور نہ ان میں اتنی سمجھ ہوتی ہے کہ کیا بات کہنے کی ہے اور کیا بات کہنا ٹھیک نہیں ہے۔ ماں نے اعلان کیا کہ جو بھی بچہ مہینہ بھر میرا حکم پوری طرح مانے گا اس کو پہلی تاریخ کو انعام ملے گا۔ ایک بچے نے اپنی رائے کا اظہار کیا "تب تو انعام پاپا ہی کو مل سکے گا" — ایک بار ماسٹر صاحب نے نسیم سے پوچھا۔ "بتاؤ نسیم تم کو کون کون سی بڑی لڑائیاں یاد ہیں؟" نسیم نے جواب دیا "جی مجھے یاد تو کئی ہیں مگر اماں نے منع کر دیا ہے کہ گھر کی بات ہر کسی کو نہیں بتایا کرتے۔" ایک اور صاحب زادے نے یہ پوچھنے پر کہ ان کے انگلش کے ماسٹر کیا پڑھاتے ہیں جواب دیا۔ "جی پڑھائیں گے وہ خاک ان کو تو خود نہیں معلوم بس ہم سے ہی پوچھتے رہتے ہیں واٹ از دِس، واٹ از دیٹ" — ایک اور صاحب گانا گا رہے تھے کبھی سیدھے لیٹ کر گاتے کبھی الٹے ہو جاتے کبھی ایک گانا گاتے کبھی دوسرا۔ ان کے بھائی کی سمجھ میں الٹنے پلٹنے والی بات نہیں آئی آخر انہوں نے پوچھ ہی لیا تو چھوٹے بھائی صاحب نے جواب دیا۔ "ریکارڈ پلٹتا ہوں۔"

اچھا اب ایک ذہین بچے کی ذہین شرارت سنیے۔ بات ہے تو ایک امریکن بچے کی لیکن اگر امریکن گھروں کی طرح ہندوستانی گھروں میں بھی ٹیپ ریکارڈ ہوا کرتے تو کوئی ہندوستانی عقلمند بچہ بھی ایسا کر سکتا تھا۔ جونیر اسکول میں پڑھنے والے ایک بچے کو زکام کھانسی ہو گئی۔ بچے کو اسکول سے چھٹی دلا دی گئی اور اس کو گھر کے سب سے اوپر والے کمرے میں رکھا گیا چار روز بعد زکام ٹھیک ہو گیا مگر کھانسی کو آرام نہ ہوا۔ کئی دن گذر گیے مگر ہر پندرہ بیس منٹ بعد کھانسی کی آواز بدستور آتی رہی بچے کی کھانسی ٹھیک نہ ہونے سے ماں کو کافی پریشانی تھی۔ ایک دن جب کہ کھانسی کی آواز آ رہی تھی وہ بچے کی حالت دیکھنے کے لیے اوپر پہنچ گئی اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ لڑکا بڑے مزے سے لیٹا ہوا ہیڈ فون سن رہا ہے اور چلتے ہوئے ٹیپ ریکارڈ سے زوردار کھانسی کی آواز آ رہی ہے۔ اسکول سے بچنے کے لیے لڑکے نے اپنی کھانسی کو ریکارڈ کر کے رکھ لیا تھا اور اسی کو بار بار بجا دیتا تھا۔

بچے اپنی بات کو جھٹلایا جانا پسند نہیں کرتے اور بحث کرنے میں اپنے دماغ کی پوری طاقت لگا دیتے ہیں۔ شہر میں رہنے والے ایک باپ نے چھٹی کے دن گاؤں کے علاقے کی یہ سوچ کر سیر کرائی کہ بچے کو دیہاتی زندگی کے کچھ تجربات ہو جائیں گے۔

لڑکا باپ سے الگ ہو کر کبھی کبھی ادھر ادھر نکل جاتا تھا۔ ایک بار واپس آ کر اس نے بتایا کہ اس نے کچھ لوگوں کو گھوڑا بناتے ہوئے دیکھا ہے۔ "کچھ اور کر رہے ہوں گے گھوڑا کوئی آدمی تھوڑا ہی بناتے ہیں" باپ نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ مگر بچہ کہاں ماننے والا تھا کہنے لگا "میں نے اپنی آنکھوں سے لوگوں کو ایک گھوڑا بناتے دیکھا ہے جب میں وہاں پہنچا تو وہ اس کے ایک پیر میں آخری کیل ٹھوک رہے تھے۔"

لڑکے ہوں یا لڑکیاں، بچے بچے ہی ہوتے ہیں دلیل بازی میں لڑکیاں بھی کسی سے کم نہیں ہوتیں شیلا اسکول سے لوٹی تو اپنے کمرے میں پہنچ کر زور زور سے کہنے لگی "پلیز کم ہیر ممی، پلیز کم ہیر" ماں آئی تو اس نے وجہ پوچھی۔ لڑکی نے بتایا کہ آج اس نے اسکول میں یہ الفاظ بولنا سیکھے ہیں۔ ماں کو اس بات سے خوشی ہوئی اور اس نے سوچا لگے ہاتھوں اس کو جانے کی انگلش بھی سکھا دوں۔ ماں نے شیلا سے کہا "شاباش بیٹی اب تو تم کو انگلش بولنی آگئی۔ اچھا یہ بتاؤ کہ مجھے باہر بھیجنا ہو تو کیا کہوگی؟" لڑکی جانتی تو تھی نہیں مگر وہ بات بنا گئی۔ فوراً کمرے کے دروازے سے باہر نکلی اور وہاں سے بولی "پلیز کم ہیر ممی" ــــ ایک اور صاحبہ کی عقلمندی ملاحظہ فرمائیے۔ بڑی بہن نے ایک کیک کے دو ٹکڑے کیے۔ بچی کو آزمانے کے لیے کہ وہ کون سا ٹکڑا اٹھاتی ہے جان بوجھ کر کیک کے دو ٹکڑے کیے گیے۔ ایک چھوٹا اور ایک بڑا۔ بڑی بہن نے پلیٹ چھوٹی بہن کی طرف کی تو لڑکی نے ذرا سوچنے کے بعد بڑا ٹکڑا اٹھا لیا۔ بڑی بہن نے کہا "منی یہ تو بری بات ہے کہ بڑا ٹکڑا خود اٹھا لیا جائے۔ یہ تو بدتمیزی ہوئی"۔ منی بی نے سوال کیا "اچھا دیدی اگر میں آپ کو دونوں ٹکڑے پیش کرتی تو آپ کون سا ٹکڑا اٹھاتیں؟" "میں تو یقیناً چھوٹا اٹھاتی" بڑی بہن نے جواب دیا۔ "یہ میں پہلے سے جانتی تھی اور اسی لیے چھوٹا ٹکڑا آپ کے لیے چھوڑ دیا"۔ منی نے بہن کو لاجواب کر دیا۔

★

ایک انوکھا خواب

جناب آزاد مظفر شاہجہانپوری

ایک طوطے کا بچہ
جس کے تھے بال بچے
ٹانگ کا وہ لنگڑا تھا
آنکھ کا وہ کانا تھا
ٹائیں ٹائیں سے اُسکی
کانپتا تھا کل جنگل
سن کے آیا ہاتھی کو
طوطے پر بڑا غصّہ
اس نے طوطے کو ڈانٹا
طوطے نے جو ماری ٹانگ
دور جا گرا ہاتھی
ایک ننھی چیونٹی پر
چوٹ کھا کے وہ چیونٹی
اس بُری طرح اُچھلی
ایک ببول کے اوپر
ایک ننھے کانٹے میں
اس کا کان جا اٹکا
چیختا تھا وہ لٹکا
ہاتھی نے کیا فوراً
ساتھیوں کو ٹیلی فون
ہاتھی کے سبھی ساتھی
دوڑے دوڑے آئے تب
ہاتھی کے بچانے کو
مل کے جتنے ہاتھی تھے
اس بُبول پر ٹکّر
زور سے لگاتے تھے
لیکن اس سے ٹکرا کر
چھوٹی گیند کے مانند
لوٹ لوٹ جاتے تھے
دیکھ کر تماشہ یہ
ناچنے لگا طوطا
پھر تو جتنے ہاتھی تھے

دم دبا کے بھاگے سب
کھیلتے وہیں پر تھے
چند بچّے مچھّر کے
دیکھا جب ان بچّوں نے
ہاتھی کو چھڑا لائے
اور بنا کے ایک فٹبال
کھیلنے لگے اس سے
کِک پہ کِک لگاتے تھے
اور مسکراتے تھے
ایک ننھے مچھّر نے
ایک کِک لگائی جو
اتنا اونچا اُچھلا وہ
ایک جہاز جاتا تھا
اس سے جا کے ٹکرایا
گر پڑا وہ طیارہ
اس کی پھٹ گئی ٹنکی
آگ لگ گئی اس میں
جو کے پھیلی جنگل میں
جس سے جل گیا ہاتھی
ماجرا یہ جب دیکھا
رحم آیا چیونٹی کو
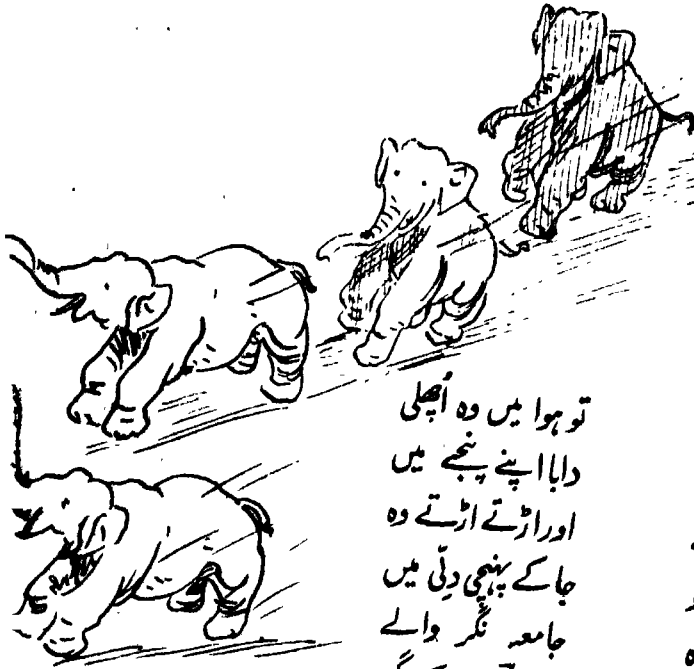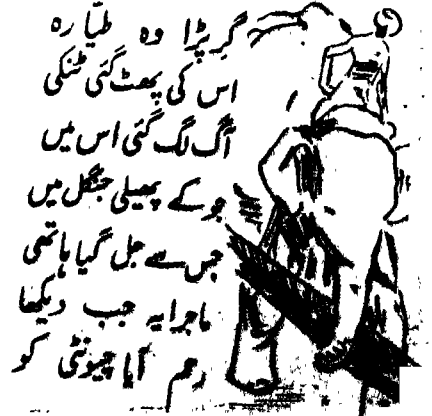
تو ہوا میں وہ اُچھلی
دابا اپنے پنجے میں
اور اڑتے اڑتے وہ
جا کے پہنچی دِلّی میں
جامعہ نگر والے
وہ ولی چچا کے گھر
اور چچا سے انگلش میں
اس نے رو کے فرمایا
اِس غریب ہاتھی کو
اسپتال میں جا کر
جلدی بھرتی کروادو
تب ولی چچا بولے
اس کو چھوڑ جاؤ تم
ایک شاہ بابا سے

جھاڑ پھونک کروا کے
اس کو اچھا کریں گے
اس کو گھر میں پالیں گے
جب سنا یہ ہاتھی نے
بولا فارسی میں وہ
تھینک یو میری چیونٹی
اب یہیں رہیں گے ہم
اب یہیں پڑھیں گے ہم

جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

ہونہار بروا

ایک دن مشہور شاعر نادر خاں شوخی ایک کتاب کی دکان کے سامنے سے گزر رہے تھے۔ انھوں نے ایک ۱۲-۱۳ سال کے لڑکے کو اس دکان سے باہر نکلتے دیکھا۔ لڑکے کے چہرہ پر عجب رونق تھی۔ اس سے قبل بھی شوخی صاحب نے اس لڑکے کو دیکھا تھا اور اس کا کلام مختلف اخباروں اور رسالوں میں پڑھا تھا۔ لیکن ان کا خیال تھا کہ یہ لڑکا خود اتنے اچھے اشعار نہیں کہہ سکتا۔ بلکہ کوئی اور ہے جو شعر کہہ دیتا ہے اور اس لڑکے کے نام سے وہ شعر چھپتے ہیں۔

نادر خاں شوخی نے شک دور کرنے کے لیے لڑکے کو روکتے ہوئے کہا" برخوردار! تم تو اچھی اچھی نظمیں اپنے نام سے چھپوا رہے ہو۔ اگر واقعی وہ سب تمھاری کہی ہوئی ہیں تو تم تعریف کے لائق ہو۔ لیکن مجھے شک ہے کہ تم خود شعر نہیں کہتے۔ اس لیے آج میں تمھارا امتحان لینا چاہتا ہوں۔"

راہ میں اس طرح ٹوکنے پر لڑکا ناراض ضرور ہوا۔ لیکن اس نے اپنی ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ نہایت ادب سے کہا کہ وہ امتحان میں کامیابی کی کوشش کرے گا۔ اس پر نادر خاں شوخی رام پوری نے ایک مصرع طرح پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس طرح پر کم از کم ایک شعر ہی سنا دے۔ دونوں کے قدم گفتگو کرتے ہوئے آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ ہونہار لڑکا اشعار موزوں کرتا اور سناتا چلا جا رہا تھا۔ اشعار بھی ایسے کہ شوخی صاحب داد پر داد دیتے ہوئے ذرا نہیں تھکے۔ ان اشعار میں ایک شعر یہ بھی ہے

وعدۂ وصل بھی کچھ طرفہ تماشے کی ہے بات
میں تو بھولوں نہ کبھی، ان کو کبھی یاد نہ ہو

یہی لڑکا بعد میں جناب شوق صاحب کا شاگرد بنا اور خط کتابت کے ذریعہ اصلاح لیتا رہا۔ لیکن جب حضرت شوق سے پہلی بار اس کی ملاقات ہوئی اُس وقت وہ صرف ۱۴ سال کا تھا۔ حضرت شوق کو بھی یقین نہ آیا کہ یہی لڑکا ان سے اصلاح لیا کرتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے بھی اسی طرح اس لڑکے کا امتحان لیا۔ اور لڑکے نے مصرع طرح پر استاد کے سامنے اکتالیس اشعار کی ایک طویل غزل کہہ ڈالی۔

اچھا یہ بتائیے یہ ہونہار کون تھا۔ ؟ ؟

باقی ص ۵۰ پر

جناب خالد عرفان

اجالے کے کرشمے

ایک لطیفہ سُنیے: ایک مرتبہ اکبر بادشاہ نے دربار میں سوال کیا "دنیا میں سب سے رواں دواں شے کون سی ہے" دربار کے سب لوگوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق مختلف چیزوں کے نام لیے۔ پر بیربل نے کہا "عالم پناہ دنیا میں روشنی سے زیادہ رواں شے کوئی اور نہیں ہے۔" اکبر بادشاہ کو بڑا تعجب ہوا اور انھوں نے بیربل سے کہا کہ دوسری شام تک اگر بیربل نے اپنی بات کو صحیح ثابت نہیں کیا تو سر قلم کردیا جائے گا بیربل نے اپنی بات کو صحیح ثابت کرنے کے لیے کیا کیا۔ ہمیں اس سے کیا۔ لیکن سب سے تیز دوڑنے میں روشنی کا جواب نہیں اس کا تو آپ کو خود اندازہ ہوگا۔ سورج ہماری زمین سے کوئی پندرہ کروڑ کلو میٹر دور ہے۔ لیکن اس کے طلوع ہوتے ہی $\frac{1}{2}$ منٹ میں ہم تک روشنی پہنچ جاتی ہے کیسے؟ کیا سورج سے ذرات کی صورت میں روشنی چل کر ہم تک پہنچی ہے؟ — شاید! مدتوں تک سائنس داں یہی سمجھتے رہے کہ روشنی کے ذرات ہوتے ہیں۔ جیسے ہوا کے ذرات یا دھول کے ذرات پھر پتہ چلا، نہیں روشنی بھی قوت ہے جس طرح گرمی یا بجلی، اور وہ لہروں کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے۔ پھر سوال اٹھا یہ لہریں کیسے چلتی ہیں۔ آپ نے پچھلی بار آواز کی لہروں کے متعلق پڑھا تھا کہ حرکت ہوئی اور آواز کی لہریں بننے لگیں اور پھر کسی سہارے کے بل پر آگے بڑھتی گئیں۔ بالکل اسی طرح کوئی چیز خوب گرم ہو جاتی ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ اس میں پائے جانے والے ذرات گرم ہوکر روشن ہوجاتے ہیں۔ کیوں؟ گرمی سے ان ذرات میں حرکت پیدا ہو جاتی ہے جو روشنی کی لہروں کی صورت میں نمایاں ہوجاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا جب انگی کوئلہ جلاتی ہیں تو جلنے سے پہلے کوئلہ سیاہ ہوتا ہے بالکل اندھیرے کی طرح پھر جب دہک اٹھتا ہے سرخ انگارہ بن جاتا ہے خوب گرمی نکلنے لگتی ہے تو اسی قدر روشن بھی ہوجاتا ہے، حالاں کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ کوئی چیز

میں قدر گرم ہو جائے اسی قدر روشنی دینے لگے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ گرمی اور روشنی ماں جائی بہنیں ہیں ہمیشہ ساتھ رہتی ہیں۔ آپ نے پڑھا ہوگا۔ سورج آگ کی دہکتی ہوئی بھٹی ہے۔ اسی لیے وہ اس قدر روشن ہے۔ کسی شام اپنے سائے پر نظر دوڑائیے گا۔ آپ کو پتہ چلے گا کہ سایہ زیادہ گہرا ہے۔ اسی رات کسی بجلی کے قمقمے کی روشنی میں اپنے سایہ پر نظر ڈالیے گا وہ زیادہ گہرا نہیں ہوگا۔ سایہ کی گہرائی اور صفائی کے لیے روشنی کی تیزی کے علاوہ اس کے ذریعہ کے جسم اور فاصلے کا بھی حصہ ہوتا ہے۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ آج کل سادہ قمقموں سے زیادہ دودھیا قمقمے اور ٹیوب لائٹ استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ان سے جو روشنی نکلتی ہے، وہ ٹھنڈی بھی ہوتی ہے اور ان سے جو سایے بنتے ہیں وہ ہلکے اور چھوٹے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے آپ ایک آسان سا تجربہ کیجیے۔ سائے کی تصویر بنا کر خود اندازہ کریجیے۔ پہلے ایک صاف شیشہ کا بلب لیجیے سفید دیوار یا سفید کاغذ کے مقابل اس کو جلا لیجیے۔

اور ان کے درمیان اپنی انگلیوں کو لائیے۔ ان کا سایہ گہرا اور نمایاں ہوگا۔

اب ایک دودھیا بلب جلائیے، اور اپنی انگلیوں کو وہیں رہنے دیجیے۔ ان کا سایہ ہلکا اور چھوٹا ہوگا۔ اور باہر کی طرف دھندلایا ہوا ہوگا۔ کیوں؟

بات یہ ہے روشنی کی لہروں کی راہ میں جب کوئی رکاوٹ آتی ہے تو وہ کٹ جاتی ہیں، رک جاتی ہیں۔ اور اس طرح سایہ بن جاتا ہے۔ روشنی کا ذریعہ صاف بلب کی طرح جس قدر رکاوٹ کے مقابلہ میں چھوٹا ہوگا اسی قدر اس سے نکلنے والی روشنی کی زیادہ لہریں رک جائیں گی اور سایہ گہرا بنے گا اور درمیانی رکاوٹ جتنے فاصلے پر ہوگی اسی قدر گہرا ہوگا۔ لیکن دودھیا

لقمے کی طرح روشنی کا ذریعہ رکاوٹ سے بڑا ہوگا تو
روشنی کی لہریں زیادہ حصے سے نکلیں گی اور وہ رکاوٹ
سے ٹکرا کر آگے پھیل جائیں گی اور اس طرح سایہ کو ہلکا
نا دیں گی ؟

اگر میں آپ سے پوچھوں، آپ دیکھتے کیسے ہیں؟
آپ بے اختیار مسکرا اٹھیں گے کہ یہ بھی کوئی پوچھنے
کی بات ہوئی۔ سب جانتے ہیں کہ ہم اپنی آنکھوں سے
دیکھتے ہیں۔ ٹھیک ہے، فرض کیجیے، آپ کو اندھیری
کوٹھری میں لے جایا جائے تو آنکھیں لاکھ پھاڑی جائیں
آپ کو وہاں کچھ بھی تو نظر نہیں آئے گا۔ پر اب جھٹ
سے بٹن دبایئے اور بلب روشن کر لیجیے۔ ساری چیزیں
نظر آنے لگیں۔ کیوں؟ جب تک روشنی نہیں ہوتی،
کوئی چیز نہیں دکھائی دیتی۔ اب سوال یہ ہے، دراصل
دیکھنا کیا ہے؟ ہوتا یہ ہے، روشنی کی لہریں جب کسی
چیز سے ٹکراتی ہیں تو —— کیا وہ رک جاتی ہیں ؟
آگے نہیں بڑھتیں ؟ —— ہاں بھی اور نہیں بھی!
آگے وہ جاتی نہیں اس طرح وہ رک گئیں۔ لیکن پیچھے کی
طرف پلٹ جاتی ہیں اس طرح وہ نہیں رکیں۔ ہے نا مزے
کی بات اور جب وہ پلٹتی ہیں تو کیا ان کا راستہ وہی
ہوتا ہے یا بدلا ہوا ہوتا ہے؟ آپ نے گیند دیوار پر
کھینچ ماری ہوگی تو دیکھا ہوگا وہ اسی راستہ پلٹ کر آپ
تک آجائے گی۔ اسی طرح روشنی کی لہریں پلٹ کر آپ
کی طرف آتی ہیں لیکن ان کا راستہ اسی سطح پر مقابل
کی سمت ہوتا ہے اور لہریں اسی قدر مخالف سمت میں
جھکی ہوتی ہیں جتنی کہ اس نقطہ پر مرکوز ہوتے ہوئے ہوتی ہیں۔

آپ نے آئینہ میں عکس تو دیکھا ہوگا۔ یہ لیجیے
آپ پھر سے ہنس پڑے۔ یہ تو ہر دن ہوتا ہے۔ بھلا آئینہ
کی مدد کے بغیر بال کیسے سنوارے جاتے ہوں گے ؟
آسان سی بات تو ہے۔ پر میں صرف دو سوال پوچھوں تو آپ
بغلیں جھانکنے لگیں! نہیں، غلط ہے؟ اچھا چلیے مان
لیا۔ ذرا یہ تو بتایئے آپ کا عکس کہاں ہوتا ہے؟ آئینہ کے
پیچھے! ذرا جھانک کر بتایئے پیچھے کہاں ؟ کتنے فاصلے
پر؟ آپ نے جھانکا اور عکس غائب! بھلا کیوں ؟
بات یہ ہے جیسے آپ موجود ہیں۔ ویسے عکس بھی موجود
ہے۔ لیکن آپ کا وجود ہے۔ عکس کا ٹھوس وجود نہیں
ہے۔ بس وہ چھلاوہ ہی تو ہے اور آئینہ کی دوسری طرف
اسی قدر فاصلے پر موجود ہے جس قدر آپ اس کے سامنے!
اس کے لیے ایک آسان تجربہ کر لیجیے۔

میز پر آئینہ کی بجائے ایک سادہ چوکور شیشہ
کھڑا کر لیجیے۔ اب اس کے سامنے تھوڑے فاصلے
پر ایک گڑیا رکھ دیجیے۔ ایک شیشے کا گلاس لیجیے اور
شیشے کی دوسری طرف دیکھتے ہوئے اس عکس کو گلاس
سے ڈھانپنے کی کوشش کیجیے۔ تھوڑی سی کوشش سے
عکس گلاس کے اندر قید ہو جائے گا۔ اب میز پر شیشہ
کی نچلی سطح سے ملا کر پنسل سے نشان لگا لیجیے۔ پھر فٹ
رول سے گڑیا اور گلاس کا نشان سے فاصلہ ناپیے گا۔

آپ کو اچنبھا ہوگا کہ بیشتر عکس شیشہ سے مقابل سیدھ میں اسی فاصلے پر ہوگا جس قدر شیشے کے سامنے گڑیا رکھی جائے گی، چاہے وہ جہاں بھی رکھی جائے۔

ایک اور بات پوچھوں، بھلا یہ آسمان نیلا کیوں ہے؟ یہ سورج نکلنے اور ڈوبنے کے وقت نارنجی کیوں دکھائی دیتا ہے؟ بات یہ ہے، آپ جس کو روشنی کہتے ہیں وہی جو سورج سے نکلتی ہے۔ اس میں سات رنگ چھپے ہوتے ہیں۔ ہر رنگ کی خاص خاص لمبائی والی لہریں ہوتی ہیں جو باہم مل کر ایک دکھائی دیتی ہیں۔ زمین اور آسمان کے درمیان آپ کہیں گے خالی جگہ پائی جاتی ہے۔ میں نے پچھلی بار آپ کو بتایا تھا خالی جگہ بھی خالی نہیں ہوتی ہوا سے بھری ہوتی ہے۔ ہوا کے علاوہ فضا میں پانی اور دھول کے بے شمار ننھے ننھے ذرات تیرتے رہتے ہیں جب سورج سے نکل کر روشنی ان ذرات پر پڑتی ہے تو وہ فضا میں پھیلادی جاتی ہے، موڑ دی جاتی ہے اس پھیلنے کے عمل میں لہروں کی گانٹھ کھل جاتی ہے۔ ایسی لہریں جن کی لمبائی چھوٹی ہوتی ہے زیادہ مڑتی ہیں اور لمبی لہریں کم اور وہی رنگ دکھائی دے جاتا ہے جس کی لہریں زیادہ مڑتی ہیں۔ نیلے اور بنفشی رنگ کی لہروں کی لمبائی نہایت چھوٹی ہوتی ہے۔ اسی لیے ان ذرات پر پڑکر وہ زیادہ پھیلتی ہیں اور آسمان نیلا نظر آتا ہے لیکن اگر کسی وجہ سے ہر لہر اتنی ہی مڑے جس قدر کہ اس کی لمبائی تو رنگ علیحدہ ہوکر صاف صاف دکھائی دینے لگتے ہیں جب آسمان پر خوب صورت سی سات رنگوں والی دھنک نکلتی ہے تو بالکل یہی ہوتا ہے۔ ہلکی ہلکی پھوار سے فضا میں جو لاکھوں بوندیں تیرتی رہتی ہیں وہ صاف شفاف تکونے شیشے کا کام دیتی ہیں۔ اور ان سے گزر کر روشنی کے ساتوں رنگ علیحدہ علیحدہ ہوکر کمان سی بنا لیتے ہیں۔ بھلا یہ کون کون سے رنگ ہیں؟ اگلی بار دھنک دیکھ کر ضرور بتائیے گا۔ اور ہاں اسی طرح گلاب سرخ اور گیندا زرد ہوتے ہیں۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر جب روشنی پڑتی ہے تو وہ دوسری تمام لہروں کو جذب کرکے محض سرخ رنگ کی لہروں کو منعکس کردیتی ہیں اور گلاب سرخ دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح جب کسی چیز پر روشنی پڑے اور اس کے تمام رنگوں کی لہریں جذب کرلی جائیں تو ظاہر بات ہے کوئی رنگ نہیں دکھائی دے گا۔ یعنی چیزیں سیاہ دکھائی دیں گی۔ اس طرح آپ جس کو سفید کہتے ہیں اس میں سب رنگ ملے ہوتے ہیں اور جس کو سیاہ اس میں کوئی رنگ نہیں ہوتا

روشنی کیسے مڑتی ہے یا پھیلتی ہے، چلیے میں دکھا دوں۔ دوڑ کر جائیے اور ایک گلاس میں پانی لیتے آیئے اس میں چند قطرے دودھ کے ڈالیے ایک اندھیرے کمرے میں میز پر گلاس اپنے سامنے رکھیے اور مخالف سمت سے اس کو لگا کر ٹارچ روشن کیجیے آپ کو روشنی زرد نظر آئے گی۔ کیوں کہ نیلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی لہریں دودھ کے ذرات سے ٹکرا کر پھیل جاتی ہیں۔ اس ہلکی نیلی روشنی کو دیکھنے کے لیے ٹارچ

کو ہلائے بغیر گلاس کی بغل سے دیکھیے۔ آپ کو پانی نیلا نظر آئے گا۔ ان ہی رنگوں کو گہرا دیکھنا ہو تو پانی میں مزید دودھ ڈال دیجیے۔ بالکل اسی طرح کے عمل سے طلوع اور غروب کے وقت سورج کا گولا نارنجی یا سرخ دکھائی دیتا ہے اس وقت روشنی کو فضا میں طویل فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں اور صرف لمبی لہریں ذرات سے ٹکرا کر پھیلتی ہیں۔

اگر میں آپ سے کہوں کہ آپ کی نظر بعض حالات کے تحت صاف اور شفاف پانی کے پار بھی نہیں جا سکتی تو آپ جھٹلا دیں گے۔ لیکن میری بات پر آپ کو یقین آجائے گا جب میں آپ سے کہوں کہ ایک پانی سے بھرے گلاس کو اپنی آنکھوں سے تھوڑا اوپر اٹھایئے اور نچلی سطح کے پار اوپر دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کی نظریں ناکام لوٹ آئیں گی گویا پانی کی نچلی سطح اتنی ماند پڑ گئی ہے کہ وہ روشنی کو لوٹا نہ سکے یا اس قدر روشن جس قدر منہ دیکھنے کا آئینہ اصل بات یہ ہے کہ روشنی آپ کے ساتھ مذاق کرتی ہے۔ یعنی وہ بجائے پانی سے باہر آنے کے چکر دے کر پھر سے سطح کی طرف لوٹ جاتی ہے۔ یعنی پوری طرح اندر کی طرف منعکس ہو جاتی ہے۔ یوں سمجھیے جب بھی روشنی کی لہریں کھڑکی کی سمت سے زاویہ بنا کر چلتی ہوئی پانی کی سطح سے نکل کر ہوا میں داخل ہونے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ سطح سے لوٹا دی جاتی ہیں۔ جتنا بڑا زاویہ ہوگا۔ اتنی ہی زیادہ حد تک وہ مڑی ہوں گی۔ پانی کے اندر سے جب ایسی لہریں ۴۸ ڈگری کا زاویہ بنا کر نکلنے کی کوشش کرتی ہیں تو وہ باہر جھانک تک نہیں سکتیں، اندر ہی اندر سے واپس لوٹا دی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مچھلی یا کوئی تیراک پانی کے اندر سیدھے نہیں دیکھ سکتے بلکہ گولائی میں اڑتالیس ڈگری کا زاویہ بنا کر نظر دوڑانی پڑتی ہے۔ اسی سلسلے میں ایک بڑا مزے دار تجربہ کر لیجیے۔ کسی گہری ڈش (DISH) یا پیالہ میں پانی بھر لیجیے اور اس کی تہہ میں ایک سکہ رکھ کر ایک چھوٹے سے گلاس سے ڈھانپ دیجیے۔
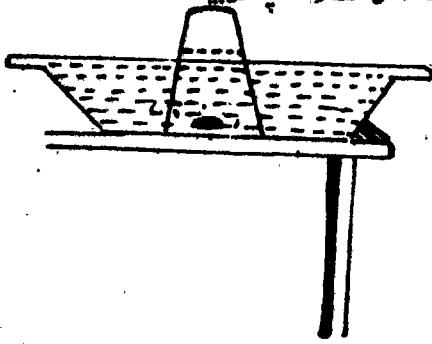
آپ یہ دیکھ کر حیران رہ جائیں گے کہ اگر اس گلاس کے اندر پانی چلا گیا ہے تو سکہ نظر آجائے گا۔ وجہ آپ نے گلاس اتنی تیزی سے ڈھانپا کہ اس کے اندر کی ہوا نے پانی کو اندر نہ داخل ہونے دیا۔ تو آپ لاکھ کوشش کریں سکہ آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ یوں ذرا خیال رہے کہ گلاس پر بالکل اوپر کی

(باقی صفحہ پر)

جناب مولانا مقبول احمد سیوہاروی

قرآن پاک اور مقام ابراہیم کا وسیلہ دے کر دعائیں مانگتے ہیں۔ خدا کا کرنا ایسا ہوتا ہے کہ گھروں تک جانے نہیں پاتے کہ خدا کی رحمت (بارش) نازل ہو جاتی ہے۔

حرم شریف کے دروازے :-

کہتے ہیں کہ حرم شریف کے ۱۹ دروازے ہیں لیکن دیکھا جائے تو ایک ایک دروازے کے ساتھ کئی کئی دروازے ہیں، جیسے باب الصفا کہ باب الصفا کے ساتھ کئی دروازے اور بھی ہیں۔

حرم کے پانچ مینار ہیں۔ باب العمرہ کے پاس ایک مدرسہ ہے۔ جسے یمن کے بادشاہ ابوالمظفر نے قائم کیا ہے۔

باب العمرہ کے باہر ایک کنواں ہے۔ اسے چاہ ابراہیم کہتے ہیں۔ اس کے قریب ایک بڑا مسافر خانہ ہے۔ مسافر خانے کو عربی میں رباط کہتے ہیں رباط المُوفق اس کا نام ہے۔ مکہ معظمہ کا سب سے اچھا مسافر خانہ یہی ہے۔ میں نے اسی میں قیام کیا تھا۔

حرم شریف کے آس پاس بہت سے مکان ہیں۔ ان کی چھتیں حرم شریف کی چھت سے ملی ہوئی ہیں اور کھڑکیاں کھلی رہتی ہیں۔ ان گھروں کے رہنے والے کعبے کی دید سے ہر وقت فیض یاب ہیں۔

ایسے مکان جن کے دروازوں سے حرم شریف تک جا سکتے ہیں تین ہیں ایک زبیدہ کا ہے "باب زبیدہ" زبیدہ ہاروں رشید کی بیوی کا نام تھا۔ یہ مشہور عباسی خلیفہ گزرا ہے۔ اس کی راج دھانی بغداد میں تھی (۲) ایک مکان ہے جس کا نام دار العجلہ ہے۔ اور (۳) ایک دار الشراجی ہے۔

حرم شریف کے قریب قابلِ زیارت مکانات

(۱) قبۃ الوحی (۲) بی بی خدیجہ کا مکان (۳) وہ قبہ جس میں سیدہ فاطمہؓ خاتون کی ولادت ہوئی (۴) حضرت ابوبکر صدیقؓ کا مکان

صفا اور مروہ

حرم شریف کا ایک دروازہ باب الصفا ہے۔ یہاں سے صفا کی پہاڑی پچھتر قدم ہے۔ صفا اور مروہ کے بیچ میں ایک نالہ ہے جہاں بہت بڑا بازار لگتا ہے۔ اس میں غلہ، کھجوریں، گھی، سبزیاں، پھل وغیرہ بکتے ہیں۔ یہاں اتنی بھیڑ رہتی ہے کہ حاجی صفا اور مروہ کے درمیان دوڑتے وقت اس بھیڑ میں پھنس جاتے اور نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مکے میں اس بازار کے سوا کوئی دوسرا بازار نہیں ہاں بنی شعبہ کے دروازے کے پاس کپڑے والوں اور دوا فروشوں کی کچھ دکانیں ہیں۔

صفا اور مروہ کے درمیان ایک مسافر خانہ بھی ہے۔ اس میں مجاور رہتے ہیں۔ یہ مسافر خانہ ملک الناصر نے بنوایا ہے۔ پہلے یہاں حضرت عباسؓ کا مکان تھا۔

باب معلے کے باہر ایک پرانا قبرستان ہے اسے حجون کہتے ہیں۔ مکے والے بھی اس کا حال نہیں بتا سکتے۔ علماء صالحین اور اولیاء اللہ کے مزار اتنے پرانے ہو گیے ہیں کہ نشان تک باقی نہیں رہے۔ انھی میں بی بی خدیجہؓ کی قبر ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں عبداللہ بن زبیرؓ کو پھانسی پر لٹکایا گیا تھا۔ مکے کے باہر دو پہاڑیوں کے بیچ ایک تنگ راستہ ہے۔ جہاں پتھروں کا ڈھیر پڑا رہتا ہے۔ لوگوں نے کہا یہ ابولہب اور اس کی بیوی کی قبر ہے۔ جس نے رسول اللہ کو زندگی بھر دکھ دیا اور حالت کفر میں دونوں مر گیے۔ انجام یہ ہے کہ جو کوئی ادھر سے گذرتا ہے قبر پر پتھر مارتا ہے۔

ابو قبیس کا پہاڑ:-

پورب اور دکھن کے کونے میں ابوقبیس کی پہاڑی ہے جس وقت سرکارِ دوعالم کی انگلی کے اشارے سے چاند کے دو ٹکڑے ہوئے تھے سرکار اسی پہاڑی پر تھے۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم کی قبر بھی اسی پہاڑی پر ہے۔

غار حرا:-

مکے سے شمال کی طرف حرا، کی پہاڑی ہے۔ اسی پہاڑی کی کھوہ میں سرکارِ دوعالمؐ عبادت فرمایا کرتے تھے۔ اور یہیں پہلی وحی نازل ہوئی تھی۔ فرشتے نے وضو سکھایا اور نماز پڑھائی تھی۔

مکے سے ایک کوس دور غار ثور کی زیارت کے لیے جاتے ہیں تو جس راستے سے سرکارِ دوجہاں تشریف لے گیے تھے۔ زائرین بھی جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جس کی قسمت ہو غار کے اندر کی زیارت ہوتی ہے وہ چلا جاتا ہے۔ ورنہ رہ جاتا ہے بعض

تو ایسے پھنس جاتے ہیں کہ جب تک پکڑ کر کھینچا نہ جائے۔ باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے۔

مکے والوں کی عادتیں:-

مکے والے بڑے خوش اخلاق، مہمان نواز اور مسکینوں پر مہربان ہیں۔ غریبوں سے بے حد سلوک کرتے ہیں۔ نان بائیوں سے روٹی پکوانے جاتے ہیں اگر کوئی فقیر ساتھ ہو جاتا ہے تو بڑی خوشی سے اس کا حصہ الگ کر دیتے ہیں۔ اعلیٰ لباس پسند کرتے ہیں۔ اکثر سفید لباس پہنتے ہیں۔ خوشبو زیادہ استعمال کرتے ہیں۔ پیلو کی مسواک سے بار بار دانت صاف کرتے ہیں۔ سرمہ زیادہ لگاتے ہیں۔

مکّے کی عورتیں:-

مکے کی عورتیں بہت خوش جمال ہیں۔ اور بے حد پاک باز۔ بُرے کاموں سے ہمیشہ دور رہتی ہیں۔ بناؤ سنگار اور خوشبو کا بہت شوق ہے۔ حرم کے طواف کے لیے جاتی ہیں تو حرم کے راستے مہک جاتے ہیں۔

مکّے کے قاضی:-

مکے کے قاضی نجم الدین محمد محی الدین طبری بڑے سخی ہیں۔ طواف بہت کرتے ہیں۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع ہے، امیروں، درویشوں، مسکینوں کی دعوتیں کرتے رہتے ہیں ملک الناصر سلطان مصران کا بہت عقیدت مند ہے۔

مکے کے خطیب:-

مکّے کے خطیب خطابت اور حسن بیان میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہر جمعے کو نیا خطبہ لکھتے ہیں اور ایسے انداز سے لکھتے ہیں کہ سُننے والے مبہوت ہو جاتے ہیں۔

امام مالکیہ:-

مالکیہ کے امام ابو عبداللہ محمد ابن الفقیہ ہیں۔ انھیں امام خلیل کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ امام خلیل کو مکے کا ہر ایک آدمی قطب وقت سمجھتا ہے۔ کبھی کسی سائل کو اپنے دروازے سے خالی نہیں پھیرتے۔

رسول کریمؐ کی زیارت کا شرف:-

ایک دفعہ مجھے سرکار دو جہاں کی زیارت ہوئی میں نے دیکھا کہ لوگ جوق درجوق سرکار سے بیعت کرتے جاتے ہیں۔ اتنے میں امام خلیل آئے اور سرکار کے سامنے دوزانو بیٹھ گیے۔ اور سرکار کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرنے لگے۔ آخر میں بولے۔ یارسول اللہ میں اقرار کرتا ہوں کہ اپنے دروازے سے کسی مسکین اور حاجت مند کو محروم نہ پھیروں گا۔

(باقی)

—•—

قلم کی کہانی

جناب
شکیل
جاوید
امروہوی

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں دہلی میں ایک اُردو ماہنامہ میں کام کرتا تھا۔ اس دفتر سے ایک ماہنامہ اور ایک فلمی ویکلی اخبار نکلتا تھا۔ رسالہ کے خاص نمبر کی تیاریاں زور شور سے ہو رہی تھیں۔ دم لینے کی فرصت نہ تھی۔ میں نے صبح سے ۱۲½ بجے تک تقریباً چالیس پینتالیس خط ادیبوں، شاعروں کو خاص نمبر میں شرکت کے لیے لکھے کہ وہ اپنے مضمون، غزل، نظم اس خاص نمبر کے لیے مرحمت فرمائیں۔ ان خطوں کو پہلی ڈاک سے بھیجنا تھا۔ جب ٹکٹ دیکھے تو وہ ختم ہو چکے تھے۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا، "آپ کھانا کھانے تو جائیں گے ہی راستہ میں پوسٹ آفس پڑتا ہے ٹکٹ لے کر لگا دیجیے گا۔" یہ کہہ کر انھوں نے دس روپیے کا ایک نوٹ مجھے دیا۔

صدر تھانہ والے پوسٹ آفس سے میں نے ٹکٹ خریدے اور ڈیسک پر آ کر خطوں پر ٹکٹ لگانے لگا۔ اچانک مجھے اپنی پشت کی طرف سے آواز آئی۔

"کیا آپ چند منٹ کے واسطے اپنا قلم دے سکتے ہیں۔؟"

میں نے گھوم کر دیکھا۔ یہ ایک لڑکا تھا۔ جس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی

میں نے جواب میں اپنے کوٹ کی جیب سے قلم نکال کر اس لڑکے کو دے دیا۔ اس لڑکے کے پاس منی آرڈر فارم تھا، وہ ڈیسک پر ہی منی آرڈر فارم بھرنے لگا۔ میں نے ایک سرسری نظر یوں ہی منی آرڈر فارم پر ڈالی اس نے ہندی میں کچھ رقم لکھی تھی۔ اور میں خطوں پر ٹکٹ لگانے لگا۔

خطوں کو ڈاک میں ڈال کر میں بی کریم کی طرف چل دیا۔ میں یہیں رہتا تھا اور یہیں اپنے ایک عزیز کے یہاں کھانا کھاتا تھا۔ جب میں کھانے سے فارغ ہوا تو ہمارے ان عزیز کی بیوی نے مجھے ایک جوابی پوسٹ کارڈ لکھنے کے لیے دیا میں نے قلم نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا مگر قلم ندارد تھا۔ میں نے پریشانی کے عالم میں کوٹ کی تمام جیبیں دیکھ ڈالیں مگر قلم ملتا نہ تھا۔ آخر قمیص اور پتلون کی جیبیں بھی دیکھ ڈالیں تو مجھے خیال ہوا شاید میں دفتر سے قلم نہیں لایا ہوں مگر اسی لمحے مجھے ڈاک خانے والی بات یاد آگئی۔ وہاں میں نے ایک لڑکے کو منی آرڈر فارم بھرنے کے لیے اپنا قلم دیا تھا۔ اور پوسٹ آفس سے چلتے وقت اس سے لینا بھول گیا تھا۔ اب اس واقعہ کو ایک گھنٹے سے زیادہ ہو چکا تھا۔ میں عزیز کی اہلیہ سے معذرت کر کے دفتر کی طرف چل دیا۔ میرا ذہن قلم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

دہلی جیسی بڑی جگہ میں جہاں ہندوستان کے ہر گوشہ کا آدمی ملتا ہے۔ بنا جانے پہچانے کسی کو تلاش کرنا محض حماقت نہیں تو کیا ہے؟ اور وہ لڑکا میرے لیے اجنبی تھا۔ پھر کس طرح مجھے اپنا قلم واپس مل سکتا ہے!

اسی لمحے میرے ذہن میں ایک سوال ابھرا۔ اس لڑکے نے منی آرڈر فارم بھرا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ لڑکا کچھ ہوشیار اور ایماندار ہو اور وہ منی آرڈر کی کھڑکی پر منی آرڈر بابو کو وہ قلم دے گیا ہو کہ اگر کوئی صاحب آپ سے قلم کے بارے میں معلوم کریں تو آپ انھیں یہ دے دیں۔ اس چھوٹی سی امید پر صدر تھانہ کے پاس آیا تو میں نے سوچا کہ آخر پوچھ لینے میں کیا حرج ہے؟ اور میں پوسٹ آفس میں داخل ہو گیا۔ منی آرڈر بابو سے میں نے وقت کا حوالہ دے کر قلم کے بارے میں پوچھا۔

منی آرڈر بابو نے بتایا کہ "ہمیں کسی نے کوئی قلم نہیں دیا۔ اگر ایسا ہوتا تو آپ سے قلم کے بارے میں ضروری نشانات معلوم کر کے قلم آپ کے حوالہ کر دیا جاتا۔"

منی آرڈر بابو کا جواب سن کر میرے ذہن میں فوراً ایک دوسرا سوال آیا۔

" اگر وہ منی آرڈر فارم جو وہ لڑکا بھر رہا تھا میرے سامنے آجائے تو میں اسے پہچان سکتا ہوں ۔ اور منی آرڈر فارم میں اس کا پتہ بھی ہوگا۔"

یہ خیال کر کے میں نے منی آرڈر بابو سے یہی بات کہہ دی۔

" واہ صاحب ! کمال ہے ۔ اتنی بڑی جگہ میں آپ کس طرح خط یا لکھاوٹ دیکھ کر اس منی آرڈر فارم کو شناخت کر سکتے ہیں ؟ جب کہ آپ کو یہ بھی نہیں معلوم کتنے روپے کا منی آرڈر ہے؟ کس کے نام ہے ۔؟ ؟ بھیجنے والا کون ہے ۔؟؟؟"

منی آرڈر بابو نے کہا ۔ اور واقعی اس کی بات ٹھیک تھی۔

" اگر آپ کی مہربانی ہو جائے تو میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔" میں نے انکساری سے کہا۔

" لیکن میں تو اب حساب بند کر چکا ہوں۔ اور منی آرڈر فارم بھی باندھ چکا ہوں ۔ اور پھر میں آپ کو بغیر جانے پہچانے منی آرڈر فارم کیسے دکھا دوں یہ تو بڑی ذمے داری کی بات ہے۔"

" یہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر آپ مہربانی فرما کر تھوڑی زحمت کریں تو میں کوشش کر کے دیکھتا ہوں۔"

منی آرڈر بابو نے میری طرف دیکھا اور کہا۔

" اچھا صاحب! ذرا کچھ دیر ٹھہریے میں کوشش کرتا ہوں۔"

منی آرڈر بابو نے چھٹی کے لیے ایک درخواست لکھی اور پھر اس نے منی آرڈر فارم کی ایک بڑی گڈی میرے سامنے رکھ دی۔ اور میں ہر فارم پر سرسری نظر ڈال کر الٹتا رہا۔ مجھے اس لڑکے کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔ نہ مجھے یہ پتہ تھا کہ اس نے کتنے روپے کی رقم منی آرڈر کی تھی۔ صرف اس کی ہلکی سی تحریر کا عکس میرے ذہن میں محفوظ تھا۔ جس کے سہارے میں نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ میں اس کی تحریر پہچان سکتا ہوں۔

تقریباً ایک حصّہ منی آرڈر فارم دیکھنے کے بعد میری ہمت ٹوٹ گئی۔ لیکن میں نے سوچا کہ جب اتنے فارم دیکھ لیے ہیں تو کچھ دیر اور سہی۔ اور پھر ایک فارم پر میری نظر جم گئی ۔ اور میں نے پورے یقین کے ساتھ کہا۔

" یہی ہے وہ فارم ۔ !"

منی آرڈر بابو نے استفہامیہ نظروں سے میری

طرف دیکھا۔ اور وہ فارم منی آرڈر بابو نے نکال کر اس میں سے بھیجنے والا کا پتہ لکھ کر مجھے دیا۔ وہ پتہ سرائے ُ وہلّا کا تھا۔ صدر تھانہ کے پوسٹ آفس سے سرائے ُ وہلّا کا اچھا خاصا فاصلہ ہے۔ میں نے پتہ لے کر منی آرڈر بابو کا شکریہ ادا کیا۔ چلتے وقت منی آرڈر بابو نے مجھے تاکید کی۔

"اگر آپ اپنا قلم حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو مجھے ضرور بتائیں۔"

میں نے سوچا کہ اگر اس پتہ پر کوشش کروں تو اچھے خاصے پیسے اٹھ جائیں گے۔ اور وقت علیحدہ برباد ہوگا۔ اور پھر کیا معلوم وہ لڑکا مجھے ملا بھی یا نہیں۔ سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ یہ پتہ کیر آف معرفت تھا اور وہ میرے لیے اجنبی تھا۔

ان تمام پریشانیوں سے بچنے کے لیے بہتر یہی تھا کہ میں نیا قلم خرید لوں۔ مگر رہ رہ کر مجھے اس قلم کا خیال آرہا تھا۔ کیوں کہ وہ قلم میرے ہاتھ پر رواں تھا۔ اور وہ مجھے میرے ماموں نے تحفے میں دیا تھا۔ سب سے بڑی وجہ یہ تھی۔

غرض کہ میں ان سوالوں سے الجھتا ہوا دفتر آگیا۔ اور وہاں آکر میں نے ایڈیٹر صاحب کو سارا واقعہ سنایا۔

انھوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ "اس پریشانی سے بچنے کے لیے دوسرا قلم خریدنا زیادہ اچھا رہے گا۔"

پھر بھی مجھے کسی طرح قرار نہیں تھا۔ وہ قلم میری نگاہوں کے سامنے پھر رہا تھا۔ لہٰذا میں نے آخری ہتھیار اس طرح استعمال کیا کہ دفتر کا چھپا ہوا پتے والا لفافہ اٹھا کر اس لڑکے کے پتہ پر ڈال دیا۔ اور خط کے آخر میں یہ لکھا: "تم میرا قلم یہاں آکر واپس کر جاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو مجبوراً مجھے وہیں آنا پڑے گا۔"

خط ڈاک میں ڈال کر میں قلم کی طرف سے مطمئن ہو گیا۔ اگر میرے خیال کے مطابق یہ اُسی لڑکے کا پتہ ہے تو شاید میں کامیاب ہو جاؤں۔

خط ڈاک میں ڈالنے کے ٹھیک پانچویں دن ایک لڑکے نے ایڈیٹر صاحب سے میرے بارے میں معلوم کیا۔ ایڈیٹر صاحب نے اندر سے مجھے بلایا۔ اس لڑکے نے شاید مجھے پہچان لیا تھا۔ وہ مسکین صورت بنائے معذرتی لہجے میں بولا۔

"معاف کیجیے گا۔ میں نے پوسٹ آفس میں آپ کو تلاش کیا۔ اور کچھ دیر آپ کا انتظار بھی کیا مگر آپ نہ مل سکے۔"

"لیجیے! — یہ رہا آپ کا قلم — " اس لڑکے نے مجھے میرا قلم دیتے ہوئے کہا۔

میں نے اس لڑکے کی طرف — اور اپنے قلم کی طرف دیکھا — مجھے ایک عجیب سی مسرت ہوئی۔

"آپ سے ایک چھوٹی سی التجا ہے۔ وہ یہ کہ آپ کو میرا ایڈریس کس طرح ملا — ؟"

تب میں نے تفصیل سے اس لڑکے کو تمام واقعات بتائے۔ اس لڑکے کا نام رمیش کار اگروال تھا۔ اور وہ میری طرف حیرت زدہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ جیسے میں نے کوئی بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہو — !!

بقیہ ص ۴۲

وہی ہے جو بڑا ہو کر صرف شاعر نہیں بلکہ اپنے دور کا ممتاز ادیب، صحافی، مفکر، رہنما، جنگ آزادی کا ایک ستون اور ہندو مسلم اتحاد کا انمول جواہر ثابت ہوا اور جس نے تمام عمر مادرِ وطن کی بے لوث خدمت کی۔ یعنی مولانا ابوالکلام آزاد۔ آج ان کا سایہ ہمارے سروں پر نہیں ہے لیکن ان کی زندگی کے کارنامے ہمارے سامنے ہیں جن سے ہر ہر قدم پر ہم سبق لیتے ہوئے آگے بڑھ سکتے ہیں۔

بقیہ ص ۳۸

جانب سے سیدھا نہ دیکھا جائے ورنہ سکہ ہر وقت نظر آتا رہے گا۔ اور اس کا سبب بھی وہی ہے، روشنی کا اندر کی طرف پوری طرح منعکس ہو جانا!

اب آنکھیں ذرا بند کر لیجیے۔ اور ستا لیجیے اگلی بار میں آپ کو جادو کے دیس لے چلوں گا۔ جو خود آپ کے اندر ہی بسا ہوا ہے۔

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

ذرا یہ تو دیکھو کہ جتنے بھی ایسے اہم مقام ہیں وہ سب انگریزوں کے قبضہ میں ہیں سنگاپور، ہانگ کانگ عدن وغیرہ۔

لیکن عدن کا بندرگاہ کھلا بندرگاہ ہے۔ جسے انگریزی میں فری پورٹ کہتے ہیں یعنی یہاں سے سامان بھیجنے اور اندر لانے میں کوئی محصول نہیں لیا جاتا۔ ویسے عدن کا بندرگاہ انگریزوں کے قبضہ میں ہے۔ اور انگریزوں کا ایک گورنر بھی رہتا ہے۔

پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ تیل کا اسٹور یا گودام بھی ہے۔ عرب، ایران وغیرہ میں جتنا بھی تیل ہوتا ہے۔ یہاں پائپ کے ذریعہ جمع کیا جاتا ہے۔ بڑی بڑی ٹنکیاں بنی ہوئی ہیں اور یہاں سے یہ تیل جہازوں کے ذریعہ باہر بھی جاتا ہے۔ ہمارے جہاز کو بھی یہیں سے تیل لینا ہے اور کچھ تھوڑا سا سامان بھی۔ یہ جہاز یہاں سے اتنا کافی تیل لے گا کہ امریکہ پہنچ کر جب واپس لوٹتے وقت یہاں آئے گا تب پھر تیل لے گا۔ راستہ میں بالکل ضرورت نہیں پڑے گی۔ ہم لوگ جہاز سے تیل کی ٹنکیاں دیکھ سکتے ہیں لیکن ان پہاڑوں پر ہریالی دور دور تک نظر نہ آتی تھی۔

ہمارا جہاز بندرگاہ سے ذرا دور پر رک گیا۔ اور پائلٹ کا انتظار کرنے لگا۔ جب پائلٹ آگیا تو پھر بندرگاہ کی طرف چلا۔ لیکن یہاں بھی جہاز زمین سے دور سمندر ہی میں کھڑا ہوگیا۔

عدن میں کوئی گودی نہیں ہے۔ جب ہم لنچ سے فارغ ہو گئے تو عدن کا رخ کیا۔ پولس کا جو افسر آیا ہوا تھا اس سے بات چیت شروع کی۔ وہ ہندوستانی تھا شکل و صورت میں بھی اور بات چیت میں بھی مسلمان تھا۔ اس سے اتنی دوستی کر لی کہ جب وہ واپس بندرگاہ پر جانے لگا تو ہم بھی اس کی کشتی میں سوار ہو گئے اور پورٹ کی طرف چل دیے پورٹ ہمارے جہاز سے یہ سمجھو کوئی ۵۰۰ گز ہوگا۔

پولس والوں سے ہم نے ڈاک خانے کا پتہ پوچھ لیا تھا۔ مجھے سب سے پہلے اس کی فکر رہتی ہے۔ والدہ کی عادت سے میں واقف ہوں

کوشش بھی کرتا ہوں کہ جہاں سے بھی موقع ملے خیریت
کا خط ضرور روانہ کر دوں۔ اس مرتبہ خط ڈالنے میں
میرے اور بھی بہت سے ساتھی تھے۔ میں اکیلا ہی
نہ تھا۔

راستہ میں ہم نے دیکھا کہ یہاں قریب قریب
سب ہندوستانی ہیں۔ لیکن گفتگو عربی میں کرتے
ہیں۔ پورٹ سے ہی ایک گائڈ ہمارے ساتھ لگ گیا۔
ہمارے انکار کرنے پر بھی وہ نہ مانا اور ہمارے ساتھ
لگا رہا۔ راستہ میں اس سے معلوم ہوا کہ یہاں کے
مسلمان یہودی کے خاص دشمن ہیں۔ اور عدن سے
قریب قریب تمام یہودی اپنی تجارت اور جائداد بیچ
کر چل دیئے ہیں۔

یہاں کے مسلمان ہندوستان کے ہندوں
سے بھی سخت ناراض ہیں۔ (پاکستان کی وجہ سے)
اس لیے جب بے وقوفی کی بنا پر ہم نے پوچھنے پر
بتایا کہ ہم تین مسلمان ہیں اور ایک ہندو تو مسلمانوں
سے تو بہت خوش ہوا اور ہندو کی طرف اشارہ کر کے
کہنے لگا کہ یہ بہت خراب آدمی ہے۔ صرف اتنے ہی
اشارہ سے ہم عدن کی سیاسی فضا کو بھانپ گیے۔
اور آئندہ جس کسی نے ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں تو
ہم نے کہا کہ ہم سب مسلمان ہیں۔ تو لوگ بہت خوش
ہوتے تھے۔

اس سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ اس وقت
جب مصر میں لڑائی ہو رہی ہے۔ یہاں عربوں کی
کیا کیفیت ہو گی۔ ڈاک خانے میں بھی جب دوسرے
لوگوں سے ملاقات ہوئی تو ان کے خیالات ایسے ہی
معلوم ہوئے، میں ڈاک خانے میں بیٹھ کر جب تمھیں
کارڈ لکھ رہا تھا تو ایک شخص مجھے اردو لکھتے دیکھ کر
تعجب سے پوچھنے لگا کیا آپ مسلمان ہیں۔ میں نے کہا
جی۔ فوراً دوڑا دوڑا وہ اپنے دوسرے ساتھیوں کو
بلا لایا۔ اور پھر ہم نے بہت دیر تک اس سے باتیں
کیں اور باتیں کرتے وقت وہی جملہ استعمال کیا "جیسا
دیس ویسا بھیس" جب ڈاک خانے کا کام ختم کر
چکے تو پھر بازار کی راہ لی۔ جس جگہ ہم ابھی گھوم رہے
ہیں۔ یہ عدن کا بندرگاہ ہے۔ شہر عدن تو اس بندرگاہ
سے قریب ۶ میل دور ان پہاڑوں کے پیچھے واقع
ہے ہم نے بازار میں دیکھا کہ چیزیں ہندوستان
سے بہت ہی سستی ہیں۔ وجہ یہ کہ یہاں محصول ہی
نہیں لیکن اس سے ہم کچھ بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتے
تھے۔ خرید کر کہاں ساتھ لے جائیں۔ سب لوگ یہی
کہنے لگے لوٹتے وقت ضرور چیزیں عدن سے لے
جائیں گے۔ میں نے کہا بہت اچھا کیا معلوم اس وقت
کدھر سے ہو کر آئیں۔ دل کے بہلانے کو غالب یہ
خیال اچھا ہے۔

بازار بہت صاف ستھرے۔ سڑکیں پختہ اور
تارکول کی ہیں۔ اور لوگ سب خوش حال معلوم ہوتے

تھے۔ یہاں پر ہمیں گجراتی نظر آئے بنگالی اور مدراسی
بھی ملے۔ پارسی تو بہت کافی ہیں اور بمبئی کے مسلمان بھی
کثرت سے ہیں۔ لیکن ان سب میں مسلمانوں کی تعداد
زیادہ ہے۔ یہاں پر مسلمان عورتوں کو برقع میں دیکھا
لیکن برقع سیاہ رنگ کا تھا۔ اور صرف آدھا سر اور
کندھے اور سینہ کو ڈھک لیتا تھا اور بس۔

غرض گھوم گھام کر بغیر کوئی چیز خریدے ہم
ٹھیک ۵½ بجے شام لوٹ آئے، ہمارے جہاز نے
تیل لے لیا تھا اور سامان لادا جارہا تھا۔ لیکن سامان
بھی ختم ہونے والا تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ ابھی روانہ
ہونے والے ہیں۔

کوئی ۷½ بجے کے قریب ہمارا جہاز پھر اپنے
سفر پر چلا۔ اس وقت اندھیرا ہو چلا تھا۔ روشنیاں
جل چکی تھیں۔ عدن کا نظارہ عجب بہار دکھا رہا تھا،
پہاڑ آسمان کے پس منظر میں بہت خوش نما معلوم
ہوتے تھے۔ پہاڑوں پر جا بجا بجلی کے قمقمے عجب
سماں پیدا کر رہے تھے۔ اور ان سب سے زیادہ جو
لطف دے رہے تھے۔ وہ ہر رنگ کے قمقمے تھے
غرض سماں عجب پر بہار تھا، ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔
بندرگاہ میں جہاز خموشی سے کھڑے تھے۔ ان کے سائے
سمندر کے خاموش پانی میں آئینہ میں تصویر کا خیال پیدا
کر رہے تھے۔ ادھر یہ سب سماں تھا اور ادھر جہاز
کے چلنے کی اور انجن کی آواز۔ دل یہ چاہتا تھا کہ ابھی
عدن میں اور رکیں، ایک ہفتہ کے طوفانی سفر نے
جو کیفیت پیدا کر دی وہ ابھی دور نہ ہو پائی تھی، جی
ذرا اور آرام کرنے کو چاہتا تھا۔ لیکن جہاز کوئی اپنے
قبضہ میں تو ہوتا نہیں، ہم مجبور تھے۔

جہاز دھیرے دھیرے چلتا رہا اور جہاز کے
ساتھ ہم بھی، لیکن عدن کی طرف اب بھی للچائی نظروں
سے دیکھ رہے تھے، کاش اب بھی جہاز مڑ جائے،
ہم بہت دیر تک ڈیک پر کھڑے رہے۔ جہاز اب
اپنی پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ ہم عدن کے چراغوں
کو ابھی تک تک رہے تھے۔ لیکن جب پاؤں نے جواب
دے دیا تو اپنے کیبن میں لوٹ آئے اور بستر پر دراز
ہو گیے۔ اب صبح ریڈسی میں ہوں گے اور پورٹ
سوڈان جا کر دم لیں گے۔

آج ۱۳؍جون ہے اور اتوار کا دن صبح جب
ہم اٹھے تو ہم نے دیکھا کہ ہم بحر قلزم میں داخل
ہو گیے ہیں۔ سمندر کی حالت بہت ہی اچھی ہے۔ جہاز
کے دائیں بائیں ہمیں کئی جزیرے ملے۔ یہ جزیرے
بھی خشک تھے۔ لیکن کافی بڑے معلوم ہوتے تھے۔
نقشے میں ہمیں یہ جزیرے نہیں ملے۔ جزیرے کیا تھے
اونچی اونچی پہاڑیاں تھیں لیکن تمام خشک کہیں نام کو
بھی ہریالی نہیں۔ آج دن بھر ہمیں کئی جہاز ملے۔

ریڈسی بھی بہت عام راستہ ہے اور چونکہ
سمندر زیادہ چوڑا نہیں ہے۔ اس لیے عموماً ب

جہاز ایک ہی راستے سے جاتے ہیں اور ہمیں وہ تمام جہاز راستہ میں نظر آئے جو نہر سے گزر کر عدن کی طرف جا رہے تھے۔ لیکن دن کے وقت کوئی مسافر والا جہاز ہمیں نہیں دکھائی دیا۔ یا تو مال ڈھونے والے جہاز تھے یا پھر ٹنکر جسے تیل لیجانے والا جہاز بھی کہتے ہیں۔ یہ جہاز تیل کے اسٹیشن سے تیل بھر کر دوسری جگہ لیجاتے ہیں۔ ہمیں بحر قلزم میں آج بہت ٹنکر دکھائی دیے۔ ٹنکر کی پہچان یہ ہے کہ فنل یعنی چمنی جہاز کے پچھلے حصّہ میں ہوتی ہے۔ ویسے چمنی اکثر جہاز کے اگلے حصّہ میں یا بیچ میں ہوتی ہے۔

قریب قریب تمام دن ہم جہازوں کو ہی دیکھتے رہے پہلے پہلے صرف دھواں ہی دکھائی دیتا تھا لیکن تھوڑی دیر میں پھر جہاز کی چمنی نظر آنے لگتی پھر جہاز خود ہی ہماری طرف آتا نظر آتا۔

لیکن ایک جہاز دوسرے جہاز کے نزدیک سے نہیں گزرتا۔ کافی دور رہتا ہے یہ سمجھو ۵۰۰ گز دور۔ رات کے وقت ہمیں ایک مسافروں والا جہاز بھی جاتا دکھائی دیا۔ اس میں بجلی کی کئی روشنیاں نظر آ رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کوئی محل پانی پر تیرتا ہوا چلا جا رہا ہے اس میں قریب قریب ۲۵۰ مسافر ہوں گے۔ اِدھر ہم صرف ۴ عدد مسافر ہیں اور اُدھر اتنے زیادہ کتنا مزہ آتا ہوگا۔

ابھی رات کے کوئی ۱۰ بجے ہوں گے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا جہاز چلتے چلتے رُک گیا ہے معلوم ہوا انجن میں کوئی خرابی ہے اس لیے رکا ہوا ہے۔ جب خرابی دور ہو جائے گی پھر چلنے لگے گا۔ ہمارے جہاز پر اس وقت بھی وہی دو لال روشنیاں اوپر تلے جل رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ جہاز قابو سے باہر ہے۔ ٹھیک اسی وقت ہم نے دیکھا کہ ایک دوسرا جہاز ہمارے جہاز سے قریب جا رہا ہے اور دونوں روشنی کے ذریعہ آپس میں کچھ اشارہ کر رہے ہیں۔ کیپٹن سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ دوسرے جہاز والوں نے ہم سے پوچھا تھا کہ کیا خرابی ہے تو ہم نے انھیں جواب دیا انجن خراب ہو گیا ہے۔ کوئی بڑی خرابی نہیں۔ ابھی ٹھیک ہو جائے گی، ٹھیک اسی وقت میں نے سوال کیا مان لیجیے اگر ہمارے جہاز میں ایسی خرابی ہو جائے جسے دور کرنا ہمارے قابو سے باہر ہو اور اگر ہم دوسرے جہاز کی مدد چاہیں تو کیا وہ ہمیں مدد دیں گے۔ تو وہ کہنے لگا ضرور اگر ہم مصیبت میں ہوں اور مدد چاہیں تو انھیں ضرور مدد دینی پڑے گی۔ یہ بین الاقوامی قانون ہے۔ لیکن ہمیں اس کے لیے انھیں قیمت ادا کرنی ہوگی۔

اتنے عرصے میں ہمارا انجن ٹھیک ہو گیا تھا اور ہمارا جہاز پھر تیزی سے چلنے لگا۔ آج رات چاند کی روشنی بہت ہی صاف ہے۔ آسمان پر بادل نہیں لیکن کیبن میں کافی گرمی ہے۔ جی چاہتا ہے باہر ڈیرا جمائیں۔

(باقی آئندہ)

آدھی ملاقات

سالنامہ ملا

پیام تعلیم کے کچھ شمارے دیکھنے کا موقع ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پیام تعلیم بچوں کی تعلیم و تربیت اور دل چسپی کے سلسلے میں ایک بہت ہی اہم اور نمایاں کام کر رہا ہے۔ بچوں کے دیگر نکلنے والے پرچوں میں مجھے یہ سب سے زیادہ پسند آیا ہے۔ آپ کا ستیش بترا۔ لکھنؤ

سالنامہ حسب معمول ہر لحاظ سے بہت اچھا ہے دلچسپ اور مفید مطلب نظمیں، مزے دار اور کام کی کہانیاں معلوماتی مضامین بظاہر اچھی اچھی تصویروں سے مزین اور کیا چاہئے۔ (ڈاکٹر) نورالحسن ہاشمی۔ لکھنؤ

پیام تعلیم کا سالنامہ ملک کے تمام نونہال سالناموں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً بچوں کا ادب پیش کرنے والے رسائل میں پیام تعلیم نے ایک نمایاں مقام حاصل کرلیا ہے۔ میری جانب سے دلی مبارک باد قبول فرمائیے۔ سعید عقاب (مالی گاؤں)

بھائی واہ کیا خوب صورت سالنامہ نکالا ہے..... واقعی سالنامے کا جواب نہیں۔ اللہ تعالیٰ آپکی سعی کو کامیاب فرمائے...... دو تین باتیں مشورۃً عرض کرنی ہیں (۱) پیام تعلیم میں شائع ہونے والی چیزوں پر تحریری رائے منگوائیں۔ ان سے دریافت کریں کہ انھیں کون کون سی چیزیں پسند آئیں۔ پسند آئیں تو کیوں ناپسند آئیں تو کیوں۔ اس طرح بچوں کے تنقیدی شعور اور لکھنے کی صلاحیت میں اضافہ ہوگا۔ (۲) بہت سے شعراء اور مضمون نگار بچوں کے لیے لکھتے ہیں زبان بڑوں کی استعمال کرتے ہیں۔ ان کو لکھیے کہ بچہ بن کر لکھیں۔
افتخار اعظمی بمبئی۔

پیام تعلیم کا دل کش و دل نشیں سالنامہ اپنے دامنِ رنگیں میں خوب صورت اور کارآمد مضامین نظم ونثر کے رنگ برنگے پھولوں کی بہار لیے نظر نواز ہوا۔ اس مہنگائی اور خاص کر اردو کی کھلم کھلا دشمنی کے دور میں اتنا خوب صورت اور معیاری نمبر پیش کرنا معجزہ سے کم نہیں۔ شمیم ہاشمی (شاہ آباد)

پیام تعلیم کا سالنامہ دیکھا اور دیکھتا ہی رہ گیا۔ میرے خیال وخواب میں بھی نہ تھا کہ جامعہ اتنا خوب صورت، دل فریب اور مکمل سالنامہ نکالے گا... احمد مشکور۔ لکھنؤ

واللہ بھئی پیام تعلیم کے بارے میں جیسا سنا تھا ویسا ہی پایا۔ بلکہ سچ پوچھیے تو اس سے بھی بڑھ کر پایا.....
سجاد احمد یحییٰ پور (ضلع مونگیر)

پیام تعلیم کی مقبولیت کا اندازہ ان بے شمار خطوط سے ہوتا ہے جو مجھے نہ صرف ہندوستان بلکہ بیرونی ممالک

سے موصول ہو رہے ہیں پیامِ تعلیم بلاشبہ بچوں کا سب سے معیاری اردو جریدہ ہے۔ میں خود بھی بچپن سے پیامِ تعلیم شوق سے پڑھتا آیا ہوں۔ (۲) خاص نمبر کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانا ہے... ضیاء الدین غوثی
ایڈیٹر مسرت پٹنہ

سالنامہ جیسا کہ میں نے ایک دن خواب میں دیکھا تھا ہو بہو، ویسے ہی نکلا۔ محمد شعیب شمسی بریلی

پیامِ تعلیم کے سالنامے کو پڑھ کر طبیعت پھڑک گئی۔ واقعی سالنامہ خوب ہے۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے..... ایم نیاز انصاری (کلکتہ)

ماشاءاللہ ٹائٹل جاذب توجہ ہونے کے علاوہ رسالہ معلومات اور مفید مضامین کا دلچسپ مجموعہ ہے۔ ایسا اچھا رسالہ آپ کی کوششوں سے ہی مرتب ہو سکتا ہے۔
سید احسن مارہروی
(پشاور)

اور جب مجھے پیامِ تعلیم ڈاکیے نے دیا تو پھولا نہ سمایا۔ واقعی آپ نے پیامِ تعلیم کو بلندی کی منزل تک پہنچا ہی دیا۔۔ محمد شمیم حسن کلکتہ

سالنامہ ملا۔ بہت خوب صورت بہت مفید۔ بہت دیدہ زیب.... سکریٹری نسیمی لائبریری۔ دہلی۔

جنوری کا سالنامہ اور فروری کا پیامِ تعلیم دونوں ایک ساتھ ملے طرح طرح کی نظموں، مضمونوں اور کہانیوں کو دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا.....
سید ظفر آفتاب حسین۔ دربھنگہ

پیامِ تعلیم کا سالنامہ پسند آیا۔ اور بے حد پسند آیا۔ اچھا سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارکباد
محمد نسیم شاداں الٰہ آباد

سالنامہ نظر سے گذرا۔ جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہوگی۔ اتنا ضخیم، باصحت اور اعلیٰ تعلیم سے آراستہ سالنامہ نکالنا واقعی آپ کے حوصلے، جوش اور ادب دوستی کا کھلا ثبوت پیش کرتا ہے۔ خیر اندیش۔ شاہ محمد مونگیر

سالنامہ اپنی آغوش میں انتہائی خوبیوں کا خزانہ لے کر موصول ہوا۔ شکریہ۔ بھئی آپ کی کوششیں واقعی قابلِ صد مبارکباد ہیں۔ ہماری دعا ہے پروردگارِ دو عالم پیامِ تعلیم کو بدرِ کامل کی طرح جگمگائے اور اس کی ضیا باریوں سے ہم پیامیوں کی تاریک راہیں روشن ہوں۔ محمد شفیع تمنا۔ کلکتہ

تایا جان یوسف ناظم کے نام :-

تایا جان یوسف ناظم کے بارے میں مزاحیہ طور پر کچھ لکھا ہے مناسب ہو تو اسے ضرور شائع کیجیے۔ یہ سلسلہ بہتر تو ہے مگر کیا معلوم جو "تایا جان ناظم قسم کے تایا جان دوسرے بھی ہوں کہیں

ایسا نہ ہو کہ وہ بھڑک جائیں ۔

بچوں کے نام خط لکھنا اور ان سے مٹھائی وغیرہ کی امید پر جیتے رہنا ۔ اور اُن کی تعریف کے پُل باندھنا ان کو خوش کرنے کی فکر میں لگے رہنا۔ بھولے بھالے بچوں کو دھوکا دے کر اپنے آپ کو تایاؤں کی فہرست میں شمار کر لینا۔ اپنے تایا ہونے کا دعویٰ کرنا۔ تایاؤں چچاؤں کی قسمیں گنوانا اور ان کی عادتیں لکھنا۔ تایاؤں کو ہمیشہ روتی صورتوں میں شمار کرنا۔ پیام تعلیم کے لیے کہانیاں لکھنا اور بے چارے ایڈیٹر پر رعب جمانا اور رعب ڈالنا کہ وہ ان سن لائٹ سے دھلی ہوئی صاف کہانیوں کو شائع کرے اور سب سے پہلے جگہ دے۔ کبھی کبھی دو تین ماہ تک پیامیوں سے روٹھ کر غائب رہنا۔ اور دور بیٹھے کھڑکی سے تماشا دیکھتے رہنا، پھر بغیر بلائے کے آ ٹپکنا قربان میاں، انسان میاں، شیطان میاں کے کارنامے گنوانا ۔

چلتے چلتے پیام تعلیم کے بارے میں یہ دو شعر بھی سُن لیجیے :-

دل کی دیرینہ تمنا ہے پیام تعلیم
دیکھ لو کتنا پیارا ہے پیام تعلیم
دیکھ لے چاہے جو ہر دل کا یہ ہے آئینہ
سب کا اپنا ہے پیارا ہے پیام تعلیم

اور آخر میں سالنامہ پیام تعلیم کا مادۂ تاریخ

"پیام تعلیم خزانۂ مسرت"
۱۹ ۶ ۶۶

ناطق رضوی پرنام بٹ

مذہبی کتابیں ہندی میں

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لیے بہت سی اچھی مذہبی کتابیں شایع کی ہیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کے ہر طبقے میں پسند کی گئیں اور ان کے بیسیوں ایڈیشن چھپ کر فروخت ہو چکے ہیں۔ آج بھی یہ کتابیں بہت سے اردو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

ہندی کی تعلیم عام ہونے کے باعث اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ ان کتابوں کو ہندی رسم الخط میں شایع کیا جائے۔ چنانچہ ہم نے دو کتابیں ہمارے نبیؐ اور آں حضرتؐ ہندی پڑھنے والے بچوں کے لیے بہت احتیاط کے ساتھ شایع کی ہیں۔

آں حضرتؐ ہندی میں حضرت محمدؐ کے نام سے چھپی ہے۔

ہمارے نبیؐ ۷۰ پیسے
حضرت محمدؐ ۶۰ پیسے

پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

قلمی دوستی

محمد عاقل انصاری - عمر بارہ سال
مشغلہ :- محلے محلے انجمنیں قائم کرنا - بچوں کو پیام تعلیم پڑھ کر سنانا - مذہبی کتابیں جمع کرنا - قلمی دوستی
قاضی پورہ - ٹانڈہ - فیض آباد

محمد ضیاء الدین - عمر چودہ سال
مشغلہ :- ٹکٹ جمع کرنا - قلمی دوستی - سائنس کے مضامین پڑھنا - ایچ/۵۲ بہار پور روڈ - پوسٹ آفس گارڈن ایچ روڈ - کلکتہ ۲۴

رشید احمد خاں - عمر بارہ سال
بچوں کے رسالے پڑھنا - قصے کہانیوں کی کتابیں پڑھنا قلمی دوستی - موضع کلونا - پوسٹ آفس چیرکی - ضلع گیا (بہار)

ایم نعیم - عمر ۱۳ سال
مشغلے :- قلمی دوستی، رسالوں کا مطالعہ، وغیرہ
$\frac{۲}{۱۰}$ بی آئی ٹی بلاک - ابراہیم رحمت اللہ روڈ بمبئی (۳)

[illegible] - عمر پندرہ سال
[illegible] پڑھنا - صرف لڑکیوں سے قلمی دوستی

معرفت چودھری عبدالرحیم ٹائٹ ہلدوانی (ضلع نینی تال)

فاروق انور زیدی - عمر ۱۵ سال
مشغلے :- فوٹوگرافی، کہانیاں پڑھنا - قلمی دوستی
پتہ - گل ہردہ - ہردہ ۵-۱-۶

محمد اسلم - عمر آٹھ سال
پیام تعلیم شوق سے پڑھنا، تعلیمی تاش کھیلنا - قلمی دوستی
انجمن شیدائے مصطفیٰ قاضی پورہ
ٹانڈہ فیض آباد (یوپی)

عابد حسین رضوی - عمر ۱۵ سال
مشغلے :- پیام تعلیم پڑھنا، ہاکی اور بیڈ منٹن کھیلنا، مذہبی اور ادبی رسالوں کا مطالعہ کرنا - وغیرہ وغیرہ
پتہ - کیر آف حامد حسین فرش محلہ نئی بستی - ہلدوانی (ضلع نینی تال)

محمد اظہر انصاری - عمر دس سال
مشغلے - ادبی کتابوں سے اپنی لائبریری سجانا - اچھے ادبی رسالے منگانا - مضمون لکھنا - قلمی دوستی -
پتہ :- محلہ سکراول - ٹانڈہ (ضلع فیض آباد)

نسیم احمد خاں - عمر ۱۰ سال
مشغلے - قلمی دوستی - اچھی کتابیں پڑھنا - مختلف کھیلوں سے دلچسپی لینا - پتہ :- معرفت محمد طٰہٰ خاں صاحب - بائک ڈرائی کلینرس - دریبہ پان - مراد آباد -

بچوں کی کوششیں

طرح طرح کی بولیاں

ویسے تو آپ طرح طرح کی بولیاں سنتے ہیں۔ آیئے آج آپ کو ایک ساتھ کئی مزیدار بولیاں سنائیں۔

جب ہمارے مدرسہ ابتدائی میں اس سال داخلے شروع ہوئے تو جگہ جگہ کے لڑکے داخلے کے لیے آئے۔ ہر ایک اپنے اپنے دیس کی بولی بولتا تھا۔ مزہ یہ کہ ایک دوسرے کی زبان پر ہنستا بھی تھا۔ مجھے بھی اس دفعہ بہت سے لڑکوں سے ملنے کا موقع ملا۔

ایک بار ایک بنگالی لڑکا میرے پاس آیا۔ میں اس وقت اسکول کا کام کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگا۔ اے بھائی ہم کو آج خط گیرنا (ڈالنا) ہے۔ تم ہمارا خط لکھ دو۔ ہم دل ہی دل میں مسکرائے ہم نے کہا لاؤ لکھ دیں پہلے تو اپنے ابا جان کو سلام خیریت لکھ وائی۔ پھر بڑی رونی آواز میں بولے۔ لکھو "تم تو کہو تھے کہ خط گیرتے رہو۔ مگر تم نے کوئی خط بھی نہ گیرا۔ میں کھاٹ پر بیٹھا خط گیر رہا ہوں تم مو کو دجھے (اکیلا چھوڑ) چلے گے۔ اس لفظ کا کہنا تھا کہ مجھے ہنسی آگئی وہ بے چارہ میرا منھ دیکھنے لگا۔

ایک بار ایک آسامی لڑکے سے ملاقات ہوئی اس وقت ایک کتا دوڑا جا رہا تھا۔ کہنے لگا شرافت وہ دیکھو کتا دوڑ رہا ہے ایک بار کہنے لگے شرافت ریل پر روشنی لگی ہے میں خوب ہنسا۔

ہمارا تعلیمی میلا شروع ہو رہا تھا۔ چاروں طرف خوب سجاوٹ تھی۔ تو پیڑوں پر روشنی کے بلب لگے تھے۔ کہنے لگے پیڑ پر روشنی۔

ایک بار دلی والے کوئی بزرگ اپنے لڑکے کو بلا رہے تھے۔ "او سعادت نہ آ رہا ہے نہ جا رہا۔ خالی حریان (حیران) کر رہا ہے۔

ایک بار ایک ماسٹر صاحب نے ایک سہارنپوری سے پوچھا۔ تمہارے ماسٹر صاحب نے کلاس میں کیا کر دیا تو بولے۔ گملوں دگملوں، میں پیڑے لگا دے۔ پوری بورڈنگ اس پر ہنس دی۔

ایک بار جب کھانے کی گھنٹی بج رہی تھی تو ایک سہارنپوری بولے۔ گھنٹی باج گئی۔

اب آپ رام پور کی بولی بھی سن لیجیے۔ "او یار کہا جا ریا۔ زرا نصراللہ خاں کے بازار سے تماکو لیتے آئیو۔ اور ہاں ببو خاں کی بغیا سے سفریاں (امرود) تو لیتے آئیو۔

شرافت یار خاں۔ مدرسہ ابتدائی جامعہ

ڈائمنڈ

"کیا تم بتا سکتے ہو کہ ڈائمنڈ (ہیرا) کہاں سے آیا

جاتا ہے۔" ماسٹر صاحب نے ارشد سے پوچھا۔ "جی سر! یہ امریکہ کی پہاڑیوں میں ملتا ہے۔ راتوں میں امریکن سپاہی پہاڑی کے گرد گھومتے رہتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کبھی کبھی پہاڑیوں سے ایک روشنی پھوٹتی ہے۔ سپاہی دیکھتے ہی اس پر فائر کر دیتے ہیں۔ اور سر! آپ تو جانتے ہی ہیں کہ وہ بڑے نشانہ باز ہوتے ہیں۔ گولی ٹھیک روشنی پر لگتی ہے اور یہی گولی ہیرا بن جاتی ہے۔"

"شاباش!!" ماسٹر صاحب نے خوش ہو کر کہا۔

عشرت جہاں اکبر پور

اچھا لڑکا

سچ جو ہمیشہ بولا کرتا ۔ میٹھی باتوں سے من بھرتا
روز یاد خدا کی کرتا ۔ اچھا لڑکا وہ کہلاتا
اپنا سبق دل سے پڑھتا ۔ نہیں کسی سے کبھی جھگڑتا
ٹھیک وقت پر پڑھنے جاتا ۔ کبھی نہ کڑوی باتیں کرتا
جو ماں دیتی خوشی سے کھاتا ۔ ماں باپ کی عزت کرتا

عبدالرسول انصاری سکراول ٹانڈہ

ایک بادشاہ اور غریب کسان

ایک دن ایک کسان ہل جوت رہا تھا۔ اسی وقت ادھر سے اس ملک کا بادشاہ آنکلا۔ وہ کسان سے پوچھنے لگا۔ "تو ایک دن میں کتنا کماتا ہے؟" کسان بولا:۔ "میں ایک دن میں چار آنے کماتا ہوں۔" بادشاہ بولا۔ "تو ان کا کیا کرتا ہے؟" کسان نے جواب دیا "ایک آنہ تو خود کھاتا ہوں۔ دوسرا آنہ ادھار دیتا ہوں۔ تیسرے آنہ سے اپنا قرض ادا کرتا ہوں۔ چوتھا آنہ کنویں میں ڈال دیتا ہوں۔" بادشاہ ان باتوں کا مطلب نہ سمجھا۔ بولا "یہ کیسے؟" کسان نے پھر جواب دیا۔ "میں پہلا آنہ تو خود کھاتا ہوں اور اپنی بیوی کو کھلاتا ہوں اور دوسرا آنہ میں اپنے بچوں کو کھلاتا ہوں اس لیے کہ جب میں لاچار ہو جاؤں گا تو یہ میری مدد کریں گے۔ اور تیسرا آنہ میں اپنے والد کو دیتا ہوں اس لیے کہ انھوں نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا۔ اور چوتھا آنہ میں غریبوں محتاجوں کو بانٹ دیتا ہوں۔" یہ بات بادشاہ سن کر بہت خوش ہوا۔ اور کسان سے کہا "یہ بات کسی سے مت کہنا جب تک تو میرا سَو بار منھ نہ دیکھ لے۔" کسان نے جواب دیا "بہت اچھا۔"

اب بادشاہ اپنے محل میں چلا گیا۔ دوسرے دن اس نے اپنے محل میں سب وزیروں کو جمع کیا۔ اور کہا "جو وزیر میری ایک بات کا جواب دے گا۔ اس کو میں منھ مانگا انعام دوں گا۔

"ایک کسان چار آنے روز کماتا ہے۔ وہ ایک آنہ تو خود کھاتا ہے دوسرا آنہ ادھار دیتا ہے تیسرے آنے میں قرض ادا کرتا ہے۔ چوتھا آنہ کنویں میں ڈال دیتا ہے۔ بتاؤ یہ کیسے ....؟"

سب وزیر سوچنے لگے۔ ان سب میں ایک وزیر بہت چالاک تھا۔ اس نے سوچا اور جی میں

کہا کر بادشاہ کل اس کسان کے پاس گیا تھا۔ بس وہ
گھوڑے پر سوار ہو کر سیدھا کسان کے پاس پہنچا۔ اور کہا
"کل تمھارے پاس ایک بادشاہ آیا تھا۔ اس نے تم سے
کیا پوچھا تھا؟" کسان نے جواب دیا "میں نہیں بتا سکتا۔
بادشاہ نے منع کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ جب تک تم میرا
سو بار منہ نہ دیکھ لو تب تک یہ بات کسی کو مت بتانا"
وزیر نے اسے سو سکے دیے اور کہا ان سکوں کو دیکھ
لو۔ ان سکوں پر بادشاہ کی صورت بنی ہوئی ہے۔ کسان نے
وہ سب سکے دیکھ لیے۔ وزیر کو وہ سب باتیں بتا دیں۔
وزیر نے واپس جاکر بادشاہ کو وہ سب باتیں بتا دیں۔

بادشاہ سمجھ گیا اور اس نے کسان کو بلوا بھیجا اور
کہا "تم نے میری بات کیوں بتا دی؟" کسان نے جواب
دیا۔ بادشاہ سلامت میں نے آپ کی صورت سو بار دیکھ
لی ہے۔ بادشاہ بولا "میں تو دربار ہی میں بیٹھا ہوں۔ تم
نے میری صورت کیسے دیکھ لی؟"

وزیر نے بادشاہ سلامت کے سامنے ان
سکوں کو رکھا۔ جن پر بادشاہ کی صورت بنی ہوئی تھی۔
بادشاہ یہ سکے دیکھ کر بہت خوش ہوا کسان اور وزیر
دونوں کو بہت سی اشرفیاں انعام میں دیں۔

سید طاہر الاسلام ٹونکی

لکڑہارا:-

ایک لکڑہارا تھا۔ وہ بہت بوڑھا ہو گیا تھا
پھر بھی وہ محنت مشقت کر کے اپنا اور اپنی بیوی کا پیٹ
پالتا تھا۔ بے چارہ بہت غریب تھا۔ روزانہ جنگل میں
جاکر لکڑیاں کاٹتا تھا۔ ایک مرتبہ لکڑیاں کاٹ کر واپس
آ رہا تھا۔ کافی تھک چکا تھا۔ اس لیے ذرا آرام کرنے
ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور کہنے لگا "ہے بھگوان میں اب
کتنا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اگر ذرا بھی بیمار پڑ گیا تو ہماری
مدد کون کرے گا۔ گھر میں بس میری ایک بیوی ہے۔
وہ بے چاری بھی کافی بوڑھی ہو گئی ہے"۔ اتنے میں
ایک آدمی اس کے پاس آیا اور کہنے لگا "لکڑہارے
میاں ابھی سے اپنے بڑھاپے سے پریشان ہو جب
بڑھاپے کا وقت آئے گا تو بھگوان کوئی نہ کوئی
کام نکال ہی دے گا۔ آؤ ذرا میرے گھر چلو"۔ لکڑہارے
نے کہا "میری لکڑیوں کے گٹھے کو کون دیکھے گا"۔ اس
آدمی نے کہا "میں ان کی حفاظت کروں گا"۔ وہ آدمی
اس لکڑہارے کو اپنے گھر لے گیا اور اس کو ایک
تھیلی میں کچھ اشرفیاں دیں اور کہا "کل پھر آنا" لکڑہارا
خوش خوش گھر گیا۔ اپنی بیوی کو تمام واقعہ سنایا بیوی
بہت خوش ہوئی۔ لکڑہارے نے کہا کل پھر جانا ہے
یہ سن کر اس کی بیوی خوشی سے اچھل پڑی۔

دوسرے دن لکڑہارا پھر اس کے گھر گیا
کیا دیکھتا ہے کہ وہ دعا مانگ رہا ہے۔ اس نے لوگوں
سے پوچھا کہ یہ کیا کر رہا ہے۔ انھوں نے کہا مانگ رہا ہے
لکڑہارے نے کہا کس سے۔ لوگوں نے جواب دیا "خدا
سے" یہ سن کر لکڑہارے کی جیسے آنکھیں کھل گئیں۔ کہنے
لگا "تو پھر میں بھی اسی سے کیوں نہ مانگوں اور اپنے
پاؤں لوٹ آیا۔

(اس۔ ام۔ بدیع اعظم مدرسہ ثانوی جامعہ)

کمار - لایل - جی - برکلے

شوق اور لگن کی جیت

ترجمہ
محمد حسیب حسان

صبح منہ اندھیرے — بالکل گجر دم۔

ایک لڑکا آنکھیں ملتا بستر سے اٹھا۔ اور زینے کی سیڑھیوں پر تیزی سے قدم رکھتا ہوا سیدھا چھت پر پہنچا۔ یہاں ایک بے ڈھنگی سی دوربین رکھی تھی۔ لڑکے نے دوربین کا رخ آسمان کی طرف کیا اور آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کو بہت غور سے دیکھنے لگا۔ ان میاں صاحبزادے کو ایک نامعلوم ستارے کی تلاش تھی ایسے ستارے کی جو ابھی تک دریافت نہ ہوا تھا۔

اچھا بتائیے وہ لڑکا کون تھا؟

وہ تھا کوروا کیا۔ ایک جاپانی مچھیرے کا لڑکا —

وہی جاپان جو ہمارے دیس کے پورب میں ہے۔ اور جہاں کی گڑیاں اور کھلونے آپ کو بہت پسند ہیں۔

کوروا کیا ۱۹۴۴ء میں ایک معمولی خاندان میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ مچھلیوں کے ایک اسٹور کا مالک تھا۔ اچھا خاصا کھاتا پیتا آدمی تھا۔ پر خدا کا کرنا۔ اسٹور میں گھاٹا ہونے لگا۔ ہوتے ہوتے ایک دن ایسا آیا کہ اسٹور کو بند کرنا پڑا۔ کوروا کیا کے باپ کو بہت صدمہ ہوا۔ غم غلط کرنے کے لیے۔ اس صدمے کو بھلانے کے لیے وہ شراب پینے لگا۔ ہر وقت نشے میں دھت رہنے لگا۔

اس چھوٹے سے کنبے کے لیے یہ دہری مصیبت تھی۔ پریشانی یہ تھی کہ گھر کا خرچ کیسے چلے۔ بے چاری اکیا کی ماں ایک ہوٹل میں کام کرنے لگی۔ مگر اس سے بھی پورا نہ پڑتا تھا۔ ناچار چھوٹے اکیا کو بھی کام تلاش کرنا پڑا۔

وہ روز صبح تڑکے اٹھتا۔ آس پڑوس میں اخبار بانٹتا۔ پھر جلدی جلدی اپنے اسکول کی طرف قدم بڑھاتا کہ کہیں دیر نہ ہو جائے۔ شام کو اسکول سے لوٹنے کے بعد شام کا اخبار بانٹتا غرض بے چارے کے صبح و شام اسی طرح بیتتے تھے۔ پر بھئی تھا وہ بہت مستقل مزاج بہت ہمت والا۔ اپنی دھن کا پکا۔ وہ ان مشکلوں کو خاطر میں نہ لاتا۔ مزدوری بھی کرتا۔ مدرسے بھی جاتا اور اس دوڑ بھاگ میں کچھ وقت اپنے خاص شوق کے لیے بھی نکال لیتا۔ اپنی دوربین کے ذریعے آسمانوں کی سیر کرتا۔

غرض ۱۹۵۹ء میں اس نے جیسے تیسے مڈل
کا امتحان پاس کر ہی لیا۔ اور خوش قسمتی سے اسے پیانو
کمپنی میں نوکری بھی مل گئی۔ اس کمپنی میں پیانو کے پرزے
صاف کرتے وقت اس کا دماغ ستاروں کی دنیا میں رہتا۔
کسی نئے ستارے کی کھوج لگانے کے خواب دیکھا کرتا۔
پر آپ جانئے وہ محض خیالی پلاؤ پکانے والا لڑکا
تو تھا نہیں۔ وہ تو اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے
ہر کام کرنے کو تیار تھا۔ اس نے سب سے پہلے تو
ستاروں کے علم پر لکھی ہوئی کتابیں پڑھنا شروع کیں۔
ساتھ ہی ساتھ اپنے خالی وقت میں علم کیمیا یعنی کیمسٹری
اور فزکس (طبیعیات) کی کتابیں بھی پڑھتا رہا۔ کیمسٹری
کی کتابوں میں دوربین اور اس کے شیشے کے متعلق
لکھی ہوئی باتوں کو وہ بہت دھیان سے پڑھتا۔ تاکہ
ایک اچھی دوربین خود بنا لے۔

کوروا کیا نے فزکس اور کیمسٹری وغیرہ کی بہت
سی کتابیں تو مڈل کا امتحان پاس کرنے سے پہلے پڑھ
ڈالی تھیں۔ اور ان علموں میں اچھی خاصی قابلیت پیدا کر
لی تھی۔ اس نے ایک نوٹ بک بھی بنائی تھی۔ اس نوٹ
بک میں ستاروں کے بارے میں خاص خاص باتیں لکھی تھیں۔

پیانو کمپنی کی ملازمت کے زمانے میں وہ اپنے
خرچ میں سے بچا بچا کر پیسے جمع کرتا اور دوربین بیچنے
والی ایک دوکان سے دوربین کے مختلف حصے خرید کر
لے آتا۔ دوربین کا شیشہ وہ خود گھس گھس کر تیار کرتا
رہتا کہ دور کی چیز صاف دکھائی دے اچھی طرح دکھائی دے

آخر اگست ۱۹۶۱ء میں اس نے اپنی دوربین
مکمل کر لی اس دوربین پر ہندوستانی روپیوں کے حساب
سے لگ بھگ ۱۵۶ روپیے لگے تھے۔

اس کے بعد اکیا نے کئی مہینے تک اپنی دوربین
کے ذریعے آسمان میں ایک نئے ستارے کی تلاش
کی مگر بے سود۔ اس نے سوچا شاید میرے دیکھنے کے
طریقے میں کوئی کمی ہے۔ اس نے فوراً ٹوکیو کی مشہور
رصدگاہ کے صدر کو ایک خط لکھا۔ اس خط میں اپنے
تجربوں اور مشاہدوں کے بارے میں لکھا اور اپنی ناکامی
کا بھی ذکر کیا۔ اس کا جواب رصدگاہ کے صدر منورو ہونڈا
نے دیا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ منورو ہونڈا نے نو ستارے دریافت کیے

"آسمان کا محض اس مقصد سے مشاہدہ کرتے
رہنا کہ کسی نئے ستارے کا کھوج لگانا بے معنی اور
فضول بات ہے۔ اس کے لیے بہت وقت درکار ہے۔
بہت محنت کی ضرورت ہے۔ مگر اس تاروں بھرے
آسمان کو دیکھتے رہنا اس کے چمک دمک رکھنے والے
ستاروں کا مشاہدہ کرتے رہنا کہ کوئی نیا ستارہ دریافت
کرنا ہی بغیر اس خیال کے کہ اپنی جگہ خود بہت دلچسپ مشغلہ ہے اور
کوئی عجب نہیں جو کبھی نہ کبھی قسمت تمہارا ساتھ دے
اور کسی ستارے کی تلاش میں تم کامیاب ہو جاؤ۔"

اکیا پر اس نصیحت کا بہت اچھا اثر ہوا۔ اور
اس نے اپنے شغل کو جاری رکھا۔ کسی نئے ستارے کو

دریافت کرنے کا خیال اب بھی اسے بے چین کیے ہوتے تھا۔

۳۱۔ دسمبر ۱۹۶۲ء کو اکیا کی ماں نے اس سے کہا "بیٹے تم ستاروں کی تلاش میں روز ہی سر گرداں رہتے ہو۔ کل نو روز ہے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر تھوڑی سی تفریح بھی کر لو"۔ اکیا نے ماں کی بات مان لی۔

اس روز رات بھر اکیا اور اس کے دوستوں نے جی بھر کے رنگ رلیاں منائیں اور نئے سال کا خوب دھوم دھام سے استقبال کیا۔ دوسرے دن اکیا اپنی امی کے ساتھ عبادت خانے گیا۔ ماں بیٹوں نے نئے سال کے لیے اچھی اچھی باتوں کے لیے دعائیں مانگیں۔ اکیا نے اس وقت کیا دعا مانگی ہوگی۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اور اب ایسا لگتا ہے کہ اب کے اللہ میاں نے اس کی دعا قبول کر لی۔

دوسرے دن صبح کو یعنی ۲ جنوری کو وہ معمول کے مطابق صبح تڑکے اپنے بستر سے اٹھا۔ سیدھا چھت پر پہنچا اور دوربین گھما کر آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ دوربین کا رخ جب جنوب مغرب کی طرف ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دھندلی دھندلی سی چیز افق کے پاس نظر آ رہی ہے۔ اس سے پہلے یہاں اسے کچھ نظر نہ آیا تھا۔ اس نے فوراً آسمان کا نقشہ نکالا۔ نقشے میں بھی اس جگہ کوئی چیز نہیں تھی۔

آخر پریشان ہو کر اس نے ٹوکیو کی رصدگاہ کو ایک تار دیا۔ تار میں اس نے اپنی دریافت کے بارے میں تمام باتیں تفصیل سے لکھ دیں۔ تھوڑی دیر میں تار کا جواب آگیا۔ "آپ نے نئے سال کا ستارہ دریافت کر لیا اس کی تلاش میں مشرق و مغرب کے بڑے بڑے سائنس داں لگے ہوتے تھے"۔

پھر کیا تھا تھوڑی دیر میں کیمرے والے ٹیلی ویژن والے اخبار کے نامہ نگار سیلاب کی طرح اُمڈ پڑے۔ سارے جاپان میں لوگ اکیا کی تصویریں ٹیلی ویژن پر دیکھ رہے تھے۔ دوسرے دن اکیا کو سات سو خط ملے۔ ان خطوں میں ستاروں کا شوقیہ علم سیکھنے والوں نے مختلف قسم کے مشورے مانگے تھے۔ جس پیانو کمپنی میں اکیا کام کرتا تھا اس نے ۱۰۰۰ روپے کا ایک چیک پیش کیا۔ اور ٹوکیو کی رصدگاہ کی طرف سے ایک سونے کا تمغہ دیا گیا۔

غرض لگن، مستقل مزاجی اور شوق کی فتح ہوئی اور اکیا کا خواب سچا ہو گیا۔

(سنڈے اسٹینڈرڈ)

پرنٹر پبلشر سیّد احمد ولی نے
مکتبہ جامعہ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں
آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

صمانی

ادھر اُدھر سے

سفید گوریلا

افریقہ میں گوریلے کا ایک بچہ پکڑا گیا ہے۔ اس کے بال سفید ہیں۔ بالکل انوکھی بات! اس سے پہلے دیکھی نہ سنی۔ سائنس دانوں کی نظر میں فطرت کا ایک نیا عجوبہ! جغرافیہ سوسائٹی (واشنگٹن) نے بتایا ہے کہ اس کی ماں کیلے کے ایک فارم میں کیلے کھا جاتی تھی۔ ایک دن فارم کے مالک نے عاجز آ کر گولی چلا دی۔ مادہ گوریلا وہیں ڈھیر ہو گئی۔ یہ بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوا تھا۔ یہ بچہ بھی عام گوریلوں کی طرح تھا بس بال سفید تھے۔ کھال گلابی۔ آنکھیں بجائے گلابی کے نیلی تھیں۔ تصویر میں یہ کیلا کھا رہا ہے۔

ہالا

یہ جرمنی کی عجیب و غریب گھوڑی کا نام ہے۔ اس کی عمر اکیس سال ہے۔ یہ اب تک چھلانگ لگانے کے ۱۲۵ امتحانی مقابلوں او ساٹھ مشہور بین الاقوامی مقابلوں میں جیت چکی ہے اور تو اور اولمپک مقابلوں میں سونے کے تین تمغے حاصل کر چکی ہے۔ ایک عجیب بات یہ کہ ۱۷ سال کی عمر سے اس کے بچے بھی پیدا ہونے لگے ہیں تصویر میں یہ جس بچے کے ساتھ کھڑی ہے اس کا پانچواں بچہ ہے۔ لوگوں کے خیال میں یہ بچہ بھی بہت ہونہار ہے اور بڑا ہو کر ماں کی طرح نام پیدا کرے گا۔

انگلستانی بچّوں کا کارنامہ

تنگ برج ویلس کینٹ کے بچّوں نے ایک بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔ (یہ جگہ انگلستان کے جنوب مشرق میں ہے) بہت بڑا۔ اس کی بدولت بہار کے قحط والے علاقے کے لگ بھگ ۵ ہزار بچے فایدہ اٹھائیں گے۔ اس سلسلے میں ۲۶۲۵۰ ہزار روپیہ کی رقم چندے میں جمع ہوئی ہے اور اس میں سے آدھی سے زیادہ رقم ان بچّوں نے جمع کی ہے۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ بچے پوری لگن، مستقل مزاجی اور پکّے ارادہ سے اس کام میں نہ جٹ جاتے تو کامیابی ناممکن تھی ان بچّوں نے اپنے اسکولوں کی چھٹیوں کا اچھا خاصا حصّہ اسی کام کے لیے وقف کر دیا تھا۔ سائیکلوں پر چڑھ کر گھومے پھرے اور چندہ جمع کیا۔ خود ہمارے دیس کے نونہالوں نے بہار کے ان فاقوں کے مارے بھائیوں کی مدد کے لیے کوئی کوشش کی ہے تو اس کی اطلاع پاکر ہمیں بڑی خوشی ہوگی۔

ننھّے آرٹسٹوں نے اپنے آرٹ کا کمال دکھایا

کئی سال سے مشہور اخبار شنکر ویکلی کی طرف سے بچّوں کے آرٹ کا عالمی مقابلہ ہو رہا ہے۔ عالمی یا بین الاقوامی مقابلے کا مطلب یہ ہے کہ بہت سے ملکوں کے بچّے ان مقابلوں میں حصّہ لیتے ہیں۔ اس سال دلّی کے لڑکوں کا یہ مقابلہ پچھلے مہینے ماڈرن ہائی اسکول میں ہوا۔ ۱۵ ہزار سے زیادہ بچّوں نے شرکت کی۔ بالکل میلا سا لگتا تھا۔ اسکول کے میدان میں جگہ جگہ کھانے پینے کی اور مصوّری کے سامان کی دوکانیں لگ گئی تھیں۔ چار پانچ سال کی عمر کے بچّوں سے لے کر سولہ سال تک کی عمر کے بچے اس میں شریک تھے۔ پانچ سے سولہ سال کے بچّوں کو تو عنوان بتا دیے گئے تھے۔ پانچ سے چھوٹی عمر کے بچّوں کو آزادی دے دی گئی تھی کہ جیسی چاہیں تصویر بنائیں۔ بعض ننھے منّوں کے لیے برش اور کلر بکس وغیرہ تو بس جیسے کھلونے تھے۔ آٹھ سے سولہ برس کے لڑکوں نے چار گھنٹے تک بہت محنت اور توجہ سے تصویریں بنائیں۔ پر ان ننھے منّوں میں سے بعض کے تو ہاتھ منھ کپڑے سب رنگے ہوئے تھے۔

نیشنل ہائی اسکول واپولی کی سلور جوبلی

پچھلی ۲۶ فروری کو نیشنل ہائی اسکول واپولی کی سلور جوبلی بہت اہتمام سے منائی گئی۔ مہاراشٹر کے ضلع رتناگری میں یہ پہلا اسکول ہے جس میں پڑھائی اردو میں ہوتی ہے یہ ۱۹۳۰ء میں قائم ہوا تھا اور ماشاء اللہ اس نے خوب ترقی کر لی ہے۔ اس کامیاب تقریب پر ہم جناب پرنسپل صاحب کو

اور ان کے ساتھیوں خصوصاً خاور صاحب کو دلی مبارکباد دیتے ہیں۔

گورے گاؤں (ضلع قلابہ) کے اردو اسکول کا شاندار تعلیمی پروگرام

یہ تعلیمی جلسہ جناب ابراہیم صاحب اسمٰعیل نور کی صدارت میں منعقد ہوا۔ ہیڈ ماسٹر جناب محمد قاسم صاحب شیخ محمود کردی کر کی استقبالیہ تقریر اور صدر کی صدارتی تقریر کے بعد بچوں کے قلمی رسالے 'قاصد' کا افتتاح کیا گیا۔ پھر تعلیمی نمائش کا افتتاح ہوا۔ اس کے بعد اسسٹنٹ ڈپٹی جناب دلاور خاں صاحب دیشمکھ کے ہاتھوں تقریر و تحریر میں امتیازی حیثیت پانے والے بچوں کو انعامات دیے گئے۔ آخر میں تفریحی پروگرام ہوا۔ بچوں نے کئی دل چسپ ڈرامے پیش کیے۔

نیشنل اردو ہائی اسکول کلیان میں انعام تقسیم کرنے کا جلسہ

جلسہ نیشنل ہائی اسکول کے احاطے میں الہاس نگر کالج کے پرنسپل سر پدھے کی صدارت میں منعقد ہوا۔ معزز مہمانوں کے علاوہ آس پاس کے علاقے کے بھی بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ استقبالیہ، صدر کی، پروفیسر سنگھ اور دلارے صاحب کی تقریروں کے بعد نذیر احمد صاحب نے انعام تقسیم کیے۔ آخر میں تفریحی پروگرام ہوا۔ فینسی ڈریس میں عبدالمجید گولنداز اور ڈرامے میں سراج احمد جل گاؤنکر۔ لیاقت دادا بھائی اوّل سکندر علی محمد بہترین قرار دیے گئے۔ مشتاق احمد دلارے قوالی اور کورس میں اوّل آئے۔ موسیقی کا انعام اسلم حاجی میاں ڈونگ کو دیا گیا۔

اٹھارہ زبانوں کے ماہر

ابھی تھوڑے دنوں پہلے کی بات ہے بنارس ہندو یونیورسٹی نے ایک بزرگ رام کمار چوبے کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری دی ہے۔ ڈاکٹر چوبے دنیا میں غالباً پہلے شخص ہیں جنھوں نے اٹھارہ زبانوں میں ام۔اے پاس کیا ہے۔ اس وقت آپ کی عمر لگ بھگ ۷۲ سال ہے۔ کاشی و دیا پیٹھ میں اعزازی پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے بنارس ہندو یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے۔
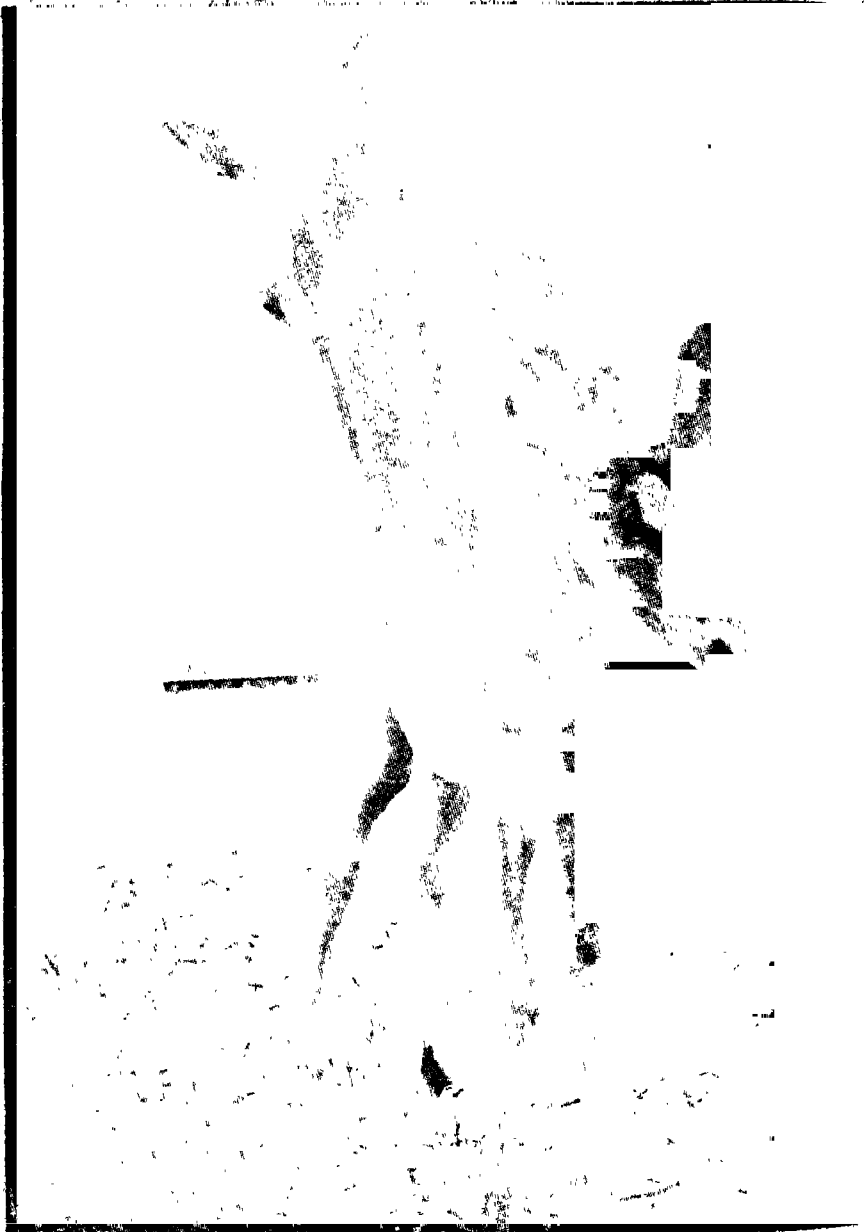
مغربی جرمنی کی ایک حیرت انگیز گھوڑی "ہالا"

7.

Regd. No. D. 145

Payam—i—Taleem

New Delhi-25.

بچوں کے لئے

اسکو میں چھپی ہوئی رنگین تصویروں والی
خوبصورت کتابیں جو دلچسپ بھی ہیں اور سستی بھی

		صفحات		قیمت		
●	چوزہ		۱۶		۲۰	پیسے
●	دستانہ	〃	۲۰	〃	۳۰	〃
●	ڈڈ کہانیاں	〃	۲۰	〃	۳۰	〃
●	گیہوں کی بالی	〃	۱۶	〃	۳۰	〃
●	تصویروں میں چٹ پٹی کہانیاں	〃	۵۲	〃	۷۵	〃
●	روی اور ششی	〃	۶۸	〃	۶۰	〃
●	تین بھالو	〃	۱۶	〃	۴۰	〃
●	نیلا پیالہ	〃	۹۴	〃	۱۲۵	〃
●	میشکا	〃	۱۶	〃	۳۰	〃

ان میں سے چوزہ ½ ۱۰ × ۲۲ سنٹی میٹر اور باقی سب کتابیں
[illegible] ½ ۲۲ × ۲۹ سنٹی میٹر [illegible]

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی

ممّی! ــــ بتائیے میرا ایک جوتا کہاں ہے؟

فوٹو: شاہد علی خان

یمہ (نیویل)، عمر ۱ سال

نادرہ (تاشقند)، عمر ۲ سال

سلطان چک (تاشقند)، عمر ۲½ سال

کریم عبدالرحمٰن (نیروبی)، عمر ایک سال

حمیدالزماں (کامتی)، عمر ۱ سال

سلمیٰ (راجیشور)، عمر ۹ ماہ

نور جہاں (احمد آباد)، عمر ۳½ سال

فیروز اختر (سہرام)، عمر ۷ سال

شانتی رنجن بھٹاچاریہ

قیصر سرمست

محمد امین

کلیم راہی

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم

دہلی

جلد ۴

شمارہ ۵

مئی ۱۹۶۷ء

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنس بلڈنگ جے جے ہسپتال بمبئی ۳

فی پرچہ: پچاس پیسے

سالانہ چندہ: پانچ روپے

بچوں کے لیے دلچسپ و معلوماتی کتابیں

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
اٹیم کیا ہے	پ. گنا سیکر	/۶۵	سورج کا گھرانا	اے. دی. ایس. راما راؤ	/۷۵
اکبر اور بیربل کے لطیفے	مرتبہ اظہر پرویز	/۴۰	سائنس کی دنیا	وزارت حسین	۲/۵۰
انوکھی مشین	دیبداس داس گپتا	۱/۲۵	سائنس کے کرشمے	"	۲/۰۰
باپو کے قدموں میں	منو بہن گاندھی	۱/۰۰	ستاروں کی دنیا ہت دور تک	اظہر پرویز	۲/۰۰
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	شرابی	"	/۵۶
بچوں کے اقبال	مرتبہ اظہر پرویز	/۵۰	شہر اور گاؤں	نریشور شرما	/۷۵
بچوں کے حالی	"	/۷۵	کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/۲۵
بچوں کی معلومات	قدسیہ بیگم	/۷۵	مندر	وسنت نیل کنٹھ گدرے	/۷۵
بچوں کی سائنس	اظہر پرویز	۱/۰۰	مصنوعی چاند	اظہر پرویز	۱/۵۰
پنچ تنتر کی کہانیاں اول	شگفتہ دہلوی	/۷۵	نہر ذا مربی	فصاحت حسن خاں	۱/۰۰
پنچ تنتر کی کہانیاں دوم	"	/۷۵	نیا تیرتھ	راجندر اوستھی ترشٹ	۱/۰۰
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	/۷۵
توانائی کا راز	اظہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین	۲/۰۰
چار درویش	پدونا تھ تھٹے	۱/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیرج موہن سیناپتی	۱/۰۰
خلا کا سفر	اظہر پرویز	۱/۲۵	ہمارا ذہن	وریجا اڈو پا	۱/۰۰
روشنی کے مینار	جے بھکو	/۷۵	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسن	۱/۰۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

سرورق کی تصویر... ننھا مستری

فوٹو فضل الرحمٰن

فہرست

بچوں سے باتیں

آپ کو اپریل کے پیام تعلیم کا اچھا خاصا انتظار کرنا پڑا۔ تھوڑے ہی دنوں میں دفتر میں خطوں کے ڈھیر لگ گئے۔ خدا کرے یہ پرچہ آپ کو وقت پر ملے۔

لیجیے بھئی، دیکھتے دیکھتے گرمیوں کا موسم بھی آگیا۔ گرمیوں کا بھی امتحان کا بھی۔ کہیں کہیں تو اس پرچے کے پہنچتے پہنچتے امتحان شروع بھی ہوگئے ہوں گے۔

اس پرچے میں امتحان کی تیاری پر ایک مضمون شایع ہو رہا ہے۔ اس پر ایک نظر ضرور ڈال لیجیے۔ آپ کے لیے بہت کارآمد ہے۔ دلی دعا ہے کہ ہمارے سب پیامی ان امتحانوں میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہوں۔ آمین!

اے لیجیے حاجی بابا صاحب بمبئی سے دلّی آتے آتے کہیں راستے میں اٹک گئے۔ ظ۔ انصاری صاحب کی اطلاع یہ ہے کہ بمبئی سے بہت دن ہوئے روانہ ہو چکے ہیں۔ نہ جانے بے چارے پر راستے میں کیا بیتی۔ ویسے خود انصاری صاحب کو شبہ یہ ہے کہتے ہیں کچھ غلطی ہو گئی ہے۔ بہر حال ہمارے آپ کے دونوں کے لیے افسوس کی بات ہے کہ اس مرتبہ ان کی

زیارت سے محروم رہے۔

انصاری صاحب کا خط آنے کے بعد ہم نے بہت دنوں تک حاجی صاحب کا انتظار کیا، مضمونوں کی ترتیب کا کام ملتوی کر دیا۔ پر انتظار کرتے کرتے آنکھیں پتھرا گئیں اور وقت آخر آ گیا تو خیال چھوڑ دیا۔ غالباً اگلے پرچے میں ہم ان کے بارے میں کچھ بتا سکیں۔

پنچ تنتر کے عنوان سے اس پرچے میں ہم ایک نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں۔ یقین ہے کہ یہ سلسلہ آپ کو بہت پسند آئے گا۔ یہ ایک پرانے، بہت پرانے ہندی عالم کی لکھی ہوئی کہانیاں ہیں۔ بہت ہی دلچسپ، بہت ہی مزے دار۔ عقل، حکمت، سوجھ بوجھ کو ان کہانیوں میں کچھ ایسا سمو دیا ہے کہ واہ واہ۔ جبھی تو اب سے سینکڑوں سال سے ان کا عربی، فارسی اور نہ جانے دنیا کی کتنی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

کچھ دنوں سے مدرسوں خصوصاً اردو مدرسوں کی علمی ادبی سرگرمیوں کا ذکر پیامِ تعلیم میں نہیں آ رہا تھا۔ اب یہ سلسلہ ہم پھر شروع کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ صرف مہاراشٹر کے اسکولوں کا حال ہے لیکن دوسرے صوبوں کے مدرسوں کے بچے اپنے ہاں کی سرگرمیوں کا حال لکھ کر بھیجیں گے تو ہم بڑی خوشی سے شائع کریں گے۔

پیامیوں کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ ان کے محترم مضمون نگار جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ جی کو ان کی تصنیف "تذکرہ تصنیف اردو بنگالہ" پر اورنٹل کالج بمبئی نے ڈی لٹ کی ڈگری دی ہے۔ بنگال میں شروع سے لے کر اب تک اردو کی جتنی بھی کتابیں چھپی ہیں اس کتاب میں ان سب کا ذکر ہے۔ بھٹاچاریہ جی نے بنگالی ہندوؤں کی اردو خدمات کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی ہے۔ مشرقی بنگال کی حکومت کی طرف سے اس کتاب پر انھیں پانچ ہزار روپیہ انعام بھی مل چکا ہے۔ اس کامیابی پر ہم اپنی اور اپنے پیامیوں کی طرف سے بھٹاچاریہ جی کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

مولانا اسمٰعیل میرٹھی مرحوم کو آپ اچھی طرح جانتے پہچانتے ہوں گے۔ بچوں کے بہت بڑے شاعر تھے، بہت بڑے ادیب تھے۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں وہ اس دنیا سے رخصت ہوئے تھے۔ ہمارے بزرگوں اور ساتھیوں کا خیال ہے کہ اگلے نومبر میں ان کی یادگار منائی جائے اور پیامِ تعلیم کا ایک خاص نمبر نکالا جائے۔ آپ بھی ہمیں اپنی رائے بتائیے۔

جناب سعادت نظر

میرے استاد

میرے استاد جو ہیں دانا ہیں
اپنے اپنے ہنر میں یکتا ہیں
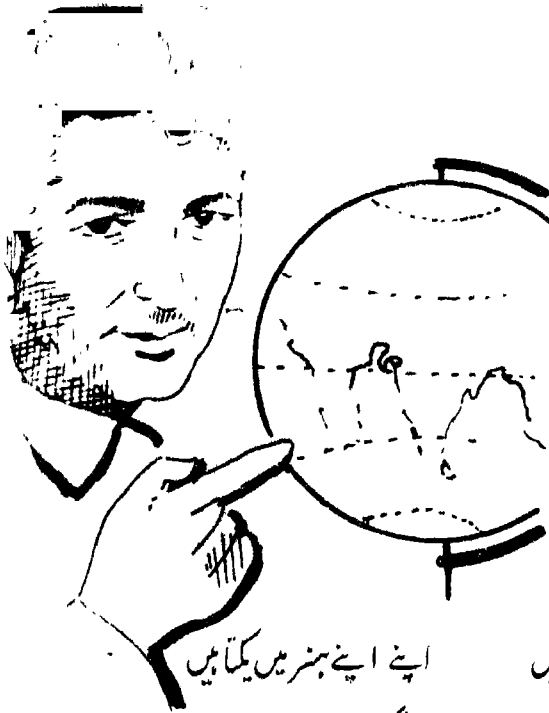
ڈھنگ جینے کا جو سکھاتے ہیں
"زندگی کیا ہے" وہ بتاتے ہیں

یہ فضا کیا ہے؟ یہ جہاں کیا ہے
یہ زمین اور آسماں کیا ہے

ان سے پوچھو ترقیوں کا راز
کہ سمجھتے ہیں وقت کی آواز

ان کے سینے میں لاکھوں گوہر ہیں
یعنی وہ علم کے سمندر ہیں

ان سے بڑھتا ہے ملک کا معیار
اور سنورتا ہے قوم کا کردار

ان سے تہذیب کی بہار بھی ہے
علم کے چہرے پر نکھار بھی ہے

جناب رفیق محمد خاں شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

آپ نے شیر اور خرگوش کی کہانیاں پڑھی ہوں گی اپنی عقل مندی سے خرگوش شیر سے کنویں میں جست لگوا کر تمام جنگل کے جانوروں کی حفاظت کرتا ہے۔ اسی طرح کبوتروں کے جال لے اُڑنے اور چوہے سے جال کٹوا کر شکاری کے پھندے سے بچ نکلنے کی کہانی ہے پھر بگلوں اور کچھوے کی کی دوستی کی کہانی ہے۔ اسی طرح بیل اور شیر، گیدڑ اور خرگوش، رنگے سیار، بندر اور بڑھیا وغیرہ کی بے شمار کہانیاں آپ نے سنی ہوں گی پڑھی ہوں گی، چرندوں پرندوں کی یہ کہانیاں ہزاروں سال سے ہمارے ملک میں سُنی اور سنائی جا رہی ہیں۔ "پنچ تنتر" نام کی ایک کتاب اسطرح کی بے شمار کہانیوں کا یوں سمجھیے کہ خزانہ ہے۔ اور جن کہانیوں کا ذکر ہوا وہ بھی اسی کتاب سے لی گئی ہیں۔

"پنچ تنتر کی کہانیوں کا شمار دنیا کی مقبول ترین کہانیوں میں ہے — ان کہانیوں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ عربی زبان میں "کلیلہ و دمنہ" کے نام سے اس کا ترجمہ کافی مقبول ہوا ہے۔

تو بھی پنچ تنتر کی کہانیاں چرندوں اور پرندوں کی کہانیاں ہیں۔ اور کسی خاص موضوع کو لے کر ایک میں سے ایک کہانی پھوٹتی چلی جاتی ہے۔

ہر ملک میں اس کی لوک کتھاؤں یا کہانیوں کا ایک خاص مقام ہوتا ہے۔ یہ کہانیاں دو طرح کی ہوتی ہیں تفریحی یا تعلیمی۔ پنچ تنتر کی کہانیوں میں دونوں باتیں ملی ہوئی ہیں۔ یہ کہانیاں اتنی دل چسپ ہیں کہ ایک بار ہاتھ لگ جائیں تو چھوڑنے کو جی نہ چاہے مگر یہ صرف دل چسپی اور تفریح کا سامان فراہم نہیں کرتی ہیں۔ ان میں ہندوستان کے علم و دانش اور حکمت

علی کا نچوڑ بھی موجود ہے۔ ہر کہانی کا ایک خاص مقصد ہے۔

یہ کہانیاں سنسکرت میں ہیں وشنو شرما نام کے ایک عالم نے ان کہانیوں کو مرتب کیا تھا۔

کہانیاں کیوں لکھی گئیں:-

ہمارے دیس کے جنوب میں مہیلا دوپیہ نام کا ایک شہر تھا۔ وہاں ایک بہادر اور رحم دل راجہ امرشکتی راج کرتا تھا۔ امرشکتی کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اس کا خزانہ ہیرے جواہرات سے بھرا ہوا تھا۔ مگر اس کے تینوں بیٹے نکمّے اور کم عقل تھے۔ راجہ کو اس بات کا بہت غم تھا۔

ایک دن راجہ نے اپنے وزیروں کو بلایا اور لڑکوں کی تعلیم و تربیت کی طرف سے تشویش کا اظہار کیا۔ راجہ امرشکتی کی حکومت میں اس وقت پانچ سو عالموں کو وظیفہ دیا جاتا تھا مگر ان میں سے کوئی ایسا نہیں تھا جو شہزادوں کی مناسب تعلیم و تربیت کی ذمہ داری لے سکتا۔ بالآخر ایک وزیر کے مشورے سے راجہ نے وشنو شرما نام کے ایک برہمن کو شہزادوں کی تعلیم کے لیے مقرر کیا۔

راجہ نے وشنو شرما کو بلا کر کہا کہ اگر آپ میرے بیٹوں کو حکمتِ علی کی تعلیم دے دیں تو میں آپ کو ایک سو گاؤں انعام میں دوں گا۔

وشنو شرما نے جواب دیا کہ مجھے انعام کا لالچ نہیں مگر میں چھ مہینے کے اندر شہزادوں کو سیاست اور حکمتِ علی کے تمام گُر سمجھا دوں گا۔

وشنو شرما نے شہزادوں کو حکمتِ علی کی تعلیم دینے کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں اور ان کے ذریعے شہزادوں یا راج کماروں کو حکمت اور منطق کی تعلیم دی۔

یہ کہانیاں پانچ حصوں میں یا پانچ تنتروں میں بانٹی گئی ہیں اس لیے ان کہانیوں والی کتاب کا نام پنچ تنتر رکھا گیا ہے۔

تینوں شہزادے ان کہانیوں کو سُن سُن کر حکومت کے انتظام کے سارے گُر سیکھ گیے اور با کمال انسان بن گیے۔ ارے آپ تو جیسے اکتا گیے۔ اچھا لیجیے ہم کہانی شروع کرتے ہیں۔

دوست دشمن کی پہچان:-

مہیلا دوپیہ شہر میں وردھ مان نامی ایک بنیا رہتا تھا اس نے کافی دولت جمع کی تھی۔ پر وہ اور دولت کمانا چاہتا تھا۔ اس نے باہر سے مال لاکر

بیچنے کا ارادہ کیا۔ متھرا جانے کی ٹھہری۔ اس نے ایک رتھ تیار کروایا۔ اس رتھ میں دو خوبصورت بیل جتے تھے۔ ان میں سے ایک بیل کا نام سنجیوک تھا دوسرے کا تیوک۔

وردھ مان کا رتھ جمنا کے کنارے پہنچا تو سنجیوک کا پاؤں دَل دَل میں پھنس گیا۔ دَل دَل سے باہر نکالنے کی کوشش میں بے چارے کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ وردھ مان کو بڑا رنج ہوا۔ بیل کی ٹانگ ٹھیک ہو جانے کی امید میں وہ تین دن تک وہیں رُکا رہا۔ آخر اس نے ایک آدمی کو بیل کی دیکھ بھال کے لیے چھوڑ دیا کہ جنگل کے خوف ناک درندے اسے نقصان نہ پہنچائیں اور خود آگے بڑھ گیا۔

یہ آدمی شیر اور چیتوں کے ڈر سے اپنی جان بچا کر بھاگ آیا اور مالک سے کہا سنجیوک مر گیا۔

ادھر سنجیوک جمنا کنارے کی ٹھنڈی ہوا اور گھاس کھا کھا کر خوب موٹا تازہ ہو گیا۔ دریا کے کنارے دن بھر سیر گشت کرنا اور جھاڑیوں میں سینگ پھنسا کر جھومنا بس یہی اس کا کام تھا۔

ایک دن پنگ لک نام کا ایک شیر جمنا کنارے پانی پینے آیا۔ شیر نے دور سے بیل کی پھپھکار سُنی۔ اس پھپھکار سے ڈر کر وہ ایک جھاڑی میں جا چھپا۔

شیر کے پیچھے پیچھے دو گیدڑ بھی تھے۔ ان کے بھی بھلے نام تھے۔ کرکٹ اور دمنک۔ دونوں ہمیشہ شیر کے پیچھے پیچھے لگے رہتے تھے۔ شیر کو ڈرا سہما دیکھ کر انھیں بہت اچنبھا ہوا۔ بھلا جنگل کے راجہ کا اس طرح سہم جانا اس طرح ڈر جانا! اچنبھے کی بات تو تھی ہی۔

دمنک نے اپنے ساتھی کرکٹ سے کہا۔ پنگ لک اس جنگل کا راجہ ہے۔ سبھی جانور اس سے ڈرتے ہیں لرزتے ہیں۔ آج وہ اس طرح ڈر کر چھپ گیا۔ پیاسا تھا پر پانی پیے بغیر ہی دریا سے لوٹ آیا۔ آخر یہ ڈر کاہے کا؟

کرکٹ نے جواب دیا۔ اے دمنک وجہ چاہے کچھ ہو ہمیں اس سے کیا دوسرے کے معاملوں میں دخل دینا ٹھیک نہیں۔ جو ایسا کرتا ہے وہ اس بندر کی طرح تڑپ تڑپ کر مرتا ہے جس نے دوسرے کے کام میں بے کار دخل دینے کی کوشش کی تھی۔

دمنک نے کہا:- ایں؟ یہ بندر کی کیا بات کہی تم نے۔

کرکٹ نے جواب دیا۔ لو سنو.....

(اگلی کہانی اگلے پرچے میں)

جناب افتخار اعظمی

چندا ماموں

امّی امّی اچھی امّی
چندا ماموں کے گھر آخر بولو ہم کب جائیں گے ؟
اور وہاں سے یہاں کی خاطر کیا کیا چیزیں لائیں گے ؟
امّی امّی اچھی امّی ——————— کیا کیا چیزیں لائیں گے ؟

چندا ماموں کے گھر امّی کھیل تماشا ہوتا ہے؟
برف ملائی کی خاطر کیا وہاں بھی پپّو روتا ہے؟
امّی امّی اچھی امّی ——————— وہاں بھی پپّو روتا ہے

صبح سویرے وہاں بھی سب کو مکتب جانا ہوتا ہے
رات میں گھر پہ ابّا جی کو سبق سنانا ہوتا ہے
امّی امّی اچھی امّی ——————— سبق سنانا ہوتا ہے

وہاں بھی امّی کرکٹ، لوڈو اور کبڈّی ہوتی ہے
اوں اوں کرتی پاؤں پسارے مُنّی ہردم روتی ہے
امّی امّی اچھی امّی ——————— منی ہردم روتی ہے

چندا ماموں کے فوٹو ہم لوگ وہاں سے لائیں گے
پھر وہ فوٹو مکتب میں سب لڑکوں کو دکھلائیں گے
امّی امّی اچھی امّی ——— لڑکوں کو دکھلائیں گے

امّی امّی اچھی امّی
چم چم کرتے
چھم چھم کرتے
چندا ماموں کے گھر بولو آخر ہم کب جائیں گے
اور وہاں سے یہاں کی خاطر کیا کیا چیزیں لائیں گے
امّی امّی اچھی امّی ——— کیا کیا چیزیں لائیں گے۔

جناب نشاط اکبری

تلیگو کہانی

آدھا آنہ

کہتے ہیں کسی شہر میں ایک سود کا بیوپاری رہتا تھا۔ وہ اپنے اس بیوپار سے لوگوں کو خوب لوٹتا تھا۔ ایک دن ایک بڑھیا اس کے پاس آئی اور کہا "میں سنتی ہوں کہ تم سودی کاروبار کرتے ہو۔ میرے پاس کچھ پیسے ہیں میں ان کو تمھارے بیوپار میں لگانا چاہتی ہوں کیا تم اس طرح میری مدد کرنے کے لیے تیار ہو؟"

یہ سن کر بیوپاری کہنے لگا "بڑی بی! میں ہر آدمی کو قرض دے کر واجبی سود حاصل کرتا ہوں لیکن منافع میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ تمھاری بات اور ہے اس لیے تم بے خوف مجھ پر بھروسا کر سکتی ہو اگر تم میرے پاس اپنی پونجی رکھو گی تو چھ مہینے میں ہی دوگنا چوگنا منافع حاصل کر سکو گی۔"

بڑھیا نے فوراً ہی بیوپاری کے ہاتھ پر آدھا آنہ رکھ دیا اور کہا "یہی میری کُل پونجی ہے اس کو تم اپنے بیوپار میں لگا لو اگر میں زندہ رہی تو پھر آؤں گی خدا حافظ!" یہ کہہ کر بڑھیا اپنے گھر لوٹ آئی۔

اس واقعہ کے بعد کئی سال تک بڑھیا نے بیوپاری کے گھر کا رخ بھی نہیں کیا چونکہ یہ ایک معمولی سی بات تھی نہ کاغذ نہ کھاتا اس لیے بیوپاری بھی بھول گیا۔ لیکن بارہ برس کے بعد بڑھیا اچانک بیوپاری کے پاس آئی اور بیوپاری سے اپنے حصے کا منافع مانگا۔

بیوپاری بہت حیران ہوا اور کوشش کرنے کے باوجود اسے کچھ بھی یاد نہ آسکا۔ بڑھیا نے ذرا

تفصیل سے اپنی بات دہرائی اور اس کا عہد یاد دلایا۔ تب بیوپاری کو بھی یاد آیا بولا "بڑی بی! تم سچ کہتی ہو میں تو تمھیں اور تمھارے پیسوں کو دونوں کو بھول گیا تھا۔ ہاں تو کتنے پیسے تھے تمھارے؟"

"آدھا آنہ" بڑھیا نے فوراً جواب دیا یہ سن کر بیوپاری نے کچھ اوپری حساب کرکے کچھ رقم اپنے جیب سے نکالا اور کہا "یہ لو تمھارا حساب ختم ہوا" جب بڑھیا نے دیکھا کہ بیوپاری صرف دو روپے دے رہا ہے تو اس نے لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا "کیا تم مجھے بھیک دے رہے ہو؟ ٹھیک ٹھیک حساب کرکے میرا منافع دو ورنہ میں یہاں سے ٹلنے کی نہیں" ان دونوں کی تکرار اور لڑائی سن کر قریب گذرنے والے بہت سے لوگ جمع ہو گئے "اور کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟" کئی آوازیں مجمع کی طرف سے آنے لگیں بڑھیا نے لوگوں کو سارا واقعہ بتا دیا اور ان کی مدد چاہی یہ سن کر لوگ بیوپاری کو بُرا بھلا کہنے لگے اور بیوپاری کو حساب کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب مجبوراً بیوپاری کو بڑھیا کا حساب دیکھنا ہی پڑا جب حساب کیا گیا تو سودی کاروبار کے مطابق بارہ برس کے ۱۴۴ آدھے مہینے ہوتے ہیں اور آدھا آنہ بھی ۱۴۴ گنا ہوجاتا ہے اس طرح بڑھیا کے آدھا آنے کے بارہ برس میں پانچ لاکھ چوبیس ہزار دو سو اٹھاسی روپے ہوتے ہیں۔

یہ سُنتے ہی سود خور کا خون خشک ہو گیا۔

ذرا آپ بھی حساب لگا یئے۔ بھلا آدھ آنے سے اتنی رقم کیسے ہوگئی۔

●●

الکزنڈر رسکن
ترجمہ ڈاکٹر اظہر انصاری

اباجان کی گیند

اپنے بچپن میں اباجان پالو دا پو ساد کے چھوٹے سے شہر میں رہا کرتے تھے۔ ان کے ابا جان نے انھیں خوبصورت سی گیند خرید دی تھی۔ وہ گیند سورج جیسی تھی۔ بلکہ سورج سے بھی اچھی تھی اس لیے کہ بلا پلکیں مارے اسے گھورا جاسکتا تھا۔ وہ سورج سے چوگنی خوبصورت تھی۔ چار قسم کے رنگوں سے رنگی ہوئی تھی۔ سورج تو صرف ایک ہی رنگ کا ہوتا ہے اور پھر کوئی یہ نہیں بتا سکتا کہ وہ اصل میں کس رنگ کا ہے۔ وہ گیند ایک طرف گلابی رنگ کی تھی۔ جیسے پیپرمنٹ دوسری طرف کتھئی رنگ کی جیسے چاک لیٹ۔ اوپر کا حصہ نیلا تھا جیسے آسمان اور نچلا حصہ سبز جیسے دوب۔ پالو دا پو ساد کے چھوٹے سے شہر میں کسی نے ایسی خوبصورت گیند نہیں دیکھی تھی۔ اس کو ماسکو میں خریدا گیا تھا۔ شاید ماسکو میں بھی اس قسم کی گیندیں بہت کم ملتی ہوں۔ اس کو دیکھنے کے لیے بڑے لوگ بھی آیا کرتے تھے اور اسے دیکھتے ہی کہہ اٹھتے "اُف فوہ! کتنی خوبصورت گیند ہے!!

اور سچ مچ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اباجان کو اس پر بے حد فخر تھا۔ اس کو لے کر وہ ایسے گھومتے جیسے اس کے کے موجد وہی ہوں۔ چار طرح کے رنگوں سے انھی نے رنگا ہو۔ جب ابا جان اس گیند کو لے کر باہر کھیلنے جاتے تو چاروں طرف سے لڑکے دوڑکر جمع ہو جاتے اور کہتے۔

"آہا۔ کتنی خوبصورت گیند ہے!! کیا تم ہمیں بھی اس گیند سے کھیلنے دوگے؟"

لیکن اباجان اس گیند کو بغل میں دبا کر غراتے۔

"نہیں میں تمھیں اس گیند سے ہرگز نہ کھیلنے دوں گا۔ یہ میری گیند ہے۔ یہ ماسکو میں خریدی گئی ہے۔ بھاگ جاؤ۔ میری گیند کو ہاتھ نہ لگاؤ۔"

لڑکے ان سے کہتے۔ "تم لالچی ہو پہلے درجے کے لالچی۔"

ابا جان ان کی باتوں کی بالکل پرواہ نہ کرتے
وہ ان لڑکوں کو گیند سے کھیلنے کی اجازت دینے پر تیار
نہ ہوتے۔ وہ اس سے خود اکیلے کھیلتے پر اکیلے کھیلنے
میں کہیں کھیل کا مزا آتا ہے! اس وجہ سے خود غرض ابّا
جان اس گیند کو لڑکوں کے پاس تھڈائے جا کر کھیلتے
تاکہ ان میں حسد کا مادّہ پیدا ہو۔ تب سب لڑکے مل کر ان
کو چڑھاتے۔

"یہ خود غرض لڑکا ہے۔ ہم لوگ اس کے ساتھ
ہرگز نہیں کھیلیں گے۔"

دو دن تک لڑکوں نے ابا جان کا بائیکاٹ کیے رہے
تیسرے دن انھوں نے کہا۔

"تمھاری گیند بدصورت تو نہیں۔ بڑی بھی ہے
اس کے رنگ بھی خوش نما ہیں اگر تم اس کو موٹر کے
نیچے پھینکو گے تو وہ بھی دوسری گیندوں کی طرح
پھٹ جائے گی۔ پھر تم کس بات پر اتنا اکڑتے ہو؟"
"ابا جان نے تن کر جواب دیا" میری گیند ہرگز ہرگز
نہیں پھٹے گی۔"

"ہوں پھٹے گی کیوں نہیں" لڑکوں نے مل کر کہا۔
"بالکل نہیں ہرگز نہیں"
"اچھا دیکھو وہ موٹر آ رہا ہے۔ جاؤ اس کے
نیچے پھینک کر تو دیکھو؟ کیوں ہچکچا رہے ہو؟"

ابا جان نے گیند موٹر کے نیچے پھینک دی۔
کچھ دیر تک سب لڑکے وہاں کھڑے دیکھتے رہے۔ گیند
پہلے سامنے کے پہیے سے ٹکرائی اور پھر داہنے ہاتھ
کے پچھلے پہیے کے نیچے آ گئی۔ موٹر اچھلا گیند پر سے
گذرتا ہوا فراٹے بھرتا ہوا چلا گیا۔ وہ گیند وہیں پڑی
رہی۔

"وہ نہیں پھٹی۔ نہیں پھٹی" ابا جان اک دم سے
چلائے اور اس کو لینے دوڑے۔ فوراً ایک دھماکا ہوا
ایسا لگا جیسے کسی نے توپ داغ دی ہو۔ یہ گیند کی آواز
تھی۔ آخر گیند پھٹ گئی۔ جب ابا جان اس کے قریب
پہنچے تو انھوں نے وہاں ربر کا ایک ڈھیر پایا۔ اس کی
ساری خوبصورتی غائب ہو چکی تھی۔ ابا جان رونے لگے
اور گھر کی طرف بھاگے۔ سارے لڑکے ان کے پیچھے
دوڑ رہے تھے اور قہقہہ لگا رہے تھے۔
"وہ پھٹ گئی! وہ پھٹ گئی اور تم کو خود غرضی کا
پھل مل گیا۔"

ابا جان نے گھر میں آ کر اپنی اماں جان (یعنی دادی
جان) کو بتایا کہ انھوں نے اپنی گیند موٹر کے نیچے پھینک
دی تھی۔ تو دادی جان نے ان کے کان اینٹھے۔ شام کو
جب دادا جان اپنا کام ختم کر کے گھر آئے تو انھوں نے بھی
گوشمالی کی۔ دادا جان نے تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

"میں تم کو تمھارے گیند کی سزا نہیں دے رہا ہوں بلکہ تمھاری بیوقوفی کی سزا دے رہا ہوں"

ایک زمانے تک لوگوں میں چرچا رہا کہ کیسے کوئی اتنی خوبصورت گیند کو جان بوجھ کے موٹر کے نیچے پھینک سکتا ہے۔ وہ کہتے۔

"ضرور کوئی بہت ہی بیوقوف لڑکا ایسی حرکت کر سکتا ہے"

عرصے تک لڑکے ابّا جان کو چڑھاتے رہے۔

"اجی حضرت! آپ کی خوبصورت گیند کیا ہوئی؟

لیکن ابا جان کے پڑوس میں جو صاحب رہتے تھے۔ انھوں نے مذاق نہیں اڑایا۔ انھوں نے ابّا جان سے پورا واقعہ دہرانے کو کہا۔ جب وہ پوری کہانی سن چکے تو انھوں نے ابّا جان سے کہا۔

"تم بے وقوف لڑکے نہیں ہو"

ابّا جان بہت خوش ہوئے۔

"لیکن تم خود غرض ضرور ہو اس پر مزہ یہ کہ اکڑتے ہو۔ یہ بہت بڑی بات ہے۔ وہ لڑکا جو گیند اکیلے کھیلے گا۔ ہمیشہ نقصان اٹھائے گا۔ یہ بات صرف لڑکوں کے لیے ہی نہیں بلکہ بڑوں کا بھی یہی حشر ہوتا ہے۔ تم اگر اپنی عادت نہ بدلوگے تو ہمیشہ پچھتاؤگے"

ابّا جان پر بڑی طرح خوف طاری ہوگیا۔ وہ رونے لگے۔ وہ خود غرض نہیں بننا چاہتے تھے۔ وہ اتنی دیر تک روئے کہ پڑوسیوں کو ان پر رحم آگیا انھوں نے ابّا جان کو ایک نئی گیند خرید کر دی۔ یہ گیند پہلی والی گیند کی طرح خوبصورت نہ تھی لیکن اس گیند سے سب گلی کے لڑکے مل کر کھیلا کرتے اور ہر لڑکا خوش رہتا۔ اس کے بعد ———— کسی نے یہ نہیں کہا کہ ابّا جان خود غرض تھے۔

جناب نثار اعظمی

گلاب اور بچے

کہتے ہیں پھولوں کا راجہ ہے گلاب
شکل و صورت رنگ و بو میں لاجواب

جس چمن میں یہ نہیں وہ ہے اداس
دوسرے پھولوں میں وہ بو ہے نہ باس

سونی جیسے محفل انجم [illegible] ہے
بے مہ تاباں فلک گم سم رہے

یوں ہی بچے جب کسی آنگن میں ہوں
شہر میں یا ملک کے دامن میں ہوں

ہوں مزین علم سے اخلاق سے
نیک ہوں واقف ہوں وہ آداب سے

ماہ و انجم اور گل سے ہیں بھلے
ہر کوئی ان کو لگائے گا گلے

ان سے ہی مہکے گا پھر ہندوستاں
ان کے دم سے چمکے گا سارا جہاں

پیارے بچو! تم ہو اک تازہ گلاب
تم تو نہرو کے پسندیدہ گلاب
شوق سے سیکھو پڑھو ہر علم و فن
ہوگی اب تم سے ہی تزئین چمن

[illegible] اور پھول سے سنوارنا

ایک دن کی حکومت

(پرانے زمانے کی کہانی)

دنیا کے بڑے بڑے بادشاہوں میں ہارون رشید بھی ایک بڑا بادشاہ گذرا ہے۔ اس کی راجدھانی بغداد میں تھی۔

بغداد میں بڑے بڑے محل تھے، مسجدیں تھیں، کالج اور مدرسے تھے، جن میں دور دور سے پڑھنے کے لیے لڑکے آتے تھے۔ ان کے کھانے پہننے اور رہنے کا انتظام حکومت کرتی تھی۔

ہارون رشید بڑا اچھا بادشاہ تھا۔ وہ بھیس بدل بدل کر راتوں کو گشت کرتا اور اپنی رعایا کا حال دیکھتا کہ کوئی دکھی تو نہیں ہے، کسی پر کوئی ظلم تو نہیں کرتا، کوئی کسی کو ڈرا دھمکا کر رشوت تو نہیں لیتا؟

جب کبھی گشت کے لیے جاتا اپنے وزیر جعفر کو ساتھ رکھتا۔ ایک نوکر بھی ساتھ رہتا جس کا نام مسرور تھا۔

ایک دن یہ تینوں سوداگروں کا بھیس بنا کر شہر کے کوچوں میں پھرنے لگے اور پھر شہر کے باہر چلے گئے۔

ہارون رشید نے اپنے وزیر جعفر سے کہا۔

"جعفر! آج میرا دل نہیں لگتا، نہ جانے کیا بات ہے۔" ابھی بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ انہیں ایک نوجوان اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ ان تینوں کو بڑے ادب سے سلام کیا اور بولا:

"کیا آپ مسافر ہیں؟" جعفر نے بڑھ کر کہا۔

"ہاں میاں ہم مسافر ہیں اور ابھی اس شہر میں آئے ہیں، بغداد بہت بڑا شہر ہے، ہمیں یہاں کوئی جانتا بھی نہیں ہے۔ ہم سوچ رہے ہیں کہ رات کہاں گذاریں۔" نوجوان بولا "مرحبا! میری کیسی اچھی قسمت ہے کہ آپ جیسے شریف آدمی مل گئے۔ میری عادت ہے کہ کبھی کھانا اکیلے نہیں کھاتا، اگر کوئی جاننے والا

دوست یا عزیز رشتے دار نہیں ہوتا تو شہر سے باہر آکر جو کوئی مسافر مل جاتا ہے اسے اپنے ساتھ شریک کرلیتا ہوں۔ میرا مکان بہت بڑا اور عمدہ ہے اور فقط میرا ہی مکان نہیں شہر کے سب ہی مکان عمدہ ہیں۔ ہمارے بادشاہ نے کچھ ایسا انتظام کیا ہے کہ شہر کا کوئی مکان ٹوٹا پھوٹا نہیں ہے اور شہر کے رہنے والے سب آرام اور چین سے رہتے ہیں۔ ہمارا بادشاہ غریبوں کی سیوا کرتا ہے اور جس کسی پر کوئی ظلم کرتا ہے اسے ایسی سزا دیتا ہے کہ عمر بھر کے لیے توبہ کرلیتا ہے۔ اپنا ہو یا پرایا انصاف کی ترازو کسی طرف جھکتی نہیں ہے۔ آپ سب میرے گھر پر رات میں آرام کرلیں اور میرے ساتھ کھانا کھائیں۔"

ہارون رشید نے اپنے وزیر کو اشارہ کیا کہ اس نوجوان کی بات مان لینی چاہیے۔ پھر تینوں نوجوان کے ساتھ چل پڑے۔

نوجوان کا مکان بڑا شان دار تھا۔ بیٹھک میں ایرانی قالین بچھے تھے، ان پر رنگ برنگ کے تکیے لگے تھے۔ چاروں طرف آئینے تھے، جھاڑ فانوس تھے جن میں کافوری بتیاں تھیں۔ پوری بیٹھک خوشبو سے مہک رہی تھی۔ نوجوان نے خوش آمدید کہہ کر مہمانوں کا استقبال کیا

نوجوان کا نام ابوالحسن تھا اور یہ بڑا مہمان نواز تھا۔ اس نے اپنے مہمانوں کو نہایت عمدہ کھانے کھلائے اور تازے پھل پیش کیے اور ایک گانے والے کو بُلا کر مہمانوں کو گانا سنوایا۔ ہارون رشید اس کی مہمان نوازی سے بہت خوش ہوا اور پوچھنے لگا کہ "بیا ابوالحسن تمھارا جی بھی کسی بات کو چاہتا ہے؟ ہمارا عمدہ عمدہ سامان جسے بادشاہ خریدتے ہیں کل آجائے گا۔ اگر کسی بات کو تمھارا دل چاہتا ہو تو ہم سے کہہ دو۔ ہم بادشاہ سے ذکر کردیں گے اور بادشاہ ہماری بات مان لے گا۔

ابوالحسن نے کہا میرے دوستو اور مہمانو! میں تو اللہ واسطے مسافروں کی خدمت کرتا ہوں۔ میرے لیے اس سے زیادہ آرام کی اور کیا بات ہے کہ مجھے خدا نے ایک ایسی حکومت میں پیدا کیا جس کے سایے میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں اور اپنے پرائے سب کے لیے انصاف کی ترازو برابر ہے، اس کے شکرانے میں مَیں نے یہ عہد کرلیا ہے کہ خدا کے بندوں کی خدمت کروں گا اور چاہے وہ کسی عقیدے کے ہوں ان کو آرام پہنچاؤں گا۔

ہارون رشید نے کہا "پھر بھی تمھاری کوئی نہ کوئی آرزو ضرور ہوگی۔"

ابوالحسن نے کہا "انسان کی آرزوئیں تو نہ جانے کیا کیا ہوتی ہیں مگر کہیں سب آرزوئیں پوری بھی ہوجاتی ہیں؟ نہیں نہیں میری کوئی آرزو نہیں جو میں آپ سے کہوں۔

بادشاہ نے مسکرا کر کہا "ارے ابوالحسن اب تم ہمارے دوست ہو گیے ہو، ہم نے اور تم نے ساتھ ساتھ کھانا کھایا ہے۔ تم بے تکلف کہہ دو ہم مقدور بھر تمھاری آرزو پوری کرنے کی کوشش کریں گے۔"

ابوالحسن نے کہا "اگر میں اپنی آرزو آپ سے بیان کروں تو شاید مجھے آپ بے وقوف سمجھیں، لیکن جب آپ بار بار پوچھتے ہیں تو کہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایک دن کی بادشاہت مل جائے اور میں بغداد کے بادشاہ کے تخت پر بیٹھ جاوٴں۔"

"مگر پھر تم کیا کروگے؟" ہارون رشید نے پوچھا۔

ابوالحسن نے کہا۔

"میں جتنے شہر میں غنڈے ہیں شریفوں کو ستاتے ہیں دن رات جھگڑے فساد کرتے ہیں اور جنھوں نے اپنا پیشہ ہی گالیاں بکنا اور ڈنڈے دکھا دکھا کر لوگوں کو ڈرانا بنا لیا ہے ان سب کو پکڑوا کر اونٹوں پر بندھوا دوں گا اور ان اونٹوں کو سارے شہر میں گھمواؤں گا تاکہ سب لوگ انہیں پہچان لیں اور پھر ہر ایک کے اتنے کوڑے لگواؤں کہ یہ اپنا غنڈہ پن بھول جائیں اب آپ ہی سوچیے کہ یہ کتنی بے وقوفی کی آرزو ہے۔ کہاں میں غریب ابوالحسن کہاں خلیفہ ہارون رشید۔ زمین اور آسمان کا فرق ہے۔"

ہارون رشید نے کہا "ابوالحسن خدا کے نزدیک کیا مشکل ہے کہ تمھاری آرزو پوری کر دے اور تمھیں ایک دن کی بادشاہت مل جائے۔" پھر دونوں ہنسنے لگے۔ ہارون رشید نے کہا "اچھا دوست اب تم کافی بناؤ تم بھی پیو اور ہمیں بھی پلاؤ۔" ابوالحسن نے جھٹ پٹ کافی کے لیے کیتلی چڑھا دی اور کچھ دیر میں سب کے سب کافی پینے لگے۔ بادشاہ نے اپنے وزیر کی طرف کچھ اشارہ کیا اور وزیر نے کافی کی پیالی میں پسی ہوئی کوئی دوا ملا دی۔

بادشاہ نے وہ پیالی ابوالحسن کو دے کر کہا "لو بھئی ابوالحسن یہ پیالی ہماری اور اپنی دوستی کی یادگار میں پی لو۔ اب صبح ہونے والی ہے اور ہم رخصت ہو رہے ہیں۔"

ابوالحسن نے پیالی ہاتھ میں لے کر کہا "دیکھیے جب آپ جائیں تو باہر کا دروازہ ضرور بند کرتے جائیں۔ کھلے دروازے میں شیطان آجاتا ہے اور برے برے سپنے دکھائی دینے لگتے ہیں۔" یہ کہہ کر ابوالحسن نے کافی کی وہ پیالی جس میں دوا ملی تھی پی لی۔

پیالی پیتے ہی ابوالحسن بے ہوش ہوگیا۔ ہارون رشید نے اپنے نوکر مسرور سے کہا۔"ابوالحسن کو اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لو اور محل سرائے تک لے چلو اور جس مسہری پر ہمارا بستر لگا ہوا ہے وہاں لٹا دو مگر دیکھو سنبھال کرلے چلنا کہیں گرا نہ دینا۔"

صبح قریب تھی۔ ابوالحسن نے آنکھ کھولی تو اس کا دماغ خوشبو سے معطر ہوگیا۔ شاہی مسہری، زریں لحاف خوشبو سے بسی ہوئی مخملی توشک جگمگاتا کمرہ ابوالحسن نے جلدی سے آنکھیں بند کرلیں اور بڑبڑانے لگا۔

"میں نے سوداگروں سے کہا تھا کہ باہر کا دروازہ کھلا نہ چھوڑنا مگر انہوں نے میری بات کی پرواہ نہ کی، اور اب مجھے شیطان بُرے بُرے سپنے دکھا رہا ہے۔"

ہارون رشید دوسرے کمرے میں بیٹھا ہوا ابوالحسن کی حرکتیں دیکھ رہا تھا۔ ابوالحسن کی بڑبڑاہٹ سن کر بہت ہنسا مگر بولا نہیں۔

اتنے میں خوب صورت خوب صورت لڑکیاں سازلے کر آگئیں اور انہوں نے ابوالحسن کی مسہری کے قریب آکر ہلکے ہلکے سُروں میں گانا شروع کردیا۔ پھر بولیں۔"سرکار صبح ہوگئی ہے، نصیب دشمناں حضور کی طبیعت کیسی ہے کہ اب تک بیدار نہیں ہوئے؟"

ابوالحسن بولا۔"سرکار، سرکار کسے کہہ رہی ہو؟ میں تو ابوالحسن ہوں، شہر کا ایک غریب آدمی۔"

لڑکیوں نے اپنی اپنی انگلیاں دانتوں میں لے کر کہا۔"حضور آپ کیسی باتیں فرمارہے ہیں، آپ تو بغداد کے خلیفہ اور بادشاہ ہیں، ہمارے مالک اور آقا ہیں، ابوالحسن کیوں ہوتے۔"

ابوالحسن حیران حیران یہ تماشہ دیکھ رہا تھا۔ اتنے میں ایک خدمت گار سونے کی پٹی لگائے، زری کی جھالر دار پگڑی باندھے آیا اور بڑے ادب سے سلام کرکے بولا۔"سرکار دربار آراستہ ہے۔ امیر، وزیر سب حضور کے انتظار میں ہیں، فریادی عرضیاں لیے کھڑے ہیں۔"

اب ابوالحسن کو یقین ہوگیا کہ خدا نے اس کی مراد پوری کردی ہے اور وہ سچ مچ بادشاہ بن گیا ہے۔ وہ شاہی لباس پہن کر باہر نکلا اور تخت پر بیٹھ گیا۔ وزیر امیر سب ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور کسی کی مجال نہ تھی کہ ابوالحسن کی طرف دیکھے۔

ابوالحسن نے بڑے رعب کے ساتھ کہا۔
"ہم بدولت حکم دیتے ہیں کہ شہر میں جتنے غنڈے ہیں سب کو گرفتار کرلیا جائے اور رانٹوں پر رسیوں سے کسوا کر تمام شہر میں پھرایا جائے۔ تاکہ چھوٹے بڑے سب دیکھ لیں کہ فسادیوں اور شہر کے امن کو خراب

کرنے والوں کا یہ انجام ہوتا ہے اور پھر سب کے اتنے
کوڑے مارے جائیں کہ ان کی کھال اتر جائے۔"

یہ سنتے ہی پولیس کا افسر آگے بڑھا اور بولا
حضور کے حکم کے مطابق ان کی تلاش کی جاتی ہے
اور شام تک رپورٹ پیش کر دی جائے گی۔

ابوالحسن نے اپنے محلے کے شریف اور بزرگ
لوگوں کو اشرفیاں اور روپے بھجوائے اور اپنی ماں
کے پاس بھی بہت سی اشرفیاں بھیجیں اور پھر محل سرائے
میں چلا گیا۔ محل سرائے میں رپورٹ گذری کہ شہر
کے تمام غنڈوں کو پکڑ لیا گیا ہے اور انہیں کوڑوں سے
اتنا مارا گیا ہے کہ توبہ توبہ پکار رہے ہیں اور بہت
سوں کو شہر سے باہر نکال دیا گیا ہے۔ سرکار حکم
دیں تو انہیں چھوڑ دیا جائے۔

اتنے میں وہی لڑکیاں جنہوں نے ابوالحسن
کو اپنا گانا گا کر جگایا تھا آگئیں اور ان میں سے ایک
لڑکی نے کافی کی پیالی بڑے ناز و انداز سے پیش کی
جس کے پیتے ہی ابوالحسن بے ہوش ہو گیا اور ہارون
رشید کے حکم سے مسرور نے پھر اسے اس کے گھر پر پہنچا دیا۔
ہوش آیا تو حیران تھا کہ میں نے جو کچھ دیکھا ہے یہ خواب
تھا یا بیداری۔ اور اس کی حالت دیوانوں کی سی
ہو گئی۔ مدتوں بعد جب ہارون رشید نے اسے
بلایا تو معلوم ہوا کہ خدا کی قدرت سے ایسے اسباب
پیدا ہو گئے تھے جس سے ایک دن کی حکومت اسے
مل گئی تھی اور اس بہانے سے غنڈوں کا صفایا
ہو گیا ہے۔

پھر ہارون رشید نے اس کا اتنا گذارا مقرر
کر دیا کہ زندگی بھر عیش کرتا رہا۔ اور غنڈے اس کی جان
کو روتے رہے۔

بچوں کا جسم تیزی سے بڑھے اور لباس تنگ ہو جائے
تو دھوبی کا کیا قصور...

جب مسز تیز رنگ دھوبی سے ساز باز کر لیں تو سمجھ لیجئے کہ لباس کے سکڑ کر تنگ ہو جانے کی مصیبت کا سامنا ہے۔ لہذا جب بھی آپ بچوں کے لباس کے لئے مضبوط اور دیرپا سُوتی کپڑے یا سُوت ملے ہوئے کپڑے خریدنا چاہتے ہوں تو ہمیشہ 'سینفورائزڈ' کی مُہر پر اصرار کیجئے۔

یہ مشہور ٹریڈ مارک جو دنیا بھر میں جانا پہچانا اور خاص کر ہندوستانی کپڑوں کی غیر ملکوں میں برآمد کو بڑھا رہا ہے، آپ کا لباس سکڑ کر تنگ نہ ہونے کی ضمانت ہے۔ اس پر بھروسہ کیجئے 'سینفورائزڈ' چھاپ والے کپڑوں کو سلوانے سے پہلے پانی میں بھگونے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ لہذا ہر کپڑا جو آپ خریدیں اُس پر اس مُہر کو ضرور دیکھ لیجئے۔

کلوئٹ پیباڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹیڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں تشکیل شدہ) کا جاری کردہ رجسٹرڈ ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ'۔ اس ٹریڈ مارک کے مالکان استعمال کرتے ہیں یا ان رجسٹرڈ استعمال کرنیوالوں کو جو جانچ کئے ہوئے کپڑوں پر اس کے استعمال کی اجازت دیتے ہیں جو پوری طرح ان کے مقرر کردہ اعلیٰ معیار کو قائم رکھتے ہیں۔

جناب سعید عقاب

راجہ پکوڑی مل

(ایک منظوم ڈراما)

راجہ پکوڑی مل:۔

میں ہوں راجہ پکوڑی مل پجاری مال، دھن کا مونا
کوئی مانے نہ مانے میں تو راجا اپنے من کا ہوں
ہزاروں بھوکے پیاسے میرے در کو تکتے رہتے ہیں
اگر دنیا چمن ہے باغباں میں اس چمن کا ہوں

جہاندیدہ:۔

یہ مال اور دھن کرھن کے بل پہ تو بھگوان بنتا ہے
خدا کے قہر سے ڈر کس لیے شیطان بنتا ہے
خدا کی آزمایش کا ہے اس میں راز پوشیدہ
کوئی بنتا ہے مفلس اور کوئی دھنوان بنتا ہے
ادھر آ۔ میں تماشے بزم عالم کے دکھاتا ہوں
غلط فہمی کے پردے تیری آنکھوں سے اٹھاتا ہوں

(ایک کمزور سا لڑکا گزرتا ہے)

جہاندیدہ:۔

یہ اک مفلس کا بچہ ہے جو ہے دو روز سے بھوکا
نکل آئی ہیں باہر پسلیاں اور جسم ہے سوکھا
تجھے پیدا کیا جس نے، تو جس خالق کا بندہ ہے
یہ بچہ بھی تو بندہ ہے اسی بھگوان، پر بھوکا
جو یہ سچ ہے تو پھر کیوں مفلسوں سے دور رہتا ہے
انھیں روتا بلکتا چھوڑ کر مسرور رہتا ہے
صحیح مصرف سمجھ جاتا اگر تو اپنی دولت کا
وطن کو سامنا کرنا نہ پڑتا ایسی ذلت کا

(ایک نوجوان بھکارن آتی ہے)

نوجوان بھکارن:۔

میں بیوہ اور دکھی ہوں مجھے کچھ دان ہی دیدو
عوض اس کا اگر چاہو تو میری آبرو لے لو

میرا معصوم بچہ دودھ پینے کو ترستا ہے
نہ پاکر دودھ وہ مجھ کو بڑی حسرت سے تکتا ہے

جہاندیدہ :۔ (پکوڑی مل سے)

اے دولت کے پجاری دیکھ کتنی سستی عزت ہے
تیرے پیارے وطن میں ماؤں بہنوں کی یہ حالت ہے
بچا سکتا نہیں گر آبرو تو بنتِ حوّا کی
تیرے چاندی کے ٹکڑے اور تجھ پر خوب لعنت ہے
اگر تو مفلسوں کو اپنی دولت میں سے کچھ دیدے
تو کیوں بھارت کی بیٹی آج اپنی آبرو بیچے

(ایک نوجوان آتا ہے)

نوجوان :۔

میں بی، اے پاس ہوں مجھ کو نہ سمجھیں آپ آوارہ
مقدر نے بنایا ہے مجھے بے کار و ناکارہ
مری ناکامیوں نے یہ سبق مجھ کو سکھایا ہے
کروں جاکر کہیں چوری نہیں اس کے سوا چارہ

جہاندیدہ :۔

اُتر آئیں اگر قسمت کے مارے بھی بغاوت پر!!!
تو چھاجائیں گھڑی بھر میں تری دولت کی طاقت پر
کبھی تقسیم زر کا مسئلہ سرسبز اگر ہوگا
یہی انسان قابض ہوں گے دنیا کی امامت پر

(ایک غنڈے کو دیکھ کر پکوڑی مل کہتا ہے)

پکوڑی مل :

ارے یہ تو وہی مشہور غنڈہ ہے کہ رو‌ڈی
کہ جس نے جیب سے میری اڑایا نوٹ سو کا

غنڈہ : (راجہ پکوڑی مل کو دیکھ کر)

کہو راجہ مزے میں ہو، ہے کتنی جیب میں نقدی
میں تم کو دیکھتا ہوں تو ٹپک جاتی ہے رال اپنی

جہاندیدہ : (غنڈے سے)

میرے بھائی! کہو غنڈہ تمھیں کس نے بنایا ہے
وہ مجبوری بھی کیا جس نے کہ یہ تم کو سکھایا ہے

غنڈہ :۔

مجھے غنڈہ گری بے روزگاری نے سکھائی۔
مجھے غنڈہ گری دھن کے پجاری نے سکھائی۔!
مرے بھائی بہن بھوکے مری مائیں بھکارن
مجھے غنڈہ گری اس آہ و زاری نے سکھائی

پکوڑی مل : (لجاجت سے)

میرے بھائی مجھے تم بخش دو میں خود ہوں شرمن
یہ میری ہی حماقت تھی کہا میں نے تمھیں غنڈ
غلط مصرف کروں گا آج سے ہرگز نہ دولت
رہے گا آفتابِ انسانیت کا مجھ سے تابن
یہ سن کر دونوں آپس میں گلے ملتے ہیں خوش
جہاندیدہ کے ہونٹوں پر مسرت رقص فرما

جناب اقبال امروہوی

جس وقت یہ رسالہ آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔ امتحان قریب آ چکے ہوں گے۔ اور آپ سب ہی امتحان کی تیاری میں مصروف ہوں گے۔ آپ کے سامنے اس وقت ایک اہم مسئلہ ہوگا بہت ہی اہم: امتحان کی تیاری کس طرح کی جائے؟ کیا پڑھیں؟ کیسے پڑھیں؟

آپ پڑھنے بیٹھتے ہیں تو ایک کتاب کھولتے ہیں۔ تھوڑی دیر پڑھتے ہیں۔ دل نہیں لگتا۔ دوسری کتاب اٹھا لیتے ہیں۔ اس کا مضمون بھی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو تیسرے مضمون کی کتاب پڑھنے لگتے ہیں آپ کا بہت سا قیمتی وقت اسی الٹ پھیر میں ضائع ہو جاتا ہے۔ آپ میں سے بعض پیامی چند مضامین میں تو بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ چند میں کمزور ہوتے ہیں جن مضمونوں میں کمزور ہوتے ہیں۔ ان کے مطالعہ میں آپ کا دل نہیں لگتا اور تمام دلچسپیاں انہی مضمونوں کی جانب رہتی ہیں جن میں آپ پہلے سے اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں نتیجہ یہ کہ تمام مضامین پر پوری توجہ نہیں ہو پاتی اور جن مضامین میں کمزور ہیں۔ ان میں اور بھی کمزور ہو جاتے ہیں۔

مثلاً تاریخ، جغرافیہ اور شہریت جیسے مضامین میں آپ کا اور بہت سے پیامیوں کا دل نہیں لگتا ان مضامین کو آپ دردِ سر سمجھتے ہیں۔ سوچتے ہیں کہ یہ مضامین رٹنے سے یاد ہو جاتے ہیں اور بڑے بڑے سبقوں کو رٹنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ ہماری سمجھ میں کچھ باتیں آئی ہیں۔ آیئے آپ کو بھی بتاتے چلیں۔

دیکھیے، کسی مضمون کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے سب سے ضروری چیز توجہ ہے۔ کسی کتاب یا مضمون کو پڑھتے وقت آپ کی پوری توجہ سبق پر ہونی چاہیے۔ آپ کے ذہن کو دوسرے تمام خیالات سے بالکل خالی ہونا چاہیے۔ آپ گھر پر ہوں یا اسکول میں سبق کے دوران اپنے خیالات کو بھٹکنے نہ دیجیے۔ صرف سبق

کے بارے میں سوچیے ۔ ایسا نہ ہو کہ کتاب آپ کے
سامنے کھلی ہو اور آپ کا دھیان کھیل کے میدان کی
طرف ہو ۔

گھر پر مطالعہ کے لیے آپ ایسا وقت رکھیے
جب آپ کا ذہن بالکل خالی ہو ۔ جس وقت آپ پڑھنے
بیٹھیں تو تمام خیالات دل سے نکال دیجیے ۔ اور پوری
توجہ سبق پر دیجیے ۔

جو سبق آپ کو پڑھنا ہے ۔ اسے ایک دو بار
غور اور توجہ سے پڑھ جائیے ۔ اس کے بعد کتاب بند
کر کے سوچیے کہ آپ نے کیا پڑھا ۔ اور جو کچھ آپ نے
پڑھا ہے اسے ذہن میں یکجا کر لیجیے ۔ اگر سبق کا
کوئی حصہ اچھی طرح ذہن نشین نہیں ہوا ہے تو سبق
ایک بار پھر پڑھ جائیے اور اس کے بعد پھر یادداشت
پر زور دے کر ذہن میں سبق کا خلاصہ تیار کیجیے ۔ اگر
اس بار سبق کا خلاصہ مکمل طور پر ذہن میں آگیا تو سمجھ
لیجیے کہ آپ کا پڑھنا کامیاب رہا ۔ سبق کا یہ خلاصہ
اپنے الفاظ میں لکھ ڈالیے ۔ درمیان میں اگر کسی قسم کی
دقت محسوس ہو تو کتاب سے نقل کرنے کی کوشش نہ
کیجیے ۔ سبق ایک بار پھر پڑھ لیجیے ۔ جس وقت آپ سبق
کا خلاصہ محض اپنی یادداشت کے ذریعہ لکھنے میں کامیاب
ہو گیے تو سمجھیے کہ آپ اس سبق پر حاوی ہو گیے ۔ اب
آپ کو کتاب پڑھنے کی ضرورت نہیں ۔ مضمون کو اچھی
طرح ذہن نشین کرنے کے لیے وہ خلاصہ پڑھ لیا
کیجیے ۔ یاد رکھیے کہ سبق کو کتاب کے الفاظ میں یاد رکھنے
سے بہتر ہے کہ آپ اسے اپنے الفاظ میں یاد رکھیں اس
طرح وہ آپ کے ذہن میں اچھی طرح محفوظ رہے گا ۔

اس طرح آپ تاریخ ، جغرافیہ جیسے مضامین
کا مطالعہ کر کے ان مضامین کو بھی اپنے لیے آسان بنا
سکتے ہیں ۔

ہاں ریاضی جیسے مضامین کے لیے یہ طریقہ
مناسب نہیں ۔ ریاضی میں تو مشق کی ضرورت ہے جب
اسکولوں میں آپ کے استاد کوئی سوال حل کروا رہے
ہوں یا کوئی نیا سوال سمجھا رہے ہوں تو پوری توجہ ان
کی جانب رکھیے تاکہ سوال اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے ۔
کسی موقعہ پر کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو اسی وقت پوچھ
لیجیے ۔ جس وقت تک سوال اچھی طرح ذہن نشین نہ ہو
جائے آگے نہ بڑھیے ۔ یاد رکھیے کہ اگر کسی جگہ کوئی
کمی باقی رہے گی تو اس کا اثر عرصہ تک رہے گا ۔ سوال
اچھی طرح ذہن میں آجائے تو پھر اس کی مشق کیجیے
کتاب سے اسی قسم کے سوال چن کر حل کرنے کی کوشش
کیجیے ۔ بہتر یہ ہے کہ ایک قسم کا سوال مکمل طریقہ پر
ذہن نشین ہو جانے کے بعد اسی قسم کے آسان اور
ہلکے سوالات آپ خود بنائیں اور حل کریں ۔ ابتدا میں
مشکل سوالات حل کرنے کی کوشش نہ کیجیے ۔ دھیرے
دھیرے آسان سے مشکل کی طرف جائیے ۔

اگر کسی سوال کے حل کرنے میں آپ دقت

محسوس کرتے ہوں۔ اور کافی محنت کے بعد بھی اسے حل نہ کر پاتے ہوں۔ تو اس سوال کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا رکھیے لیکن اسے نظر انداز نہ کیجیے۔ اس پر دوبارہ ضرور کوشش کیجیے۔

اس طرح آپ ان مضامین پر بھی پوری طرح حاوی ہو جائیں گے۔ جن پر آپ اب تک اس لیے توجہ نہیں دے سکے کہ آپ ان میں اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہیں۔ یاد رکھیے آپ کے ذہن و دماغ میں وہ تمام مضامین رہ سکتے ہیں جن میں آپ دلچسپی لیتے ہیں۔

جس مضمون میں آپ اپنے آپ کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اس پر زیادہ توجہ دیجیے۔ اپنے پڑھنے کے وقت کو آپ مختلف مضامین پر اس طرح تقسیم کیجیے کہ ان مضامین پر نسبتاً زیادہ وقت صرف ہو جن میں آپ کمزور ہیں۔ جن مضامین میں آپ ہمیشہ اچھے نمبروں سے کامیاب ہوتے ہیں۔ انھیں بھی یہ سوچ کر نظر انداز نہ کیجیے کہ آپ ان میں ماہر ہیں۔

جناب شاہد فاروقی

کتنا خرچ

۱ ۲ ۳ ۴ ۵

اوپر بنی ہوئی پانچ زنجیروں کو آپس میں جوڑنا ہے۔ لوہار ایک زنجیر کو کاٹنے کا ایک پیسہ لیتا ہے اور ایک زنجیر کو جوڑنے کے دو پیسے لیتا ہے تو بتائیے کتنے کم سے کم خرچ میں ایک پوری زنجیر بن جائے گی؟

جواب:۔ صرف ۹ پیسے میں بن جائے گی۔

نمبر ۱ والی زنجیر کی تینوں کڑیوں کو تین پیسے میں کٹوا لیجیے پھر ایک کڑی کو زنجیر نمبر ۲ اور ۳ میں پرو کر جڑوا لیجیے کل ۳+۲=۵ پیسے خرچ ہو گئے۔ اب پھر ایک کڑی کو زنجیر نمبر ۳ کے آخری سرے اور ۴ میں پرو کر جڑوا لیجیے۔ کل خرچ ۵+۲=۷ پیسے ہوئے۔ اب تیسری کڑی کو اسی طرح زنجیر نمبر ۴ کے آخری سرے اور زنجیر نمبر ۵ میں ڈال کر جڑوا لیجیے۔ کل خرچ ۷+۲=۹ پیسے

۴ ۵ ۳ ۲

جناب کلیم راہی

ٹوٹی ہوئی تلوار

بڑی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ دھول کا ایک بادل سا سارے میدانِ پر چھا گیا تھا۔ سپاہیوں کے جوشیلے نعرے، چیخیں، کراہیں اور تلواروں کی تیز جھنکاریں۔ قیامت کا سماں تھا۔ شہزادہ انور جمال بڑے ہی نازک محاذ پر دشمن کا مقابلہ کر رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کی فوجی قوت گھٹتی اور دشمنوں کے حوصلے بڑھتے جا رہے تھے۔

جہاں شہزادہ بڑی بہادری اور جواں مردی سے دشمن کے حملوں کا جواب دے رہا تھا۔ وہاں ایک بزدل سپاہی بھی کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں بھی ایک تلوار تھی۔ مگر وہ سوچ رہا تھا " اگر میرے پاس بھی شہزادے کی سی چمک دار اور اعلیٰ قسم کے فولاد سے تیار کی ہوئی تلوار ہوتی تو میں بھی اس کی طرح دشمن کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کرتا۔ اور خون کی ندیاں بہا دیتا۔ مگر میری تلوار تو پرانی اور کند ہے۔ اس خراب لوہے سے بنی ہوئی تلوار سے میں بھلا دشمنوں کا مقابلہ کیسے کر سکتا ہوں "؟

اس نے یہ بات بار بار سوچی اور پھر جھلا کر تلوار کے دو ٹکڑے کیے اور میدانِ جنگ سے بھاگ گیا۔

شہزادہ انور جمال بری طرح دشمنوں کے نرغے میں آ گیا تھا۔ دشمن کے بہادر سپاہیوں اور سرداروں نے اسے چاروں طرف سے گھیرے میں لے لیا۔ مگر شہزادہ اسی جوش اور ہمت کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتا رہا تھا۔ تقدیر کی بات عین اسی وقت ایک سردار سے لڑتے ہوئے شہزادے کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ گئی اور دور جا پڑی۔

اب شہزادہ بالکل نہتا رہ گیا تھا اور دشمن تھے کہ چڑھے آ رہے تھے۔ شہزادے نے پھر بھی ہمت

نہیں ہاری اور اپنے بچاؤ کی برابر کوشش کرتا رہا۔
بچتے بچتے آخر وہ اس جگہ آگیا جہاں ریت پر اس بزدل سپاہی کی ٹوٹی ہوئی تلوار پڑی تھی۔ شہزادے نے بڑی تیزی سے وہ تلوار اٹھا لی اور پھر ایک بار پوری جرأت کے ساتھ دشمن پر ٹوٹ پڑا۔

شہزادے نے ایسی بہادری سے مقابلہ کیا کہ سورج کے ڈھلنے تک جنگ کا نقشہ بدل گیا۔ شہزادے کی جواں مردی اور دلیری دیکھ کر وہ سارے سردار اور سپاہی جو اسے گھیرے ہوئے تھے۔ خوف زدہ اور مایوس ہو گئے ——— اور آخر کار شہزادے نے اسی ٹوٹی ہوئی تلوار سے یہ جنگ جیت لی۔ اسی تلوار سے جسے ایک بزدل سپاہی نے بے کار جان کر توڑ دیا تھا۔

جناب انوار انصاری

ہولی

ہولی آئی، ہولی آئی   لے عبیر کی جھولی آئی
نئے نئے کپڑے ہیں بنتے   گھر گھر ڈھول مجیرے بجتے
پوڑی بنتی پوے بنتے   آپس میں سب کوئی ملتے
آج نہ کوئی راجا رانی   آج نہ کوئی پنڈت گیانی
سب مل کر ہیں رنگ اڑاتے   آپس میں مل دل بہلاتے
لال لال ہے دھرتی لگتی   دیکھ خوشی من میں ہے جگتی
بھر بھر پچکاری سب لاتے   ایک دوسرے کو نہلاتے

کتنی اچھی ہولی آئی
سب کے من میں خوشی سمائی

(ہندی کی ایک نظم سے ترجمہ)

جناب قیصر سرمست

چیتا اور بور بچہ کا فرق

میں جناب مناظر عاشق ہرگانوی کے مضمون "چیتا ــــ چند یادیں"[1] کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں

پیامِ تعلیم بچوں کا رسالہ ہے اور میرا خیال ہے کہ اس رسالے میں جو بھی معلومات ہوں وہ صحیح ہوں۔ مناظر عاشق صاحب کا مضمون کافی دل چسپ ہے۔ لیکن اس کی بنیادی غلطی یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار نے چیتے اور بور بچہ میں کوئی فرق نہیں رکھا۔ انھوں نے چیتے کی وہی خصوصیات بیان کی ہیں جو حقیقتاً بور بچہ کی ہیں۔ میں پیامیوں کے لیے مختصراً دونوں کا فرق بیان کر دیتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مناظر عاشق صاحب نے جسے "چیتا" ظاہر کیا ہے وہ دراصل "بور بچہ" ہے۔

چیتا اور بور بچہ بلی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن مشہور حکیم اور مفکر ارسطو کا خیال ہے کہ فطرتاً چیتے کو کتے سے بہت زیادہ مشابہت ہے۔ اس لیے کہ جتنی بیماریاں کتے کو عارض ہوتی ہیں وہی چیتے کو لاحق ہوتی ہیں۔

چیتا بلی کی جماعت سے تعلق تو رکھتا ہے مگر اس میں بہت سی خصوصیات کتے اور بلی کی پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے بعض ماہرینِ حیوانات اسے دونوں کی درمیانی قسم قرار دیتے ہیں۔ اس کی کھوپڑی چھوٹی اور ٹانگیں لمبی ہوتی ہیں۔ جو بلی کی جماعت کے کسی جانور کی نہیں ہوتیں۔ اس کے ناخن بھی شیر ببر اور بور بچہ کے ناخنوں کی طرح پوری طرح اندر نہیں ہوتے۔ کتے کی دُم کی طرح اس کی دم بھی سر کی طرف مڑی ہوئی ہوتی ہے۔

چیتے کا جسم بہت ہی سُبک چھریرا اور کمر بہت پتلی ہوتی ہے۔ سارے جسم پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں لیکن

[1] یہ مضمون سالنامہ (صفحہ ۱۹۰) میں چھپا ہے۔

چہرہ پر سیاہ دھاریاں ہوتی ہیں۔ دنیا کا کوئی جانور دوڑنے میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ ساٹھ پینسٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ یہ خصوصیت بھی بلی کی جماعت کے کسی جانور میں نہیں پائی جاتی۔ پرانے زمانے میں اسے ہرنوں کے شکار کے لیے خاص طور پر پالا جاتا تھا۔

جائے تو اپنے بچاؤ کے لیے معمولی سا حملہ کر کے فرار ہو جاتا ہے۔ چیتے کے متعلق کبھی نہیں سنا گیا کہ وہ آدم خور (انسانوں کو کھانے والا) بھی ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف بو رہیہ LEOPARD (فارسی میں پلنگ، عربی میں نمر کہتے ہیں) انتہائی کینہ خصلت ہوتا ہے۔ اور اس میں درندگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوی ہے۔ اس کا رنگ بھی چیتے کی طرح زرد ہی ہوتا ہے لیکن جسم پر دھبے نہیں ہوتے بلکہ گل ہوتے ہیں جس کے بیچ میں سے جسم کا زرد رنگ نظر آتا ہے۔ جسم ذرا بھدا ٹانگیں چھوٹی ہوتی ہیں مگر گرے ہاونڈ (ایک قسم کا کتا)

چیتے کو فارسی میں "یوز" عربی میں "فہد" اور اور انگریزی میں CHEETAH کہتے ہیں۔ یہ درندہ ہونے کے باوجود انسانوں سے مانوس ہے اور پالا جا سکتا ہے۔ چیتا انسانوں پر خود کبھی حملہ نہیں کرتا اگر مجبور ہو

جیسی اور کھوپڑی بلڈاگ سے مشابہ ہوتی ہے۔ بورہیہ درخت پر آسانی چڑھ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ آدم خور ہو جاتا ہے تو انسانوں کو گھروں میں بھی پناہ نہیں یوں بھی جنگل کے قریب کے گاؤں کے جانوروں کو اس

وجہ سے انتہائی نقصان ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ گاؤں اور بستیوں میں آکر مویشیوں وغیرہ کو اٹھا لے جاتا ہے حد تو یہ ہے کہ پالتو کتے بھی اس سے نہیں بچ سکتے برخلاف اس کے جنگلی کتوں اور ترڑس HYENA سے اس کی روح فنا ہوتی ہے۔ یہ بڑا لالچی اور حریص جانور ہوتا ہے۔ گیدڑ، مرغی، ہرن، مور، گرگٹ، کیکڑے اور سانپ غرض کہ جو بھی مل جائے چٹ کر جاتا ہے۔

اپنے مارے ہوئے جانور کو تھوڑا سا کھا کر بچا ہوا حصہ وہیں نہیں چھوڑ دیتا بلکہ دوسرے دن کے لیے کسی اونچے اور گھنے درخت میں کسی محفوظ جگہ رکھ دیتا ہے بوربچہ کی سننے اور دیکھنے کی قوت بہت تیز ہوتی ہے اور قوت برداشت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ایک مشہور شکاری مسٹر بلائتھ کا کہنا ہے کہ "بوربچہ بہت خاموش رہتا ہے۔ اسے بولتے ہوئے شاید ہی کسی نے سنا ہوگا اور اس میں اتنی چھوٹی سی جگہ میں چھپ جانے کی صلاحیت ہوتی ہے کہ اس قد و قامت کا دوسرا جانور شاید ہی چھپ سکے۔"

بوربچہ بلا وجہ بھی انسانوں پر حملہ کر دیتا ہے اور حملہ کرتے وقت نہ تو غراتا ہے اور نہ سامنے سے آتا ہے بلکہ پیچھے سے یا دائیں بائیں سے چھپ کر حملہ کرتا ہے اس کی کئی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں۔ بعض جنگلوں میں سیاہ بوربچے بھی دیکھے گئے ہیں۔ اور ہمالیہ پر نو ہزار فٹ کی بلندی پر اور وسط ایشیا کے پہاڑوں پر سفید بوربچے پائے جاتے ہیں جنھیں برف کا بوربچہ SNOW LEOPARD کہتے ہیں۔ اس کے سفید جسم پر نیلے رنگ کے گل بہت ہی پیارے اور بھلے لگتے ہیں۔

بہرکیف چیتا اور بوربچہ بالکل ہی علیحدہ نوع کے جانور ہیں اور ان کی خصلتیں بھی جدا جدا ہیں۔ امید کہ ان چند سطروں سے دونوں کا فرق واضح ہو گیا ہوگا۔
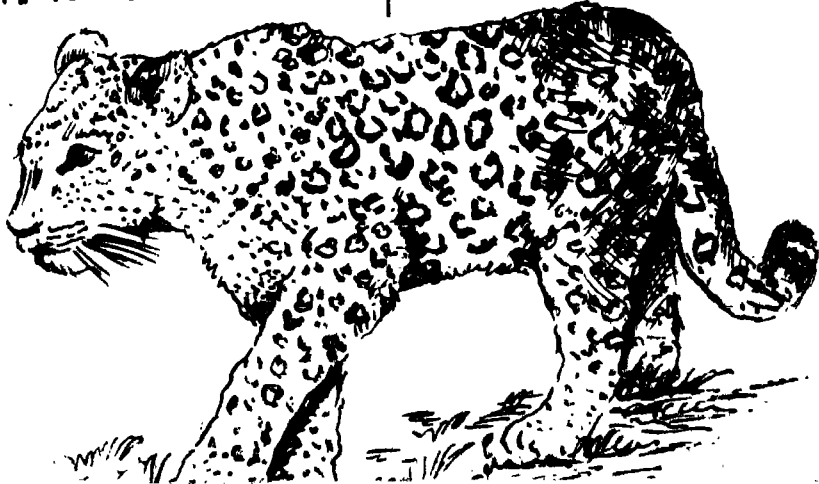
جناب ایم۔ این۔ خاں امروہوی

موتیوں کی کھیتی
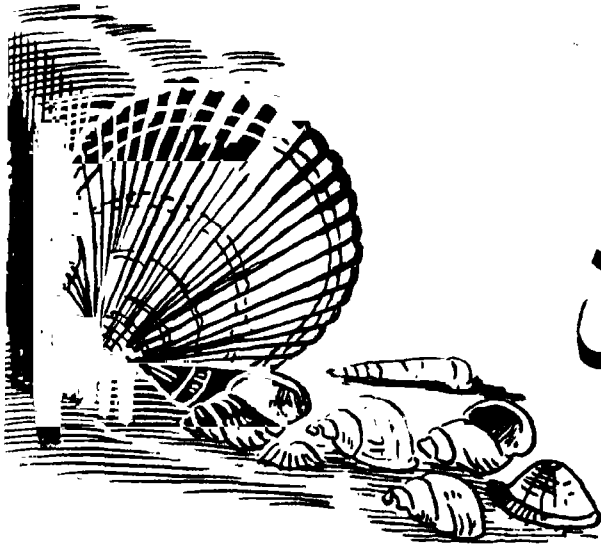
قدرت نے ہمیں نہ جانے کیسی کیسی خوبصورت قیمتی اور نایاب چیزیں عطا کی ہیں۔ ہم اس کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہی ہے۔ ایسی خوبصورت اور قیمتی چیزوں میں ہیرے اور موتی بھی ہیں۔ آیئے آج آپ کو ان موتیوں کے بارے میں کچھ دلچسپ باتیں بتائیں

آپ میں سے جن لوگوں نے سمندر دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ سمندر پانی کا کیسا اتھاہ ذخیرہ ہے دور دور تک سمندر کے کنارے نظر نہیں آتے جہاں تک نظر جاتی ہے نیلا نیلا پانی موجیں مارتا دکھائی دیتا ہے۔

اس سمندر کی تہہ میں سینکڑوں عجیب وغریب چیزیں پائی جاتی ہیں، جو اوپر سے تو نہیں دکھائی دیتیں لیکن تہہ میں جاکر انھیں آپ آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔

موتی بھی اسی سمندر کی تہہ میں پایا جاتا ہے۔

دھنک کے سات رنگوں میں لپٹا ہوا پیارا دودھیا موتی دیکھنے والوں کے دل موہ لیتا ہے اور ہاں موتی ہوتا بھی تو دل ہی کی طرح نرم و نازک ہے جس طرح ذرا سی سخت بات کا اثر دل پر ہوتا ہے اور اسے ٹھیس پہنچتی ہے اسی طرح موتی بھی ذرا سی رگڑ یا بے احتیاطی برداشت نہیں کرسکتا۔ ذرا سی رگڑ سے اس پر کھروچیں یا خراشیں پڑجاتی ہیں اور اس کی ساری خوبصورتی، ساری آب ختم ہوجاتی ہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ موتی قیمتی چیز ہے۔ اس کی قیمت اس کے وزن کے ساتھ ساتھ اس کی خوبصورتی پر بھی ہے۔ آپ خود ہی سوچیے بدصورت موتی کو کون خریدے گا۔ موتی عام طور پر سفید ہوتے ہیں اور عام طور پر مل جاتے ہیں۔ لیکن کالے موتی بڑی مشکل سے ہاتھ

آتے ہیں یہ دیکھنے میں بھی بہت ہی خوبصورت ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کی قیمت بھی سفید موتیوں سے کافی زیادہ ہوتی ہے۔

اب آپ سوچ رہے ہوں گے کہ بھلا یہ خوبصورت نرم و نازک موتی سمندر کی تہہ میں کس طرح محفوظ رہتے ہوں گے تو بھئی قدرت ان خوبصورت اور نازک موتیوں کو بڑی حفاظت سے مضبوط تجوریوں میں بند رکھتی ہے۔ مضبوط تجوریاں۔ جادو کی تجوریاں۔ ایسی تجوریاں کہ جن میں ریت کے ذرے بھی جاتے ہی موتی بن جاتے ہیں۔ اور جناب جادو کی تجوریاں ہیں سمندر کے نازک جاندار "گھونگھے میاں کے سخت خول یعنی سیپیاں"۔ پر بھئی موتی ہر سیپی میں نہیں ملتا۔ ہزاروں سیپیوں میں سے کسی ایک میں ہوتا ہے۔ یہ موتی والی سیپی سمندر میں ۴۸ یا ۱۲۰ فٹ کی گہرائی میں جزیروں کے بیچ اُتھلے سمندروں میں زیادہ پائی جاتی ہے۔

موتی والی سیپیاں بھی دوسری ہزاروں لاکھوں سیپیوں کی طرح سمندر کی تہہ میں پڑی رہتی ہیں۔ انھیں نکالنے کے لیے غوطہ خور اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر سمندر میں غوطہ لگاتے ہیں۔ وہیل شارک آکٹوپس جیسے خطرناک سمندری جانوروں سے انھیں ہر وقت خطرہ رہتا ہے۔ یہ جانور منٹوں سکنڈوں میں انھیں ختم کر سکتے ہیں۔ لیکن انسان تو آپ جانیے اشرف المخلوقات ہے وہ ان سے بھلا کیا ڈرے گا۔ ان سمندری بھوتوں سے محفوظ رہنے کے لیے وہ ایک خاص طرح کی پوشاک پہن کر غوطہ لگاتا ہے۔ یہ پوشاک فولاد، چمڑے اور پلاسٹک کی بنی ہوتی ہے۔ سر پر "لوہے کا خود" چڑھا رہتا ہے سانس لینے کے لیے ربر کی نلی ناک سے جڑی رہتی ہے۔ اسے سانس لینے کے لیے بار بار پانی سے باہر آنے کی ضرورت نہیں۔ ہاتھ میں سیپیاں تلاش کرنے کے آلے خاص طرح کی لالٹین اور پیروں میں بڑے بڑے جوتے ہوتے ہیں۔

باہر لانے کے بعد ان سیپیوں کو دو چار دن سمندر کی گرم ریت پر دھوپ میں خوب سکھایا جاتا ہے۔ اس طرح ان میں رہنے والے کیڑے یعنی گھونگھے مر جاتے ہیں۔ اب موتیوں کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ ہر سیپی کا پیٹ چیر کر موتی تلاش کیا جاتا ہے۔ اور کہیں ہزاروں سیپیوں میں سے ایک دو میں خوبصورت جھلملاتا موتی ملتا ہے۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ یہ خوبصورت موتی ان بھدی سیپیوں میں آ کہاں سے جاتے ہیں۔ اگر نہیں تو سُنیے ــــ سمندر کے خاندان کا ایک نرم و نازک جانور ہوتا ہے "گھونگھا"۔ اس کے جسم سے ایک چپکتا ہوا رقیق یا پتلا مادہ رِستا رہتا ہے جو اس کے چاروں طرف پتھر کی طرح سخت خول بناتا ہے۔

یہ خول ہی اس چھوٹے سے جانور کا مضبوط قلعہ اور موتیوں کی آہنی تجوری ہے۔ یہ خول ہی "سیپی" کہلاتا ہے اس میں "گھونگھا" تمام خطروں سے محفوظ بڑے امن و اطمینان سے رہتا ہے اوپر سے بھدی نظر آنے والی یہ سیپی۔ اندر سے بڑی چکنی اور خوبصورت ہوتی ہے۔
کبھی کبھی گھونگھا ہوا اور پانی لینے کو اپنے قلعہ کے دونوں دروازے کھولتا ہے۔ ایسے میں کوئی ذرہ یا چھوٹا سا کیڑا مکوڑا اس میں چلا جائے تو اس قلعے کے دروازے جھٹ ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتے ہیں آپ کے جوتے میں اتفاق سے کوئی کنکری چلی جائے تو آپ کو کیسی تکلیف اور الجھن اور بے چینی ہوتی ہے؟ آپ فوراً جوتے کے تسمے کھول کر پاؤں جوتے میں سے نکالتے ہیں اور کنکری کو نکال پھینکتے ہیں۔ بس تبھی آپ کو چین آتا ہے۔ بس یہی کیفیت گھونگھے کی ہوتی ہے جب کوئی ذرہ اس کے قلعے میں جاتا ہے اور اس کے نکلنے کا کوئی امکان نہیں ہوتا تو وہ اپنے جسم سے نکلنے والے دقیق مادے سے اسے ڈھکنا شروع کر دیتا ہے اس مادے کی تہیں اس ذرے کے چاروں طرف جمتی جاتی ہیں اور کچھ عرصہ بعد وہ موتی بن جاتا ہے۔ کیوں ہے نا یہ جادو کی تجوری جس میں ریت کے ذرے بھی جادو بن جاتے ہیں؟
ہاں تو جب یہ سیپی کسی غوطہ خور کے ہاتھ لگ جاتی ہے تو وہ اس کا منہ کھول کر نرم و نازک موتی کو نکال لیتا ہے سیپی سے باہر نکلتے ہی سورج کی کرنیں اس خوبصورت موتی کو چوم لیتی ہیں اور خوش ہو کر قوس و قزح کے پیارے پیارے سات رنگ اسے عطا کرتی ہیں

موتیوں کی کھیتی:-

یہ تو تھے قدرت کے کارخانے والے موتی
حضرتِ انسان نے سوچا کیوں نہ ان موتیوں کی کھیتی کی جائے۔ جی ہاں کھیتی۔ کیوں کہ سمندر کی تہہ میں موتی والی سیپیاں تلاش کرنے میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں سیپیوں میں سے ایک آدھ ہی موتی والی سیپی ملتی ہے۔ انسان نے سوچا کیوں اس جھنجھٹ میں پڑے کیوں نہ زیادہ سے زیادہ موتی آسانی سے حاصل کیے جائیں۔
بس پھر کیا تھا انسان موتیوں کی منافع بخش کاشت کے طریقے تلاش کرنے میں لگ گیا۔ آخر ۱۸۹۴ء میں بڑی محنت اور تلاش کے بعد جاپانی نوجوان کوچی کی موتو موتیوں کی کاشت کا آسان سا طریقہ ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔
اس نے ایک اچھی سی سیپی کے بہت چھوٹے چھوٹے ذرے بنائے اور انھیں "میلی گرینا" خاندان کی سیپیوں کے منہ کھول کر زبردستی اندر ڈال دیا۔ جس طرح انسانوں کے خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جانوروں کے بھی

خاندان اور قبیلے ہوتے ہیں) اس کے فوراً بعد ہر سیپی کا منہ بند کر دیا گیا۔ پھر ان سیپیوں کو سمندر کی تہہ میں کسی محفوظ مقام پر لے جاکر چھوڑ دیا گیا اس طرح کچھ سالوں کے بعد ان سیپیوں میں موتی پیدا ہو جاتے ہیں۔ موتی بننے کا طریقہ وہی ہے جو قدرتی طریقہ ہے۔ اس طریقے پر عمل کر کے بے شمار موتی پیدا کیے جا رہے ہیں۔ یہ ترکیب "موتی پیدا کرنے کا جاپانی طریقہ" بھی کہلاتی ہے۔ اس طرح کے پیدا کیے ہوئے موتیوں اور قدرتی طریقے پر پیدا ہونے والے موتیوں میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ دونوں صورتوں میں موتی کی پیدائش کا طریقہ ایک ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ قدرتی طریقے میں ذرے اپنے آپ اتفاقاً سیپی میں داخل ہوتے ہیں اور اس مصنوعی طریقے میں زبردستی داخل کیے جاتے ہیں۔

جزائر بالی نیشیا، شمالی کیلی فورنیا، جنوبی آسٹریلیا لنکا، ہندوستان اور خلیج فارس بہترین موتیوں کے لیے مشہور ہیں۔ اسکاٹ لینڈ، جرمنی، روس اور جنوبی امریکہ کی ندیوں میں بھی اچھے موتی پائے جاتے ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے کہ موتیوں میں سب سے بڑا موتی کتنا بڑا ہے؟ اگر نہیں تو کوئی بات نہیں۔ ہم بتائے دیتے ہیں۔ دنیا کے سب سے بڑے موتی کا قطرہ دو انچ۔ محیط چھ انچ اور وزن تین اونس ہے۔

جناب ل۔م۔شاہد

جادو کے سکّے

منو دیدی کی جیپ جب شام کو گاؤں پہنچی تو گیہوں کی سنہری بالیوں پر شام اتر آئی تھی۔ شہتوت کے درختوں پر چڑیاں چہک رہی تھیں۔ دو تین لڑکے رہٹ پوری قوت سے چلا رہے تھے۔ وہ جیپ کی آواز سنتے ہی چلانے لگے "دیدی آگئیں ـــ دیدی آگئیں" اور جیپ کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ تمام لڑکے جیپ کے پیچھے بندروں کی طرح لٹک گئے اور شور مچانے لگے۔

جیپ اب بانسوں کے جھرمٹ کو پار کرکے آم کے بڑے باغ سے نکل کر گاؤں کے سرپنچ کے مکان کے سامنے رک گئی۔

منو دیدی بال منڈل کی ڈائرکٹر تھیں۔ وہ ہر ماہ بال منڈل کا صدر ایسے لڑکے کو منتخب کرتی تھیں جس نے مہینہ میں کوئی اچھا کام کیا ہو۔ کبھی کبھی چناؤ میں بڑی دشواری پیش آتی کیوں کہ بہت سارے لڑکوں کے کام اچھے ہوتے۔ ایسی حالت میں پرچی ڈال کر فیصلہ کرنا پڑتا۔ مگر اس بار سب کی زبان پر رگھو ہی کا نام تھا۔ یہاں تک کہ سرپنچ نے بھی رگھو ہی کا نام لیا تھا۔

پچھلی بار جب دیدی آئی تھیں تو انھوں نے دیکھا تھا کہ کاکی چلنے پھرنے سے مجبور ہوگئی ہیں۔ سر پر سفید بال، جھریوں سے بھرا ہوا چہرہ اور تیز کھانسی۔

وہ گاؤں بھر کی کاکی تھیں۔ وہ اکیلی تھیں۔ رمن کاکا گزشتہ کئی سال سے نہ جانے کہاں تھے۔ یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ زندہ تھے یا نہیں۔ ایک بار بھیانک سیلاب آیا تھا۔ تبھی سے ان کا پتہ نہ تھا۔

کاکی سب کی کاکی تھیں۔ کبھی کھیتوں میں کام کروا رہی ہیں۔ کبھی آلو بوا رہی ہیں تو کبھی مونگ پھلی صاف کروا رہی ہیں۔ اگر کوئی کام نہ ہو تو کسی کے بچے کو گود میں لے کر کھلا رہی ہیں۔ مگر پچھلے سال سے ان کی

آنکھوں میں دھندا اتر آئی تھی اور وہ کمزور ہوتی جارہی تھیں۔ کچھ روز ہوئے کہ ان کی بغل میں ایک پھوڑا نکل آیا تھا۔ درد برداشت سے باہر تھا۔ منو دیدی ایک بار ڈاکٹر بھی لے آئیں تھیں لیکن کوئی خاص فایدہ نہیں ہوا اور دھیرے دھیرے چارپائی سے لگ گئیں۔ اب وہ اپنی کوٹھری میں ہی پڑی رہتیں۔

کاکی اکیلی کوٹھری میں پڑی کراہتی رہتیں۔ پھوڑا ان کو بہت تکلیف دے رہا تھا۔ رگھو کا اسکول جانے کا راستہ کاکی کی کوٹھری کے سامنے سے گزرتا تھا۔ ایک دن رگھو کو کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب کام چھوڑ کر کاکی کے پاس آگیا۔ کاکی اندھیری کوٹھری میں پڑی تھیں اور چارپائی سے لگ گئیں تھیں۔

"کیوں کاکی بہت درد ہے کیا؟" رگھو نے پوچھا۔

"ہاں بیٹا ــــ"

اور اس دن سے رگھو اسکول سے لوٹتے ہوئے شام کو کاکی کے پاس رک جاتا۔ ان کے پھوڑے کو دھوتا۔ پٹی باندھتا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کرکے گھر چلا جاتا۔

تیسرا دن تھا۔

رگھو پٹی باندھ کر جانے کو اٹھ کھڑا ہوا کہ کاکی کسی طرح اٹھیں اور چارپائی کے نیچے ایک ٹین کی صندوقچی سے ٹٹول کر ایک پانچ پیسے کا سکہ نکالا۔

"لے بیٹا ــــ"

پر رگھو کیسے لیتا۔ منو دیدی کا کہنا تھا کہ اچھا کام پیسوں کے لالچ سے نہیں کرنا چاہیے۔ مگر اس نے دیکھا کہ کاکی بہت اداس ہو کر کہہ رہی تھیں۔

"رگھو میرے پاس اور ہے ہی کیا۔ کچھ پانچ پیسے کے سکے ہیں بس۔ پچھلی بار منو دیدی دے گئی تھیں۔"

کاکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

انکار کرنے پر کاکی کو دکھ ہوگا یہ سوچ کر رگھو نے سکہ لے لیا اور کاکی کا چہرہ کھل اٹھا۔

روزانہ ایسا ہی ہوتا۔ رگھو ان کی مرہم پٹی کرتا وہ کسی طرح اٹھتیں اور صندوقچی کھینچ کر کپڑوں کی تہہ سے ایک پانچ پیسے کا سکہ نکال کر رگھو کو دے دیتیں۔ رگھو لے لیتا تو وہ کھل اٹھتیں اور ان کا جھریوں سے بھرا چہرہ مسکرا دیتا۔

پندرہ بیس دن گزر گئے۔ اب کاکی چارپائی سے بالکل نہیں اٹھ سکتی تھیں۔ صندوقچی سرہانے پر پڑی رہتی۔ پر کاکی کے پاس سکے تھے ہی کتنے۔ یہی ہوں گے بیس بائیس۔ بیسویں دن کاکی نے ٹٹولا تو کچھ

نہیں تھا۔ شاید سب ختم ہو چکے ہیں۔ کاکی نے سوچا ان کا چہرہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی ڈوب رہا ہو۔

"کیسی ہوں میں ــ تجھے کچھ نہ دے سکوں گی"۔

تبھی رگھو نے چپکے سے دو سکے صندوقچی میں ڈال کر کہا ــ "اچھی طرح دیکھو کاکی، ابھی اور ہوں گے"۔

اور سچ مچ کاکی کو ایک سکہ مل گیا۔ اس کے بعد تو کاکی کے سکے کبھی ختم ہی نہیں ہوئے جیسے جادو کے سکے ہوں۔ زندگی بھر کاکی کو جو سکھ نہیں ملا تھا وہ آخری دنوں میں ملا۔ سکے دے کر وہ کس قدر سکون محسوس کرتی تھیں۔ رگھو نے کاکی کے باہری دکھ ہی کو دور نہیں کیا بلکہ ان کے من کو سکون بھی دیا تھا۔

بال منڈل کا صدر رگھو کے علاوہ پھر کون ہوتا؟

(ہندی سے)

بقایہ صہ ۵۲

ہار مان لی۔

آپ جانتے ہیں نا میں نے کس لڑکی کی بات کہی ہے؟ یہی وہ لڑکی ہے جو بڑی ہو کر انگریزی زبان کی مشہور عالمہ و شاعرہ ہوئی اور جسے "بلبلِ ہند" کا لقب ملا۔ علم کی اس متوالی کو دنیا آج شریمتی سروجنی نائڈو کے نام سے جانتی ہے۔

قلمی دوستی

عبداللہ باشا سی ــ سولہ سال

پتہ :- عبداللہ باشا سی XI ایون اسٹنڈرڈ سی۔ اسلامیہ ہائی اسکول۔ میل وشارم

مشغلہ :- نماز پڑھنا، ٹکٹ جمع کرنا، قلمی دوستی کے سلسلے میں خطوں کے جواب جلد دینا۔

رضیہ فردوس ــ سولہ سال

مشغلہ :- مطالعہ کرنا، لڑکیوں سے قلمی دوستی کرنا

پتہ :- رضیہ فردوس نیر دی جامع مسجد (جنگوواڑی) اکوٹ ضلع اکولہ

جلیل احمد ــ چودہ سال

مشغلہ :- کہانیاں اور دوسری کتابیں پڑھنا

پتہ :- سلامت سیٹھ کی چال دھولکا مل کے سامنے احمد آباد ۲۱

بدر فاطمہ ــ نو سال

مشغلہ :- کھیل کود، مذہبی کتابیں پڑھنا اور سننا۔

پتہ :- جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب سیف سہسرامی

تتلی

رنگ برنگے پنکھوں والی — نازک نازک بھولی بھالی

ملکۂ گلشن باغ کی رانی — فطرت کی معصوم کہانی

گلشن گلشن گھوم رہی ہے — کلی کلی کو چوم رہی ہے

روپ تو دیکھو رنگ تو دیکھو — دیکھو اس کے ڈھنگ تو دیکھو

دل بہلانا کام ہے اس کا — پیاری تتلی نام ہے اس کا

سچ ہے سب کے من کو بھائے — اچھا سا کیوں نام نہ پائے

دیکھو نہ اس کو ہاتھ لگاؤ — اس کا ننھا جی نہ دکھاؤ

نیک بنو اور نام کماؤ

تم بھی تتلی سے بن جاؤ

انٹارکٹکا کی مہمیں

جناب محمد امین
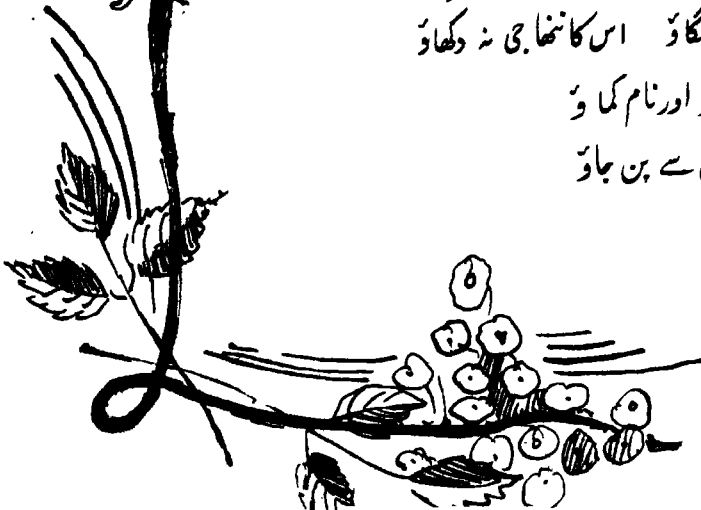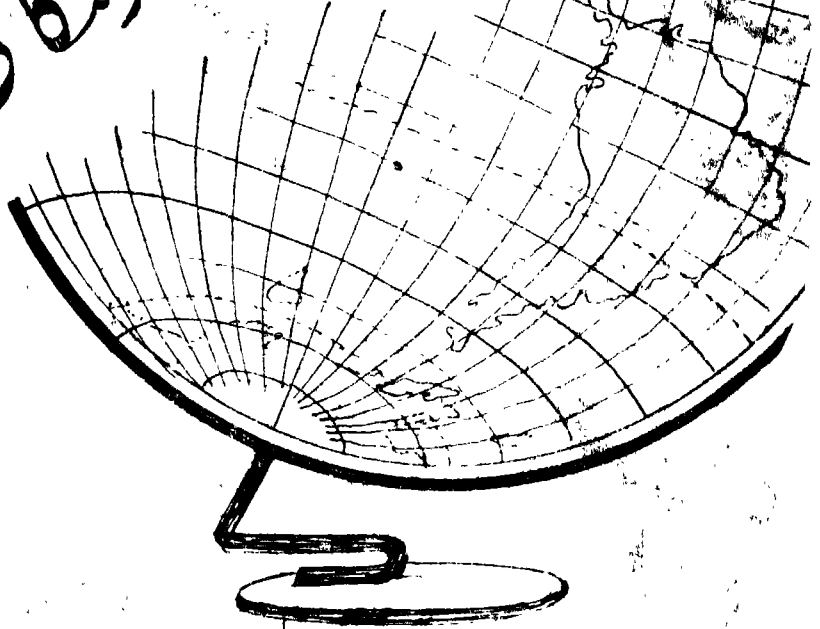
ہماری زمین کے اور انسانی تاریخ کے مختلف عہدوں اور مختلف زمانوں میں جتنی بھی بڑی ایجادیں ہوئی ہیں وہ چند مخصوص دماغوں کی وجہ سے ہوئیں۔ گلیلیو، نیوٹن اور آئن سٹائن کا نام کس نے نہیں سنا؟ انہوں نے فرداً فرداً سائنس کے مختلف میدانوں میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے ہیں۔ ان کی بدولت سائنس کا علم کہاں سے کہاں پہنچ گیا پھر اب تو دنیا بہت آگے بڑھ گئی ہے۔ بہت آگے بہت آگے! اب تو سائنس اور ٹکنالوجی کی ریسرچ یا تحقیق کے سلسلے میں بھی آپس میں مل جل کر کام کرنے کا اور ایک دوسرے کے مشورے سے تحقیق کا کام آگے بڑھانے کا زمانہ آگیا ہے۔ تحقیق کرنے والوں کو خاص ڈسپلن اور ٹیم کے تحت رہ کر اپنی معلومات اور ان کا نچوڑ اکٹھا کر کے ٹکنالوجی اور سائنس کے

بہت سے کاموں یا منصوبوں کو کامیاب بنانے کے لیے سوچ بچار کرنا پڑتا ہے۔

ابھی حال میں انٹارکٹکا کے متعلق بہت سی نئی نئی باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ان کے بارے میں آپ نے اخباروں یا رسالوں میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑھا ہوگا۔ یاد رکھیے کہ یہ واقفیت، یہ جان کاری فرداً فرداً کام کرکے نہیں حاصل کی جاسکتی تھی۔ سائنس کے بہت سے شعبوں نے اور ماہروں کے گروپ نے مل کر بہت سی اسکیموں کو کامیاب بنایا ہے۔

قطب جنوبی پر جو ایک زبردست برِاعظم پھیلا ہوا ہے اس کی تحقیق اور جان کاری کے سلسلے میں بہت سے ملکوں کے بڑے بڑے سیاحوں کے نام لیے جاتے ہیں جیسے امنڈسین، اسکاٹ، ماسن، شکلٹن اور بائرڈ وغیرہ لیکن اب کوئی ایک آدمی ایسا بڑا کارنامہ انجام نہیں دے سکتا۔ تحقیق کے کام کو سائنس اور بہت سے فنی لوگ ایک ساتھ مل کر کامیاب بنا رہے ہیں۔

آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ برِاعظم انٹارکٹکا دنیا کے دوسرے تمام برِاعظموں سے الگ تھلگ ہے اور وہاں کا ماحول بڑا ہی خطرناک ہے۔ وہاں ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے برفیلے طوفان آتے رہتے ہیں۔ سردیوں میں عام طور سے درجہ حرارت نفی ۵۶ ڈگری سینٹی گریڈ (نفی ۷۰ ڈگری فرن ہائیٹ) رہتا ہے۔ ایسے ماحول میں باہمی میل جول کے بغیر تحقیق کا کام کرنا مشکل ہے۔

چاند اور سیاروں کی تحقیق میں جو مسئلے درپیش ہیں وہ شاید انٹارکٹکا کے مسئلوں سے زیادہ خطرناک ہوں لیکن یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ شاید شروع میں چاند کی طرح انٹارکٹکا کے اندرونی حصوں تک جانا بھی ناممکن سمجھا جاتا تھا۔

سب سے پہلے غالباً مچھلی پکڑنے والے یونٹ کیسے کر بس اتفاق سے اپنے راستوں سے بھٹک کر ہوا اور مدوجزر کی موجوں کی لپیٹ میں آکر یہاں آپہنچے تھے۔ لیکن بعد میں لوگوں کی ہمتیں بڑھیں اور جان کی بازی لگا کر برفیلے طوفانوں کا مقابلہ کرتے ہوئے کئی سیاح انٹارکٹکا تک پہنچنے کی جدوجہد کرنے لگے۔

ان کی دیکھا دیکھی اور دوسرے ماہرین نے ہمت کی۔ ان لوگوں نے آگے بڑھ کر خطرناک علاقوں کے نقشے بنائے اور زمین کی خشکی کے، برفی حصے کی چھان بین کی اور راہیں کے چپے چپے کا جائزہ لیا۔

یاد رکھیے یہ حصہ یا علاقہ برِاعظم یورپ کے علاقے سے ڈیڑھ گنا زیادہ ہے۔

پر اب تو سائنس نے اتنی ترقی کرلی ہے کہ

انٹارکٹکا میں اب ایسے کئی اسٹیشن قائم ہیں جہاں سائنس داں سال بھر قیام کرتے ہیں اور وہاں کے ماحول کا تفصیلی مطالعہ کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس وقت دنیا کے بارہ ملکوں کے ماہر اور ٹکنیشین سیکڑوں کی تعداد میں انٹارکٹکا کی چھان بین میں لگے ہوئے ہیں۔

امریکا کے سائنس دانوں کی جماعت سب سے بڑی ہے اور ان کے ماہر پانچ مستقل مقامات پر (ان پانچ میں سے دو ساحل پر ہیں، دو اندرونی علاقے میں ہیں اور ایک ٹھیک قطب جنوبی پر واقع ہے) تحقیق کے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ کمال کی بات یہ ہے کہ جب قطب جنوبی پر چھ مہینے تک سردی کی لمبی رات شروع ہوتی ہے اس وقت بھی امریکہ کے ۳۱۱ سائنس داں اور ٹکنیشین پروگرام کے مطابق اپنا کام کرتے ہیں، اپنے سامان اور اوزار کی دیکھ بھال کرتے ہیں، اگر کوئی آلا ٹوٹ جائے تو اس کی مرمت بھی کرتے ہیں۔ گرمیوں میں امریکہ کے سائنس دانوں اور تحقیق کا کام کرنے والوں کی تعداد بڑھ کر پانچ ہزار تک پہنچ جاتی ہے۔

اس تحقیق اور جانچ پڑتال میں حصہ لینے والے دوسرے ملک ارجن ٹائنا، اسٹریلیا، بلجیم، چلی، فرانس، جاپان، نیوزی لینڈ، ناروے، جنوبی افریقہ، روس اور برطانیہ ہیں۔

ان ملکوں کی ٹیموں میں علمِ نباتات کے ماہر بھی شامل ہیں۔ وہ اس بات کے امکان پر غور کرتے ہیں کہ ممکن ہے سمندر کے پانی کے ذخیروں میں آگے چل کر انسان کی غذا کے لیے مفید چیزیں مل جائیں۔

زمین اور چٹانوں کے ماہرین اس بات کا پتہ چلاتے ہیں کہ انٹارکٹکا میں کون کون سی دھاتیں موجود ہیں اور ان کے کتنے کتنے ذخیرے ہیں۔ وہ اس بات پر بھی نظر رکھتے ہیں کہ قدیم زمانے میں گلیشیر کہاں کہاں تک پھیلے ہوئے تھے تاکہ ان کی مدد سے دنیا کی آب و ہوا کی تبدیلی کا بھید معلوم کیا جا سکے۔

علمِ طبیعات کے ماہر خلاء کے ریڈی ایشن کا کھوج لگاتے ہیں۔ انٹارکٹکا کی فضا بالکل صاف و شفاف ہے اور اس کی ایسی کیفیت ہے کہ انسان کی ایجاد کی ہوئی ریڈیائی لہریں یہاں تقریباً ناپید ہیں۔ اس لیے شعاع افشانی (ریڈی ایشن) کی تحقیق کے لیے نہایت مناسب ماحول ہے۔

آب و ہوا اور علمِ موسمیات کے ماہر ہوا، ہوا کے دباؤ کا بھید، اس کے نشیب و فراز اور دنیا کے موسم پر ان کے اثرات کو معلوم کرتے ہیں۔ تحقیق اور جستجو کی اس قدر لگن ہے کہ اس سلسلے میں امریکہ کے ماہروں نے نیا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔

صرف ایک سال یعنی ۱۹۶۲ء میں امریکہ کے سائنس دانوں نے فوٹو اتارنے، فلم بنانے، مختلف چیزوں کا ریکارڈ اتار کر رکھنے اور کئی چیزوں کے نمونے جمع کرنے کا جو کام کیا اس کا وزن ۳۰ ٹن تک پہنچ گیا تھا۔

اس کے علاوہ سائنس دانوں نے جستجو اور کھوج کے میدان میں نئے کارنامے بھی انجام دیے ہیں۔

۱۹۶۲ء کی گرمیوں میں مینے سوٹا یونی ورسٹی (MINNESOTA UNIVERSITY) کے دس سائنس دانوں نے ایسے پہاڑوں کا پتہ چلایا جو خالص سنگ مرمر کے ہیں۔ انہوں نے اس کی بھی جانچ کی کہ ان پہاڑوں کے اوپر سے جب برف اور برفیلی چٹانوں کی سلیں پھسلتی ہیں تو وہ بڑے خوبصورت اور زیادہ سفید بن جاتے ہیں۔

اسی طرح اوہایو اسٹیٹ یونی ورسٹی کے چٹانوں (علم طبقات الارض) کے چار ماہر جب ایک خاص قسم کی موٹر میں سوار ہو کر چٹانوں کی بناوٹ کا مشاہدہ کر رہے تھے تو انہوں نے ایک ایسے پہاڑ کا پتہ لگایا جس کے متعلق پہلے سے کسی کو کچھ نہیں معلوم تھا۔ صرف یہی نہیں یہ پہاڑ آتش فشانی بلکہ زندہ آتش فشانی پہاڑ ثابت ہوا۔ گویا یہ جنوبی دنیا کے نچلے حصوں کا آخری آتش فشاں پہاڑ ہے۔

پنگوئین نام کی چڑیوں کے متعلق بھی وس کان سن یونی ورسٹی کے سائنس دانوں کی ایک ٹیم نے یہ ایک دلچسپ مشاہدہ کیا کہ یہ چڑیاں اپنے گھونسلے تک پہنچنے کے لیے مسلسل سیدھی لاین بنا کر سپاہیوں کی طرح سر اونچا کیے سیکڑوں میل تک لفٹ رائٹ کرتی رہتی ہیں۔ ان کا سردار ان کی رہنمائی کرتا ہے۔ نہ کوئی چڑیا ڈسپلن توڑتی ہے نہ لائن بگاڑنے یا آگے پیچھے ہونے کی کوشش یا جرأت کرتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اپنے قواعد وضوابط ہیں اور ان کی پابندی کرنا انتہائی ضروری ہے جیسا کہ فوجیوں کے لیے قاعدے اور قانون کی پابندی کرنا ضروری ہے۔

۱۹۵۹ء میں امریکہ نے انٹارکٹکا کی کھوج میں حصہ لینے والے بارہ ملکوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس منعقد کی۔ اس موقع پر مختلف مسائل پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ لیکن کوئی متفقہ فیصلہ نہ ہو سکا بحث مباحثہ کا سلسلہ جاری رہا۔ دوبارہ کانفرنس کی نشست بلائی گئی۔ آخر کار ۲۳ جون ۱۹۶۱ء کو انٹارکٹکا کے متعلق ایک معاہدہ ہو گیا۔ اس معاہدے کی سب سے اہم دفعہ یہ ہے کہ تیس سال تک دنیا کا کوئی ملک انٹارکٹکا کے کسی حصے پر اپنی ملکیت قایم کرنے یا قبضہ جمانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

دوسرے یہ کہ سب ملک باہمی میل جول اور ایک دوسرے کی امداد کے جذبے کے ساتھ کام کریں گے۔ اپنی معلومات کو سامنے رکھ کر تبادلۂ خیالات بھی کریں گے، ایک دوسرے کو مختلف سہولتیں بہم پہنچائیں گے اور مہموں کے کاموں سے بھی ایک دوسرے کو باخبر رکھیں گے، مل جل کر تجربے کریں گے اور مل جل کر نئے پروجیکٹ بھی چلائیں گے۔ آڑے وقتوں میں سہارا دینے اور پوری پوری امداد کرنے سے کبھی نہیں کترائیں گے۔

اس طرح سائنس دانوں کی بہت سی ٹیمیں بین الاقوامی سطح پر آپس میں مل جل کر کام کر رہی ہیں۔ اور امن و امان کے جذبے سے کام لیکر اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر پوری طرح عمل کر رہی ہیں۔ یہ کام ایک شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ سیکڑوں ہزاروں لوگ مل کر اپنے اپنے میدانوں اور شعبوں میں تحقیق کر رہے ہیں۔ ان کی جدّ و جہد سے یقین ہے کہ ہمیں آپ کو بہت ہی قیمتی معلومات حاصل ہوں گی۔

جناب شباب قریشی

بھوک کا چوہا

امی مجھ کو بھوک لگی ہے
مجھ کو دودھ پلا دو نا!
میرے پیٹ میں بھوک کا چوہا
اُچھل اُچھل کر ناچ رہا ہے
یا الٰہا میں اُس چوہے کے
ننھے منھے پیٹ میں جا کر
بھوک کے مارے ناچ رہا ہوں

بات یہ بالکل سچ ہے امی
تم کو گر یہ جھوٹ لگے گی
میرے پیٹ میں جھانک کے دیکھو
کیسی بھوک لگی ہے مجھ کو
کتنا چوہا دوڑ رہا ہے۔

جناب شیخ عبدالغنی

پہلے تم نے بات کی

کام کرنے والے
ایک بوڑھا
ایک بڑھیا
دو آوارہ گرد

بوڑھا۔ (گھر میں داخل ہوتے ہی) او بھئی آج کیا پکایا ہے؟

بڑھیا۔ (جھنا کر) پہلے چارپائی پہ بیٹھ کر دم تو لو۔ تمھیں تو ہر وقت پیٹ کی سوجھتی ہے۔

بوڑھا۔ نیک بخت۔ کمرہ کھانے کی سوندھی سوندھی خوشبو سے مہک رہا ہے اور مجھے خوب بھوک لگی ہے۔

بوڑھیا۔ ندیدے ہو۔ ہر وقت بھوک ستاتی ہے!

بوڑھا۔ اری نیک بخت۔ یوں تو نہ بولا کرو۔ آج کا دن تو بہت مبارک ہے۔ دیکھو کتنی بہت سی لکڑی لایا ہوں۔

بوڑھیا۔ اور میں تو گھر میں دن بھر بس ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہی!

بوڑھا۔ (کندھے دکھاتے ہوئے) دیکھو کندھے سرخ ہو گیے ہیں۔ باہوں پر نیل سے پڑ گیے ہیں آج لکڑی کا گٹھا بہت بھاری تھا۔

بوڑھیا۔ تم اپنے شانوں اور باہوں کو روتے ہو۔ میرے ہاتھوں کی طرف بھی تو دیکھو۔ کتنے پھٹ گیے ہیں؟ دن میں کئی بار ہاتھوں کو ٹھنڈے پانی میں ڈالنا پڑتا ہے۔ ابھی آٹا گوندھا، ابھی چاول دھوے، برتن مانجے اور ہاں روز روز تمھارے کپڑے دھونا پڑتے ہیں۔

بوڑھا۔ (بات کاٹ کر) میرا سارا جسم دکھ رہا ہے۔

بوڑھیا۔ بس بھی کرو۔ بک بک ہی کیے جاؤ گے مجھے کھانا نکالنے دو؟ (آہستہ سے) بوڑھا چھوڑ کہیں کا۔

بوڑھا۔ لو میں چپکا ہوا جاتا ہوں (منہ پھیر کر آہستگی سے) ایسی بدزبان چڑچڑی بڑھیا سے خدا کسی کا واسطہ نہ ڈالے (بڑھیا کھانا نکالتی ہے۔ دو تین پیالوں میں سبزی، بھاجی اور گوشت نکالتی ہے اور تھال میں روٹیاں رکھتی ہے)

بوڑھیا۔ یہ پانچ پھلکے تم کھاؤ۔ چھ پھلکے میں کھاؤں گی۔

بوڑھا۔ کیوں؟ تم چھ کیوں کھاؤ گی؟ اور مجھے پانچ ہی کیوں دو گی؟

بوڑھیا۔ کھانا میں نے پکایا ہے۔

بوڑھا۔ جنگل میں جاؤں۔ محنت مشقت میں کروں۔ کما دھا کر میں لاؤں۔ اور زیادہ کھانے پینے کا حق تم جتاؤ۔

بوڑھیا۔ تو میں کیا بھر مکھیاں مارتی رہتی ہوں۔ دن بھر میں بھی محنت کرتی ہوں۔ کنویں سے پانی لاتی ہوں۔ برتن مانجھتی ہوں۔ تمھارے کپڑے لتے دھوتی ہوں۔ اور تمھارے لیے گرم گرم کھانا تیار رکھتی ہوں۔

بوڑھا۔ اری نیک بخت یہ سب کچھ سہی، پھر بھی گھر میں رہ رہی ہو۔

بوڑھیا۔ اور تم کون سا سمندر پار کرتے ہو۔ (آہستہ سے) بوڑھا جھڑوس۔

بوڑھا۔ بس بک بک بند کرو۔ زبان ہے یا قینچی۔ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے

بوڑھیا۔ کھانا تم ٹھنڈا کر رہے ہو یا میں؟

بوڑھا۔ بھلا کوئی بھی بھلے گھر کی شریف عورت اپنے میاں سے یوں بولا کرتی ہے۔

بوڑھیا۔ اور شریف مرد یوں بولا کرتا ہے؟

بوڑھا۔ اُف زبان ہے یا کتَرنی؟

بوڑھیا۔ (اٹھتے ہوئے) کھانا کھاؤ تو کھالو۔ نہیں اپنی بلا سے۔ میں اپنا حصّہ کھا رہی ہوں۔

بوڑھا۔ تم آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ نیک بخت! پہلے اس ایک روٹی کا فیصلہ ہو جائے تب میں کھانے کو ہاتھ لگاؤں گا۔

بوڑھیا۔ اس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ میں یہ روٹی کھا رہی ہوں۔

بوڑھا۔ لیکن میں کھانے نہیں دوں گا۔

بوڑھیا۔ روٹی تو روٹی۔ میں تمھیں بھی کھا جاؤں گی۔

بوڑھا۔ (مسکرا کر) اری نیک بخت مجھے ایک شرط سوجھی ہے۔ کہو تو بتاؤں؟

بوڑھیا۔ ہاں ہاں بتاؤ۔

بوڑھا۔ شرط یہ ہے جو پہلے بات کرے گا۔ وہ اس روٹی کا حقدار نہیں ہوگا۔ اور جو چپ چاپ خاموش رہے گا وہ روٹی پائے گا۔ جب تک دونوں کھانے کو نہیں چھوئیں گے بولو یہ شرط منظور ہے؟

بوڑھیا۔ (کچھ سوچتے ہوئی) ہاں منظور ہے۔

(بوڑھا اور بڑھیا دونوں چپ چاپ اپنی اپنی جگہوں پر جم کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ہوا کا ایک جھونکا آتا ہے اور دروازہ کھل جاتا ہے۔ لیکن دونوں میں کوئی بھی دروازہ بند نہیں کرتا ہے۔)

~~~~~~~

(دو آوارہ گرد اور بچے لفنگے گھومتے گھامتے اس جگہ پہنچتے ہیں۔ دروازہ کھلا پاکر ایک دوسرے سے کہتا ہے)

پہلا آوارہ گرد۔ (اے دیکھ۔ یہ دروازہ کھلا ہوا ہے)

دوسرا آوارہ گرد۔ چلو ایک دم سے اندر داخل ہو جائیں۔

پہلا۔ آہاہاہاہا! آہاہاہاہا! قسم قسم کے کھانے سجے ہیں۔ (چونک کر) ارے یہ بوڑھا اور بڑھیا۔ سلام بوڑھے میاں۔

دوسرا۔ سلام بڑی بی!

پہلا۔ ارے کیا سنتے نہیں ہو؟ جواب دونا۔

دوسرا۔ کیا بہرے ہو؟

پہلا۔ یاران کو تو جیسے سانپ سونگھ گیا ہے۔

دوسرا۔ نہیں۔ ان کے سر پر بھوت سوار ہیں۔

پہلا۔ اچھا۔ گویا یہ آسیب زدہ ہیں آہاہاہاہا!

دوسرا۔ مرنے دو انھیں۔ آؤ کھانا کھائیں۔ آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں۔

پہلا۔ ہاں ہاں چلو ہو جائے۔ (دونوں کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بوڑھا بڑھیا کی طرف قہر بھری نظروں سے اشارہ کرتا ہے کہ وہ ان بن بلائے مہمانوں کے خلاف زبان کھولے اور بڑھیا آنکھوں ہی آنکھوں میں بوڑھے سے کہتی ہے کہ وہی ان لفنگوں کو بھگانے میں پہل کرے لیکن دونوں خاموش رہتے ہیں)

پہلا۔ آہاہاہاہا! کتنے اچھے پھلکے ہیں۔

دوسرا۔ میٹھی کتنی اچھی ہے؟

پہلا۔ پالک کتنا مزیدار ہے!

دوسرا۔ (چٹخارا لیتا ہوا) اور بھئی واہ بھنا ہوا گوشت۔

پہلا۔ (انگلیاں چٹخاتا ہوا) واہ بھئی واہ بڑھیا کیا اچھا کھانا پکاتی ہے۔ (بوڑھے میاں اور بوڑھی ناک سکوڑ کر، منہ بسور کر، اور چہرے بھینچ بھینچ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارہ کر رہے ہیں گویا وہ کہہ رہے ہوں کہ کوئی ایک اٹھ کر ان کو بھگاتا کیوں نہیں)

دوسرا۔ ہاں یار کھانا تھالی میں رکھ۔ دونوں پر بھوت سوار ہو گئے ہوں گے۔

پہلا۔ ہماری قسمت میں یہ کھانے لکھے تھے۔

دوسرا۔ اب ایک ہی پھلکا بچا ہے۔

پہلا۔ گوشت کی یہ آخری بوٹی ہے۔ لو تم اس چٹنی کے ساتھ روٹی کھاؤ۔

دوسرا۔ نہیں میں کھا چکا (ہاپ.... ہاپ۔ روز سے
~~~~~~~

ڈکار لیتا ہے) پانی ! پانی !

دوسرا ۔ کیا شور مچاتے ہو ؟ پانی اس گھڑے میں ہوگا ۔ اٹھو اور پی لو ۔

(پہلا آوارہ گرد ایک ہنڈیا میں گھڑے سے پانی انڈیل کر غٹاغٹ پی جاتا ہے ۔ اس کے بعد دوسرا کھانا کھا کر کھڑا ہو جاتا ہے ۔ اور اس ہنڈیا کو اپنے ساتھی کے ہاتھ سے چھین کر پانی حلق میں انڈیلتا ہے ۔ بوڑھا اور بڑھیا کی آنکھوں میں غم و غصے سے آگ کے شعلے سے نکل رہے ہیں ۔ (پیٹ پر ہاتھ پھیر کر) آج میں نے ڈٹ کر کھانا کھایا ۔ (ہپ ۔ ہپ ۔ ڈکار لیتا ہے)

پہلا ۔ ارے دیکھو ! یہ بوڑھیا گھور گھور کر ہمیں کیا دیکھ رہی ہے ؟

دوسرا ۔ جانے سے پہلے ہم ان بڑی بی کے ہاتھ تو چوم لیں ۔ ہاتھ جوڑ کر سلام تو کر لیں ۔

پہلا ۔ (شانہ پر زور سے ہاتھ مار کر) بھئی واہ خوب یاد دلایا چلو ۔ (دونوں بڑھیا کی طرف بڑھتے ہیں ۔ اور جوں ہی اس کے ہاتھ کی طرف منہ بڑھاتے ہیں بوڑھا اچھل پڑتا ہے ۔ اور گرج دار آواز کمرے میں گونجتی ہے)

بوڑھا ۔ بدبختو ! میرا کھانا چٹ کر گئے اب میری عورت کے ساتھ گستاخی کر رہے ہو ؟

(دونوں بھوت بھوت کا شور بلند کرتے ہیں اور رفو چکر ہو جاتے ہیں ۔)

بوڑھیا ۔ (چک کر) پہلے تم نے بات کی ، اب پھل کا مجھے ملا ۔

(پردہ گر جاتا ہے)

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

علم کی متوالی :-

۱۲ برس کی دُبلی پتلی کمزور لڑکی۔ جسم گویا ہڈیوں کا ڈھانچا لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک، بلا کی روشنی ہے۔ کئی دن سے اسے بخار ہے پھر بھی وہ لکھنے پڑھنے سے باز نہیں آتی۔ ڈاکٹر نے لڑکی کے باپ کو تاکید کی ہے کہ اسے مکمل آرام کی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا "آپ کی لڑکی اِس عمر میں انٹرنس کا امتحان پاس کر چکی ہے۔ اب پڑھنے کی کیا ضرورت ہے۔ صحت قایم رہے تو سب کچھ ممکن ہے ۔" لیکن وہ لڑکی کہاں ماننے والی تھی۔ لکھنا پڑھنا وہ کسی حالت میں بھی ترک کرنا گوارا نہیں کرتی تھی۔ ڈاکٹر کے جاتے ہی وہ پھر لکھنے بیٹھ گئی اور دو دن میں تیرہ سو (۱۳۰۰) مصرعے کہہ ڈالے۔ بخار نے اور زور کیا۔ علم کی اس متوالی نے بخار کے سامنے ہتھیار ڈال دینے سے انکار کر دیا۔ ہفتہ بھر کی محنت سے اس نے دو ہزار جملوں پر مشتمل ایک ڈرامہ لکھ ڈالا۔ ڈاکٹر حیران تھا کہ وہ جتنا علاج کر رہا ہے مرض اتنا ہی بڑھ رہا ہے۔ باپ بھی سخت ناراض ہوا کہ بچی کسی طرح کاغذ قلم چھوڑنے کا نام نہیں لیتی۔ انھوں نے غصہ میں آکر تمام کاغذ قلم بچی سے چھین کر دوسرے کمرے میں لے جاکر رکھ دیے اور بچی کے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا۔ باپ کے چلے جانے کے بعد لڑکی بستر سے اٹھی، پورا کمرہ کاغذ قلم یا پنسل کے لیے چھان مارا لیکن وہاں نہ کاغذ کا کوئی ٹکڑا تھا نہ قلم یا پنسل۔ ہاں، باپ یہ بھول گیا تھا کہ کمرے میں کتابوں سے بھری ہوئی ایک الماری بھی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ لڑکی لکھنے کے بجائے الماری سے ایک ایک کتاب نکال کر پڑھتی گئی ——— کئی کتابیں پڑھ ڈالیں، پڑھتی رہی پڑھتی رہی اور دن بیتتے رہے ——— بالآخر بخار ہی نے اپنی

باقی ۵۴ پر

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مسلسل

دو بزرگ :-

یوں تو مکّے میں بڑے بڑے بزرگ اور خدارسیدہ لوگ رہتے ہیں۔ مگر دو بزرگوں کا حال لکھنا ضروری ہے۔

عزّ الدین واسطی :- یہ بے حد دولت مند تھے پر اب دنیا کو لات ماردی ہے۔ گھر سے سینکڑوں روپیہ آتا ہے۔ یہ بزرگ اس روپیے کی کھجوریں اور غلہ خرید کر مسکینوں اور ضعیفوں کو پہنچا دیتے ہیں۔

دوسرے ابوالحسن علی بن رزق اللہ الانجری ہیں۔ طنجہ کے رہنے والے۔ مکّے میں جاروب کشی کرتے ہیں۔ (جھاڑو دیتے ہیں) میرے والد کی اور ان کی پرانی دوستی ہے۔ طنجے تشریف لے گئے تو ہمارے ہی گھر قیام رہا۔ مکّے میں وفات پائی۔ اب ان کا ایک مسافر خانہ ہے۔ اسے رباط ربیع کہتے ہیں۔ مسافر خانے میں ایک کنواں ہے اس کا پانی اتنا میٹھا ہے کہ مکّے میں کسی کنویں کا پانی اتنا میٹھا، اتنا خوشگوار نہیں ہے۔

طائف والوں کو شیخ سے اتنی عقیدت ہے کہ ان کی وفات کے بعد سال کے سال اپنے باغوں کی پیداوار کا دسواں حصّہ مسافر خانے کے خرچ کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ جس سال ہم یہ دسواں حصّہ نہیں بھیجتے پیداوار کم ہو جاتی ہے۔ اور باغوں کو نقصان پہنچ جاتا ہے۔

دن کا ذکر ہے کہ مکّے کے امیر کے غلاموں نے ایک مسافر خانے کے میٹھے کنویں کا پانی زبردستی گھوڑوں کو پلا دیا اصطبل میں گھوڑوں کو باندھا تو گھوڑے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ امیر کو خبر ہوئی۔ تو مسافر خانے کے درویشوں کے پاس حاضر ہو کر معافی مانگی اور ایک رئیس کو اپنے گھر لے گیا۔ درویش نے گھوڑوں کی پیٹ پر ہاتھ پھیرا تو جو کچھ ان کے پیٹ میں تھا نکل پڑا۔ اور اچھے ہو گیے۔ اس کے بعد امیر ہمیشہ مسافر خانے کی خدمت کرتا رہا۔ اور کبھی ایسی غلطی نہ کی۔

حسن مجنوں :- کچھ میں نے بھی مکّے میں

جاروب کشی (جھاڑو دینے) کی خدمت انجام دی ہے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک صاحب دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔ شیخ نجم الدین اصفہانی کے مرید تھے حسن نام تھا۔ سب لوگ انھیں حسن مجنوں کہتے تھے۔ میں نے یہاں کے رہنے والوں سے ان کا حال پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ یہ رات کو طواف زیادہ کرتے تھے۔ ایک رات کو طواف کر رہے تھے کہ ایک درویش نظر آئے۔ حسن نے ان درویش کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ درویش ان کا حال پوچھنے لگے اور بولے "حسن! تیری ماں تیری جدائی سے بیقرار ہے اور روتی ہے۔ کیا تجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ اسے اپنی صورت دکھا دے۔ تیری ماں خدا کی بڑی نیک بندی ہے۔"

حسن بولے "جی تو میرا بھی چاہتا ہے۔ مگر میرے بس میں کیا ہے کس طرح ان کے پاس پہنچوں کہ وہ مجھے دیکھ سکیں۔"

درویش نے کہا: "کل رات کو مجھ سے ملنا۔"

دوسرے دن حسن درویش سے ملے پہلے دونوں نے کعبے کا طواف کیا۔ درویش جنت المعلٰی کی طرف چلے تو حسن بھی ساتھ ہو گیے۔ درویش نے حسن سے کہا: "آنکھیں بند کر لے اور اپنے کپڑے سمیٹ کر ہاتھ سے پکڑ لے" تھوڑی دیر بعد درویش نے کہا "کیا تو اپنی بستی کو پہچانتا ہے؟"

حسن نے کہا: "ہاں پہچانتا ہوں۔"

درویش نے کہا: "آنکھیں کھول اور دیکھ۔"

حسن نے آنکھیں کھولیں تو اپنے دروازے کے سامنے کھڑے تھے۔ درویش غائب ہو گیے اور حسن اپنی ماں کے پاس پہنچ گیے۔ پندرہ دن ماں کے پاس رہے۔ ایک دن بستی کے باہر نکلے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہی درویش کھڑے ہیں۔ حسن نے کہا "اب تو میرا جی اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں جانے کو چاہتا ہے۔"

درویش بولے "رات کو اسی جگہ ملنا۔" رات آئی اور حسن درویش کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گیے درویش بولے "کپڑے سمیٹ کر ہاتھوں میں پکڑ لے اور آنکھیں بند کر لے۔"

اب جو آنکھیں کھولیں تو حسن حرم کعبہ میں کھڑے تھے۔ درویش نے کہا "اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔"

حسن پیر و مرشد کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے اتنے دنوں تک نہ آنے کا سبب پوچھا۔ اب یہ بڑے گھبرائے۔ پیر و مرشد نے بار بار پوچھا تو سارا قصّہ سُنا دیا۔ ان کے پیر و مرشد بولے "ایسے درویش سے ہم بھی ملنا چاہتے ہیں۔"

رات ہوئی تو حسن اپنے پیر کو اس جگہ لے گیے جہاں درویش ملتے تھے اور بتایا کہ وہ درویش یہ ہیں۔ درویش نے جب سُنا کہ حسن میرے بارے

میں بتا رہے ہیں تو منھ پر ہاتھ رکھ کر کہا: "چپ خدا تجھے چپ کرے" درویش کا یہ کہنا کہ حسن کی زبان بند ہو گئی۔ اسی دن سے دیوانوں کی طرح پھرتے ہیں۔ دن رات بے وضو طواف کرتے رہتے ہیں۔ نماز چھوڑ دی ہے۔ بھوک لگتی ہے تو صفا مروہ کے نالے والے بازار میں کسی دکان پر پہنچ جاتے ہیں جو کچھ دل میں آتا ہے کھا لیتے ہیں۔

دکان دار ان کی بڑی عزت کرتے ہیں اور ہر ایک تمنا رکھتا ہے کہ حسن اس کی دکان سے کھائیں۔ جس کی دکان پر کھا لیتے ہیں، اس کی بکری تگنی چوگنی ہو جاتی ہے۔ ہر ایک سقہ یہی چاہتا ہے کہ حسن پانی اس سے لے کر پئیں۔ نہ جانے زندہ ہیں یا رحلت کر گئے۔ امیر سیف الدین انھیں مصر لے گیا تھا۔

حرم کی نمازیں: سب سے پہلے شافعی امام نماز پڑھتا ہے پھر مالکی اور حنبلی اور ان سب کے بعد حنفی۔ سب کے مصلے الگ الگ ہیں۔

جمعے کا خطبہ: جمعے کے دن بڑی چہل پہل ہوتی ہے۔ امام خطبہ کے لیے نکلتے ہیں تو نرالی شان ہوتی ہے۔ سیاہ چغہ، سیاہ عمامہ، سیاہ چادر اوڑھ کر چلتے ہیں۔ آگے آگے موذن ادب کے ساتھ چلتا ہے۔ دو موذن دائیں بائیں سیاہ جھنڈیاں لیے چلتے ہیں۔ اگلا موذن کوڑا پھٹکارتا جاتا ہے جس سے سڑاخ سڑاخ کی آواز نکلتی ہے اور نمازی سمجھ جاتے ہیں کہ امام صاحب تشریف لا رہے ہیں۔ ممبر کے قریب پہنچتے ہی کوڑے کی پھٹکار بند کر دی جاتی ہے۔ ممبر حجر اسود سے ملا کر رکھا جاتا ہے۔

ممبر کے قریب بیٹھ کر امام سب سے پہلے حجر اسود کو چومتے ہیں اور دعا مانگتے ہیں پھر لوگوں کی طرف رخ کر کے دائیں بائیں سلام کرتے ہیں۔ نمازی "وعلیکم السلام" کہتے ہیں۔ جس وقت امام ممبر پر جاتے ہیں۔ موذن کا سردار جو کندھے پر تلوار رکھے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ تلوار امام کو دے دیتا ہے۔ امام ممبر کے پہلے درجے پر اتنی زور سے تلوار کی نوک مارتے ہیں کہ تلوار کی جھنکار سب کے کانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ دوسرے تیسرے درجے پر بھی یہی عمل کرتے ہیں اور بیٹھ جاتے ہیں۔ اب تمام اذان دینے والے زمزم شریف کے قبے پر کھڑے ہو کر اذان دیتے ہیں۔ اذان ختم ہوتے ہی خطبہ شروع ہو جاتا ہے۔ امام سرکارِ دو جہاں پہ درود پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں۔

"اے اللہ محمدؐ اور آل محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر رحمت نازل فرما جب تک اس گھر کا طواف ہوتا رہتا ہے۔ اور جب تک عرفات میں حاجی ٹھہرتے ہیں۔

رسول اللہ کے چار یاروں: صحابہؓ کرام حمزہ، عباس۔ امام حسن حسین، سیدہ فاطمہ، بی بی خدیجہ کا نام لیتے ہیں اور ہر ایک کے ساتھ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ پھر ملک الناصر کے لیے دعا کرتے ہیں پھر سلطان مجاہد نورالدین کے لیئے امرا، حکام مکّہ کے لیے۔

نماز ختم ہوجاتی ہے تو امام اسی شان سے واپس جاتے ہیں۔ دونوں طرف جھنڈے آگے آگے موذن کو ڑا پھٹکارتے ہوئے گویا نماز ختم ہوگئی۔

چاند کا جلوس:-

یوں تو ہر نئے چاند پر شریف مکّہ کا جلوس نکلتا ہے۔ مگر بعض مہینوں میں جلوس کی شان بڑھ جاتی ہے۔ جیسے رجب کے مہینے میں جونہی رجب کا چاند نظر آتا ہے قرنا اور نقارے بجنے لگتے ہیں۔ رجب کی پہلی تاریخ کو سواروں پیادوں اور مکّے کے تمام امیروں کے ساتھ شریف مکّہ کی سواری نکلتی ہے۔ فوجی اپنے کرتب دکھاتے ہیں۔ گھوڑے دوڑاتے کُدا تے ہیں۔ پیدل فوجی اچھلتے کودتے اور ہتھیاروں کو اچھالتے اور ایسی صفائی سے روکتے ہیں کہ واہ واہ کا شور مچ جاتا ہے نقارے دھونسے ساتھ ساتھ ہوتے ہیں

بیت اللہ پہنچ کر شریف مکّہ طواف کرتا ہے اور موذنوں کا سردار شریف کے لیئے دعا مانگتا ہے۔

رجب کا عمرہ:-

رجب میں چھوٹا حج جسے عمرہ کہتے ہیں بڑی دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ اس عمرہ میں مکّے کے آس پاس کے لوگ بھی آتے ہیں اور غلّہ، گھی، زیتون، بادام اور کشمش لاتے ہیں۔ یہ نہ لائیں اور غلّے کی آمد نہ ہو تو مکّے والے بھوکے مرجائیں۔ مگر کیسے آئیں! یہ تو اللہ کا وعدہ ہے کہ مکّے میں طرح طرح کی چیزیں ملا کریں گی۔ یہ لوگ جنس نہیں لاتے تو خود ان کے دیہات میں قحط پڑجاتا ہے اور جانور مرنے لگتے ہیں اور جس سال غلّہ اور دوسری چیزیں پہنچا دیتے ہیں۔ فراخی اور پیداوار زیادہ ہوتی ہے۔

سامانِ رسد لانے والے یہ قبیلے بڑے نیک اور خوش اخلاق ہیں جس وقت طواف کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے دل و جان سے قربان ہو رہے ہیں۔ پھر جس وقت حرم کے پردے پکڑ پکڑ کر دعائیں مانگتے ہیں تو ایسے ذوق و شوق سے رو رو کر دعائیں مانگتے ہیں کہ آس پاس والے بھی رونے لگتے ہیں۔

جس وقت ان کا ہجوم طواف کے لیے بڑھتا ہے تو پھر کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ طواف کے لیے قدم بڑھائے۔ نہ کوئی حجرِ اسود چوم سکتا ہے نہ طواف کرسکتا ہے ان کا لباس چمڑے کا ہوتا ہے اور یہ اتنے بہادر اور بے خوف ہیں کہ بدّو بھی جنھیں اپنی طاقت کا بڑا گھمنڈ ہے انھیں دیکھ کر کھسک جاتے ہیں۔ اور ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے

محترمہ صفیہ ایم یوسف

روٹی نے جان بچائی

کسی ملک میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ وہ بہت کنجوس تھا۔ کسی کو ایک پیسہ تک نہ دیتا۔ کوئی بھکاری اس کے دروازے پر آجاتا تو ڈانٹ کر بھگا دیتا۔ اگر بھکاری نہ جاتا ڈھیٹ پن دکھاتا تو وہ اسے مارنے سے بھی گریز نہ کرتا۔ گھر میں بھی کھانے کی چیزیں مثلاً چاول، آٹا وغیرہ تول کر دیتا۔ کبھی کوئی چیز زیادہ نہ دیتا۔ اسی لیے اس کا نام ہی کنجوس سوداگر پڑ گیا۔

اس کی ایک بیوی تھی تین بچے تھے۔ کاروبار اور دوسرے کاموں کے لیے تین نوکر بھی تھے۔ وہ ان نوکروں سے بہت کام لیتا تھا۔ گھر کے کام اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ایک نوکرانی تھی اس کا نام شریفہ تھا۔ یہ بے چاری صبح منھ اندھیرے سے رات گئے تک کام کرتی۔ ذرا بھر بھی اسے آرام نہ ملتا اس پر بھی وہ اُف تک نہ کرتی۔

ایک مرتبہ سوداگر کو سامان لانے کے لیے دوسرے ملک جانا پڑا۔ سفر پر جانے سے پہلے اپنی بیگم سے کہا کہ میری غیر حاضری میں کسی کو کوئی چیز یا پیسہ نہ دینا۔ اور روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں اسے دے گیا۔

دوسرے ملک سے سامان خریدنے کے بعد وہ اپنے وطن آنے کے لیے جہاز پر بیٹھ گیا۔ جہاز ابھی سمندر کے درمیان میں بھی نہ پہنچا تھا کہ طوفان اور آندھی نے آگھیرا۔ چاروں طرف اندھیرا اور دھواں دھواں سا نظر آنے لگا۔ تمام مسافر گھبرا گیے۔ اور خدا سے دعا مانگنے لگے۔ اندھیرا اتنا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ آندھی کے تھپیڑوں سے جہاز میں سوراخ ہونے لگا۔ سوراخ سے جہاز میں پانی بھرنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدا کا کرنا کوئی گول سی چیز سوراخ پر چپک گئی۔ جس کی وجہ سے پانی اندر آنا بند ہو گیا۔ مسافروں کی جان میں جان آئی اور

انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ آندھی اور طوفان بھی کم ہو گیا۔ لوگوں نے غور سے دیکھا تو سب کو تعجب ہوا وہ گول چیز "روٹی" تھی جس نے پانی کو روک رکھا تھا۔

خدا خدا کر کے جہاز کنارے پہ لگا اور سب مسافر جہاز سے اتر کر اپنے اپنے گھر لوٹ گیے۔ سوداگر بھی اپنے گھر پہنچا۔ گھر پہونچتے ہی اس نے سب کو بلا کر پوچھا "کیا تم میں سے کسی نے خیرات کی تھی یا کسی کو کوئی چیز دی تھی"؟ سب نے کہا۔ "جی نہیں آپ تو منع کر گیے تھے کہ کسی کو کوئی چیز نہ دینا" پھر سوداگر نے اپنی بیگم سے پوچھا "تم نے تو کوئی چیز کسی کو نہیں دی؟ کیا تم نے کوئی نیکی کی ہے"۔ بیگم نے کہا "جی نہیں آپ منع جو کر گیے تھے"۔ اتنے میں شریفہ بھی آئی۔ سوداگر نے اس سے بھی یہی سوال کیا۔ شریفہ نے ڈرتے ڈرتے کہا "جی ہاں میں نے کچھ خیرات کی تھی"۔ سوداگر نے غصے سے کہا "کیا دیا تھا تم نے"۔ شریفہ نے سہم کر جواب دیا "میں ایک سائل کو روزانہ دو روٹیاں نالی کے ذریعہ دیا کرتی تھی"۔ سوداگر نے کہا "میں تو آٹا تول کر دے گیا تھا پھر تم نے روٹیاں کیسے دیں"؟ شریفہ نے کہا "حضور آپ نے آٹا تول کر دیا تھا۔ آٹا گوندھ کر پیڑے بناتے وقت ہر پیڑے میں سے تھوڑا آٹا نکال لیا کرتی اور اس کی دو روٹیاں بنا کر نالی کے ذریعہ بھکاری کو دے دیا کرتی تھی۔ میں اپنے دل سے مجبور تھی حضور! معاف کر دیجیے۔ مجھ سے خطا ہو گئی"۔

یہ سن کر سوداگر کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ خوش ہو کر بولا "شاباش شریفہ! تم نے ہم سب مسافروں کی جان بچائی۔ اگر وہ روٹی جہاز کے سوراخ کا منہ بند نہ کرتی تو جہاز میں پانی بھر جاتا اور وہ ڈوب جاتا"۔

سوداگر نے خوش ہو کر شریفہ کو بہت سا انعام دیا بھوکوں کو پیٹ بھر کھانا کھلایا۔ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کی۔ آج بہت ہی اچھا سبق ملا۔ اور یہ بات اس کے دل میں جم گئی تھی کہ نیکی کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

مسلسل

میں نے یہ خیال اپنے دوستوں سے ظاہر کیا تو
سب نے اس کی تائید کی۔ لیکن سوال یہ تھا ڈیک پر بیٹھا کس
پر جائے۔ میں نے کہا اس کا انتظام میں کر دوں گا۔ سب کو تعجب
تھا کہ آخر بچھانے کو لاؤں گا کیا؟ میرے ساتھ پیلا بچھوڑا
ہے۔ یہ میں نے دہلی ہی سے ساتھ لے لیا تھا کہ شاید کہیں راستہ
میں ضرورت پڑے۔ بچھانے کے کام آئے گا۔ دہلی سے کلکتہ
کے سفر میں بھی اس نے خوب کام دیا تھا۔ اس وقت بھی۔ میں
یہ بچھوڑا لے آیا اور ہم سب لوگ کئی گھنٹوں تک اس پر لیٹے
ڈیک پر ہوا کھاتے رہے اور گپیں لگاتے رہے۔ اتنی دیر
تک ہم کبھی بھی رات میں نہیں جاگے۔

آج چاندنی رات بھی بہت اچھی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی
ہوا بھی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ موسم بہت خوش گوار تھا۔ یہ
ہی وجہ تھی کہ ہم اتنی رات گئے تک کیبن سے باہر گپیں
لگا رہے تھے۔ اتنے میں ایک صاحب کو جو پیشاب آیا تو ڈیک
پر ہی کھڑے ہو کر پیشاب فرمانے لگے۔ لیکن انھیں گئے ایک
منٹ بھی نہیں ہوا تھا کہ دوڑتے ہوئے وہ ہمارے پاس
آئے۔ فرمانے لگے۔ ارے بڑی بڑی مچھلیاں ہمارے
جہاز کے ساتھ دوڑ لگا رہی ہیں۔ پھر کیا تھا۔ ہم تو کئی دن سے
اسی کی تلاش میں تھے کہ کاش کوئی بڑی مچھلی کبھی تو نظر آئے۔

اس وقت جو ہماری تمنا پوری ہوتی ہوئی نظر آئی
تو ہم لوگ بہت خوش تھے۔ جتنی جلدی ہو سکتا تھا ہم ریلنگ
کے نزدیک پہنچے کیا دیکھتے ہیں کہ واقعی جہاز کے ساتھ ساتھ
کوئی سات آٹھ بڑی بڑی مچھلیاں تیزی سے تیر رہی ہیں۔
اور اب یہ جہاز کے اگلے منہ پر پہنچ کر جہاز کے آگے ہو گئی
تھیں۔ ہم بہت دیر تک یہ نظارہ دیکھتے رہے۔ کبھی جہاز
سے پیچھے رہ جاتی تھیں اور کبھی آگے بڑھ جاتی تھیں معلوم
ہوتا تھا دوڑ ہو رہی ہے۔ یہ مچھلیاں ۱۰ فٹ لمبی ہوں گی
اور قریب ایک من وزن ضرور ہو گا۔ ہم بہت دیر تک انھیں
دیکھتے رہے۔ چاندنی رات میں وہ بالکل صاف نظر آ رہی تھیں
کاش اس وقت ۱۲ بور بندوق ہوتی تو ایک
دو کو ضرور مارتا۔ لیکن پھر انھیں سمندر سے کیسے نکالا جاتا
مچھلیوں کو دیکھتے دیکھتے جب ہم تھک کر چور ہو گئے تو اپنی
جگہ پر لوٹ آئے۔ تھوڑی دیر تک ہم گپیں لگاتے رہے
بعد میں اپنے اپنے کیبن کی طرف چل دیے۔ اس وقت رات

سا ایک بجا ہوگا۔ نیند بھی آرہی تھی۔ بستر پر پڑتے ہی نیند آگئی۔ اور صبح دیر سے آنکھ کھلی کیونکہ رات کو دیر سے سوئے تھے۔

کل کی ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا۔ ہمیں صبح قریب ۱۰ بجے افریقہ کے ساحل کی زمین بھی نظر آئی تھی لیکن یہ کافی دور تھی۔ صرف پہاڑوں کا ہلکا سا خاکہ نظر آتا تھا۔ یہ زمین اری ٹیریا کی زمین تھی آج ۱۴ر جون ہے اور پیر کا دن ہم تمام دن ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ آج ہمیں سمندر میں جہاز آتے جاتے کم دکھائی دئے۔ معلوم نہیں کیا بات تھی۔ ہم نے کیپٹن سے دریافت کیا تو معلوم ہوا ہم سیدھے راستہ سے ہٹکر چل رہے ہیں۔ ہمارا رخ اب افریقہ کے ساحل کی طرف ہے کیونکہ اب ہم پورٹ سوڈان جانا چاہتے ہیں۔ اس لیے ہم نے اپنا راستہ بدل دیا ہے۔

یہ دن بھی اسی طرح گزر گیا۔ رات ہوتے ہی ہم پھر بڑی مچھلیوں کو دیکھنے جہاز کے اگلے سرے پر گئے تو پھر اسی قسم کی مچھلیاں جہاز کے ساتھ چل رہی تھیں۔ آج بہت دیر تک مچھلیوں کا نظارہ کرتے رہے۔ یہ مچھلیاں کبھی کبھی الٹ کر اُچھلتی بھی تھیں۔ ان کا پیچھے کا حصہ بالکل سفید ہوتا ہے۔ ان مچھلیوں کی شکل گو کچھ سے کچھ ملتی جلتی ہوتی ہے یہ مچھلی کھانے کے کام میں بہت کم آتی ہے۔ اس کا تیل نکالا جاتا ہے۔ آج رات کو بھی ہم پھر کل کی طرح چاندنی رات کا لطف اٹھاتے رہے۔ اور گپیں لگاتے رہے گرمی آج بھی کافی ہے۔ جب نیند آنے لگی تو اپنے اپنے کیبن کو لوٹ آئے اور سو گیے۔

صبح جب اٹھے تو زمین نظر آرہی تھی۔ لیکن ابھی کافی دور تھی۔ قریب ۸ میل دور ہوگی۔ سامنے پورٹ سوڈان کے بندرگاہ کے نشانات نظر آرہے تھے ہم لوگ جلدی نہا دھوکر فارغ ہونے کی کوشش کرنے لگے تاکہ پورٹ آنے سے پہلے تیار ہو جائیں اور پورٹ کا پورا معائنہ کر سکیں۔ جب تک ہم تیار ہوں۔ زمین بہت قریب آچکی تھی اور پورٹ بالکل صاف نظر آرہا تھا۔ اس وقت جہاز پر پائلٹ کا جھنڈا بھی لگا دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں پائلٹ کی موٹر کشتی آتی دکھائی دی۔ پائلٹ آیا اور ہمارے جہاز کو بندرگاہ کے اندر لے جانے کی کوشش کرنے لگا۔

بندرگاہ پورٹ سوڈان کوئی بڑا بندرگا نہیں ہے اور نہ قدرتی ہے۔ معمولی بندرگاہ ہے۔ لیکن پچھلی لڑائی میں جب افریقہ میں اٹلی والوں کے ساتھ اتحادیوں کی جنگ ہورہی تھی۔ اس وقت اس کی اہمیت بڑھ گئی تھی اور اسی وقت اس کی کافی ترقی ہوئی۔ اسی بندرگاہ سے لڑائی کا سارا سامان اتحادی فوجوں کو افریقہ بھیجا جاتا تھا۔

یہاں سے عربک گم اور مونگ پھلی دوسرے ملکوں کو بھیجی جاتی ہے۔ ہمارا جہاز بھی یہاں سے عربک گم لے گا جو امریکہ بھیجا جارہا ہے۔

تھوڑی دیر میں ہمارا جہاز بندرگاہ میں داخل ہوگا۔ ہم نے دیکھا کہ دو تین اور جہاز ڈیک سے لگے

کھڑے ہیں۔ ہمیں بھی خوشی ہوئی کہ کلکتہ کے بعد آج پہلی مرتبہ ہمارا جہاز ڈیگ پر لگے گا۔ اور بغیر کسی کشتی کی مدد کے ہم لوگ، زمین پر جا سکیں گے۔ پروگرام تو پہلے ہی بنا لیا گیا تھا سب سے پہلے ڈاک خانے جائیں گے، وہاں خط لکھیں گے اور ڈاک میں ڈالیں گے بعد میں شہر جائیں گے اور سنیما دیکھنے کی کوشش کریں گے۔ اگر سوڈان کی بنی ہوئی کوئی چیز ملے گی تو ضرور خریدیں گے۔

ہم لوگوں نے جلدی سے ناشتہ کیا اور چلنے کو تیار ہو گئے۔ ڈاک خانہ جہاز سے نظر آ رہا تھا۔ اس لیے ہمیں بہت خوشی تھی۔ ہم فوراً ڈاک خانہ میں جا داخل ہوئے اور معلومات حاصل کرنے لگے، ڈاک خانہ میں کالے کالے آدمی بیٹھے تھے اور عربی بولتے تھے۔ جو خاک بھی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ بڑی مشکل سے سمجھ پائے کہ سوڈان میں پوسٹ کارڈ نہیں ہوتے عجیب ملک ہے لکھو تو لفافہ اور نہ لکھو تو لفافہ ان سے کہا اچھا لفافہ ہی دے دو مگر جب ہندوستانی نوٹ نکالے تو انکار کر دیا۔ یہ نہیں چلتے امریکن ڈالر نکالے تو انھیں بھی لینے سے انکار کر دیا۔ انگریزی شلنگ نکالے تو معلوم ہوا یہ بھی نہیں چلتے اب تو بڑی پریشانی ہوئی۔ دریافت کیا یہاں کوئی سکے بدلنے والا بھی ہے تو جواب ندارد۔

ہم ڈاک خانے سے نکل آئے اور سکے بدلنے والے کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومنے لگے لیکن ہم اپنی بات کسی کو سمجھا سکتے تھے۔ اور نہ ہمیں وہ اپنی بات سمجھا سکتے تھے۔ ہندوستان چھوڑنے کے بعد پہلی مرتبہ ہمیں زبان کی تکلیف محسوس ہوئی۔ ہم اِدھر اُدھر گھوم ہی رہے تھے کہ ہمیں ایک انگریز دکھائی دیا۔ ہم فوراً اس کی طرف لپکے اس امید میں کہ وہ ہماری کچھ مدد کرے گا۔ لیکن بجائے انگریز کے وہ یونانی نکلا۔ لیکن خیر وہ انگریزی سمجھتا تھا۔ ہم نے جب اپنی دشواری کا حال اس سے بیان کیا تو اسے ہم سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ لیکن وہ بھی ہمیں یہ نہیں بتا سکا کہ سکے بدلنے والا ہمیں کہاں ملے گا۔ صرف سکے کی تبدیلی اور زبان کے مسئلہ نے ہمارے ذہن پر اتنا خراب اثر پیدا کیا کہ ہم شہر کی سیر کا خیال تو کیا سنیما جانا بھی بھول گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد اس یونانی نے کہا کہ مرے پاس سڈانی سکے ہیں لیکن بہت کم میں آپ کو امریکن ڈالر کے بجائے دے سکتا ہوں۔ اس سے اچھی بات ہمارے لیے اور کیا ہو سکتی تھی۔ ہم نے اس کا شکریہ ادا کیا اور ایک ڈالر اسے دیا اس کے بجائے اس نے ایک بہت بڑا سفید سکّہ ڈھبو ہمیں دیا اور کہا کہ یہ اس ڈالر کے برابر ہے۔ سکّہ لیتے ہی ہم ڈاک خانہ میں پہنچے اور ایر لیٹر خریدنے لگے اس سکہ میں ہمیں (۸) عدد ایر لیٹر ملے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر ہندوستان میں یہی ایر لیٹر خریدتے تو ہمیں ۴۸ آنے دینے ہوتے تو کم سے اس سکّہ کی قیمت ۴۸ آنے تو ہے ہی اس میں کوئی شک کرنے کی گنجائش نہیں۔ لیکن ایک امریکن ڈالر کی قیمت ہندوستان میں ۔ ۳/۶ ہوتی ہے یعنی ہمیں چھ آنے کا نقصان رہا۔ لیکن ہمیں اس وقت ۶ر آنے کے نقصان کی بالکل فکر نہ تھی۔ ہمیں تو یہ خوشی تھی کہ ہم تھیں

اور دوسرے لوگوں کو یہاں سے خط بھیج رہے ہیں۔ ایرلیٹر لے کر ہم جہاز پر لوٹ آئے اور انھیں لکھنے لگے میں نے اپنے لیے ۳ ایرلیٹر خریدے تھے میں لکھنا چاہتا تھا پوسٹ کارڈ اور ملے ایرلیٹر اس لیے موڈ ذرا خراب ہوگیا تھا۔ جب لکھ چکا تو فوراً ڈاک میں ڈال آیا۔

اس وقت تک کا شہر کا اور سنیما دونوں دماغ سے ہٹ گئے تھے۔ جب صرف ٹکٹ وغیرہ خریدنے میں اتنی دشواری ہوئی تو اور زیادہ دشواریاں کون مول لیتا۔ باقی وقت ہم پورٹ پر ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ایک اور جہاز ہماری بغل میں آکر کھڑا ہو گیا یہ بھی CITY LINE کا جہاز تھا۔ CITY LINE جہاز کی ایک کمپنی ہے اور اس کے ہر جہاز کا نام دنیا کے کسی نہ کسی شہر کے نام پر رکھا گیا ہے ہمارے جہاز کا نام سٹی آف دلّی ہے۔ ہمارے پاس جو جہاز آکر کھڑا ہوا ہے۔ اس کا نام سٹی آف لندن یہ بھی مال ڈھونے والا جہاز ہے لیکن ہمارے جہاز سے ذرا بڑا ہے اور خوبصورت بھی زیادہ ہے۔ اس میں بارہ سواریوں کی جگہ ہے۔ ہمارے جہاز میں صرف ۶ سواریوں کا انتظام ہے۔

ہم لوگ اس جہاز کو دیکھنے گئے۔ یہ جہاز ہمارے جہاز سے کئی گنا اچھا ہے۔ فرنیچر۔ پالش۔ صفائی۔ کمرہ کی چھت سب ہی چیزیں اچھی ہیں۔ اس کا کرایہ بھی زیادہ ہے یہ یہاں سے افریقہ جارہا ہے لندن سے آیا ہے۔

شام تک ہم ادھر اُدھر گھومتے رہے۔ اور مختلف چیزیں دیکھتے رہے۔ بندرگاہ سے ذرہ دور ہٹ کر پانی

بہت کم گہرا ہے وہاں بھی ہم گئے، وہاں ہم نے عجیب عجیب قسم کی مچھلیاں دیکھیں۔ ان کے رنگ عجیب عجیب تھے کوئی لال تو کوئی نیلی کوئی پیلی تو کوئی ہری دیکھنے میں بہت اچھی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن بڑی نہ تھیں۔ سب سے بڑی مچھلی کوئی ۱۱ انچ کے قریب ہوگی۔ لیکن رنگ ان کے بہت ہی خوبصورت تھے جی چاہتا تھا کچھ پکڑ کر ساتھ لے لوں پانی کے اندر ہمیں کورل بھی نظر آرہے تھے۔ جو عجیب عجیب رنگ لیے ہوئے تھے۔ پانی گہرا نہ تھا۔ اس لیے جی چاہتا تھا نیچے اتر کر کچھ کورل ہی لے لیے جائیں لیکن پانی میں اترے کون۔ سب بابو لوگ تھے کون اترے اور نکالے۔ تعریف سب کر رہے تھے لیکن اترتا کوئی نظر نہیں آتا تھا۔

ہمارے پاس ایک چھوٹا لڑکا بھی کھڑا تھا۔ وہ ہماری گفتگو سن رہا تھا۔ وہ ہمارا مطلب سمجھ گیا فوراً پانی میں کود کر ایک کورل نکال لایا۔ جو سب سے نزدیک تھا۔ اور ہمیں دے دیا۔ بعد میں اس نے ایک اور نکالا۔ لیکن یہ پہلے والے سے چھوٹا تھا۔ اچھے اچھے کورل ذرہ دور تھے وہ بچہ نہیں نکال سکتا تھا۔ ہم میں سے ایک نے اسے ۲ آنہ نکال کر دیئے۔ پتہ نہیں وہ انھیں کیا کرے گا۔ وہ تو اس ملک میں چلتے ہی نہیں ہیں۔ کورل سیپ کی قسم کا ہوتا ہے۔ سخت لیکن جہاں سیپ ہموار اور چکنی ہوتی ہے کورل ناہموار اور کھُردرا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی پیڑ ہو۔ لیکن چیز خوبصورت ہوتی ہے۔ یہ اتنے زیادہ خوبصورت نہ تھے۔

بچّوں کی کوششیں

کوّا اور مینا:-

یہ بہت دنوں کی بات ہے۔ایک تالاب کے کنارے ببول کا ایک بہت پُرانا پیڑ تھا۔اس پیڑ پر ایک کوا اور ایک مینا رہتے تھے۔کوے کا گھونسلا پیڑ کی چوٹی پر تھا مینا کا گھونسلا بیچ ڈال پر تھا۔
مینا تھوڑے سے میں بھی گذر بسر کر لیتی تھی لیکن کوّے کو اچھے سے اچھا چاہیے تھا اس لیے وہ دن بھر کھانا ہی ڈھونڈتا پھرتا تھا۔ جتنا کھانا کوّا کھاتا تھا۔اتنی ہی اس کی کھانے کی ہوس بڑھتی تھی۔ایک دن پانی برس رہا تھا۔مینا آرام سے گھونسلے میں بیٹھی گا نا گا رہی تھی۔اتنے میں کوّا کیڑے مکوڑے کھاتا ہوا پیڑ کے نیچے آبیٹھا اور مینا سے بولا تمھارا گھونسلا تو بہت خوب صورت ہے مجھے بھی کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ میں بھی اپنا گھونسلا تمھاری طرح خوب صورت بنا لوں۔"

مینا نے کوے کو جواب دیا کہ اگر تم میری طرح اپنا گھونسلا بنانا چاہتے ہو تو میری طرح تھوڑے سے کھانے میں گذر کر لیا کرو مگر تم بہت لالچی ہو۔کوّے کو مینا کا جواب بہت بُرا لگا غصے میں آکر مینا کا خوبصورت گھونسلا توڑ پھوڑ دیا۔ مینا نے کوے سے کچھ نہیں کہا اور اپنا گھونسلا کسی دوسرے درخت پر بنا لیا اور آرام سے رہنے لگی۔

پر خدا کو تو کوے کی یہ بات بہت بری لگی اور اس نے کوّے کو اس غلطی کی سزا بھی دی۔ہوا یہ کہ آدھی رات کو جب کوّا اپنے گھونسلے میں سو رہا تھا۔بڑے زور کی بارش ہوئی بڑے بڑے اولے گرے اور کوے کا گھونسلا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور خود اس پر بھی پٹاپٹ اتنے اولے پڑے کہ دوسری دنیا کو سدھار گیا۔

ہاتھی اور مگرمچھ

گنگا ندی میں ایک بہت خوفناک مگرمچھ رہتا تھا۔وہ ہمیشہ ندی میں پانی پینے والے جانوروں پر بے خبری میں حملہ کیا کرتا تھا۔اس نے بہت سے جانوروں کو مار ڈالا تھا۔

ایک دن ہاتھی ندی میں پانی پینے گیا۔مگرمچھ نے ہاتھی کی سونڈ پکڑ لی۔ہاتھی نے بہت کوشش کی، پر مگرمچھ نے سونڈ نہ چھوڑی۔آخر میں ہاتھی کو غصہ آگیا وہ مگرمچھ کو ریت پر گھسیٹ لایا۔

مگرمچھ سونڈ چھوڑ کر بھاگنے لگا۔ہاتھی نے اس کا پیچھا کیا اور پکڑ لیا۔مگرمچھ نے بہت خوشامد کی۔بولا "بڑے بھائی مجھے چھوڑ دیجیے۔آج مجھے آپ کی طاقت کا اندازہ ہو گیا میں نہیں جانتا تھا کہ آپ میں اتنی طاقت ہے آج سے میں آپ پر یا آپ کی برادری پر حملہ نہیں کروں گا۔"

ہاتھی نے کہا تیری بے وقوفی تھی جو تو نے مجھ پر حملہ کیا۔دشمن کی طاقت کا اندازہ کیے بنا اس پر وار نہ کرنا چاہیئے اب میں تجھ سے ضرور بدلہ لوں گا۔یہ کہہ کر ہاتھی نے مگرمچھ کو مار ڈالا

سید احمد شاہ جہان پور

پانی سے نقش و نگار:-

آپ تھوڑی بہت ڈرائنگ تو ضرور جانتے ہوں گے۔ ڈرائنگ میں واٹر کلر یا پنسل کلر یا یا آئل کلر کی ضرورت ہوتی ہے۔ آج میں آپ کو ایسی ڈرائنگ بنانے کی ترکیب بتاتا ہوں کہ اپنے دوستوں کو سادے کاغذ پر رنگین تصویر بنا کر حیرت میں ڈال دیں گے۔ مگر اس کے لیے کاغذ پہلے سے تیار کرنا ہوگا۔

ایک سفید اور مضبوط کاغذ لیجیے اس پر ہلکی پنسل سے توتا بنائیے یا کوئی بھی شکل جو ہلکی پنسل سے کاغذ پر بنا سکتے ہو بنائیے۔ جب شکل بن جائے تو پنسل کی لکیروں کو ربر سے بالکل ہلکا کر دیجیے ایسا کہ لکیریں آپ کو بھی غور سے دیکھنے پر نظر آئیں۔ پھر سوکھے فیرک المونیم سلفیٹ اور سوکھے ٹینک ایسڈ کو برابر مقدار میں پیس لیجیے۔ اگر آپ نے توتے کی شکل بنائی ہے تو اس پوڈر کو بہت احتیاط سے پاؤں اور پنجوں پر رگڑ دیجیے ایسا نہ ہو کہ کاغذ پھٹ جائے یا پاوڈر لائن سے باہر نکل جائے۔ اسی سے توتے کی گردن پر لکیر کھینچ دیجیے۔

پھر اسی طرح فیرک المونیم سلفیٹ اور سوڈیم سلفیٹ برابر مقدار میں پیس لیجیے۔ اس کو توتے کی چونچ اور دم پر رگڑ دیجیے۔ پھر سوڈیم فیرو سائنائیڈ اور فیرک سائنائیڈ کو برابر برابر ملا کر پیس کر تیار کر لیجیے اس کو توتے کے باقی حصوں پر رگڑ دیجیے۔ اب آپ کی پوشیدہ تصویر تیار ہوگئی۔

اب اپنے ساتھیوں کو اکٹھا کیجیے۔ اور کہیے کہ ہم کو سادہ کاغذ پر پانی سے تصویر بنا کر دکھا سکتے ہو۔ پھر اپنے کاغذ کو نکالیے۔ یہ کاغذ دور سے دیکھنے پر سادہ نظر آئے گا۔ پھر اسے میز پر رکھیے۔ اور اپنے ساتھیوں میں سے کسی ایک سے گلاس میں نل سے پانی لانے کو کہیے جس سے انھیں یقین ہو جائے آپ پانی کا ہی استعمال کر رہے ہیں۔ پھر معمولی واٹر کلر کا برش لے کر پانی کو کاغذ پر سنبھال کر پھیریے۔ اتنا دھیان رہے کہ کاغذ بہت گیلا ہو کر پھٹ نہ جائے۔ کیوں کہ پاوڈر رگڑنے سے کاغذ کم زور ہو جائے گا۔ اس لیے دو باتوں کا دھیان رکھیے۔ (پہلی) بات کہ پاوڈر مہین پیسا جائے۔ دوسری بات پانی کی زیادتی کاغذ کو گلا نہ دے۔ اس کے لیے کاغذ موٹا اور مضبوط لیجیے۔

دیکھیے آپ کے دوست اور آپ خود حیرت میں رہ جائیں گے کہ پانی پھیرتے ہی رنگین توتا تیار ہو گیا۔ توتے کے پر ہرے، چونچ لال اور پنجے کتھئی ہو جائیں گے۔ اس کھیل کا کمال آپ کی ہوشیاری پر منحصر ہے۔ یہ سب ہی چیزیں آپ کو سائنس کا سامان بیچنے والے کے یہاں مل جائیں گی زیادہ مہنگی بھی نہیں ملیں گی۔ ایک بار تصویر بنانے کے لیے ہر ایک چیز پانچ پانچ گرام کافی ہوگی۔ یاد رکھیے ان سبھی چیزوں کو سوکھا ا ل کرنا ہے

(ترجمہ)

حسن نظامی جمشید پور

گانے والی چڑیا:-

اب سے بہت دنوں پہلے ہندوستان میں ایک بہت بڑا راجا تھا۔ وہ چڑیاں پالنے کا بہت شوقین تھا۔ اس نے اپنی راجدھانی میں ایک چڑیا گھر بنایا تھا۔ جس میں سینکڑوں قسم کی چڑیاں تھیں لوگ دور دور سے چڑیا گھر دیکھنے آتے اور راجا کی تعریف کرتے تھے۔

ایک بار راجہ کو معلوم ہوا کہ راجدھانی میں ایک ایسی چڑیا آئی ہوئی ہے۔ جو گاتی ہے تو انسان بے خود ہو جاتا ہے اس کے گانے میں اتنا درد اتنا سوز ہے کہ انسان اس کی تاب نہ لا کر رو پڑتا ہے۔

راجہ کو بڑا تعجب ہوا اور اس نے ایک چڑیمار کو حکم دیا کہ وہ اس چڑیا کو پکڑ لائے۔ چڑیمار اسی وقت حکم کی تعمیل کو نکل پڑا۔

ابھی کچھ ہی دور گیا ہوگا کہ ایک درخت پر ایک چڑیا میٹھے میٹھے سُروں میں گیت گا رہی تھی۔ صیاد پل بھر گیت سننے کو رُکا اور نہ جانے کب تک رُکا رہا۔ یہاں تک کہ شام ہوگئی چڑیا نے گیت گانا بند کر دیا۔ کیونکہ سورج اب ڈھل چکا تھا اور افق کی لالی بھی مٹنے والی تھی۔

چڑیمار سمجھ گیا کہ یقیناً یہ وہی چڑیا ہے جس کے لیے وہ بھیجا گیا تھا۔ اور اسے کسی طرح پکڑ کر راجا کی حضور میں لایا چڑیا نے راجہ کو دیکھتے ہی چڑیمار کے ظلم کی شکایت کی اور نہ جانے کب تک چڑیا گاتی رہی یعنی شکایت کرتی رہی اور راجہ سنتا رہا جب چڑیا نے گانا بند کر دیا تو راجہ نے حکم دیا کہ اسے سونے کے پنجرے میں بند کر کے چڑیا خانے میں رکھو اور اس کا نام گانے والی چڑیا ہی رہے گا۔

کچھ دنوں میں اس چڑیا کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ چڑیا خانے میں دیکھنے اور سننے والوں کا ایک ہجوم رہتا یہ بات راج کمار کو معلوم ہوئی وہ چڑیوں کا شوقین نہیں تھا لیکن تعریف سُن کر دیکھے بنا نہیں رہا گیا راج کمار نے جب گانا سُنا تو چڑیا بہت پسند آئی وہ اسے راج محل میں لے گیا۔ اور وہ خود اس کی دیکھ بھال کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اسے چُرا نہ لے جائے۔ راجکمار کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کی بیوی نے چڑیا کی طرف راجکمار کو متوجہ دیکھا تو راج کمار کے پیچھے طرح طرح سے چڑیا کو ستانا شروع کر دیا۔

ایک روز راجکمار چڑیا کو نہلا رہا تھا کہ اتفاق سے اس کا ہاتھ چڑیا کے سر پر گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ چڑیا کے سر میں کانٹا چبھا ہوا ہے۔ اس نے جھٹکے کے ساتھ اسے نکال دیا اور ایک لمحہ میں وہ چڑیا ایک خوبصورت لڑکی بن گئی۔ راجکمار نے اس سے پوچھا تم کون ہو؟

"گھبرائیے نہیں میں آپ کی اصلی بیوی ہوں۔ میں سب باتیں آپ کو ابھی بتاتی ہوں" اس خوب صورت لڑکی نے جواب دیا۔

"کیا مطلب ....؟" راجکمار نے پوچھا۔

اس لڑکی نے جواب دیا "مطلب یہ کہ میں سات سمندر پار کے بادشاہ کی بیٹی ہوں۔ میری ماں میرے بچپن ہی میں مر گئیں میرے باپ نے دوسری شادی کر لی۔ میری ایک سوتیلی بہن ہوئی۔ میرا نام گل ہے اور میری سوتیلی بہن کا نام صنوبر ہے میری شادی آپ سے طے ہوگئی۔ لیکن میری سوتیلی ماں یہ نہیں چاہتی تھی کہ میں کسی بادشاہ کے ہاں بیاہی جاؤں۔ چنانچہ رخصتی کی رات صنوبر دلہن بنی اور مجھ میں کانٹا ٹھوک کر چڑیا بنا دی گئی۔ اور اس شکل میں ڈالی ڈالی بیٹھ کر اپنا دکھ درد سناتی رہی لوگ میرے دکھ کو نہیں سمجھتے تھے اور مجھے گانے والی چڑیا کے نام سے پکارا کرتے تھے۔ ہاں ایک بات اور کہنے والی ہوں دیکھیے صنوبر نے مجھے آپ کے پیچھے تکلیفیں بھی پہنچائی ہیں۔ راجکمار نے دیکھا سچ مچ چوٹ لگی تھی۔ داغ تک موجود تھا۔ راجکمار کو غصہ آیا اور اس نے صنوبر کو قتل کروا کر اس کا سر اپنی سسرال بھجوا دیا اور گل سے شادی کر لی۔

محمد شکیل اختر۔ مظفر پور

عجیب وغریب جزیرہ :-

کسی ملک میں ایک نیک
بادشاہ رہتا تھا۔ اس کا ایک شہزادہ تھا۔ جو بہت بہادر تھا ایک
دن شہزادے نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک جزیرے میں گھوم
رہا ہے۔ جہاں ہر طرف سناٹا چھایا ہوا ہے۔ دور دور تک آبادی
کا نام نہیں جس راستہ پر وہ چل رہا تھا اس کے دونوں کناروں
پر اونچے درخت اُگے ہوئے تھے۔ جن پر پھل لگے ہوئے
تھے۔ اس جزیرے کی آب وہوا شہزادے کو بہت بھلی لگی جب
شہزادہ جزیرے میں سیر کرتا ہوا آگے بڑھا اس نے کہیں کہیں
آدمیوں کو سوتے دیکھا۔ شہزادہ ان کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ وہ
سب کے سب جنگلی آدمی تھے۔ جو بے خبر سو رہے تھے شہزادے
کو تعجب ہوا کہ اس کے پہنچ جانے کے باوجود کوئی بھی نہیں جاگا
شہزادے نے بھی ان کو جگانا مناسب نہ سمجھا۔ کیونکہ اسے
ڈر تھا کہ کہیں یہ لوگ اسے نقصان نہ پہنچائیں۔ اس خیال
کے آتے ہی وہ آگے بڑھ گیا۔ آگے جا کر اس نے دیکھا
ایک لکڑی کا بہت بڑا محل کھڑا ہے۔ شہزادے نے
سوچا کہ سارے ملک میں صرف ایک محل اور وہ بھی لکڑی
کا بنا ہوا۔ اس میں رہنے والا ضرور اس جزیرے کا مالک
ہوگا۔ چل کر اس جزیرے کے متعلق معلومات حاصل کرنا
چاہییں یہ سب سوچ کر شہزادہ محل کی طرف بڑھا۔ جب
اس نے دروازے میں قدم رکھا تو اندر اسے فرش زمین
پر ایک بہت موٹا جنگلی آدمی لیٹا نظر آیا جو بڑے اطمینان
سے سو رہا تھا۔ شہزادہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا محل میں ایک
کمرے سے دوسرے کمرے میں گھومنے لگا۔ اتنے بڑے
محل میں اسے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ جب وہ ایک بڑے سجے
ہوئے کمرے میں پہنچا تو یہ دیکھ کر اس کو اور بھی تعجب ہوا کہ
ایک لڑکی پلنگ پر سو رہی ہے اور اس کے سنہرے بال بکھرے
ہوئے ہیں۔ شہزادہ اسے جگا کر پوچھنا ہی چاہتا تھا کہ تم
کون ہو اور اس جزیرے میں اکیلی کیوں رہتی ہو اور تمہارے
سب آدمی سو کیوں رہے ہیں۔ ابھی یہ شہزادہ سوچ ہی رہا تھا
کہ یکایک وزیر نے اسے جگا دیا۔ شہزادہ نیند سے چونک
پڑا اور وزیر اعظم سے کہنے لگا۔ آپ نے یہ کیا کیا۔ میں اس
وقت خواب میں ایک بہت ہی خوب صورت جزیرے کی سیر
کر رہا تھا اور شہزادی کو جگانا ہی چاہتا تھا کہ آپ نے
مجھے جگا دیا۔

کچھ دن بعد شہزادے کو اس جزیرے کی کھوج
کی فکر ہوئی اور اس نے اپنے سارے سپاہی ملک بھر میں
بھیج دیے کہ اس جزیرے کو تلاش کریں۔ وزیر نے بہت
سمجھایا کہ اے اچھے شہزادے یہ تو خواب تھا۔ خواب میں
تو انسان بڑی اچھی اچھی چیزیں دیکھتا ہے۔ لیکن اسے
پا نہیں سکتا۔ شہزادے نے کہا۔ آپ نہیں جانتے ہم اس
جزیرے کا ضرور کھوج لگائیں گے اور پھر بتائیں گے کہ
خواب کی باتیں سچی بھی ہوتی ہیں۔

کچھ دن بعد بوڑھے بادشاہ نے تخت و تاج
شہزادے کے حوالے کیا اور خود یادِ الٰہی میں مشغول ہوگیا۔
تخت پر بیٹھتے ہی شہزادے نے حکومت کے چند بہادر
آدمیوں کو بلا کر اس جزیرے کی کھوج کے لیے کہا۔
اتفاق سے ایک دن وزیر اعظم اور اس کے چند آدمی ایک
جزیرے میں پہنچ گئے اور وہاں کا حال دیکھ کر انھوں نے
اندازہ لگایا کہ یہ ہی وہ جزیرہ ہے جس کو بادشاہ نے

خواب میں دیکھا تھا کیونکہ وہاں کا نقشہ بالکل ویسا ہی تھا۔ جیسا بادشاہ نے خواب میں دیکھا تھا۔ ابھی وہ واپس جانے کی سوچ ہی رہا تھا کہ چند جنگلی آدمیوں نے انھیں گھیر لیا اور کچھ پھل پیش کرکے کہا کہ یہ ہماری ملکہ نے آپ لوگوں کی خدمت میں بھیجے ہیں۔ وزیر بہت خوش ہوا اس کے ساتھیوں نے خوب پھل کھائے صرف ایک آدمی ایسا تھا جس نے پھل نہیں کھائے کچھ دیر بعد جن لوگوں نے پھل کھائے تھے انھوں نے اچھلنا کودنا شروع کر دیا۔ اور اس جزیرے سے واپس جانے سے انکار کر دیا۔ آخر کار وہ آدمی جس نے پھل نہیں کھایا تھا لوٹ آیا اور اس نے لوٹ کر ساری کہانی بادشاہ کو سنائی۔ بادشاہ فوراً کچھ آدمیوں کو لے کر اس جزیرے میں پہنچا۔ ان لوگوں کو بھی پھل پیش کیے گئے۔ لیکن ان لوگوں نے انکار کر دیا۔ یہ لوگ سیدھے اس کمرے میں آئے جہاں شہزادی لیٹی ہوئی تھی۔ شہزادے نے اس کو جگایا اس کے جاگتے ہی سارا جزیرہ آباد ہو گیا۔ جب شہزادے نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ کچھ دن پہلے ایک دیو نے ہم پر کچھ پڑھ کر پھونک دیا تھا تب سے آج تک ہم سو رہے ہیں۔ ہر وقت ہم کو نیند آتی رہتی ہے اس کے بعد وہ سب لوگ ہنسی خوشی زندگی گزارنے لگے۔

محمد سلیم الہ آبادی (ثانوی سوم)

لالچی آدمی :- ایک آدمی بہت لالچی تھا۔ جو کچھ کماتا تھا۔ سب کا سب جمع کرتا تھا۔ وہ ہر وقت زیادہ سے زیادہ بچانے کی فکر میں رہتا تھا۔ یہاں تک ایک دو دن کھانا بھی نہیں کھاتا تھا دو پیسے کی دال میں وہ خود اپنا اور اپنی بیوی کا پورا کرتا تھا۔ مگر اس کی بیوی کو اپنے لالچی شوہر کی یہ سب باتیں بالکل پسند نہیں تھیں وہ جب بھی کما کر لاتا تھا۔ اس کو اٹھا کر رکھ دیتا تھا۔ اس کی بیوی اس سے پوچھتی تھی اتنا روپیہ جو اکٹھا ہو رہا ہے آخر کس کے لیے ہو رہا ہے۔ وہ اپنی دیہاتی بیوی کو سمجھا دیتا تھا کہ یہ سب مال ہم فرفر کے لیے اکٹھا کر رہے ہیں۔ لالچی اپنی زبان میں روپیہ اکٹھا کرنے کو کہتا تھا لالچی کی بیوی سمجھتی تھی کہ فرفر کوئی ہمارا رشتہ دار ہوگا۔ لالچی کی سیدھی سادی بیوی لالچی کی باتوں میں آجاتی تھی۔ ایک دن لالچی کہیں سے کچھ روپیہ لایا اور اپنی بیوی سے کہا۔ یہ روپیہ فرفر کے لیے اٹھا کر رکھ دو۔ اتفاق سے یہ سب باتیں گلی سے گذرتے ہوئے ایک آدمی نے سن لیں کچھ دیر بعد لالچی گھر سے کسی کام کے لیے باہر آیا اس آدمی نے دیکھا کہ لالچی گھر سے کافی دور نکل گیا تو وہ چپکے سے لالچی کے گھر گیا اور لالچی کی بیوی سے بولا۔ میں فرفر ہوں تمھارے شوہر نے مجھے بھیجا ہے۔ جتنا روپیہ تمھارے شوہر اکٹھا کر رہے ہیں وہ سب میرے لیے کر رہے ہیں۔ لالچی کی بیوی نے سوچا میرے شوہر بھی یہی کہتے تھے کہ ہم یہ روپیہ فرفر کے لیے اکٹھا کر رہے ہیں۔ اور یہ آدمی اپنے آپ کو فرفر بتاتا ہے۔ اس نے سارا روپیہ لاکر اس آدمی کو دے دیا۔ اور جب اس کا شوہر گھر آیا تو اس نے ساری بات اپنے شوہر کو بتا دی۔

ظفر علی ہلدوانی

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجیے۔

منیجر..

جناب م۔ ی کھتری

مہاراشٹر کی تعلیمی و ادبی سرگرمیاں

ناگپاڑہ میونسپل اردو سیکنڈری اسکول بمبئی کا سالانہ جشن

۱۴ر مارچ ۶۶ء بروز منگل صبح ساڑھے آٹھ بجے اسکول کا سالانہ جشن منایا گیا۔ جلسے کی صدارت جناب پروفیسر نظام الدین گوریکر صاحب نے فرمائی۔

مہمانِ خصوصی شری پٹوردھن صاحب سپرنٹنڈنٹ میونسپل اردو اسکول جناب فاروقی صاحب۔ محترمہ آمنہ خاتون صاحبہ، شمیم احمد صاحب، بیٹ آفیسران میونسپل اردو مدارس۔ جناب بداس صاحب، ہیڈ ماسٹر اکھوویہ نگر میونسپل سیکنڈری اسکول۔ مسز اے صدیقی، ہیڈ مسٹریس ڈونگری اسکول۔ جناب قیوم صاحب، ہیڈ ماسٹر آر۔ سی ماہم ٹریننگ اسکول نے شرکت فرمائی۔

جج کے فرائض جناب محی صاحب، محترمہ رحیمہ چنائے، بیٹ آفیسر اور جناب ایوب صاحب ہیڈ ماسٹر نے انجام دئے۔

تقریری مقابلے میں حفیظہ شیخ (جماعت نہم الف) اول آئیں۔ حمیدہ محمود (جماعت نہم الف) دوم آئیں اور نجم الدین سیف الدین (ہشتم ی) سوم آئے۔

نظم خوانی میں خیر النسا، (ہشتم الف) کو پہلا انعام ملا۔ دوسرا انعام طاہرہ عبد الغفور (نہم الف) کو ملا اور تیسرا انعام رشیدہ بی دادامیاں (نہم الف) کو ملا۔ بہترین طالب علم کا اعزاز عبد الشکور (جماعت ہشتم) کو ملا۔ اور طالبات میں زبیدہ مخدوم کو بہترین طالبہ قرار دیا گیا۔

اسکول چمپین شپ غلام رسول (ہشتم ی) نے حاصل کی

اپنی تقریر میں شری پٹو۔۔ھن نے اسکول اسٹاف کی خوش انتظامی کو سراہا۔

جناب صدر پروفیسر گوریکر صاحب نے طلباء اور طالبات کو انعام تقسیم کیے۔

اسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر جناب صلاح الدین صدیقی صاحب نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یہ امید ظاہر کی کہ اسکول کی بقا و ترقی میں معزز مہمانوں کا تعاون اور ان کے مشورے ہمیشہ ملتے رہے گے۔

آل انڈیا اسکول ٹیم کی لندن جانے کی تیاری

آل انڈیا اسکول ٹیم ۱۶ر جولائی دہلی سے لندن روانہ ہوگی۔ اس ٹیم کے انتخاب کے لیے مدراس، کلکتہ، میسور، دہلی اور بمبئی کے کھلاڑیوں کو پریکٹس (مشق) کے لیے ۱۴ر اپریل کو بریبورن اسٹیڈیم (بمبئی) بلایا گیا ہے۔ یہ پریکٹس ۲۴ر اپریل تک ہوگی۔ اور ان میں سے ۱۶ر کھلاڑی

چنے جائیں گے۔ پہلی جولائی کو سولہ کھلاڑیوں کی یہ ٹیم دہلی روانہ ہوگی۔ دہلی میں یکم جولائی سے ۱۵ر جولائی تک ان ۱۶ کھلاڑیوں کی پریکٹس روزانہ ہوگی۔ اس کے بعد ۱۶ر جولائی کو آل انڈیا کرکٹ کیمپ کی یہ ٹیم دہلی سے لندن روانہ ہوگی۔ تمام میچ ختم ہونے کے بعد یہ ۱۳ر اگست کو واپس لوٹے گی۔

آل انڈیا اسکول ٹیم کے مینیجر جناب ادھیکاری صاحب ۱۶ر کھلاڑیوں کے نام کا اعلان ۲۹ر جون کو کریں گے۔

بمبئی سے ۶ کھلاڑیوں کو آل انڈیا اسکول بورڈ نے پریکٹس کے لیے بریبورن اسٹیڈیم پر بلایا ہے۔ ان میں سے تین کھلاڑی انجمن اسلام ہائی اسکول (بمبئی) سے لیے گئے ہیں۔

ان ۶ کھلاڑیوں کے نام یہ ہیں (۱) بشیر الدین (۲) انور قریشی (۳) منظور علی (۴) اجیت نائیک (۵) جی۔ این۔ بھونا (۶) دی کامیرکر

بھساول میں اُردو مدرسوں کے سالانہ تہذیبی پروگرام کا مقابلہ:۔

۲۱ مارچ کو صبح دس بجے یہاں کے اُردو اسکولوں کے تہذیبی پروگراموں کا انعامی مقابلہ ہوا۔ جناب داؤد خاں صاحب اس کے صدر تھے۔ ہر اسکول کی ساتویں جماعت کے سات سات لڑکوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا۔ ججوں کے متفقہ فیصلے کے مطابق پہلا انعام اُردو گرلس اسکول کو ملا۔ دوسرا انعام اُردو اسکول ۲ کو تیسرا انعام اردو اسکول ایک جماعت ہفتم ب کو ملا۔ چوتھا انعام اسی اسکول ہفتم الف پانچواں انعام اردو اسکول آگ والا چال کو چھٹا انعام اردو اسکول استادہ کو ملا۔ ایجوکیشن آفیسر جناب یو۔ ام۔ وائی شیخ نے اس مقابلے میں بہت دلچسپی لی۔ اصل میں انعامی مقابلے کی یہ تجویز انھی کی تھی۔

تھانہ میں اسکولوں میں تقریر اور غزل خوانی کے مقابلے:۔

انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول تھانہ کے پرانے طالب علموں نے انجمن طلبائے قدیم یا اولڈ اسٹوڈنٹس ایسوسی ایشن قائم کی ہے اس کے افتتاح کے موقع پر تھانہ کے اسکولوں کے طالب علموں کے تقریر اور غزل خوانی کے مقابلے ہوئے۔ جلسے کے صدر جناب شکیل بدایونی اور مہمانِ خصوصی عبدالمجید انصاری تھے۔ عبدالمجید صاحب ہی نے انعام تقسیم کیے۔

تقریری مقابلے میں انجمن خیر الاسلام ہائی اسکول کو شیلڈ ملی۔ پہلا انعام اسی اسکول کے طالب علم برہان حارث کو دوسرا جمیلہ کو تیسرا تنویر اختر آفندی (طالب علم محمدیہ ہائی اسکول) کو ملا۔ خصوصی انعام عبدالرحمٰن، غلام محمد، محمد رضا کو مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کی طرف سے دیئے گئے۔ طالبات کا خصوصی انعام میمونہ (بمبئی گرلس ہائی اسکول) کو دیا گیا۔

غزل خوانی کے مقابلے میں انقلاب شیلڈ محمد یونس (خیر الاسلام ہائی اسکول) کو، شکیل بدایونی شیلڈ عطاالرحمٰن (اینگلو اردو ہائی اسکول پونا) کو تیسرا انعام حسام الدین دیوی (محمدیہ ہائی اسکول بمبئی) کو ملا۔ تنویر اختر آفندی، مشتاق عبداللطیف اور سلمہ زبیری کو خصوصی انعام دیئے گئے۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کا طالبات کا خصوصی انعام فاطمہ العزیز کو دیا گیا۔

بقیہ صد ۲۰ پر

صحافی

اِدھر اُدھر سے

انوکھی موٹر:-

کلکتہ اس وقت موٹروں جیپوں اور بسوں کا شہر ہے۔ بڑی چوڑی چوڑی سڑکوں پر ان کا تانتا لگا رہتا ہے سڑک کو پار کرنا مشکل ہوتا ہے۔ پر اب سے اسی سال پہلے یہ بات نہیں تھی۔ عام طور پر گھوڑا گاڑیوں کا رواج تھا۔

اسی زمانے میں ــــ یوں سمجھیے کہ اس صدی سے پہلے کلکتہ میں ایک موٹر آئی کلکتے والوں کے لیے تو یہ نئی تھی ہی شاید پورے ہندوستان کے لیے بھی یہ مہمان بالکل نیا تھا۔ نیا بھی انوکھا بھی۔ بہت ہی انوکھا۔

اس موٹر کا آگے کا یعنی انجن والا حصہ ایسا نہیں تھا۔ جیسا آج کل ہوتا ہے۔ بطخ کی شکل کا تھا۔ بی بطخ انجن کا دھواں اپنے منھ سے نکالتی تھیں۔ دھواں بھی اور لال لال چنگاریاں بھی۔ گھوڑا گاڑی والے تو انجن دیکھتے ہی اپنی گاڑی ادھر اُدھر بھگاتے جاتے تھے۔ ڈرتے تھے کہ ان بی بطخ کو دیکھ کر گھوڑے بدک نہ جائیں ہاں عام لوگوں کے لیے یہ انوکھی گاڑی تماشا بن گئی تھی۔ جب کبھی بی بطخ اپنے گھونسلے یا گراج سے سیر گشت کے لیے سڑک پر آتی تھیں۔ ان کے چاروں طرف بھیڑ لگ جاتی تھی۔ ہوتے ہوتے پیدل چلنے والوں کے لیے یہ ایک مصیبت بن گئیں آخر پولس والوں نے ان کے گھر سے نکلنے پر پابندی لگا دی۔ اور یہ انوکھی سواری جس طرح اچانک نمودار ہوئی تھی۔ ویسے ہی اچانک غائب ہو گئی۔ اور نہ جانے اس بے چاری کا کیا حشر ہوا۔ اس کے موجد مسٹر ماتھی سن نے اسے توڑ پھوڑ دیا یا یہ کلکتہ کے کسی کونے میں بے کسی کی حالت میں زنگ کھا رہی ہے۔

یہ کسی کو پتہ نہیں چلا کہ بطخ کے اس ڈھانچے کو کون سا انجن چلاتا تھا۔ اس زمانے کا رولس انجن ؟ بنز انجن یا یہ بی بطخ جادو کے زور سے چلتی تھیں۔

کلکتہ کے بڑے بوڑھوں کے ذہن میں ان کا ناک نقشہ اب تک محفوظ ہے اور کبھی کبھار ان کی یاد آجاتی ہے تو بہت مزے لے کر ان کی باتیں کرتے ہیں۔

(جونیئر اسٹیٹس مین)

کیا ہم کروڑوں سال زندہ رہ سکتے ہیں؟

اچھا بتائیے وہ کون سی مخلوق ہے جس کی عمر سب سے زیادہ ہے؟

اس کا جواب فری برگ یونیورسٹی کے ایک ڈاکٹر نے دیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ نمک کے بہت ہی پرانے ذخیروں میں ایسے جراثیم پائے گئے ہیں۔ جن کی عمر دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ جراثیم پتھر والے (غالباً سیندھا) نمک کے ٹکڑوں میں ملے ہیں۔ اور کروڑوں سال سے دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا۔

سائنس داں کا خیال ہے کہ زمین میں جہاں نمک کے ذخیرے یا نمک کی کانیں پائی جاتی ہیں۔ وہاں پہلے سمندر تھا سمندر کا پانی خشک ہوگیا۔ صرف نمک رہ گیا۔ یہ نمک دھیرے دھیرے پتھر کی چٹانوں کی طرح سخت ہوگیا۔ سمندر میں جو جراثیم تھے۔ وہ نمک کی پتھریلی سنگلاخ چٹانوں میں قید ہوکر رہ گئے۔ اور اب کہیں کروڑوں برس کے بعد سائنس کے تجربہ گھروں یا لیبارٹریوں میں نمک کے ان ٹکڑوں کو توڑ کر ان قیدی جراثیم کو رہائی دلائی گئی۔

نمک کے یہ پتھریلے ٹکڑے ۱۸ کروڑ سال سے لے کر ۲۰ کروڑ سال تک پرانے تھے۔ سائنس دانوں نے سوچا کیوں نہ نمک کے ان سے بھی پرانے ذخیروں پر بھی تجربہ کیا جائے یہ تجربہ بھی کامیاب رہا۔ ۵۰ کروڑ سال سے لے کر ساٹھ کروڑ سال کے نمک کے ذخیروں میں سے یہ جراثیم نکالے گئے اور کیمیائی عمل سے انھیں زندہ کردیا گیا۔ اس بات کا تجربہ تو پہلے ہوچکا تھا کہ جراثیم بہت سخت جان ہوتے ہیں۔

اچھا تو اگر جراثیم ایک خاص درجۂ حرارت پر منجمد ہوکر زندہ رہ سکتے ہیں تو کیا جان دار بھی اس عمل سے زندہ رہ سکتے ہیں؟ مثلاً انسان کو ایک خاص درجۂ حرارت پر منجمد کر دیا جائے تو کیا سینکڑوں یا ہزاروں سال تک نیند کی حالت میں رہ سکتا ہے اور کیا دوبارہ پھر جاگ سکتا ہے۔ یا پھر زندہ رہ سکتا ہے؟

روسی سائنسداں اس بارے میں تجربے کر چکے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ ہاں ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے دیس میں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ سادھو لوگ دم کشی کرتے ہیں۔ یا دم سادھ لیتے ہیں۔ اپنے بدن کو بے جان سا بنا لیتے ہیں اور پھر سینکڑوں سال بعد جاگ اٹھتے ہیں۔ سائنسدانوں کے ان تجربوں کی روشنی میں تو یہ بات کچھ کچھ ٹھیک ہی لگتی ہے۔

ابھرتے ہوتے فن کاروں کے ساڑھے سات سو شاہکار:-

یہ تصویروں کی انوکھی نمائش تھی بہت انوکھی نمائش

حال میں ان ساڑھے سات سو شاہکاروں کو دیواروں پر لٹکتا ہوا دیکھ کر ایک دفعہ تو ان کو پرکھنے والے بھی ایک زبان ہوکر واہ واہ کہہ اٹھے تھے۔

پر اس میں انوکھی بات کیا تھی؟ انوکھی بات یہ تھی کہ یہ سارا کارنامہ ان ابھرتے ہوئے آرٹسٹوں کا تھا۔ جن کی عمریں چار یا پانچ برس سے لے کر سولہ برس تک تھیں۔

اپریل کے پرچے میں اس مقابلے کا ذکر آچکا ہے۔

لگ بھگ پندرہ ہزار بچوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا اور کچھ نہیں کچھ نہیں تو ستائیس ہزار تصویریں بنائی تھیں ان میں سے ساڑھے سات سو نمائش کے قابل سمجھی گئیں اور ۲۴۱ تصویریں انعام کی مستحق قرار پائیں سب سے

اچھی تصویر پر نمونے کا تمغہ جگدیش رام کو دیا گیا۔ بیگم زیدی میموریل انعام مکیش کمار کو دیا گیا۔ شنکر ویکلی کا خصوصی انعام پی داس گپتا کو ملا۔

اس انعامی مقابلے کا خیال شنکر پلائی صاحب کے دماغ میں آیا تھا۔ اس لیے آیا تھا کہ نئی پود میں مصوری کی صلاحیت رکھنے والوں کو ڈھونڈھ نکالا جائے۔ موجودہ مقابلے میں شنکر صاحب نے ایک بات بہت دلچسپ کہی۔ ان پندرہ ہزار بچوں کو سنبھالنے میں تو انھیں ذرا پریشانی نہ ہوئی البتہ ان کے سرپرستوں اور گھر سے لانے والوں کا معاملہ قابو سے باہر ہوگیا۔

(انڈین ایکسپریس)

آدمی بھی بننے لگے ؟

جی ہاں آدمی بھی بننے لگے۔ کیلی فورنیا کی سائنسی تجربہ گاہ یا ریسرچ لیبارٹری میں سائنس دانوں نے آدمی کا نمونہ یا ماڈل تیار کیا ہے۔ یہ ماڈل ڈاکٹروں کو پڑھائے گا۔ اس کی جلد پلاسٹک کی ہے۔ اور جناب انسانوں کے ہاتھ کا بنا ہوا یہ انسان منہ بھی کھولتا ہے۔ سانس بھی لیتا ہے۔ زبان بھی ہلاتا ہے۔ اور کبھی آنکھیں بھی جھپکاتا ہے۔

معلوم ہوا ہے کہ ۵۵ ہزار پونڈ اور زیادہ خرچ کر کے ایسا انسان بنا سکیں گے جو چل پھر سکے، روانی کے ساتھ بات چیت کر سکے۔

مگر ٹھہریئے ابھی ہمارے سائنس دانوں کی تشفی نہیں ہوئی۔ وہ اپنے تجربوں کی روشنی میں ایسا انسان بنانے کی سوچ رہے ہیں۔ جسے غصہ بھی آتا ہو۔ غصّے کی حالت میں اس کے ماتھے پر بل بھی پڑ جائیں۔ آنسو بھی بہا سکے اور ہاں اس کے بدن میں خون بھی ہوگا۔

(ذو القرنین بدایوان)

باقی مہاراشٹر ص ۷۹

مالی گاؤں ہائی اسکول میں آل مہاراشٹر اُردو ہندی تقریری مقابلہ :-

اس مرتبہ اس تقریری مقابلے کا انتظام ایک خوب صورت پنڈال میں کیا گیا۔ ججوں کے متفقہ فیصلے کے تحت انعام تقسیم کیے گیے۔

(۱) ثانوی مدرسے۔

حکیم محمد حسن ٹرافی مالی گاؤں ہائی اسکول کو ملی۔

پہلا انعام جاوید فاروقی (مالی گاؤں ہائی اسکول) کو۔ دوسرا انعام نفیس احمد (باندرہ ہائی اسکول بمبئی) کو تیسرا انعام محمد ابراہیم محمد یعقوب (مالی گاؤں اسکول) کو ملا

رعایتی انعام عدنان محمد صابر (اے ٹی ٹی ہائی اسکول) کو ملا۔

مہاراشٹر میں اُردو تیسرے نمبر پر :-

۱۔ مہاراشٹر میں مراٹھی بولنے والے ۱۷۰ لاکھ ۳۰ ہزار

۲۔ مہاراشٹر میں گجراتی بولنے والے ۷۰ لاکھ ۹۳ ہزار

۳۔ مہاراشٹر میں اُردو بولنے والے ۴۰ لاکھ ۶۰ ہزار

۴۔ مہاراشٹر میں ہندی بولنے والے ۳۰ لاکھ ۴۰ ہزار

(پرنٹر پبلشر سید احمد دہلی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شایع کیا)

ہم پاس ہو گئے

قاسم مرزا عمر ۶ سال   حمیدہ عمر ۷ سال

بالا سر 7

Regd. No. D. 1457

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.

پیامِ تعلیم
50 P

آبّا اور امّی تو کہیں چلے گئے! — اب؟ فوٹو: شاہد علی خاں

عشرت فاطمہ (بھوپال) عمر ۱ سال

صباحُ الحسن بلال نورانی ـــــ مصباحُ الحسن زبیر نورانی

عمر ۶ سال ــ عمر ۵ سال

شگفتہ جبین (مونگیر) عمر ۲½ سال
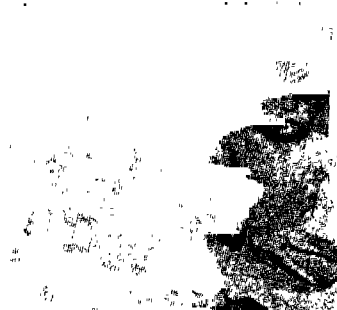
عذرا (جڑواں بہنیں) عُنیزہ

(مالیگاؤں) عمر ۹ ماہ

طلعت رشید (بمبئی) عمر ۱۳ سال

محمد شاہین محمد یوسف (مالیگاؤں) عمر ۹ ماہ

ہدایت اللہ (بمبئی) عمر ۷ سال

امین الدین (احمد آباد) عمر [illegible]

عرفانہ نیر عرف اپی (دہلی) ۶ سال

مشتاق احمد (بمبئی) عمر ۱۱ سال

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی

آرٹسٹ
گلیڈون میسی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

کتاب	مصنف	قیمت	کتاب	مصنف	قیمت
ایٹم کیا ہے	پ. گن سیکر	-/۶۵	سورج کا گھرانا	اے. وی. ایس راما راؤ	-/۷۵
اکبر اور بیربل کے لطیفے	مرتبہ اطہر پرویز	-/۴۰	سائنس کی دنیا	وزارت حسین	۲/۵۰
انوکھی جنین	دیبداس داس گپتا	۱/۲۵	سائنس کے کرشمے	〃	۲/۰۰
باپو کے قدموں میں	منوہن گاندھی	۱/۰۰	ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	۲/۰۰
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	شرابی	〃	-/۵۶
بچوں کے اقبال	مرتبہ اطہر پرویز	-/۵۰	شہر اور گاؤں	نرملیشور شرما	-/۷۵
بچوں کے حالی	〃	-/۷۵	کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/۲۵
بچوں کی معلومات	قدسیہ بیگم	-/۷۵	مندر	وسنت نیل کنٹھ گدرے	-/۷۵
بچوں کی سائنس	اطہر پرویز	۱/۰۰	مصنوعی چاند	اطہر پرویز	۱/۵۰
پنچ تنتر کی کہانیاں اول	شکنتلا دیوی	-/۷۵	نہرو امر ہیں	فصاحت حسن خاں	۱/۰۰
پنچ تنتر کی کہانیاں دوم	〃	-/۷۵	نیا تیرتھ	راجندر اوستھی ترشٹ	۱/۰۰
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	-/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	-/۷۵
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین	۲/۰۰
چار درویش	[illegible]	۱/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیر موہن سیناپتی	۱/۰۰
خلاء کا سفر	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہمارا ذہن	وریجا اڈوپا	۱/۰۰
روشنی کے مینار	بے بھگو	-/۷۵	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسن	۱/۰۰

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

ڈاکٹر ذاکر حسین

فہرست

بچوں سے باتیں

آپ نے اخباروں میں ایک خبر تو پڑھی ہوگی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہمارے دیس کی جمہوریت کے صدر چُن لیے گئے۔ یہ خوشی کی بات ہے، بہت خوشی کی پیام تعلیم کے لیے بھی، جامعہ ملیہ کے لیے بھی۔ علی گڑھ کی یونیورسٹی کے لیے بھی پورے دیس کے لیے بھی کہ اسے ایسا بھاری بھر کم، ایسا باوقار، ایسا پڑھا لکھا صدر نصیب ہوا۔ اب تک ڈاکٹر رادھا کرشنن جیسے غیر معمولی قابلیت کے بزرگ دیس کی جمہوریت کے صدر تھے۔ ان کی جانشینی کے لیے موجودہ صدر جیسی موزوں شخصیت مشکل سے مل سکتی تھی۔

آپ کے پیام تعلیم کی بنیاد غالباً ۱۹۲۶ء میں پڑی تھی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ڈاکٹر عابد حسین صاحب پروفیسر محمد مجیب صاحب یوں سمجھیے کہ اس کے بانیوں میں سے ہیں۔ ان تینوں کی سرپرستی اسے برابر حاصل رہی۔ ذاکر صاحب کی کچھ کہانیوں کا مجموعہ ابو خاں کی بکری کے نام سے چھپا ہے۔ مکتبہ جامعہ نے اسے بہت اہتمام سے چھاپا ہے۔

یہ سب کہانیاں پہلے پیام تعلیم میں چھپ چکی ہیں۔ ذاکر صاحب قبلہ نے ان کہانیوں کے علاوہ بھی پیام تعلیم کے لیے بہت کچھ لکھا ہے۔

اس سلسلے میں ایک اور خوش خبری سنیے۔ پیام تعلیم اس خوشی میں ایک خاص نمبر نکال رہا ہے۔ اس بات کی پوری پوری کوشش کی جائے گی کہ یہ نمبر ذاکر صاحب کے شایانِ شان ہو۔ یہی نہیں آپ کے لیے دلچسپ بھی ہو۔ یہ نمبر شاید ہم اگست میں نکال سکیں۔ ٹھیک ٹھیک تاریخ غالباً اگلے پرچے میں بتا سکیں گے۔

لیجیے صاحب حاجی بابا تشریف لے آئے اور اس پرچے کی زینت ہیں۔ پچھلے مہینے انھوں نے آتے آتے اتنی دیر کی کہ مئی کا پرچہ چھپ کر آپ کے پاس پہنچ بھی گیا۔ اصل میں حاجی صاحب ان دنوں امریکہ پہنچ گئے تھے۔ اور اس کوشش میں تھے کہ آپ کے سامنے کوئی اچھوتی

چیزیں پیش کریں۔

ظ۔ انصاری صاحب نے وعدہ کیا تھا کہ یہ ڈائری خالی زبان و بیان کا نمونہ ہی نہ ہوگی آپ کی خدمت میں دلچسپ اچھوتے اور مفید معلومات بھی پیش کرے گی۔ اس ڈائری کو پڑھ کر آپ کو خود ہی اس کا اندازہ ہو جائے گا۔

ظ انصاری صاحب نے پشکن کی ایک دوسری نظم کا ترجمہ بھی بھیجا ہے۔ یہ بھی اسی پرچے میں چھپ رہا ہے۔ اصل نظم کی طرح یہ ترجمہ بھی شاہ کار ہے۔ پڑھیے اور مزے لیجیے۔

اس پرچے میں دو اور اچھی اچھی کہانیاں شائع کی جا رہی ہیں۔ ایک تو محترمہ آصفہ مجیب کی ہے "نیکی کا بدلہ" اخلاقی کہانی ہے اور بہت اچھے انداز میں لکھی گئی ہے۔ ہم محترمہ آصفہ مجیب کے احسان مند ہیں کہ ہمیں وقتاً فوقتاً نوازتی رہتی ہیں۔

دوسری کہانی "جھبرو" پیام تعلیم کے بہت ہی محترم بزرگ جناب غلام ربانی صاحب کی ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اس بات کا اندازہ ہوگا کہ عیش و آرام انسان تو انسان جانوروں کو بھی ناکارہ بنا دیتے ہیں۔ زبان بیان کے اعتبار سے بھی یہ کہانی اپنا جواب آپ ہے۔

ہمارے محترم ساتھی جناب بزمی بھارتی کو تو آپ خوب جانتے ہیں۔ ان کی نظمیں پیام تعلیم میں اکثر چھپتی رہتی ہیں۔ ان کی بھی اور ان کی ہونہار بچی تقدیس بالا کی بھی۔ اس بچی کی ایک نظم آپ اس پرچے میں بھی پڑھیں گے۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس مہینے بزمی صاحب اس بچی کے فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں۔ اس بچی کی شادی کر رہے ہیں۔ اس رخصتی کے سلسلے میں انھوں ایک نظم بھی لکھی ہے۔ یہ نظم بھی ہم اسی پرچے میں چھاپ رہے ہیں۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ ایک چہیتی اولاد کو رخصت کرتے وقت باپ کے دل پر کیا بیتی ہے۔

پنج منتر کا سلسلہ آپ نے بہت پسند کیا ہے۔ یہ جاری رہے گا اور ہاں بھئی بچوں کے بہت ہی اچھے ننھے والے سید ابوسلیم فرید آبادی صاحب نے ایک بہت مزیدار مضمون لکھ کر بھیجا ہے۔ یہ جولائی کے پرچے میں چھپے گا۔ جولائی کے پرچے میں اور بھی اچھی اچھی دلچسپ چیزیں ہوں گی

ادھر کبھی ہم نے ذاکر صاحب کی کتاب

دل کی آواز

تقدیس بالا

مجھ کو توفیق دے یہ میرے خدا
اپنا ہر فرض کر سکوں میں ادا

حوصلہ مجھ کو یہ عنایت کر
راہِ حق پر رہے ہمیشہ نظر

یا خدا بخش مجھ کو حُبِ وطن
اس پہ قربان ہو میرا تن، من، دھن

علم کی روشنی میں آگے بڑھوں
اونچی اونچی پہاڑیوں پہ چڑھوں

راہ سخت آئے تو نہ گھبراؤں
مُسکراتی ہوئی گزر جاؤں

سیم و زر کی کمی سے ہو نہ ملال
دولتِ علم سے ہوں مالا مال

آدمیت سے دور کر دے جو
ایسی دولت مجھے نصیب نہ ہو

خدمتِ پُرخلوص کام آئے
نیک ناموں میں میرا نام آئے

عمر گُزرے مری محبت میں
زندگی کاٹ دوں رفاقت میں۔

جب سے لالہ مکھن لال کے نقلی دیسی گھی نے ہماری چیل گاڑی کا انجن بگاڑا، ہمارے دل کا انجن خراب ہوگیا۔ پھر کی زور زور سے گھومتی ضرور ہے لیکن ہندوستانی فلمی گانوں کی طرح بے سُری اور بے تکی آواز بس نکالنے لگتی ہے "شکو، شکو، دھڑڑ"، مِس گُلگُلہ بولی، اے اُستاد، روس اور امریکہ

دونوں مُلکوں نے اُڑان کی سائنس میں بڑی ترقی کی ہے، کیا اچھا ہو کر آپ وہیں سے کوئی انجن بنوالیں۔ یا اگر خود چلے چلیے تو کیا عجب کہ وہی بڈھا جرمن انجینیر کہیں مل جائے اور چیل گاڑی کے انجن کی مرمّت کر دے۔ ہم نے سوچا، ہاں لڑکی ٹھیک کہتی ہے۔ جرمنی کے پُرانے پُرانے سائنس داں جو پچھلی لڑائی کے وقت زندہ بچ رہے تھے، ان دونوں ملکوں کی طرف نکل گئے۔ بعض لوگ کہتے ہیں لوٹ کے مال میں جرمن

سائنس دان بھی روسی اور امریکی فوج کے ہاتھ لگے اور وہ اٹھالے گئے۔ اب تک اُن سے کام لے رہے ہیں۔ ہوگا، خیر، ہمیں کیا مطلب!

ہم نے پہلا خط امریکہ کے صدر لنڈن جانسن کو لکھا کہ برخوردار نورِ چشم، جب آپ ہماری دعاؤں کی برکت سے صدر بنے تو ہم کو آپ سے بڑی اُمیدیں تھیں۔ آپ نے ویت نام جیسے اُڑیسہ کے برابر ملک پر توپیں اُتار کر ہمیں بہت دُکھ پہنچایا۔ ہمارا سینہ کسی پاپڑ والے کا جھابا ہو کر رہ گیا ہے جس میں دو بلیاں لڑتے لڑتے گر پڑی ہیں، سب امیدیں چُرمُر ہوگئی ہیں۔ ایک امید سالم بچی ہے اور وہ یہ کہ ہم کو واپسی ٹکٹ بھیج کر اپنے ملک بلائیں گے، مہمان رکھیں گے اور ہماری چیل گاڑی کے لیے انجن کا بندوبست کر دیں گے۔ ممکن ہے، ہم پھر جی لگا کر دُعا کریں اور دعا کی برکت سے آپ کی مشکل آسان ہو، پھنسی ہوئی ٹانگ ویت نام سے نکل جائے۔ اس خط کو تار سمجھنا اور حلق میں لُقمہ ہو تو پانی پینے سے پہلے جواب دینا۔ ہم اب پہلے سے بھی زیادہ حاجی بابا ہو چکے ہیں، آپ کو مل کر خوشی ہوگی ...... فقط

امریکی لوگوں کی "ایفی شنسی" مشہور ہے۔ پوچھو وہ کیا، تو ایفی شنسی یعنی چستی اور ہوشیاری۔ دیکھو کہ اِدھر خط پہنچا، اُدھر جواب آیا۔ خط کا مضمون یہ کہ ہمارا شاندار ملک ہر طرح کے فرار کرنے والوں کی پناہ گاہ ہے، یہاں ایک سے ایک غریب نواز کی درگاہ ہے۔ بہت سال پہلے جب کراچی کی سڑکوں پر ہمارا جلوس نکل رہا تھا، ہم نے کیا نام کہ کسی اونٹ گاڑی والے بشیر ساربان کو راستے میں دیکھا، اور خواہ مخواہ امریکہ آنے کی دعوت دی، اسے خوب خوب ڈِنر کھلائے۔ آپ تو بشیر ساربان کے بھی چچا معلوم ہوتے ہیں۔ جم جم آئیے۔ امریکہ والے عجوبے پسند کرتے ہیں، ٹکٹ کا انتظام کر دیا گیا ہے، آئیں گے تو ضرور پسند کیے جائیں گے۔ وغیرہ وغیرہ

ویسے تو امریکہ ہمارا دیکھا بھالا تھا، ہم اپنی چیل گاڑی سمیت گھوم بھی آئے تھے بیس برس پہلے۔ اس بار جیٹ ہوائی جہاز میں سکرٹری مس گلگلہ کو لے کر روانہ ہوئے۔

جب ہوائی جہاز ایک ہزار کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اُڑتا اُڑاتا نیویارک کے قریب پہنچا تو گلگلہ ایک بہت اونچی بلڈنگ دکھا کر بولی:

"اُستاد، خیریت ہوگئی کہ آپ اپنی خاص سواری سے نہیں آئے ورنہ چیل گاڑی کسی ایسی اونچی

عمارت کی کھڑکی میں گھس جاتی۔

ایئرپورٹ پر اُترتے ہی اُبھی ہم زرق برق شیشے دیکھ رہے تھے اچھی وضع قطع کا ایک اُیفی شنٹ سا آدمی لپکا ہوا آیا اور پوچھا —— یعنی آپ ؟ —— ہم نے گردن اوپر نیچے ہلائی۔ اور داڑھی میں کنگھا ٹہلایا تو اس نے ایک سرکاری آرڈر دکھایا۔ مطلب آرڈر کا یہ کہ یہ خاص صدر صاحب کے مہمان ہیں۔ ان کے آرام کا خاص خیال رکھا جائے۔ اور بال نگری (بچوں کی بستی) جو دنیا بھر کے بچوں کا نمائش گھر ہے، میاں والٹ ڈیزنی کا بنایا ہوا ڈیزنی لینڈ (DISNEY LAND) وہیں اُتارا جائے۔ ڈیزنی لینڈ کی سیرگاہ ان کے لیے نہایت موزوں رہے گی، پبلسٹی بھی خوب ہوجائے گی۔ اور ان کا کام بھی وہیں بن جائے گا۔

آگے آگے ہماری گاڑی روانہ ہوئی، پیچھے پیچھے اخبار والے اور فوٹوگرافر۔ ڈیزنی لینڈ، تم جانو، امریکی زندگی کی بھاگ دوڑ سے ہٹ کر ایک بڑے مزے کا جزیرہ ہے۔ جیسے چاندنی چوک کی شور پکار سے دور اوکھلا پر جامعہ ملیہ والوں کی بستی۔ اس کے بننے کی کہانی لمبی ہے، تھوڑے لفظوں میں یوں کہوں کہ:

والٹ ڈیزنی ایک بڑا بھلا مانس جوان تھا، اب سے پچاس برس پہلے کی لڑائی میں امریکہ سے ڈرائیور بھرتی ہوا۔ زخمیوں کو ڈھونڈنے والی ایمبولینس گاڑی چلاتا پھرا۔ آدمیوں کے زخم دیکھتے دیکھتے اس نے جی میں ٹھان لی کہ باقی ساری زندگی بچوں کے لیے ہنسی خوشی بٹورنے میں گزار دوں گا۔ وہی اس نے کر کے دکھا دیا۔

لڑائی ختم ہوئی۔ اپنے وطن امریکہ واپس آیا۔ اور بہت سے تجربے کر کے میکی ماؤس (MICKEY-MOUSE) کے کارٹون نکالے۔ پہلے یہ کارٹون اخباروں میں چھپے۔ پھر ان کی کارٹون فلمیں بنیں، کتابیں نکلیں، ٹیلی ویژن پر دکھائے گئے —— اور امریکہ سے ساری دنیا میں پھیل گئے۔ امریکہ کی ہر ایک پیداوار کا یہی انجام ہوتا ہے۔

یہ میکی صاحب بڑے کمال کی چیز ہیں، ہر ایک مصیبت کا مقابلہ کرنا جانتے ہیں، کبھی ہمت نہیں ہارتے۔ کسی کمزور کو نہیں مارتے۔ ہر ایک کے دُکھ کے ساتھی ہیں۔ روتے بسورتے نہیں، میکی ماؤس کو تماشے دکھاتے اور دنیا بھر کے بچوں کو ہنساتے چالیس برس ہوتے ہیں لیکن کوئی نہیں بتا سکتا کہ اگلی بار وہ کس شکل کے وقت کیا حرکت

کریں گے۔
جب میکی ماؤس چل پڑا اور بچوں سے بڑھ کر بچوں کی دادی امّاں اور دادا میاں اُن سے لطف لینے لگے تو والٹ ڈیزنی نے اگلا قدم اُٹھایا۔ ایک تفریحی پارک بنانا چاہیے اور اس میں دنیا بھر کا سوانگ رچانا چاہیے، جب لوگ اس پارک میں آئیں تو انھیں لگے کہ ایک اور ہی دُنیا میں آگئے ہیں جہاں ایک سے ایک بڑھ کر عجوبہ سجا ہوا ہے۔
پچاس لاکھ ڈالر کا اندازہ تھا، بنتے بنتے چار کروڑ چالیس لاکھ ڈالر (سمجھو کوئی ۳۲ کروڑ روپے) لگ گئے، تب یہ پارک بن کر تیار ہوا۔ پارک کیا ہے، واقعی نرالی دنیا ہے۔ چاروں طرف ٹیلے سے کھڑے کر دیے ہیں اور بیچ میں کشمیر کی وادی یا دہرہ دون کی طرح کی بستی ہے جو پانچ حلقوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اور ہر ایک حلقے میں ایک ننھی منّی سی دنیا آباد ہے۔
پارک کے پھاٹک سے اندر قدم رکھو تو واہ وا، معلوم ہوتا ہے ساٹھ ستّر برس پہلے کے کسی پرانے امریکی شہر میں آگئے۔ گھوڑا گاڑی —— جیسے بمبئی میں گھوڑے ٹرام کھینچتے تھے —— ٹن ٹن —— ٹنا ٹن۔ سامنے پرانی وضع کی دکانیں، بساط خانے جیسے دلّی کے پرانے دریبے میں ہیں۔ باجہ بج رہا ہے، ایک بڑے سے ہال میں اندر خاموش فلمیں چل رہی ہیں۔ بولتی فلموں کی ایجاد سے پہلے یہی فلمیں چلا کرتی تھیں۔ بلکہ دو ایک تو ہم نے بھی ہندوستان میں بنا کر دکھائی تھیں اپنے پڑپوتوں کو۔
اور آگے جاؤ تو (ADVENTURE LAND) ایڈونچر لینڈ آتا ہے۔ جنگل اور دریا۔ دریا میں مگرمچھ۔ یہ کون سا دریا ہے دریائے نیل (مصر والا

یہ ہے دریائے کانگو (افریقہ کا)، جنگلی جانور
دھم سے کود رہے ہیں۔ قدم قدم پر خطرہ نظر آتا ہے۔
لیکن یہ خطرہ ہے جھوٹ موٹ کا۔ پرزوں اور کھلونوں
کے جانور ہیں۔ کہیں بٹن دبایا اور اوپر سے لنگور کودا۔
بٹن گھمایا اور لنگور واپس۔ دریا کنارے کے مندر اور
گھاٹ بھی موجود ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے واقعی
یہ سامنے کمبوڈیا کا بودھ مندر (پگوڈا) ہے اور
ہماری کشتی نیچے کی طرف بہہ رہی ہے۔
کشتی کا مانجھی آواز لگاتا ہے، صاحبو، ہوشیار،
آبشار کے نیچے چٹان ہے
جھرنے میں جا پڑے گی

کشتی چلی ہاتھ سے۔ جان سٹ سے نکلنے والی تھی کہ
چٹان ربڑ کی نکلی اور کشتی پار اتر گئی۔
بھاپ کا انجن لگی ایک کشتی سرحدی دریا پہ
جا رہی ہے۔ آگے غیر علاقہ ہے۔ کشتی ایک مشہور
امریکی ادیب مارک ٹوئن کے نام پر مارک ٹوئن
سٹیمر کہلاتی ہے۔ اس مصنف نے جیسے قصے افسانے
لکھے ہیں ویسے اس کشتی میں سفر کرنے والوں کی آنکھوں کے
آگے آتے ہیں۔ مغربی سرحد پر گولی چل رہی ہے۔
ڈاکوؤں کی ٹولی سے قصبہ آزاد کرایا جا رہا ہے ——
تڑ —— تڑا تڑا تڑاخ!

پھر تیسرا حلقہ آتا ہے "پریوں کا دیس"
(FANTASY LAND) پل سے ہو کر اس میں
جاتے ہیں، پل کے کنارے سونی رانی کا محل ہے۔
محل کے پار جھولے کی ریل چلتی ہے۔ اس ریل میں
بیٹھو اور پریوں کا دیس دیکھ لو۔ قصے کہانیوں
کے شہزادہ گلفام اور کوہ قاف کی پری سے
یہیں ملاقات ہوتی ہے۔ ہیروں کی
کان، سوئٹزرلینڈ کی برف پوش پہاڑی
اور سن پہاڑی کے بیچ میں سے جھولے کی ریل جھولا جھولتی
سن سن گزر جاتی ہے۔ جب ریل
میں ہماری نظر مس گلگلہ پر پڑی

تو ہمیں وہ بھی کوہ قاف کی پری معلوم ہوئی ——
ایسا اچھا منظر تھا۔

"کل کی دُنیا" - (TOMORROW-
LAND) - بھی ایک کمال کا علاقہ ہے ——
جب ہم نے اس میں قدم رکھا تو یوں لگا جیسے
آنے والے زمانے میں ابھی سے آ گئے۔ ایک
ریل سامنے سے چپ چاپ گزر گئی۔ ریل چلنے کی
اتنی اور ایسی آواز آ رہی تھی جیسی گھسی ہوئی سوئی
پر بگڑے ہوئے ریکارڈ چلنے کی آتی ہے۔ ستّر
کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے گزرنے والی یہ ٹرین
مسافروں کو آنے والے کل کی دنیا دکھاتی ہے۔
انجن سے لے کر دُم تک پوری ٹرین ایک سیدھا
چمکدار ڈبہ نظر آتی تھی۔ ہم بھی بٹھائے گئے۔ یہ
ٹرین غپ سے سمندر میں اُتر جاتی ہے اور پھر
باہر نکل آتی ہے۔ دریائی جانور بھی ٹرین کے
شیشوں میں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک جگہ سے
ٹرین گزرنے لگی تو گنگلو نے ہمارا کندھا ہلایا۔

ارے وہ، وہ دیکھو۔ راکٹ چلا۔

سچ مچ ۲۷ گز لمبا ایک راکٹ تیار رکھا تھا
چاند پر جانے کے لیے۔ ہم نے راکٹ کو چاند پر
پہنچنے کے لیے تیار دیکھا تو ہمیں اپنی پیاری چاندسی
چیل گاڑی یاد آ گئی جو برہان پور کے باہر جنگل میں
کھڑی ہو گی اور اس دن کے انتظار میں پٹرول کے
آنسو بہاتی ہو گی۔ جب ہم اس کا انجن بنوا کر یا نیا
انجن لیے ہوئے اپنے وطن لوٹیں۔ ہم نے جھٹ سے
اپنی سیٹ کا ایک خُفیہ بٹن دبا یا۔ اور ریل گاڑی
رکوا کر اُتر پڑے۔

وہاں ایک شخص ٹہل رہا تھا۔ پوچھا تم کون؟
پتہ چلا کہ یہ مرحوم والٹ ڈیزنی کے ساتھی اور وارث
ہیں۔ ڈیزنی مرحوم سے ہماری بھی ایک زمانے سے
یاد اللہ تھی۔ انھیں بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ داڑھی
کو ہاتھ لگا کر چومنے لگے۔ پھر ہمارا بریانی والا چوڑا ہاتھ
سر پر رکھ کر بولے۔ قسم ہے آزادی کے اُس بُت
کی، جو امریکہ کی قومی نشانی ہے۔ پچھلے سال جب والٹ
ڈیزنی کا سایہ ہمارے سر سے اٹھا، ڈیزنی لینڈ
کی رونق اُٹھ گئی۔ آپ یہاں رہ جائیں تو ہم چچا بنا کر
رکھیں گے۔ اور ایک انجن کیا، ہم تو ایسی چیل گاڑی
بنوا دیں گے آپ کے لیے کہ بس! آپ چاہیں تو
چھٹا علاقہ آپ کے نام کا "حاجی بسا لینڈ" سامنے کے
ٹیلے کے نیچے بسا دیں گے۔ ڈیزنی لینڈ کے تماشوں
میں ایک نیا......

"ارے،" ہم نے کہا "ظالم، کیا مجھ بڈھے کو

تم نے کھلونے کا گڈا سمجھا ہے ؟ بچے تالی بجائیں،
جوان مذاق اُڑائیں اور بُڈھے ناک بھوں چڑھائیں؟
ہم دُنیا جہان میں گھومنے پھرنے والے آدمی، کہاں
ایک پارک میں بند ہو سکتے ہیں۔ اِس خیال سے
اِدھر چلے آئے کہ پاکستان کو ہتھیار اور ہندوستان کو
گیہوں کروڑوں من کے حساب سے بھیجنے والا ملک
ہے یہ، کیا عجب کہ ہم کو بھی دس پندرہ سیر کا ایک
خاص موڈل والا انجن یہاں سے سپلائی ہو جائے۔
انجن اٹھائیں گے اور اپنے گھر کا راستہ لیں گے۔"

اُس شریف آدمی نے سُنا، اپنا باکسنگ والا
ہاتھ ہمارے سر پر رکھا اور بولا "قسم آپ کے سر کی،
حاجی بابا، ہماری اطلاع یہ ہے کہ پاکستان ہمارے
ہتھیار اور ہندوستان ہمارے گیہوں ہضم کر کے ہم کو
بے حساب گالیاں دیتے ہیں اور آنکھیں دکھاتے
ہیں۔ اب ہم مفت کا مال دے دے کر مفت کی
گالیاں نہیں کھانے والے۔ بیوپاری کا چلن یہ ہے
کہ مال لو تو پیسے رکھ دو، چاہے بعد میں گالیاں
دیتے پھرنا۔ اگر ہم ڈیزنی لینڈ کے یہ اصلی کمالات
ایجاد کر سکتے ہیں تو کیا آپ کا ایک نقلی انجن بناتے
دیر لگتی ہے؟ ابھی لو یہ، ڈزائن دیجیے، پیشگی
رقم رکھیے اور جہاں، جتنے کہیے، چیل گاڑی کے
انجن اپنے ورکشاپ سے تیار کرا کے ہم ایکسپورٹ
کر دیں گے۔"

ہم نے کہا، برخوردار! چیل کے گھونسلے میں
ماس کہاں، درم و دام اپنے پاس کہاں۔"

ہم تو صدرِ لِنڈن جانسن کے مہمان ہیں، ویسے
آدمی بڑے مہمان نواز ہیں، کچھ ایسی تدبیر کرو کہ انجن
بنے، مفت بنے اور ایسا بنے کہ تمھارے راکٹ کے
پیچھے پیچھے چاند پر اُتر جائے۔

وہ ادب سے بولا، "یہ بات ہے تو فکر
نہ کیجیے حاجی بابا، ہم تو کئی ایک بگڑی ہوئی حکومتیں
برسوں سے چلا رہے ہیں۔ ایک چیل گاڑی چلانا
کیا مشکل ہے۔"
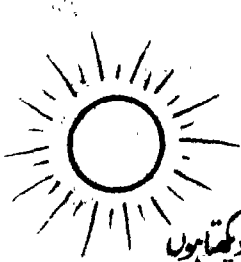
گرمی کے دن رات

جناب عبدالمنان نسیم شواپوری

پریشان سب کی نظر دیکھتا ہوں — لرزتے ہوئے بام و در دیکھتا ہوں
چرندوں پرندوں کا میں ہر بشر کا — بُرا حال شام و سحر دیکھتا ہوں
یہ لُو کے تھپیڑے، یہ گرمی، یہ شعلے — جہنم کو پیشِ نظر دیکھتا ہوں
نہیں فرق آقا و خادم میں کوئی — سبھوں کو پسینے میں تر دیکھتا ہوں
نکالے زباں پیاس سے مُنہ کے باہر — تڑپتے ہوئے جانور دیکھتا ہوں
نہ سڑکوں پہ رونق نہ بازار میں غُل — خموشی ہے طاری جدھر دیکھتا ہوں
اُڑی سبزہ زاروں کے چہروں سے رونق — فسردہ فسردہ شجر دیکھتا ہوں
نہ ندیوں میں پانی نہ بارش کا امکاں — کسانوں کی آنکھوں کو تر دیکھتا ہوں

یہ گرمی ہے یا ہے قیامت خدایا!
بچا اس مصیبت سے اب توبہ توبہ!

کٹا دن مصیبت میں تو رات آئی — لیے ساتھ تاروں کی بارات آئی
کھلی چاندنی ہر طرف دودھ کی سی — فسردہ دلوں کو ملی تازگی سی
چلے ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے — مچلنے لگے سوکھے ہونٹوں پہ نغمے
لگے بسترے آنگنوں میں چھتوں پر — کہ نشہ سا چھانے لگا ہے دلوں پر
جو انسان دن کے ستائے ہوئے تھے — کہ لُو سے بڑے تنگ آئے ہوئے تھے
پسینے میں دن بھر نہائے ہوئے تھے — جو تکلیف دن بھر اٹھاتے ہوئے تھے

وہ آغوش میں نیند کی سو گئے ہیں
وہ سپنوں کی نگری میں سب کھو گئے ہیں

جناب غلام ربّانی

جھبرو

بہت دنوں کی بات ہے، کسی جاگیردار کے پاس ایک کتا تھا۔ ایک صاف ستھری چوکی پر ریشمی گدا بچھا ہوا تھا جس پر وہ بیٹھتا تھا۔ چاندی کی ایک ہلکی سی زنجیر سے بندھا رہتا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ایک آدمی تھا جو اس کے لیے بازار سے گوشت لاتا اور اُبال کر راتب کھلاتا تھا۔ بڑھیا صابن سے مَل مَل کر اسے نہلاتا، جس سے اس کے بال ریشم کی طرح ملائم اور چمکدار ہو گئے تھے۔ جب کبھی جاگیردار کہیں باہر جاتے تو وہ اُچک کر بگھی میں ان کے پاس بیٹھ جاتا تھا۔ جاگیردار کا کوئی دوست یا ملاقاتی ان سے ملنے آتا تو باتوں باتوں میں وہ اس کتّے کو ضرور دکھاتے تھے اور کہتے کہ جب میں ولایت گیا تھا تو وہاں کتّوں کی ایک نمایش ہوئی تھی، جس میں دُنیا بھر کے نسلی کتّے لائے گئے تھے وہیں میں نے اسے ایک ہزار میں خریدا تھا۔ اس کا باپ اسپین کا تھا اور اس کا دادا سوئٹزرلینڈ کا تھا۔ اس کا خاندان جنگلی درندوں کے مقابلے کے لیے مشہور تھا۔ جاگیردار اس کو پیار سے "موتی" کہتے تھے۔ اور موتی بڑے ٹھاٹھ سے رہتا تھا۔

کچھ دن بعد جاگیردار کو اپنی جاگیر میں جانے کا اتّفاق ہوا۔ چنانچہ وہ موتی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ ان کا ڈیرا گاؤں کے کنارے پہاڑی کے دامن میں لگایا گیا جس کے پاس سے ایک نالا بَل کھاتا ہوا نکل گیا تھا۔ اس پر درختوں کے جھنڈ چھائے ہوئے تھے۔ گاؤں سے ملا ہوا جنگل تھا، اس میں جنگلی جانور رہتے تھے۔

رات کو ایک تیندوا ان کے ڈیرے میں گھس آیا۔ جاگیردار سفر سے تھک کر سو گئے تھے، اور بڑے زور زور سے خرّاٹے لے رہے تھے ان کے پلنگ کے پاس موتی موجود تھا، وہ تیندوے کو دیکھ کر ڈر گیا اور کوں کوں کرنے لگا۔ تیندوا اس پر جھپٹا اور موتی کو بھنبھوڑنے لگا۔ جاگیردار سہم کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ مگر اب جائیں تو کہاں ؟ اتنے میں گاؤں کا ایک کتّا اندر آیا اور تیندوے پر ٹوٹ پڑا

اب کبھی تیندوا اوپر اور کتّا نیچے اور کبھی کتّا اوپر اور تیندوا نیچے۔

اس وقت موتی کی بن آئی اور وہ چپکے سے باہر کھسک گیا۔ ادھر تیندوا اور کتّا دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بنے ہوئے تھے کبھی اس کی پیٹھ پر اس کا منہ اور کبھی اس کی گردن اس کے منہ میں۔ آخر تیندوا بے دم ہو گیا اور کتّے نے اسے بُری طرح جھنجھوڑ ڈالا۔

اب جاگیردار پلنگ سے نیچے اُترے تو تیندوا دم توڑ رہا تھا۔ اس شور و غل میں گاؤں کے لوگ جمع ہو گئے اور تیندوے کو گھسیٹ کر باہر نکالا، کتّا دُم ہلاتا ہوا ایک کسان کی طرف بڑھا اور اس کے پاؤں میں لوٹنے لگا۔ گاؤں والے خوش ہو کر کہنے لگے "ارے یہ تو بنسی کا جھبرو ہے، واہ رے شیر کیا کہنے ہیں تیرے"

صبح ہوتے ہی جاگیردار نے گاؤں والوں کو بلایا اور بنسی سے پوچھا "تم نے یہ کتّا کتنے کو خریدا ہے" وہ بے چارہ شرما کر کہنے لگا "اجی صاحب ہم غریب آدمی بھلا کتّے کا کیا مول کریں گے۔ گاؤں میں

جیسے اور کُتے ہیں، یہ بھی ہم نے ایک پلا پال لیا تھا"
جاگیردار نے کہا "یہ تو بہت بڑا شکاری
ہے۔ تم اسے کھانے کو کیا دیتے ہو؟" وہ بولا،
جاگیردار جی ہمارے پیٹ سے کچھ بچے تو ہم اسے
دیں۔ یونہی کوئی باسی کوسی ٹکڑا بچارے کو
مل جاتا ہے۔

جاگیردار (گاؤں کے چودھری سے) چودھری
گاؤں والوں سے کہہ دو۔ اس سال سب کا آدھا لگان
معاف، اور جھبرو نے ہماری جان بچائی ہے اب
اسے ہم یہاں نہیں چھوڑیں گے، بنسی! یہ لو
پان سو روپے، یہ تمہارے جھبرو کی قیمت نہیں ہے
بلکہ کشتی جیتنے کا انعام ہے۔ اب ہم جاتے ہیں
اور جھبرو کو لے جاتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں جب
بگھی آئی اور جاگیردار اس میں بیٹھا تو حسبِ معمول
موتی بھی کود کر سامنے کی سیٹ پر جا بیٹھا۔ جاگیردار
نے نفرت سے اسے دھتکارا اور گاؤں والوں سے
کہا اسے نیچے اُتار دو۔ غرض موتی کو وہیں چھوڑ وہ
گاؤں سے روانہ ہو گیا۔

مکان پر پہنچ کر جاگیردار نے حکم دیا، اب
جھبرو موتی کی جگہ رہے گا اور موتی کے نوکر سے کہا،
دیکھو اس کی دیکھ بھال موتی سے بھی زیادہ کرو
اور اس کے آرام کا خیال رکھو۔ غرض جھبرو اسی ٹھاٹھ
سے رہنے لگا جیسے موتی رہا کرتا تھا۔

اب موتی کا حال سُنیے، اس پر کیا گزری،
جب جاگیردار گاؤں سے چلا گیا اور وہ بیچارہ وہاں
اکیلا رہ گیا تو چاروں طرف سے کتوں نے اس پر
دھاوا بول دیا۔ ادھر سے کالو اور بھورا نے لے
پھپیڑا دوسری طرف سے لالو اور شیرو نے بھنبھوڑا
وہ بیچارا دم دبا کر بھاگا۔ مگر جس طرف جاتا اسی گلی کا
کتا اس پر لپکتا۔ کئی کتوں سے
لڑ بھڑ کر لہو لہان ہو گیا۔ آخر جان بچا کر گاؤں سے
باہر چلا گیا، دن بھر بھوکا پیاسا پھرتا رہا۔ رات کو
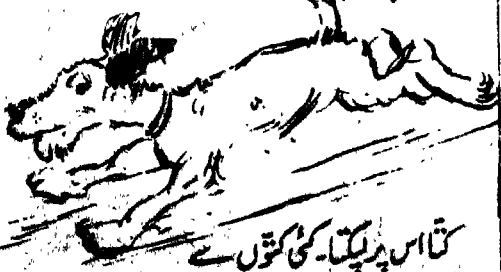
بھی کچھ کھانے کو نہیں ملا۔

دوسرے دن جب بھوک سے نڈھال ہوگیا تو مرتا کیا نہ کرتا۔ گاؤں کی طرف چلا، ایک گلہری اسے دکھائی دی، بس ایک ہی چھلانگ میں اسے پکڑ کر چٹ کر گیا۔ آگے بڑھا تو ایک کتا اس پر جھپٹا مگر سامنے سے بنسی چلا آرہا تھا اس نے بچالیا اور روٹی کا ایک ٹکڑا بھی دیا، وہ دُم ہلانے لگا۔ بنسی اسے اپنے کھیت پر لے گیا۔ اب موتی بنسی کے پاس رہنے لگا۔

شروع میں گاؤں کے کتوں نے اسے بہت ستایا مگر آخر یہ بھی نسلی کتا تھا اور ہاتھ پاؤں کا زبردست اس نے ڈٹ کر مقابلہ کرنا شروع کیا اور چند ہی روز میں گاؤں کے کتوں پر اس کا رعب بیٹھ گیا۔ اب تو یہ حال ہوگیا کہ بڑے بڑے کتے اس کو دیکھ کر کترانے لگے۔ اس گاؤں میں ایک کتا شیرو نام کا بہت زبردست تھا، اس کے سامنے کوئی دُم نہیں مارتا تھا۔ ایک دن موتی کی اس سے بھی مڈبھیڑ ہوگئی۔ موتی نے اسے ایسا بھنبھوڑا کہ وہ چیختا ہوا بھاگ گیا۔ اب سارے گاؤں پر موتی کا راج ہوگیا۔ جنگل کی طرف جاتا تو خرگوش کو چند ہی چھلانگوں میں پکڑ لیتا۔ لومڑی، گیدڑ تو کیا بھیڑیے کی مجال نہ تھی کہ اس کے سامنے ٹھہر سکے۔

کوئی سال بھر گزرا تھا کہ جاگیر دار کو پھر اسی گاؤں میں جانے کا اتفاق ہوا۔ جب ان کی بگھی بستی میں داخل ہوئی تو جھبرو جاگیردار کی برابر کی سیٹ پر بڑی شان سے بیٹھا ہوا تھا۔ گاؤں کے کتوں نے اسے دیکھ کر غرّانا شروع کیا۔ جب جاگیردار بگھی سے اُترا تو جھبرو بھی اُترا مگر ابھی وہ اُترا ہی تھا کہ گاؤں کا ایک کتا اس پر جھپٹا اور گرا کر اس کے سینے پر چڑھ گیا۔ جاگیردار کو غصّہ آیا اور اس نے بید سے سڑاسڑ مارنا شروع کیا جھبرو موقع پاکر بھاگا۔ ادھر یہ کتا دُم ہلاکر جاگیردار کے پاؤں میں لوٹنے لگا اور محبّت کے مارے بچھا جارہا تھا۔ جاگیردار نے غور سے دیکھا تو حیران ہوکر کہا "ارے یہ تو ہمارا موتی ہے"

جناب ظ انصاری

پادری جی اور ان کے نوکر کی کہانی

جو روس کے شاعرِ اعظم الیکساندر پوشکن نے لکھی
تمام دنیا میں پسند کی گئی
اور ظ انصاری نے اس کا منظوم ترجمہ کیا

سُنا ہے کہ رہتا تھا اک پادری
مگر اس کے بھیجے میں بھوسی بھری
وہ اِک روز جاتا تھا بازار سے
کہ سستا سا سودا سلف دیکھ لے
وہیں سامنے سے بھٹکتا ہوا
ذرا دائیں بائیں اٹکتا ہوا

وہ بدھو بھی پہنچا
جسے روسی بھاشا میں "بلدا" کہیں
"کہو، پادری جی، کدھر کو چلے؟
سویرے سویرے،
کہاں کے ارادے ہیں؟ کیا بات ہے؟"
"میاں کیا بتاؤں، مجھے چاہیے ایسا اِک آدمی

جو باورچی ہو اور سائیس ہو
بڑھئی کے ہُنر میں بھی اَکّیس ہو
بھلا ایسا نوکر کہاں پایئے
کہ ہو کام دھندے میں بھی ہوشیار
نہ ہو اتنا مہنگا کہ بن جائے بار"

میاں "بدھو" بولے کہ اچھا جناب
میں "بندا" ہوں کیجے مرا انتخاب
کروں گا میں سب کام جی جان سے
نبھا جاؤں گا دھرم ایمان سے
مرا کیا ہے، اُبلے ہوئے آلو کھا کھا کے کاٹوں گا دن
نہ بیٹھوں گا ٹھالی کبھی، کام بِن
مجوری مری، کچھ نہیں،
سال میں تین ٹھونگے
اسی پاک ماتھے پہ ہوں گے
سُکھی ہوں میں اتنے ہی انعام سے
جو سرکار خوش ہوں مِرے کام سے

سُنا، سوچ میں پڑ گیا پادری
کہ یہ تین ٹھونگے کی اچھی کہی
میاں، ٹھونگے ٹھونگے میں انتر بڑا
کوئی نرم ٹھونگا، تو کوئی کڑا
چلو، دیکھی جائے گی، یہ بھی سہی
کہا اُس نے بدھو سے "اچھا، رہی
وہی لو، مجوری، جو تم نے کہی
حویلی میں میری، ترے واسطے
ٹھکانا بہت سر چھپانے کا ہے
ترا کام محنت دکھانے کا ہے"

غرض اس طرح اُن کا سودا پٹا
حویلی میں، بدھو
کسی کونے کھدرے میں رہنے لگا
جو سوئے تو ہو پیال پر اس کا بستر
جو کھائے
تو چار آدمی کے برابر
جو کرنے پہ آئے
تو ساٹھ آدمی کا کرے کام ڈٹ کر
سویرے سے نمٹائے سب کام کاج
زمیں کی جتائی
تو گھوڑے کا ساج
دوکانوں پہ دوڑے
تڑک میں ہی تیار چولہا کرے

ہوں انڈے بھی صاف اور اُبلے دھرے
بہت خوش تھی بُدھو سے خود پادرن
مگر اس کی بیٹی کو رہتی کُڑھن
کہ اک جان اور اس پہ اتنے جتن
اسی گھر میں بچّہ بھی تھا گود کا
وہ بدھو میاں سے بہت ہِل گیا
چٹائے اسے کھیر بدھو تو وہ
پکارے، "چچا آؤ، گودی میں لو"
سبھی کو یہ نوکر تھا پیارا، مگر
کھٹکتی تھی کچھ پادری کی نظر
پسیجا نہیں وہ کبھی بھول کر
اُسے فکر تھی، آرہا ہے سمے
حساب اس کا کرنا ہے، کیسے جمے!
نہ پینے کی لذت، نہ کھانے کا چین
جلے رات بھر آنکھ کی لالٹین
یہ حالت ہوئی روز کی فکر سے
کہ ہر وقت ماتھا ٹھنکتا رہے

غرض پادرن سے کہا "بھاگوان
بتا کچھ کہ الجھن میں ہے میری جان
جو گتھی پڑے اور مشکل ہو چال
تو کرتی ہے عورت کی بُدھی کمال
وہ ترکیب میں، چال میں تیز ہے
ہر اک جی کے جنجال میں تیز ہے
کہا اُس نے تدبیر سُن مَردُوے
اُسے کام ایسا کوئی سونپ دے
کہ ہو بس سے باہر
جتادے کہ دیکھ، اس کو کرنا ہے سَو فی صدی
یہ ترکیب سوجھی ہے اس زور کی
کہ لاٹھی نہ ٹوٹے، مَرے سانپ بھی
نہ "بلدے" کو دینا دلانا پڑے
نہ ٹھونگا ہی ماتھے پہ کھانا پڑے"
سُنا یہ تو بس پادری کِھل گیا
اُسے نسخۂ کیمیا مل گیا
ڈپٹ کر کہا، سُن بے تکتا ہے کیا
بلاتا ہوں تجھ کو ادھر آ ذرا
جو کہتا ہوں سُن غور سے کھول کان:
بقایا ہے بھوتوں پہ میرا لگان
یہ ہے اُن کے ذمّے مرے جیتے جی
برس تین سے ایک کوڑی نہ دی
نٹ وال دیپے سے ساگر کو جا
بقایا کی ایک ایک پائی اُگھا

یہ اک کام دیتا ہوں کر کے دکھا
نتیجہ نہ دیکھا جو تکرار سے
تو ساگر کو بدھو میاں چل دیے
[یہ سوچا کہ اچھا دکھاتا ہوں میں
انھیں انگلیوں پر نچاتا ہوں میں]
کنارے سے ڈالی سمندر میں رسّی، گھمائی، پھرائی بڑی دیر تک
مچی کھلبلی اور سرا تہہ میں پہنچا تو اٹھی دہائی بڑی دیر تک
پرانا سا اک بھوت باہر نکل
پکارا کہ "کیا ہے بے او بدھو مَل؟
یہاں کیوں مچاتا ہے تو گڑبڑی؟
ہمارا سمندر تجھے کیا پڑی؟

کہا "یوں نہیں باز آنے کے تم
سمندر میں رسّی گھماؤں تو پھر،
مروڑوں زرا تم کمینوں کی دُم"
یہ سُنتے ہی وہ بھوت گھبرا گیا
کہ یہ کیسے بے ڈھب سے پالا پڑا!
پکارا "خفا کیوں ہو کس بات پر؟"
بگڑ کر یہ بولا —— "نہیں کیا خبر؟
کہ کب سے بقایا ہے تم پر لگان
نہ بھرتے ہو پیسہ، نہ دھرتے ہو کان
بہت سر اٹھایا ہے، اب پھل چکھو
زرا دیکھوں تو کتنے پانی میں ہو!"

وہ بولا:
بگڑتے ہو کیوں پیارے بدھو میاں
زرا ٹھیر جاؤ
نہ گڑبڑ مچاؤ یہاں
ابھی بھیجے دیتا ہوں سارا لگان
تمھیں بے گا پوتا ہمارا 'لگن'"

کہا جی میں بدھوؔ نے، اب دیکھیے
نمٹنا پڑے چھوٹے شیطان سے
کہ اتنے میں. بھوکا بِلوٹا بنا
بھڑق سے نکل آیا اِک بھوتنا
خوشامد سے بدھوؔ کو کر کے سلام
کیا ننھّے ٹیٹوڑے سے کلام
"یہ کیسی وصولی پہ آئے ہو تم
بڑی بے اصولی پہ آئے ہو تم
میاں، ہم تو ہیں بھوت، ہم کو بھلا
لگانوں دگانوں سے کیا واسطہ؟
سُنا تک نہیں ہم نے پہلے کبھی
مگر تم جو کہتے ہو، یوں ہی سہی
یہ رکھا ہے تھیلا، رقم اس میں ہے
مگر پہلے دیکھیں کہ دَم کس میں ہے
جو پہلے سمندر کا چکر لگائے
وہ جیتے، یہ تھیلا اٹھا گھر کو جائے

سُنا، ہنس پڑا سُن کے بدھوؔ میاں
"ابے جا، کہاں میں، کہاں تو، میاں
بھلا سامنے میرے آئے گا تو؟
سمجھ لے، بڑی منھ کی کھائے گا تو،

اگر حوصلہ ہے تو مجھ سے نہیں
ذرا چھوٹے بھیّا سے ہو جائے دوڑ"
وہیں پاس جنگل تھا
اس میں کہیں سے دو خرگوش پکڑے
بڑے موٹے تگڑے
اُنھیں ایک تھیلے میں ڈالا
سمندر پہ پہنچا

پکڑ کان، خرگوش باہر نکال
یہ بولا، دِکھا بھوت نے اپنی چال
ابھی تو ہے بالشت بھر کا جنا
ہے جھوجھا چنا اور باجے گھنا

میں کیوں اپنی [illegible] کھوؤں گا، چھوڑ
یہ لے، میرا بھیّا رہا تیری جوڑ
زرا ناپ لے، ساتھ اس کے زمیں
لگا دوڑ، ہاں، ایک دو —— اور تین
وہ جوڑی جو چھوٹی تو پر لگ گئے
کنارے کنارے وہ بُھتنا چلا
مگر یہ تو، تم جانو، خرگوش تھا
جو چھوٹا تو سدھ بھی نہ جنگل کی لی
وہ جنگلی تھا بس، راہ جنگل کی لی
ادھر سے وہ بُھتنا
سمندر کا تٹ ناپتا
بہت دور سے ہانپتا کانپتا
جو پہنچا پسینے میں ڈوبا ہوا
تو سوچا کہ بازی رہی میرے ہات
میں بدھو سے منواؤں گا اپنی بات
(ابھی اس کے تھیلے میں خرگوش تھا
نہ کچھ اس سے چھوٹا، نہ اس سے بڑا)
قریب آیا بھتنا تو چھوٹے میاں
مزے میں چمکتے تھے لال انکھڑیاں
چہکتا تھا بدھو بڑے پیار سے
"بہت دوڑے بھیّا، بہت تھک گئے

اب آرام کر لو، مرے لاڈلے"
یہ نقشہ جو دیکھا بڑا اٹ پٹا
تو بالکل ہی بُھتنا گیا سٹپٹا
سمیٹے بدن، دُم دبائے ہوئے
تکے اس کو، آنکھیں چُرائے ہوئے
پھر آخر کہا "میں نے لی ہار مان
ابھی تجھ کو دیتا ہوں سارا لگان
وہ دوڑا گیا
پکارا کہ دادا دُہائی تری
ہرایا مجھے چھوٹے بدھو نے ایسا کہ سب آبرو ہو گئی کرکری
یہ بُھتنوں کا دادا بڑا گھاگھ تھا
خبر سُن کے کچھ سوچ میں پڑ گیا

اِدھر پھر سے بدھو نے طوفان اٹھایا بہت
سمندر میں رستا گھمایا بہت
اُٹھیں ایسی لہریں
کہ چھوٹے بڑے بھوت تنگ آ گئے
وہ بُھتنا نکل کر پکارا: —— "اَمان!
ابھی تجھ کو بھرتے ہیں سارا لگان
مگر سُن، ابھی شرط باقی ہے ایک،
یہ لاٹھی جو لایا ہوں اس کو اٹھا

بہت دُور کوئی نشانہ بنا
نشانے سے بھی آگے جو پھینک دے
وہ جیتا، رقم لے کے چلتا بنے
کہو بدھو، اب تم کو کاہے کی سوچ؟
یہ ڈر ہے کہ آنے لگی پہنچے میں موچ؟
"نہیں بے، مجھے ڈر ہے اس بات کا
کہ پھینکی اگر میں نے لاٹھی گھما
وہ بادل ہیں، ان سے پرے جائے گی
تو روتا پھرے گا، نہ مل پائے گی
مجھے کیا، میں رسّا گھماؤں گا پھر
مزا بھوتوں کو چکھاؤں گا پھر
سنا یہ تو بھتنا پڑا سوچ میں
مگر فائدہ کیا تھا سنکوچ میں
وہ دوڑا گیا اپنے دادا کے پاس
بہت دل شکستہ، بہت بدحواس

دھر پھر سے بدھو نے رسّا لیا
وہ طوفان اٹھایا
کہ بھوتوں کا پھر ناک میں دم کیا
نکل کر یہ بھتنا پکارا کہ ٹھہر
بس اک آخری شرط ہو جائے خیر

"نہیں بے، بہت ہو چکی شرط ورط
چلے گی نہ آگے تری کوئی شرط
ہے اب میری باری، بتاؤں گا میں
مزا کشمکش کو چکھاؤں گا میں
یہ بھورا بچھیرا کھڑا ہے — ادھر
اٹھا لے لے، لے کے چل کوس بھر
اگر تو اٹھا لے تو تیرا لگان
نہیں تو، میں جیتا، پکڑ اپنے کان
جو کی اس سے بدھو نے دو ٹوک بات
تو بھتنے نے سوچا کہ کھاؤں نہ مات
وہ جھٹ سے بچھیرے تلے گھس گیا
بہت زور مارا ہیئ شا، ہیئ شا

اٹھا کر بچھیرے کو دو ڈگ بھرے
جو گھٹنے، بچک جائیں، وہ کیا کرے
غرض تیسرے ڈگ میں بولا وہ چیں
نہ اُٹھ پایا، ٹانگیں پساریں وہیں
ڈپٹنے لگا اس کو بدھو میاں
لیے جا، کہاں ہیں، کہاں تو، میاں
تو مورکھ تھا جو مجھ سے بازی بدی
بھلا کیا ضرورت تھی اس بات کی!
بچھیرا ——
جسے تو نہ ہاتھوں پہ لے جا سکا
مجھے دیکھ ٹانگوں میں لے کر چلا"
سوار اس پہ بدھو ہوا جس گھڑی
بچھیرے نے ایسی بھری چوکڑی
اُڑی دھول —— اِک دم ہوا ہو گیا
ڈرا: بھتنا —— ہیں، یہ کیا ہو گیا؟
وہ دوڑا گیا اپنے دادا کے پاس
بہت دل شکستہ، بہت بدحواس
نہ ترکیب باقی رہی اور نہ چال
تو سوچا کہ عزت کا صدقہ ہے مال
سمیٹا لگان اور تھیلے میں ڈال
تھمایا اُسے، "لے رے بدھو سنبھال"

لیے مال، کرتے چلے ہائے وائے
تو بدھو میاں خیر سے گھر کو آئے
جو دیکھا کہ پھر یہ بلا آگئی
بدکنے بھڑکنے لگا پادری
اُسے ڈر کے مارے چڑھی کپکپی
چھپا جا کے جورو کے پیچھے مگر
وہاں بھی بدن میں سمایا تھا ڈر -
جو ڈھونڈھا تو بدھو نے پایا اُسے
رقم بھر کے تھیلا تھمایا اُسے
کہا: پادری جی، لگان اپنا لو
میں جاتا ہوں، اب میرا ٹھکنا کرو
بچارے کو ماتھا بڑھانا پڑا
بڑے زور کا ٹھونگا کھانا پڑا
لگا پہلا ٹھونگا
تو چھت تک اُچھل کر گیا پادری
پڑا دوسرا تو
زباں اُس کی تالو سے باہر گری
لگا تیسرا ٹھونگا ایسا شدید
کہ صاحب کے سر سے نکل آئی لید
وہ بدھو چلا طعنے دیتا ہوا:
"جو سستے کے پیچھے نہ جاتے میاں
تو ماتھے پہ ٹھونگا نہ کھاتے میاں"

نیکی کا بدلہ

ترمہ آصفہ مجیب

ایک مسافر اونٹ پر سوار جا رہا تھا۔ ایک
ؤں میں اس کا گزر ہوا۔ ایک طرف جنگل میں کچھ
افلے والے آگ جلائے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی وہ
ہاں سے گئے زور کی ہوا چلی، آگ آن کی آن میں
مڑک اٹھی۔ شعلوں سے سارا جنگل لالہ زار بن گیا۔

ایک بڑا سا سانپ آگ میں گھر گیا۔ وہ
ملا تلملا کر رہ جاتا۔ کہیں سے نکلنے کا راستہ نہیں
ل رہا تھا۔ ہر طرف سے بھڑکتے شعلے خونخوار اژدہے

کی طرح منہ پھیلائے اسے نگلنے کو تیار تھے۔ قریب تھا
کہ وہیں جل بھن کر بھسم ہو جائے اتنے میں اونٹ پر سوار
مسافر نظر آیا۔ سانپ اس کو دیکھ کر سر پٹخنے لگا اور
گڑگڑانے لگا۔ جیسے کہہ رہا ہو "تمہارا بھلا ہو۔ مہربانی
کرکے مجھے اس دوزخ سے نکالو"

سوار بڑا رحم دل تھا اس سے کسی کی مصیبت
نہیں دیکھی جاتی تھی جو بن پڑتا مصیبت کے وقت
ضرور مدد کرتا اور اس سے چھٹکارا دلاتا۔ اس

جی میں سوچا سانپ تو آدمی کا دشمن ہے مگر اس وقت
رحم کے قابل ہے اس تکلیف سے اسے کسی طرح چھڑانا
چاہیے۔ نیک کاموں سے دنیا اور آخرت سنورتی
ہے۔ اس کے پاس ایک توبڑا تھا جسے بڑی ترکیب
سے نیزے میں لٹکا کر سانپ تک پہنچا دیا۔ ڈوبتے
کو تنکے کا سہارا۔ سانپ جھٹ اس میں گھس گیا۔
آگ سے نکال کر سوار نے اسے چھوڑ دیا اور بولا
"جاؤ جہاں جی چاہے۔ شکر کرو کہ تمھاری جان بچی
اور خبردار اب کبھی کسی آدمی کو نہ کاٹنا۔ اس شکرانے
میں کہ اتنی بڑی مصیبت سے تم نے آج نجات
پائی ہے اللہ کی مخلوق کو ستانا اور جان لینا چھوڑ دو۔"

سانپ نے لہرا کر پھن اٹھایا "اے جوان یہ
باتیں چھوڑو۔ جب تک تمھیں اور تمھارے اونٹ کو
کاٹ نہیں لوں گا نہیں جاؤں گا۔"

سوار چیخا "کیا میں نے تیرے ساتھ نیکی نہیں
کی؟ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر تجھے بھڑکتے
شعلوں کے بیچ سے زندہ سلامت نہیں نکالا؟ اس کا
تو مجھے یہ صلہ دے رہا ہے۔ تجھے شرم نہیں آتی میں نے
کیا کیا اور تو کیا کر رہا ہے؟"

سانپ نے اپنی زہریلی زبان نکالی "میں نے
مانا کہ تم نے بھلائی کی۔ میں کسی آدمی سے اس کی توقع
بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر بے موقع بھلائی
کوئی عقل مندی نہیں ہے۔ میرا کام تو کاٹنا ہے
تم کو تو معلوم ہے۔ تو اب اس کا نتیجہ بھی بھگتنا پڑے گا۔
دوسری بات یہ ہے کہ ہماری تمھاری پرانی عداوت
چلی آ رہی ہے۔ بھلا کوئی آدمی کبھی ہمیں زندہ چھوڑتا
ہے؟ عاقبت اندیشی یہی ہے کہ دشمن کا سر کچل دینا
چاہیے تم نے رحم کھایا مگر میں تمھیں اس لیے کاٹوں گا
کہ دوسروں کی آنکھیں کھلیں اور انھیں سبق ملے۔"

سوار کانپ اٹھا: "لعنت ہے تجھ پر۔ بھلائی کا بدلہ
برائی کس مذہب میں جائز ہے۔ کہاں کا انصاف
ہے؟ نیکی کی پاکیزگی اور ستھرائی کو تو برائی کی گندی

غلاظت میں ڈال کر ملیامیٹ کر رہا ہے۔

سانپ نے بل کھایا "ہوں میں آدمیوں کو خوب جانتا ہوں۔ وہ بھلائی کے بدلے میں برائی کرتے ہیں، تمھارے ہی نقشِ قدم پر چل رہا ہوں۔ تم سے جو سودا خریدا وہی تمھارے ہاتھ بیچ رہا ہوں۔ جیسے کو تیسا۔ بولو پہلے تمھیں کاٹوں یا تمھارے اونٹ کو۔"

سوار جھلّایا "کیا بک رہا ہے اُلٹی گنگا بہا رہا ہے۔ جھوٹ ہے بالکل جھوٹ"۔ سانپ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا کہ آدمیوں کا یہی طریقہ ہے۔ سوار انکار کر رہا تھا۔ اس نے عاجز ہو کر کہا "اگر تیری بات سچ ہے اور تو اس دعوے کے ثبوت میں کوئی گواہ لائے کہ آدمی کی عادت ایسی ہی ہے تو میں تیرا زخم کھا کر جان دینے کو تیار ہوں۔"

سانپ نے ادھر ادھر دیکھا۔ تھوڑی دور پر ایک بھینس چر رہی تھی کہا "ہاں چلو اس سے پوچھتے ہیں۔" دونوں بھینس کے پاس آئے۔ سانپ نے پوچھا:

"اے بڑی بی زرا ایک بات بتاؤ نیکی کا بدلہ کیا ہے؟"

بھینس بگڑ گئی۔ زمین پر پیر پٹخ کر بولی:

"سچ کہوں! آدمی کے یہاں بھلائی کا بدلہ برائی ہے۔ یوں کہ میں انھیں خوب جانتی پہچانتی ہوں۔ مدتوں ایک آدمی کے پاس رہی ہوں۔ ہر سال بچہ دیتی۔ دودھ، دہی، گھی سے گھر بھر دیا۔ اس سے اس کی روزی چلتی، بچے پلتے تھے۔ جب میں بوڑھی ہوئی نکال باہر کیا۔ جنگل میں پھرا کرتی ہوں اب کچھ ہی کر زرا دم آیا، رؤہت پھری تو کل وہی میرا مالک ادھر آیا دیکھا کہ میرے بدن پر کچھ گوشت چڑھا ہے، قصائی کو بلا لایا۔ بیچ کر دام کھرے کر لیے۔ بس آج کل میں مجھے مذبح میں لے جا کر مار ڈالیں گے۔ یہ ہے میری عمر بھر کی بھلائی کا بدلہ۔"

سانپ پھنکارا "سن لیا؟ اب زخم کھانے کے لیے جلد تیار ہو جاؤ۔"

سوار نے کہا "شریعت میں دو گواہ مانے جاتے ہیں۔ دوسرا گواہ لا۔"

سانپ نے نظر دوڑائی سامنے ایک گھنیرا درخت تھا۔ لمبی لمبی شاخیں ہوا سے جھوم رہی تھیں۔ اور زمین پر سایہ ڈال رہی تھیں۔ سوار سے کہا چلو اس سے پوچھ لیں۔ دونوں درخت کے نیچے آئے، سانپ نے پوچھا: "تم بتاؤ نیکی کا بدلہ کیا ہوتا ہے؟" درخت کے پتے کھڑکھڑائے آواز آئی "آدمی

نیکی کا بدلہ برائی سے دیتا ہے۔ فائدہ کے عوض نقصان پہنچاتا ہے اپنی بیتی کہہ رہا ہوں۔ مجھے دیکھو اس بیابان میں اُگا۔ پروان چڑھا۔ ایک پیر سے آدمیوں کی خدمت کے لیے کھڑا رہتا ہوں۔ تھکے ماندے آتے ہیں میرے سایہ تلے بیٹھ کر ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا میں آرام کرتے ہیں ستستاتے ہیں۔ دل و دماغ اور آنکھوں کو راحت اور سکون پہنچاتا ہوں۔ جب مجھ پر نظر ڈالتے ہیں تو کہتے ہیں" واہ وا کیا اچھا گھنا پیڑ ہے۔ فلاں شاخ سے کلہاڑی کا دستہ بڑا اچھا بن سکتا ہے۔ وہ ڈال بیل کے کام آئے گی اور اس کے تنے سے گھر کے دروازے بہت خوبصورت بن سکتے ہیں۔ اگر کلہاڑی پاس ہوئی تو بس میری شامت ہی آجاتی ہے۔ جتنی لکڑی جی چاہا کاٹ لی۔ اپنا حال کس سے کہوں کون سنتا ہے۔ مجھ سے سُکھ اٹھاتے ہیں اور مجھ ہی کو دُکھ دیتے ہیں۔ یہ تو چاہتے ہیں مجھے جڑ ہی سے اُکھاڑ پھینکیں۔"

سانپ بولا "لو اب تو دو گواہ ہو گئے اب جان دو۔" سوار نے کہا:

"جان بڑی عزیز ہوتی ہے۔ بس بھر اس سے ہاتھ نہیں دھو سکتا۔ اگر ایک گواہ اور تیرے موافق ہو تو قضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دوں گا۔"

عجیب اتفاق کہ بات تھی کہ وہاں ایک لومڑی کھڑی یہ سب حال دیکھ رہی تھی اور بڑے غور سے ان کا جھگڑا سُن رہی تھی۔ سانپ اس کی طرف بڑھا کہا "لو۔ لو! لومڑی کھڑی ہیں پوچھ لو ان سے۔ کیا جواب دیتی ہیں۔"

سوار کے کہنے سے پہلے ہی لومڑی چیخ کر بولی "ایسے بھولے نہ بنو کیا تم جانتے نہیں کہ بھلائی کا بدلہ بُرائی ہے۔ ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ آخر معلوم تو ہو کون سی بھلائی اس کے ساتھ کی جس کا تمھیں یہ بدلہ دینا چاہتا ہے۔ سوار نے جو گزری تھی سب کہہ دیا۔ لومڑی نے ہنس کر کہا۔

"آدمی عقل مند معلوم ہوتے ہو پھر کیوں بے سر پیر کی اُڑا رہے ہو۔ صحیح بات کہو۔"

سانپ نے جھوم کر سر اٹھایا "ہاں سچ کہہ رہا ہے۔ یہ جو اس کے پاس توبڑا ہے اسی میں بٹھا کر اس نے آگ سے نکالا۔" لومڑی نے غصے سے جھڑکا۔

"چل ہٹ اپنا رستہ پکڑ۔ میں آدمی نہیں ہوں جو تیرے چکموں میں آجاؤں ۔۔۔ کہاں اتنا بڑا تو

باقی صفحہ ۴۴ پر

تقاضا

جناب بزمی بھارتی

میری تقدیس میرے دل کا قرار
تیرے دم سے تھی میرے گھر میں بہار
آج تو جا رہی ہے اس گھر کو
تیری تقدیر بن چکا تھا جو
دل لرزتا ہے میرا یہ کہہ کر
آج تو جا رہی ہے اپنے گھر
چند دن کی مری رفاقت تھی
تو کسی اور کی امانت تھی
وقت نے مجھ سے جب تقاضا کیا
جس کا جو حق تھا اس کو سونپ دیا
آج وہ دن بالآخر آ ہی گیا
مجھ کو کہنا پڑا کہ ـــ بیٹی جا

میہمانی کا دَور ختم ہوا
میزبانی کا دَور ختم ہوا
میرے گھر تجھ کو کوئی سکھ نہ ملا
کھایا پہنا نہ اپنی مرضی کا
دکھ سہے اور مُنہ سے کچھ نہ کہا
جو ملا وہ خوشی سے کھایا پیا
تو نے صرف ایک بات مجھ سے کہی
ہائے وہ بھی رہی ادھوری ہی
فرض ادا کر رہا ہوں میں اپنا
یہ نہ کہنا کہ مجھ کو کچھ نہ دیا

جنمی بھارتی

محمد یوسف پاپا

تقدیس بالا

سعادت صدیقی

۶۰۰ سال پرانا واٹر ورکس

(تفصیل "ادھر ادھر سے" میں پڑھیے) بشکریہ۔ اطلاعات جرمنی

میری تقدیس میری بیٹی جا
اپنے گھر میں چراغ گھی کے جلا

اپنے گھر کو تجھے سجانا ہے
پھول کی طرح مسکرانا ہے

کوئی دکھ آئے تو نہ مرجھانا
اور خوشی میں کبھی نہ اترانا

میں نے سب کچھ بتا دیا ہے تجھے
دکھ بھی سہنا سکھا دیا ہے تجھے

بات جو حق ہو اس کو بھی کہنا
دوسروں کی خوشی میں خوش رہنا

وقت نازک ہے گم نہ ہو جانا
اپنی چادر میں پاؤں پھیلانا

ذہن پستی کی سمت بڑھنے نہ پائے
جو قدم بھی اٹھے وہ اونچا جائے

بات ایسی کبھی نہ ہونے پائے
حرف شکوہ کوئی زباں پر لائے

میری عزت کا بھی خیال رہے
اپنی عظمت کا بھی خیال رہے

یوں بتانا ہے اب تجھے جیون
جس طرح بہہ رہے ہیں گنگ وجمن

اپنے ساتھی کی روح بن جانا
یہ سہارا ہے تیرا بعدِ خدا

تیرا ساتھی ہی تیری جنّت ہے
اس کی خدمت تری عبادت ہے

ہوش مندی سے بیٹی رہنا اُدھر
میرے گھر سے ہے دور تیرا نگر

تیرا گلشن ہو اور بہاراں ہو !
تیرے گھر میں سدا چراغاں ہو

ڈائیوفینٹس کی لوح مزار

جناب خلیق انجم اشرفی

چوتھی صدی عیسوی میں ڈائیوفینٹس اسکندریہ کا مشہور حساب داں گزرا ہے۔ علم حساب اور الجبرا پر اس نے بڑی عمدہ کتابیں لکھی ہیں۔ وہ علم حساب اور الجبرا پر کتابیں تصنیف کرنے والا واحد یونانی حساب داں گزرا ہے۔ دوسرے تمام یونانی حساب داں ابتداء میں جیومیٹری کا علم جانتے تھے۔

ڈائیوفینٹس ہی وہ شخص تھا جس نے مساوات (EQUATIONS) کے علم کو ترقی دی۔ اس کے علم نے عرب اور عہد وسطیٰ کے حساب دانوں کو بڑی حد تک متاثر کیا۔ اس حساب داں کی لوح مزار پر ایک عجیب سی عبارت لکھی ہے :—

"یہاں ڈائیوفینٹس دفن ہے۔ ایک قابل دید عجوبہ —— یہ پتھر اس کی عمر اس کے فن کے ذریعہ بتاتا ہے اس کی عمر کا چھٹا حصہ اسے بچپن کا ملا۔ عمر کا $\frac{1}{12}$ حصہ اسے اپنی داڑھی اگانے میں لگا۔ عمر کا $\frac{1}{7}$ حصہ اور گزارنے کے بعد اس نے اپنا بیاہ رچایا۔ پانچ سال گزارنے کے بعد قدرت نے اسکے ہاں ایک لڑکا پیدا کیا۔ یہ لڑکا جسے والدین کا ڈھیروں پیار نصیب ہوا، باپ کی آدھی عمر کو پہنچ کر عالم بالا کو سدھار گیا۔ اور پھر عمر کے وہ چار دکھ بھرے سال (جن کی شدت کو حساب کی رنگینیوں نے بڑی حد تک کم کر دیا تھا) گزارنے کے بعد وہ خود بھی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔"

بظاہر یہ پورا کتبہ کسی مجذوب کی بڑ لگتا ہے۔ مگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو پورا کتبہ قدم بہ قدم الجبرا کی ایک مساوات (EQUATION) میں ڈھل جاتا ہے۔

ہم ڈائیوفینٹس کی عمر جاننا چاہتے ہیں۔ یہ ہماری

مساوات کا انجانا عدد یعنی مساوات کا 'x' ہو گیا۔ اس لیے ڈائیوفینٹس کے بچپن کا زمانہ $\frac{x}{6}$ سال ہوا۔ داڑھی اگانے کا عرصہ $\frac{x}{12}$ سال رہا $\frac{x}{7}$ کا عرصہ ایک نوجوان کنوارے کی حیثیت سے گزارنے کے بعد اس نے شادی کی شادی کے پانچ سال بعد اس کے یہاں لڑکا پیدا ہوا۔ اس کا لڑکا اس کی نصف عمر یعنی $\frac{x}{2}$ سال تک زندہ رہنے کے بعد انتقال کر گیا اور باپ (ڈائیوفینٹس)، بیٹے کی موت کے چار سال بعد تک زندہ رہنے کے بعد 'x' سال کی پختہ عمر میں اس دنیا سے سدھارا۔

اتنا سب جاننے کے بعد ہم اپنی مساوات کو مندرجہ ذیل طریقہ پر لکھ سکتے ہیں (دائیں سے بائیں پڑھیے)

$$\frac{x}{6} + \frac{x}{12} + \frac{x}{7} + ۵ + \frac{x}{2} + ۴ = x$$

نسب نما کے اعداد کا ذو اضعاف اقل ۸۴ ہے اس لیے مساوات کے قاعدہ کی رو سے اس مساوات کی دونوں طرفوں کو ۸۴ سے ضرب کر دیا۔ اس طرح ہمیں مندرجہ ذیل مساوات حاصل ہوئی۔

$$۱۴x + ۷x + ۱۲x + ۴۲۰ + ۴۲x + ۳۳۶ = ۸۴x$$

یا $۷۵x + ۷۵۶ = ۸۴x$

یا $۷۵۶ = ۸۴x - ۷۵x$

یا $۷۵۶ = ۹x$

یا $x = \frac{۷۵۶}{۹}$

یا $x = ۸۴$

یعنی ڈائیوفینٹس کل ۸۴ سال زندہ رہا۔ اس عمر کے $\frac{1}{6}$ حصہ یعنی ۱۴ سال تک ایک لڑکا رہا۔ عمر کا $\frac{1}{12}$ حصہ یعنی مزید سات سال اس نے داڑھی اگانے یا عنفوانِ شباب میں گزارا۔ پھر عمر کا $\frac{1}{7}$ حصہ یعنی ۱۲ سال اور گزار کر کل ۲۱ + ۱۲ = ۳۳ سال کی عمر میں شادی کر لی شادی کے پانچ سال بعد یعنی ۳۸ سال کی عمر میں اس کے لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکا باپ کی عمر یعنی ۴۲ سال کا ہو کر اس وقت مرا جب باپ کی عمر ۸۰ سال تھی۔ باپ بیٹے کی موت کے چار سال تک زندہ رہ کر ۸۴ سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے سدھار گیا

یہ ہے ڈائیوفینٹس کی عجیب وغریب لوحِ مزار کا حل۔ ــــــــــــ

جناب عبدالرزاق بیگ بمبئی

نیکوں کی نیک باتیں

قرض معاف کردیا

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ساتھی (صحابی) تھے حضرت قیسؓ بہت سے لوگوں پر ان کا قرض تھا۔ ایک بار وہ بیمار ہوئے۔ لوگ ان کی عیادت یا بیمار پرسی کے لیے آتے ہوئے جھجکتے تھے شرماتے تھے۔ حضرت قیسؓ کو یہ بات معلوم ہوئی۔ انھوں نے اعلان کرا دیا کہ جن لوگوں کے ذمے میرا قرض ہے میں نے سب معاف کر دیا۔ یہ اعلان ہوتے ہی لوگ اس کثرت سے آنے لگے کہ جس بالا خانے میں رہتے تھے اس کا زینہ ٹوٹ گیا۔

کفن بانٹ دیا

اُحد کی لڑائی میں آنحضرت کے چچا حضرت حمزہؓ شہید ہوئے تو ان کی بہن حضرت صفیہؓ نے اپنے صاحبزادے حضرت زبیرؓ کو ان کے کفن کے لیے دو چادریں دیں۔ حضرت حمزہؓ کو کفن پہنایا جا رہا تھا تو حضرت زبیرؓ نے دیکھا کہ حضرت حمزہ کے پہلو میں ایک انصاری کی لاش ہے۔ اور بے کفن ہے۔ حضرت زبیرؓ نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ حضرت حمزہؓ کو تو دو چادریں پہنائی جائیں اور دوسرے بھائی بے کفن رہیں۔ انھوں نے ایک چادر ان کے لیے دے دی پھر حضرت حمزہؓ کے لیے ایک چادر کافی نہ ہوئی۔ سر چھپایا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے پاؤں چھپائے جاتے تو سر ننگا ہو جاتا۔ آنحضرت نے دیکھا تو فرمایا چادر سے چہرہ ڈھانک دیا جائے۔ پیروں پر گھاس ڈال دی جائے۔

نفع کا سودا

ایک صحابی اپنے باغ کی دیوار بنوانا چاہتے تھے۔ بیچ میں ایک دوسرے آدمی کا درخت تھا۔ دیوار بنانے والے نے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یہ درخت مجھے دلوا دیجیے تاکہ میری دیوار سیدھی بن سکے مگر درخت کا مالک کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا۔ آنحضرت نے اس سے فرمایا کہ اگر یہ درخت دے دو تو جنت میں تمھیں بہت سے درخت ملیں گے۔

ایک اور صحابی حضرت ثابتؓ کو یہ بات معلوم ہوئی تو آنحضرت کی خواہش کو پورا کر کے جنت الفردوس میں باغ حاصل کرنے کی خواہش نے بے تاب کر دیا۔ فوراً درخت کے مالک کے پاس پہنچے اور اس سے کہا کہ میرا باغ لے لو اور اس کے عوض یہ درخت مجھے دے

بات طے ہوگئی تو حضرت ثابت آں حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ میں نے یہ سودا کیا ہے اور یہ درخت دیوار بنانے والے کے حوالے کر دیجیے۔ آں حضرتؐ یہ سن کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ ثابتؓ کے لیے جنت میں کتنے ہی درخت ہیں۔ اس کے بعد حضرت ثابتؓ اپنی بیوی کے پاس پہنچے اور کہا کہ یہاں سے نکل چلو۔ میں نے یہ باغ جنت کے درختوں کے بدلے میں بیچ دیا ہے۔ ان کی نیک بیوی نے بہت خوشی ظاہر کی اور کہا کہ یہ بہت نفع کا سودا ہے۔

آپ زندہ ہیں تو سب غم آسان ہیں

اُحد کی لڑائی میں مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا۔ بڑے بڑے صحابہ اس لڑائی میں شہید ہوئے۔ لڑائی کے دوران یہ افواہ پھیل گئی کہ نصیب دشمناں آنحضرت نے شہادت پائی ہے۔ مدینے کی عورتیں گھبرا کر گھروں سے نکل کر باہر راستے پر آ کھڑی ہوئیں کہ کسی آتے جاتے سے آنحضرت کی خیریت معلوم کریں۔ ایک شخص اُحد کے میدان کی طرف سے آتا ہوا دکھائی دیا۔ ایک انصاری عورت نے آنحضرت کی خیریت پوچھی مگر انھوں نے بجائے سیدھا جواب دینے کے اس کے باپ کی شہادت کی خبر سنائی۔ عورت نے اس خبر پر کوئی توجہ نہ کی۔ اور پہلا سوال دُہرایا۔ وہ بولا تمھارا بھائی بھی شہید ہو چکا ہے۔ عورت نے اس خبر کو بھی اہمیت نہ دی اور پھر وہی سوال دُہرایا۔ ان صاحب نے بجائے صحیح جواب دینے کے اس کے خاوند کی شہادت کی خبر سنائی۔ عورت بے چین ہو کر بولی کہ مجھے تو تم یہ بتاؤ کہ خدا کے رسول کا کیا حال ہے۔ اور جب اس آدمی نے یہ بتایا کہ خدا کے رسول خدا کے فضل سے خیریت سے ہیں تو اس کی جان میں جان آئی اور بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا "آپ زندہ ہیں تو سب غم آسان ہیں"۔

اللہ کے رسول کو تکلیف نہ پہنچے

حضرت سعد بن ربیع احد کی لڑائی میں سخت زخمی ہو گئے تھے۔ آنحضرت نے ایک شخص کو ان کا حال دریافت کرنے بھیجا۔ بڑی مشکل سے حضرت سعد تک پہنچے وہ اس وقت نزع کے عالم میں تھے۔ صحابی نے کہا کوئی پیغام ہو تو فرمائیے۔ حضرت سعدؓ کو اس وقت نہ بیوی بچے یاد آئے نہ ماں باپ یاد آئے اور کہا تو یہ کہا "مسلمانوں کو میرا سلام پہنچا دینا اور کہنا کہ اگر تمھاری زندگی میں آنحضرت کو کوئی تکلیف پہنچ گئی تو یاد رکھو اللہ کے دربار میں تمھارا کوئی عذر قبول نہ ہوگا۔ اور تمھیں سخت پشیمانی ہوگی" اتنا کہہ پائے تھے کہ روح جنت کو سدھار گئی۔

رسول کے پیر میں کانٹا چبھنا بھی گوارا نہیں

حضرت زید کو مکّے کے کافروں نے قید کر لیا تھا۔ اور آخر انھیں پھانسی دے دی گئی۔ جب آپ کی حالت نازک ہو گئی موت کا وقت قریب آ گیا تو ایک کافر نے بڑے طنز سے کہا۔ اگر اس وقت تمھاری جگہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہمارے قبضے میں ہوتے تمھاری کیا حالت ہوتی۔ حضرت زید نے جواب دیا۔ خدا کی قسم آنحضرت کا تمھارے قبضے میں آنا تو دور کی بات ہے میں تو یہ بھی گوارا نہیں کر سکتا کہ آپ کے پیر میں کانٹا چبھے اور میں خاموش بیٹھا رہوں۔ ابوسفیان ابھی تک مسلمان نہیں ہوئے تھے یہ سن کر عش عش کر اٹھے اور کہنے لگے محمدؐ کے ساتھی آپ سے جتنی محبت کرتے ہیں اس کی مثال نہیں۔

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی

کہانیاں

(۲)

بندر کی کہانی :-

کرکٹ نے دمنک کو بندر کی کہانی اس طرح سنانی شروع کی۔

کسی گاؤں میں ایک مندر بن رہا تھا۔ بہت سے راج مزدور اور کاریگر اس کام میں لگے ہوئے تھے۔ کہیں پتھر کاٹے جا رہے تھے تو کہیں بڑی لکڑیوں کو چیر کر دروازے وغیرہ بنا رہے تھے۔ دوپہر کو یہ سب کاریگر بستی میں آجاتے کچھ کھاتے پیتے دم بھر ستاتے اور پھر کام پر لوٹ جاتے۔

ایک دن دوپہر کے وقت جنگل سے بندروں کا ایک غول کا غول ادھر آ دھمکا۔ راج مزدور کھانا کھانے بستی میں چلے گئے تھے۔ ان بندروں نے میدان صاف دیکھا تو خوب دھما چوکڑی

بھائی کسی نے صندل کی ادھ بنی دیوار پر سے چھلانگیں لگانی شروع کر دیں۔ کوئی سنگ تراش کے اوزاروں سے جا الجھا۔ پاس ہی ایک ادھ چرا شہتیر پڑا تھا۔ بڑھئی اسے چیرتے چیرتے بیچ ہی میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اور اس ادھ چیرے شہتیر میں کیل پھنسا دی تھی۔

ایک بندر میاں شہتیر میں پھنسی ہوئی اس کیل سے جا الجھے۔ یہ چیز انھیں عجیب و غریب معلوم ہوئی وہ اس ادھ چرے شہتیر پر جا کر بیٹھ گئے اور پورا زور لگا لگا کر کیل کو نکالنے لگے۔ کیل کافی مضبوطی سے پھنسی ہوئی تھی۔ مگر بندر میاں پر بھی ضد سوار ہو گئی ملسے نکالنے کے لیے بدن کا سارا زور لگا دیا۔ کیل تو جیسے تیسے نکل گئی۔ پر بندر میاں خود اس پھٹے شہتیر کے بیچ میں جا پھنسے۔ ایسے پھنسے کہ ہزار کوشش پر نکل نہ پائے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔

پرائے پھٹے میں پیر نہ ڈالو:

یہ کہانی سنا کر

کرکٹ نے دمنک کو ہوشیار کرتے ہوئے کہا:۔

اسی لیے میں کہتا ہوں کہ دوسروں کی باتوں میں بے جا دخل نہیں دیتے شیر کے شکار کا بچا کھچا حصہ ہمیں پیٹ بھرنے کے لیے مل ہی جاتا ہے پھر ہمیں کسی کے پھٹے میں پیر ڈالنا کیا ضرور!

دمنک بولا:۔ اے کرکٹ تجھے تو بس ہر وقت اپنے کھانے ہی کی فکر رہتی ہے۔ مالک تیرے لیے جو ٹکڑا چھوڑ ہی دیتا ہے۔ مالک کی پریشانی، مصیبت اور تکلیف کا بھی تو کچھ خیال کیا کر۔ نہ جانے انھیں کیا پریشانی ہے۔ ہمیں ان کا بھلا بھی تو سوچنا ہے۔

کرکٹ بول پڑا:۔ بھلا ہمارے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ ہمارا شمار اس کے خاص مشورہ دینے والوں میں تو کیا ادنیٰ مدد گاروں میں بھی نہیں ہے۔ بغیر کچھ پوچھے کسی کو مشورہ دینا بیوقوفی کی علامت ہے۔ اس سے بہت ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔

دمنک نے کہا:۔ یہ بڑے چھوٹے عہدوں کی بات رہنے دو۔ جو بھی مالک کی خدمت اچھی طرح کرے گا۔ وہ اس کا چہیتا بن جائے گا۔ ترقی کرتے کرتے پردھان بن جائے گا۔ جو خدمت نہیں کرے گا۔ وہ بڑے عہدوں سے بھی گرا دیا جائے گا۔ بادشاہوں کا یہی دستور ہے کہ وہ پاس رہنے والوں ہی کو اپناتے ہیں۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ بیل بوٹوں کا بھی یہی دستور ہے۔

کرکٹ بولا:۔ تو پھر کیا کیا جائے۔ تم جو چاہتے ہو صاف صاف کہہ دو۔

دمنک نے جواب دیا:۔ آج ہمارا مالک کافی ڈرا ہوا ہے سہما ہوا ہے۔ میں اس ڈر کی وجہ معلوم کرتا ہے اور سوجھ بوجھ سے کام لے کر اس ڈر سے نجات پانے کا اسے کو مشورہ دیتا ہے۔

کرکٹ :- یہ تمھیں کیسے پتہ چلا کہ ہمارا مالک آج ڈرا ہوا ہے۔

دمنک :- یہ پتہ چلانا کوئی مشکل کام نہیں۔ کسی کے دل کی بات چھپی نہیں رہتی۔ چہرے کے اُتار چڑھاوے بات چیت کے انداز سے حرکات و سکنات سے، آنکھوں کے کھنچاؤ سے اس کا اندازہ اچھی طرح ہوجاتا ہے۔ آج ہمارا مالک کافی سہما ہوا ہے۔ اس کا ڈر دور کر کے ہم اسے اپنے قابو میں کر سکتے ہیں اور تب وہ ہمیں اپنا خاص مشیر (مشورہ دینے والا) بنا لے گا۔

کرکٹ نے اپنی عقل لڑائی :- دمنک تو شاہی آداب بالکل نہیں جانتا۔ بھلا تو شہنشاہ کو کیسے اپنے بس میں کرے گا۔

دمنک :- میں نے تو اپنے پتا سے یہ سارے گر کھیل ہی کھیل میں بچپن میں سیکھ لیے ہیں۔ شاہی آداب ایک فن ہے۔ ایک ہنر ہے اور یہ ہنر میں خوب جانتا ہوں۔

یہ کہہ کر دمنک شاہی آداب کے اصول بتانے لگا۔ بادشاہ کو مطمئن کرنے اور اس کی نگاہ میں عزت حاصل کرنے کے بہت سے گر بھی سمجھائے۔ کرکٹ دمنک کی عقل مندی پر حیران رہ گیا۔ اس نے دمنک کی بات مان لی دونوں شیر کے دربار کی طرف چل پڑے۔

گیدڑ شیر کے دربار میں :- دمنک کو آتا دیکھ کر پنگ لک (شیر) دربان سے بولا۔ ہمارے پچھلے وزیر کا بیٹا دمنک آرہا ہے۔ اسے بے روک ٹوک میرے پاس آنے دو۔

دمنک شاہی دربار میں آکر پنگ لک کو آداب بجا لایا اور اپنی مقررہ جگہ پر بیٹھ گیا۔

پنگ لک نے خاص شاہانہ انداز میں اپنا دایاں ہاتھ بڑا اٹھا کر دمنک سے خیریت پوچھی اور بولا۔ کہو دمنک خیریت تو ہے۔ بہت دنوں بعد صورت دکھائی۔ کوئی خاص بات ہے؟

دمنک نے عرض کیا: ۔ خاص بات تو کچھ بھی نہیں۔ پھر بھی غلام کو آقا کی بھلائی کی بات کہنے کے لیے خود ہی حاضر ہونا چاہیے۔ راجہ کے پاس بھلے بُرے سبھی طرح کے غلام ہیں اور بادشاہ کے لیے سبھی کام کے ہیں۔ وقت پر تنکے کا سہارا بھی بہت ہوتا ہے۔ غلام کی تو بات ہی کیا ہے۔

آپ نے بہت دنوں میں آنے کی جو شکایت کی ہے تو اس کی بھی وجہ ہے۔ جہاں شیشے کی جگہ ہیرا اور ہیرے کی جگہ شیشہ جڑا جائے وہاں اچھے غلام نہیں ٹھہرتے جہاں کسوٹی نہ ہو وہاں رتنوں کی قدر و قیمت نہیں آنکی جا سکتی۔ غلام اور آقا ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ دونوں کا ایک دوسرے پر دارومدار ہے۔ انحصار ہے۔ انھیں ایک دوسرے کی عزت کرنی چاہیے۔ بادشاہ تو خوش ہو کر غلام کو صرف عزت بخشتے ہیں۔ مگر غلام آقا سے خوش کر اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔

پنگ لک (شیر) دمنک گیدڑ کی باتوں سے خوش ہو کر بولا۔ تو تو ہمارے پرانے وزیر کا بیٹا ہے جو کچھ کہنا ہے بے جھجک کہہ دے۔

دمنک میں آپ سے تنہائی میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ راز (بھید) کی بات چھ ہی کانوں میں محفوظ رہ سکتی ہے چھے کانوں میں کوئی راز راز نہیں رہ جاتا۔

تب پنگ لک نے اشارے سے ریچھ، چیتے، اژدہا، بگھے وغیرہ سب جانوروں کو دربار سے باہر بھیج دیا۔ دربار میں خاموشی چھا گئی۔ دمنک نے شیر کے کانوں کے پاس منہ لے جا کر سوال کیا۔

شیر کیوں ڈر گیا تھا۔

دمنک: ۔ مہاراج جب آپ پانی پینے گئے تھے۔ تو بنا پانی پیے پیاسے ہی کیوں لوٹ آئے تھے؟

شیر (ذرا پھیکی ہنسی، ہنستے ہوئے بولا) کچھ بھی نہیں۔

دمنک گیدڑ موقع سے فائدہ اٹھا کر بولا۔ مہاراج وہ بات کہنے کے قابل نہیں تو مت کہیے۔ سبھی باتیں کہنے کے لائق نہیں ہوتیں۔ کچھ باتیں تو اپنی بیوی سے بھی چھپائی جاتی ہیں۔ کچھ باتیں بیٹوں سے بھی چھپائی جاتی ہیں۔ یہ باتیں لاکھ اصرار کرنے پر بھی کسی کو نہ بتانی جائیں۔

شیر نے سوچا دمنک تو عقل مند معلوم ہوتا ہے۔ کیوں نہ اس سے دل کی بات کہہ دی جائے۔ یہ سوچ کر وہ بولا دمنک، یہ دور سے پھنکار کی جو آواز آ رہی ہے

کیا تمھیں سنائی دے رہی ہے۔

دمنک نے کہا:۔ ہاں سنائی تو دے رہی ہے۔ مہاراج مگر اس سے کیا ہوا ؟

پنگ لک:۔ دمنک اب میں اس جنگل کو خیرباد کہنے کی سوچ رہا ہوں۔

دمنک:۔ کیوں مہاراج ؟

پنگ لک:۔ جنگل میں کوئی دوسرا طاقتور جانور آگیا ہے۔ یہ بھیانک آواز اسی کی گرج سے پیدا ہو رہی ہے۔ وہ خود بھی اپنی آواز کی طرح بہت بھیانک ہوگا اور اتنا ہی بہادر اور شہ زور ہوگا۔

دمنک:۔ مہاراج اونچی آواز سے ڈرنا مناسب نہیں۔ بھیری، مردنگ، سنکھ وغیرہ بہت سے باجے ہیں ان کی آوازیں بہت اونچی ہوتی ہیں، مگر ان سے کون ڈرتا ہے۔ یہ جنگل آپ کے باپ دادا کی میراث ہے۔ وہ یہیں راج کرتے رہے ہیں مہاراج۔ اس جنگل کو چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ دیکھیے ڈھول کتنے زور سے بجتا ہے۔ پڑ دو گومایو کو اس کے اندر جاکر ہی پتہ چلا کہ وہ اندر سے بالکل خالی تھا

پنگ لک:۔ یہ گومایو کا کیا قصہ ہے

دمنک:۔ ابھی سناتا ہوں۔ ہر ذرا توجہ سے سنیے مہاراج۔

(گومایو" کی دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں)

بقیہ صفحہ ۳۰

جیسے شیطان کی آنت کہاں یہ ننھا سا توبڑا۔ بھلا تو کیسے اس میں سما گیا۔ کیسے یقین کروں ...... خدا کے عذاب سے ڈر۔"

سانپ سٹپٹایا پیچ و تاب کھاکر بولا "بیٹھ کر دکھا دوں تب تو یقین کروگی ؟

اس نے کہا" ہاں اپنی آنکھ سے دیکھ لوں تو مانوں گی۔ پھر ایسا سچا فیصلہ کروں گی کہ اس میں رو رعایت کا دخل نہ ہوگا۔ دودھ کا دودھ پانی کا پانی۔ لگی لپٹی نہیں رکھوں گی۔"

سوار نے پھرتی سے توبڑا سانپ کے سامنے کر دیا۔ وہ لومڑی کی باتوں میں آکر بڑے غرور کے ساتھ توبڑے میں سما گیا۔ لومڑی نے سوار کو اشارہ کیا اور بولی:

"اے جوان دشمن جب قابو میں آجائے تو چھوڑنا نہیں چاہیے۔"

سوار نے توبڑے کا منہ بند کر دیا۔ سانپ کو اتنا مارا کہ اس کا کچومر نکل گیا۔ اور بہت سی مخلوق کو اس کے ضرر سے بچا لیا۔

جناب سید محمد شفیع تمنّا کلکتوی

ساجن کے گھر چلی بندریا

ساجن کے گھر چلی بندریا آج دُلھنیا بن کے
مُنہ پر ہے مسکان خوشی کی پاؤں میں گھونگھر چھنکے
ملی جو بوڑھے بندر کو یہ سُندری دُلھنیا
جھوم اُٹھے پھر کیوں نہ خوشی سے اس کے من کی دُنیا
مونچھوں پر کیوں ہاتھ نہ پھیرے چلے نہ کیوں تن تن کے
ساجن کے گھر چلی بندریا آج دُلھنیا بن کے
سر پہ دوپٹہ لال، پہنے گھگھری نیلی پیلی
دیکھو بن گئی آج بندریا دُلھن نئی نویلی

پگ پگ تال جماتی جائے گائے گیت مِلن کے
ساجن کے گھر چلی بندریا آج دُلھنیا بن کے
قدم قدم پر کہتی جائے بےچاری بانریا
اب ہے تمھارے ہاتھ مرے گھونگھٹ کی لاج سنوریا
تم ہی تو اب ساتھی ٹھہرے جیون اور مَرن کے
ساجن کے گھر چلی بندریا آج دُلھنیا بن کے

جب ابا جان چھوٹے تھے تو انھیں سرکس دکھایا گیا۔ یہ سرکس بہت دل چسپ تھا۔ ابّا جان کو شیر کو رام کرنے والا بہت پسند آیا۔ وہ بہت اچھا لباس پہنے ہوئے تھا "شیروں کو رام کرنے والے" میں کتنی کشش تھی اس سے سارے شیر اور شیر ببر ڈرتے تھے۔ اس کے پاس ایک کوڑا اور ایک تمنچہ بھی رہتا تھا لیکن وہ انھیں بہت کم استعمال کرتا تھا۔

وہ سرکس کے دائرے سے چلا کر کہتا: "جانور میری آنکھوں سے ڈرتے ہیں۔ میری آنکھیں ہی میرا سب سے بڑا ہتھیار ہیں۔ کوئی خوں خوار جانور آدمی کی آنکھوں

کی تاب نہیں لاسکتا۔"

وہ سچ کہتا تھا۔ اس لیے کہ جیسے ہی اس کی نظریں شیر ببر پر پڑتیں وہ اونچے تختوں پر بیٹھ جاتے پتلیوں کو پھاند جاتے۔ بے بس و حرکت زمین پر لیٹ جاتے جیسے بے جان لاش اور یہ سب کچھ اس لیے کہ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لاسکتے تھے۔

وہاں بگل بجتے۔ ہر آدمی تالیاں بجاتا شیروں کے رام کرنے والے کو گھورتا اور وہ خود بانہوں کو سینے پر رکھ کر ہر طرف جھک جھک کر سلام کرتا۔ بڑا لطف آتا۔ ابّا جان نے طے کرلیا کہ وہ بھی شیروں کو رام کریں گے۔ انھوں نے سوچا کہ شروع ایسے جانوروں سے کرنا چاہیے۔ جو کم خطرناک ہوں۔ ابّا جان ٹھہرے ننھے منّے سے، پر انھوں نے ٹھیک ہی سمجھا تھا کہ شیروں اور شیر ببر کو نوسکھیے رام نہیں کرسکتے۔ کتّے سے یہ کام شروع کیا جائے وہ بھی چھوٹے کتّے سے۔

اتفاقاً ایسا موقع ابّا جان کو جلد ہی مل گیا۔

پاوالوداپوساد کے چھوٹے سے شہر میں ایک پارک تھا۔ وہیں پر تھا جہاں آجکل بہت بڑا پارک بن گیا ہے دادی جان ابّا جان کو اکثر وہیں ٹہلانے لے جایا کرتی تھیں۔ ایک دن ابّا جان کھیل رہے تھے اور دادی جان بنچ پر بیٹھی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ پاس ہی ایک دوسری بنچ پر ایک اور عورت بیٹھی تھی۔ اس کے پاس ایک چھوٹا سا سفید کتّا تھا جس کی آنکھیں بالکل کالی تھیں۔ وہ ابّا جان کو گھور رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو: "مجھے رام کرنے کی بہت سخت ضرورت ہے۔ ننھے میاں آئیے مجھے رام کیجیے۔ مجھ میں انسانی آنکھوں کی تاب نہیں۔"

ابّا جان نے روشن پارک کی تاک کتّے کو رام کریں دادی جان کتاب پڑھ رہی تھیں اور وہ دوسری عورت بھی کتاب پڑھ رہی تھی دونوں میں سے کسی نے یہ نہیں دیکھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ کتّا بنچ کے نیچے اطمینان سے لیٹا تھا اور ابّا جان کو اپنی کالی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ ابّا جان اس کے قریب بہت دھیرے سے پہونچے اور سوچنے لگے: "اُف وہ تو میری آنکھوں کی تاب لاسکتا ہے۔ مجھے شیر ہی سے ابتدا کرنا چاہیے تھی۔ ایسا لگتا ہے کتّا رام ہونے کے لیے تیار نہیں۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔"

اس دن گرمی کافی تھی۔ ابّا جان نے ننگے پیروں پر خالی سینڈل پہن رکھی تھی۔ ابّا جان قریب سے قریب تر آتے گیے لیکن وہ کتّا چپ چاپ لیٹا رہا اور انھیں تکتا رہا جب ابّا جان بہت قریب آگئے تو وہ ایک دم اچھلا اور ابّا جان کے پیٹ میں کاٹ کھایا۔ بس ایک ہنگامہ برپا ہوگیا ابّا جان چیخنے لگے، دادی جان چیخ رہی تھیں، کتّے کی مالک بھی چلا رہی تھی اور وہ کتّا زور زور سے بھونک رہا تھا۔ ابّا

جان نے چلا کر کہا۔

"باپ رے باپ اس کتے نے مجھے کاٹ لیا۔"

"اس نے بچے کو کاٹ لیا" دادی جان چلائیں۔

"اس لڑکے نے ضرور اسے چھیڑا ہوگا۔ میرا کتا کاٹتا نہیں ہے" کتے کی مالکہ چلا رہی تھی۔

اور تم اچھی طرح سمجھ سکتے ہو کہ کتا کتنا چلا رہا تھا۔

لوگ ہر طرف سے بھاگے چلے آرہے تھے۔ وہ سب چلا رہے تھے "غضب ہوگیا بڑا غضب ہوگیا۔"

پارک کا رکھوالا بھی آگیا اور اس نے دریافت کیا

"پیارے لڑکے کیا تم کتے کو چھیڑ رہے تھے؟"

"نہیں بالکل نہیں" ابا جان نے جواب دیا "میں تو اسے رام کر رہا تھا۔"

"اس کو تم کس طرح رام کرنا چاہتے تھے؟"

"میں اس کی طرف بڑھتا گیا اور اسے گھورتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ انسانی آنکھوں کی تاب نہیں لا سکتا۔"

سب لوگ ہنسنے لگے۔

"سنیے" عورت بولی "قصور لڑکے ہی کا ہے۔ اس سے کس نے کہا تھا کہ وہ میرے کتے کو رام کرے۔"

دادی جان دم بخود تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ وہ چپ تھیں پارک کے رکھوالے نے کہنا شروع کیا۔

"محترمہ آپ نے وہ نوٹس پڑھا ہے۔ اس پر لکھا ہے "کتوں کا لانا منع ہے" یہ نہیں لکھا ہے کہ "بچوں کا لانا منع ہے"۔ میں ان خاتون پر ضرور جرمانہ کرتا۔ لیکن اب آپ پر جرمانہ کروں گا۔ مجھے آپ سے پارک کو چھوڑنے کی درخواست کرنی پڑے گی۔ یہ لڑکا کھیل رہا تھا اور آپ کا کتا کاٹتا ہے یہاں کھیلنے کی اجازت ہے کاٹنے کی نہیں۔" پھر ابا جان کو مخاطب کرکے "صاحبزادے کھیلنے کے وقت ذرا دماغ استعمال کیا کرو۔ کتا یہ نہ جانتا تھا کہ تم کس لیے اس کی طرف جا رہے ہو۔ ہو سکتا ہے وہ سمجھا ہو کہ تم اس کی طرف اس کو کاٹنے آرہے تھے۔ سمجھے؟"

"جی ہاں" ابا جان نے جواب دیا۔ اب وہ شیر کو رام کرنے کے خواہش مند نہ تھے۔ انجکشن لینے کے بعد انھوں نے طے کر لیا تھا کہ یہ مشغلہ بہت خراب ہے۔ اب ابا جان کا خیال رام کرنے کے بارے میں بالکل بدل چکا تھا۔ جب ابا جان کی ملاقات اک اور لڑکے سے ہوئی اس نے ایک کتے کی بھنویں کھینچ لی تھیں دونوں ایک دوسرے کی بات خوب سمجھ گئے۔ کتے نے ان حضرت کے گال پر کاٹا تھا — پیٹ میں نہیں۔ لیکن انجکشن ان کو بھی پیٹ ہی میں لینے پڑے تھے۔

برائی کا بدلہ

ترجمہ — عرب کی ایک لوک کہانی۔

رئیس فاطمہ۔ بی۔ اے سال دوم
علی گڈھ

ایک غریب لڑکا سڑک کے کنارے بیٹھا روٹی کھا رہا تھا۔ اس نے تھوڑی دور آگے ایک کتا سوتا ہوا دیکھا۔ لڑکے نے اس کتے کو آواز دی۔ جب وہ قریب آگیا تو لڑکے نے اپنے ہاتھ میں ایک نوالہ لے کر اس کی طرف بڑھایا کتا روٹی کو لینے کے لیے لڑکے کے اور قریب آگیا لیکن لڑکے نے اسے روٹی کا نوالہ تو دیا نہیں اس کے سر پر زور سے ڈنڈا مار دیا۔ کتا بے چارا چیختا چلاتا بھاگا۔

اتفاق سے اس وقت ایک آدمی اپنی کھڑکی سے جھانک رہا تھا۔ اور سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ اپنے پیچھے ایک ڈنڈا چھپا کر وہ باہر دروازے پر آیا اور اس لڑکے کو پیسے دکھا کر آواز دی۔ لڑکا بھاگ کر اس آدمی کے پاس آیا اور اپنا ہاتھ پیسے لینے کے لیے آگے بڑھایا۔ اس آدمی نے اسے پیسہ تو دیا نہیں ہاں پیسوں کی بجائے اپنا ڈنڈا زور سے ہاتھ پر مارا۔ چوٹ بہت سخت آئی۔ وہ درد کی شدت سے کتے سے بھی زیادہ چلانے لگا۔ اس نے اس آدمی سے پوچھا "تم نے مجھے کیوں مارا جب کہ میں نے تم سے کوئی چیز نہیں مانگی تھی" آدمی نے جواب دیا "اور تم نے اس کتے کو کیوں مارا۔ اس نے بھی تم سے کوئی چیز نہیں مانگی تھی۔"

جناب [illegible] صدیقی

چاند میں خرگوش

یونانی لوک کہانی

ہزاروں سال پُرانی بات ہے، یونان میں ایک سرسبز و شاداب جنگل تھا۔ اس جنگل میں طرح طرح کے جانور رہا کرتے تھے۔ اس زمانے میں جانوروں میں آپس میں بڑی محبت ہوتی تھی اور وہ ایک دوسرے کا شکار نہ کرتے تھے۔

اسی جنگل میں ایک چشمہ تھا، چشمے کے آس پاس کی جگہ بڑی خوب صورت تھی، جگہ جگہ پھول کھلے ہوئے تھے اور ہری ہری گھاس اُگی ہوئی تھی۔ چشمے کے ایک کنارے چار دوست، ایک لنگور، ایک گیدڑ، ایک اود بلاؤ اور ایک خرگوش رہا کرتے تھے۔

چاروں جانور بہت نیک، سیدھے اور رحم دل تھے۔ وہ ایک دوسرے سے بہت محبّت کرتے تھے اور ایک دوسرے کے دُکھ سکھ میں شریک رہتے تھے۔ دوسروں کی بھلائی کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور کوئی کسی کو نہ ستاتا تھا وہ چاروں بہت آرام اور سکون کے ساتھ زندگی گزار رہے تھے۔ خرگوش ان میں سب سے زیادہ شریف اور نیک طبیعت کا تھا۔ اس لیے وہ ان کا سردار تھا اور سب اس کی بات بہت مانتے تھے۔

ایک دن کا ذکر ہے، چشمے کے کنارے سبزے پر چاروں دوست بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے، رات کا وقت تھا، چاندنی پھیلی ہوئی تھی، موسم بہت خوشگوار تھا۔ چاروں دوست دوسرے کی بھلائی کے کاموں کے لیے صلاح مشورہ کر رہے تھے۔ خرگوش نے رائے دی۔

"کل ہم لوگوں کو کوئی ایسا کام کرنا چاہیے کہ ہمارا نام دنیا میں امر ہو جائے .... لوگ ہمیں عزت و احترام کے ساتھ یاد کریں اور ان میں دوسروں کے ساتھ نیکی، ہمدردی، بھلائی اور محبت کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔"

گیدڑ، اود بلاؤ اور لنگور خرگوش کی اس بات سے بہت خوش ہوئے اور اس پر عمل کرنے کا وعدہ کرتے ہوئے سو گئے۔ صبح جب ان کی آنکھ کھلی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک فرشتہ صورت انسان سبزے پر بیٹھا ہوا زار وقطار رو رہا ہے ——— چاروں دوست مسافر کے پاس گئے اور اس سے رونے کی وجہ پوچھی۔ مسافر نے روتے ہوئے انھیں بتایا ——— "میں بہت بھوکا ہوں، مجھے کچھ کھانے کو نہیں مل رہا ہے۔ ـ ـ ـ ـ"

خرگوش نے سب کو رات والی بات یاد دلائی اور اپنا اپنا وعدہ پورا کرنے کو کہا۔ یہ سنتے ہی لنگور دوڑتا ہوا جنگل کی طرف گیا اور چند ہی منٹوں میں تازے تازے پھل توڑ لایا اور مسافر کو پیش کر دیے۔ گیدڑ ایک برتن میں بہت سا دودھ بھر لایا اور مسافر کو دے دیا۔ اود بلاؤ چشمے میں کود گیا اور بہت سی مچھلیاں پکڑ لایا۔ پھر تینوں نے مل کر آگ جلائی، مچھلیاں بھون کر مسافر کو دیں۔ مسافر نے تینوں کی لائی ہوئی چیزیں لے لیں، پیٹ بھر کر کھائیں اور خدا کا شکر ادا کیا۔

خرگوش ابھی تک نہ آیا تھا، سب کو بڑی فکر تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ وہ خالی ہاتھ واپس آ رہا ہے۔ خرگوش مسافر کے قریب پہنچا اور رو کر بولا: "سب نے آپ کی خاطر کی افسوس کہ میں کچھ نہ کر سکا۔ میں خود حاضر ہوں۔ آپ مجھے ہی بھون کر کھا لیجیے۔ ورنہ میں خود ہی آگ میں کود پڑوں گا۔"

یہ کہتے ہی آگ میں چھلانگ لگا دی اور جل بھن کر خاک ہو گیا۔ اس کی روح آسمان کی طرف پرواز کر گئی۔

یونانیوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اجنبی مسافر ایک فرشتہ تھا۔ وہ خرگوش کے جلے بھنے جسم کو آسمان پر لے گیا اور چاند میں لگا دیا۔ اور چاند میں جو داغ ہیں وہ اسی خرگوش کے جسم کے ہیں۔

جناب [illegible] یوسف پاپا

سیتل دھوبی

سیتل ہیں اک اچھے دھوبی — اپنے کام کے سچے دھوبی
نیچے پہنیں ایک لنگوٹی — اوپر سے بنیائن موٹی
کاندھے پر ہے ایک انگوچھا — پھٹا پرانا ، گندا گندا
چہرے کی رنگت مٹیالی — یا سمجھو تقریباً کالی
پیروں میں ہیں ایسے جوتے — جن کے ختم ہوئے بل بوتے
ان کے پاس گدھا ہے کانا — لنگڑا بوڑھا اور سیانا
لادتے روز گدھے پر لادی — وہ اس لادی کا ہے عادی
یہ بھی اس پر لاتے ہیں وہ — جب جب باہر جاتے ہیں وہ
گاؤں میں وہ گھر گھر جاتے ہیں — میلے کپڑوں کو لاتے ہیں
شام کو لے کر کپڑے سارے — گھاٹ پہ جاتے ہیں بیچارے
پانی میں پھر ان کو بھگو کر — ریہہ لگاتے ہیں ہر اک پر
سب کو ایک جگہ پر رکھ کر — ڈھک دیتے ہیں ان پر چادر
رات کو گھاٹ پہ وہ سوتے ہیں — ٹوٹی کھاٹ پہ وہ سوتے ہیں
صبح سے پہلے اٹھتے ہیں وہ — کام پر اپنے جٹتے ہیں وہ
مَل کر مَیل کو دور ہیں کرتے — محنت وہ بھرپور ہیں کرتے
دنیا بھر کے مَیل کو چھانٹیں — پھر کپڑوں کو گھر گھر بانٹیں

تم بھی بچو پیار کو بانٹو
اپنے من کے میل کو چھانٹو

کل کی بات

تاجدار احتشام

آج ہمارا ملک بڑے نازک دور سے گذر رہا ہے ہر طرف ہنگامے۔ گئو ہتیا کے سلسلے میں کیا کچھ گڑبڑ نہ ہوئی اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔ دیس میں اناج کی کمی ہے کہیں کہیں تو کال پڑ گیا ہے۔ الیکشن کے ہنگامے ختم ہو چکے ہیں۔ مگر ایک دوسرے کو گرانے کے کیا کیا منصوبے بنے

میں ابھی بہت چھوٹا ہوں۔ اپنے گھر میں سب سے چھوٹا۔ میری عمر لگ بھگ تیرہ سال ہے۔ آٹھویں جماعت میں پڑھ رہا ہوں۔ گھر والے مجھے اپنی کسی بات میں شامل نہیں کرتے۔ کبھی کبھی تو یہ کہہ کر دھتکار دیتے ہیں "چلو ہٹو بڑوں میں مت بیٹھو تم ابھی بچے ہو۔"

میں بہت کچھ سوچتا ہوں اپنے آپ پر کڑھتا ہوں سب سے چھوٹا ہونے کی بے بسی پر کبھی کبھار تو آنکھوں میں آنسو بھی آجاتے ہیں۔

کل ہی کی تو بات ہے رات کا کھانا کھانے کے بعد ہم لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ یکایک سیاسی باتیں شروع ہو گئیں۔ مجھے بہت سی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ مجھے افسوس بھی ہوا کہ ہندوستان کے شہری آخر اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کے لیے کیوں آپس میں لڑ رہے ہیں۔ چاچا نہرو تو کہتے تھے کہ ہندوستان کے لوگوں کو مل جل کر دیس کو اچھا بنانے کے کاموں میں حصہ لینا چاہیے۔ آپس میں لڑتے رہنے سے دیس کی طاقت گھٹتی ہے۔

میں نے بھائی جان سے پوچھا کہ اس نازک حالت میں میں اپنے وطن کے کیا کام آسکتا ہوں۔ بھائی جان نے اس بات پر اس بری طرح مجھے جھڑک دیا جیسے میں نے کوئی بہت بڑی غلطی کی ہو۔ میں خاموشی کے ساتھ اٹھا اور اپنے بستر پر جا کر لیٹ گیا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی

میں اپنی ... میری آنکھوں میں آنسو آ گیے ۔

میں نے رات کو عجیب سا خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ تمام بڑے نیتا اپنی گدیوں سے اتر گئے ہیں اور اب ہم بچوں کا راج شروع ہوگیا ہے۔ الیکشن کے منصوبے بن رہے ہیں۔ بڑے بڑے پوسٹر لگ رہے ہیں۔

"سلیم کو ووٹ دو جس کا نشان امرتی ہے۔"

"بلونت سنگھ کو ووٹ دو جس کا نشان گیند بلا ہے۔"

"ونود کو ووٹ دو جس کا نشان پوری کچوری ہے۔"

"ولیم کو ووٹ دو جس کا نشان کیڈبری چاکلیٹ ہے۔"

تقریریں ہو رہی ہیں۔ جلوس نکل رہے ہیں۔ جلسے ہو رہے ہیں۔ جلسوں میں بچے نیتا تقریریں کر رہے ہیں۔

سلیم کو مٹھائی بہت پسند ہے۔ اس نے الیکشن میں بھی اپنا نشان امرتی رکھا ہے۔ اس کا کہنا ہے ان بڑوں کی حکومت میں ہمیں مٹھائیاں نہیں ملا کرتیں اور اگر ملتی بھی ہیں تو بہت کم اور اس کے لیے بھی ہمیں کبھی کبھی بڑی تکلیفیں اٹھانی پڑتی ہیں۔ وہ ہر طرف مٹھائی کی دکانیں کھولنے کا وعدہ کر رہا ہے۔

بلونت سنگھ کا کہنا ہے کہ مٹھائی ہر چند ضروری چیز ہے۔ مگر کھیل کود بھی مٹھائی کے ساتھ ساتھ ضروری ہیں تاکہ ہماری صحت برقرار رہے۔

ہر طرف ہنگامہ ہے ہنگامہ ہی ہنگامہ، شور ہی شور۔ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ پھر میں نے دیکھا کہ جہاں تک نظر کام کر رہی ہے بچے ہی بچے ہیں۔ میری عمر کے، مجھ سے کچھ بڑے، مجھ سے کچھ چھوٹے۔ ہر طرف بچے ہی بچے اور بیچ میں چاچا نہرو کا مسکراتا ہوا چہرہ ہے وہی مسکراہٹ جو ہم تمام بچوں کو ان کا گرویدہ بنالیا کرتی تھی۔ وہی مسکراہٹ جو بچوں کو اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی۔ کچھ دیر بعد پنڈت جی نظروں سے اوجھل ہو گیے۔ اور پھر ہر طرف گلاب کے پھول گلاب کے پھولوں کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ سرخ گلاب گلابی گلاب، گلاب ہی گلاب ۔

میں سوچتا ہوں اس خواب کا کیا مطلب ہے میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آتا۔ خواب کی باتیں نہ جانے سچ ہوتی ہیں یا جھوٹ۔ شاید بڑے لوگ جانتے ہوں میں اپنے تمام بھائیوں سے درخواست کروں گا کہ وہی مجھے بتائیں۔

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفر نامہ ابنِ بطوطہ

ان کا لباس چمڑے کا ہوتا ہے اور یہ اتنے بہادر اور بے خوف ہیں کہ بدو جنھیں اپنی طاقت پر بڑا گھمنڈ ہے۔ انھیں دیکھ کر کھسک جاتے ہیں۔ ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کرتے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کا بیان ہے کہ رسول اللہ نے ان کی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ جب یہ طواف کریں تو تم بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاؤ کیونکہ خدا کی رحمت ان پر ٹوٹ پڑتی ہے۔

رجب کے بعد شعبان

شعبان کی چودہ(۱۴) تاریخ کو حرم میں بڑی رونق ہوتی ہے۔ میلا سا لگ جاتا ہے۔ تمام حرم میں چراغاں کیا جاتا ہے۔ اوپر چودھویں کا چاند نیچے قندیلوں کی روشنی عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ کوئی الگ کھڑا نماز پڑھ رہا ہے۔ کہیں جماعت ہو رہی ہے۔ عبادت کے شوق کا یہ عالم ہوتا ہے کہ سو سو رکعتیں پڑھتے ہیں لیکن جی نہیں بھرتا۔ کچھ لوگ ساری ساری رات طواف میں مصروف رہتے ہیں، کچھ عمرے کے لیے نکل جاتے ہیں۔

مکے کا رمضان:-

مکے کے رمضان کا کیا کہنا ادھر رمضان کا چاند نظر آیا۔ ادھر عبادت اور کلام پاک کی تلاوت کی سرگرمیاں شروع ہو گئیں۔ نقارے اور دھونسے پٹنے لگے۔ تمام حرم روشنی سے جگمگا اٹھتا ہے۔ کونے کونے میں خوش آواز قاری نظر آتے ہیں۔ ہر طرف تراویح کی جماعتیں اور قاریوں کی خوش آوازی۔ کچھ عجیب حال ہوتا ہے۔ دل پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ جسے حضور قلب کہتے ہیں۔ ہر شخص حضورِ قلب کی نعمت سے سرشار ہو جاتا ہے۔

عموماً اکیس(۲۱) سے لے کر ستائیس(۲۷) (رمضان) تک قرآن پاک ختم ہو جاتے ہیں۔ ان میں قاری اور بڑے بڑے عالم شامل ہوتے ہیں۔

کسی لڑکا کا پہلی بار قرآن سناتا ہے تو جس رات میں ختم ہو جاتا ہے پر تکلف ممبر تیار کیا جاتا ہے۔ اس پر کھڑا ہو کر لڑکا برجستہ تقریر کرتا ہے۔ پھر لڑکے کا باپ تمام نمازیوں، اپنے دوستوں اور عزیزوں کو اپنے گھر لے جاتا ہے ان کی عمدہ قسم

کے کھانوں اور مٹھائی سے تواضع کرتا ہے۔

ستائیسویں کی رات میں سب سے زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اور رنگ برنگ کی روشنی کی جاتی ہے۔

عید الفطر:- جس طرح رمضان کی ستائیسویں کو چراغاں کیا جاتا ہے۔ عید کی رات میں ان میں روشنی ہوتی ہے نا ورجہاں جہاں مسجدیں ہیں۔ ان میں روشنی ہوتی ہے۔ عید کی رات دن سے زیادہ بارونق ہوجاتی ہے۔ حرم میں روشنی، تمام مسجدوں میں روشنی، تکبیروں کی گونج طواف کرنے والوں کا ہجوم ہر طرف ذکرِ خدا کی آوازیں۔ سبحان اللہ!

صبح کی نماز پڑھتے ہی سب لوگ کپڑے بدلنے کی تیاریاں کرتے ہیں اور پرتکلف لباس پہن کر حرم کی طرف دوڑتے ہیں تاکہ امام کے قریب صف میں جگہ ملے۔ سارا حرم خوشبو سے مہک جاتا ہے۔ عطر میں بسا ہوا عربی لباس، چہروں پہ خوشی عبادت کا ذوق یہی عید ہے۔

خطیب کا لباس بھی نہایت قیمتی اور شاندار ہوتا ہے آمد کی شان وہی ہوتی ہے جس کا ذکر جمعہ کی نماز میں کیا گیا ہے۔ آگے آگے کوڑے کی پھٹکار۔ دائیں بائیں سیاہ جھنڈے اور چال پُروقار۔

نماز کے بعد خطبہ پڑھا جاتا ہے خطبہ ختم ہوتے ہی سلام اور مصافحہ شروع ہوجاتا ہے۔ اس کے بعد حرم کا داخلہ ہوتا ہے۔ یہاں سے سب لوگ باب المصلےٰ کے قبرستان جاتے ہیں اور فاتحہ پڑھ کر اپنے اپنے گھروں کو واپس آجاتے ہیں۔

حج

حج کا بیان کیا ہو سال کے ۳۶۰ دن کا نچوڑ ہے۔ ایسی رونق، ایسی امنگیں اور ولولے ایسے پرکیف اور روح پرور مناظر کہ جس کسی کی آنکھ ایک بار دیکھ لے ہمیشہ یہ تمنا رکھے کہ یہ نظارہ پھر بھی نصیب ہو۔ ذی الحجہ کی پہلی تاریخ سے نقارے بجنے لگتے ہیں اور جب تک عرفات کی روانگی ہوتی ہے ان کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

ذی الحجہ کی ساتویں کو ظہر کی نماز کے بعد امام ایک طویل تقریر کرتا ہے۔ اس تقریر میں حج کے طریقے پوری وضاحت سے بیان کرتا ہے۔ آٹھویں کو منیٰ کی طرف کوچ ہو جاتا ہے راستے میں ایک وادی پڑتی ہے جس سے دوڑتے اور اچھلتے چلتے ہیں۔ اسے وادی محسّر کہتے ہیں۔ یہ وادی یا گھاٹی منیٰ اور اور مزدلفہ کے بیچ میں ہے۔ مزدلفہ میں پانی کے تالاب ہیں جنھیں ہارون الرشید عباسی خلیفہ بغداد کی بیوی زبیدہ نے تعمیر کرایا تھا۔ مکے سے منا پانچ میل ہے اور منا سے عرفات پانچ میل آگے ہے۔ گویا یہ سفر دس میل کا ہے۔

عرفات پہاڑوں کے بیچ میں ایک ہموار اور اک بہا میدان ہے۔ اس سے ملا ہوا جبل رحمت ہے۔ اسی کے چاروں طرف حاجی پڑاؤ ڈالتے ہیں اور چند گھنٹوں کے لیے عرفات ایک عظیم الشان شہر بن جاتا ہے۔

ہم مکے سے جا رہے ہیں:-

ذی الحجہ کی بیس کو ہم نے مکے سے رخت سفر باندھ

لیا یہاں سے پھر مدینے کا کوچ ہے چھ دن میں مدینے شریف میں ٹھہر کر مشہد علی کی طرف روانگی کا قصد ہے۔

ہم مشہد علی (نجف) کے راستے میں وادی عروس نجد، آب النقرہ سے گزرے ہمارا قافلہ عراقی قافلہ ہے اور ہم انگریزی حساب سے ۱۷ نومبر ۱۳۲۶ء کو مکّے سے چلے ہیں۔ سالار کارواں (قافلے کے سردار) میرے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آئے۔ عراق، خراسان، فارس کے حاجی زیادہ ہیں غریبوں کے لیے اونٹوں پر پانی کے ذخیرے ہیں۔ کھانے پینے کا سامان اور علاج معالجے کی دوائیں بھی ہیں یہ تمام انتظام اور آسانیاں سلطان عراق ابو سعید کی طرف سے ہیں۔

آب النقرہ کے بعد آب القارورہ ہے۔ یہاں بڑے تالاب بنے ہوئے ہیں اور بارش کا پانی بھرا رہتا ہے۔ آب بہ خوش گوار ہے۔

اسی راستے پر جگہ جگہ وہ تالاب پڑتے ہیں جنھیں زبیدہ ہارون رشید عباسی کی بیوی نے بنوایا ہے۔ اسی راستے میں وہ گاؤں بھی ہے جہاں بہترین دودھ اور گھی کپڑے کے تبادلے میں مل جاتا ہے۔ اس گاؤں کا نام سمیرہ ہے

ایک جگہ کا نام جبل المخروق یعنی ہوادار پہاڑی ہے جس میں بڑے بڑے سوراخ ہیں۔ اور ان سوراخوں میں سے ہوا نکلتی ہے۔ ایک جگہ ہے عقبۃ الشیطان۔ یہ ایک ویران وادی یا گھاٹی ہے۔ معلوم نہیں اس کا یہ نام کیوں ہے!

ایک جگہ قلعہ ہے جس میں عربوں کی بستی ہے۔ عراق کے حاجی مکّے جاتے ہیں تو اپنا غیر ضروری سامان یہیں چھوڑ جاتے ہیں اور واپس آکر لے لیتے ہیں۔

مکّے سے بغداد جاتے ہیں یہ (قلعہ) آدھی مسافت پر ہے۔ کوفے کو یہاں سے بارہ دن میں پہنچتے ہیں۔ قافلے یہاں پہنچتے ہیں تو بہت چوکنے رہتے ہیں۔ اور پورا سامان رکھتے ہیں کہ لڑائی کا موقع آجائے تو مقابلہ کیا جائے۔

قافلے والوں کو مستعد دیکھ کر عرب لٹیرے ڈر جاتے ہیں اور قافلے کو پریشان نہیں کرتے۔

اس راستے میں سب سے زیادہ عجیب چیز منارۃ القرآن (قرن سینگ کو کہتے ہیں قران جمع) ہے۔ یہ ایک اونچا مینار ہے جس پر ہزاروں سینگ لگے ہوئے ہیں۔

نجف کے راستے میں قادسیہ بھی پڑتا ہے۔ پہلی جون ۶۳۵ء کو مشہور صحابی حضرت سعد بن وقاص نے ایرانی فوج کو شکست دی تھی اور قادسیہ کو فتح کر لیا تھا۔ یہ پہلے بہت بڑا شہر تھا۔ اب ویران ہے۔ گاؤں جیسی بستی رہ گئی ہے۔ یہاں چھواروں کا نخلستان ہے۔

نجف:-

نجف بہت خوب صورت شہر ہے۔ سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مزار مقدس اسی نجف میں ہے عراق کے شہروں میں اتنی آبادی کسی شہر کی نہیں ہے۔ نہ اتنے خوب صورت مکان ہیں۔ نہ اتنی عمدہ سڑکیں ہیں۔ نہ ایسے بارونق بازار ہیں۔ جہاں ہر قسم کا سامان ملتا ہو۔ اچھے اچھے مدرسے ہیں خانقاہیں ہیں فقیروں کے تکیے ہیں مدرسوں میں شیعہ مذہب کے طالب علم اور مجتہد رہتے ہیں اور تعلیم

کا [illegible] جاری ہے۔

باہر کا جو مسافر آتا ہے۔ تین دن مہمان رکھا جاتا ہے۔ دونوں وقت روٹی، گوشت اور کھجوریں دی جاتی ہیں۔

حضرت علیؓ کا روضہ:-

حضرت علی کے روضے پر، حاجب، نقیب اور خواجہ سرا حاضر رہتے ہیں۔ بلا اجازت کوئی اندر نہیں جا سکتا۔ اندر جانے کی اجازت اس طرح لی جاتی ہے۔ دروازے کے سامنے کھڑے ہو کر کہتے ہیں۔

"امیر المومنین یہ ضعیف (کم زور)، بندہ حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ اجازت ہو تو روضہ کے اندر قدم رکھے ورنہ واپس جائے۔ اگرچہ گناہ گار ہے اور اس قابل نہیں کہ اندر آئے۔ مگر آپ صاحب کرم ہیں اور گناہوں کے پردہ پوش ہیں۔"

اس کے بعد دربان آستانہ بوسی کے لیے کہتے ہیں اور اندر جانے کی اجازت دے دیتے ہیں۔ آستانہ اور آستانے کے دونوں بازو چاندی کے ہیں اندر اعلیٰ قسم کا فرش ہے اور سونے چاندی کی قندیلیں لٹکتی ہیں۔ قبّے کے بیچ میں لکڑی کا کٹہرا ہے اس پر بہت خوب صورتی اور مضبوطی سے سونے کے پتر چڑھے ہیں۔ کٹہرے میں تین قبریں ہیں۔ ایک حضرت آدمؑ کی بتاتے ہیں دوسری حضرت نوحؑ کی تیسری حضرت علی شیرِ خدا کی۔

ان مزاروں کے بیچ میں ایک تشت میں مشک اور گلاب کا عرق بھرا رکھا رہتا ہے۔ لوگ اس میں ہاتھ ڈال کر چہرے اور ہاتھوں پر ملتے ہیں۔

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

تماشہ دیکھتے ہوئے ہم اپنے جہاز پر لوٹ آئے تو دیکھا سامان اتارا جا رہا ہے۔ اور جو قلی سامان اتار رہے ہیں وہ سب کالے ہیں۔ نہایت گندے جسم سے بدبو آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر کوئی شخص ان کے پاس کھڑا رہ جائے تو تے ہو جائے سر پر بال بہت بڑھے ہوئے جو گردن کو چھپائے ہوئے تھے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ گرمی سے بچنے کے لیے بڑھائے گیے ہیں۔ یہ سب مسلمان تھے اور سوڈان کے رہنے والے عرب۔

یہ محنت مشقت خوب کر سکتے ہیں۔ لیکن حالت ان کی بہت ابتر ہے۔ دنیا میں جہاں علم وفضل اتنا بڑھ گیا ہے جہاں لوگ ایٹمی عہد کا خواب دیکھتے ہوں وہاں انسان کو ایسی حالت میں دیکھ کر شرم محسوس ہوتی ہے۔ جہاں انسانی برابری یا مساوات کا راگ الاپا جا رہا ہو۔ وہاں ایسے انسان بھی موجود ہوں جن کے جسم پر تن ڈھکنے کو کپڑا نہ ہو تو یہی معلوم ہوتا ہے انسان بہت جھوٹا ہے۔ دغا باز ہے۔ مکار ہے اور نفع خوری کی عادت ابھی تک اس کے دماغ سے نہیں نکلی ہے۔ شاید ہندوستان میں بھی اتنے گندے اور مفلس لوگ تمہیں نہ دکھائی دیں گے جتنے ہم نے پورٹ سوڈان پر دیکھے۔

یہ عدن ملک ہے جہاں برسوں انگریزوں کا راج رہا ہے۔ جہاں کہیں بھی انگریز گیے اس قوم کو تباہ کر دیا۔ ایسے ایسے جال پھیلائے کہ وہ قوم جہالت کے پھندوں میں پھنسی رہی۔ اور اس کی تصویر تمہیں ہندوستان سے باہر کہیں اور دیکھنی ہو تو پورٹ سوڈان میں دیکھو۔

یہ سب حالات اور نظارے دیکھ کر طبیعت اتنی بدمزہ ہوئی کہ باہر نکلنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اس وقت شام ہو چکی ہے۔ جہاز سے سامان اتارا جا چکا ہے اور اب جہاز کے چلنے کی تیاری ہے۔ ہمارا جہاز ٹھیک ۷ بجے چل دے گا۔ ہم اب بحر احمر سے گزرتے ہوئے پورٹ سعید جائیں گے۔

۱۴ جون کو ہمارا جہاز ٹھیک ۸ بجے شام پورٹ سوڈان سے پورٹ سوئز کے لیے روانہ ہوا۔ اس وقت شام ہو چکی تھی اور پورٹ پر ہر جگہ روشنیاں ہی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ اندھیرا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ آتے جاتے

جہازوں کی روشنیاں عجیب بہار دکھا رہی تھیں۔ ہم بھی اس
دل فریب نظارہ سے لطف اندوز ہونے کی غرض سے ڈیک
پر جاکر کھڑے ہو گیے۔ وہاں اتفاقاً کیپٹن سے ملاقات ہو گئی،
دوران گفتگو میں نے دریافت کیا "حضرت یہ تو بتایئے
پورٹ سڈان سے پورٹ سوئیز کتنی دور ہوگا" فرمانے لگے۔
"لگ بھگ ...۸ میل ہے" ہم نے پھر سوال کیا "کب
تک ہمارا جہاز پہنچے گا" جواب ملا "۱۶ رجون کو صبح سویرے
ہم پورٹ سوئیز پہنچ جائیں گے اگر بس خیریت رہی"

موسم اس وقت بہت خوشگوار ہو چلا تھا۔ کپتان کی
گفتگو سے معلوم ہو رہا تھا کہ بہت موڈ میں ہیں اور باتوں میں
خوب دلچسپی لے رہے ہیں۔ ہمارے لیے تو بھئی یہ بہترین موقع
تھا۔ سوچا چلو ان سے کچھ حاصل ہی کر لو۔ میں نے ان سے
اجازت طلب کی کہ کیا میں ان سے کچھ سوالات کر سکتا ہوں فوراً
فرمانے لگے۔ شوق سے پوچھیے۔ جو سوالات میں نے ان سے
پوچھے انھیں تمھاری معلومات کے لیے یہاں لکھے دے
رہا ہوں مقصد یہ ہے کہ جہاں میری تعلیم ہو رہی ہے وہاں
اس تعلیم سے تم بھی فائدہ کیوں نہ اٹھاؤ۔

سوال: یہ بتایئے کہ بحر قلزم کو RED SEA (سرخ
سمندر) کیوں کہتے ہیں۔

جواب: یہ بھئی تم خود نہیں دیکھ رہے ہو اس کا پانی
جو سرخ رنگت لیے ہوئے ہے۔ اسی سرخ رنگت کی وجہ
سے اس کا نام RED SEA پڑ گیا۔

سوال: یہ سمندر کتنا لمبا ہوگا۔

جواب۔ یہ سمجھیے کہ اندازاً ایک ہزار پانچ سو میل لمبا
ہوگا۔

سوال تو اور بھی کیے جاتے لیکن ڈنر کا گھنٹہ بج
چکا تھا۔ اس لیے ہم سب ڈیک سے اتر کر اپنے اپنے
کیبن میں چلے آئے اور رات کے کھانے کی تیاری کرنے لگے
رات کو کھانے کے بعد خان برادرس نے اصرار کیا کہ کچھ دیر
ڈیک پر پھر تفریح کی جائے۔ چونکہ فضا بہت اچھی تھی۔ میں نے
ان کی تجویز مان لی اور ہم سب ساتھ پھر ڈیک پر چلے گیے جاتے
ہوئے میں نے اپنی چادر اور تکیہ دونوں ساتھ لے لیے۔ خان
برادرس پوچھنے لگے "یہ کیا ہے" میں نے کہا حضرت یہ میرا
بستر ہے۔ ڈیک پر چل کر وہاں کسی ہولڈ کے اونچے چبوترے
پر ہم بستر بچھا کر دراز ہو گیے" انھوں نے ہماری تجویز کو کچھ
زیادہ پسند نہیں کیا۔ لیکن جب ہم ڈیک پر لیٹ گیے تو فرمانے
لگے "یار ہمیں بھی تو ذرا لیٹنے دو" میں نے کہا خوب ابھی تو آپ
اس پر اعتراض کر رہے تھے۔ اور اب یہ انداز آپ کو اس قدر
پسند آگیا" وہ کچھ نہ بولے۔ بس ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیے۔

بھئی تمھیں کیا بتاؤں۔ رات اندھیری تھی۔ لیکن
آسمان بالکل صاف ستارے آسمان میں اس قدر صاف
اور شفاف روشن تھے کہ زندگی میں اس سے پہلے کبھی انھوں
نے مجھے اس قدر متاثر نہیں کیا مجھے فوراً خیال آیا کہ میں جس
سمندر میں اس وقت سفر کر رہا ہوں اس کی دائیں طرف
عرب کا دیس ہے اور بائیں طرف افریقہ کا دیس۔ یہ وہی
عرب کا دیس ہے جہاں کے باسیوں نے علم نجوم میں دنیا
میں شہرت حاصل کی اور ستاروں پر جو شاعری فرمائی ہے
وہ بھی اپنا جواب نہیں رکھتی۔ وجہ سمجھ میں آگئی کہ "ماحول"
انسان کو سب کچھ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے تم شاید یہ بات
نہ سمجھ پاؤ گے بھئی عرب کا دیس ایک ریگستانی علاقہ ہے۔

بچّوں کی کوششیں

اضرجوابی

میرا پانچ سالہ بھائی اختر بڑا نٹ کھٹ
.ذہین اور حاضر جواب بھی ہے. اس کی حاضر جوابی کے چند
ے آپ بھی سنیے۔

ایک دفعہ اختر اپنے کمرے میں بیٹھا بہت دیر
کان کھجلا رہا تھا۔ اتنے میں ممی آگئیں اور اختر سے کہا
ن کیوں کھجلا رہے ہو؟

اختر نے فوراً جواب دیا: "ماسٹر صاحب نے کہا ہے
بلز کان سے نکلتا ہے۔ اور میں کان سے کو بلز نکال رہا ہوں۔"

ایک دفعہ ابا جان اختر کو سمجھا رہے تھے اور میں پاس
بیٹھا ہوا تھا. ابا جان نے کہا: "دیکھو اختر راستہ دیکھ کر چلا کر د
نہ کسی موٹر کے نیچے آجاؤ گے۔"

ابا جان موٹر کے نیچے آجانے سے کیا ہوتا ہے میرے
پر سے تو کئی بار ہوائی جہاز گزر چکا ہے۔"

ایک بار اختر نے ممی سے دودھ مانگا. ممی نے جوا
: "دودھ پھٹ گیا ہے۔" اختر نے جلدی سے کہا: "تو دودھ
سوئی اور سوت تاگا، سے سی دیجیے۔"

اختر نے ابا سے کہا: "ابا اگر میں امتحان میں پاس ہو گیا
ایک نیا سوٹ سلوا دیجیے گا۔"

ابا نے کہا: "اور اگر فیل ہو گیے تو؟"

"تو آنسو پونچھنے کے لیے ایک رومال۔" اختر نے
معصومیت سے جواب دیا۔

ایک دفعہ اختر اپنے دوست حامد سے گفتگو کر رہا تھا.
حامد:- یار..... سنا ہے کہ چینیوں نے زبردستی
ہماری کئی چوکیوں پر قبضہ کر لیا ہے۔
حامد:- مجھے تو کچھ نہیں معلوم میرے گھر میں تو نما:
پڑھنے کی دو چوکیاں ہیں۔ دونوں پر ہی ہمارا قبضہ ہے۔

ایم۔ اے۔ راہی (درالی گنج)

رینگنے والے جاندار

رینگنے والے جانوروں کا خون ٹھنڈا ہوتا ہے. ان
کے لیے اپنے آپ کو جاڑے میں گرم رکھنا بہت ہی مشکل ہے
ایک گرم خون والے جانور کے لیے یہی کام بہت سہل ہے.
اس لیے ہم کو یہ سن کر حیرت نہ کرنی چاہیے کہ رینگنے والے
جاندار زمین کے سب سے گرم حصوں میں کیوں رہتے ہیں۔ وہ
کبھی دلدل بھرے دریا، کبھی مرطوب علاقے میں اور کبھی بے
حد گرم ریگستانوں میں رہتے ہیں. ان کی کھال نوکیلے کانٹے
نما ایک چیز سے ڈھکی رہتی ہے اور ان میں سے کئی زہر کو ایک
طرح سے حملے کے لیے استعمال کرتے ہیں. رینگنے والے

...کی کئی قسمیں ہیں۔ لیکن ہم ان میں سے کچھ خاص ہی نام
[illegible] لگے جیسے مگرمچھ، کچھوا، چھپکلی، گرگٹ اور سانپ یہ
سب جانور انڈے دیتے ہیں۔ جن میں سے ان ہی جیسے مگر
چھوٹے چھوٹے بچے نکلتے ہیں۔ مینڈک ان سب سے کافی ملتا
ہے، مگر ایک تو اس کے جسم پر کانٹے دار جال نہیں ہوتا۔ اور
دوسرے وہ اپنے انڈے پانی میں دیتا ہے۔ اس کے بچے پہلے
تو صرف پانی ہی میں رہتے ہیں۔ لیکن جلد ہی ان کا جسم مختلف
شکلیں اختیار کر لیتا ہے اور وہ زمین پر رہنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔

آیئے آپ کی ملاقات مگرمچھ کے خاندان سے کرائیں۔

مگرمچھ بہت بڑی چھپکلی کو کہتے ہیں۔ امریکہ میں دو طرح کے
(ALLIGATER) اور ایک طرح کا مگرمچھ ہوتا ہے مگرمچھ
افریقہ اور ہندوستان میں بھی پایا جاتا ہے۔ (ALLIGATER)
چین میں پایا جاتا ہے۔ (ALLIGATER) اور مگرمچھ ایک
دوسرے سے کافی ملتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مگرمچھ کے
اوپر کے دانت اور نیچے کے دانت ایک گانٹھ کے ذریعہ ایک
دوسرے سے جڑے رہتے ہیں (ALLGIATER) کے دانت
بالکل چھپے رہتے ہیں۔ دونوں کی ناکیں اوپر کے حصے میں باہر
کو رکھی رہتی ہیں۔ وہ اسی سے سانس لیتے ہیں۔ ان کی آنکھیں
ان کے سر پر ہوتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہت سے مگرمچھ
اپنی ناک اور آنکھیں اوپر کیے پانی میں پڑے رہتے ہیں اور اس
طرح بے حس و حرکت پڑے ہوئے۔ یہ دور سے بالکل بڑے
بڑے لکڑی کے لٹھے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے بہت سے
جانور جو لاپرواہی سے ان کے ارد گرد گھومتے ہیں۔ جلد ہی مگرمچھ
کا شکار ہو جاتے ہیں (ALLIGATER) اور مگرمچھ کی
دُمیں ان کو تیرنے میں بڑی مدد دیتی ہیں۔ مادہ مگرمچھ انڈے
دیتی ہے۔ وہ انڈے زمین پر ریت میں دیتی ہے۔
ایک دفعہ میں ۲۰ سے لے کر ۴۰ تک کی تعداد میں
انڈے دے دیتی ہے۔ پھر تھوڑے عرصہ بعد دھوپ
کی گرمی سے وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور ان میں سے چھوٹے
چھوٹے بچے نکلتے ہیں یہ اپنے ماں باپ کی صحیح
نقل ہوتے ہیں۔

کچھوا:۔ کچھوے کو کون نہیں جانتا۔ ارے صاحب یہ
جو خرگوش کے ساتھ دوڑ میں اول آیا تھا۔ آپ نے اس کی کہانیاں
تو بہت پڑھی ہیں۔ آیئے اب ذرا اس کی عادتوں اور خصلتوں
پر بھی تو نظر ڈالیں۔ تو لیجیے سنیے۔

کچھوے زیادہ تر زمین پر ہی رہنا پسند کرتے ہیں۔ اور
سبھی وہ زمین پر ہی ہیں۔ لیکن کچھ صرف پانی ہی میں رہتے ہیں
شمالی امریکہ میں جو کچھوا پانی میں رہتا ہے اسے (SLIDE
TERRAPINS) کہتے ہیں کچھوؤں کے جسم پر ایک مضبوط
خول ہوتا ہے۔ زمین پر رہنے والوں میں سے جائنٹ کچھوا
سب سے دلچسپ ہوتا ہے۔ مگر اب اس کی تعداد گھٹتی
جا رہی ہے اور وہ صرف بحر الکاہل کے جزیروں میں پایا جاتا
ہے۔ وہ اتنا بھاری ہوتا ہے کہ اسے ایک آدمی نہیں اٹھا
سکتا۔ کچھوے بھی انڈے دیتے ہیں۔ جن میں سے بچے نکلتے
ہیں۔ ہرے کچھوے کا سوپ بھی بنتا ہے۔ نرم خول والے
کچھوے امریکہ اور افریقہ میں پائے جاتے ہیں۔ یہ بڑے
بد مزاج اور خطرناک ہوتے ہیں۔ ان کے جبڑے بہت تیز
ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دشمن سے بچنے کے لیے پانی میں گھس
جاتے ہیں۔ بہت سے کچھوے سو سال سے زیادہ تک زندہ
رہتے ہیں۔

چھپکلی اور سانپ۔ بہت ہی قریبی رشتے دار ہیں جتنی چھپکلیاں آج کل ہیں وہ سب پہلے زمانے کی چھپکلیوں کی بگڑی ہوئی شکلیں ہیں۔ بس فرق صرف چھٹائی، بڑائی کا ہے۔ گو ایک چھوٹی قسم کی چھپکلی ہوتی ہے اور اس کی کھال بے حد نرم ہوتی ہے اس کے پیروں کے نیچے گدّے لگے ہوتے ہیں۔ جو اسے چڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ وہ اپنی دم حملے سے بچنے کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اگر اس پر کوئی حملہ کرتا ہے تو وہ اپنی دم چھوڑ کر بھاگ جاتی ہے۔ چھپکلیوں کے ہر بار نئی، نئی دُمیں نکل آتی ہیں۔ یورپ کی چھپکلیاں بڑے ہی شوخ رنگ کی ہوتی ہیں۔ ان کے چار پاؤں ہوتے ہیں دنیا میں چھپکلیوں کی تقریباً ۲,۹۰۰ قسمیں ہیں۔ ہر ایک چھپکلی کی ایک چپٹی زبان، دو چمک دار آنکھیں اور دو کان ہوتے ہیں۔ چھپکلیاں سانپوں کی طرح انڈے دیتی ہیں انڈے پھوٹنے پر اُن میں سے بچے نکلتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے کیڑے پکڑتی ہیں۔ اور جب انھیں غصہ آتا ہے تو کاٹ بھی لیتی ہیں۔ یہ امریکہ میں بھی پائی جاتی ہیں۔ گو (AMAZON) کے جنگلوں میں پائی جاتی ہے آسٹریلیا کی چھپکلیاں بڑی ہی خطرناک ہوتی ہیں۔ اڑنے والی چھپکلیاں بھی ہوتی ہیں۔ گرگٹ میں رنگ بدلنے کی بڑی زبردست طاقت ہوتی ہے۔ وہ جس جگہ بیٹھا ہوتا ہے ویسا ہی رنگ بدل لیتا ہے۔ اس طرح دشمن اسے نہیں دیکھ سکتا۔ رات کو اس کا رنگ مکھن جیسا ہو جاتا ہے۔ صبح کو ہرا۔ اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا ہے۔ اس کے مطابق رنگ تبدیل کرتا ہے۔ اس کی زبان ایک گانٹھ کی طرح ہوتی ہے۔ اور جب وہ مکھیوں کا شکار کرتا ہے تو زہر سے کر اپنی دم موڑ لیتا ہے۔ اور درخت کی ڈالی پر بیٹھ کر مکھی کا شکار بڑی ہی پھرتی سے کرتا ہے۔ اس کی کھال کے نیچے چھوٹے چھوٹے خانے یا خلیے ہوتے ہیں۔ اس کو جب خوشی ہوتی ہے۔ یا صدمہ پہونچتا ہے تو وہ اپنا رنگ انھیں خلیوں کے ذریعہ تبدیل کر لیتا ہے۔ گرگٹ چڑھنے میں بڑا ماہر ہے۔ اس کی دم درخت کے چاروں طرف لپٹ کر چڑھنے میں بڑا ساتھ دیتی ہے۔

سانپ سے تو ہر ایک واقف ہوگا۔ تو آیئے اب آخر میں سانپ سے اور ملاقات کر لیں۔ سانپ رینگ کر چلتا ہے۔ وہ اپنا کھانا نگلتا ہے اور لپنے ہی برابر کے دو تین جانور رکھا جاتا ہے۔ بہت سے سانپوں کے دانت بھی ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی وہ کھانا نگل جاتے ہیں۔ زہریلے سانپوں کے اوپر کے دانت نہیں ہوتے ہیں۔ اور یہ کھوکھلے دانتوں (FANG S) کے ذریعہ زہر جسم میں پہنچاتے ہیں یہ سوئی کی طرح نوکیلے ہوتے ہیں۔ اور جب سانپ ان پر زور دیتا ہے تو دانت کے نیچے والے حصے میں جو زہر کا چھوٹا سا تھیلا ہوتا ہے۔ اُسی میں سے زہر نکل کر ہر ایک (FANG) میں پہونچ جاتا ہے۔ اور پھر یہ دانت انسان کے جسم میں پیوست کر دیے جاتے ہیں تو سارا زہر اندر پہنچ جاتا ہے بہت سے سانپ زہریلے نہیں ہوتے ہیں۔ بوا (BOA) اور اژدہے میں زہر نہیں ہوتا ہے۔ انگلستان کا گھانس والا سانپ بہت ہی نقصان دہ ہوتا ہے۔ وہ ایک اچھا تیراک ہوتا ہے۔ وہ کیڑے مکوڑے کھاتا ہے سانپ بھی اڑتے ہیں اور ایسے سانپ ہندوستان میں پائے جاتے ہیں کوبرا بہت ہی زہریلا سانپ ہوتا ہے۔ یہ ایشیا اور افریقہ میں پایا جاتا ہے۔ اس کے کاٹنے سے انسان مر جاتا ہے۔

سب [illegible] سانپ زہریلے ہوتے ہیں اور وہ مچھلی کھاتے ہیں جب سانپ کی کھال پرانی ہو جاتی ہے تو وہ پھٹ کر اُس سے الگ ہو جاتی ہے۔ اس کھال کے اتر جانے کے بعد نئی اور خوبصورت کھال اس کی جگہ لے لیتی ہے۔ سانپ بھی انڈے دیتا ہے۔ جن میں سے کچھ عرصہ بعد چھوٹے چھوٹے سپولیے نمودار ہوتے ہیں۔ یہ ہو بہو اپنے ماں، باپ کی شکل کے ہوتے ہیں۔

عفت آرا۔

لطیفے:-

(۱) ایک آدمی۔ (دوسرے سے) کیا بات ہے! آج تو آپ دل کھول کر ہنس رہے ہیں۔

دوسرا آدمی۔ (ہنستے ہنستے) جی... میں... میں دل کھول کر نہیں منہ کھول کر ہنس رہا ہوں۔

(۲) ڈاکٹر۔ (مریض سے) تمھیں کوئی خاص شکایت نہیں۔ صرف آرام کی ضرورت ہے۔!

مریض۔ لیکن ڈاکٹر صاحب میری زبان تو دیکھیے

ڈاکٹر۔ اسے بھی آرام کرنے کی ضرورت ہے۔

(۳) ایک۔ پانی نہ ہوتا تو؟

دوسرا۔ ہم دودھ پیا کرتے۔

اختر حسین عابدی

بلی کی دم:-

عابد کو لوگ "بلی مار" کہتے تھے۔ جہاں بھی کوئی بلی دیکھ پاتا اس کے پیچھے بھاگتا اور موقع ملتے ہی اسے مار بیٹھتا۔ عابد میاں ایک دن کھانا کھانے کے بعد چارپائی پر لیٹ گئے۔ پڑے پڑے انھوں نے دیکھا کہ اس کے والد دودھ کا خالی کٹورا لیے بک جھک کر رہے ہیں۔ عابد کے والد کے سر پر لمبی زلفیں چوٹی جیسی تھیں۔ عابد نے ان سے کہا: "اچھا ابا جی، بلی کو بار بار دودھ پی جانے کا میں مزہ چکھا دونگا۔ اس نے بلی سے بدلہ لینے کی ٹھان لی۔ ایک دن بلی اس کے آگے پڑ ہی گئی۔ وہ عابد کے والد کی گدے دار کرسی کے سرے پر چڑھی بیٹھی تھی اور اس کی دم اوپر کو اٹھی تھی۔ اسے عابد نے دیکھ لیا۔ عابد میاں دبے پاؤں جا کر ایک قینچی لے آئے بلی کی دم کاٹنی تھی۔ چپ چاپ عابد نے قینچی چلا دی اور یہ سمجھا کہ بلی کی دم کٹ گئی۔ مگر یہ بات نہیں ہوئی۔ کیوں کہ جب عابد قینچی لانے گیا تو بلی کرسی سے اتر کر چوہوں کی کھوج میں چلی گئی تھی۔ اتنے میں اس کرسی پر اس کے والد آ بیٹھے یہ قد میں بہت ٹھگنے تھے۔ اس لیے بڑی اور موٹی کرسی میں نظر نہ آئے۔ ہاں ان کی زلف کی ایک لٹ جو چوٹی نما تھی دکھائی دی۔ اسے عابد نے بلی کی دم سمجھا۔ اس لیے قینچی سے کاٹنے پر بلی کی دم نیچے نہ گری بلکہ چوٹی نیچے آ پڑی۔ چوٹی کٹتے ہی والد چونک کر اٹھ کھڑے ہوئے انھیں دیکھتے ہی عابد میاں کے ہوش اڑ گئے۔ وہ رونے لگا۔ پر اسے ایسی شرارت پر بھی مار نہ کھانی پڑی۔ یہ سب تو خواب تھا۔ اس دن عابد کھانا کھاتے ہی سو گیا تھا۔

ع، ع، قریشی

آدھی مُلاقات

آپ کے ہاتھوں "پیامِ تعلیم" دن بدن نکھر اور سنور رہا ہے۔ میری ایک ناقص رائے یہ ہے کہ ریاست میسور کے پرائمری، مڈل اور ہائی اسکولوں کو ایک ایک کاپی روانہ کریں۔ ان سے درخواست کی جائے کہ وہ اپنے مدرسوں کے لیے خرید یں۔ آج کل چھٹیاں ہیں۔ میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔

سلیم تمنائی میسور

میرے خیال میں اگر ایک صفحہ آپ سوال و جواب کے لیے رکھیں تو اس سے پیامیوں کو فائدہ پہنچے گا۔ اس سے ہمیں نئی نئی باتوں کا علم حاصل ہوگا۔ اس لیے اگر آپ ایسا کر سکیں اور ہمارے لکھنے والے۔ پیامی بھی اس کے لیے راضی ہوں تو ایسا ضرور کریں۔ میرے خیال سے یہ ایک فائدہ مند قدم ہوگا۔

محمد اقبال زرمٹ (دگیا)

"پیامِ تعلیم" کا اپریل کا شمارہ دیکھا حاجی بابا کی دوبارہ تشریف آوری قابلِ تحسین ہے۔ خدا کرے اب یہ ہر ماہ ہم پیامیوں سے ملتے رہیں۔ یہ مضمون اپنے اندر بہت سی خوبیاں لیے ہوئے ہے۔ امید ہے اوروں کو بھی پسند آیا ہوگا۔ ظ۔ صاحب کو میری مبارکباد پہنچا دیجیے گا۔ ویسے کیف صاحب کی نظم، سعادت کی ہوبلی، یوسف کے قربان میاں کے کارنامے، اختر کی اپنی زمین، مظفر کا انوکھا خواب، خالد کے ابا کے کرشمے اور حبیب حسان کا شوق، اور لگن بھی اچھے مضامین ہیں۔ ان سب تک مبارکباد پہنچا دیجیے۔

غلام محمد سوداگر قریشی (بمبئی)

"پیامِ تعلیم" کا دیدہ زیب سالنامہ نظر نواز ہوا۔ حیرت ہے کہ اس گرانی کے زمانے میں ایسا معیاری، پر از معلومات اور ضخیم سالنامہ نکالا ہے جس کی کتنی ہی تعریف کی جائے تو حق ادا نہیں ہو سکتا۔ سالنامہ مذکور کا ٹائیٹل نہایت پرکشش ہے۔ اس کے آرٹ ورک اور جدت طرازی نے بیحد متاثر کیا۔ نیز اس کے مضامین، نظمیں، کہانیاں، ڈرامے اور تصاویر غرضیکہ ہر چیز معیاری، دلچسپ اور پر از معلومات ہے طنز و مزاح میں بھی تیکھا پن ہے۔

وقت کا یہی تقاضہ ہے کہ نئی نسل کے لیے ایسی ہی خصوصیات کے حامل ماہنامے شائع ہوا کریں تاکہ بچوں کے تفنن طبع کے دوش بدوش کردار سازی میں بھی بدرجہ اتم معاون ثابت ہو سکیں۔

عبدالقیوم خان۔ ببلاجو دھپور

اسلامی سال نو کی دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ امید ہے آپ قبول فرمائیں گے "پیامِ تعلیم" کا تازہ شمارہ اول تا آخر پڑھا۔ مضامین، نظموں وغیرہ کی ترتیب بہت ہی اچھی تھی۔ پرچے کی موتی جیسی چھپائی اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگاتی ہے۔ خداوند کریم سے دعاگو ہوں کہ وہ آپ کو اور آپ کے پرچے کو دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین ثم آمین

غلام محمد سوداگر بمبئی۔

میں نے آپ کا پیامِ تعلیم پڑھا اور پڑھ کر ازحد خوشی حاصل ہوئی کہ اس میں بچوں کی دلچسپی کے لیے بہت کچھ معلومات تھی۔

عظیم الدین نانڈگاؤں سامرلوتی

اپریل کا "پیامِ تعلیم" دستیاب ہوا۔ اوپر کا سرِ ورق بہت ہی اچھا بنایا ہے۔ جیسے ہی پیامِ تعلیم ملا دل خوشی کے مارے اچھلنے لگا۔

ظفر آفتاب حسین، دربھنگہ

قلمی دوستی

نام - خالد سجاد - عمر ۱۲ سال
پتہ - محلہ بریاتو - ہوسنگ کالونی - رانچی
مشغلہ - اخبار پڑھنا - پیام تعلیم پڑھنا - فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا - صبح کو ٹہلنے جانا -

---

نام - رشید احمد - عمر ۱۳ سال
پتہ - ثاقب برادرس - یادگیر
مشغلہ - پیام تعلیم، نور، بتول شوق سے پڑھنا

نام - نواب علی وارثی - عمر ۱۴ سال
پتہ - بی بی بلڈنگ دودھ پور - علی گڑھ
مشغلہ - ٹکٹ جمع کرنا - لطیفے لکھنا، قلمی دوستوں کے خطوں کے جواب لکھنا -

---

نام - محمد خلیل طالب - عمر ۱۶ سال
پتہ - نورنگ دروازہ - مکان ۳ - ۱۱ - ۳۴ - رانچور
مشغلہ - فٹ بال، کبڈی، ہاکی وغیرہ کھیلنا - اردو رسالے پڑھنا - مخلوقِ خدا کی خدمت کرنا -

---

نام - ظفر علی - عمر ۱۵ سال
پتہ - معرفت حافظ شوکت علی لائن ہلدوانی ضلع نینی تال
مشغلہ - قلمی دوستی - پیام تعلیم پڑھنا -

نام - عبدالعزیز ملا - عمر ۱۵ سال
پتہ - روم نمبر ۴ پٹیل بلڈنگ نیو چیچن بندر روڈ بمبئی ۹
مشغلہ - فوٹو گرافی، مصوری، قلمی دوستی، اچھے اچھے رسالے پڑھنا

نام - محمد امان اللہ تاباں - عمر ۱۴ سال
پتہ - معرفت رحمت اللہ قریشی - محلہ راجہ باندہ - پوسٹ رانی گنج (بردوان مغربی بنگال)
مشغلہ - ٹکٹ جمع کرنا، دوسرے ملک کے ساتھیوں سے قلمی دوستی (سب سے پہلے خط لکھنے والے کو ایک کتاب تحفہ میں دی جائے گی)

نام - ام - اے - راہی - عمر ۱۱ - سال
پتہ - معرفت اکرام الدین - نیو مارکٹ - پوسٹ رانی گنج بردوان - مغربی بنگال،
مشغلہ - پیام تعلیم پڑھنا - قلمی دوستی (جو بھائی سب سے پہلے خط لکھیں گے - انھیں ایک پاکستانی پرچہ تحفہ میں دیا جائے گا -

---

نام - خواجہ عزیز احمد - عمر ۱۱ سال
پتہ - عزیز منزل، شیر پورہ - ورنگل -
مشغلہ - مضمون لکھنا، لائبریری قائم کرنا - تقریر کرنا اچھے اچھے رسالے پڑھنا -

---

نام - محمود احمد - عمر ۱۳ سال
پتہ - محمود منزل - شیر پورہ ورنگل -
مشغلہ - مضمون لکھنا، کتابیں جمع کرنا - قلمی دوستی -

اسکولوں کی تعلیمی و ادبی سرگرمیاں

مہاراشٹر

یوم اقبال

محمدیہ عربک ہائی اسکول راے ... ب میں ۱۹ اپریل ۷۶ء یوم اقبال منایا گیا۔ صدارت مولانا سید عباس صاحب نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے جناب کریم رومانی صاحب نے شرکت فرمائی اور علامہ اقبال پر ایک اچھی سی تقریر کی۔ عارف نعمانی صاحب نے بھی اقبال کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اسکول کے طالب علموں نے بھی اقبال پر تقریریں کیں۔ مقامی تحصیلدار صاحب نے تلگو میں اقبال کی وطنیت پر تقریر کی۔ اس کے بعد مولانا نے علامہ اقبال کے لیے دعا مانگی اور جلسہ برخاست ہوا۔

بزم نسواں مہاراشٹر کی ٹرافی انجمن اسلام گرلز ہائی اسکول نے جیتی

پچھلی جنوری کے آخری ہفتے میں صوفیہ کالج ہال بمبئی میں بزم نسواں مہاراشٹر کی جانب سے سوشل کلچرل پروگرام پیش کیا گیا۔ مسز علی رضا نے صدارت کی۔ ان اسکولوں نے حصہ لیا: اکبر پیر بھائی اسکول (ڈراما)، انجمن خیر اسلام ہائی اسکول (فوک ڈانس)، طیبہ ہائی اسکول (ڈائیلاگ)، انجمن اسلام گرلس ہائی اسکول (پیروڈی)، داور بھائی فاضل گرلز ہائی اسکول (ایکشن سانگ اور فوک ڈانس)، بمبئی گرلز ہائی اسکول (نے بلو)، اس۔ ام گرلز ہائی اسکول (فوک ڈانس)، رئیس ہائی اسکول بھیونڈی (ڈراما)۔

جج کے فرائض محترمہ عصمت چغتائی، مسز سلطانہ فیضی، مسز خورشید شیخ، مسز ٹومس نے ادا کیے۔ مسز اچوی اگریٹ اور مسز آغا جانی کشمیری مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے شریک تھیں۔

ٹرافی انجمن گرلز ہائی اسکول نے حاصل کی۔ پہلا انعام بھی اسی اسکول کو ملا۔ دوسرا انعام اس۔ ام گرلز ہائی اسکول کو، تیسرا انعام داود فاضل ہائی اسکول کو ملا۔ رئیس ہائی اسکول بھیونڈی اور اکبر پیر بھائی اسکول کی لڑکیوں نے بھی عمدہ اداکاری پر انعام حاصل کیے۔

انٹر اسکولس ڈرائنگ و کرافٹ کا دسواں عظیم الشان مقابلہ

پچھلے دنوں سنیچر اور اتوار کے دن آرٹ اینڈ کرافٹس ٹیچرس ایسوسی ایشن نے ایک عظیم الشان انٹر اسکولس مقابلہ

منعقد کیا لگ بھگ بتیس سو بچوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا۔ مقابلے کا افتتاح جناب ایچ ایچ اسماعیل صاحب نے کیا۔ ملک کے مشہور فلم آرٹس ڈائرکٹر مہمان خصوصی کی حیثیت سے شامل تھے۔ ایسوسی ایشن کے سکریٹری جناب ملا صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اب تک لگ بھگ چوبیس ہزار لڑکے ان مقابلوں میں حصہ لے چکے ہیں۔ موجودہ مقابلے میں بتیس ممتاز اسکولوں کے طالب علموں نے حصہ لیا۔ انجمن اسلام گرلس اینڈ بوائز ہائی اسکولس، جے جے گرلس ہائی اسکول۔ رحمت بائی گرلس ہائی اسکول۔ نیو بھارواہا ہائی اسکول کے طالب علموں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ تقسیم انعام کا جلسہ اور منتخب کاموں کی نمائش کا انتظام بہت جلد کیا جائے گا

سمارنگ اردو اسکول میں جشن جمہوریہ :

جناب عبدالرحمٰن علی صاحب کی صدارت میں بہت دھوم دھام سے یوم جمہوریہ کا جشن منایا گیا۔ صبح کو پربھات پھیری کی گئی۔ پھر جھنڈا لہرایا گیا۔ صبح کو ساڑھے دس بجے جلسہ شروع ہوا۔ تلاوت قرآن اور حمد و نعت کے بعد جناب عبدالرحمٰن بھاروے جناب عبدالغنی عبدالرحمٰن پرکار کی پرجوش تقریریں ہوئیں۔ آخر میں صدر صاحب کی تقریر ہوئی جناب صدر اور اسمعیل دادامیاں بھاروے نے اسکول کو مختلف ضرورتوں کے لیے عطیے دے۔

جامعہ ملیہ :- (از نامہ نگار)

مدرسہ ثانوی کا سالانہ جلسہ :- انجمن طلبہ مدرسہ ثانوی کے اہتمام میں اس مرتبہ بھی ۶ مئی کو مدرسہ ثانوی کا سالانہ جلسہ بہت شان و شوکت سے منایا گیا۔ جناب وائس چانسلر (شیخ الجامعہ) جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب جلسے کے صدر تھے۔ پہلے انجمن کے صدر عبدالحفیظ صاحب نے تقریر کی پھر سکریٹری محمد شمیم صاحب نے انجمن کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔ پھر جناب وائس چانسلر صاحب کے ہاتھوں انعامات تقسیم ہوئے۔ یہ انعام بورڈنگ میں اچھے رہن سہن پر دیے گیے۔ کورس کے مضامین اوّل آنے والوں کو دئے گیے ایک دن کے مدرسے میں سب سے اچھے پڑھانے والے یا سب سے اچھے استاد اور سب سے اچھا انتظام کرنے والے، اپنے بورڈنگوں کو سب سے اچھا سجانے والوں کو دیے گیے اسپورٹس میں اول دوم سوم آنے والے لڑکوں اور لڑکیوں کو دیے گیے آخر میں جناب شیخ الجامعہ صاحب نے موقع کے مناسب دلچسپ تقریر فرمائی اور جلسہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔

ہاں ایک دن کے مدرسے کی بات آگئی ہے۔ تو اس کے بارے میں بھی تھوڑا سن لیجیے۔ مدرسہ ابتدائی اور ثانوی دونوں میں سال میں ایک دن سب کام لڑکوں پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وہی پڑھاتے ہیں۔ دفتر کا اسکول کا سارا انتظام کرتے ہیں۔ اپنے ہوسٹلوں کو سجاتے ہیں۔ استاد اس دن چھٹی مناتے ہیں۔ پکنک کو جاتے ہیں۔

مدرسہ ابتدائی میں الوداعی دعوت اور منظوم تعارف۔

۲۰ مئی [illegible] کو عالی منزل مدرسہ ابتدا

والے دوسرے علاقوں میں بھیجا جائے جو فاقوں پر فاقے کر رہے ہیں۔ کاش اپنے دیس کے طالب علم بھی دیس کے ان پریشان حال لوگوں کے لیے ایسی ہی ہمدردی دکھا سکتے۔

چھ سو برس پہلے کے نل

پچھلے سالنامے میں آپ اورنگ آباد کے نلوں کا حال پڑھ چکے ہیں۔ یہ نل لگ بھگ ساڑھے تین سو سال پہلے ملک عنبر نے بنوائے تھے۔ ان نلوں کے ذریعے پورے شہر کو پانی پہنچتا تھا۔ انجینرنگ کے اس کمال کا پتہ چلانے کے لیے انگریز انجینروں نے انھیں جگہ جگہ سے کھود ڈالا۔ اور یہ نل بے کار ہو گیے

مگر وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اس طرح کے نل جنوب مشرقی علاقے کے ایک گاؤں خاسٹی ٹوئی میں ہیں۔ یہ چھ سو سال پرانے ہیں اور اب تک اسی طرح کام دے رہے ہیں۔ اُس وقت ایک استاد کے مشورے پر لکڑیوں کا ایک زمین دوز سلسلہ بچھایا گیا تھا، جو آج تک بلا کسی ٹوٹ پھوٹ کے کام دے رہا ہے۔ قریب کا ایک پہاڑی چشمہ اسے پانی پہنچاتا ہے۔ خشک سے خشک موسم میں بھی پانی سوکھنے نہیں پاتا۔ کڑاکے کی سردیوں میں بھی پانی پہلے تین میٹر بڑے پائپوں کے ذریعہ چھوٹے چھوٹے ڈبیوں میں بٹ کر دوسری نالیوں کے ذریعے گھر گھر پہنچ جاتا ہے۔ دیس بدیس کے سینکڑوں ماہرین آب پاشی چھ سو برس پہلے کے انجینرنگ کے اس کمال کو دیکھنے کے لیے آچکے ہیں۔ (تصویر ٹائٹل کے تیسرے صفحے پر)

خوب میٹھی نیند سوئیے

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے بجلی کے ایک کارخانے نے عجیب و غریب آلہ ایجاد کیا ہے۔ اس آلے کی مدد سے بے خوابی کا پرانے سے پرانا مریض بھی منٹوں میں میٹھی نیند سو سکتا ہے۔ مریض کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے۔ بیٹری سے چلنے والے بجلی کے اس آلے سے بجلی کی ہلکی ہلکی لہریں نکلتی ہیں اور اس پٹی کے ذریعے مریض کے دماغ تک پہنچ جاتی ہیں اور اسے ایسا لگتا ہے، جیسے غبارے کی طرح ہلکا پھلکا ہو گیا ہے اور فضا میں تیر رہا ہے۔ مریض سو جاتا ہے تو یہ آلہ آپ سے آپ اپنا کام بند کر دیتا ہے۔ اس آلے کی قیمت ڈیڑھ ہزار جرمن مارک ہے اور یہ ابھی صرف ڈاکٹروں کے ہاتھ بیچا جاتا ہے۔

کمپیوٹر یا کھلونا

یہ کھلونے جیسا کمپیوٹر

لڈوگس بافن (جرمنی) کے کیمیائی کارخانے نے اپنی تربیتی تجربہ گاہ میں ریاضی کے استادوں کی نگرانی میں

تیار کرتا ہے اور کولانیہ میں تعلیم و تربیت کا سامان تیار کرنے والی ایک کمپنی نے اسے تجارتی مقصد سے بڑے پیمانے پر تیار کرنا منظور کر لیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ بچوں کو کھیل ہی کھیل میں کمپیوٹر سے کام لینے کا ہنر آجائے۔ اس ننھے منے کمپیوٹر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ لڑکے اسے خود آسانی سے چلا سکتے ہیں اور کھیل ہی کھیل میں کمپیوٹر کی بناوٹ، کام، اور کام کرنے کے طریقے سیکھ سکتے ہیں بلکہ ان کے پروگرام کی ترتیب کا کام بھی انجام دے سکتے ہیں۔

شہری زندگی کی ایک ننھی سی تصویر منی ڈم

اس ننھے منے شہر میں کوئی آباد نہیں ہے۔ پھر بھی بیس تیس لاکھ سیاح اور شوقین ہر سال اسے دیکھنے آیا کریں گے۔ اس شہر میں آپ صرف پیدل چل سکیں گے حالانکہ اس میں دنیا کے تمام ذرائع نقل و حمل بروقت رواں دواں اور متحرک رہتے ہیں۔ یہ شہر ڈسل ڈورف (وفاقی جمہوریہ جرمنی) کے ایک مشہور معمار دل ڈومبل نے اپنے شہر کے قریب ہی بسایا ہے۔ اور اس کا نام منی ڈوم رکھا ہے۔ دنیا کی قریب قریب سبھی مشہور عمارتوں کی ہو بہو نقلیں اس شہر میں ۲۵ — ۱ کے تناسب سے پیش کی گئی ہیں۔ ابھی تک دو ہزار عمارتیں بن پائی ہیں اور انھیں چار سو ماہر بڑھئیوں سنگتراشوں اور نقاشوں نے سات سال کی مسلسل محنت کے بعد تیار کیا ہے اور ۲۲ کروڑ جرمن مارک اس پر خرچ ہو چکے ہیں۔ اس کی قابل دید عمارتوں میں نیویارک کا کینیڈی ایرپورٹ ہے فرانکفرٹ کا مین ریلوے اسٹیشن ہے۔ ایک بہت بڑی بندرگاہ ہے۔ برلن کا اولمپک اسٹیڈیم ہے۔ جرمنی کے تاریخی محل اور گرجے ہیں۔ آئندہ سالوں میں اس میں نئی نئی عمارتیں بنتی رہیں گی۔

زینوں پر اترنے چڑھنے والی گاڑیاں

زینوں پر اترنے اور چڑھنے والی گاڑیاں اب کوئی عجوبہ روزگار یا ان دیکھی بات نہیں رہیں گی۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شہر فرانکفرٹ کے ایک صنعتی کارخانے نے ایک ایسی کل ایجاد کر لی ہے جس کے ذریعے بچوں کی چھوٹی موٹی ہتھ گاڑیوں سے لے کر بڑی بڑی موٹر کاروں تک ہر قسم و ہر سائز کی چھوٹی بڑی گاڑیاں بلا کسی دقت کے زینوں اور سیڑھیوں پر چڑھنے اور اترنے لگ جائیں گی۔ یہ عجوبہ روزگار مشین جس کا نام اس کے موجد نے "زینوں سیڑھیوں پر چڑھنے اترنے والی سائیکل" رکھا ہے، پانچ ڈنڈوں والے ایک چرخی نما پہیے پر مشتمل ہے۔ اس کے ہر ڈنڈے کے سرے پر پلاسٹک کے چھوٹے چھوٹے بیلن نما پہیے لگے ہیں۔ ان ڈنڈوں اور بیلنوں کی مدد سے چھوٹی بڑی گاڑیاں آسانی سے زینوں پر اتر چڑھ سکتی ہیں۔

ودرز، پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا۔

اینگلو عربک ہائر سکنڈری اسکول دہلی کے طالب علم مکیش کمار جنھیں شنکر کے تصویری مقابلہ پر
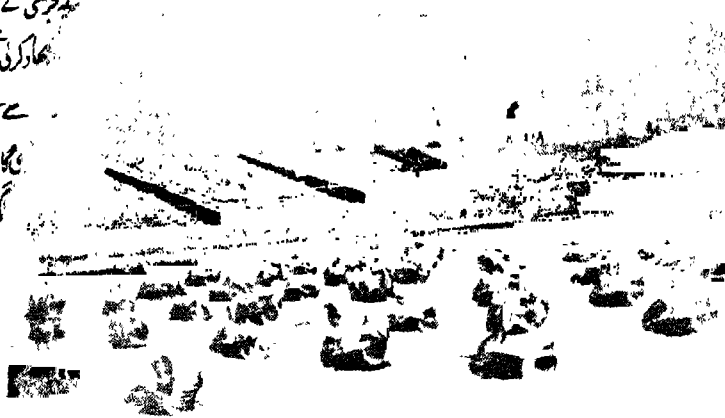
انجمن اسلام گرلس ہائی اسکول ممبئی (پرائمری سکشن) کی طالبات کی جسمانی ورزش
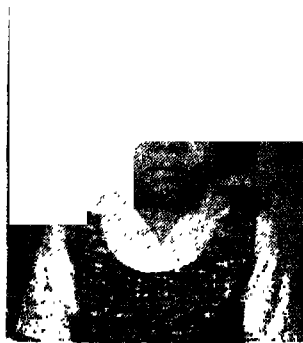
اا سال

نشاط لطیف (جامعہ نگر) عمر ۵ سال

عبدالرحمٰن (ممبئی) عمر ۱۳ سال

)عمر ایک سال

ثمینہ حبیب (ٹونک) عمر ایک سال

خالد رشید (چکدینوی) عمر ۱۲ سال

لطیف (جامعہ نگر) عمر ۱۰ سال

شہزادی خاتون (امروہہ) ایک سال

سراج الدین (ممبئی) عمر ۱۱ سال

ابو اعلیٰ ——— یاسمین بانو (پورنیہ)
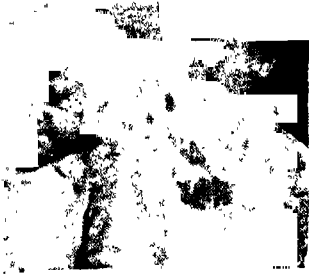
عمر ۳ سال   عمر ۲ سال

رانی (دہلی) عمر ۹ سال
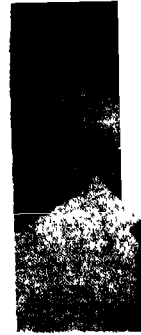
کلام حیدری (ٹیچی)، عمر ۱۳ سال

افضل احمد (دہلی)، عمر ۱۳ سال
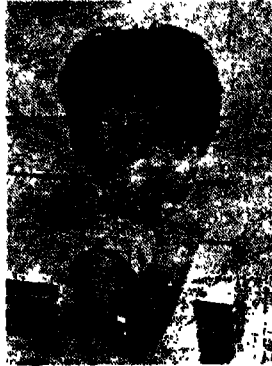
عائشہ ندیم (جامعہ نگر)، عمر ۱۳ ماہ

شاہد میاں (دہلی)، عمر ۴ سال

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیامِ تعلیم دہلی

جلد ۴ —— جولائی ۱۹۶۷ء —— شمارہ ۷

ایڈیٹر: محمد حسین حسّان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال، بمبئی ۳

سالانہ چندہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

سرورق کی تصویر

بچوں کا پارک ——— فوٹو ایس اے چودھری

فہرست

بچوں سے باتیں

پیامیوں کو جون کا پرچہ بہت اچھا لگا۔ کیا مضمون، کیا کہانیاں، کیا نظمیں۔ بچوں کو سبھی بہت پسند آئیں۔ حاجی بابا کی ڈائری، جھبرو، پنچ تنتر کی کہانیاں نیکی کا بدلا بچوں کو خاص طور پر پسند آئے۔ نظموں میں پادری جی، ساجن کے گھر چلی بندریا، سیتل دھوبی کی خاص طور پر تعریف کی گئی ہے۔ دوسری نظمیں دل کی آواز "تقاضا" گرمی کے دن رات وغیرہ بھی بہت پسند کی گئیں۔

افسوس ہے کہ حاجی بابا ہماری آج کی محفل میں شریک نہ ہو سکے۔ ہمارے محترم دوست جناب ظ۔ انصاری صاحب وقت پر مضمون نہ بھیج سکے مجبوراً ہمیں پرچہ مرتب کر کے پریس بھیج دینا پڑا۔ اب آپ حاجی بابا صاحب کی زیارت اگست کے پرچے میں کیجیے گا۔ اور غالباً پشکن کی ایک بہت ہی اچھی نظم کا بھی۔ یہ دونوں چیزیں ہمیں یقین ہے کہ آج کل میں آتی ہوں گی۔

مکتبہ جامعہ بمبئی کی شاخ کے انچارج برادرم شاہد صاحب کے خط سے یہ خوش خبری ملی ہے کہ ذاکر نمبر کے لیے ہمارے ظ۔ انصاری صاحب ایک غیر معمولی چیز لکھ رہے ہیں۔ یہ خوش خبری آپ کے لیے بھی ہے ہمارے لیے بھی۔ کیوں؟ ٹھیک ہے نا! تو پھر آئیے ہم آپ دونوں ظ انصاری صاحب کا پیشگی شکریہ کیوں نہ ادا کر دیں۔

کچھ دنوں سے رسالہ کو پیامیوں کے پاس پہنچنے میں کچھ دیر ہو جاتی تھی۔ ہمارے پریس کی غیر معمولی مصروفیت کو بھی اس تاخیر میں اچھا خاصا دخل ہے۔ اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ پیام تعلیم کی ساری کاپیاں زیادہ سے زیادہ دس بارہ تاریخ تک پریس کے حوالے کر دی جائیں۔ تاکہ دیر کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ ہمارے مضمون نگار بزرگ اور بھائی اس بات کو ذہن میں رکھیں تو ہمیں بڑی سہولت ہو۔

اس پرچے میں بھی آپ کو بہت مزے مزے کی چیزیں پڑھنے کو ملیں گی۔ سب سے پہلے تو آپ

ابو تبسم صاحب کی کہانی پڑھیے۔ پھر پنج تنتر، تیر کمان، ٹھنڈی آگ، ابا جان کی شاعری، چاند میں کا گڈرو، امام بخاری وغیرہ۔ اسی طرح نظموں میں سالانہ امتحان کے سلسلے میں ایک نہ دو اکٹھا تین نظمیں پڑھیے تینوں کی تینوں اپنی جگہ بہت خوب ہیں۔ ان کے علاوہ "وطن یاد آیا" اور دوسری اچھی اچھی نظمیں ہیں۔

پچھلے پرچے کے انھی صفحوں میں ہم نے آپ کو ایک خوش خبری سنائی تھی؛ قبلہ ذاکر صاحب کی صدارت کی خوشی میں ہم ایک خاص نمبر نکال رہے ہیں "ذاکر نمبر" یہ نمبر اگلے ستمبر میں نکلے گا۔ رسالے کے آخری صفحے پر مفصل اعلان ہے۔ اسے پڑھ لیجیے اور دعا کیجیے کہ ہمیں صدر جمہوریہ ہند کے شایانِ شان نمبر نکالنے میں کامیابی ہو۔

ہمارے ایک مضمون نگار تھے درگا پرشاد شاد سلطان پوری۔ یہ شاعر بھی تھے نثر نگار بھی۔ بھوپال کے ایک اسکول میں استاد تھے۔ پیام تعلیم کے لیے بھی انھوں نے ایک ڈراما اور نظمیں لکھی ہیں۔ پچھلے مہینے "ہماری زبان" (ہفتہ وار اخبار) سے اچانک یہ اطلاع ملی کہ ایک عرصے تک بیمار رہنے کے بعد شاد صاحب اپنے عزیزوں دوستوں اور بے شمار شاگردوں کو ناشاد چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو گیے۔ ہمیں اس حادثے کا بہت افسوس ہے اور ان کے عزیزوں سے دلی ہمدردی۔

پچھلے دنوں ہماری اردو دنیا کے دو اور بزرگ اس دنیا سے رخصت ہو گیے۔ لکھنؤ کے جعفر علی خان صاحب اثر اور کراچی کے شاہد احمد دہلوی۔ اثر صاحب مرحوم بڑے گھرانے میں پیدا ہوئے بہت اونچی ملازمتوں پر رہے مگر شاعری ان کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ شاہد احمد دہلوی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے پوتے تھے۔ علم و فضل اور اردو زبان میں مہارت انھیں وراثت میں ملی تھی۔ دہلی سے مشہور رسالہ ساقی نکالتے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں دلی کی سر زمین ان پر تنگ ہوئی تو لاہور اور پھر کراچی میں پناہ لی اور کراچی میں ستم پشتم زندگی گذار کر اللہ کو پیارے ہوئے۔ اِنّا لِلّٰہ وَاِنّا اِلَیہِ رَاجِعُون۔

افسوس ہے کہ بار بار اصرار کے باوجود ہمارے پیامی بہن بھائی، ہمیں خط لکھتے وقت اپنا خریداری نمبر نہیں لکھتے۔ اس سے ہمیں جواب دینے یا خط کی تعمیل میں بہت دشواری ہوتی ہے۔ خاص طور پر اس وقت پریشانی ہوتی ہے جب یہ شکایت آتی ہے کہ انھیں کئی مہینے کا رسالہ نہیں ملا۔ ایسی شکایتیں دور کرنے میں دیر اس لیے ہوتی ہے کہ ہمیں ہزاروں خریداروں کا پتہ تلاش کرنے میں وقت

جناب اخضر بریلوی

رباعیات

خدمت سے کسی کی بھی نہ کتراؤ تم
ہنستے ہوئے ہر ایک کے کام آؤ تم
یہ اپنے پرائے کا ہے جھنجھٹ کیسا
غم کھاؤ تو ہر ایک کا غم کھاؤ تم

موتی یہ پرو لو تو بہادر بن جاؤ
سچوں میں جو ہو لو تو بہادر بن جاؤ
سچ بات بہادر ہی کہا کرتے ہیں
تم جھوٹ نہ بولو تو بہادر بن جاؤ

سورج کے شراروں کی قسم کھاؤ تم
یا چاند ستاروں کی قسم کھاؤ تم
آیندہ زمانے میں چمکنا ہے تمھیں
تابندہ نظاروں کی قسم کھاؤ تم

اس بحرِ ذلالت سے ابھرنا سیکھو
خود دار بنو! آن پہ مرنا سیکھو
دنیا میں کوئی شے بھی نہیں ڈرنے کی
ڈرنا ہے تو اللہ سے ڈرنا سیکھو

گھوڑے کی سواری

جناب ابو تمیم فرید آبادی

گھوڑے کی سواری کرنی آگئی تو یہ فکر ہوئی کہ مشق جاری رہنی چاہیے، ورنہ ساری محنت بے کار جائیگی۔

میرے بھائی صاحب، جو میر صاحب کہلاتے تھے، ان کے پاس ایک گھوڑا تھا تو سہی، مگر وہ بہت زبردست، جنگی قسم کا تھا۔ ہمارے قد سے بہت اونچا۔ اس پر سواری کرنا خطرناک تھا۔

بڑا خطرہ خود میر صاحب کا تھا یعنی وہ گھوڑے سے زیادہ خطرناک، غصیل اور خوفناک تھے۔ اللہ نے یہ مشکل بھی آسان کردی اور ہمارا کام بنا دیا۔

وہ کیسے؟

وہ ایسے کہ میر صاحب اپنے علاقے کے سردار تھے۔ اس زمانے میں لیڈر نہیں ہوتے تھے سردار ہوتے تھے۔ بعد میں سرداروں کو لیڈر کہا جانے لگا۔ یہ سردار بھی لیڈروں کی طرح اپنے گھر، محلے اور شہر کی فکر نہیں کرتے تھے دُور دُور کے شہروں کی فکر میں گھلا کرتے تھے۔

میر صاحب کے پاس دیہاتی اپنے گھوڑوں پر سوار ہو کر آتے تھے۔ اور کئی گھنٹے تک بولتے رہتے یا میر صاحب کی باتیں سُنتے رہتے اور دوپہر کو کھانا کھاکر وہیں درختوں کے سائے میں سو جاتے تھے۔ وہ لوگ ایسے بےخبر سوتے کہ پھر ان کو پتہ نہ چلتا کہ آس پاس کیا ہو رہا ہے۔ میر صاحب اپنے گھر جاکر سو جاتے۔

یہ دیہاتی اپنے گھوڑوں کو، (گھوڑے کا ہیکو، وہ ٹٹو ہوتے تھے) یا تو میر صاحب کے مردانہ مکان میں کھلا چھوڑ دیتے تھے۔ یا کوئی تیز طرار ٹٹو ہوتا تو گردن میں لپٹی ہوئی رسی کھول کر اسی رسی سے باندھ دیتے تھے۔

گدھوں سے دو ایک انچ اونچے ٹٹوؤں سے ہم نے گھوڑے سواری کی مشق کی۔ اس طرح خاصے گھوڑے سوار بن گئے۔ مگر جس طرح ہر کام کی مشق میں

کچھ دِقت، پریشانی ہوتی ہے اسی طرح ہم کو بھی بہت دفعہ دِقت اٹھانی پڑی، پریشانی بھی ہوئی —— ایک پریشانی کا حال سنو۔

اس دن میں، اجی، جندو ہم تین گھوڑے سوار تھے ۔صرف تین۔ اور ٹٹو بڑا جوان، چکنا، من چلا تھا۔ تھوڑی دُور تک تو وہ بڑی شرافت سے ہمارے ساتھ چلتا رہا۔ جب ہم اپنے "میدان گھوڑا سواری" یعنی کچے قبرستان میں پہنچے تو اس نے کان کھڑے کیے۔ اجی صاحب اچھل کر اس کی پیٹھ پر جا چپکے۔ ٹٹو صاحب نے پیچھے کے پاؤں ایسے ڈھب سے اُچھالے کہ اجی صاحب ٹٹو صاحب کی گردن پر جا پہنچے۔ ٹٹو صاحب نے اپنی گردن اس طرح جھڑجھڑائی کہ اجی صاحب پتوں کی طرح جھڑ کر نیچے آپڑے۔

یہ ٹٹو صاحب کی بڑی گستاخی تھی، اجی صاحب اسے معاف نہیں کر سکتے تھے۔ اجی صاحب نے سیدھے ہاتھ میں ٹٹو صاحب کی لگام تھام رکھی تھی اور الٹے ہاتھ میں گیلی مہندی کی قمچی۔ اجی صاحب اللہ کی طرف سے کھبّے پیدا ہوئے تھے، یعنی ان کے بائیں ہاتھ میں بڑی طاقت تھی۔

بس جناب اجی صاحب نے مہندی کی قمچی ایسے زنّاٹے سے ٹٹو صاحب کے چوتڑوں پر چپکائی کہ ٹٹو صاحب تل ملا کر چھپٹے۔ ابھی دو قدم نہیں ہٹے ہوں گے کہ ٹٹو صاحب کی عین گردن پر قمچی ایسی پڑی کہ گردن کی طرح گول ہوگئی اور جس جگہ بال نہیں تھے وہاں گوشت ابھر آیا۔ ٹٹو صاحب تو پہلے ہی فُل اسپیڈ کا ارادہ کر چکے تھے، یہ بجلی کی سی چمک جب گردن کے گرداگر پڑی تو ٹٹو صاحب کو سچ مچ کے تارے نظر آگئے اور وہ فل اسپیڈ سے بھی تیز رفتاری میں دوڑ پڑے۔

اجی صاحب نہ ٹٹو کی اولاد تھے نہ ان کے دادا گھوڑے، مگر شاباش، بڑا ساتھ دیا۔ یعنی قبرستان سے لے کر نہر کے پل تک اجی صاحب لگام تھامے تھامے مہندی کی قمچی سے ٹٹو صاحب کے ٹانگوں کو بجلی کا کرنٹ پہنچاتے رہے۔ اللہ اکبر!

یہ فاصلہ تو زیادہ نہیں تھا، یعنی کوئی آدھ میل ہوگا۔ مگر رفتار اتنی خطرناک تھی کہ میں اور جندو بہت پیچھے رہ گئے۔ حالاں کہ جندو مدرسے میں ہر دوڑ میں اوّل آتے تھے۔ ان کو دوڑنے کے علاوہ ایک کمال اور بھی آتا تھا۔ جسے اڑنگا کہتے ہیں۔ یعنی جو ان سے آگے بڑھنے لگتا اسے ایسی مکاری سے اڑنگا مارتے تھے کہ وہ بے چارہ گرنے کے باوجود جندو صاحب کا شکر گذار ہوتا کہ "تم نے مجھے سنبھال لیا ورنہ بے ڈھب گرتا"۔

میں اور جندو جب نہر کے پل پر پہنچے تو دیکھا کہ

اجی صاحب ایک خاک کے بگولے کے پیچھے بگولے کی طرح بگ ٹٹ چلے جارہے ہیں، ٹٹو صاحب کا نام ہے نہ نشان ـــــ اگلا بگولا ٹٹو صاحب کو ڈھانپے لیے جارہا تھا۔

لالہ چھنگا سنگھ کے باغ میں پہلے بگولا گھسا اس کے بعد اجی صاحب کو داخل ہوتے دیکھا اور پھر ہم کو صرف آملن اور آم کے درخت نظر آئے۔ میں اور جندو لالہ چھنگا سنگھ کے باغ میں گھسے تو وہاں تین مالیوں کو پوری طاقت سے ہنستے پایا۔ جندو صاحب بڑے شہری مذاق والے تھے ایک دم گرم ہو کر بولے "ابے ہنستے کیوں ہو" ایک نے تو سنا ہی نہیں، دوسرے نے سمجھا ہی نہیں، تیسرے نے کہا "ایں جی"۔ جندو صاحب نے اپنا سوال نہیں دوہرایا۔ "وہ کدھر گیا بے جانور"

"کون جی؟"

"کون جی کے بچے۔ وہ ٹٹو"

"ٹٹو؟ اچھا جی ٹٹو"

دوسرا مالی ہنسی روک چکا تھا اور جندو صاحب کے اجلے پاجامے سے ان کی حیثیت سمجھ چکا تھا۔ بولا۔ "ٹٹو تو جی جانوں فالسوں سے پار ہو چکا ہوگا" یہ دیہاتی سوال کا جواب ہمیشہ ایسے الفاظ میں دیا کرتے ہیں کہ دو سوال پھر کرنے پڑیں۔

مثلاً، پہلا سوال یہ کہ فالسوں سے پار کیا معنی؟ اس باغ میں چھوٹے موٹے دو تین باغ تھے۔ ان میں سے ایک حصہ محض فالسوں کا تھا۔ میں نے اجی صاحب کی خیریت پوچھی، تو وہ پھر ہنس پڑے۔

"ابے ہنسنے کی کیا بات ہے، جانور" جندو صاحب نے پوچھا۔

"لوجی۔ بات نہیں ہے۔ پہلے تو وہ سامنے والے چوبچے میں گرے۔ وہ تو اس میں پانی نہیں تھا۔ بس کیچڑ ہی تھی ....."

دوسرے نے بات کاٹی "اجی بجلی کی طرح اس میں سے تو نکل گیے" پہلے نے اپنی بات پوری کرنے کو کہا "پھر گلاب میں پھنس گئے"

تھوڑی دیر تک جندو صاحب تحقیقات میں لگے رہے، دراصل وہ سستا رہے تھے۔ میں بھی سانس ٹھیک کر رہا تھا۔ اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک بھوت چلا آرہا ہے۔

وہ تو مہندی کی باڑ کا خدا بھلا کرے کہ ہم نے اجی صاحب کو پہچانا، ورنہ بھلا آپ ہی انصاف کیجیے ایک شخص کو سفید کپڑوں میں دیکھنے کے بعد چند منٹ کے اندر وہ سر سے پیر تک کالا کالا، سبز سبز، نیلا نیلا، بھورا بھورا بن کر آجائے گا تو کیا آپ اسے پہچان لیں گے؟ کالا اور سبز رنگ تو اجی صاحب کو سامنے والے چوبچے

نے اللہ واسطے یعنی مفت دے دیا تھا۔ بھورا رنگ۔ ان کو نالے کے باہر ایک اونچی سی ڈزل (سرحد) نے بخشا جس پر اجی صاحب غلطی سے گر گیے تھے۔ اور ثبوت میں اپنا چھلا ہوا گھٹنا دکھا رہے تھے۔ حالاں کہ اس کی ضرورت نہیں تھی۔ گھٹنے کی ہڈی ہی صاف نظر آ رہی تھی، چار انچ مربعہ پاجامہ ایسا صفائی سے اڑ گیا تھا کہ کسی گواہی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔

خیر صاحب ہمدردی کا جذبہ تو بعد میں پیدا ہوا پہلے تو میں اور جندو بے اختیار ہنس پڑے۔ باغ کے مالیوں نے بھی ہمارا ساتھ دیا۔ مگر ہولے ہولے۔ اصل میں وہ پہلے ہی لطف اٹھا چکے تھے۔ ہنسی کے بعد بھی جندو صاحب نے ہمدردی ظاہر نہیں کی، بلکہ ٹٹو صاحب کی خیریت پوچھی۔ "وہ؟ وہ بے ایمان"۔ اجی نے سرخ رو ہو کر جواب دیا۔ "یاد کرے گا کہ کس سے پالا پڑا تھا"۔

قصہ مختصر ٹٹو صاحب بہت دور نکل گئے تھے اور اجی صاحب کہتے تھے کہ ہم دونوں (یعنی میں اور جندو) ہمت کریں تو بس دو تین گھنٹے کے اندر اسے پکڑ سکتے ہیں، اس لیے کہ اجی صاحب نے ٹٹو صاحب کو مہندی کی قمچی کی ضربوں سے خاصا کمزور کر دیا ہے۔

اے دوستو! جو یہ پڑھ رہے ہو۔ سنو کہ یہ جون کا مہینہ اور ایک بجے کا وقت تھا۔ اجی صاحب کے تخمینے کے مطابق ٹٹو صاحب کی گرفتاری چار بجے تک عمل میں آ سکتی تھی۔ میری آنکھوں کے آگے ہلکا سا اندھیرا آ گیا، گرمی کے خیال سے۔ پھر انہی آنکھوں کے آگے کالا بادل آ گیا ——— میر صاحب کے خیال سے۔ یعنی بے زبان کا یہ ٹٹو صاحب تھا۔ وہ سو کر تین بجے اٹھیں گے۔ اور میر صاحب کو خبر کرے گا... ——— خطرہ خطرہ خطرہ!!

جندو صاحب پروگرام بنانے کے بھی ماہر ہیں انھوں نے ان تینوں مالیوں ہی سے ایک جوان کو چھانٹ کر لالچ دیا اور ساتھ لے لیا۔ اس طرح ہم چار جان داروں نے دو گھنٹے کی پوری کشمکش، بھاگ دوڑ کے بعد ایک جان دار المعروف ٹٹو صاحب کو پکڑا!

یہ جان دار المعروف ٹٹو صاحب اب بھی تر و تازہ تھا۔ مگر اب چار جان داروں نے اس کو گھیر لیا تھا۔ اجی صاحب چوں کہ بہت تھک گئے تھے۔ اس لیے سوار ہوے۔ جندو صاحب نے چوں کہ نقشہ پکڑنے کا بنایا تھا۔ اس لیے سوار ہو گیے۔ میں چوں کہ اصلی چور تھا۔ اس لیے لگام پکڑ کر چلا۔ اور مالی نے ایک موٹی سی رسی ٹٹو صاحب کی زخمی گردن پر مزید باندھ دی۔ ایسے ڈھب سے باندھی کہ جس جگہ ٹٹو صاحب کی گردن پر مہندی کی گیلی قمچی کا گومڑا ابھر آیا تھا۔ وہ دبتا رہے۔

اے دوستو! یہ تھی پریشانی۔ مگر یہ پریشانی

ختم نہیں ہوئی تھی ۔ ہاں جناب ۔ ابھی کسر باقی تھی ۔ وہ کیا کسر تھی ؟ وہ کسر یہ تھی کہ جب ہم کچے قبرستان میں پہنچے تو ٹٹو صاحب کے مالک سے مڈبھیڑ ہو گئی ۔ خدا جھوٹ نہ بلائے، میرا تو جی چاہا کہ کسی دھنسی ہوئی قبر میں چھپ جاؤں ۔ مگر دوستو، کون زندہ قبر میں گھستا ہے جو میں گھس جاتا ۔ اچی صاحب کا دل بھی بہت دھکڑ پکڑ کرنے لگا ۔ مگر واہ رے جندو بہادر ۔ جب مالک نے کہا " ارے بے رحمو! یہ تم نے اس بے زبان کا کیا حال بنایا ہے" تو جندو صاحب نے بے زبان کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے کہا " اے ہمارا حال نہیں دیکھتے ؟" اس کے بعد جندو صاحب نے اپنی ہمدردی اور اللہ واسطے کی بھاگ دوڑ کا قصہ ایسے الفاظ میں سنایا کہ مالک ٹٹو صاحب خوش ہو گیا ۔

یہ تو تھا پریشانی کا قصہ ۔ رہا دقت کا قصہ ۔ تو وہ ایک نہیں کئی قصے ہیں ۔ ان میں سے ایک مختصر سا قصہ یہ ہے کہ ایک منہ زور ٹٹو سے ہمارا واسطہ پڑ گیا ۔ دیکھنے میں تو وہ خاصا مریل تھا، مگر بڑا بدمزاج نکلا ۔ یعنی جندو اور اچی نے اچھل اچھل کر کئی بار اس کی پیٹھ پر بیٹھنے کی کوشش کی ۔ اور ہر بار ناکام ہوئے ۔ رکاب میں پاؤں ڈالنے سے پہلے ہی اچھلنے لگتا تھا ۔ اس کا حل جندو نے یہ بتایا کہ " اسے حکیم جی کے نہرے میں لے چلو" یہ نہرہ کچی چار دیواری کا تھا ۔ ایک ٹوٹا پھوٹا دروازہ بھی تھا ۔ باقی اور کچھ نہ تھا ۔ یہ ایک قطعہ زمین تھا جس میں پانچ چھ پلنگ بچھائے جاتے تھے ۔ اس کے اندر اس مریل بدمزاج ٹٹو کو بند کر کے آدھا گھنٹے تک ہم چار شہ سواروں نے دوڑایا ۔ چاروں کے ہاتھوں میں ایک ایک قمچی تھی ۔ اچی، جندو دروازے پر تھے ۔ جس شہ سوار کے پاس سے وہ گذرتا ایک قمچی کا وار سہتا اور بھاگتا ۔ آدھے گھنٹے میں وہ بھی تھک گیا اور شہ سواروں کے بازو بھی شل ہو گئے ۔ اب جب کہ ہماری محنتوں کا پھل ملنے والا تھا ۔ قسمت کی خوبی دیکھیے کہ حکیم صاحب آن دھمکے ۔ ٹٹو کو بدحال اور ہمارے منہ پر ہوائیاں دیکھ کر انھیں ٹٹو پر تو رحم آ گیا ۔ مگر ہم پر مطلق نہ آیا ۔ جندو کے ایک ایسا سپاٹ دار چنگٹ مارا کہ بقیہ شہ سوار دیوار پھاند کر بھاگ کھڑے ہوئے ۔ میں جس جگہ کودا (یعنی گرا) وہاں مہندی کی خشک لکڑیوں کا ڈھیر تھا ۔ چوٹ تو واللہ مطلق نہ آئی، مگر پنڈلیوں اور کہنیوں تک اتنے کانٹے لگے کہ جگہ جگہ سے خون نکل آیا ۔ گھر میں گھسا تو جواب طلب کیا گیا کہ " اے بدنصیب ۔ تو اتنے کانٹوں میں گھسا کیوں تھا ؟ اندھا ہے؟ اگر پاجامہ جگہ جگہ سے زخمی نہ ہوتا تو جواب طلبی کی نوبت نہ آتی ۔ اس زمانے میں بچوں کی کھال سے زیادہ قیمتی چار آنے گز کا لٹھا سمجھا جاتا تھا ۔ چاہے پاجامہ پرانا ہی کیوں نہ ہو ۔

کامیاب

عنّاب خضر بستی

چاکلیٹ کا اک ڈبہّ پہلے سامنے لاکر رکھ دو
خوشی کی پیاری امّی تم کو بات سناؤں گا
ڈیڈی سے مت کہنا کچھ بھی، خود کرلوں گا بات
ان کو میں تفصیل سے ساری بات بتاؤں گا

ان سے میں چاہوں گا اپنی محنت کا کچھ پھل
کروں گا میں ان سے کبھی نہ کوئی ٹیڑھا ایک سوال
رات کو میں نے رات سمجھا اور نہ دن کو دن
نہیں سنوں گا اس موقع پر کوئی بھی قیل و قال

سودے بازی سے اب ان کی نہیں چلے گا کام
میٹھی میٹھی باتوں ہی میں کر جاتے ہیں گول
بہلانا پھسلانا گویا ان کی ہے اک عادت
ان کی عادت میں ہے شامل کرنا ٹال مٹول

سلک کا اچھا سوٹ بنے گا اور لگے گی ٹمی
ہم بھی کریں گے اس موقع پر اپنے دل کو شاد
ڈیڈی اور امّی کا میری خواب ہوا ہے پورا
آئیں گے سب لوگ یقیناً دینے مبارک باد

جناب خضؔر برنی

ناکام

گھر میں قدم کے رکھتے ہی کھل جائے گا بھرم
امّی کو اپنی دوں گا میں کیوں کر کوئی جواب
بیٹا دکھاؤ ہم کو بھی اپنا رزلٹ کارڈ
ان کے ہر اک سوال پہ ہونا ہے لاجواب
مجھ سے سوال ہوگا کہ تم پاس ہو گئے؟
میزان نمبروں کی ہمیں بھی دکھاؤ تم
ہندی میں کتنے، اردو میں کتنے ہیں دیکھ لیں
اور ہسٹری کی بات ذرا کچھ سناؤ تم
جغرافیہ، جیومیٹری، انگلش، حساب میں
کر شمی میں سب کلاس میں اوّل ہو تم ضرور
اپنی کلاس میں ہے ڈرائنگ کا کیا جواب
مُنّا ہمارا سارے محلّے میں ذی شعور
کچھ اور بھی تھے جملے جو امّی نے کہہ دیے
ہم دل ہی دل میں ان کا قصیدہ سنا کیے
امّی نے اک گلاس میں شربت ہمیں دیا
ناکام آرزوؤں نے دو گھونٹ پی لیے

جناب محب احمد خاں

تیر کمان اور تیر اندازی

دنیا کتنی بدل گئی ہے۔ زمانہ کتنا بدل چکا ہے؟ اس سوال کا ٹھیک جواب تو تاریخ جاننے والا ہی دے سکتا ہے۔ پر اس کا کچھ کچھ اندازہ تم آپ اپنی روزمرہ میں کام آنے والی چیزوں سے بھی لگا سکتے ہیں۔

دیکھیے ایک زمانہ تو وہ تھا جب سو پچاس میل کے سفر میں بھی کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ آج ہوائی جہاز میں اپنا مزے سے بیٹھ کر سینکڑوں ہزاروں میل کا سفر چند گھنٹوں میں طے کر لیجیے۔ پہلے ایک جگہ کی خبر دوسری جگہ پہنچنے میں کئی کئی ہفتے بلکہ مہینے لگ جاتے تھے۔ آج یہ خبریں ریڈیو کے ذریعے پلک جھپکتے دنیا کے کونے کونے میں پہنچ جاتی ہیں اور دیکھیے آج شکار یا اپنی حفاظت کے لیے طرح طرح کے ہتھیار مثلاً بندوقیں توپیں اور میزائل ایجاد ہو چکے ہیں۔

پر ایک زمانہ وہ بھی گذرا ہے جب اُن کاموں کے لیے سب سے مہلک ہتھیار تلم، بھالا اور تیر کمان مانے جاتے تھے اور اس تیر کمان کا رواج تو ہماری دنیا میں بہت دنوں تک رہا ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ انسان نے تیر کمان ایجاد نہ کیا ہوتا تو آج اس زمین پر اس کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ ہزاروں ہزار سال تک انسان نے تیر کمان ہی کے ذریعے اپنی خوراک حاصل کی ہے اور دوسروں پر فتح حاصل کی ہے۔
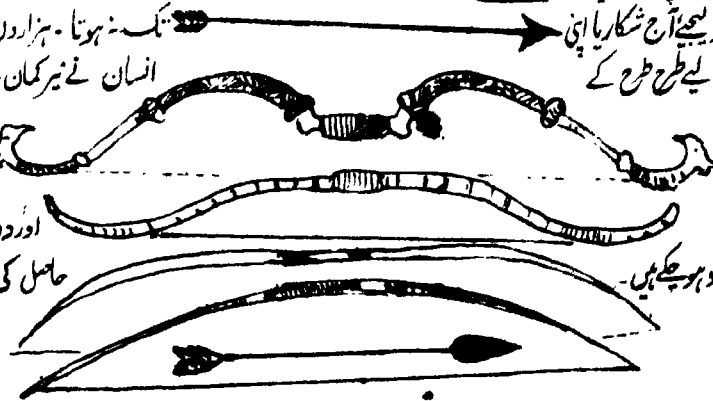
یہ تیر کمان کس کی ایجاد ہے یہ ہم آپ کو ٹھیک ٹھیک نہیں بتا سکتے ۔ البتہ شمالی افریقہ کے ملک تیونس کی ایک پرانی آبادی کی کھدائی کے وقت کچھ ایسی چیزیں اور ایسے نشانات ملے ہیں جن سے اندازہ لگایا گیا ہے کہ اب سے لگ بھگ پچاس ہزار برس پہلے وہاں کے لوگ تیر کمان استعمال کرتے تھے ۔

یورپ کے ملک اسپین کی بعض چٹانوں پر بنے ہوئے پرانے نقش و نگار میں تیر کمان کی تصویریں بھی دکھائی دیتی ہیں ۔ یہ نقش و نگار اب سے پندرہ سولہ ہزار برس پہلے کے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسپین کے لوگ اس زمانے میں تیر کمان کا استعمال سیکھ چکے تھے ۔ ہمارے دیس ہندوستان میں تیر کمان کا استعمال رامائن کے زمانے میں عام ہو چکا تھا ۔ کچھ ایسا لگتا ہے کہ دنیا کے مختلف ملکوں میں تیر کمان کی ایجاد مختلف زمانوں میں ہوئی ۔

اُس زمانے کی کمانیں مضبوط اور لچک دار لکڑی یا بانس کی بنائی جاتی تھیں ۔ ان کمانوں میں ڈوری جانوروں کی کھال یا بٹی ہوئی تانت کی لگائی جاتی تھی ۔ تیر مضبوط بانس یا بید کے بنائے جاتے تھے ۔ اور ان کے پھل، نوکیلے پتھر، ہڈّی، ہاتھی دانت یا جانوروں کے سینگوں کے ۔ غرض تیر کمان کی حکومت سینکڑوں بلکہ ہزاروں برس تک رہی ۔ اسی ہتھیار کی بدولت ہزاروں سلطنتیں بنیں اور ہزاروں بگڑیں ۔ چین ہو یا بابل، مصر ہو یا یونان، ہندوستان ہو یا انگلستان ان سب ہی ملکوں کی تاریخ اور تہذیب بنانے اور بگاڑنے میں تیر کمان نے ہمیشہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا ۔

اب سے کوئی چار سو سال پہلے تک دنیا میں تیر کمان کا دور دورہ رہا ۔ اس کے بعد جب بارود اور بندوق ایجاد ہوئی تو تیر کمان کی اہمیت گھٹتی گئی اور اب تو نوبت یہاں تک آپہنچی کہ ہم آپ جیسے اس کی اصل شکل وصورت دیکھنے تک کو ترستے ہیں ۔ یہ دوسری بات ہے کہ بچپن میں ہم سب ہی بانس کی کھپچی کی کمان اور جھاڑو کی تیلی کا تیر بنا بنا کر تیر اندازی کا مزہ اٹھا لیتے ہیں ۔ تیر کمان کا چلن آج کی مہذب دنیا میں کہیں نہ رہا ۔ ہاں افریقہ اور امریکہ کے پچھڑے اور نیم وحشی قبیلے اب بھی اس تیر کمان کے بل پر زندگی بسر کرتے ہیں ۔

تیر اندازی کے فن میں ایشیائی گھاس کے میدانوں میں رہنے والی خانہ بدوش قوموں نے جو مہارت حاصل کی وہ کسی اور قوم کو حاصل نہ ہو سکی ۔ ہُن اور منگول جیسی قوموں نے چنگیز خاں، ہلاکو اور تیمور لنگ جیسے جابر بادشاہوں کی فوجوں نے اپنے بے پناہ تیروں سے دنیا میں جو تباہی پھیلائی اس کی مثال نہیں ملتی ۔ ان کے سپاہی اس فن کے ماہر ہوتے تھے ۔ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے آگے پیچھے، دائیں، بائیں جدھر چاہیے ۔ بے دھڑک تیر چلاتے تھے اور نشانہ

کبھی خطا نہ ہوتا تھا۔ چنگیز خاں کی فوج میں ایسے ہی تیر انداز
پانچ لاکھ سے بھی زیادہ تھے۔ یہ فوج ہی حملے میں دشمن
پر ساٹھ لاکھ تیر چلا سکتی تھی۔

اب آپ ہی سوچیے کہ ایسے طاقتور اور خطرناک
دشمن کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔

ہندوستانی تیر اندازی کا سنہری زمانہ رامائن
اور مہابھارت کا زمانہ تھا۔ شری رام چندر جی، ارجن
اور ویر ابھمنیو کے قصّوں اور ہندوستانی دیومالا کی کہانیوں
میں تیر اندازی کے ان گنت ایسے واقعات ملتے ہیں جنھیں
پڑھ کر تعجب ہوتا ہے۔

مغربی یورپ اور انگلستان میں تیر اندازی کے
فن نے بارہویں صدی سے پندرھویں صدی عیسوی
تک بڑی ترقی کی۔ انگلستان کی سو سالہ جنگ کے زمانے
میں، جو چودھویں پندرھویں صدی میں لڑی گئی طرح طرح کی
کمانیں ایجاد ہوئیں۔ اسی زمانے میں چھ چھ فٹ لمبی
کمانیں اور تین تین فٹ لمبے تیر بنائے گیے۔ یہ بہت
مضبوط ہوتی تھیں اور بہت دور تک تیر پھینک سکتی تھیں
اسی لیے یہ بہت مقبول ہوئیں

اب تیر کمان کی اہمیت ہتھیار کے لحاظ سے
بالکل ختم ہو چکی ہے۔ ہاں بعض ملکوں میں تیر اندازی کھیل
اسپورٹ کی حیثیت سے ابھی زندہ ہے۔ کرکٹ کلب، یا
ہاکی کلب اور سوکر کلب کی طرح بعض ملکوں میں
تیر اندازی کے کلب اور سوسائٹیاں بھی قائم ہیں۔

انگلستان میں تیر اندازی کی ایک بڑی پرانی
سوسائٹی ہے۔ اس کا نام ہے "گرانڈ نیشنل آرچری سوسائٹی"
اس سوسائٹی کے تحت ملک بھر میں لگ بھگ ساڑھے
چھ سو کلب چل رہے ہیں۔ ان کلبوں کے ممبروں کی تعداد
پندرہ ہزار سے بھی زیادہ ہے۔ اِدھر امریکہ میں تیر اندازی
کے کھیل کو بڑی مقبولیت حاصل ہو رہی ہے تیر اندازی
کے ہزاروں کلب قایم ہیں۔ ان کے ممبروں کی تعداد
پچھتر لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔

دوسرے کھیلوں کی طرح تیر اندازی کے ملکی
اور عالمی مقابلے ہوتے ہیں۔ عالمی مقابلوں کا انتظام
کرنے کے لیے ایک باقاعدہ انجمن ہے۔ یہ انجمن ہر
دوسرے سال عالمی چمپین کے انتخاب کے مقابلے
کرواتی ہے۔ عورتیں اور مرد دونوں ان مقابلوں میں
حصّہ لیتے ہیں۔ پچھلے چند برسوں میں جو مقابلے ہوئے
ان میں چمپین شپ حاصل کرنے کی عزت یا تو امریکہ
کو ملی یا سوئٹزرلینڈ کو۔ دنیا کے کسی اور ملک کو یہ فخر
حاصل نہ ہو سکا۔

یہ مقابلے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک
نشانہ بازی کے اور دوسرے زیادہ سے زیادہ فاصلے
تک تیر پھینکنے کے۔ دونوں مقابلے بڑے دلچسپ
ہوتے ہیں۔

دوسری قسم کے مقابلے نے طرح طرح کی
نئی نئی کمانیں ایجاد کرنے میں بڑی مدد کی ہے۔ لکڑی

باقی صفحہ ۲۲ پر

جناب برقؔ بہاری
ہے آم کے نام میں یہ دلچسپ اثر
جاتی نہیں یاد اس کی دل سے اکثر
بوڑھوں کا جوانوں کا یہاں ذکر ہو کیا
بچّوں کو بھی ہے آم کا پیارا ازبر
آموں کی جو گٹھلیاں اُپجتی ہیں کہیں
بچّوں کو ہو پھر صبر یہ ممکن ہی نہیں
گھِس گھِس کے بناتے ہیں پپیہے ان کے
پھرتے ہیں بجاتے ہوئے پٹ پیں پٹ پیں

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

(سلسلہ)

ڈھول کا پول

پھر دمنک گیدڑ نے پنگ لک شیر کو گیدڑ اور ڈھول کی کہانی سنائی :۔

"گومایو نام کا ایک گیدڑ بھوکا پیاسا جنگل میں گھوم رہا تھا۔ گھومتے گھومتے وہ ایک لڑائی کے میدان میں پہنچ گیا۔ اس میدان میں کچھ ہی دنوں پہلے گھمسان کا رن پڑا تھا لڑائی تو ختم ہو گئی تھی مگر ایک بڑا سا ڈھول ابھی تک میدان میں پڑا تھا جب ہوا چلتی تھی تو آس پاس کی بیلوں کی شاخیں اس ڈھول میں لگتی تھیں اور وہ بج اٹھتا تھا۔ اچھی خاصی زور کی آواز نکلنے لگتی تھی۔

گومایو گیدڑ نے اچانک یہ آواز سنی تو سہم گیا۔ اُس نے سوچا کہ یہ بھیانک آواز والا جانور کہیں مجھے دیکھ نہ پائے۔ اچھا ہے کہ میں پہلے ہی کھسک جاؤں مگر فوراً ہی اُسے ایک بات یاد آئی کہ خوف یا خوشی کے وقت (بے سوچے سمجھے) کوئی کام نہ کر بیٹھنا چاہیے۔ یہ سوچ کر وہ آواز کی طرف چل پڑا۔

قریب پہنچا تو ڈھول نظر آیا۔ بیلوں کی شاخیں ہوا کے زور سے اس پر لگ رہی تھیں۔ گومایو خود بھی اُس پر ہاتھ مارنے لگا۔ ڈھول اور بھی زور سے بج اٹھا۔

گومایو گیدڑ نے سوچا یہ جانور تو بہت سیدھا سادہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کا جسم بھی بہت بڑا ہے۔ اس میں گوشت بھی بہت ہوگا، چربی بھی بہت ہوگی، خون بھی بہت ہوگا۔ کئی دن کے لیے میری بھوک کا سامان ہو گیا۔

یہ سوچ کر اُس نے ڈھول کے اوپر لگے ہوئے چمڑے میں دانت گڑو دیے۔ چمڑا بہت سخت تھا کھینچا تانی میں اس کے دو دانت بھی ٹوٹ گئے مگر اس

نے ہمت نہ ہاری ڈھول میں سوراخ کر ہی ڈالا۔ مگر اس
سوراخ کو اور چوڑا کرکے گومایو اندر گھسا تو بے چارے کو
بڑی مایوسی اور ناامیدی ہوئی ——— وہ تو اندر سے خالی تھا!"

یہ کہانی سنا کر دمنک نے شیر کو آگاہ کرتے ہوئے
کہا:۔

"اسی لیے تو میں کہتا ہوں کہ محض اونچی آواز سے
ڈر جانا ٹھیک نہیں۔"

پنگ لک شیر نے کہا:۔ "ٹھیک ہے مگر میرے
ساتھی بھی اس آواز سے ڈر کر اس جنگل سے بھاگنے کی سوچ
رہے ہیں۔ میں انھیں کیسے روکوں؟"

دمنک:۔ مگر اس میں ان کا کیا قصور ہے۔ غلام تو آقا
کے پیچھے پیچھے اس کے نقش قدم پر چلتے ہیں۔ جیسا آقا ہوگا
ویسے ہی اس کے غلام ہوں گے۔ دنیا کی یہی ریت ہے۔
آپ اطمینان رکھیے اور ذرا ہمت سے کام لیجیے۔ میں جلد ہی
اس آواز کا بھید معلوم کرنے کی کوشش کروں گا۔

پنگ لک:۔ پر تو وہاں جانے کی ہمت کیسے کرے گا؟

دمنک:۔ یہ میرے اوپر چھوڑ دیجیے۔ آقا کا حکم بجا لانا
غلام کا فرض ہے۔ اگر آپ حکم دیں تو میں آگ میں کود پڑوں
سمندر میں چھلانگ لگا دوں۔

پنگ لک:۔ اچھا تو دمنک
جاؤ اس آواز کا پتہ لگاؤ
تمھیں اس میں کامیابی
نصیب ہو بس
یہی ہماری دعا ہے۔

(دمنک گیدڑ پنگ لک شیر کو
سلام کرکے رخصت ہوا اور جدھر سے آواز آرہی تھی
اس سمت کا اندازہ کرکے اسی رخ چل پڑا۔)

دمنک کے جانے کے بعد شیر نے سوچا۔ میں
نے دمنک پر بھروسا کرکے اسے اپنے دل کی بات بتادی
یہ میں نے اچھا نہیں کیا۔ کہیں وہ دوسرے گروہ سے
نہ مل جائے اور کہیں وہ اس گروہ کو میرے اوپر حملہ کرنے
کے لیے نہ اکسا دے۔ مجھے اس پر اعتبار نہ کرنا چاہیے
تھا۔ وہ وزارت کے عہدے سے الگ کر دیا گیا ہے
اس کا باپ بھی میرا وزیر تھا۔ ایک بار عزت ملنے کے بعد

ب کسی کی بے عزتی ہو جاتی ہے تو وہ اعتبار کے قابل
ہیں رہتا۔ اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے موقعے ڈھونڈتا
رہتا ہے۔ اب میں کسی دوسری جگہ جاکر دمنک کا انتظار
کرتا ہوں۔

ادھر دمنک ڈھونڈتا ڈھانڈتا آخر اس بھیانک
آواز والے جانور کے قریب پہنچ گیا اور اسے دیکھتے ہی اسے
بے انتہا خوشی ہوئی ــــ وہ کوئی بھیانک جانور نہیں تھا
ایک سیدھا سادھا بیل تھا بے چارہ۔

دمنک نے سوچا، اب میں حکمت عملی سے کام
لے کر جنگل کے سوامی اور اپنے آقا پنگ لک شیر کو اپنے
بس میں کر سکتا ہوں۔ پرانا دستور ہے کہ بادشاہوں پر مصیبت
آتی ہے تو وہ وزیروں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگتے ہیں۔

یہ سوچ کر وہ اپنے آقا پنگ لک سے ملنے کے
لیے الٹے قدم لوٹ پڑا۔

پنگ لک شیر نے اسے اکیلا آتے دیکھا تو
بہت خوش ہوا۔ اس کے دل سے ڈر نکل گیا اور اطمینان
کا سانس لیا۔ دمنک قریب آیا تو اس سے پوچھا "کہو
دمنک دیکھ آئے وہ جانور؟"

دمنک :۔ آپ کی دعا سے دیکھ لیا مہاراج!

پنگ لک :۔ (حیرت سے) سچ مچ؟

دمنک :۔ آقا کے سامنے جھوٹ نہیں بول سکتا پھر
آپ کی تو دیوتاؤں جیسی عزت کرتا ہوں بھلا آپ سے
جھوٹ بولنے کی مجھ میں کہاں ہمت!

اب پنگ لک شیر ذرا اپنی شان جتاتے ہوئے
بولا:۔ "ہاں ہاں اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ عین
ممکن ہے کہ تو نے اسے دیکھا ہو اور اس نے تجھے ایک
حقیر سی شے سمجھ کر تجھے نہ مارا ہو، اپنی توجہ کے لائق
نہ سمجھا ہو۔ بڑوں کا یہی شیوہ ہے کہ وہ اپنے برابر کے
دشمن پر ہی زور دکھاتے ہیں چھوٹوں پر نہیں آندھی کا
جھونکا بڑے درختوں کو گراتا ہے گھاس پھوس کو نہیں"

دمنک نے اس وقت بہت بردباری اور سوجھ
بوجھ سے کام لیا اور بولا:۔

"مہاراج میں حقیر ہی سہی پر آپ حکم دیں تو میں اس
لحیم شحیم جانور کو بھی آپ کا خدمت گزار بنا دوں؟"

پنگ لک ٹھنڈی سانس بھر کر بولا "کاش ایسا
ممکن ہوتا۔"

دمنک گیدڑ فوراً بول اٹھا "مہاراج عقل کی مدد
سے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے۔ جو کام بڑے بڑے ہتھیار
نہیں کر سکتے وہ چھوٹی سی عقل کے لیے بڑا نہیں ہے"

پنگ لک اس بات سے بہت ہی خوش ہوا۔
خوش ہو کر بولا:۔

"دمنک یہ بات ہے تو میں آج سے تجھے اپنا
وزیر اعظم (بڑا وزیر) بناتا ہوں۔ آج سے میری حکومت
میں تو ہی لوگوں کو جزا سزا دیا کرے گا۔"

شیر سے یہ اعزاز حاصل کرکے دمنک گیدڑ سنجی وک بیل کے پاس پہنچا۔ اور اکڑ کر کہنے لگا۔ "او بدذات بیل، میرا مالک پنگ لک تجھے بلا رہا ہے۔ تو یہاں ندی کے کنارے چہل قدمی کیوں کرتا رہتا ہے اور پھپکاریں کیوں مارتا رہتا ہے؟"

سنجی وک بیل سہم کر بولا: "یہ پنگ لک نام تو میں نے پہلی بار سُنا، یہ کون سے مالک ہیں؟"

دمنک نے اب اور اکڑ دکھائی: "ارے تو پنگ لک کو نہیں جانتا۔ اچھا اب تھوڑی ہی دیر میں تو اسے جان لے گا۔ اس کی طاقت کا بھی اندازہ کرے گا ــــ وہ جنگل کے تمام جانوروں کا راجہ پنگ لک شیر ہے۔ پاس ہی ایک پیڑ کے سایے میں بیٹھا ہے۔"

یہ سنتے ہی سنجیوک بے چارے کی جیسے جان نکل گئی۔ گڑگڑا کر بولا: "آپ شکل و صورت سے تو بھلے مانس لگتے ہیں۔ اگر آپ مجھے اپنے مہاراج کے پاس لے جانا چاہتے ہیں تو پہلے ان سے میری جان بخشی کرا دیجیے۔ میری جان کی امان لے لیجیے، میں خوشی خوشی آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔"

دمنک اب ذرا نرم پڑا۔ اس نے کہا: "ہاں دوست تیرا کہنا بھی سچ ہے۔ تو ابھی یہیں بیٹھ، میں تیری جان بخشی، تیری امان کا قول لے کر ابھی آتا ہوں۔"

اب دمنک گیدڑ پھر پنگ لک شیر کے پاس

پہنچا اور بات بنا کر کہنے لگا: "مہاراج وہ کوئی معمولی
جانور نہیں وہ تو بھگوان کی سواری کا بیل ہے میرے
پوچھنے پر اس نے بتایا کہ بھگوان نے خوش ہو کر اُسے
جمنا ندی کے کنارے ہری ہری گھاس چرنے بھیجا ہے
وہ تو یہاں تک کہتا تھا مہاراج کہ بھگوان نے اسے یہ
سارا جنگل کھیلنے اور چرنے کے لیے دے دیا ہے۔"

پنگ لک شیر بیچ ہی میں بول پڑا: "اچھا اچھا یہ
بات ہے۔ میں بھی تو کہوں کہ بھگوان کی آشیرباد کے
بنا کون بیل ہے جو اس جنگل میں اس قدر بے خوفی
سے گھوم سکے۔ ہاں دمنک تو نے اس کو کیا جواب دیا؟"

دمنک نے کہا: "مہاراج مجھے بھی اس وقت
ایک ہی سوجھی۔ اس سے کہا یہ تو بڑی اچھی بات ہے
یہاں ہمارے خدا ترس مہاراج پنگ لک شیر پہلے سے موجود ہیں
آپ اس جنگل میں ان کے مہمان بن کر آرام سے رہیے وہ بھی
آپ کو پسند کریں گے۔"

پنگ لک:۔ پھر اس نے کیا جواب دیا؟

دمنک:۔ مہاراج اس نے میری یہ بات مان لی اب
آپ جان بخشی کا "امان کا قول دیں تو میں اسے اپنے ساتھ
لیتا آؤں!"

دمنک گیدڑ کی بات سن کر پنگ لک شیر بہت
خوش ہوا۔ بولا: "تم نے یہ بہت اچھی بات کہہ دی، بلکہ میرے
دل کی بات کہہ دی۔ جاؤ اسے میرے پاس لے آؤ
میں جان بخشی کا قول دیتا ہوں۔"

باقی آئندہ

بقیہ صفحہ ۱۶

اور بانس کی کمانوں کے علاوہ آج کل لوہے، اسٹیل،
پلاسٹک اور گلاس فائبر کی کمانیں بھی بننے لگی ہیں۔

اس زمانے کا سب سے زیادہ دور تک
تیر پھینکنے کا عالمی ریکارڈ ۴۸۰ گز ہے۔ یہ ریکارڈ ۱۹۵۵ء
میں امریکہ کے چارلس پیئرسن نے قائم کیا تھا جب
سے اب تک اس ریکارڈ کو کوئی اور شخص نہ توڑ سکا۔
یہ ریکارڈ تو نئے زمانے کا ہے جب کہ طرح طرح کی
کمانیں سائنس کی مدد سے بنائی جا چکی ہیں۔ لیکن
اگر آپ کو یہ بتایا جائے کہ اب سے دو سو سال پہلے
ٹرکی کے سلطان نے ۹۷۲ گز کی دوری پر تیر پھینکا تھا۔
تو کیا آپ یقین کریں گے؟ یقین تو آپ کو کرنا ہی
پڑے گا۔ اس لیے کہ سر رابرٹ انیزلے نے یہ
واقعہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انیزلے اس
وقت ٹرکی میں امریکہ کے سفیر تھے۔ یہ واقعہ انھوں
نے اپنی کسی کتاب میں بیان بھی کیا ہے۔

جناب پروفیسر امانت، پونا

وطن یاد آیا

آج غربت میں وطن یاد آیا
وہ بہاروں کا چمن یاد آیا

اپنا چھوڑا ہوا گھر یاد آیا
اک سہانا سا نگر یاد آیا
یاد آیا وہ ابھرتا سورج
جس کی کومل سی سنہری کرنیں
سارے دیہات کو روشن کرنے
خود ہی بڑھ بڑھ کے بلائیں لیتیں
سبز میدان میں چرنے کے لیے
ننھے چرواہوں کی ہمراہی میں
یاد پھر آنے لگیں جاتے ہوئے
تیز طرار سی ستھری گائیں

کچے رستوں کے وہ دلکش منظر
جال میں جن کے الجھتی تھی نظر
ننھے چمکیلے ستاروں جیسی
تتلیاں جن پہ تھرکتی اڑتیں
گدگداتی ہے ابھی تک دل کو
منہ اندھیرے ہی وہ تالاب کی سیر
اور وہ گلشنِ شاداب کی سیر
یاد کے روپ میں یوں میرا وطن
پیار سے گویا بلاتا ہے مجھے
کتنا دلکش ہے وطن کا یہ خیال!

امام بخاری علیہ الرحمۃ

تم نے شاید کبھی اپنے باپ یا کسی بڑے بوڑھے سے سنا ہوگا کہ دنیا میں ایک ایسے بزرگ بھی گذرے ہیں جن کا نام امام بخاری تھا۔

امام بخاری کون تھے۔ انھوں نے ایسا کیا کام کیا ہے۔ جس سے ان کا نام مشہور ہوا ہے؟ یہ بات ہم تمھیں بتاتے ہیں۔

یہ تو تمھیں معلوم ہے کہ مسلمانوں کا ہر ایک بچّہ اللہ کو اکیلا اور یکتا سمجھتا ہے اور یہ بھی سمجھتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں کس لیے بھیجا تھا! اس لیے بھیجا تھا کہ انسانوں کو اچھی اچھی باتیں بتائیں اور بری باتوں سے روکیں۔

اب یہ سنو کہ جب محمد صلے اللہ علیہ وسلم کسی کو کوئی بات بتاتے تھے تو وہ اس بات کو یاد کر لیتا تھا اور اس بات کا دھیان رکھتا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منھ سے نکلی ہوئی بات کا کوئی لفظ، حرف، زیر زبر چھوٹ نہ جائے۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم جب کلام فرماتے تھے۔ تو جو کوئی مسلمان ہوتا چپ ہو جاتا۔ اور پورے غور سے یہ کلام سنتا، پھر اسے یاد کر لیتا اور جب کسی سے وہ بات جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی بیان کرتا تھا۔ تو جوں کی توں بیان کر دیتا تھا۔ نہ گھٹاتا تھا نہ بڑھاتا تھا۔ حد یہ ہے کہ اگر بات کرنے میں رسول اللہ مسکرائے تھے تو اس کی نقل بھی کر دیتا تھا، اور کہہ دیتا تھا کہ رسول اللہ مسکرائے بھی تھے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی باتیں جس نے بھی سنیں یاد رکھیں۔ کسی نے سَو باتیں یاد کر لیں۔ کسی نے دو سَو کسی نے اس بھی زیادہ مگر

لکھا کسی نے نہیں تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ کی وفات کے بعد جنھیں یہ باتیں یاد تھیں ان میں بہت سے لوگ دوسرے شہروں میں چلے گیے۔

یہ لوگ جس شہر میں گیے۔ وہاں کے مسلمانوں نے ان کی بڑی عزت کی اور جب بھی ان شہروں کے مسلمانوں کو الجھن پیش آئی تو انھی بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہوئے جنھیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی باتیں یاد تھیں۔ ان سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی حالت میں کیا ہدایت فرماتے تھے، اور جب یہ بزرگ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ہدایت سنا دیتے تو یہ لوگ یاد کر لیتے اور کوئی ان سے پوچھتا تو جوں کا توں بتا دیتے نہ کچھ گھٹاتے نہ بڑھاتے۔

بیچ میں ایک ضروری بات یاد آگئی ہر جسے بتائے بغیر آگے بڑھنا مشکل ہے وہ بات یہ ہے کہ قرآن پاک کی ہر بات کو آیت کہتے ہیں اور جو کچھ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے کسی وقت فرمایا ہے اسے حدیث کہتے ہیں۔

حدیث کے معنی ہیں بات کرنا

یہ حدیثیں ایک دو دس بیس نہیں تھیں ہزاروں، لاکھوں تھیں۔ تم سوچو! انسان دن بھر میں کتنی باتیں کرتا ہے، اگر فقط مہینہ دو مہینہ کی باتوں کی بھی گنتی کی جائے تو لاکھوں ہو جاتی ہیں۔ اور حدیثیں تو ہر رسول کی فرمائی ہوئی ہیں۔ کوئی پوچھتا یا رسول اللہ ہم نماز کیسے پڑھیں۔ ہاتھ باندھیں یا لٹکائیں، ہاتھ باندھتے وقت زبان سے کیا کہیں۔ رکوع کیسے ہوتا ہے۔ سجدہ کیسے کیا جاتا ہے۔ سجدہ میں کیا پڑھنا چاہیے۔ ہمارے پاس مال ہے ہم اپنا مال کنبہ پر خرچ کرتے ہیں، رسول اللہ فرماتے کنبہ پر بھی خرچ کرو، خیر خیرات بھی کرو، غریبوں مسکینوں، اپاہجوں مسافروں کی مدد بھی کرو۔

سفر میں نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، پڑھیں تو کتنی پڑھیں، بیماری میں نماز چھوڑ دیں یا پڑھتے رہیں۔ ایسی کتنی باتیں تھیں دین دنیا کی لاکھوں باتیں چلنا پھرنا، بولنا چالنا، ہنسنا رونا سونا جاگنا، بیاہ شادی۔ باپ کا حق بیٹے پر، بیٹے کا حق باپ پر، خاوند کا بیوی پر، بیوی کا خاوند پر، دن کی عبادت، رات کی عبادت، رمضان کے روزے، نفلی روزے، لڑائی اور ملاپ، تجارت اور دکانداری، خریدنے اور بیچنے کا ڈھنگ، ایک بات ہو دو ہوں زندگی میں تو نہ جانے کیا کیا باتیں پیش آتی ہیں، پرانے قانون اور رواج بدل رہے تھے۔ نئے اور خوبی

سے بھرپور قانون اور رواج بنائے اور سکھائے
جا رہے تھے
جنھوں نے حدیثوں کو سنا اور یاد کیا انھوں
نے اسکول اور مدرسے بنائے اور پھر ان مدرسوں
سے ہزاروں نے سنا اور یاد کیا ان حدیثوں کو،
اب ذرا ٹھہر جاؤ اور یہ بات سنو کہ جس زمانے
کا ہم ذکر کر رہے ہیں۔ مسلمانوں کی بڑی حکومت تھی
یہ حکومت عباسیوں کی حکومت کہلاتی ہے۔ اسی
زمانہ میں دوسرے بڑے بڑے خاندان والے
بھی جن کی لوگ عزت کرتے تھے یہ چاہتے تھے
کہ ہماری حکومت ہو جائے، حاکم یہ بھی جانتے
تھے کہ ہماری حکومت جب تک ہی چل سکتی ہے، جب
تک ہمارے فیصلے، عمل اور انتظام قرآن پاک اور
رسول اللہ کی حدیثوں پر ہوگا، اگر ہم اس کے خلاف
کریں گے تو ہماری حکومت گھڑی بھر نہ چلے گی!
اسی زمانہ میں ایسے لوگ بھی تھے۔ جنھوں نے حدیثوں
میں اپنے مطلب کی باتیں بڑھالی تھیں اور یہ حدیثیں
جگہ جگہ بیان کی جانے لگی تھیں۔
بزرگوں اور دین کے سچے جاننے والوں نے
جب یہ دیکھا تو سوچا کہ یہ بات تو اچھی نہیں ہے اس
لیے ایسی حدیثوں کی پرکھ ہونی چاہیے، ان حدیثوں
میں ایسی حدیثیں بھی تھیں جن کی کوئی سند نہ تھی، ایسی
حدیثوں کے بارے میں کتابیں اور رسالے لکھ کر
بڑے بڑے شہروں میں پہنچا دیے گیے،
امام بخاری اسی زمانے میں تھے تم نے
جی میں سوچا ہوگا کہ سند کسے کہتے ہیں۔ سند اسے
کہتے ہیں۔ جیسے تم یہ کہو مجھ سے کہا سلیم نے سلیم
نے سنا عبدالکریم سے، عبدالکریم کہتے ہیں کہ مجھے
یہ بات بتائی سلیمان نے۔
اگر سلیم، عبدالکریم اور سلیمان نیک بخت
ہیں۔ انھوں نے ہنسی ہنسی میں بھی کبھی جھوٹ نہیں
بولا۔ کسی بدچلن اور چھوٹے آدمی سے دوستی نہیں
کی کسی کو دھوکا نہیں دیا اور بہکایا نہیں۔ تو ان
کی بات پر اعتبار کیا جائے گا۔ اور سند ہو جائے
گی کیونکہ یہ سب نیک اور اچھے لوگ ہیں، حدیث
کی سند بھی کچھ اس طرح کی ہوتی ہے کہ اگر کسی
ایسے آدمی کا نام بیچ میں آجاتا ہے، جو کسی وجہ سے
بدنام رہا ہو تو یہ سند قابل اعتبار نہیں رہتی ہے
اور اگر نام آگے پیچھے ہو جائیں تب بھی نہیں مانی
جاتی ہے۔
امام بخاری سنہ ۱۹۴ ہجری میں پیدا ہوئے
جس کا حساب لگایا جائے تو بارہ سو برس کے قریب

ان کی پیدائش کو گذر چکے ہیں۔

امام بخاری کا پیدائشی نام محمد ہے۔ باپ کا نام اسمٰعیل تھا۔ باپ بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ ماں نے دیکھ بھال کی اور تعلیم دلائی مشہور ہے کہ امام بخاری کی آنکھوں کی روشنی بچپن ہی سے جاتی رہی تھی۔ بیچاری ماں دعا کرتی رہتی تھیں کہ میرے بچے کی آنکھوں میں روشنی پیدا ہو جائے۔ خدا کا کرنا ایک رات ان کی ماں نے خواب میں حضرت ابراہیم پیغمبر کو دیکھا (سلام حضرت ابراہیم پیغمبر پر) فرما رہے ہیں۔ خدا نے تمھاری دعا قبول کر لی ہے اور تمھارے بیٹے کی آنکھوں میں روشنی آگئی ہے۔ صبح اٹھ کر دیکھا تو سچ مچ بیٹے کی آنکھوں میں روشنی آگئی تھی۔

امام بخاری کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات سے بڑی محبت تھی۔ جب کسی مکتب میں جاتے اور کوئی حدیث سُنتے تو فوراً یاد کر لیتے تھے۔

بخارا میں جہاں امام صاحب کا مکان تھا۔ یہاں کے ایک مدرسہ کی بات ہم تمھیں سناتے ہیں۔ اس وقت امام بخاری کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ اس مدرسہ میں ایک بڑے عالم پڑھاتے تھے۔ جن کا نام محدث داخلی تھا۔

ایک دن محدث داخلی حدیث بیان کر رہے تھے، اب پھر بیچ میں ایک ضروری بات سن لو۔

اُردو زبان میں حدیث کا نمونہ یہ ہے۔

ہم سے حدیث بیان کی ابو نعیم نے انھوں نے ابو عامر سے سُنا ابو عامر نے نعمان ابن بشیر سے سُنا۔

نعمان ابن بشیر کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے۔

اس میں تین نام آئے ہیں۔ ایک ابو نعیم کا دوسرا ابو عامر کا اور تیسرا نعمان ابن بشیر کا حدیث بیان کرنے والا جب بھی حدیث بیان کرے گا اسی ترتیب سے نام لے گا پہلے ابو نعیم کا نام لے گا پھر ابو عامر کا پھر نعمان ابن بشیر کا،

اگر بھول کر پہلے بشیر کا نام لے گا اور پھر ابو عامر کا، یا پہلے ابو عامر کا نام لے اور پھر نعیم کا تو یہ سند کی غلطی ہے اور اس حدیث کو جب بھی کوئی پرکھے گا صحیح نہیں بتائے گا،

ہاں تو محدث داخلی نے حدیث بیان کرتے وقت کہا سفیان نے ابو الزبیر سے اور ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت کی ہے گیارہ برس کے بچے امام بخاری نے محدث داخلی کی سند سنی تو فوراً کہا حضرت

ابوالزبیر نے تو ابراہیم سے روایت نہیں کی ہے یہ بات آپ نے کیسے کہہ دی"

محدث داخلی نے ڈانٹ دیا۔ مگر امام نے پھر یہی کہا سند غلط ہے اگر آپ کے پاس اصل حدیث کا لکھا ہوا نسخہ ہو تو مقابلہ کر لیجیے، یہ ایسی بات تھی کہ محدث داخلی کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ کتب خانہ میں جا کر اصل حدیث دیکھی تو امام صاحب کا کہنا سچ نکلا، اور سند میں واقعی بھول ہو گئی تھی۔ واپس آکر پوچھا لڑکے! کیا تم صحیح سند بتا سکتے ہو امام نے کہا بیشک، سنیئے۔ سفیان نے زبیر بن عدی سے اور وہ ابراہیم سے روایت کرتے ہیں محدث داخلی نے اقرار کیا کہ یہ سند صحیح ہے۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ ہے جسے اسمٰعیل کے بیٹے حاشد نے بیان کیا ہے۔ حاشد کہتے ہیں کہ ہم بہت سے طلبا اور امام بخاری حدیث کے بڑے بڑے عالموں اور بزرگوں کے پاس جاتے تھے اور جو حدیثیں سنتے تھے لکھ لیتے تھے، مگر بخاری کسی ایک حدیث کو بھی نہ لکھتے تھے ہم کہتے اس پڑھنے اور سننے کا کیا حاصل ہے جب کہ آپ لکھتے نہیں ہیں۔ دو ہفتے گذر گیے تھے۔ اور ہم نے پندرہ ہزار سے زیادہ حدیثیں سن کر لکھی تھیں۔

امام بخاری بولے، ذرا اپنی حدیثیں جو تم نے لکھی ہیں نکالو، اور جب ہم نے حدیثیں نکالیں تو بولے۔ اب میں یہی حدیثیں تمہیں سناتا ہوں۔ یہ کہہ کر پوری کی پوری حدیثیں سنا دیں جن میں کہیں نہ سند کا فرق تھا نہ کسی لفظ کا نہ زیر زبر کا یہ دیکھ کر ہم ان کی ذہانت اور حافظہ پر حیران ہو گیے۔

یہ بات یوں ہی نکل آئی کہنا یہ تھا کہ جب لوگوں نے حدیثیں بنانی شروع کر دیں اور اوٹ پٹانگ سندیں بیان کرنے لگے تو ایک دن کی بات ہے کہ ابن اسحٰق جو امام بخاری کے بڑے بزرگ استادوں میں تھے۔ کہنے لگے۔

کیا ہی اچھا ہوتا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حدیثوں کا صحیح مجموعہ مرتب ہو جاتا۔

امام بخاری بھی اس مجلس میں موجود تھے۔ یہ بات اپنے بزرگ استاد کی سنی تو دل کو لگ گئی۔

یوں تو امام صاحب اٹھارہ سال کی عمر سے کتابیں لکھنے لگے تھے۔ ایک کتاب تو چاند کی روشنی میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے روضہ کے قریب بیٹھ کر پوری کی تھی، اور دوسری کتابیں بھی دو سو سے کم نہیں ہیں تصنیف کی تھیں۔ مگر جیسی شہرت صحیح بخاری کی ہوئی کسی کتاب کی نہ ہوئی۔

صحیح بخاری کے متعلق امام صاحب خود بھی فرمایا کرتے تھے کہ خدا تعالےٰ کے دربار میں بخاری کو ذریعہ بناؤں گا،

بخاری ان کتابوں میں ہے جو لاکھوں مرتبہ چھپ چکی ہے، اس کے حاشیے اور اس کی تشریحات پر بڑے بڑے عالموں اور بزرگوں نے راتیں گذاری ہیں اس کا درس صدیوں سے ہر جگہ ہر مدرسہ اور اور ہر ملک میں جہاں مسلمان رہتے ہیں جاری رہا ہے اور اب بھی جاری ہے اور خدا کے بندگان خاص نے اسے اصح الکتاب بعد القران کا درجہ دیا ہے۔

(قرآن کے بعد دنیا میں سب سے صحیح کتاب)

بخاری کی ترتیب، احادیث کی تلاش و جستجو، حدیثوں کی پرکھ اور سندوں کی صحت کے لیے امام بخاری نے کہاں کہاں سفر کیے اور اپنے وقت کے کتنے بزرگوں سے ملے۔ یہ بڑی لمبی باتیں ہیں موقع ہوا تو پھر کبھی بیان کی جائیں گی۔

جناب عادل جعفری ایم۔ اے

امّی دُعائیں دیجیے

اب تو مرے کمال کا احساس ہو گیا؟
امّی کہاں ہیں لیجیے میں پاس ہو گیا!
پیچی، لوکاٹ، موسمی و آم لوں گا آج
ابّا کہاں ہیں؟ ان سے میں انعام لوں گا آج
آثار آرہے ہیں نظر آج عید سے
نمبر مجھے ملے ہیں زیادہ امید سے
یہ دیکھیے حساب میں ہیں ۱۰۰ سو میں ۱۰۰ سو ملے
انگریزی میں پچاس ۵۰ میں دس ۱۰ اور جوڑیے
ہندی سے خواہ مخواہ میں ڈرتا تھا صبح و شام
امّی یقین کیجیے پہلا ہے میرا نام
سائنس کی تو بات ہی کرنی فضول ہے
اس میں تو فرسٹ آنا ہی میرا اصول ہے
جغرافیہ میں ٹھیک ہے کچھ کم ملے ہیں مارکس
لیکن مرے سوا کوئی اس میں نہیں ہے پاس
تاریخ اور علمِ تمدّن میں دیکھیے
اسّی ۸۰ سے چار ۴ زیادہ مجھے مارکس مل گئے
اردو میں فارسی سے بھی آگے بڑھا ہوں میں
مجموعی حیثیت سے بھی سب سے سوا ہوں میں

دل سے دُعائیں دیجیے امّی مجھے شتاب
ہر سال ہو نتیجہ مرا یوں ہی لاجواب

جناب شفق سہسرامی

ٹھنڈی آگ

سالانہ امتحان ختم ہو چکے تھے۔ شمیم اور ظفر دونوں نے سال بھر خوب محنت کی تھی، پرچے اچھے ہوئے تھے امتحان میں اچھے نمبروں سے کامیابی کی امید تھی اسی لیے انھیں تفریح کا پروگرام بنانے کی سوجھی۔ شہر میں تفریح کی جتنی جگہیں تھیں ان سے ـــــ ان کا دل بھر چکا تھا۔ اس لیے انھوں نے احمد نگر کا ارادہ کیا۔ احمد نگر تفریح کے لیے بہترین جگہ تھی۔ اس کے علاوہ شمیم کے خالو وہاں رہتے تھے۔

جب وہ احمد نگر کے اسٹیشن پر اترے تو رات کے بارہ بج رہے تھے۔

احمد نگر بہت بڑا شہر نہیں تھا۔ نہ یہاں موٹر رکشا تھا نہ ٹیکسیاں۔ رہنے کے لیے چھوٹے چھوٹے کوارٹر خوبصورتی سے بنائے گئے تھے اور سواری کے لیے ٹم ٹم تھی اور بس۔

اسٹیشن سے باہر نکل کر وہ ایک ٹمٹم پر بیٹھ گیے۔

"کہاں جانا ہے حضور؟" ـــــ ٹمٹم والے نے لگام کھینچتے ہوئے پوچھا۔

"کیلاش روڈ"

"کیلاش روڈ ـــــ؟" ٹمٹم والا خوفزدہ ہو گیا

"ہاں بھئی۔ ہمیں وہیں جانا ہے۔"

"میں نہیں جاؤں گا سرکار۔ وہاں جانے

کے لیے پرانے قبرستان میں سے گزرنا پڑتا ہے۔"
"تو کیا ہوا؟" ظفر نے حیرت سے پوچھا۔
"سرکار آپ دوسری ٹمٹم کرلیں میں نہیں جاؤں گا۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ رات کو کوئی بھی ٹمٹم والا اُدھر نہیں جاتا۔ آپ بھی نہ جائیے خطرہ ہے حضور، جان چلی جاتی ہے۔"
"کیسا خطرہ؟ کون جان لے لیتا ہے؟ کچھ بتاؤ گے بھی؟" شمیم جھلا گیا۔
"پرانے قبرستان میں جنات رہتے ہیں قبروں سے نکل کر رات میں گھوما پھرا کرتے ہیں۔ اگر کوئی بھولے سے اس طرف چلا جاتا ہے تو اُسے مار کر تالاب میں پھینک دیتے ہیں۔" ٹمٹم والے نے خوفزدہ انداز میں بتایا۔
"کیا خوب اب قبروں میں مُردوں کی جگہ جنات رہنے لگے ہیں۔" ظفر نے ہنستے ہوئے پوچھا "کسی نے افواہ پھیلائی ہوگی۔"
"افواہ نہیں ہے سرکار۔ ایک بار میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تھا۔ رات میں سواری پہنچا کر لوٹ رہا تھا۔ دور سے ان کو دیکھا۔ ان لوگوں کا پورا بدن آگ سے دہک رہا تھا، پورے جسم سے شعلے نکل رہے تھے جس سے آس پاس روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں ڈر گیا اور بھاگ کر دوسری طرف چلا گیا۔ پھر وہیں رہا۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی تو واپس آیا تھا۔"
"عجیب ڈرپوک آدمی ہو!" ظفر بولا۔
"صاحب میں تو ڈرپوک ہوں ہی لیکن بڑے بڑوں کو جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ ابھی چند دنوں پہلے کی بات ہے، بھولو پہلوان اپنی ٹمٹم پر ایک سواری بٹھا کر لے گیا وہ بھی ڈرتا نہیں تھا لیکن دوسرے دن اس کی لاش تالاب میں تیرتی ملی۔ اسی تالاب میں جو قبرستان کی بغل میں ہے۔"
"لیکن بھئی ہم لوگوں کو جانا ضروری ہے تم چلو، آخر ہم لوگ بھی تو تمھارے ساتھ ہیں" شمیم نے سمجھانے والے انداز سے کہا۔ "اگر رات میں آنا نہ چاہو گے تو مت آنا گھر پر ٹھہر جانا۔"
"آپ مجبور کرتے ہیں تو چلتا ہوں لیکن میں ٹھہروں گا نہیں رات ہی کو تو سواریاں ملتی ہیں، کچھ کما لیتا ہوں نہیں تو بچے بھوکوں مریں۔ غریب آدمی ہوں۔ چار چار بچے اور بوڑھی ماں بھی ہے۔ سب کی امیدوں کا سہارا میں ہی ہوں۔"
"نہ ٹھہرنا میاں لیکن چلو بھی تو!" ظفر جھلا گیا۔ ٹمٹم والا ان لوگوں کو لے کر بہت تیزی

سے پہلا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج رہے تھے اس لیے پورا شہر خموشی کی چادر میں لپٹا ہوا نیند کے مزے لے رہا تھا۔ ٹمٹم قبرستان کے پاس پہنچی تو اس نے پھر کہا۔ "میری بات مانیے سرکار مت جائیے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"ارے بھئی ہم لوگوں کو نہیں جانتے ہم لوگ جنات کے چچا ہیں۔ ہمارے ہوتے ہوئے وہ نہیں آئیں گے اور اگر آ بھی گئے تو ڈانٹ کر بھگا دیں گے۔" ظفر بولا۔

ٹمٹم والے نے ایک نظر دونوں لڑکوں پر ڈالی۔ ان کی عمر سولہ سال سے زیادہ نہ رہی ہوگی، ٹم ٹم والے نے دل میں کہا ابھی بچے ہو اس لیے ایسی باتیں کر رہے ہو لیکن منہ سے کچھ نہ بولا خاموش رہا۔ اگرچہ اس کا چہرہ ڈر کے مارے زرد ہو رہا تھا۔

اب ان کی ٹمٹم قبرستان کے پاس سے گزر رہی تھی۔ شمیم نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں لیکن قبرستان میں تاریکی اور سناٹے کا راج تھا۔ ٹمٹم والا سامنے سڑک پر دیکھتے ہوئے کچھ پڑھ رہا تھا شاید کوئی دعا تھی۔

"کیوں جی! کہاں ہیں تمھارے جنات صاحب؟" شمیم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"میں خدا سے دعا کر رہا ہوں کہ ان سے ملاقات نہ ہو اور آپ کو مذاق سوجھا ہے۔ کوئی دعا پڑھیے جو بھی آپ کو یاد ہو۔ میں بھی دعا پڑھ رہا ہوں۔"

"ہم لوگ بھی چل رہے ہیں تم چلتے رہو" ظفر بولا۔ خدا خدا کر کے ٹمٹم اختر صاحب کے بنگلے پر جا کر رک گئی۔

شمیم نے ٹمٹم والے کو روکنا چاہا لیکن اس نے کہا صاحب بچے بھوکوں مر جائیں گے پھر اسے بھی شک ہونے لگا تھا کہ جنات وغیرہ کوئی چیز نہیں ہیں ورنہ نظر کیوں نہ آتے جب کہ ان کے نکلنے کا وقت بارہ بجے سے ایک بجے رات تک ہے۔ اس نے کرایہ لیا اور واپس لوٹ گیا۔ جب وہ قبرستان کے نزدیک پہنچا تو تنہائی اور خوف کا شدت سے احساس ہوا۔ پھر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے جب اس نے اپنے سامنے دو جناتوں کو دیکھا جن کے جسموں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

ٹمٹم والے کے حلق سے ڈری ڈری سی چیخ نکلی گھوڑا بھی الف ہو گیا اور ٹمٹم سمیت تالاب میں جا گرا۔ دونوں جناتوں نے قہقہہ لگایا۔ ان کے حلق سے شعلے نکل کر فضا میں پھیل گئے پھر اچانک وہ غائب ہو گئے رات اور ڈراونی ہو گئی تھی۔

صبح جب شمیم اور ظفر بیدار ہوئے تو انھیں سب سے پہلے اس کی اطلاع ملی کہ ایک تمتم والے کی لاش تالاب میں ملی ہے۔ تمتم بھی الٹا ہوا ہے گھوڑا بھی مر گیا ہے۔

وہ دونوں فوراً تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔ لاش باہر نکالی جا چکی تھی۔ وہی تمتم والا تھا جو انھیں لایا تھا۔ دونوں یہ دیکھ کر چونک پڑے۔ دونوں کو اس کی موت کا گہرا صدمہ ہوا۔ بے چارہ انھی لوگوں کی وجہ سے مارا گیا۔ اب اس کی بوڑھی ماں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کا کیا ہوگا۔ ان کی آنکھیں چھلک آئیں۔

بہت سے لوگ وہاں جمع تھے اور چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ ایک شخص کہہ رہا تھا۔

"یہ ضرور جناتوں کی حرکت ہے۔ دو دن قبل ایک آدمی کی لاش اسی جگہ ملی تھی پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا لیکن جب سے یہ جنات نظر آنے لگے ہیں یہ سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" دوسرے شخص نے تائید کی۔ "پرسوں رات کو جب میں دکان بند کر کے آ رہا تھا تو دو جناتوں کو تالاب کے کنارے ٹہلتے دیکھا تھا۔"

"مجھے ایک بڑے مولانا نے تعویذ دیا ہے" تیسرے شخص نے اپنے بازو کا تعویذ دکھاتے ہوئے کہا۔ "اور کہا ہے کہ کسی دن چل کر دیکھوں گا اور جناتوں کو بھگا دوں گا۔"

لوگ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ شمیم اور ظفر وہاں سے لوٹ آئے۔ دونوں کے چہروں پر غم کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ انھیں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے تمتم والے کے قاتل وہی ہوں۔

ناشتے سے فارغ ہو کر جب انھوں نے کمرے کا رخ کیا تو اختر خاں نے ٹوکا۔ "کیوں میاں گھومنے آئے ہو تو پھر گھومو۔ کمرے میں کیوں جا رہے ہو ———؟"

اختر خاں کے کہنے پر دونوں شکار کے لیے روانہ ہو گئے۔ شمیم کے پاس اس کا ریوالور تھا۔ دوپہر تک وہ چڑیوں کا شکار کرتے رہے جب واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں بہت سی فاختائیں، بگلے اور مرغابیاں تھیں۔ اختر خاں ایک دراز قد آدمی سے باتیں کر رہے تھے گورا چٹا رنگ تھا کڑی کڑی مونچھیں تھیں۔ اختر خاں نے دونوں کا تعارف کرایا۔ "یہ دونوں میرے بھانجے ہیں امتحان کے بعد تفریح کے لیے آئے ہیں۔ اور بچو یہ ہیں تمھارے

کرنل صاحب، میرے گھرے دوست۔ ان کا نام سعید ہے۔

دونوں نے انھیں سلام کیا پھر دیر تک وہ کرنل سے باتیں کرتے رہے کرنل نے بہت سے قصے اور لطیفے انھیں سنائے۔ جب وہ رخصت ہونے لگے تو شمیم نے ان سے کہا۔ "کرنل چچا، ہم آپ کا انتظار کریں گے، پھر آئیں گے نا!"

"ہاں بیٹے کیوں نہیں" انھوں نے گال تھپتھپائے اور چلے گئے۔

شام تک وہ ٹمٹم والے کو بالکل بھول چکے تھے۔ شام کو انھوں نے لان میں بیڈمنٹن کھیلا، پھر رات کا کھانا کھا کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔ دونوں تھک چکے تھے اس لیے جلد ہی سو گئے۔ کمرے میں ہلکے سبز رنگ کا برقی قمقمہ روشن تھا۔

ایک بجے رات کا وقت ہوگا جب قدموں کی چاپ سن کر شمیم کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے ظفر کی طرف دیکھا۔ وہ بے خبر سو رہا تھا۔

شمیم نے اسے ہلایا۔

"کیا ہے بھئی، سونے بھی دوگے!" ظفر نے بڑبڑا کر کروٹ بدل لی لیکن جب شمیم نے جھنجھوڑا تو اسے اٹھنا پڑا۔

"باہر قدموں کی آوازیں معلوم ہو رہی ہیں۔" شمیم نے کہا۔

"تو میں کیا کروں؟" ظفر جھلا کر بولا۔ "میں کوئی ٹھیکیدار ہوں؟"

"تم سمجھے نہیں، اتنی رات گئے آخر کون چل رہا ہے۔ چلو دیکھیں۔" شمیم بولا۔

"یار گھر ہی کا کوئی ہوگا کیوں فضول نیند خراب کر رہے ہو۔" ظفر جمائی لے کر بولا۔

"میں دیر سے آوازیں سن رہا ہوں۔ گھر کا کوئی فرد نہیں ہو سکتا۔ چلو دیکھیں۔"

"سو رہو یار کہیں جنات ہوئے تو میرا ڈر سے دم ہی نکل جائے گا۔" ظفر نے لیٹتے ہوئے کہا۔

"سیدھی طرح سے نہ چلو گے تو دوں گا دو ہاتھ ——"

"میں اسے احتیاط سے رکھ دوں گا۔ جب تمھیں ضرورت ہوگی لوٹا دوں گا۔" ظفر نے اطمینان سے کہا۔

تنگ آکر شمیم نے اسے کالر سے پکڑ کر بستر سے کھینچ لیا۔

"چلتا ہوں بھئی کالر تو چھوڑ!" ظفر نے سلیپر پہنتے ہوئے کہا۔ "تو خود بھی کسی جنات سے کم تھوڑی

سے جب دونوں باہر نکلے تو انھیں کمپاؤنڈ میں دو آتشی مخلوق نظر آئے جو کچھ تلاش کر رہے تھے۔

"ارے باپ جنّات" ظفر خوف سے کانپنے لگا۔

"ابے چپ اگلا دبا دوں گا" شمیم نے دھیرے سے ڈانٹا۔ پھر بلند آواز میں ان جناتوں کی طرف دیکھ کر پکارا۔ "کون ہے؟ کیا ہو رہا ہے ــــ؟"

وہ دونوں جو لاپرواہی سے کچھ تلاش کر رہے تھے چونک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر ایسا معلوم ہوا جیسے انھیں زمین نگل گئی ہو۔ پورا کمپاؤنڈ تاریکی کی دبیز چادر میں چھپ گیا۔

"ارے کہاں گئے؟" ظفر نے چونک کر پوچھا۔

"پتہ نہیں۔ آؤ دیکھیں" شمیم نے ورانڈے سے اترنے کے لیے قدم بڑھایا۔

"کیا غضب کرتے ہو یار؟ جناتوں کو تم نے چھیڑا ہے۔ اس پر تلاش کرو گے۔ کہیں انھیں غصّہ آگیا تو ہمیں بھی پکڑ کر تالاب میں ڈبو دیں گے" ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"بے کار بات مت کرو مارنا اور زندہ رکھنا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ جب اس کی مرضی ہوگی تب ہی مروں گا۔ جناتوں میں کسی کی جان لینے کی طاقت نہیں ہے۔ پھر موت کا وقت مقرّر ہے اگر آنا ہوگی آجائے گی۔ ڈرتے کیوں ہو؟"

"اندھیرے میں کیسے تلاش کروگے چلو کمرے سے ٹارچ لے لیں" ظفر نے کہا۔

"ہاں یہ ٹھیک ہے" انھوں نے کمرے سے ٹارچ لی اور پورا کمپاؤنڈ چھان مارا لیکن انھیں کچھ نہ ملا۔ صبح انھوں نے اختر خاں سے پوچھا "خالو جان رات ہم نے کمپاؤنڈ میں جناتوں کو دیکھا۔ ان کے جسموں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ کچھ تلاش کر رہے تھے۔ ہم لوگوں کے ڈانٹنے پر وہ غائب ہو گئے۔"

"روز ہی یہ ہوتا ہے" اختر خاں نے لاپرواہی سے کہا۔ "پتہ نہیں وہ جنات کمپاؤنڈ میں کیا تلاش کرتے ہیں۔ پہلے تو ہم لوگ خوفزدہ ہو گئے تھے لیکن جب انھوں نے ہمیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تو ہم نے بھی چھوڑ دیا۔ پولیس میں رپورٹ کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ پولیس والے چور یا ڈاکو یا انسانوں کو تو گرفتار کر سکتے ہیں جناتوں کو نہیں۔ تم ان کی فکر چھوڑ دو۔ گھومو پھرو۔ یہ شہر تمھیں کیسا لگا؟ ابھی تم نے دیکھا ہی کیا ہے۔ کل اتوار ہے میرے ساتھ "بیوٹی پیلس" چلنا۔ وہاں ایک جھیل ہے بہت خوبصورت" انھوں نے بات کا رخ بدل دیا۔

(پھر کیا ہوا؟ کیا شمیم اور ظفر نے جناتوں کی تلاش جاری رکھی؟
یہ سب جاننے کے لیے اگست کے پیام تعلیم کا انتظار کیجیے)

جناب کیفؔ احمد صدیقی

نتیجہ

جو دن بھر کھیلا کرتے تھے
اُستاد سے جھگڑا کرتے تھے
لوگوں کو ستایا کرتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

جو سب کی بُرائی کرتے تھے
صرف اپنی بڑائی کرتے تھے
آپس میں لڑائی کرتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

جو خوب شرارت کرتے تھے
تعلیم سے نفرت کرتے تھے
کھیلوں سے محبت کرتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

جو دیر سے مکتب جاتے تھے
پڑھنے سے جی کو چراتے تھے
بیکار میں وقت گنواتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

جو بھائی بہن کو ستاتے تھے
ماں باپ کو دکھ پہنچاتے تھے
استاد کا دل بھی دکھاتے تھے
وہ فیل ہوئے ہم پاس ہوئے

الکزانڈر کن

ترجمہ: محمد اظہر انصاری

ابّا جان شاعر بنے

جب ابّا جان چھوٹے تھے تو ان کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ انھوں نے پڑھنا چار برس کی عمر میں سیکھ لیا تھا اور دن دن بھر پڑھا کرتے تھے۔ جب دوسرے لڑکے طرح طرح کے کھیل کھیلا کرتے ابّا جان پڑھنے کے علاوہ کچھ نہ کرتے۔

دادا جان اور دادی جان کو بڑی فکر ہو گئی، ان لوگوں کا خیال تھا کہ اتنی پڑھائی نقصان دہ ثابت ہوگی۔ دونوں نے ابّا جان کو کتابیں دینی بند کر دیں انھیں تین گھنٹے روزانہ سے زیادہ پڑھنے نہ دیتے۔

پر اس سے کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ ابّا جان باوجود اس کے صبح سے رات تک پڑھتے۔ وہ تین گھنٹے وہاں پڑھتے جہاں سب لوگ انھیں پڑھتے ہوئے دیکھتے۔ اس کے بعد وہ روپوشس ہو جاتے۔

وہ پلنگ کے نیچے چھپ جاتے اور وہاں پڑھا کرتے۔ اوپر کے اندھیرے کمرے میں گھس جاتے وہاں پڑھتے، وہ گھاس والے کمرے میں پہنچ جاتے وہاں پڑھتے، گھاس والے کمرے میں جا کر پڑھنا بہت اچھا لگتا اس لیے کہ وہاں تازہ گھاس کی بھینی بھینی خوشبو بھی ہوتی۔ وہاں سے وہ گھر میں سب کے چیخنے کی آوازیں بھی سن سکتے۔ یہ تیز آوازیں اس وقت ہوتیں جب کہ ان کی تلاش پلنگوں کے نیچے کی جاتی۔ ننھے ابا جان رات کے کھانے کے وقت نمودار ہوتے۔ انھیں فوراً سزا ملتی، وہ جلدی جلدی کھانا کھاتے اور سو جاتے۔

جب کبھی ان کی آنکھ رات کو کھلتی تو وہ لیمپ جلا کر

پڑھنا شروع کر دیتے۔ وہ چڑگا دسکی کی کتابیں ۔
گر مچھ اور گولیور کا سفر ــــ پڑھتے۔ پشکن کی لکھی ہوئی
کہانیاں اور الف لیلہ پڑھتے۔ دنیا میں جتنی اچھی اچھی
کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کو پڑھنے کی امنگ رکھتے۔
اتنے میں دادی جان نمودار ہو جاتیں، کتابیں
چھین لیتیں اور روشنی گل کر دیتیں۔ تھوڑی دیر کے بعد
ابا جان پھر روشنی جلا لیتے اور پہلی کتاب سے بھی زیادہ
دل چسپ کتاب کا مطالعہ شروع کر دیتے تب دادا جان
وارد ہوتے، کتاب جھپٹ لیتے، روشنی بند کر دیتے
اور اندھیرے میں ابا جان کو ایک چپت رسید کر دیتے
اس چپت کا اثر ابا جان کے بدن سے زیادہ ان کے
ذہن پر پڑتا۔

ان سب باتوں کا نتیجہ بہت برا ہوا۔ اول تو
ابا جان نے اپنی آنکھیں چوپٹ کر لیں۔ پلنگ کے
نیچے اوپر والے اندھیرے کمرے میں اور گھانس والی
کوٹھری میں روشنی کم ہوتی اس کے علاوہ کمبل اوڑھ کر
اور چھوٹے سے سوراخ کی مدد سے پڑھنے سے ان کی
آنکھیں خراب گئیں۔ لیٹ کر یا کم روشنی میں پڑھنا
نقصان دہ ہوتا ہے۔ ابا جان کو عینک لگانی پڑی۔
یہی وہ زمانہ تھا جب کہ ابا جان کو تک بندی کا شوق
ہوا، انھوں نے ایک بلی دیکھی اور فرمایا:

اورے بلی　　کیسی چلتی

انھوں نے کتا دیکھا اور کہا:

کتے موٹے　　کھائے گا بوٹے

مرغا دیکھا تو گانے لگے:

میاں مرغے ککڑوں کوں
کیسے ہو؟ ہوں ہوں ہوں

ابا جان کو دیکھا تو کہا:

ابا جان مہربانی
دیدو مجھ کو اک خوبانی

دادا جان اور دادی جان کو ان کی شاعری بہت پسند
آتی اور اسے لکھ لیتے اور جب بھی محفل جمتی وہ اسے
سناتے۔ آنے والے بھی اسے لکھ لیتے۔ جب بھی
لوگ اکٹھا ہوتے کوئی نہ کوئی فرمائش کرتا۔
"میاں صاحبزادے تم اپنے شعر نہ سناؤ گے؟"
اور ابا جان اپنی تازہ نظم سناتے جو انھوں نے
ایک بلی کے سلسلے میں لکھی تھی۔

اورے بلی دسر کا
مجھے نہیں تیرا بھسکا

سب بڑے ہنستے وہ جانتے تھے کہ شعر اچھے نہیں ہیں
لیکن ابا جان کو گھمنڈ تھا کہ وہ لاجواب ہیں وہ سمجھتے کہ
بڑے ہنس ہنس کر ان کو داد دے رہے ہیں۔ وہ

سالگرہ کے موقع پر کیک کٹنے سے پہلے اور کیک کٹنے کے بعد اپنے اشعار سنایا کرتے۔ ایک بار جب پھوپی بی زرا کی شادی ہوئی تو ابا جان نے اپنی ایک چھوٹی سی نظم سنائی اس دفعہ وہ مقبول نہیں ہوئی اس لیے کہ وہ یوں شروع ہوتی تھی۔

کون کرے گا یہ یقیں

ہیں بی زرا پھوپھی مہ جبیں

سارے مہمان قہقہہ مار کر ہنسنے لگے لیکن بی زرا پھوپھی رونے لگیں اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ دولھا نہ رویا اور نہ ہنسا۔

ابا جان کو سزا نہیں ملی اس لیے کہ انھوں نے پھوپھی بی زرا کو جان بوجھ کر تکلیف پہنچانے کی کوشش نہ کی تھی۔ پر ابا جان کو اتنا ضرور محسوس ہوا کہ بوڑھے اس دفعہ اتنے خوش نہیں ہوئے جیسا کہ وہ اس سے پہلے ان کی تک بندی پر ہوا کرتے تھے۔ اس کے بعد ابا جان نے کسی کو دوسرے سے یہ کہتے سُنا۔

"مجھے یقین ہے کہ یہ پگلا اس قسم کی بیوقوفیاں آئندہ نہ کرے گا۔"

ابا جان دادی جان کے قریب گئے اور انھوں نے پوچھا۔

"پگلے کے کیا معنی ہیں؟"

"وہ لڑکا جو غیر معمولی ہو۔"

"اس کی بابت کیا بات غیر معمولی سمجھی جائیگی؟"

"یعنی یہ کہ وائلن بجائے یا اچھا حساب کرے یا پھر جو اپنی ماں پر سوالات کی بھرمار کرے۔"

"جب وہ بڑا ہوتا ہے تو کیا ہوتا ہے؟"

"بڑھ کر وہ اک معمولی انسان بنتا ہے۔"

"شکریہ" ابا جان نے کہا "اب میں سمجھا۔"

اس کے بعد ابا جان نے اگلی سالگرہ والی پارٹی میں اپنی نظم نہیں پڑھی۔ انھوں نے سر میں درد کا بہانہ کیا۔ اس واقعہ کے بعد سے ابا جان نے اِک عرصے تک کوئی شعر نہ لکھا اور اب بھی جب کوئی ان سے سالگرہ کے موقع پر کسی نظم کی فرمایش کرتا ہے تو ان کے سر میں فوراً درد شروع ہو جاتا ہے۔

ان داتا

جناب علو شبلی

ساتھ لیے ہل بیل کو اپنے
گھر سے نکلے نور کے تڑکے

دھوپ کی کرنیں تیر چلائیں
پانی لے کر بدلیاں آئیں

کام ہے ان کا محنت کرنا
محنت کرنا جھولی بھرنا

دن بھر محنت کرتے ہیں یہ
پیدا دولت کرتے ہیں یہ

کھیتوں میں ہریالی اِن سے
چہروں پر بھی لالی اِن سے

ہونٹوں کی مُسکان یہی ہیں
اپنے وطن کی شان یہی ہیں

ہم سب کے "ان داتا" ہیں یہ
سچ پوچھو تو "ماتا" ہیں یہ
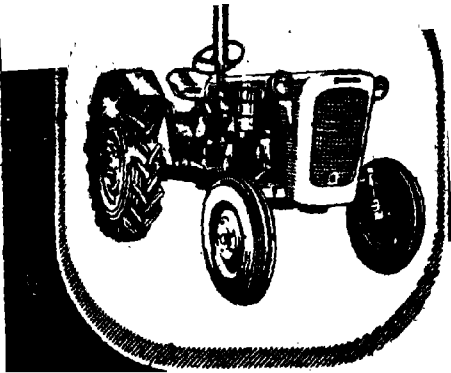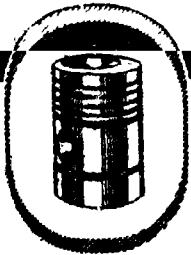
جناب سلام بن رزاق

باب الشفاء

آپ نے تاریخ میں شاہ جہاں بادشاہ کا قصّہ تو پڑھا ہوگا۔ اس بادشاہ نے اپنی چہیتی ملکہ کی یاد میں تاج محل تعمیر کروایا تھا۔ آج ہم آپ کو ایک ستون کی کہانی سناتے ہیں اسے ایک کروڑ پتی نے اپنی بارہ برس کی پیاری بیٹی کی یاد میں بنوایا ہے۔

یہ ستون جنیوا (اٹلی) کی سرحد پر آسمان کی طرف منھ اٹھائے کسی بے خوف سپاہی کی طرح کھڑا ہے اور سیاحوں کی توجہ فوری طور پر اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔

اس کے بانی کا نام سینیٹر گیرو لیمو گیسلنی ہے۔ انھوں نے اپنی دم توڑتی بیٹی کے سرہانے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اپنی بے شمار دولت دنیا کے غریب اور بیمار بچوں کے لیے وقف کر دیں گے اور اپنا یہ وعدہ انھوں نے پورا کیا۔
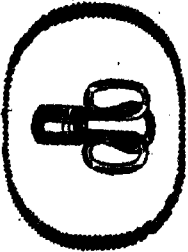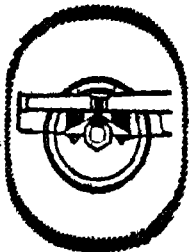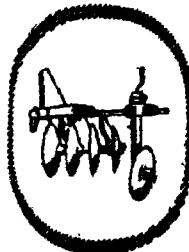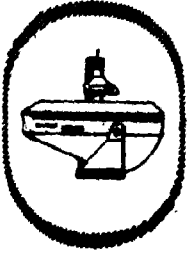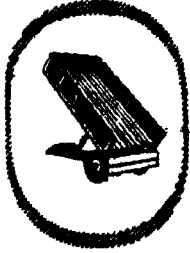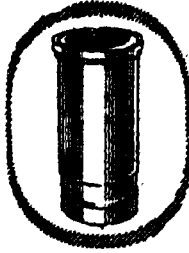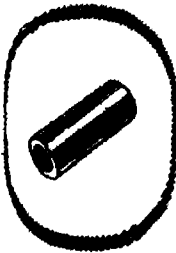
اس ستون کے آس پاس جو بستی ہے اس کا نام "باب الشفاء" ہے باب الشفاء ہسپتالوں کا ایک سلسلہ ہے۔ جہاں تمام ضروری سہولتیں فراہم ہیں۔ یہ ہسپتال بچوں کے لیے ہیں۔ پورے بر اعظم یورپ میں یہ عظیم الشان ہسپتال اپنا ثانی نہیں رکھتے۔

باب الشفاء میں کل تینتیس عمارتیں ہیں۔ جن کا رقبہ ۵۸۰۰۰۰۴ مربع فٹ ہے۔ ان تمام عمارتوں میں مختلف شعبوں میں کام کرنے والے ۰۰، سے زائد ڈاکٹر مختلف بیماریوں کے ماہر ہیں۔ کتنی ہی نرسیں ہیں اور چھوٹے بڑے کام کرنے والے بے شمار نوکر ہیں۔ یہ تمام لوگ اس ننھی سی بچّی کی آخری آرزو کی تکمیل کے لیے دن رات مصروف رہتے ہیں۔

سینیٹر گیسلنی کی عمر اس وقت ۸۵ برس ہے۔ ۱۹۱۵ء میں ان کی اکلوتی بیٹی گیانینا بیمار پڑ گئی۔ یہ پہلی جنگ عظیم کا زمانہ تھا۔ اٹلی بھی جنگ میں شامل

تھا۔ تمام مقامی ڈاکٹر لڑائی پر روانہ کر دیئے گیے تھے۔ دوائیں بھی معقول نہیں تھیں۔ سہولت اور علاج کے تمام دروازے گویا بند ہو گیے تھے جس کی وجہ سے گیسلنی اپنی بیٹی کا علاج مناسب طور پر نہ کرا سکے اور گیا نینا کی زندگی کا غنچہ بن کھلے مرجھا گیا۔ اس جان لیوا صدمے کو گیسلنی نے بہت صبر و ضبط کے ساتھ برداشت کیا اور ایک ایسا کام کیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ انھوں نے اپنی تین کروڑ بیس لاکھ روپے کی کثیر دولت کو باب الشفاء بنانے میں صرف کر دیا۔ تاکہ پھر کسی موقع پر اٹلی کا کوئی بچہ یا بچی علاج سے محروم نہ رہے۔

آخر گیسلنی کا خواب پورا ہوا۔ ہسپتال کے افتتاح کے موقع پر انھوں نے آنکھ میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔

"جب گیا نینا زندہ تھی تب بندرگاہ کی طرف اکثر کھیلنے جایا کرتی تھی۔ جہاں نہایت ہی غریب مچھیروں کی بستی ہے۔ وہاں کے بہت سے بچے اس کے دوست بن گیے تھے۔ نہایت ہی غریب اور غلیظ۔ ان کے پاس کچھ نہیں تھا تاہم انھوں نے میری بچی کو ایک انمول تحفہ دی۔ وہ تحفہ ہے بے لوث دوستی اور دوسروں کے دکھ کو جاننے اور سمجھنے کا جذبہ۔ اپنی چھوٹی سی عمر میں اسے جو مسرت اور خوشی حاصل ہوئی وہ ان ننھے منے بے غرض دوستوں کی دوستی سے حاصل ہوئی۔ پھر وہ بیمار ہو گئی۔ تمام ڈاکٹر لڑائی پر تھے، دوائیں بھی معقول نہیں تھیں۔ میری ساری دولت بھی اس کی کھوئی ہوئی صحت کو نہ خرید سکی۔ اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتے ہوئے اس نے نہایت ہی دھیرے لہجے میں میرے کان میں کہا۔ "پیارے ابا جان! میرے وہ دوست نہایت ہی غریب، کمزور اور بیمار ہیں۔ میں بیمار ہوں اس لیے آپ نے ہر طرح کا علاج کیا، مجھے خوش رکھنے کے لیے ہر طرح کوشش کی لیکن مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میں اب زندہ نہیں رہوں گی۔ آپ کے پاس بہت سا روپیہ ہے مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آپ اپنے روپیوں سے غریب اور بیمار بچوں کا علاج کروائیں گے۔" مرنے سے پہلے یہی آخری بات تھی جو اس کی زبان سے ادا ہوئی۔" اپنے گالوں پر ڈھلکتے ہوئے آنسو پونچھتے ہوئے گیسلنی نے کہا میں نے اپنی لڑکی سے وعدہ کر لیا تھا اور اب اسے پورا کر رہا ہوں۔

باب الشفاء کے مرکز میں مرمر کے سفید اور شفاف پتھروں سے بنی ہوئی ایک عمارت ہے یہی گیا نینا کی آخری آرام گاہ ہے۔ الکثرات کے سناٹے میں جب ہسپتال کے تمام بچے اور بچیاں سو جاتے ہیں اس جگہ اس کا بوڑھا اور غمزدہ باپ روزانہ زیارت کے لیے آتا ہے۔ گیسلنی نے تیل کی تجارت میں لاکھوں کمائے مگر اب انھوں نے اپنا تیل کا کاروبار بند کر دیا ہے۔ اب وہ باب الشفاء کے ایک معمولی رائے دہندہ کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور بہت ہی معمولی سی تنخواہ

صبح کی آمد

جناب عبدالمتین نیاز

حکمرانی اندھیروں کی تھی صبح تک
اب دکھاتا ہے سورج بھی اپنی چمک

ڈھل گئی رات دیکھو وہ آئی سحر
جاگ اُٹھیں بستیاں، جاگ اُٹھے سب نگر

آمد و رفت کا شور ہونے لگا
کام سارا بہر طور ہونے لگا

کھل گئیں ساری دوکانیں بازار کی
راہ تکنے لگیں سب خریدار کی

کارخانوں کو مزدور جانے لگے
بابو، افسر سب اپنے ٹھکانے لگے

رکشے، تانگے، بسیں، موٹریں سب کے سب
راستوں پر دکھانے لگے اپنی چھب

چیختا ہاکر کہ اخبار لو صبح کا
رات بھر ساری دنیا میں کیا کیا ہوا

بچے جانے لگے پڑھنے اسکول میں
فرق آیا نہ دنیا کے معمول میں

یعنی کام اپنا سب صبح نے کر دیا
سادہ تصویر میں رنگ بھر بھر دیا

لانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

ے کا دوسری طرف والا دروازہ بھی چاندی کا ہے۔
س سے نکل کر مسجد ہے اس کی چھت گیری حریری
یشم کی اور فرش ریشمی قالینوں کا ہے۔
نجف کی تمام آبادی شیعوں کی ہے اور یہاں
بڑے بڑے مجتہد رہتے ہیں۔

ستائیسویں رجب کی کرامت۔

عراق کے تمام شہروں میں یہ بات مشہور ہے
کہ اگر کوئی لنگڑا ہو، بیمار ہو، اتنا کمزور ہو کر چلنے پھرنے
سے معذور ہو تو ستائیس رجب کو اسے حضرت علیؓ کے
روضے کے سامنے ڈال دیتے ہیں۔ دو تہائی رات
نہیں گزرتی کہ یہ بھلا چنگا ہو کر چلنے پھرنے لگتا ہے۔
اس رات کو لیلۃ الحیاء یعنی زندگی بخش رات کہتے ہیں۔
ایران، شام، خراسان اور دور دور کے
مریض اس رات میں آتے ہیں اور تندرست ہو کر
واپس جاتے ہیں۔ کوئی مریض اپنی بدقسمتی سے اس
تاریخ پر نہیں پہنچ پاتا تو پورے سال انتظار کرتا رہتا ہے۔

نجف میں کسی کی حکومت نہیں بس نقیب الاشراف
کا حکم چلتا ہے سب انھیں کے اشاروں پر چلتے ہیں۔
درگاہ کے خزانے کے مالک نقیب الاشراف
ہیں۔ تمام نذر و نیاز اور چڑھاوے درگاہ کے خزانے
میں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ خزانے میں سامان اور
قیمتی قیمتی چیزوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ اس میں
جمع تو ہوتا رہتا ہے مگر اس میں سے خرچ نہیں کیا جاتا۔

نقیب الاشراف۔

نقیب الاشراف بادشاہوں کی طرح زندگی
گزارتے ہیں۔ خود بادشاہ ان کی بڑی عزت کرتا ہے۔
نقیب الاشراف کہیں سفر پر جاتے ہیں تو
جھنڈے اور نقارے ساتھ چلتے ہیں۔ ان کے دروازے
پر بھی صبح و شام نقارے بجتے ہیں۔ آج کل سید
نظام الدین حسینی نقیب الاشراف ہیں۔
یہاں سے قافلہ بغداد چلا گیا مگر میں عربوں
کی ایک جماعت کے ساتھ دریائے فرات کے کنارے

پر سے بصرہ گیا۔

شہر واسط میں ابوالعباس احمد رفاعی کے مزار پر حاضری دی ۔ ابوالعباس احمد رفاعی بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ حضرت موسیٰ کاظم کی اولاد میں ہیں ۔ رفاعی سلسلے کے درویشوں سے عجیب عجیب کمالات ظاہر ہوتے ہیں ۔

حضرت احمد رفاعی کے پوتے سے جب نیاز حاصل ہوا تو بعض کمالات نظر سے گذرے ۔ اتفاق سے عصر کا وقت تھا۔ نماز ختم ہوئی تو دف اور نقارے بجنے لگے اور درویش جھومنے لگے۔ مغرب کے بعد دسترخوان بچھا جس پر روٹیاں، دودھ، مچھلی اور کھجوریں تھیں ۔

کھانے کے بعد شیخ مسند پر بیٹھ گیے اور گانا ہونے لگا۔ سوکھی لکڑیوں کے ایک ڈھیر میں جو سامنے پڑا تھا۔ آگ لگادی گئی۔ جوں ہی درویشوں پر وجد (ایک خاص کیفیت اور سرور) طاری ہوا وہ سب کے سب آگ میں گھس گیے۔ کوئی آگ میں لوٹتا تھا کوئی انگارے اٹھا اٹھا کر چبانے لگتا تھا۔ غرض آگ میں اتنی دیر تک رقص کیا ناچے، کہ آگ ٹھنڈی ہوگئی۔ عجیب حیرت انگیز منظر تھا۔ ان میں بعض ایسے باکمال ہیں کہ زندہ سانپ کا سر چبا ڈالتے ہیں اور زہر ذرا اثر نہیں کرتا۔

حیدری فرقہ۔ حضرت شیخ احمد رفاعی کے پوتے کا نام بھی احمد رفاعی ہے۔ رفاعیوں کا ذکر کرتے وقت مجھے ہندوستان کا قصہ یاد آگیا۔ یہاں میری ملاقات ایک فرقہ کے درویشوں سے ہوئی تھی جنھیں حیدری کہتے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں افغان پورہ[1] گیا تھا۔

حیدری درویشوں کے گلے میں لوہے کے بھاری بھاری طوق اور ہاتھوں میں لوہے کے کڑے پڑے رہتے ہیں۔ ان سب کا سرگروہ اور سردار خوب مضبوط اور تندرست تھا۔ بالکل کالا بھجنگ یہ سب ہمارے قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔

ایک دن بڑے درویش نے کہا۔ آج قوالی ہے تھوڑی سی لکڑیاں دے دی جائیں تو بڑی مہربانی ہوگی۔ میں نے افغان پورہ کے حاکم سے کہہ دیا۔ اس کا نام عزیز اور لقب خمار تھا۔ عزیز نے لکڑیوں کا ڈھیر کرادیا۔ یہ بیس گٹھوں سے کم نہ تھا۔

رات کو عشاء کی نماز پڑھ کر درویشوں نے پورے ڈھیر میں آگ لگادی۔ شعلے بلند ہوئے تو گانا شروع ہوگیا۔ تمام درویش آگ میں گھس گیے۔ اور وجد کی حالت میں ناچتے اور آگ پر لوٹتے رہے۔

درویشوں کے سردار نے مجھ سے ایک کرتا مانگا۔ میں نے ایک باریک کپڑے کا کرتا نکال کر دے دیا۔ درویش کرتا پہن کر جھومتا ہوا آگ کی طرف بڑھا اور دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹنے لگا۔ کرتے

[1] اب اس بستی کا نام افغان ... سے مرادآباد، کہ ضلع ...

ں آستینوں کو بار بار آگ پر مارنے لگا۔ یہاں تک تمام انگارے بجھ کر ٹھنڈے ہو گئے۔
پھر یہ کرتا درویش نے واپس کر دیا اور میں نے دیکھا کہ کپڑے کا ایک تار بھی نہیں جلا تھا۔
بصرے کے راستے میں ایک مقام الغدراء ملتا ہے۔ یہاں کے ڈاکو مشہور ہیں اور قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں۔

مالک بن دینار

مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ بڑے بزرگوں میں گذرے ہیں۔ بصرے میں ان کے نام کا ایک مسافر خانہ ہے۔ اس کا نام مسافر خانہ مالک بن دینار ہے۔ میں اُسی مسافر خانے میں ٹھہرا تھا۔
بصرے کے بیچ شہر میں مسجد علی کے نام سے ایک بڑی اونچی اور وسیع مسجد ہے۔ بالکل قلعہ معلوم ہوتی ہے۔
عراق کے شہروں میں بصرہ اپنی وسعت، عمارتوں کی مغربی اور تاریخی یادگاروں کے لحاظ سے قابلِ دید شہر ہے۔ منظر اتنا اچھا ہے کہ بہت کم شہروں کو یہ بات نصیب ہے۔ جگہ جگہ کھجوروں کے جھنڈ، ان کی ہریالی، پانی کے چشمے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں۔ کھجوریں نہایت اعلیٰ قسم کی اور بے حد سستی ہیں۔ ان سے شیرہ بھی نکالا جاتا ہے۔ یہ بے حد لذیذ (مزے دار) اور مقوی ہوتا ہے۔ بصرے والے مسافروں سے جلد ہی گھل مل جاتے ہیں اور اس قدر محبت اور خلوص سے پیش آتے ہیں کہ مسافر بصرے کو اپنا وطن سمجھنے لگتے ہیں۔
مسجد علی میں فقط جمعہ کے دن نماز ہوتی ہے اور پھر ایک ہفتے تک مسجد میں کوئی نہیں جاتا۔ اسی مسجد میں وہ قرآن پاک بھی رکھا ہوا ہے۔ جسے تلاوت کرتے کرتے حضرت عثمان ذوالنورین خلیفہ سوم شہید ہوئے تھے۔
جس آیت پر خون گرا تھا اس ورق پر اب تک خون کا دھبا باقی ہے رنگ کچھ بدل گیا ہے۔
ایک دفعہ میں نے جمعہ میں خطیب صاحب کو دیکھا کہ اونچی آواز سے خطبہ گا گا کر پڑھ رہے ہیں۔ بے حد افسوس ہوا کہ بصرے کی وہ تاریخی آبادی جس میں صحیح عربی پڑھنے کے قاعدے بنانے والے پیدا ہوئے۔ اس کے امام خطبہ بھی صحیح نہیں پڑھ سکتے۔

مینار لرزتا ہے

اس مسجد کے سات مینار ہیں۔ ان میں سے ایک مینار حضرت علیؓ کا نام لیتے ہی لرزنے لگتا ہے۔ میں بھی اس مینار پر چڑھا بصرے کے احباب میرے ساتھ تھے۔ مینار کے کھمبے میں لکڑی کا ایک ہتھا لگا ہوا

سے بڑا ہوا تھا۔ ہلا کر دیکھا تو جنبش نہ ہوئی۔ میرے ساتھیوں میں سے ایک نے ہتھے میں ہاتھ ڈال کر کہا۔ "بطفیل سرِ مبارک امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ جنبش کر" اس پر ہتھا ہلنے لگا۔ مینار بھی لرزنے لگا۔ یہ دیکھ کر میں نے بھی ہتھے پر ہاتھ ڈالا اور کہا۔ "بطفیل سرِ مبارک سیدنا ابوبکر خلیفہ رسول اللہ جنبش کر" مینار لرزنے لگا۔ اس پر سب حیرت میں رہ گئے۔ وہ تو غنیمت تھا کہ بصرے میں شیعوں کا زور نہ تھا ورنہ کیا مجال تھی کہ خلیفہ اوّل کا نام بھی کوئی زبان سے نکال سکے۔

نجف، کربلا، بحرین، قُم کا نشان وغیرہ مقامات میں شیعوں کا زور زیادہ ہے۔

بصرے کے مزار

جن دس صحابہ کو سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی بشارت دی ہے ان میں ایک حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ بھی ہیں۔ حضرت طلحہؓ کا مزار بصرے میں ہے۔ مسجد اور خانقاہ ساتھ ہے۔ خانقاہ میں ہر ایک کو کھانا ملتا ہے۔ بصرے والے حضرت طلحہؓ کے مزار کی بے حد تعظیم کرتے ہیں۔

حضرت زبیر بن العوام

حضرت زبیر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پھوپھی حضرت صفیہؓ کے بیٹے ہیں جنھیں رسول اللہ نے اپنا حواری فرمایا تھا۔ اور جنھیں جنت کی بشارت دی تھی۔ ان کا مزار بھی بصرے میں ہے اور یہاں بھی خانقاہ اور مسجد ہے: خانقاہ میں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔

حلیمہ سعدیہ

رسول اللہ کی دائی یا دودھ پلانے والی ماں حلیمہ سعدیہ اور رسول اللہ کے دودھ شریک بھائی کی قبریں ایک جگہ ہیں۔

حضرت انس

رسول اللہ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ اور ابی بکرہؓ کے مزار بھی بصرے میں ہیں

صحابہ کے علاوہ یہاں اور بڑے بڑے بزرگوں کے مزار ہیں۔ مثلاً حضرت امام حسن بصری، محمد بن واسع، مالک بن دینار، حبیب عجمی، سہیل بن عبداللہ تستری وغیرہ۔

یہ سب مزار پرانی شہر پناہ کے اندر ہیں اور ہر ایک مزار پر مقام اور تاریخ وفات کے تعویذ ہیں۔ ان شہیدوں کے مقبرے بھی ہیں جو حضرت علی اور حضرت عائشہ کی جنگ میں دونوں طرف سے لڑے تھے۔ یہ جنگ بصرے میں ہوئی تھی اور اسے جنگِ جمل یعنی اونٹ والی لڑائی کہتے ہیں۔ اس لیے کہتے ہیں کہ جب تک حضرت عائشہ کا اونٹ کھڑا رہا جنگ برابر ہوتی رہی

جناب بدیع الزماں خاور

طلباء کا ترانہ

یہ ترانہ نیشنل ہائی اسکول داپولی (مہاراشٹر) کی ۲۵ سالہ جوبلی کے موقع پر کورس کی شکل میں پیش کیا گیا تھا

اس سرزمین پر ہیں فدا جان و تن سے ہم
بُلبُل ہیں، عشق کرتے ہیں اپنے چمن سے ہم
ہم کو یہ درس گاہ نہ کیوں کر عزیز ہو
سیراب ہو رہے ہیں جہاں، علم و فن سے ہم
فردا کی ہر خوشی پہ ہمارا یقین ہے
مایوس کیوں ہوں آج کے رنج و محن سے ہم
بن جائیں گے چراغ، زمانے کی راہ میں
نکلیں گے نور لے کے جب اس انجمن سے ہم
چلنے نہ دیں گے جہل کی تخریب کاریاں
اقرار کر رہے ہیں یہ، قوم و وطن سے ہم

چاند کا کانگرو

جناب آئی۔ایم۔اے کتھور
پرنسپل انجمن ہائیر سکنڈری اسکول بیجاپور

ہماری یہ دنیا اس پر بسنے والے انسانوں کے لیے بہت پرانی ہو گئی ہے اور آدمی کی فطرت میں یہ خصوصیت رکھی گئی ہے کہ وہ ہر پرانی چیز سے بیزار ہو جاتا ہے اور کسی نئی چیز کی طرف دوڑتا ہے چاہے اسے اس نئی چیز کے حاصل کرنے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ اٹھانی پڑے۔ یہ سورج، چاند، سیارے اور ان گنت ستارے اپنی زمین سے اکتائے ہوئے آدمی کے لیے ہمیشہ سے ایک کشش کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ کبھی آدمی نے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہو کر ان کی پوجا کی ہے تو کبھی ان کی گردش کو اپنی قسمت کے نشیب و فراز کے ساتھ منسوب کیا ہے۔ غرضیکہ ایک عرصے تک آدمی کے لیے یہ ایک معمّا بنے رہے ہیں۔ ہمارے مشہور شاعر غالب بھی ان کے دھوکے سے نہ بچ سکے اور انھیں کہنا پڑا ؎

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

ان سب میں چاند ہمارا قریب ترین ہمسایہ ہے اور زمانۂ قدیم سے انسانی دلچسپیوں کا باعث رہا ہے اور ہر عمر کے آدمی نے اس سے مختلف اثرات لیے ہیں۔ بوڑھی دادی اماں جب شام کو بچوں کو کہانی سنائیں گی تو وہ چاند پر رہنے والی بڑھیا کی ہوگی۔ ماں جب اپنے بچے کو محبت سے اپنی باہوں میں بھینچے گی تو ضرور کہے گی "تو تو میرا چاند ہے۔ میرا منّا میرا چاند"

چاندنی سے اندھیری راتوں میں ہلکی ہلکی،

وہی روشنی پھیلتی ہے اور اس سے جو ایک خوشگوار سماں پیدا ہو جاتا ہے اس کی تعریف میں شاعری بھری پڑی ہے۔ یہاں تک کہ جب کوئی چھوٹا بچہ روتا ہے تو اس کو بہلانے کے لیے اسی قدرتی کھلونے (چاند) کا سہارا لیا جاتا ہے اور جب اس سے "وہ دیکھو چندا ماموں" کہا جاتا ہے تو فوراً اس کی نظریں آسمان کی طرف اٹھتی ہیں۔ چاند کا مسکراتا چہرہ دیکھ کر وہ اپنی ضد بھول جاتا ہے۔ آنسو تھم جاتے ہیں اور ایک ایسی معصوم مسکراہٹ اس کے لبوں پر آجاتی ہے جس پر فرشتوں کو بھی رشک آئے۔

لیکن سائنس والوں کی حقیقت بیں نگاہوں نے ان تمام باتوں سے الگ ہو کر چاند اور دوسرے سیاروں اور ستاروں کی حقیقت کا پتہ لگانا شروع کر دیا۔ پچھلے چند سالوں سے تو چاند پر پہنچنے کی مہم نہایت تیزی سے جاری ہے۔ راکٹ کی مدد سے روسی اور امریکی خلا باز خلا میں پہنچ کر اس کے مختلف اشارات کی معلومات فراہم کر رہے ہیں۔ یہ تیاری ہے دراصل چاند پر پہنچنے کی۔ حال ہی میں روسی اور امریکی راکٹ چاند پر بالکل آہستہ اتارے گئے ہیں (Soft landing) ان کی مدد سے بہت بیش بہا معلومات ہمیں حاصل ہوتی ہیں۔ ابھی چند دنوں کی بات ہے کہ روس نے ایک مشہور خلا باز کو راکٹ میں بٹھا کر چاند میں بھیجا تھا مگر یہ راکٹ راستے میں خراب ہو گیا۔ واپسی پر خلا باز نے راکٹ سے نکل کر زمین پر اترنے کے لیے چھتری کھولی یہ کھل نہ پائی اور خلا باز کو اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑے

آج تک چاند کے متعلق جو باتیں حاصل ہوئی ہیں ان میں سے چند نہایت اہم ہیں اور جن سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کو چاند پر پہنچنے کے بعد کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

چاند ایک سنسان علاقہ ہے اس کی سطح زمین کی سطح کا سولھواں حصہ ہے جس پر وسیع صحرا ہے اور گہرے غار ہیں۔ نہ اس کی کوئی فضا ہے نہ کہیں بادلوں کا نام و نشان۔ نہ موسم بدلتے ہیں نہ طوفان آتے ہیں نہ درخت ہیں نہ پودے، نہ گھاس اگتی ہے۔ یہ ہر قسم کے جانداروں سے بھی خالی ہے۔

چاند کے دن اور رات بھی زمین کے دن اور رات سے نرالے ہیں۔ چاند کا ایک دن زمین کے دو ہفتوں کے برابر ہوتا ہے اور اسی طرح رات بھی دو ہفتوں کے برابر ہوتی ہے۔ دن میں سورج کی گرمی اس قدر زیادہ ہوتی ہے کہ پانی میں ابال آسانی سے آسکتا ہے اور رات میں سردی اس شدّت سے پڑتی ہے کہ جاندار بھی منجمد ہو جائیں۔

ظاہر ہے چاند پر پہنچنے کے بعد آدمی کو ان تمام دشواریوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ان میں سب سے زیادہ دلچسپ اور مزے دار بات آدمی کے چلنے کے متعلق ہوگی۔ چاند پر پہنچ کر جیسے ہی وہ چلنے یا دوڑنے کی کوشش کریگا تو ہر قدم پر وہ سطح سے کافی اوپر اچھلے گا۔ اور پھر سطح پر آئے گا۔ اس حرکت کے درمیان وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے گا اس لیے لڑھکے گا یا گر جائے گا۔

کیوں؟

چاند کی کشش ثقل زمین کی کشش ثقل کا چھٹواں حصہ ہے گویا زمین پر 150 پونڈ وزن چاند پر صرف 25 پونڈ ہو جائیگا لیکن اس کی طاقت میں کوئی فرق نہ ہوگا اور اس کے اعضاء اسی زور کے ساتھ حرکت کریں گے جس زور کے ساتھ وہ زمین پر حرکت کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ حرکت غیر متوقع طور پر بہت تیز ہوگی۔ مثلاً چلنے کے لیے قدم اٹھائے گا تو وہ پورے جسم کے ساتھ سطح کے اوپر اچھلے گا اور پھر آہستہ سے سطح پر آملے گا زمین پر اس طرح نہیں ہوتا اس لیے چاند پر چلتے وقت پہلے پہلے آدمی چھوٹے بچوں کی طرح کئی مرتبہ گرے گا۔ اگر اسے وہاں کوئی دیکھنے والا ہوگا تو اس کی اس حالت کو دیکھ کر خوب ہنسے بلکہ چلنے والا خود اپنی اس کانگرو جیسی چال پر قہقہے لگائے گا اور پھر فوراً پریشان ہو جائے۔

دوسرے الفاظ میں زمین کا آدمی چاند پر کانگرو بن جائے گا۔ اس کو کانگرو کی طرح چھلانگ لگا کر چلنا پڑے گا۔ اس کے علاوہ آدمی کے چلنے کی رفتار بھی کم ہو جائے گی۔ مثلاً زمین پر سو قدم فی منٹ رفتار ہو تو چاند پر یہ گھٹ کر بیس قدم فی منٹ ہو جائے گی اس لیے چاند پر پہنچنے کے لیے جن خلا بازوں کو تربیت دی جا رہی ہے انھیں مصنوعی طور پر پیدا کردہ کم ہوا والی سطح پر آہستہ چلنے یا مینڈک کی طرح پھدک کر چلنے کی مشق کرائی جا رہی ہے۔

حالانکہ چاند ایک چھوٹا سا سیارہ ہے لیکن وہ ایک ایسی تجربہ گاہ Observatory بن سکتا ہے جہاں سے نظام شمسی کا بہتر طور پر مطالعہ اور کائنات کا وسیع پیمانے پر مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ آج کے سائنس دانوں کے درمیان ایک دوڑ سی چل رہی ہے۔ اس دوڑ میں روس اور امریکہ پیش پیش ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ پہلے کون پہنچے گا۔ لیکن اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۹ء تک چاند کی سرزمین پر انسانی قدم پہنچ جائیں گے چاہے وہ انسان روسی

اکڑ شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

امی کی زنجیریں

بچپن میں وہ مہاندی کے کنارے ایک گاؤں میں
ہتا تھا اور ہر روز صبح شام مہاندی کے کنارے آکر گھنٹو
تھا لہروں کا رقص دیکھتا رہتا۔ برسات کے شروع ہوتے
ی کسان ندی کے کنارے کنارے مٹی سے کئی باندھ
دھتے۔ لہروں کو ان باندھوں سے سر ٹکراتے دیکھ کر وہ
وچتا کہ لہریں آزادی کے لیے جدوجہد کر رہی ہیں کیونکہ
نوں نے ان لہروں کی چال کو روکنے کے لیے لہروں کو
غلام بنائے رکھنے کے لیے یہ مٹی کے باندھ باندھے ہیں۔
وہ گھنٹوں بیٹھے بیٹھے دیکھتا رہتا کہ لہریں باندھ سے بار
ار ٹکرا رہی ہیں اور دن رات باندھ توڑنے کی ان تھک مسلسل
کوشش کر رہی ہیں۔ برسات کا پانی اور بڑھ جاتا اور لہروں
میں نئی جوانی آجاتی۔ آخر کار مٹی کا ایک ایک باندھ لہروں کے
تھپیڑوں سے ٹوٹ کر پانی میں گرتا اور لہروں کی اس کامیابی
پر اسے دلی مسرت ہوتی وہ خوشی سے ہنس پڑتا
کئی سال بیت گئے۔ وہ لڑکا جوان ہوگیا اور جنگ
آزادی میں کود پڑا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا نام ملک کے
کونے کونے میں آگ کی طرح پھیل گیا۔ اس کا نام سنتے ہی
لوگوں کے دلوں میں آزادی کی لگن بڑھ جاتی اور ان میں
جدوجہد کرنے کی ہمت ابھرتی۔ کئی بار انگریزوں نے اسے

جیل کی چار دیواری میں قید رکھا لیکن وہ اپنے ارادے
سے ہرگز باز نہ آیا۔ اسی زمانے میں ایک دوست نے اس سے
سوال کیا "بھائی، میرا خیال ہے کہ تم لوگ بھارت ماتا کو
غلامی کی زنجیر سے آزاد نہیں کرا سکو گے۔" اس پر اس
بہادر نوجوان نے اپنے دوست کو جواب دیا۔ "تم نہیں جانتے
انسان قدرت سے بہت کچھ سبق حاصل کرتا ہے۔ بچپن میں
میں مہاندی کے کنارے گھنٹوں بیٹھ کر لہروں کا رقص
دیکھتا تھا کہ کس طرح لہریں اپنا سر ٹکرا ٹکرا کر باندھوں کو
توڑنے میں مگن رہتی ہیں اور آخر کار ایک دن باندھ کی بنیاد
ہل جاتی۔ یاد رکھو ہم فرنگی حکومت کی بنیاد کو ہلا چکے ہیں۔
ان کے قدم ڈگمگانے لگے ہیں اور اب وہ دن دور نہیں جب
ہم غلامی کی زنجیروں کو توڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔
ایسے ہی بہادر نوجوان کی جدوجہد اور قربانی کا
نتیجہ ہے کہ آج ہم ایک آزاد ملک کے باشندے ہیں۔ جانتے
ہو کس بہادر نوجوان کی بات کہہ رہا ہوں؟ یہی وہ نوجوان
ہے جس کا پورا نام سوبھاش چندر بوس ہے اور آج
جسے لوگ فخر و پیار سے "نیتا جی" یعنی رہنما کے نام
سے یاد کرتے ہیں۔

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

(مسلسل)

بستر پر دراز ہونے کو تو ہو گئے لیکن چین کہاں اور نیند کہاں، کروٹیں بدلتے رہے۔ دماغ میں رہ رہ کر یہ ہی خیال آتا تھا کہ ہم اسوقت اس سمندر سے گزر رہے ہیں جس کے داہنے کنارے پر وہ سرزمین واقع ہے جہاں اسلام نے جنم لیا تھا۔ میرا مطلب مکّہ اور مدینہ سے ہے۔ ہندوستان کے مسلمان ساری عمر اس انتظار میں رہتے ہیں کہ کبھی انھیں بھی اللہ میاں توفیق عطا فرمائیں کہ وہ ایک بار اس مقدس مقام کی زیارت کر سکیں۔ ان میں سے بہت کم ایسے خوش قسمت ہوتے ہیں جن کی مراد بر آتی ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگ اپنے اس ارمان کو ساتھ لے کر جہاں سے آئے تھے وہیں لوٹ جاتے ہیں۔ ایک میں بدقسمت ہوں کہ اس مقام سے قریب ہوتا جا رہا ہوں لیکن زیارت کی کوئی توقع نہیں۔

جدّے کا بندرگاہ یہاں سے مشکل سے ڈیڑھ سو میل ہو گا۔ یہ وہی بندرگاہ ہے جہاں سمندر کے راستے آنے والے حاجی لوگ مکّہ جانے کے لیے اترتے ہیں۔

تین چار گھنٹوں میں ہم اس بندرگاہ سے بھی گزر جائیں گے لیکن اس مقام کی زیارت سے محروم رہیں گے۔

خیال آیا چلو ڈیک پر چلیں اور کم سے کم اس مقدس مقام کی طرف حسرت بھری نظروں سے ایک بار دیکھ تو لیں۔ میں بستر سے اٹھا اور اکیلا ڈیک پر چلا گیا۔ چاندنی رات تھی۔ ہوا میں خنکی تھی۔ داہنی طرف جدھر جدّے کا بندرگاہ ہو سکتا تھا دیکھنا شروع کیا۔ پانی ہی پانی، نہ زمین دکھائی دیتی تھی اور نہ کوئی دوسری چیز۔ سمندر بے حد خاموش تھا، پانی پر جہاں چاند کا عکس گر رہا تھا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی نے چاندی کی چادر پالش کر کے بچھا دی ہو۔ بہت دیر تک میں گم سم ان ہی خیالات کی تہہ میں غوطے لگاتا رہا۔ اسلام

کی ساری تاریخ، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ساری زندگی ذہن پر چھا گئی۔ سوچتا رہا، انسان پیدا ہوتے ہیں، مرجاتے ہیں لیکن چند اللہ کے پیارے بندے ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں اللہ میاں کے پیغمبر ہونے کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔ جو قوم انسانی کو سیدھے راستے پر لانے کے لیے اپنا سب کچھ لٹا دیتے ہیں۔ ان کا نام اور کام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے قائم رہتا ہے۔ ان کا پیغام اس دنیائے فانی میں ہمیشہ گونجتا رہتا ہے اور ہمیشہ گونجتا رہے گا۔ یہی سوچتے سوچتے جب کافی رات بیت گئی اور نیند کے جھونکے آنے لگے تو ڈیک سے نیچے اتر آیا اور سو گیا۔

صبح ۶ بجے آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ جہاز ایک جگہ رکا کھڑا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بندرگاہ ہے میں نے جلدی جلدی ضروری کاموں سے فراغت حاصل کی اور کپڑے پہن کر ڈیک پر پہنچا تو دیکھا کہ میرے دوسرے ساتھی بھی مجھ سے پہلے وہاں موجود ہیں۔ چھوٹے خان صاحب بولے ارے میاں کہاں رہ گئے؟ دیکھو تو سوئز (SUEZ) پہنچ گئے۔

میں نے کہا: "ارے یار پہنچ تو گئے ہیں لیکن رکے کیوں کھڑے ہیں؟ چلتے کیوں نہیں؟" خان نے جواب دیا "حضرت ہم نے آپ سے قبل یہی سوال کیپٹن صاحب سے کیا تھا۔ وہ فرمانے لگے 'یہی سوئز SUEZ کے بندرگاہ سے ہی نہر سوئز (SUEZ CANAL) شروع ہوتی ہے۔ یہ نہر بہت کم چوڑی ہے اور چونکہ یہ ریگستان میں بنائی گئی ہے اسلیے اس میں ایک وقت میں ایک ہی جہاز یا تو آسکتا ہے یا جا سکتا ہے۔ اس کے دونوں کنارے ریتیلے ہیں۔ اگر خدانخواستہ جہاز کہیں تیزی سے چلنے لگے اور پانی میں لہریں پیدا ہو جائیں تو کناروں کی ریت لڑھک کر پانی میں آجائے اور پانی کی گہرائی کو کم کر دے۔ اگر اتفاقاً ایسا ہو جائے تو جہاز ریت کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ یہ سمجھو کہ بریک لگ جاتا ہے۔"

میں نے کہا "تو حضرت معلوم ہوتا ہے بہت سویرے آپ یہاں آدھمکے ہیں۔" کہنے لگے "جی ہاں بس فجر کی نماز کے بعد ہی ہم لوگ یہاں آگئے تھے۔ اور چونکہ کیپٹن صاحب کو فرصت تھی اور وہ خود آج سویرے اچھے موڈ میں تھے ہم نے سوچا چلو ان سے کچھ معلومات ہی حاصل کریں۔ اور آج ہم نے یہ طے کیا ہے کہ ہم آپ کو لکچر دیں گے۔" میں نے کہا "تمھارے لکچروں سے تو ہم سارے راستے بور ہوتے رہے، تمھارے علم کے بھی قائل ہو گئے پر آج ہم چاہتے ہیں کہ تم بھی ہماری زبان کے قائل ہو جاؤ۔" انھوں نے جیب سے ڈائری نکالی اور فرمانے لگے "لو سنو۔ نہر سوئز جہاں ایک طرف میڈی ٹیرے نا ین سمندر (MEDITERRANEAN SEA) کو ملاتی ہے دوسری طرف سوئز کھاڑی کے ذریعہ بحر احمر (RED SEA) میں جا ملتی ہے۔ یہ نہر ۱۰۷ میل لمبی ہے ½۴۲ فٹ گہری ہے اور ۱۹۷ فٹ چوڑی ہے۔"

بیچ میں میں فوراً بول اٹھا "یعنی مطلب یہ ہے کہ یہ نہر ایک ہاکی فیلڈ کی لمبائی سے بھی کم چوڑی ہے۔

خوب صاحب اور غضب خدا کا اس پر بھی جہاز اس میں سے
گزر جاتے ہیں۔" وہ فرمانے لگے "بیچ میں دخل نہ دو بس
سنتے جاؤ۔ یہ نہر دو بار بنائی جا چکی ہے۔ پہلی مرتبہ جب
اسے بنایا گیا تھا تو یہ بیچ میں خراب ہو گئی تھی۔ دوسری
مرتبہ ۶۹-۱۸۵۹ء میں پھر بنائی گئی۔ اس نہر پر ایک انگریز
کمپنی کا قبضہ ہے۔ کیپٹن نے جب یہ بات بتائی تھی تو
اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل تھا۔ کاش تم بھی اسے دیکھ
پاتے۔ اس کی باچھیں کھل کھل گئی تھیں یعنی ہم ہندوستانیوں
پر یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ انگریز ہی ایسے اچھے اور
انوکھے کام کر سکتے ہیں۔" میں نے کہا "ہاں بھئی انھیں
ہندوستان چھوڑنے میں کوئی مزہ تھوڑے ہی آیا ہوگا
وہ اپنی مرضی سے کب گئے۔ جب مجبور ہو گئے اور نکالے
گئے تب جا کر کہیں سدھارے۔ یہ دیکھو نا یہ علاقہ جس
میں یہ نہر نکالی گئی ہے مصری ہے اس نہر پر مصریوں
کا قبضہ ہونا چاہیے لیکن بات الٹی ہے۔ انگریزوں کا
قبضہ ہے۔ اور بھی تو دیکھو عدن پر بھی ان کا قبضہ ہے
حالانکہ قبضہ عربوں کا ہونا چاہیے۔ اور سنگاپور میں
بھی ان کا قبضہ ہے حالانکہ سنگاپور پر ملایا کا قبضہ ہونا چاہیے
یہ ایسی ہی بات ہے جیسے گھر کسی کا اور دروازے پر قبضہ
کسی دوسرے کا۔ یہ انگریز ہیں بھئی بڑے چالاک اور
ہوشیار۔"

ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں ہم نے
دیکھا کہ ہمارے جہاز کے قریب سے ایک دوسرا جہاز
SUEZ CANAL سے باہر نکل رہا تھا۔ بات فوراً
سمجھ میں آگئی۔ چونکہ یہ جہاز آ رہا تھا اس لیے ہمیں اندر
جانے کی اجازت نہ تھی۔ اب جب ہمارا جہاز اندر جائے
گا تو اس سرے سے دوسرا جہاز اس وقت تک اندر
داخل نہیں ہو سکے گا جب تک ہمارا جہاز نہر سوئز سے
باہر نہ نکل جائے۔ بس یہ سمجھو کہ ون وے ٹریفک ONE
WAY TRAFFIC کا اصول پیش نظر ہے۔ خان صاحب
بولے "کر دیا نا پھر لکچروں کا سلسلہ شروع!"

دیکھتے ہی دیکھتے ہمارا جہاز نہر سوئز کے اندر
داخل ہوا۔ واقعی خان نے جو بات کہی تھی وہ بالکل صحیح
نکلی۔ نہر واقعی بہت کم چوڑی ہے۔ صاف نظر آتا ہے
کہ ۲۰۰ فٹ سے زیادہ چوڑی نہ ہوگی اور کنارے بھی
صاف نظر آ رہے ہیں کہ ریتیلے ہیں اور کناروں سے پرے
نہ کوئی درخت ہے نہ جھاڑی بس ریگستان ہی ریگستان
ہے۔ جہاز کی رفتار بھی بہت کم ہو گئی ہے۔ اتنی کم کہ شبہ
ہوتا تھا کہ جہاز چل بھی رہا ہے یا نہیں۔ دریافت کرنے
پر معلوم ہوا کہ اس وقت جہاز کی رفتار چار میل فی گھنٹہ ہے
معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس ۱۰۰ میل کے سفر کو طے کرنے
میں دو دن لگ جائیں گے۔ سوئز کی بندرگاہ سے
چلنے کے بعد ہمارا جہاز اب نہر سوئز کے دوسرے
سرے پر پورٹ سعید جا کر دم لے گا۔

جہاز جب نہر سوئز میں داخل ہو گیا تو ہم سب
ڈیک سے نیچے اتر آئے اور ناشتہ کرنے چلے گئے۔

ناشتے کے فوراً بعد ہی اس وقت تک ہم سب لوگ ڈیک پر جمے رہے جب تک دھوپ برداشت کے قابل رہی۔ بعد میں ڈیک سے نیچے گیلری میں آکر آرام کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ کبھی سیدھے ہاتھ کے کنارے کی طرف دیکھتے اور کبھی الٹے ہاتھ کے کنارے کی طرف ہم نے دیکھا کہ دونوں کناروں کے قریب تھوڑے تھوڑے فاصلے پر اور بعض جگہ بہت دور دور ہوائی جہازوں کے ٹوٹے ہوئے ڈھانچے پڑے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب نشانیاں دوسری عالمی جنگ کی ہیں۔

تمھیں تعجب ہوگا کہ ہم کناروں پر پڑی چیزوں کو بہت صاف دیکھ سکتے تھے یہاں تک کہ مجھے کئی مرتبہ پھٹے پرانے فوجی جوتے بھی نظر آئے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہاں بھی لڑائی کا اکھاڑا رہا ہوگا۔ تھوڑی تھوڑی دور پر مجھے دونوں کناروں کے قریب پانی میں اترے ہوئے جنگی ٹینک بھی نظر آئے۔ تعجب ہوا کہ ٹینک اور پانی میں۔؟ آخر میں نے ایک جہازی افسر سے پوچھ ہی لیا کہ حضرت یہ ٹینک پانی میں کیوں اتارے گئے ہیں؟

وہ مسکرایا اور میری سادگی کی داد دیتے ہوئے بولا۔ ہاں صورت شکل سے ٹینک ہی معلوم ہوتے ہیں لیکن دراصل یہ ٹینک نہیں ہیں بلکہ یہ ڈریجر (DREDGER) ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ جب نہر میں کوئی جہاز نہیں ہوتا تو یہ پیندے کی ریت نکال کر کنارے پر جمع کرتے رہتے ہیں تاکہ نہر کی گہرائی ہمیشہ یکساں بنی رہے۔ نہر کناروں کی ریت سے کہیں پٹ نہ جائے۔ بھئی ان ڈریجروں کا سلسلہ آخر تک یعنی پورٹ سعید تک رہا ——

—— بھلا اس نہر کو صحیح حالت میں رکھنے کے لیے کمپنی کو کتنا خرچ کرنا پڑتا ہوگا!

لنچ پر کپتان سے جب اس مسئلے پر گفتگو ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ کمپنی کا کام مشکل ضرور ہے، لیکن کمپنی اس نہر سے گزرنے کا ہر جہاز سے اتنا زیادہ کرایہ وصول کرتی ہے کہ یہ کمپنی کروڑ پتی بن گئی ہے اور ہم سب خوشی سے یہ کرایہ ادا کرتے ہیں۔ بقول اس کے کہ "مرتا کیا نہ کرتا" اگر اس نہر سے ہو کر نہ جائیں تو سارے افریقہ کا چکر لگا کر جانا ہوگا اور اس صورت میں اس کرایے سے زیادہ صرفہ کرنا ہوگا۔

میرے دل میں ایک خیال آیا کہ کیا اچھا ہو اگر یہ کمپنی مصر کی اپنی ہو اور یہ سارا روپیہ جو انگریز لے کر بھاگ رہے ہیں مصریوں کو ملنے لگے۔ اگر ایسا ہو جائے تو مصر اپنے ملک کو اور اس کے باشندوں کو اور زیادہ ترقی یافتہ بنا سکتا ہے۔ لیکن یہ ہو بھی سکتا ہے؟[1] اور ہوگا تو کب ہوگا؟ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن دل یہ کہتا ہے کہ جس طرح ہندوستان نے انگریزوں کو اپنے وطن سے باہر دھکیل دیا ایک وقت انشاءاللہ مصر میں بھی ایسا ضرور آئے گا جب انگریزوں کو مصر سے بھی دم دبا کر بھاگنا پڑے گا۔

———— (باقی) ————

[1] آج کل نہر سویز مصریوں کے قبضہ میں ہے

بتاؤ تو جانیں!

م۔ نور زمانی

نیچے چند سوال دیے جاتے ہیں۔ ان کو حل کرنے کی کوشش کیجیے۔ انھیں حل کرنے میں ریاضی کے علاوہ ذہانت کی بھی ضرورت ہوگی۔ اگر آپ نے اس سلسلے کو پسند کیا تو ہر مہینے ایسے سوال دیے جا سکتے ہیں۔

۱۔ جاوید کے ابا نے اس کو ایک روپیہ دے کر کہا "بازار جاؤ اور اس کی ٹافیاں اور لالی پاپ خرید لاؤ۔ خیال رہے کہ جتنی ٹافیاں خریدو اتنے ہی لالی پاپ بھی ہوں۔" ٹافی کی قیمت تھی دو پیسے فی ٹافی اور ایک لالی پاپ کے تھے تین پیسے۔ جاوید بڑا ذہین لڑکا تھا۔ اس نے روپے میں برابر برابر مقدار میں دونوں چیزیں خریدیں ——— کیسے؟

۲۔ ایک گوالے کے پاس نو گائیں تھیں۔ پہلی گائے روزانہ ایک سیر دودھ دیتی تھی، دوسری دو سیر، تیسری تین سیر اور اسی طرح نویں نو سیر۔ مرنے سے پہلے اس نے وصیت کی کہ گایوں کو تینوں بیٹے آپس میں برابر برابر بانٹ لیں۔ اس کے مرنے پر بیٹوں نے وصیت پر عمل کیا اس طرح کہ ہر ایک کے حصے میں تین تین گائیں بھی آئیں اور تینوں کو ایک ہی مقدار میں دودھ بھی ملتا رہا ——— بتائیے کہ انھوں نے گایوں کو کس طرح آپس میں بانٹ لیا؟

۳۔ ایک تھیلی میں چند روپے، اس سے دگنی اٹھنیاں اور ان سے تگنی چونیاں ہیں جن کو ملا کر کل ۵۰ روپے بنتے ہیں۔ بتائیے کہ تھیلی میں روپے، اٹھنیوں اور چونیوں کے کتنے سکے ہیں ——— ؟

۴۔ ایک کارخانے میں سو مزدور کام کرتے ہیں جن میں روزانہ سو روپے بانٹے جاتے ہیں۔ ہر دن مردوں کو تین روپے پچھتر پیسے، عورتوں کو دو روپے پچاس پیسے اور لڑکوں کو پچاس پیسے کے حساب سے مزدوری ملتی ہے۔ بتائیے کہ اس کارخانے میں کتنے مرد، عورتیں اور لڑکے کام کرتے ہیں؟

اب جواب دیکھیے۔

۱۔ ٹافیاں ۲۰
لالی پاپ ۲۰

۲۔ پہلے لڑکے کو ملی پہلی، چھٹی اور آٹھویں گائے
دوسرے لڑکے کو ملی تیسری، پانچویں اور ساتویں گائے
اور تیسرے لڑکے نے لی دوسری، چوتھی اور نویں گائے

۳۔ تھیلی میں روپے کے سکے دس، اٹھنیاں بیس اور چونیاں ساٹھ ہیں۔

۴۔ اس کارخانے میں آٹھ مرد، ۱۲ عورتیں اور اسّی لڑکے کام کرتے ہیں۔

نیلام

اس نے کہا: ایک ..... دو ..... ساڑھے تین

آنے' ایک طرف سے آہستہ سے کوئی بولا

"جائے گا" اس نے پھر کہا "خو کوئی نہیں بڑھے گا تو ساڑھے تین میں چلا جائے گا۔"

داہنی طرف کھڑے ہوئے لڑکے کی عمر دس سال تھی اس کے بالوں کا رنگ بھورا تھا اور سیاہ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ پاپلین کی قمیض اور سوتی نیکر پہنے ہوئے تھا۔ پاؤں میں باٹا والے کریچ کے سفید بوٹ تھے۔ اس نے آئینہ ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر دیکھا اور کہا۔ "چار آنے"

پٹھان جھلا گیا "خو ایک پیسے کا حساب نہیں چلے گا"

ایک پنجابی بزرگ نے کہا "ساڑھے چار آنے"

پٹھان نے آئینہ ایک ہاتھ سے اچھال کر دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا "چہ ایک روپے کا مال ساڑھے چار آنے میں، ایک ..... دو ....."

لڑکے نے مسکرا کر پنجابی بزرگ کی طرف دیکھا۔ وہ شان سے موچھوں پر تاؤ دے رہے تھے۔

لڑکے نے بولی دی' پانچ آنے'

سب لوگوں کی نظریں اس کی طرف اٹھ گئیں وہ مسکرایا

"ساڑھے پانچ آنے" پنجابی بزرگ نے کہا۔

"چھ آنے" وہ کیا کسی سے کم تھا ---؟

"ساڑھے چھ آنے"

"سات آنے"

"آٹھ آنے"

ہجوم میں خاموشی چھا گئی۔ آئینہ اتنا قیمتی تو نہ تھا لڑکے نے ذرا رک کر کہا۔

"ساڑھے آٹھ آنے"

"نو آنے" پنجابی بزرگ پھر بولے

ایک اور شخص آگے بڑھ گیا۔ اس نے پہلے پٹھان کے ہاتھ سے آئینہ لے کر اپنا چہرہ دیکھا اور پھر بغیر ایک لفظ کہے واپس تھما دیا۔

پٹھان نے کہا "چہ ہندوستانی بچہ ہے سب کچھ دس ایک روپے کا مال۔ خو بازار جاؤ ایک روپے سے کم نہیں ملے گا .... نو آنے۔ ایک دو... نو آنے"

لڑکا خاموش رہا پٹھان پھر بولا۔ "نو آنے"

لڑکے نے کہا "ساڑھے نو آنے"

"دس آنے" پنجابی بزرگ نے بولی دی

"گیارہ آنے"

"بارہ آنے"

"تیرہ آنے"

"چودہ آنے"

"ایک روپیہ" پنجابی بزرگ کا چہرہ لال ہو گیا۔ انھوں نے پگڑی کے پلو سے ساتھ کھڑے ہوئے بچے کی ناک سے رستا ہوا پانی پونچھا اور پھر موچھوں پر تاؤ دینے لگے۔ ہجوم میں سے ایک اور شخص آگے بڑھا۔ اس نے آئینہ پکڑ کر دائیں بائیں گھمایا اور پھر چپکے سے کہا۔

"ٹھن گئی ہے۔"

لڑکے نے نیکر کی جیب میں ہاتھ ڈالا "ایک روپیہ ایک آنہ"

پٹھان کا چہرہ چمک اٹھا "خو ایک روپے ایک آنہ ... . ایک دو ... چلے گا؟"

پنجابی بزرگ نے اپنا بٹوہ نکال کر ہاتھ میں لیا وہ

ایک چھوٹے سے لڑکے سے کبھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے

"ایک روپیہ دو آنے"

"ایک روپیہ تین آنے" لڑکا اب بھی مسکرا رہا تھا۔

"سوا روپیہ"

"پانچ آنے"

"ڈیڑھ روپیہ" سنسنی چھا گئی۔

ایک صاحب نے لڑکے سے کہا "جانے دو میاں صاحبزادے کیوں رقم برباد کرتے ہو۔ آئینہ اتنا قیمتی نہیں ہے۔"

لڑکے کی آنکھیں چمک اٹھیں "جی نہیں۔ اب تو آئینہ لے کر ہی رہوں گا۔" اس نے پھر بولی دی "ایک روپیہ نو آنے"

"دس آنے"

"گیارہ آنے"

"پونے دو روپے"

"دو روپے" لڑکے نے داد طلب نگاہوں سے حاضرین کی طرف دیکھا۔

سب لوگ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

"دو روپے ایک.... دو روپے دو.... دو روپے"

"سوا دو"

"ڈھائی روپے"

"پونے تین"

"تین روپے"

"پانچ روپے" پنجابی بزرگ نے زور سے کہا اور پھر بچے کی ناک سے رستا ہوا پانی پونچھا۔

لڑکے نے جیب میں انگلیوں سے اپنے سرمائے کو گنا۔ ایک.... دو.... تین.... چار۔ اور ساڑھے بارہ آنے

پٹھان نے کہا "پانچ روپے۔ تو جائے گا.... ایک دو.... ایک.... دو.... جائے گا؟" اس نے لڑکے کی طرف منہ کر کے پوچھا۔

"جائے گا" لڑکے نے دھیرے سے کہا....

پنجابی بزرگ کا چہرہ کھل اٹھا۔ انھوں نے آہستہ سے کہا "ساڈے دس پیاسی"

پٹھان نے آیئنے کو زور سے اچھال کر پکڑ لیا۔

"ایک.... دو.... پانچ روپیہ.... ایک.... دو.... خوب کوئی بڑھنے والا.... جائے گا.... تین...." اس نے آئینہ پنجابی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اس نے ایک کڑکڑاتا پانچ کا نوٹ نکالا اور پٹھان کے حوالے کیا۔

لڑکے نے پہلے دائیں بائیں دیکھا اور پھر ہجوم کی نظر بچا کر پٹھان کے پاس گیا۔ ایک روپیہ چار آنے کمیشن کے وصول کیے اور مسکراتا ہوا سر جھکائے پنجابی بزرگ کے سامنے سے گزر گیا۔

اس دن اسکول میں اس کی کتابیں چوری ہو گئی تھیں۔ اور کھنہ بک سیلر کی دکان پاس ہی تھی۔

عابد ورنگلی

اونچا کرو

کسی مدرسے میں فارسی کے استاد کی جگہ خالی ہوئی اس کے لیے کچھ لوگ انٹرویو میں آئے۔ ایک صاحب کو بچوں کو پڑھانے کے لیے فارسی کتاب دی گئی تو پہلے انھوں نے کتاب کو غور سے دیکھا پھر عالمانہ انداز میں

فرمایا — "آج کل مشین کے ذریعہ چھپائی کا کام ہونے کی وجہ سے اکثر کتابوں میں بہت سی غلطیاں رہ جاتی ہیں جن سے بچوں کو کافی نقصان ہوتا ہے۔ اب دیکھیے نا۔ یہ کتاب ہے تو فارسی کی لیکن یہ جملہ تو سو فیصد اردو ہے اور وہ بھی تحریری غلطیوں سے بھرپور۔" انھوں نے ایک جملے پر شہادت کی انگلی رکھی اور کہا کہ "اگر اردو ہی میں لکھنا تھا تو یوں 'اونچا کرو' لکھتے" —— درمیان ہی میں ایک لڑکا بول پڑا "جناب یہ 'اونچا کرو' نہیں بلکہ 'اوچہ کرد' ہے۔ اس کا اردو ترجمہ ہوگا 'اس نے کیا کیا' —"

سب لوگوں کو ہنسی آگئی

—— عشرت جہاں اکبرپور

پیسے کا جادو

بغداد شریف میں ایک فقیر رہتا تھا۔ وہ ایک پاک اور نیک آدمی تھا۔ وہ اپنی زندگی خدا کی عبادت ہی میں گزارتا تھا۔ اس فقیر کے پاس روزانہ آدمیوں کی ایک بھیڑ لگ جاتی تھی۔

آدمیوں کی بھیڑ کی وجہ سے فقیر عبادت نہیں کر پاتا تھا اور اس لیے وہ اس بھیڑ کو پسند نہیں کرتا تھا۔

وہ اکیلا رہنا چاہتا تھا۔

لیکن وہ بہت بامروّت اور شریف آدمی تھا۔ لوگوں سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ 'یہاں مت آؤ'

ایک دن فقیر اداس بیٹھا تھا تو ایک آدمی نے پوچھا "کیا بات ہے کہ آپ اداس بیٹھے ہیں؟ کیا میں آپ کے لیے کچھ کر سکتا ہوں؟"

اس نے کہا "لوگ مجھے دیکھنے بہت آنے لگے اور جھونپڑی کے سامنے ایک بہت بڑی بھیڑ لگ جاتی ہے اور میں خدا کی عبادت اطمینان سے نہیں کر سکتا۔ میں ان سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہاں مت آؤ۔"

اس آدمی نے کہا "گھبرائیں نہیں۔ اب آپ امیروں سے پیسے مانگ کر غریبوں کو ادھار دیا کریں۔"

فقیر نے ایسا ہی کرنا شروع کیا۔

امیر لوگ پیسے دینا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے آنا بند کر دیا۔

غریب لوگ پیسے لوٹانا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے بھی آنا بند کر دیا۔

—— ظہیر الدین بے فکر دہتاسی

بقیہ صفحہ ۵۳

ہوں یا امریکی۔ چاند پر پہنچنا اپنی جگہ کوئی منزل نہیں اس کی حیثیت تو صرف ایک سنگِ میل کی سی ہوگی۔ انسانی منزل کیا ہے اور کہاں ہے کوئی بتا نہیں سکتا۔ انسانی ارادوں کی بلندی تو چاند تاروں سے بھی بلند ہے۔ علامہ اقبالؔ نے بہت پہلے اس جانب اشارہ کیا ہے۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

آدھی ملاقات

محترم حسین حسان صاحب   سلام مسنون

آج کی ڈاک سے "پیام تعلیم" کا تازہ شمارہ ملا
شکریہ! جناب قیصر سرمست نے چیتا اور بوزنہ کا فرق بتانے کی جو زحمت گوارا کی ہے اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ "شکاریات" پر قیصر صاحب کا مطالعہ یقیناً مجھ سے زیادہ ہے اس لیے ان کی باتیں میرے علم میں اضافے کا باعث بنی ہیں اور میں ان کی باتوں سے اختلاف کرنے کی گنجائش اپنے میں نہیں پاتا لیکن ایک بات ضرور کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ چیتا کی جن خصوصیات کا ذکر میں نے کیا ہے لگ بھگ وہی خصوصیات مشہور ماہر جنگلات جے۔ ای۔ کرینگٹن نے اپنی تجرباتی کتاب "آدم خور درندے اور یادیں" (MAN-EATER AND MEMORIES) میں بیان کی ہیں۔ کرینگٹن نے ۳۰ سال تک فورسٹ آفیسر کی حیثیت سے ملازمت کی ہے اور جنگلی جانوروں سے متعلق اپنے تجربات انہوں نے اس میں بیان کیے ہیں۔

مناظر عاشق ہرگانوی

"مئی کا پیام تعلیم" ملا۔ ٹائٹل بے حد پسند آیا۔
کہانیوں اور نظموں کا طرزِ تحریر اتنا سادہ ہے کہ بچے آسانی سے سمجھ سکتے ہیں۔ آپ کے اس پرچے کو میں نے بچوں کے دوسرے رسالوں سے مختلف اور بہتر پایا ہے لیکن اس میں بھی کچھ کمیاں ہیں جن کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پہلا تو یہ کہ اس میں کارٹونوں اور ایک مستقل فیچر جو ہنسنے ہنسانے کے لیے ہو اس کو جگہ دی جائے۔ اس سے رسالہ کی رونق بڑھے گی۔ دوسری یہ کہ ہر تیسرے ماہ ۱۰ سے لیکر ۱۶ سال کے بچوں کا کہانی نظم اور مضمون کا ایک مقابلہ ہونا چاہیے اور اس کی شمولیت کے لیے تھوڑی سی فیس رکھنی چاہیے۔ اس سے بچوں میں لکھنے کا جذبہ بڑھے گا۔

فقط خلوص کار
اسرار جھانسوی بی اے

---

۲۴ نومبر یعنی جس تاریخ سے میں ہندوستان سے روانہ ہوا ہوں اسی تاریخ سے برابر اور ہر روز پیام تعلیم اور ننھے پیامیوں کا خیال رہا ہے ....
ادیس ابابا اور میکلے میں جتنے اخبار تھے، ہر ایک میں خلائی سفر اور چاند تک پہنچنے کی کوشش کے متعلق ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر خبریں پڑھتا۔ فکر برابر رہی لیکن مواد کی کمی کا احساس غالب رہا۔ چاند پر اترنے کے بارے میں جو مضمون لکھ رہا تھا اس کے نامکمل رہنے

کا بہت افسوس ہو رہا تھا۔ ادیس ابابا میں وزارت تعلیم کی لائبریری اور یونیورسٹی کی لائبریری چھان ڈالی لیکن یک طرفہ معلومات ہونے کی وجہ سے قلم اٹھانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ میکلے میں آنے کے بعد یہاں کے اسکول کے کتب خانے میں جتنے اخبار اور رسالے اور میگزین آتے ہیں سب کو میں نے پڑھا اور خلائی سفر کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی جستجو میں لگا رہا مگر تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اور اب مجھے یہ فکر دامن گیر تھی کہ آپ لوگوں کو لکھ کر معافی مانگ لوں کہ میرے مضمون کا سلسلہ فی الحال بند کر دیجیے لیکن تین جنوری کو میں یہاں کی خاص لائبریری میں گیا یہ یو۔ ایس۔ آئی کی لائبریری ہے۔ وہاں کے لائبریرین سے روزانہ باتوں کے ساتھ ساتھ خلائی پرواز اور چاند پر اترنے کے بارے میں خاص طور پر گفتگو ہوئی۔ میں نے محسوس کیا کہ لائبریرین صاحب خلائی پرواز کے بارے میں بہت دلچسپی لے رہے ہیں۔ پھر تو میں نے ان سے خلا کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی، یہ بھی بتایا کہ میں گگارن کی کتاب کا ترجمہ کر چکا ہوں اور پیام تعلیم میں اس پر مستقل مضمون لکھ رہا ہوں۔ لائبریرین نے کہا میں آپ کو بہت سی کتابیں دوں گا اور اپنا مضمون آپ برابر جاری رکھیے۔ انھوں نے اسی وقت خلا کے بارے میں بہت سی کتابیں مجھے دیں۔ ان کتابوں کا خلاصہ پڑھ کر یقین کیجیے میری باچھیں کھل گئیں اور یقین ہو گیا کہ چاند پر اترنے والا مضمون اب بند نہیں ہوگا بلکہ چند ہفتوں کے لیے ملتوی ہو سکتا ہے۔

محمد امین

میکلے۔ اتھوپیا۔

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا۔ جناب یہ تو اپنے نام سے بھی زیادہ دلکش اور حسین ہے۔ اردو ادب میں اتنا صحت مند، اتنا معیاری اور اتنا خوبصورت جریدہ ان اداروں سے بھی نہیں نکل پایا جو سرمایہ دار ہیں۔ خدا سے دعا ہے بچوں کا یہ پیارا رسالہ آسمان ادب پر ایک روشن اور درخشاں ستارے کی طرح جگمگاتا رہے جس سے ہمارے نونہالوں کے دل بھی خوشیوں کے جھولے میں جھولتے رہیں اور ان کے ذہن و دماغ کو علم و ادب کی نئی نئی روشنی اور ضیا بھی ملتی رہے۔

مخلص ظفر نیازی رودہاسوی۔

عرض گذارش ہے کہ ماہ مئی کا پیام تعلیم دیکھا... بس مزہ آگیا۔ تمام نظمیں مضمون اور کہانیاں وغیرہ پسند آئیں لیکن خصوصاً جناب سعادت نظیر کی نظم "بولی" عبدالرحیم نشتر کی نظم "اپنی زمین" جناب آزاد مظفر شاہجہانپوری کی نظم "ایک انوکھا خواب" اور مضمونوں اور کہانیوں میں جناب ظ۔ انصاری کا مضمون "حاجی بھاگی ڈایری" نے ہنساتے ہنساتے پیٹ میں بل ڈال دیے۔ اس کے علاوہ جناب یوسف ناظم کا مضمون "قربان میاں کے کارنامے" بھی خاص طور سے پسند آیا۔ اس کے علاوہ جناب خالد عرفان کا مضمون "اجالے کے کرشمے" اور جناب کارلایل جی۔ برکلے کا مضمون "شوق اور لگن کی جیت"

سید شوکت علی

ایلچ پور

قلمی دوستی

نام ۔ عبدالسلام اختر

عمر ۔ ۱۴ سال

مشغلے ۔ کتابیں پڑھنا، نماز پڑھنا۔ قرآن پاک کا مطالعہ، بیڈمنٹن کھیلنا۔ قلمی دوستی کرنا۔

پتہ ۔ اے۔ ایس اختر معرفت محمد اسماعیل متصل لال مسجد نمبر ۵۔ ہلدوانی۔ (ضلع نینی تال)

——— ❖ ———

نام ۔ نصیر احمد۔ تخلص ۔ بچہؔ

مشغلے ۔ کہانیاں لکھنا۔ پیام تعلیم، کھلونا، بچپن، کلیاں اور بیسویں صدی وغیرہ کا مطالعہ کرنا۔ فٹ بال کھیلنا، تیرنا۔

پتہ ۔ ۱۰۴۔ مہاتما گاندھی روڈ۔ کلکتہ ۷۔

——— ❖ ———

نام ۔ الیاس احمد۔ تخلص ۔ شعلہؔ

عمر ۔ ۱۶ سال

مشغلے ۔ قلمی دوستی۔ فٹ بال کھیلنا۔ بچوں کے تمام رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ کیرم کھیلنا۔

پتہ ۔ ۱۰۴۔ مہاتما گاندھی روڈ کلکتہ ۷۔

——— ❖ ———

نام ۔ محمد ابو لیث عمر ۔ ۱۵ سال

مشغلے ۔ پیام تعلیم کو ہر ماہ دلچسپی سے پڑھنا۔ قلمی دوستی۔ ادبی کتابوں کا مطالعہ کرنا۔ سائیکل چلانا۔

پتہ ۔ محلہ سوہ ڈیہہ پوسٹ آفس سوہ سرائے (بہار شریف) پٹنہ

——— ❖ ———

نام ۔ محمد کلیم الدین

عمر ۔ ساڑھے پندرہ سال

مشغلے ۔ محلے کی انجمن کی دیکھ بھال، پیام تعلیم کا مطالعہ کرنا۔ ٹکٹ جمع کرنا۔ بیڈمنٹن کھیلنا۔

پتہ ۔ محلہ لبسار بگہہ۔ ڈاک خانہ سوہ سرائے (بہار شریف) پٹنہ

——— ❖ ———

نام ۔ جمیل احمد انصاری

عمر ۔ ۱۴ سال

مشغلے ۔ اصلاحی کتابوں کا مطالعہ ۔ نیے نیے ادبی رسائل منگانا لائبریری کے لیے کتابیں جمع کرنا۔

پتہ ۔ جمیل احمد انصاری۔ محلہ قاضی پورہ۔ ٹانڈہ۔ ضلع فیض آباد

——— ❖ ———

نام ۔ احمد عبدالغنی

عمر ۔ ۱۴ سال

مشغلے ۔ قلمی دوستی۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی کے سلسلے میں خطوں کے جواب دینا۔

پتہ ۔ احمد عبدالغنی۔ معرفت احمد عبداللطیف سینیر کوآپریٹو انسپکٹر ضلع عادل آباد (اے۔ پی)

——— ❖ ———

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

مہاراشٹر...... مرتبہ محمد اقبال صاحب

ایک عجیب اسکول

دھرول تعلقہ کے ایک دیہات میں ایک پرائمری اسکول ہے جس میں صرف ایک طالب علم ہے اسے پڑھانے کے لیے استاد بھی صرف ایک ہی ہے سنا ہے طالب علم بھی اسکول چھوڑنے کی تیاری میں ہے بے چارہ استاد!

جونی مسجد کمپاونڈ (بمبئی) میں چلڈرنس فری لائبریری

۲۱ مئی ۱۹۶۷ء سے جونی مسجد کمپاونڈ (بمبئی) میں بچوں کے لیے ایک فری لائبریری قایم ہوئی ہے جو مستقل طور پر بچوں کی ذہنی نشو ونما اور تفریح کا انتظام کرے گی۔ اس لائبریری کی دیکھ بھال بھی بچے ہی کریں گے۔

بوٹ پالش کرنے والے لڑکوں نے دو دن کی آمدنی بہار ریلیف فنڈ میں دے دی

بمبئی۔ لوکل ٹرینوں میں سفر کرنے والے اور عوام کے جوتوں کی پالش کرنے والے لڑکوں نے ہندوستان کے قحط زدہ علاقوں میں بھوک اور فاقوں کا شکار ہونے والے اپنے بھائیوں کو نہیں بھلایا۔ اور ان پالش کرنے والے لڑکوں نے مورخہ ۱۳ اور ۱۴ مئی کی پوری آمدنی بہار ریلیف فنڈ میں دے دی

اردو ہائی اسکول آکوٹ کی سالانہ ادبی نشست

مورخہ ۲ مئی ۶۷ء کو اردو ہائی اسکول آکوٹ کی لڑکیوں نے بزم ادب کے زیر اہتمام ایک جلسہ "زنانہ یوم سرپرست" منعقد کیا۔ جلسے کی صدارت محترمہ ڈاکٹر رضیہ بیگم اور مسز ڈاکٹر مزمل علی نے فرمائی اناؤنسنگ رضیہ سلطانہ (دہم) نے کی۔

جلسے کا افتتاح ممتاز بانو کی تلاوت کلام پاک سے ہوا اس کے بعد رخسانہ بیگم نے نعت پڑھی شاکرہ بانو، شہزادی (ایم اے)، بلقیس بانو (دہم)

بانو خاتون (ہشتم) ... فاطمہ پروین (پنجم) نے تقریریں کیں۔
اس کے بعد ان طالبات کو انعام تقسیم کیے گئے۔

سالانہ امتحان میں امتیازی نمبروں سے کامیابی حاصل کرنے والی بچیوں کے نام یہ ہیں :-

۱۔ معراج النساء (پنجم) (۲) شمس ناہید (ششم الف)
۳۔ رخسانہ بیگم (ہفتم) ۴۔ شہناز النساء (ہشتم)
۵۔ شاکرہ بانو (نہم الف)

اس کے بعد ارشاد بیگم صاحبہ نے تجویز پیش کی کہ "زنانہ یوم سرپرست" ہر سال منایا جائے تاکہ شہر کی عورتوں سے تال میل پیدا ہو اور ان عورتوں میں پڑھنے لکھنے کا شوق پیدا ہو۔"

بانو (ہشتم) نے ایک تجویز پیش کی کہ ہائی اسکول میں جس طرح باغبانی کی تعلیم دی جاتی ہے اسی طرح لڑکیوں کے لیے مشین کی سلائی کا انتظام کیا جائے۔

اس کے بعد صدر جلسہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور جلسہ برخاست ہوا۔

انقلاب قلم کار سوسائٹی کا جشنِ مہاراشٹر کے موقع پر جلسہ تقسیمِ انعامات

روزنامہ "انقلاب" انجمن انقلاب قلم کار سوسائٹی کے ادبی مقابلے کے انعامات تقسیم کرنے کے لیے جشن مہاراشٹر کے موقع پر ۲ مئی ۶۷ کو بابو صدیق پالی ٹیکنک میں جلسہ منعقد ہوا۔ صدارت ڈاکٹر رفیق زکریا نے فرمائی۔ الحاج زکریا آگاڑی صاحب شکیل بدایونی صاحب، جیلانی صاحب اور ابراہیم فطرت صاحب مہمانانِ خصوصی کی حیثیت سے تشریف لائے۔

سکریٹری صاحب نے مندرجہ ذیل انعامات کا اعلان کیا۔

غزل :- شکیل بدایونی میڈل — عصمت بدنام کو ملا۔
حسرت جے پوری میڈل — عبدالحمید شاکر کو ملا۔
دکھی جالنوی میڈل — بشیر احمد کو ملا۔
نظم :- ساحر لدھیانوی میڈل — سلام بن رزاق کو ملا۔
سیدہ اختر میڈل — صابرہ صابر کو ملا۔
سردار جعفری میڈل — سراج مہدی کو ملا۔
افسانہ :- کرشن چندر میڈل — احمد عظیم گھوکھاری کو ملا۔
عصمت چغتائی میڈل — نادرہ انصاری کو ملا۔
جگدیش میڈل — محمد امین دھیان کو ملا۔
مضمون :- عبدالحمید انصاری میڈل۔ محمد امین محمد یعقوب کو ملا۔
عطر سنگاں میڈل — زہرہ قریشی کو ملا۔
میاں احمد لطیف میڈل — ریشماں شاہین کو ملا۔

انعامات کی تقسیم ہونے کے بعد صدر جلسہ ڈاکٹر رفیق زکریا نے تقریر کی اور پھر انقلاب قلم کار سوسائٹی کے سکریٹری انور اشفاق صاحب نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

صحافی

اِدھر اُدھر سے

انگلستان کا نیا ہیرو

۲۹ مئی انگلستان کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ اس دن اس ملک میں ایک نیے ہیرو، نیے قومی ہیرو نمودار ہوئے ہیں۔ یہ بزرگ سر فرانسس پی چسٹر ہیں۔ انھوں نے ترپین فٹ کی چھوٹی سی کشتی میں تن تنہا دنیا کے گرد ۲۸۵۰۰ میل کا چکر لگایا ہے اور انگلستان کی تاریخی بندرگاہ پلائی متھ پر آ کر دم لیا ہے۔

اس خوب صورت بندرگاہ پر لگ بھگ ڈھائی لاکھ مردوں اور عورتوں نے ان کا استقبال کیا۔ بندرگاہ پر آنے سے پہلے سینکڑوں کشتیاں ان کی کشتی کے پیچھے پیچھے فاتحانہ انداز سے چل رہی تھیں۔ کشتیوں کا ایک شاندار جلوس بن گیا تھا۔

انگلستان کے شاہی توپ خانے نے بیس توپوں کی سلامی دی۔ شہر کے میئر استقبال، خیر مقدم یا سواگت کے لیے بندرگاہ پر تشریف رکھتے تھے۔ سمندر کے کنارے ڈھائی لاکھ کا مجمع ایسا لگتا تھا جیسے جوش اور مسرت میں بے قابو ہو گیا تھا۔ گا رہا تھا، ناچ رہا تھا۔ بندرگاہ والوں نے ایک پرانے رواج کو نئی زندگی بخشی تھی۔ اس بندرگاہ پر آنے والے جہازوں کی رہنمائی کے لیے آگ جلا کر روشنی کی جاتی تھی۔ اب کے دو راتوں سے پہاڑی پر آگ جلائی جا رہی تھی۔

ایک بات سن کر آپ کو تعجب ہوگا ـــــ یہ فرانسس جی چسٹر صاحب ۶۵ برس کے ہیں۔ آزاد ملک کے بوڑھوں میں بھی جوانوں کا سا دم خم ہوتا ہے۔

ننھا آرٹسٹ

رضا حسین زیدی

ہال بچوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، ہر عمر اور ہر سائز کے بچے ہال میں جمع تھے۔ آج "شنکرس ویکلی آرٹ ۱۹۶۷ء" کے انعامات مہارانی بیکانیر تقسیم کرنے والی

تھیں۔ ہر بچہ اپنا نام پکارے جانے کا منتظر تھا۔ اتنے میں مکیش کمار، اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول اجمیری گیٹ دہلی کا نام پکارا گیا۔ انھیں "بیگم قدسیہ زیدی میموریل" انعام دیا جانے والا تھا (یہ ایک خاص انعام تھا جو ۱۵ ہزار بچوں میں صرف ایک ہی کو مل رہا تھا) ہر نگاہ اسٹیج کی طرف گھوم گئی کہ دیکھیں کون اس انعام کا مستحق ہے، مگر چند منٹ کی خاموشی کے بعد معلوم ہوا کہ مکیش کمار آتے ہی نہیں ہیں۔

بعد میں معلوم ہوا کہ مکیش کمار کو وقت پر اطلاع نہ مل سکی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ ۱۴ نومبر ۱۹۶۵ء کی ایک ایسی ہی شام کو انڈیا گیٹ پر "نہرو بال میلہ" میں مکیش کو پہلا انعام دیا گیا تھا۔ وہاں بھی نام پکارا گیا مرحوم لال بہادر شاستری چند منٹ تک انعام لیے ہوئے منتظر رہے مگر وہاں بھی وقت پر اطلاع نہ ملنے کے سبب مکیش اس پروگرام میں شریک نہ ہو سکے۔

یہ ننھا آرٹسٹ الموڑہ کا رہنے والا ہے۔ بچپن کی تعلیم بمبئی میں ہوئی۔ وہیں ۰ سال کی عمر میں "بھارتیہ للت کلا اکاڈیمی" کی طرف سے ایک تصویر پر پہلا انعام حاصل کیا۔ اس کے بعد دلّی میں اینگلو عربک اسکول کی طرف سے شنکرس ویکلی کے مقابلوں میں ۵ مرتبہ انعام حاصل کیا۔ ایک تصویر "بھکارن" پر خاص انعام حاصل کیا۔ ان تصویروں کی نمائش روس بھی بھیجی گئی، نہرو بال میلہ میں دو مرتبہ انعام حاصل کیا۔ جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول میں ہونے والے مقابلے میں تصویروں کو سراہا گیا۔

ایک نمائش چند مہینوں میں امریکہ میں "کینیڈی آرٹ سنٹر" کی طرف سے ہونے والی ہے۔ اس سلسلے میں پورے ہندوستان سے دو ننھے آرٹسٹوں کو چنا گیا ہے۔ ایک شمال سے دوسرا جنوب سے۔ شمال سے جانتے ہیں کون ہے؟ وہی آپ کا جانا پہچانا آرٹسٹ مکیش کمار۔ اس مقابلے کے لیے انھوں نے دو تصویریں ۸×۸ بنائی ہیں۔ ایک "شادی کا جلوس" اور دوسری "دیہاتی ناچ"۔ امید ہے کہ یہ ننھا آرٹسٹ وہاں بھی انعام حاصل کرے گا اور اپنا، اپنے اسکول کا اور اپنے دیش کا نام دنیا میں اونچا کرے گا۔

خوشی کی بات ہے کہ مکیش کمار کی تصویر امریکہ کی نمائش کے لیے منتخب کر لی گئی ہے

میاں کانگرو غڑاپ سے پانی میں

جون کا مہینہ، غضب کی گرمی، لو کے جھکڑ! دلّی میں ہر کوئی بدحواس ہے۔ دلّی کے چڑیا گھر میں سرد علاقوں کے جانور کچھ تو پہاڑوں پر بھیج دیے گئے ہیں، جو نہیں جا سکتے ان کے لیے خس کی ٹٹیوں کا انتظام ہے۔ ان کے کمروں میں برف کی سلیں رکھ دی گئی ہیں۔

مگر اس گرمی سے تو گرم علاقے کے

جانور بھی پریشان ہیں۔ ذرا ان میاں کانگرو کو دیکھیے بے چارے بہت بے حال ہیں سامنے تالاب ہے سوچ رہے ہیں کہ تیر سکتے ہیں تو بھلا ہم کیوں نہیں تیر سکتے۔ مگر یہ تالاب ان کے لیے تو نہیں بطخوں اور دوسرے آبی جانوروں کے لیے ہے۔ پھر یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کانگرو صاحب کو کسی نے پانی میں تیرتے دیکھا نہ سنا۔ کم سے کم دلّی کے چڑیا گھر میں تو یہ حادثہ اب تک پیش نہیں آیا۔ خیر صاحب کچھ بھی سہی، کانگرو صاحب گرمی سے اس وقت کچھ ایسے بدحواس تھے کہ اپنے جنگلے میں سے نکل تالاب کی طرف چل پڑے اور آؤ دیکھا نہ تاؤ آنکھیں میچ غڑاپ سے پانی میں!

ارے بھئی واہ، یہ تو تیر بھی رہے ہیں۔ ٹھنڈا ٹھنڈا پانی بڑا مزہ آرہا ہے۔ ایسے مگن ہیں کہ آس پاس تیرتی ہوئی بطخوں سے بھی بے خبر ہیں۔

کیا آپ کو معلوم ہے؟

ہمارے دیس میں کھیتی کے لائق کل زمین کا رقبہ ۲۹ کروڑ ایکڑ ہے۔ اتنی زمین میں عام طور پر ۱۲ کروڑ ٹن اناج پیدا ہو سکتا ہے۔ اس وقت سات کروڑ ٹن سے آٹھ کروڑ ٹن تک پیدا ہوتا ہے۔ کھیتی باڑی کا کام ٹھیک ڈھنگ سے ہو تو دیس کے لوگوں کا پیٹ بھر سکتا ہے اور دوسرے ملکوں کو اناج بھیجا جا سکتا ہے۔

دو ارب چالیس کروڑ چوہے!

دیس میں چوہوں کی تعداد دو ارب چالیس کروڑ ہے انسانی آبادی کا پانچ گنا سمجھیے ہر خاندان کا آدھا من اناج چوہے کھا جاتے ہیں گویا ڈھائی کروڑ ٹن اناج برباد کرتے ہیں۔ اگر اس کا آدھا بھی بچایا جا سکے تو دیس کے غلّے کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔

(بھودان تحریک بنارس)

پرنٹر پبلشر سیّد احمد علی نے برقی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا۔

ذاکر نمبر

جون کے پیام تعلیم میں جس خاص نمبر کا اعلان کیا گیا ہے
وہ انشاءاللہ ستمبر کا شمارہ ہوگا اور قاعدے کے مطابق اگست
کے آخری ہفتے میں شایع ہو جائے گا۔ ہماری انتہائی کوشش ہوگی
کہ یہ نمبر صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر ذاکر حسین کے شایانِ شان
ہو۔ مفید معلومات، دلچسپ مضامین، دلکش نظموں اور کہانیوں
کا یہ حسین مجموعہ کئی تصویروں سے بھی مزین ہوگا۔ ضخامت سو
صفحات سے زیادہ اور قیمت ایک روپیہ ہوگی مگر مستقل
خریداروں سے اس کی قیمت علیٰحدہ سے نہیں لی جائے گی ــــ
یہ خاص نمبر اور جنوری ۶۸ء میں نکلنے والا سالنامہ
مفت حاصل کرنا چاہتے ہوں تو آج ہی پانچ روپیہ سالانہ چندہ
بذریعہ منی آرڈر بھیج دیجیے۔ جن خریداروں کی مدت خریداری ختم
ہو گئی ہے وہ بھی اپنے چندے جلد بھیجیں۔ "منیجر"

شیدلا
پروفیسر محمد مجیب کی لکھی ہوئی
بچوں کے لئے ایک بیوقوف
کی سبق آموز کہانی۔
قیمت: ۵۰ پیسے
لال مرغی
لال مرغی اور اس کے ننھے ساتھیوں کی کہانی
اور مکار لومڑی کو چکمہ دینے کے دلچسپ
حالات۔
قیمت: ۵۰ پیسے
چنبیلی
ایک چھوٹی سی خوبصورت
سفید بالوں والی بلی کی
مزیدار کہانی۔
قیمت: ۵۰ پیسے
بچوں کے لئے
مزیدار کہانیاں
نظمیں
اور
ڈرامے
بچوں کا کھلونا
بچوں کے مشہور شاعر شفیع الدین نیر کی
۳۱ اچھی اچھی نظموں کا مجموعہ
قیمت: ۷۵ پیسے
بچوں کے افسر
حامد اللہ افسر کی لکھی ہوئی ہلکی پھلکی
اور دلچسپ نظمیں
قیمت: ۷۵ پیسے
غیر ذمے دار لڑکا
مدھولی صاحب کا لکھا ہوا ایک ڈرامہ
ایک غیر ذمے دار لڑکے کی ذمے داری
کی کہانی
قیمت: ۳۷ پیسے
آؤ ڈراما کریں
ڈرامے کی تکنیک پر بچوں کے لئے
سہل اور سادہ زبان میں پروفیسر محمد مجیب
کی ایک نئی اور انوکھی کتاب
قیمت: ۶۰ پیسے
شمو کی عید
احسن عثمانی کے تین مختلف
اور دلچسپ ڈرامے
قیمت
۵۰ پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

ڈو پھول ——— گڑیا

فوٹو: شاہد علی خاں

شبانہ پروین (دہلی) عمر ۹ ماہ

رضوانہ عثمان (بمبئی) عمر ۴ سال عابد امام (بانکوٹ) عمر ۴ سال

ناصر حسین (بمبئی) عمر ۹ سال

محمد منصور (بمبئی) عمر ۱۳ سال

سلیم بندو (بمبئی) عمر ۵ سال

[illegible]حسین (الہ آباد) عمر ۷ سال

گڈو (مرادآباد) عمر ۲ سال

محمد نعمان (بمبئی) عمر ۱۱ سال

ہم کھیل کود میں بھی کسی سے کم نہیں

انجمن گرلس ہائی اسکول بمبئی (پرائمری سکشن) کے انعام پانے والے بچے

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر و بہار کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم

دہلی

جلد ۴ اگست ۱۹۶۷ء شمارہ ۸

ایڈیٹر: حسین حسان ندوی

آرٹسٹ: گلیڈون میسی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۲۵

بمبئی آفس
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، جے جے ہسپتال، بمبئی ۸

سالانہ چندہ: پانچ روپے

فی پرچہ: پچاس پیسے

سرورق کی تصویر:- اللہ میاں میرے بھائی جان پاس ہوجائیں!

عنیلہ الیاس

فہرست

بچوں سے باتیں

پچھلے پرچے کے قریب قریب تمام مضمون بچوں کو اچھے لگے "گھوڑے کی سواری" کو تو سبھی نے پسند کیا پھر امام بخاری، تیر کمان، ٹھنڈی آگ۔ چاند کا کانگرو، ابا جان شاعر بنے، پنچ تنتر کی کہانیاں، ابن بطوطہ، دلی سے نیویارک [illegible] پڑھتے ہیں۔

دلی سے نیویارک کا سلسلہ غالباً اگلے مہینے ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد ایک اور سفر نامہ پڑھیے گا تازہ بتازہ [illegible] دلچسپ۔

اس پرچے [illegible] اجی بڑا صاحب پھر تشریف لے آئے ہیں۔ اب کے تو یہ آسمانوں کی [illegible] کی تیاری کر [illegible] آتے ہیں۔ پھر پشکن کی شاہ کار نظم پڑھیے "سونے کا مرغا"۔ ظ۔ انصاری صاحب نے اسے اردو نظم میں اپنایا ہے۔ کس خوبی سے اپنایا ہے نظم پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا۔ پھر ملا نصرالدین کے لطیفے پڑھیے، پنچ تنتر پڑھیے اور دوسرے دلچسپ مضمون پڑھیے۔ مضمون بھی لطیفے بھی۔ اور ہمیں بتائیے کہ کیا کیا چیزیں آپ کو اچھی لگیں۔

کچھ دنوں سے چھوٹے پیامیوں کے مضمون بے تحاشہ دفتر میں آرہے ہیں۔ "بچوں کی کوششیں" کے عنوان سے ہم انھیں شایع کر رہے ہیں۔ کچھ دنوں سے ڈیڑھ کی جگہ چار صفحے کر دیے گئے

ہیں خط بھی باریک کر دیا گیا ہے پھر بھی [illegible] سے مضمون بچ جاتے ہیں۔ بچوں کے شکایتی خط آ[illegible] گئے ہیں۔ یہ پیامی ذرا صبر سے کام لیں۔ ان کے مضمون چھپنے کے قابل ہیں تو دیر سویر ضرور چھپیں گے۔

اس سلسلے میں ایک بات کہنا ہے۔ بعض [illegible] خود محنت نہیں کرتے کہانیاں یا [illegible] ادھر ادھر [illegible] نقل کر کے بھیج دیتے ہیں۔ کچھ بچوں کے خط اتنے [illegible] ہوئے ہیں نہ پڑھے نہیں جاتے۔ آئندہ سے آپ [illegible] کیجیے کہ مضمون یا کہانی لکھ کر اپنے استاد کو دکھا[illegible] استاد کی اصلاح کے بعد کاغذ کے ایک طرف [illegible] خوش خط لکھ کر ہمیں بھیجیے۔ اس پر استاد یا سرپرست کی تصدیق ضرور ہو ——— ورنہ ہم شاید شائع [illegible] کر سکیں۔

آپ کے 'ذاکر نمبر' کی تیاری کا سلسلہ جاری ہے۔ مضامین آنے شروع ہو گئے ہیں۔ اور تو اور ظ۔ انصاری صاحب نے اپنا مضمون بھیج دیا ہے۔ اب [illegible] حاجی [illegible] صاحب کی توجہ ابو تاں کی بکر[illegible] کی طرف ہو گئی ہے۔ بڑا دل چسپ مضمون ہے۔

اس کے علاوہ اور بہت سے اچھے اچھے مضمون ہیں۔ اور ان سے ذاکر صاحب قبلہ کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک انوکھی چیز ہوگی۔ بہت انوکھی، بہت قیمتی، بہت دل چسپ۔ آپ چاہیں گے [illegible] ہمیشہ سینے سے لگا [illegible] رکھیں۔

ہم اپنی طرف سے پوری پوری کوشش کر رہے ہیں کہ یہ خاص [illegible] نمبر آپ کو وقت پر ملے۔ لیکن آج کل [illegible] کے حالات میں [illegible] یقینی وعدہ کرنا مشکل ہے۔

ہمارے منیجر صاحب نے تو اس کی قیمت ایک روپیہ رکھی ہے لیکن مستقل خریداروں سے اس کی علاحدہ [illegible] نہیں لی جائے گی۔ اور جو پیامی اس [illegible] نمبر سے اس کے خریدار بنیں گے [illegible] کے ساتھ بھی [illegible] رعایت ہوگی۔ کیا اچھا [illegible] اگر آپ [illegible] قدر داں ساتھیوں کو [illegible] مستقل خریدار [illegible] پر آمادہ کریں۔

جناب کیف احمد صدیقی

لوری

میری امی میٹھے سُر میں گاتی ہیں جب لوری
جانے کہاں سے آجاتی ہیں پریاں گوری گوری

کیا جانے وہ مجھ پر کیسا کر دیتی ہیں جادو
امی یاد آتی ہیں مجھ کو اور نہ اپنے ابّو
اپنے سُنہرے رنگ برنگے پنکھوں کو پھیلا کر
جانے کہاں لے جاتی ہیں وہ مجھ کو چوری چوری
میری امی میٹھے سُر میں گاتی ہیں جب لوری

روز رات کو آجاتی ہیں گرمی ہو یا سردی
کیا جانے کیوں اُن کو مجھ سے ہے اتنی ہمدردی
یوں ہر ایک پری اُڑتی ہے میرے پیچھے پیچھے
جیسے چاند کے پیچھے پیچھے بھاگے کوئی چکوری
میری امی میٹھے سُر میں گاتی ہیں جب لوری

ساری رات دکھاتی ہیں وہ مجھ کو چاند ستارے
لیکن صبح سے پہلے آجاتی ہیں میرے دوارے
اور مجھے پہنچا دیتی ہیں پھر اپنے جھولے میں
میرے ہاتھوں میں پکڑا کر خوابوں کی اک ڈوری
میری امی میٹھے سُر میں گاتی ہیں جب لوری
جانے کہاں سے آجاتی ہیں پریاں گوری گوری

جناب ظ انصاری

ڈائری حاجی بمبا کی

میاں. اِس چٹورپن کا بُرا ہو جہاں شام کی شفق پھولی. زردے کی کھُرچن کی یاد نے ستایا اور جب بھی پورن ماشی کا چاند دیکھا، فیرنی کا پیالہ یاد آیا — بڈھے ہو گئے. پر لڑکپن کے چونچلے نہ گئے.

تم جانو. گرمی کی شام وطن سے دور اجنبی لوگ. شام کی شفق اور رات کی چاندنی دیکھی تو کلیجہ کھُرچ گیا. ہم نے دِل سے پوچھا — کہو، برخوردار — کیا کہتے ہو؟ چھوڑ دیں امریکہ کی سَرگشت اور چلیں اپنے پھپھوند پور — ؟ ہائے کیا زردہ بنتا ہے اور اس پر بالائی. کیا مزے کی فیرنی ہوتی ہے اور اس پر پستے کی ہوائی!

دل نے سنا تو اسے اُچھو لگ گیا کھنکھار کر بولا: خبردار. حاجی بما جو تم نے بھگوڑے، نکمے

لڑکوں کی سی حرکت کی! ابھی تو ایک چانس ملا ہے چاند کی سیر کر لینے کا۔ آخر آدمی کا بچہ سال دو سال میں چاند پر اُتر پڑے گا۔ لوگ ابھی سے ٹکٹ ریزرو کر رہے ہیں۔ اپنے لیے ایک سیٹ پکی کراؤ، اپنے پوتوں، پڑپوتوں کے لیے کراؤ۔ بہتی گنگا ہے، ہاتھ دھوتے جاؤ بھلے آدمی ہمت آزمانے کا موقع ملے تو گھر کے آرام یاد کر کے بھاگنا نہیں چاہیے۔

ڈیزنی لینڈ کا خرگوش اُڑا چلا جا رہا تھا ہماری خرگوشی داڑھی دیکھ کر ذرا ٹھٹکا ۔۔۔ آنکھیں جھپکاتا رہا ۔۔۔ اور پھر یہ سوچ کر اُڑنچھو ہو گیا کہ اب کی بار کسی بڑے ملک کا خرگوش اِدھر آنکلا ہے۔

مِس گلکلا، اپنی بچاری سکرٹری کو ہم نے ہوٹل میں چھوڑا اور خود نکل کھڑے ہوئے صدر جانسن کا ذاتی پلاوے کا خزانہ کھاتے ہوئے ایک دفتر سے دوسرے دفتر، کہیں وہاں بھجواؤ جہاں سے راکٹ داغے جاتے ہیں، اوپر آسمان کی طرف۔ راکٹ داغنا کیا! آدمی کا بچہ آسمان پر تھیگلی لگاتا ہے اور اُڑا چلا جاتا ہے۔

اب سے کوئی پچاس ساٹھ برس پہلے ہم زوروں میں ٹینس کھیل رہے تھے۔ یک بارگی جوانی کے زور میں جو ہم نے گھما کے ریکٹ کا ہاتھ مارا تو ۔۔۔ گیند کنی کاٹ کر سر سے صاف نکل گئی ۔۔۔ ریکٹ پیچھے سے جوتا، آگے ریکٹ، پیچھے ہمارا جوتا۔ دونوں نیٹ کے پار پہنچ گئے اور مخالف منہ پھاڑ کر ہماری قلابازی دیکھتا رہ گیا۔ تماشائیوں نے تالی پیٹ دی۔

آج کل تالی پٹتا ہے ریڈیو۔ قلابازی کھاتا ہے خلا باز۔ (جس کا وزن ہے جان باز) زمین گیند کی طرح پیروں کے نیچے سے نکل جاتی ہے ۔۔۔ [illegible] ہے راکٹ اس کے پیچھے جوتی کی شکل کا خلائی جہاز ۔۔۔ نیٹ لگا ہے اس نیلی چھت کا۔ خلا باز جوتی سمیت اس نیلے رنگ کے پار پہنچ جاتا ہے اور وہاں انڈے پھوٹنے کی طرح بے وزنی کی حالت میں ایسے ڈولتا پھرتا ہے جیسے گرمیوں کی شام کو جامع مسجد کے باہر والے علاقے میں لوگ بے بسی سے اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کہاں ٹکیں، کیسے ٹکیں؟ تم جانو۔ نیلی [illegible] اُس پار مولوی سمیع اللہ کی دکان تک نہیں ہے۔

قانون قدرت کا یہ ہے میرے بھائی

کہ ہر ایکشن (ACTION) کا ری ایکشن (REACTION) لازم ہے۔ گیند دیوار پر مارو، وہ الٹ کر تمھاری طرف آئے گی۔ کسی کے سر پر مارو، وہ تمھارے سر پر اینٹ مار دے گا۔ تیتے پکڑ کر ماچس کی ڈبیا میں بند کرو، وہ چھوٹتے ہی تمھاری ناک پر کاٹ کر اسے پکوڑی بنا دیں گے۔ تم اپنے سے کمزور کو دھکا دے کر گرادو، کوئی زبردست تمھیں دھکا دے کر دن میں تارے دکھادے گا۔

خیر جی، وہاں، خاص اس جگہ پہنچ کر ہم نے دیکھا کہ ایکشن کا ری ایکشن ہو رہا ہے ———

یعنی! اتنی آسانی سے تھوڑی آپ بیتی لکھ دیں گے ہم!

ایٹمی اسٹیشن پر

صدر لنڈن جانسن صاحب کی خاص اجازت سے ہم کو بند گاڑی میں کہیں بہت دور لے گئے۔ گاڑی کے شیشے کالے نیلے سے تھے۔ کچھ پتہ نہ چلا کدھر سے کدھر کو جا رہے ہیں۔ ایک عالی شان ہال میں پہنچے جہاں طرح طرح کے نقشے ٹنگے ہوئے تھے۔ آڑی ترچھی لکیریں۔ لوہے اور سیمنٹ کی گول دیوارے چاروں طرف بڑی بڑی زبردست دیوارو ا کے برابر سے گزرتے ہوئے۔ ایک کے بعا ایک آہنی دروازے پر اپنا کارڈ دکھاتے ہوئے ہم اور ہمارا امریکی رہنما، آخر ایک ٹھنڈے کمرے میں پہنچ گئے۔ کیا صاف شفاف فرش تھا کہ آئینے کی طرح اس میں منھ دیکھ لو۔ کیا صاف ستھرے تیز اور چست لوگ تھے کہ معلوم ہوتا تھا ان کے کپڑوں کے اندر اسپرنگ لگے ہیں۔ گھڑی جب صبح کے آٹھ بجاتی ہوگی تو ایک سے آٹھ بجتے بجتے میں یہ لوگ بستر سے اتر، تیار ہو کر اپنے اپنے جوتوں میں داخل ہو جاتے ہوں گے۔ کیا مجال جو کوئی آدمی خواہ مخواہ کسی سے منٹ بھر کو فضول بات کرے۔

موقع دیکھتے ہی ہم بھانپ گئے کہ گول دیوار کے اندر ایٹمی ری ایکٹر (ATOMIC REACTOR) لگا ہوا ہے۔ الیوٹوپ بنائے جاتے ہیں جہاں ذرے کو توڑتے ہیں تو اس میں سے سورج کی سی گرمی نکلتی ہے۔ ایسی گرمی کہ آدمی تو آدمی، لوہے کو پگھلا کر موم کر دے۔ ہمارے عزیز دوست علامہ اقبال کہہ گئے ہیں:

لو خورشید کا ٹکڑا اگر ذرے کا دل چیریں

شیشے میں سے عمارت کے باہر جو میدان
نظر آرہا تھا اس میں قطب مینار سے بھی اونچا
(قطب مینار تو صرف ۲۴۲ فٹ اونچا رہ گیا ہے)
لوہے کا مینار کھڑا تھا۔

گردن کو داہنے بائیں گھما کر ہم نے اندازہ
نکال لیا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں ذرے کے ایکشن،
ری ایکشن پر کام ہو رہا ہے۔ یہیں بڑے بڑے
سائنس داں رات دن اپنا پسینہ ٹپکاتے ہیں
اور راکٹ کو زمین کی کھینچ سے باہر اڑانے والا
ایندھن تیار کر رہے ہیں۔

گھنٹی بجی ٹن ——

اس میں سے نکلے چودھری مدن

کنونس کا موٹا، سفید، چمکتا ہوا گون ہاتھوں
میں دستانے، آنکھوں پر موٹا چشمہ اور یہ لمبی سفید
داڑھی۔ ہماری داڑھی شرم کے مارے کوٹ کے
کالر میں چھپ گئی۔

نکلتے ہی پوچھا —— آپ کا کارڈ؟

ہم نے کارڈ دکھایا۔ بولے۔ آپ کو خاص
پرمٹ کے ذریعے صرف ایک بار چاند کی طرف
راکٹ کی اڑان دیکھنے کی اجازت دی گئی ہے۔
لیکن جہاں سے راکٹ اور خلائی جہاز داغے جاتے
ہیں وہاں پہنچانے سے پہلے ایک انٹرویو بورڈ
کے سامنے جانا ہوگا۔

امریکی لوگ ایسے جلدی میں حلق سے انگریزی
بولتے ہیں کہ آدھی کان کے اندر جاتی ہے آدھی
کان کے باہر۔ اس نے کہا "انٹرویو بورڈ" ہم سمجھے
کی بورڈ" —— جیسے سائن بورڈ۔ بلیک بورڈ، –

"ہم ہر ایک بورڈ کا سامنا کرنے کو تیار ہیں
البتہ انگریزی ہماری کمزور ہے چودھری صاحب"۔
ہم نے خالص پھپھوند پوری لہجے میں زناٹے دار
انگریزی بولی۔

کاغذ پر دستخط کیے۔ ہاتھ ملایا اور چلے
ہم چودھری مدن سی داڑھی والے کے پیچھے۔

ایک کمرے میں یہ بڑی سی کمان جیسی میز
رکھی تھی۔ میز کے ایک سرے پر ترجمان دوسرے
پر سکرٹری۔ بیچ میں دو صاحبان عالی شان
جنھیں تم چاہو تو انٹرویو بورڈ کہہ لو۔

ہم اپنی جوانی میں بہت سے بورڈوں
کے سامنے گئے ہیں۔ بورڈ کے ممبر جب امیدوار
کو داخل ہوتے ہی ایک ساتھ گھورتے ہیں تو ایسے ویسے
کی سٹی گم ہو جاتی ہے، ماتھے کا پسینہ پلکوں پر

نکلتا ہے اور چشمے کے شیشے دھندلے پڑ جاتے ہیں۔ ہاتھ کبھی جیب میں جاتے، کبھی کن پٹی کھجاتے ہیں۔ لوگوں کے تانت کھنچنے لگتے ہیں۔ انٹرویو بورڈ کے سامنے جانے سے پہلے دل مضبوط اور ناک صاف کر لینی چاہیے۔

"آپ کا نام؟"

"حاجی بابا" ہم نے گلا صاف کر کے آواز میں کرارا پن پیدا کر کے کہا۔

"جناب کی عمر؟"

"دنیا ہم کو اسی برس سے اوپر کا سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں عمر اس سے آدھی سمجھیے۔"

بورڈ کے صدر صاحب نے چشمے کے اوپر سے جھانک کر ہمیں حقیقت میں دیکھا۔ "آپ کیمسٹری کے جدید علم سے واقف ہوں گے۔"

"جی ہاں ــــ ہمارے بزرگ بھی واقف رہے ہوں گے ــــ کیمسٹری تو ہمیں وراثت میں ملی۔"

"وراثت میں، کیا مطلب؟"

"جی مطلب یہ کہ بزرگ بھی سونا چاندی بنایا کرتے تھے۔ کسی پہنچے ہوئے فقیر نے انہیں پارس پتھری دے رکھی تھی ــــ تانبے پر رگڑی سونا بنالیا۔ رانگ پر گھسی وہ چاندی کا ڈھیلا بن گئی ــــ گاؤں سے گھی اور اناج آتا تھا۔ دن بھر حقہ گڑگڑاتے اور پان کھاتے تھے۔ شام کو طلسم ہوش رُبا پڑھتے اور دل [illegible] تے تھے۔۔"

جناب صدر نے ترجمان کے کان میں کچھ کھُسر پُسر کی، جواباً اس نے بھی وہی حرکت کی۔ ــــ کھُسر پُسر۔

"مسٹر حاجی، ہم آپ سے پیری فقیری کی باتیں نہیں پوچھتے، یہ بتائیے کہ آپ کیمسٹری اور فزکس کے علم سے واقف ہیں نا؟ بغیر اس علم کے آپ کی سمجھ میں نہیں آئے گا کہ یہ کیا ہو رہا ہے، کیوں ہو رہا ہے، دیکھیے۔۔۔۔۔"

ہم بات کلٹ کر بولے "صاحب کیمسٹری کو تو ہماری زبان میں علم الکیمیا کہتے ہیں اور فزکس کو طبیعیات۔ سو آپ غور سے سن لیں۔ طبیعت ہماری بہت اچھی ہے۔ ادھر سے آپ خاطر جمع رکھیں۔ اب رہا علم الکیمیا جاننے کا سوال ــــ تو کیمیا گری میں ہمارا ہاتھ بہت صاف ہو چکا ہے۔ رانگ کی چاندی بنانے پر تجربہ کرتے کرتے یہاں پہنچے ہیں اور عجب نہیں آپ کے ملک کے فائدے کے لیے یہ نسخہ بتا جائیں۔ دیکھیے!

نسخہ چاندی بنانے کا:

نیم ہوتا ہے نا، نیم ۔۔۔ ایسا کڑوا سیاہی
مائل نیم ہونا چاہیے کہ گھڑ سوار اگر اس کے پیڑ کے
نیچے ٹھیر جائے تو گھوڑا دانے سے منہ پھیر لے۔
اس نیم کے عرق کو خوب اونٹا کر گاڑھا کر لیا
جائے اور رانگ کی ٹکیہ پر تین تہ لیپ کر کے
اوپر سے خمیری آٹا لپیٹ دیا جائے۔ آٹے کے
یہ پیڑے دو من اُپلوں میں بیچوں بیچ دبا کر رات بھر
جلائے جائیں۔ آنچ کی کسر نہ رہے۔ صبح کو نکال
کر پرانے قبرستان کی کسی پرانی قبر میں داب دیے
جائیں ۔۔۔ ۷، ۸ دن بعد چاندنی رات کے بیچوں
بیچ جب اس ٹکیہ کو نکالا جائے گا تو چاندی ہو
چکی ہوگی۔ آزمائش شرط ہے جناب!"

بورڈ کے وہ دونوں ممبر ترجمان سمیت،
منہ میں رومال ٹھونسے اس طرح ہنسی ضبط کیے
جا رہے تھے جیسے ہم حاجی بابا نہیں، گاندھی جی
ہیں جو انگریز بادشاہ کے محل میں سیاسی بات
کرنے آئے اور بکری ساتھ لگا لائے۔

تمیزدار پڑھے لکھے لوگ اور یوں غیر آدمی
کے سامنے کھی کھی کریں، توبہ ہے میرے پروردگار!
دل جو مضبوط کر رکھا تھا، ڈوب گیا شرم سے
کیسا امریکہ ہے بھئی۔ ایسی حرکتیں بے تکلفی سے
کر جاتے ہیں جنھیں ہم اپنے ہاں بدتہذیبی کہتے
ہیں۔ اور ہمارے ملک میں بھی بعض چھچھورے
آدمی ان کی نقل کر کے خوش ہو لیتے ہیں۔

ہنسی سے منہ پونچھ کر وہ صاحب صدر
آف انٹرویو بورڈ بولے:

"دیکھیے، آپ ایٹمی اسٹیشن پر سائنس دانوں
سے گفتگو کر رہے ہیں۔ ہم لوگوں کے پاس مذاق
وذاق کے لیے وقت نہیں ہوتا۔
فزیکس اور کیمسٹری کا اچھا علم حاصل کیے
بغیر آپ کا یہ دورہ محض ہمارے وقت کے ساتھ
ایک مذاق ثابت ہوگا اور یہ علم ایسے ہیں کہ بچپن
سے حاصل کیے جائیں اور عمر بھر آدمی سیکھتا رہے
کیوں کہ روز بروز ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ان کے
علاوہ علم الحساب ہے۔ ان تین ٹانگوں پر آج کی
دنیا ترقی کی اگلی منزل پر پہنچنا چاہتی ہے۔۔۔"

"مگر جناب والا میرے صرف دو ٹانگیں
ہیں اور میں راکٹ کی تیسری ٹانگ لگا کر چاند
پر پہنچنا چاہتا ہوں۔"

"ضرور ۔۔۔ بڑے شوق سے

پہنچیے ۔ لیکن آپ کو چاند پر پہنچنے کے لیے، پہلے خلائی اسٹیشن پر اترنا پڑے گا ۔ خلائی اسٹیشن سمجھتے ہیں آپ ؟"

——— یہ اور طرح کی چیز ہے جو شخص ہوائی سنٹری فوگا میں بیٹھ کر الٹ پلٹ نہیں سکتا، وہ خلا کی طرف پرواز کے قابل نہیں۔"

"ہم سب طرح کے اسٹیشن سمجھتے ہیں۔ ہمارے پھپھوند پور میں بھی اسٹیشن بننے والا ہے ——— اور بمبئی میں تو بہت ....."
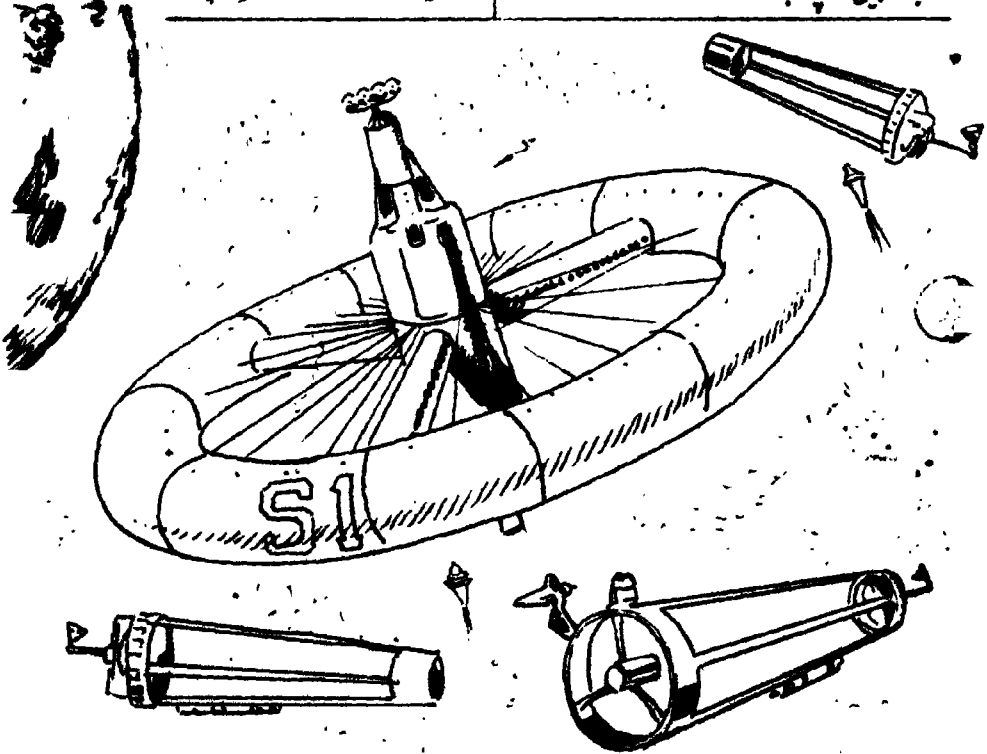
"آہا، تو یوں کہیے نا ——— خلا میں پرواز ——— جناب، ایک سے ایک ناقابل شاعر ہماری زبان کا، آئے دن غزل کہتا ہے اور خلا میں پرواز کرتا ہے ۔ بغیر کسی نازک خیال، کسی گہری بات،

"وہ نہیں" ———

خلا کے مسافر

سی ٹھوس تجربے کے ہمارے لوگ خلا میں وہ وہ
راکٹ اڑاتے ہیں کہ اللہ دے اور بندہ لے!
خلا میں پرواز سے مطلب آپ کا یہی ہے نا کہ خالی
خولی خوشنما لفظ اڑائے جاؤ۔ لفظوں کے طوطا
مینا بنائے، پھر سے اڑا دیے۔ گلا اچھا ہے
یا ٹھونسا تان کر گرج کر شاعری کی توپ داغنی
آتی ہے تو کیا کہنا۔ ادھر خلا میں پہلا مصرعہ اڑایا
اور ادھر دوسرا مصرعہ ہوتے ہوتے چھت اڑ گئی۔
—— آگے آگے مصرعہ —— پیچھے پیچھے واہ وا،
دونوں خلا میں اڑے چلے جا رہے ہیں۔

"جناب ہمارے یہاں خلا کے مسافر گلی
کوچوں میں بکھرے پڑے ہیں، جو لوگ روزنامے
اور ہفتہ وار تک نہیں پڑھتے، درجہ چار تک نہیں
پڑھتے وہ بھی شاعری کے پروں سے خلا میں پرواز
کرنا جانتے ہیں —— کیا سمجھتے ہیں آپ ہم کو یعنی؟"

صاحب صدر کچھ سمجھے، کچھ نہ سمجھے، کندھے
اوپر چڑھا کر، دونوں ہتھیلیاں بے بسی سے
آگے کر کے بولے:

"کیا عرض کروں۔ میں ایک سائنس داں ہوں
مزاج داں نہیں ہوں لیڈروں کا۔ آپ ہمارے
ملک کے پریسیڈنٹ کے ذاتی مہمان ہیں۔ کچھ
کہہ نہیں سکتا۔ آپ غالباً کیمسٹری، فزکس اور
میتھمیٹکس سے کچھ خاص دلچسپی نہیں رکھتے۔ نہ
آپ کو اسٹرالومی سے کوئی......"

گڑبڑاہٹ میں ہم جلدی سے بولے:

"نہیں صاحب، ہمارا دل نہ توڑیے۔ بہت
دور سے آئے ہیں۔ اسٹرالومی بھی ستاروں کا علم
ہے، اور اسٹرالوجی بھی۔ اسٹرالومی (فلکیات)
جاننے کے لیے سائنس کا گہرا علم ضروری ہے ——
اور اسٹرالوجی کے لیے خستہ کاغذ پر لکیریں کھینچ کر
الگ الگ خانوں میں ستارے بٹھانا اور ایک کو
دوسرے سے کاٹنا اور تقدیر کا حال بتانا۔ اسے
ہمارے ملک میں علم نجوم یا جیوتش کہتے ہیں ——
بعضے بعضے لائق وزیر ہمارے ہاں ایسے ہوئے
ہیں کہ اسٹرالومی والے سائنس دانوں سے بدکتے
تھے اور جیوتشیوں کا دربار لگائے رہتے تھے۔
ایک دفعہ جیوتش فیل ہوئی تو منسٹری الٹ گئی۔
آٹھ ستارے ایک بار ایک ہی گھر میں
سمٹے چلے آ رہے تھے کہ پنڈت ودوان لوگوں
نے گھی کے کڑھاؤ چڑھوا دیے، یگیہ اور ہون
کرا دیے۔ حلوہ پوری کھا کر ایسے زرد رکی پتیا کی
کہ ستاروں کی ایسی تیسی ہو گئی —— سنسار پر آنے
والی بپتا ٹل گئی —— دنیا بچ گئی۔

باقی ص ۴۵ پر

جناب زین العابدین راہی

ماں سے

یہ حقیقت ہے کہ اے ماں مجھ سے
تم بہت پیار کیا کرتی ہو

میری تسکین و خوشی کی خاطر
میرا ہر ناز سہا کرتی ہو

شاد و آباد زمانے میں رہوں
تم ہمیشہ یہ دُعا کرتی ہو

جب مچلتا ہوں کسی بات پہ میں
مجھ کو بہلا بھی لیا کرتی ہو

جب میں اسکول چلا جاتا ہوں
تم مری راہ تکا کرتی ہو

کس قدر تم کو خوشی ہوتی ہے
جب مجھے دیکھ لیا کرتی ہو

جب میں بیمار کبھی ہوتا ہوں
رات دن پاس رہا کرتی ہو

جب غلط کام کبھی کرتا ہوں
تم مجھے ڈانٹ دیا کرتی ہو

"بیٹا، پڑھ لکھ کے بڑا آدمی بن"
مجھ سے اکثر یہ کہا کرتی ہو

ماں تم ہی ہو کہ زمانے میں مجھے
سب سے اچھی بھی لگا کرتی ہو

محترمہ فرزانہ انصاری

جھینگر

جھینگر کو ہم آپ سب اچھی طرح جانتے ہیں۔
جب بہت دن کا رکھا ہوا سامان یا کتابیں صاف کی جاتی ہیں تو دو چار جھینگر وہاں ضرور موجود ہوتے ہیں اور کسی کونے کھدرے کی طرف بھاگ نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جھینگر کا رنگ عام طور پر سفید یا کالا ہوتا ہے۔
جسم کے تین حصے ہیں (۱) سر (۲) سینہ (۳) پیٹ۔
سر کا رنگ جسم کے مقابلے میں کسی قدر گہرا ہوتا ہے۔

سر پر دو لانبی موچھیں ہوتی ہیں۔ ان کی لمبائی خود جھینگر کے جسم سے زیادہ ہوتی ہے۔ جھینگر کے تمام جسم میں موچھیں ہی سب سے زیادہ کام کرتی ہیں۔ ان کی مدد سے جھینگر اپنا راستہ تلاش کرتا ہے، غذا تلاش کرتا ہے اور انھی سے سننے کا کام بھی لیتا ہے۔

ہمیں آپ کو خدا نے دو آنکھیں دی ہیں مگر جھینگر کے سر پر پانچ آنکھیں ہوتی ہیں۔ تین آنکھیں سادہ ہوتی ہیں اور دو مرکب۔ ان کی مدد سے جھینگر چاروں طرف یعنی پیٹھ کے پیچھے بھی دیکھ سکتا ہے۔

سر کے بعد کا حصہ سینہ کہلاتا ہے۔ یہ پیٹ سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس سے چھ جوڑ رکھنے والی ٹانگیں جڑی رہتی ہیں، ان کی مدد سے یہ دوڑتا پھرتا ہے اور خطرے کے وقت تیزی سے نکل بھاگتا ہے۔
سینے کے بعد پیٹ کا حصہ ہوتا ہے یہ سر اور سینے سے نسبتاً بڑا ہوتا ہے۔ ہر جھینگر کے دو پر بھی ہوتے ہیں۔

جھینگر کی کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ بعض جھینگر تو ڈھائی انچ تک لانبے ہوتے ہیں اور ان کے پروں کا پھیلاؤ سات انچ ہوتا ہے۔ اور بعض قسمیں بے حد چھوٹی یعنی چاول کے دانے سے بھی چھوٹی ہوتی

ہیں۔ جھینگر کی صرف چند قسمیں گھروں میں اور باقی جنگلوں میں رہتی ہیں۔ اسی لیے اندھیرا پھیل جانے کے بعد جنگل باغ وغیرہ ان کے شور سے گونج اٹھتے ہیں۔ جھینگر یہ آواز اپنے سامنے کے دونوں پیروں کو ایک دوسرے کے ساتھ رگڑ کر پیدا کرتا ہے۔

جھینگر بڑا ہی سخت جان اور طاقت ور ہوتا ہے۔ اگر آپ اس کے اوپر صرف پیر رکھ دیں تو یہ آپ کا وزن برداشت کرے گا مگر شرط یہ ہے کہ آپ اس کو رگڑیں نہیں ورنہ بے چارے کی ہڈی پسلی ایک ہو جائے گی۔ ویسے جھینگر کے جسم میں ہڈیاں نہیں ہوتیں۔ یہ بغیر ہڈی کا جاندار ہے۔

ایک تندرست انسان کا درجۂ حرارت 98.4F ہوتا ہے۔ جھینگر کا کوئی خاص درجۂ حرارت نہیں ہوتا۔ وہ زیادہ گرمی اور زیادہ سردی دونوں برداشت کر لیتا ہے۔ اگر اسے برف میں رکھا جائے تو جم جاتا ہے لیکن جیسے ہی گرمی پہنچتی ہے یہ حرکت کرنا شروع کر دیتا ہے۔ یہ اپنے جسم کو آسانی کے ساتھ موڑ بھی سکتا ہے اور اسی لیے پتلی پتلی درازوں میں آسانی کے ساتھ گھس جاتا ہے۔

جھینگر کو زندہ رہنے کے لیے خاص جگہ، ماحول، حالات اور غذا کی ضرورت نہیں، جیسے دوسرے جانداروں کو ہوتی ہے۔ مثلاً ہاتھی صرف ہندوستان اور افریقہ میں ہوتا ہے، دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتا۔ یا پھر اونٹ صرف ریگستان میں ہوتا ہے، میدانی علاقوں میں بہت نہیں ہوتا۔ لیکن جھینگر ریگستان ہو یا میدان، شہر ہو یا گاؤں ہر جگہ موجود رہتا ہے۔

جھینگر کھانے پینے کے سلسلے میں کسی خاص غذا کا پابند نہیں۔ یہ جو مل جائے کھا لیتا ہے اور خدا کا شکر ادا کرتا ہے۔ پودوں کی کلیاں کھا لیتا ہے، گوندا اور پیرافن (ایک قسم کا موم) بھی نہیں چھوڑتا۔ پینٹ، اون اور کپڑے چاٹ جاتا ہے۔ اس سے صابن بھی نہیں بچتا۔ تیل اور گھی پی جاتا ہے۔ حد یہ ہے کہ اپنی چھوڑی ہوئی جلد بھی کھا جاتا ہے۔

جب اسے کھانے پینے کے لیے کچھ بھی نہیں ملتا تو یہ گیدڑوں کی سی حرکت کرتا ہے۔ گیدڑ اپنے مردہ ساتھی کو کھا جاتے ہیں جھینگر اپنے انڈے کھا جاتا ہے۔ جھینگر کی ایک خاص قسم تو لکڑی بھی ہضم کر جاتی ہے۔ اس کے معدے میں لکڑی کو ہضم کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جھینگر دوسرے جانداروں کے مقابلے میں زیادہ عرصے تک بھوکا پیاسا بغیر کھائے پیے ایک مہینہ تک زندہ رہ سکتا

ہے۔ صرف پانی پر دو مہینے اور صرف سوکھی غذا پر پانچ مہینے زندہ رہ سکتا ہے۔ کمال یہ ہے کہ نہ تو یہ دبلا ہوتا ہے، نہ کمزور ہوتا ہے اور نہ اس پر کوئی دوسرا اثر ہوتا ہے۔

جھینگر کے جسم سے ہر وقت ایک ناگوار گندی بو آتی رہتی ہے۔ یہ ناگوار گندی بو چند غدودوں کی وجہ سے ہوتی ہے جو اس کے جسم میں پائے جاتے ہیں۔ اس بدبو کی وجہ سے اکثر جانور اسے کھانا پسند نہیں کرتے۔ جھینگر اس طرح دشمنوں سے اپنا بچاؤ کرتا ہے۔ جھینگر عام طور پر گندی جگہوں پر رہتا ہے لیکن ہمیشہ صاف ستھرا رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ اپنی ٹانگیں اور مونچھیں دھوتا اور صاف کرتا رہتا ہے۔

جھینگروں کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھتی ہے۔ ایک مادہ جھینگر دس ماہ میں یعنی 303 دن میں ۱۸۰ بچے پیدا کرتی ہے۔ یہ ایک مہینے کے اندر بڑے ہو کر خود بھی اپنے بچے پیدا کرنے لگتے ہیں۔

مادہ جھینگر اپنے انڈوں کو ایک تھیلی میں اپنے ساتھ لیے پھرتی ہے۔ انڈوں کی یہ تھیلی اس کے پیٹ کے نچلے حصے کے ساتھ جڑی رہتی ہے۔ جب انڈوں سے بچے نکلنے کے قریب ہوتے ہیں تو انڈوں کی تھیلی کو ایسی جگہ رکھ کر کوڑے سے ڈھانک دیتی ہے جہاں نکلنے والے بچوں کو آسانی سے غذا مل سکے۔ اگر ان بچوں کو غذا نہ ملے تو یہ مر جاتے ہیں۔

انڈوں سے نکلنے والے بچے دوسرے کیڑوں کے بچوں کی طرح ماں باپ سے مختلف شکل وصورت کے نہیں ہوتے۔ یہ بالکل جھینگر جیسے ہوتے ہیں۔ صرف جسامت میں چھوٹے ہوتے ہیں۔

جھینگر جب انڈے سے نکلتا ہے تو اس کی جلد بڑی نرم و نازک ہوتی ہے۔ یہ آہستہ آہستہ سخت ہو جاتی ہے اور اس میں لچک اور پھیلاؤ کی خاصیت باقی نہیں رہتی۔

جب جھینگر بڑا ہو جاتا ہے تو اس کی جلد اُسے چھوٹی محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہ سانپ کی طرح اپنی جلد چھوڑ دیتا ہے یعنی کینچلی بدل لیتا ہے۔ جلد سر پر سے اوپری حصے میں پھٹ جاتی ہے اور اس میں سے جھینگر اپنی ٹانگیں اور مونچھیں سمیٹ کر باہر نکل آتا ہے۔ اس وقت یہ سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ جب یہ باہر نکلتا ہے تو اس کی جلد نازک اور لچک دار ہوتی ہے لیکن یہ بھی آہستہ آہستہ سخت ہو جاتی ہے اور بھورا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ یہ جلد بھی ناکافی ہونے لگتی ہے تو جھینگر اسے

چھوڑ دیتا ہے۔ اس طرح جھینگر مکمل طور پر بڑا ہونے تک پانچ یا چھ بار جلد تبدیل کرتا ہے۔ جھینگر کے بچے کے پر نہیں ہوتے۔ جب بڑا ہو جاتا ہے تو دو پر نکل آتے ہیں۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے جھینگر نہایت قدیم جانور ہے۔ یہ انسانوں کی پیدائش سے پہلے ہی زمین پر موجود ہے۔

جھینگر عام طور پر گندی جگہوں پر رہتا ہے گندگی پر چلنے پھرنے سے مختلف بیماریوں کے جراثیم اور گندگی اس کے روئیں دار پیروں سے لگ جاتی ہے۔ پھر جب یہ کھانے پینے کی چیزوں تک پہنچتا ہے تو یہ گندگی اور جراثیم ان چیزوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اس طرح جھینگر بھی مکھی کی طرح مختلف بیماریاں پھیلاتا ہے۔

لیکن جھینگر انسانوں کے لیے بے کار اور نقصان دہ بھی نہیں ہے۔ یہ بیماریاں پھیلاتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ بہت ساری گندی چیزیں کھا جاتا ہے اور قدرت کی طرف سے صفائی کا کام انجام دیتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کینسر اور دل کی بیماری جیسی خطرناک بیماریوں کے تحقیقاتی کاموں میں استعمال کیا جاتا ہے۔

جھینگر کے خطرناک بیماریوں کے جراثیم پھیلانے کی وجہ سے انسان چاہتا ہے کہ یہ آبادی میں نہ رہے اور اسی لیے جھینگر کو مارنے کی مختلف دوائیں تیار کی گئی ہیں۔ لیکن خدا نے جھینگر کو ایسی صلاحیت دی ہے کہ جلد ہی اس پر دواؤں کا اثر ختم ہو جاتا ہے اور جھینگر مار دوائیں تھوڑے دنوں میں بے اثر ہو جاتی ہیں۔ جھینگر سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے گھروں کی مکمل صفائی کی جائے اور کھانے پینے کی چیزیں ڈھانک کر حفاظت سے رکھی جائیں۔

بقایہ ص ۲۳

کر ڈالتی ہے۔ کیا مجال جو اس کا نشانہ چوک جائے۔ کبھی کبھی یہ اڑتے ہوئے کیڑوں پر بھی وار کرتی ہے۔

نیویارک کے چڑیا گھر میں اس قسم کی ایک مچھلی موجود ہے۔ یہ تماشائیوں کو اپنے نشانہ کے جوہر دکھاتی ہے۔ لوگ سگرٹ کے جلتے ہوئے ٹکڑے اس سے قریب ہوا میں اچھالتے ہیں اور یہ مچھلی اپنی آبی بندوق سے ہوا ہی میں جلتے ہوئے سگرٹ کے ٹکڑے کو بجھا دیتی

برسات

جناب سیف سہرامی

گرمیوں کے دن گئے موسم سہانا آگیا
آگیا برسات کا رنگیں زمانہ آگیا

کالے کالے بادلوں سے گھر گیا نیلا گگن
ہو گئی پھر سبز دھرتی کھل اٹھا سارا چمن
ہر طرف کھیتوں میں پودے لہلہاتے جائیں گے
ندیوں کے تیز دھارے گیت گاتے جائیں گے
وہ پہاڑوں سے ہمکتے جھومتے جھرنے چلے
ندیوں نالوں کی اجڑی گود کو بھرنے چلے
تم بھی اب تیار ہو اسکول جانے کے لیے
علم کا سرچشمہ بن جاؤ زمانے کے لیے
تم سے بھی سیراب ہو علم و ہنر کی سرزمیں
علم سے حاصل کرو سرمایۂ دنیا و دیں

وقت یہ پڑھنے کا ہے [illegible] دل سے پڑھو
روشنی علم و ہنر کی لے کے تم آگے بڑھو

جناب مشہود مفتی

ہتھیار بند مچھلیاں

آپ سمجھتے ہوں گے کہ ہتھیار صرف آپ ہی کے پاس ہیں۔ آپ ہی بندوق چلا سکتے ہیں، نشانہ لگا سکتے ہیں۔ شکار کھیل سکتے ہیں۔ شاید آپ ہتھیار بند مچھلیوں سے واقف نہیں۔ جی ہاں ان مچھلیوں کے پاس بھی ہتھیار ہوتے ہیں جو ہمارے آپ کے ہتھیاروں سے کہیں زیادہ تیز اور پائدار ہوتے ہیں۔

لوہے کی تلوار میں زنگ لگ سکتا ہے۔ توپ اور بندوق کی بارود بھیگ کر بیکار ہو سکتی ہے۔ آپ کے ہتھیار کا نشانہ چوک سکتا ہے لیکن کیا مجال کہ مچھلی کی تلوار میں زنگ لگ جائے یا اس کا نشانہ کبھی خطا کر جائے۔ ہتھیار بند مچھلیوں میں تلوار مچھلی بہت مشہور ہے۔

اس مچھلی کی تلوار اصل میں اس کے منہ کے اوپری تھوتھنی سے سارس کی چونچ کے مانند نکلا ہوا حصہ ہے، یہ بالکل تلوار سے مشابہ ہوتا ہے۔ یہ تلوار اتنی لانبی اور تیز ہوتی ہے کہ بہ آسانی وہیل جیسے بڑے آبی جانور کے جسم میں گھس جاتی ہے۔

ایک بار ایک جہاز کو وہیل سمجھ کر اس مچھلی نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ جہاز بہت مضبوط قسم کی لکڑی کا بنا تھا اور اس کے نچلے حصہ میں تانبے کی موٹی چادریں چڑھی تھیں۔ لیکن اس مچھلی نے بہت آسانی سے جہاز کے ایک فٹ موٹے پیندے کو چھید کر رکھ دیا۔ اسی طرح ایک دوسری تلوار مچھلی

تلوار مچھلی

نے قریب ڈیڑھ فٹ موٹے جہاز کے پیندے کو چیر
کر جہاز کے اندر رکھے ہوئے ایک تیل کے پیپے
میں چھید کر دیا تھا۔ ایک تیسری مچھلی کی تلوار ناؤ
کے ٹکڑے میں اٹکی اس وقت لندن کے عجائب
گھر میں رکھی ہے۔ پہلے ہی حملہ میں مچھلی نے اپنی تلوار
ٹھوس لکڑی کے اندر ساڑھے تیرہ انچ دھنسا دی
تھی۔ تلوار نے ٹوٹ کر ناؤ کے خطرناک چھید کو بند
کر دیا تھا۔

تلوار مچھلی سے بہت ملتی جلتی آرہ مچھلی ہے
اس کی تھوتھنی دو دھار والے آرے کی طرح لمبی
اور تیز ہوتی ہے۔ یہ مچھلی وہیل جیسے بڑے جانور
پر حملہ کرتی ہے تو اپنی تھوتھنی اس کے جسم میں
پیوست کر کے آرے کی طرح اسے چیر ڈالتی ہے۔
مچھلی تقریباً بیس فٹ لمبی ہوتی ہے۔ چار پانچ
فٹ لمبا تو اس کا آرہ ہوتا ہے۔ اس کے آرے
میں پچیس تیس جوڑے تیز دانتوں کے ہوتے ہیں۔
جس کے بیچ سے کوئی بھی صحیح سلامت نہیں
نکل سکتا۔

بچھو مچھلی

اس مچھلی کی دُم کی جڑ کے قریب ایک
زہریلا ڈنک ہوتا ہے۔ یہ ڈنک ایک د تو

اسے دشمنوں سے محفوظ رکھتا ہے اور عجیب اسی کے سہارے یہ مچھلی اپنا شکار کرتی ہے۔

شکاری مچھلی

یہ بہت بڑے منہ کی مچھلی ہوتی ہے۔ اس کے منہ کے کنارے پر تیز دانتوں کی قطار ہوتی ہے۔ شکار ان میں پھنس کر پھر نہیں نکل سکتا۔ اس کی پشت پر چھ لمبے کانٹے ہوتے ہیں۔ آگے والا کانٹا سر کے اوپر ہوتا ہے۔ یہ سب سے بڑا ہوتا ہے۔ اس کانٹے کے سرے پر لال رنگ کے گوشت کا ایک لوتھڑا سا ہوتا ہے۔ جب یہ شکار کرنا چاہتی ہے تو منہ کھول کر چپ چاپ پانی میں لیٹ جاتی ہے اور گوشت کے اس لوتھڑے کو پانی میں ادھر اُدھر ہلاتی ہے۔ چھوٹی موٹی مچھلیاں اس لوتھڑے کے لالچ میں اس کی طرف بڑھ کر اس مچھلی کی غذا بن جاتی ہیں

اس کے جسم کے نیچے اور پچھلے حصہ میں بھی مہین مہین گوشت کے ریشے گچھوں کی شکل میں لٹکتے رہتے ہیں۔ کوئی مچھلی یا کیکڑا اگر ہڑپ کرنے کے لیے بڑھتا ہے تو وہ خود شکار ہو جاتا ہے۔

تیر انداز مچھلی

یہ بڑی نشانہ باز قسم کی مچھلی ہے۔ پانی کی مار سے شکار کرتی ہے۔ یہ مچھلی اپنی زبان کو تالو سے لگا کر ایک بہت تنگ نلی سی بناتی ہے جو پھونکنے والی نلی سے مشابہ ہوتی ہے۔ اس نلی کے ذریعے یہ اپنے منہ میں لیے ہوئے پانی کو بڑی تیزی سے چھوڑ کر بے خطا نشانہ لگاتی ہے۔ پانی کی یہ پچکاری بندوق کی گولی کی طرح تیز اور مہلک ہوتی ہے۔ اس مچھلی کی نظر بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ پتوں پر بیٹھے کیڑے مکوڑوں کو دیکھ کر یہ چپکے چپکے ان کے قریب پہنچ کر اپنی پانی کی مشین گن سے اپنے شکار کو ہلاک

باقی ص۹ پر

جناب برقی بہاری

ننھے پیامیوں سے

ہر وقت پاس اپنی زباں کا رکھا کرو — وعدہ جو تم کسی سے کرو تو وفا کرو

اُلفت اگر کسی سے رکھو، بے غرض رکھو — گر دوستی کسی سے کرو، بے رِیا کرو

ناداں اگر ہے اس کی ہو صحبت سے احتراز — دانا اگر ہے اس سے محبت رکھا کرو

کیا جانتے ہو تم کہ وہ اچھا ہو تم سے بھی — دیکھو نہ بھول کر کبھی کسی پر ہنسا کرو

مذموم یہ طریق ہے اور شرم کی ہے بات — آپس میں بھائی ہو کے ہمیشہ لڑا کرو

ہمت نہ ہارو اور کیے جاؤ کوششیں — آگے قدم بڑھا کے نہ پیچھے ہٹا کرو

کچھ بھی نہ ہوگا بار تمھیں اور سہل ہے — ہر ایک کام وقت پہ گر کر لیا کرو

سائل کو تم کبھی نہ جھڑک کر جواب دو — جو ہو سکے براہِ خدا دے دیا کرو

ایذا کبھی کسی کو نہ اپنی طرف سے دو — اس بات کا خیال ہمیشہ رکھا کرو

دُنیا میں آخرت میں بھلائی نصیب ہو

ہر وقت اپنے رب سے یہی التجا کرو

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

سنجی وک بیل کے پاس جا کر دمنک گیدڑ نے ادب سے کہا: "اے دوست [illegible] نے تمہیں جان بخشی کا قول دے دیا ہے۔ آپ [illegible] گے۔ مگر ایک بات یاد رکھنا راج [illegible] کا جا کر گھمنڈی نہ بن جانا۔ میری دوستی

کا ساتھ دینا۔ میں بھی تمہارے مشورے سے راج پاٹ کا کام چلاؤں گا۔ ہم دونوں مل کر راج کا مزہ لوٹیں گے۔"

دونوں مل کر پنگل ک شیر کے دربار میں گئے۔ پنگل ک نے اپنا داہنا پنجہ اٹھا کر سنجی وک بیل کا خیر مقدم کیا۔

سنجی وک بیل نے اپنا سارا قصہ کہہ سنایا۔ پنگل ک شیر پوری داستان سن کر بولا "دوست کسی بات سے مت ڈرو۔ اس جنگل میں میرا راج ہے تم میری حفاظت میں ہو۔ اب کوئی تمہارا بال بیکا نہ کر سکے گا۔ مگر اس جنگل میں طرح طرح کے خوف ناک جانور رہتے ہیں اس لیے اچھا یہی ہوگا

کہ تم ہر وقت میرے ہی ساتھ رہو۔"

عقل سب سے بڑا ہتھیار

شیر اور بیل کی دوستی کے بعد کچھ دنوں تک کرکٹ اور دمنک دونوں گیدڑ جنگل کا راج پاٹ چلاتے رہے۔ مگر سنجی وک بیل کی صحبت میں پنگل لک شیر کو بھی جیسے شہری رنگ ڈھنگ کی ہوا لگ گئی۔ پنگل لک سنجی وک بیل کی عزت کرنے لگا اور اسی کے طور طریقے اپنانے لگا۔

دھیرے دھیرے پنگل لک پر سنجی وک بیل کا رنگ اتنا چڑھا کہ اسی کا مرید بن کر رہ گیا۔ جنگل کے دوسرے جانوروں سے بے توجہی برتنے لگا۔ ہر وقت دونوں ایک جگہ بیٹھتے۔ مختلف معاملوں میں آپس میں صلاح مشورے کرتے رہتے۔

ان دونوں گیدڑوں کو ایک بات کی تکلیف اور بھی تھی۔ پنگل لک شیر نے شکار کی طرف توجہ کم کر دی تھی۔ کرکٹ اور دمنک شیر کے چھوڑے ہوئے شکار سے پیٹ کی آگ بجھاتے تھے۔ اب شیر کی جوٹھن کم تھی۔ کئی کئی دن فاقے سے گذر جاتے۔ یہ دیکھ کر دونوں شیر کو بیل کی دوستی سے نجات دلانے کی تدبیریں سوچنے لگے۔

ایک دن دمنک گیدڑ کچھ سوچ کر بولا۔

"بھائی کرکٹ یہ تو بڑا غضب ہوا۔ یہ سارا جال میں نے اسی لیے تو پھیلایا تھا کہ شیر کی نظروں میں اونچا اٹھوں۔ پر بات بالکل الٹی ہو گئی۔ سنجی وک بیل کی دوستی میں وہ ہمیں بھلا بیٹھا۔ ایک ہم کیا جنگل کے سارے باسیوں کو اسی کا رونا ہے۔ اب تو وہ اپنے کام کی طرف سے بھی بے پرواہ رہنے لگا ہے۔"

کرکٹ گیدڑ نے جواب دیا "مگر اس میں قصور کس کا ہے تم ہی نے دونوں کی دوستی کرائی۔ اب تم ہی ان دونوں میں پھوٹ ڈالنے کی کوئی راہ نکالو۔"

دمنک نے کہا۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں جس نے دوستی کرائی وہ پھوٹ بھی ڈلوا سکتا ہے۔"

کرکٹ نے عقل لڑائی "مگر یہ پھوٹ ڈالنے والی بات کھل گئی تو پھر تمھاری خیر نہیں۔" یہ سن کر دمنک بے اختیار ہنس پڑا "مجھے اتنا اناڑی نہ سمجھو۔"

کرکٹ۔ "پر بھائی مجھے تو سنجی وک کی عقل مندی اور سوجھ بوجھ دیکھ کر ڈر ہی لگتا ہے۔"

دمنک نے کرکٹ کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا "میری عقل بھی کچھ کم نہیں ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ جو کام بڑے بڑے ہتھیاروں سے نہیں ہو پاتا۔ عقل اور سمجھ بوجھ کی بدولت

کامیابی کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ تمھیں وہ قصہ یاد نہیں کہ ایک کوّے نے عقل کے زور سے سونے کی ایک مالا کے سہارے ایک سانپ کو مروڈالا۔

کرکٹ نے کان کھڑے کیے "ہائیں! یہ سانپ اور کوّے کی کہانی کیا ہے؟"

دمنک۔ اچھا تو پہلے یہ کہانی سن لو۔

سانپ اور کوّا

ایک برگد کے کھوکھ میں ایک کوا اپنی مادہ کے ساتھ رہتا تھا۔ اسی پیڑ کی جڑ والی کھوکھ میں ایک سانپ نے اپنا ڈیرہ جما رکھا تھا۔ یہ سانپ کوّے کے بچوں کو پر نکلنے سے پہلے ہی ہڑپ کر جاتا تھا۔ جب کبھی انڈوں سے بچے نکلتے یہی صورت پیش آتی۔ نر اور مادہ دونوں بے چارے اداس رہنے لگے۔

ایک دن اتفاق سے ایک گیدڑ ادھر سے گذرا۔ کوا اور اس کی مادہ کو اداس دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا۔ اس اداسی کا سبب پوچھا۔ کوّے نے ساری بپتا سنائی اور اس سے مدد چاہی۔

گیدڑ نے کہا۔ "سانپ کے گھر میں رہنا جان کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ مگر اس کا علاج عقل کر سکتی ہے۔ ہوشیاری سے کام لے کر سانپ مارا جا سکتا ہے۔ جیسے وہ بگلا مارا گیا تھا جس نے بہت سی مچھلیاں کھا کھا کر تالاب کی مچھلیوں کی زندگی اجیرن کر دی تھی۔ مگر ایک کیکڑے کی چال میں آ کر وہ بھی جان گنوا بیٹھا۔"
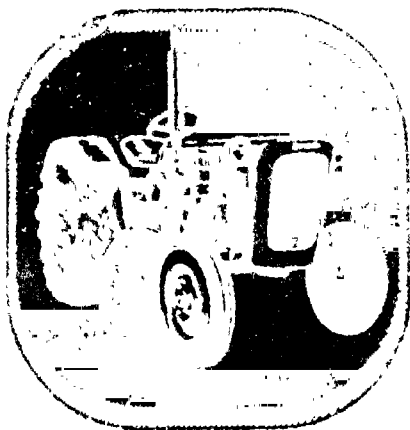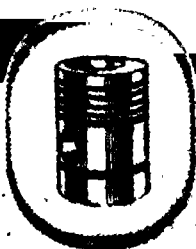
دونوں نے تعجب سے پوچھا "یہ بگلے کی کیا بات سنائی؟"

گیدڑ نے کہا اچھا تو پہلے یہی قصہ سن لو۔

بگلا بھگت

ایک جنگل میں بڑا سا تالاب تھا۔ اس تالاب میں بہت سی مچھلیاں بھی تھیں۔ اور مزے سے زندگی گذارتی تھیں۔ ایک بگلا وہاں روزانہ مچھلیاں کھانے آتا تھا۔ مگر بوڑھا ہو گیا تھا۔ مچھلیاں پکڑ نہیں پاتا تھا۔ اکثر بھوکا ہی رہ جاتا۔

الکساندر پشکن کی کہانی

روسی سے اردو میں ظ انصاری کی زبانی

سونے کا مُرغا

اور
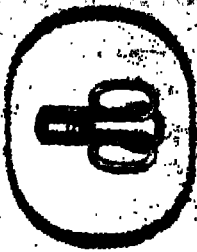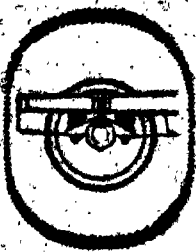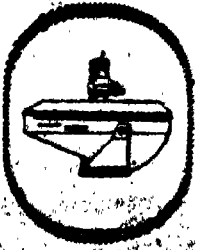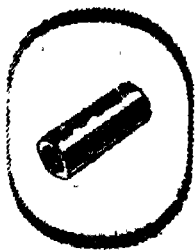
دلبر رانی

سات اقلیم پار، دور کہیں
اس جگہ جس کا اور چھور نہیں
زار دادون نام کا راجا
دھوم سے راج پاٹ کرتا تھا
بن گیا اس کا دبدبہ اک روگ
آ گئے تنگ آس پاس کے لوگ
پھر بڑھاپا بری بلا آیا
خود وہ لشکر کشی سے اکتایا

جی میں آئی کہ کیجے آرام
ہلکے ہو جائیں راج پاٹ کے کام
تھے پڑوسی بھی تاک میں اس کی
وہ جو سہتے تھے دھاک میں اس کی
اب شہ پاتے ہی سر پہ چڑھنے لگے
موقع پایا تو حد سے بڑھنے لگے
سرحدیں دور دور تک پھیلی
ان سبھی سرحدوں کی نگرانی
کب تلک فوج کرتی رہتی تھی

رات بھر جاگے سپہ سالار
پھر بھی پڑتا تھا دشمنوں کا وار
یوں بھی ہوتا کہ اُن کو دشمن سے
ہے تو حملے کا خوف دکھن سے
اور وہ پورب میں آپڑا اُون سے
اُس طرف سے ہٹاؤ تو بدذات
پھر سمندر سے بڑھ کے کرتے گھات
زار دادوں مارے غصّے کے
ایسا لاچار ہو کہ رو رو دے
رات کو چاہے آنکھ لگ جاتی
ایسی ہلچل میں نیند کیا آتی
جب نہ کوئی اُپائے بن آیا
آخر اِک جوتشی کو بُلوایا
اور مانگی مدد کہ "راج گورو
کچھ بتا، ہے بڑا گیانی تو"
اُس گیانی نے، مرد دانا نے
تار باجا تو راگ پہچانے
ساتھ لایا تھا گھر سے اک تھیلا
اُس سے مُرغا نکالا سونے کا
اور بولا — "حضور یہ لیجیے،
تیلیوں پر اسے بٹھا دیجیے!

ہے تو سونے کا جانور لیکن
پہرہ داری کرے گا رات اور دن
جاں نثاری کرے گا رات اور دن
ہو اگر شانتی تو یہ مُرغا
چونچ پر میں دبائے بیٹھے گا
پر کسی سمت سے، جو ہو گڑبڑ
کوئی دشمن اگر کرے تڑپھڑ
میرا مرغا پلک جھپکتے ہی
چونک اُٹھے گا، اُٹھائے گا کلغی
بانگ دے دے کے پھڑپھڑائے گا
اُس طرف جھٹ سے گھوم جائے گا"
سُن کے ترکیب، خوش ہوا راجا
"جوتشی تو نے کی بڑی کرپا
تجھ کو سونے میں لاد دوں تو بھی
لے وچن — اب کہی، سدا کو کہی
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
تیری اک مانگ، حکم میرا ہے"

★

مُرغ بیٹھا جو اونچے اڈّے پر
خوب رکھتا تھا سرحدوں پہ نظر
کھڑکے پتّہ، جو ہو ذرا آہٹ
جیسے اُٹھتا ہے سنتری جھٹ پٹ

مُرغ ہشیار ہو کے بانگ لگائے
فوج کو دشمنوں کی اور جتائے
سر اُٹھا کر پکارے "گکڑوں کوں
چین سے راج کریں پہرہ دوں"
دشمن آخر کو پڑ گئے ٹھنڈے
کون اُٹھاتا لڑائی کے جھنڈے
ہر طرف سے لگائی ایسی چوٹ
پٹ گئی سرکشوں کی اِک اِک گوٹ

★
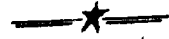
اِک برس گزرا، دوسرا گزرا
چونچ ڈالے کھڑا رہا مرغا
"عیش کی راتیں، امن چین کے دن
چھوٹے ہوتے ہیں —" کہہ گئے پُرشکن
ایک دم ایسی ہاہا کار مچی
اُٹھ گیا ہڑبڑا کے چھتر پتی
سینا نایک پکار کر بولا:
"راجا، مالک ہمارے، اَن داتا
اُٹھ، مصیبت سروں پہ آئی ہے
تیری، پرجا پتی، دُہائی ہے"
زار دادون نے جماہی لی
پوچھا "کیا ہے رے، ایسی کیا بپتی؟"

بولا سیناپتی "غضب سرکار
ہو گیا — مرغ کر رہا ہے پکار
راجدھانی میں غُل غپاڑا ہے
جیسے بستی نہیں ہے، باڑا ہے
جھانک کر کھڑکیوں سے دیکھا تو
کوئی دورہ پڑا تھا مُرغے کو
مارتا پر، کبھی اُٹھاتا مُوں
کر کے پورب کی اور گکڑوں کوں
تب تو راجا نے دیکھا، آؤ، نہ تاؤ
"ہاں، جوانو، سوار ہو جاؤ
دیر کیا ہے، نکال لو گھوڑے
باگ اٹھا دو، سنبھال لو گھوڑے"
اُس کے بیٹوں میں تھا جو سب سے بڑا
اس کو راول بنا کے بھیج دیا
فوج پورب کے راستے ہو لی
مرغ کی بند ہو گئی بولی
راجا پرجا نے بھی کمر کھولی

★

اب سنو آٹھ دن گزرنے پر
جب نہ لشکر کی آئی کوئی خبر

دونوں لاشوں میں ننھی گڑی برچھی
ایک نے دوسرے کے گھونپی تھی
گھوڑے دونوں کے سبزہ زار کے پاس
چرتے پھرتے تھے رَوندی کُچلی گھاس
گھاس کیسی، کہاں کی ہریالی
تھی لہُو کی جگر جگر لالی
زار دادون بین کر کر کے
گر پڑا — "ہائے رے مرے بچے
تم کو ظالم نے جال میں پھانسا
میرے شکروں کو دے دیا جھانسا
چل بسے تم ہمارے جیتے جی
ایسے جینے سے موت بہتر تھی"
پھر تو سب روئے یوں گلے مل مل
درد سے پھٹ گیا پہاڑ کا دل
گھاٹیوں کے لرز گئے سینے
زور سے آہ کھینچی وادی نے

★

اتنے میں — ایک چاند سا مکھڑا
جھانکا خیمے سے ڈھل گیا دُکھڑا
یہ شماخان کی تھی شہزادی
چھب دکھا کر شفق سی پھیلا دی
یوں سواگت ادب کے ساتھ کیا
اس کو تکتا ہی رہ گیا راجا
چار آنکھیں ہوئیں تو تھا گُم سُم
جیسے سورج کے سامنے گُلدم
اس کے درشن میں کھو گیا دادون
غم سے آزاد ہو گیا دادون
اور وہ راجا کے سامنے جھک کر
مسکرانے لگی ذرا رُک کر
پھر بڑھی اور لے کے ہاتھ میں ہاتھ
لائی ڈیرے میں اس کو اپنے ساتھ
چُن دیا سامنے وہ دسترخوان
جس میں تھا اک سے ایک بڑھ کر خوان
ہنس کے، آہستہ سے اُٹھایا پھر
اک چھپر کھٹ میں جا لٹایا پھر
رنگ رلیوں میں رات دن گزرے
اس طرح پورے سات دن گزرے
زار دادون ہو گیا لٹّو،
چل گیا اس کے حُسن کا جادُو
روز ڈیرے پہ اک جھمیلا ہو
عیش ہو، دل لگی ہو، میلا ہو

★

گھر کو اب رخصتی کی بات چلی
پوری پلٹن لیے برات چلی
اور چلیں آگے آگے افواہیں
جتنے منہ اتنی باتیں لوگوں میں
راجدھانی میں بج گیا باجا
چلو پھاٹک پہ، آ لیا راجا
جب براتی بڑھے نگر کی اور
ہر طرف تھا ہڑبونگ کا شور
رتھ میں رادھا کے ساتھ گردھاری
پیچھے جنتا لگی ہوئی ساری
اپنی پرجا کا جب لیا پرنام
زار داودن نے کیا پرنام
دور سے بھیڑ میں دکھائی دی
ہاتھ بھر کی سفید سی پگڑی
بس وہی جوتشی نظر آیا
اس کو بگلا بھگت بنا پایا
سر سے پاؤں تلک سفید لباس
دیکھتے ہی بلایا اپنے پاس
کرکے ڈنڈوت، خیریت پوچھی:
کہیے اچھے تو ہیں سوامی جی؟

شبھ گھڑی ہے یہ، آگیا دیجے۔
من میں جو بات ہو بتا دیجے"
گیانی بولا کہ "سنیے ان داتا
آج بے باق کیجیے کھاتا
میں نے جب خوش کیا تھا، یاد ہے نا؟
آپ نے کیا کہا تھا، یاد ہے نا؟
پہلے جو مانگے تو، وہ تیرا ہے
یہ وچن ہے، یہ حکم میرا ہے
ہے شماخان کی جو شہزادی
بس یہی پہلی مانگ ہے میری
قول وہ یاد کیجیے سرکار
یہ مجھے بخش دیجیے سرکار"
مانگ ایسی سنی جو راجا نے
سن کے ہاتھوں کے اڑ گئے طوطے
"کیا کہا؟" اس کو ڈانٹ کر پوچھا:
"گھس گیا تجھ میں کوئی بھوت بلا
عقل تو نے کہیں گنوائی کیا؟
تیرے بھیجے میں یہ سمائی کیا؟
اپنا وعدہ تو یاد ہے مجھ کو
مانگنے والے اپنے ہوش میں ہو

کیوں بھلا؟ تجھ کو چاہیے لڑکی
(مجھ سے کرنے چلا ہے گستاخی؟)
کیا مجھے جانتا نہیں؟ ہوں کون؟
مہاراجہ، مہابلی، دادون!
مانگنا ہے تو مانگ لے مجھ سے
سونے چاندی کی تھیلیاں بھر کے
کوئی منصب، کوئی بڑا عہدہ
شاہی اصطبل سے کوئی گھوڑا
اور تو اور، اپنا آدھا راج
تو جو مانگے تو بخش دوں گا آج"
جوتشی بولا "جی نہیں سرکار،
میں تو کھائے ہوئے ہوں اس پہ ادھار
جو شماخان کی ہے شہزادی
بس یہی مانگتا ہے فریادی"

★

تھوکا راجا نے، آگیا غصہ
"ہشت! ایسا کبھی نہیں ہوگا
تجھ کو ملنا بھی تھا تو اب نہ ملے
خیریت ہے اسی میں لب نہ ہلے
دور ہو جا، نہیں تو او پاجی
خود ہی شامت بلائے گا اپنی
ہاں! خبردار! دیکھتے کیا ہو؟
سامنے سے ہٹاؤ بڈھے کو"

★

چاہتا تھا اُلجھ پڑے گیانی
پر اُلجھنا ہے ایسی نادانی
بعض اوقات جھنگی پڑتی ہے
(بات کرتے ہیں ہاتھ جڑتی ہے)
زار دودن نے اُٹھایا گرز
سر پہ یوں زور سے جمایا گرز
وہ گرا جا کے چاروں شانے چت
نہ رہا نبض اور نہ سانس کا بہت
راجدھانی تو ساری کانپ گئی
اور لڑکے ہنسے — ہا ہا، ہی ہی
جانے والا گزر گیا جی سے
ہنستیا ہو تو اس کی جوتی سے
یوں تو خود بھی دہل گیا راجا
پر بظاہر بہل گیا راجا
رتھ چلا پورے تام جھام کے ساتھ
شہر میں آئے دھوم دھام کے ساتھ

★

ناگہاں — اِک طرف ہوئی کھن کھن
سب کی آنکھوں کے سامنے فوراً
پَر پھلاتا ہوا اُڑا مُرغا
اُڑ کے اڈّے سے رتھ پہ جا پہنچا
ٹھونگ سر پر لگائی راجا کے
اور مُکٹ میں گڑا لیے پنجے
جان لیوا تھی مُرغ کی ہر ٹھونگ
رتھ سے راجا گرا ہوئی ہڑبونگ
اِسی ہڑبونگ میں وہ شہزادی
گم ہوئی دے کے سب کو بربادی
ڈھونڈنے پر کہیں ملی ہی نہیں
ایسی غائب ہوئی کہ تھی ہی نہیں

من گھڑت ہے، تو ہوسیانوں کو
پُر نصیحت ہے، نوجوانوں کو

خط و کتابت کرتے وقت
خریداری نمبر
کا حوالہ ضرور دیجیے

بقیہ پنچ تنتر کی کہانیاں

ایک دن وہ اپنی اسی حالت پر آنسو بہا رہا تھا کہ اُدھر سے ایک کیکڑے کا گذر ہوا کیکڑے نے بگلے کو اس طرح آنسو بہاتے ہوئے دیکھا تو اس سے نہ رہا گیا اور قریب آکر بولا۔ آپ مچھلیوں سے بھرے اس تالاب کے کنارے اتنے اداس اتنے غمگیں کیوں نظر آرہے ہیں۔

بگلے نے جواب دیا۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو دوست۔ بات یہ ہے کہ اپنی بھوک مٹانے کے لیے روز روز مچھلیوں کو نوالہ بناتے بناتے میرے دل میں ان مچھلیوں کے لیے رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا ہے سوچتا ہوں اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے ان کی جان لینا ٹھیک نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے آج سے برت رکھنے کی ٹھان لی ہے۔ تم خود ہی دیکھ لو مچھلیاں میرے سامنے آزادی سے اِدھر اُدھر پھر رہی ہیں اور میں نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔"

کیکڑے نے بھی ہمدردی جتاتے ہوئے پوچھا "پرماما آپ کے دل میں رحم کا یہ جذبہ کیسے پیدا ہو گیا۔ آخر کوئی تو وجہ ہو گی؟

(اگلی قسط ستمبر میں ملاحظہ فرمایئے)

سفرنامہ ابن بطوطہ

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

مسلسل

فارس کی طرف

بصرہ سے ایک چھوٹی سی کشتی میں اُبلہ گیے۔ یہ کسی زمانے میں بڑی بندرگاہ تھی۔ ہندوستان اور فارس سے سوداگر سامان لاتے اور لے جاتے تھے۔ اب ایک گاؤں رہ گیا ہے۔ مگر دریا کے دونوں کناروں پر میووں کے باغ ہیں۔ یہاں درختوں کے نیچے مچھلی، روٹی، دودھ اور کھجوریں بکتی ہیں۔

یہاں سے دوسری کشتی میں عبادون (عبادان) گیے۔ عبادان کی ایک ویران مسجد میں ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ میں جب ان سے ملنے گیا تو نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز پڑھ کر مجھے دعا دی اور بڑی محبت سے پیش آئے اور ایک مچھلی عطا فرمائی یہ مچھلی خود بزرگ نے اپنے ہاتھ سے پکڑی تھی بہت لذیذ تھی۔ یہاں سے چل کر ماجول پہنچے جو بحیرہ فارس پر ہے۔

فارس سے چل کر جو شہر ہمیں ملے۔ ان میں سے کچھ ویران ہیں کچھ آباد ہیں۔ مگر پہلی جیسی رونق نہیں رہی۔ ان میں ایک رامز ہے، ایک تستر ہے۔ رامز میں ہماری ملاقات ایک عالم سے ہوئی حضرت شیخ بہاؤ الدین ملیانی کی اولاد ہیں۔

رامز سے تین دن کی مسافت پر ایک گاؤں ملا۔ اس میں کُرد رہتے ہیں۔ یہاں ہر منزل پر خانقاہیں ہیں جن میں روٹی، گوشت اور حلوا ملتا ہے۔ حلوا مزیدار ہوتا ہے انگور آٹے اور گھی سے تیار کیا جاتا ہے۔ ہر خانقاہ میں ایک امام ایک مؤذن اور کھانا پکانے والا رہتا ہے۔ یہ درویشوں کے لیے کھانا پکاتا ہے۔

تستر

اس شہر کو حضرت خالد بن ولید نے فتح کیا تھا۔ یہاں کے بڑے مشہور بزرگوں میں حضرت عبداللہ تستری گذرے ہیں۔

تستر کے چاروں طرف ایک نہر ہے۔ اس کا پانی گرمیوں میں اتنا ٹھنڈا ہوتا ہے کہ میں نے اتنا ٹھنڈا پانی کہیں نہیں پیا۔

آبادی سے باہر ایک مزار ہے جہاں لوگ اپنی مرادیں مانگتے ہیں اور نذر و نیاز لے کر جاتے ہیں۔ مشہور ہے کہ یہ مزار حضرت زین العابدین کا ہے۔ مگر

یہ صحیح نہیں ہے۔

تستر میں حضرت سہل بن عبداللہ تستری کی اولاد میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ امام شرف الدین موسیٰ ان کا نام ہے۔ ایسے باسلیقہ اور خوش انتظام ہیں کہ میں کیا بیان کروں۔ مہمانوں کو نہایت خوش ذائقہ کھانا کھلاتے ہیں۔ بریانی، گھی میں بھنا ہوا مرغ کا گوشت، روٹی، حلوا اور قسم قسم کے مزے دار سالن۔

امام شرف الدین کے چار خدمت گار ہیں۔ سُنبل، کافور، جوہر اور سرور۔ شیخ بہت خوبصورت آدمی ہیں اور بے حد صالح اور متقی۔ ہر جمعے کو وعظ کہتے ہیں۔ حجاز، شام، مصر کے بڑے بڑے واعظ دیکھے مگر جو انداز بیان شیخ کا ہے کسی کا نہیں دیکھا۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں اور وعظ سن کر ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے ہیں۔ ایک دن نماز ظہر کے بعد ۲۵ نوجوانوں نے توبہ کی۔ جو کوئی توبہ کرتا تھا شیخ اس کی پیشانی کے تھوڑے سے بال کاٹ دیتے تھے

لوگ مذہبی مسئلے کاغذ کے پرچوں پر لکھ کر ان کے سامنے رکھ دیتے تھے اور یہ ان مسئلوں کے تسلی بخش جواب لکھ دیتے تھے۔ میرا قیام یہاں سولہ دن رہا۔

تستر سے تین منزل پر ایزاج ہے۔ اس کا دوسرا نام مال الامیر ہے۔ ایزاج بادشاہ کی راج دھانی ہے۔ یہاں کی تمام خانقاہوں کی نگرانی شیخ الشیوخ نورالدین کرمانی کرتے ہیں۔ بڑے عالم اور متقی ہیں۔ بادشاہ اور شہر کے تمام امیر ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔

شیخ نے میری بڑی خاطر کی۔ اپنا مہمان بنایا اور ہوادار خانقاہ میں ٹھہرایا۔

ایزاج کے بادشاہ کا نام اتابک افراسیاب ہے۔ اس کے باپ احمد نے حکومت کی آمدنی تین حصوں میں بانٹ دی ہے۔

ایک حصہ خانقاہوں اور مدرسوں کے لیے۔

ایک فوج کے خرچ کے لیے۔

ایک اپنے خرچ کے لیے۔

تمام سلطنت میں خانقاہوں کا جنھیں مدرسہ کہتے ہیں۔ بہت اچھا انتظام ہے۔ ہر ایک منزل پر مسافروں کے لیے خانقاہ بنی ہوئی ہے۔ دونوں وقت خادم مسافروں کی گنتی کرتا ہے اور ہر ایک کے لیے روٹی کی دو ٹکیاں گوشت اور حلوا لاتا ہے یہ سب خرچ حکومت پورا کرتی ہے۔

کچھ دن بعد سلطان نے مجھے باریاب کیا۔ سلطان ایک مسند پر بیٹھا تھا۔ سامنے ایک سونے کا ایک چاندی کا پیالہ رکھا تھا۔ سلطان کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ نشے میں سرشار تھے۔ میں نے کہا اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ آپ کے والد اتنے بڑے صالح اور مقدس لوگوں میں سے تھے کہ دور دور ان کی نیکی کی

دھوم تھی۔ آپ کے لیے زیبا نہیں ہے کہ اس حالت میں رہیں۔

سلطان نے میری بات توجہ سے سُنی مگر کچھ بولا نہیں۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ نادم ہے۔ میں نے اٹھنا چاہا تو یہ کہہ کر روکا کہ آپ جیسے بزرگوں کی تشریف آوری میرے لیے باعثِ رحمت ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بادشاہ کی پلکیں نیند سے جھکی جا رہی ہیں۔ اس لیے شکریہ ادا کیا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر آ کر دیکھا تو جہاں جوتے چھوڑ گیا تھا وہاں نہ تھے۔ فوراً دربار کے سب سے بڑے عالم نے میرے جوتے حاضر کر دیئے اور جوتوں کو چوم کر بولے۔ کس کی مجال تھی کہ سلطان کو اس طرح بے دھڑک ٹوک دے۔

ایزاج سے چلتے وقت سلطان نے کچھ اشرفیاں ہمیں بھیجیں۔ ہمارا سفر دس دن تک سلطان کے ملک میں رہا۔

ایزاج سے چل کر شہر فیروزان پہنچے۔ یہ اصفہان کا علاقہ ہے۔ آب و ہوا بہت اچھی ہے۔ شہر میں داخل ہوئے تو عصر کی نماز ہو چکی تھی اور سامنے ایک جنازہ جا رہا تھا۔ آگے پیچھے مشعلیں روشن تھیں۔ گویّے گیت گاتے ساز بجاتے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ یہ نئی بات دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ فیروزان سے دن نکلے چل پڑے اور نیلان پہنچے۔ یہ بستی خوب سرسبز ہے۔ ایک مسجد تو ایسی ہے کہ واہ واہ۔ مسجد کے برجوں میں کبوتر رہتے ہیں۔ اور غول کے غول اڑا کرتے ہیں۔ اس کے آگے اصفہان ہے۔

اصفہان

یہ عراق عجم کا بڑا شہر ہے۔ مگر آپس کے جھگڑوں سے اجڑ گیا ہے۔ شیعہ سُنی کٹ کٹ کر مرے جاتے ہیں۔ کب کب کی پُرانی باتوں کے لیے خون خرابہ جاری ہے۔

اصفہان میں پھلوں کی کثرت ہے۔ خربوزہ بہت میٹھا اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ بخارا اور خوارزم کے سوا کہیں کا خربوزہ اصفہان جیسا نہیں ہوتا۔ سبز چھلکا ہوتا ہے گودا لال۔ مگر وہی لوگ اسے کھا سکتے ہیں جنھیں عادت ہوتی ہے نیا آدمی کھالے تو پیٹ خراب ہو جاتا ہے۔ میں نے کھایا تو دست آنے لگے۔

اصفہان کے لوگ گورے چٹے اور بہت بہادر ہوتے ہیں۔ کھانا عمدہ کھاتے ہیں اور جی کھول کر کھاتے ہیں۔ ہندوستان کی طرح ان کے ہاں بھی ہر پیشے کا ایک چودھری ہوتا ہے۔ اس کی بات ہر ایک مانتا ہے۔ بڑے لوگ بھی کسی کو اپنا امیر بنا لیتے ہیں اور اس کی بات مانتے ہیں۔

اصفہان کے نوجوان ایک دوسرے کی خوب دعوتیں کرتے ہیں۔ ایک سے بڑھ کر دوسرا دعوت

کھلاتا ہے۔ ایک دفعہ ایک نوجوان نے شیخی میں شمع کی آگ پر کھانا پکایا۔ دوسرے نے یہ بات سنی تو ریشم جلا کر کھانا پکایا۔ اصفہان میں میرا قیام چودہ دن رہا۔

اصفہان میں آلو بخارا اور انگور بھی پیدا ہوتا ہے۔

شیخ علی کی خانقاہ

میرا قیام شیخ علی بن سُہیل کی خانقاہ میں تھا۔ جہاں ہر ایک کو کھانا ملتا ہے۔ ایک نہایت عمدہ حمام ہے۔ خانقاہ کا انتظام کرنے والے سب اچھے لوگ ہیں۔ صاحب سجادہ دو بھائی ہیں۔ شاہ قطب الدین حسنی، مفتی شہاب الدین احمد دونوں بڑے نیک اور مہمان نواز ہیں، مسافروں، مسکینوں اور درویشوں سے بڑی محبت کرتے ہیں۔ خاطر تواضع میں کسر نہیں رکھتے۔ میں خانقاہ میں پہنچا تو فوراً کھانا اور خربوزے بھیجے۔

عجیب بات

جہاں میں ٹھہرا تھا اس کے برابر شیخ کا باغ تھا۔ شیخ کا روئی بھرا چوغہ میلا تھا میں نے دھو کر پھیلا دیا۔ چوغہ اتنا خوب صورت تھا کہ میرے دل میں خیال پیدا ہوا۔ ایسا چوغہ میرے پاس بھی ہوتا۔ اتنے میں شیخ قطب الدین میرے پاس تشریف لائے اور اپنے ایک مرید کو حکم دیا چوغہ لاؤ اور چوغہ اپنے ہاتھ سے مجھے پہنا دیا۔

میں نے قدم بوس ہو کر کہا "اگر اپنی کلاہ بھی مجھے اڑھا دیں تو میری عزت بڑھ جائے گی"۔ شیخ نے اپنی ٹوپی ہاتھ میں لے کر فرمایا۔ "محمد، یہ ٹوپی میں اس طرح تمھیں اڑھاتا ہوں۔ جس طرح میرے باپ شمس الدین محمود نے مجھے اڑھائی تھی اور انھیں ان کے باپ تاج الدین علی رجا، نے عطا فرمائی اور انھیں حضرت امام شہاب الدین ابی حفص سہروردی نے اور انھیں درجہ بدرجہ لوگوں سے ملی۔ یہ سلسلہ حضرت علی تک بیان کیا۔ اور ٹوپی میرے سر پر اڑھا دی۔

یہ واقعہ ۷، رمئی ۱۳۴۷ء (مطابق ۷۴۷ھ) کو پیش آیا۔ یہاں سے ہم شیراز چلے گیے۔ اصفہان سے شیراز دس دن کی مسافت پر ہے۔ راستے میں کلیل نام کی بستی ملتی ہے۔ کلیل میں پھل بہت سستے ہیں۔ پانچ آنے میں سات سیر سیب ملتے ہیں کلیل میں ہمارا قیام خواجہ کافی کی خانقاہ میں ہوا۔ خواجہ کافی بہت دولت مند ہے دل کھول کر خرچ کرتا ہے جگہ جگہ اس کے بنائے ہوئے مسافر خانے ہیں۔ ان میں کھانے اور ٹھہرنے کا معقول انتظام ہے۔

(باقی آیندہ)

جناب اختر بریلوی

رباعیات

حاصل تمھیں ہر حال میں کرنا ہے کمال
وہ دورِ ترقی ہو کہ ہو دورِ زوال
ادبار میں بھی شان نہ جانے پائے
بڑھ بڑھ کے بنو بدر تو گھٹ گھٹ کے ہلال

بلبل کے چہکنے سے چہکنا سیکھو
سبزے کے لہکنے سے لہکنا سیکھو
اس گلشنِ ہستی سے سبق لینا ہے
پھولوں کے مہکنے سے مہکنا سیکھو

ہر کام میں جلدی تھیں کر دے گی نڈھال
تھک جاتا ہے جو چلتا ہے خرگوش کی چال
پا لوگے بہت جلد تم اپنی منزل
خاموشی سے بڑھتے رہو کچھوے کی مثال

محنت کرو کچھ کام کرو، کام کرو
ہر گام پہ آگے ہی بڑھو، کام کرو
سورج کی کرن دیتی ہے پیغام تھیں
سونے کا نہیں وقت، اٹھو کام کرو

جناب خورشید شیدائی

مُلّا نصر الدّین کے لطیفے

لطیفہ گوئی میں مُلا نصر الدین چین اور ترکستان وغیرہ میں اسی طرح مشہور ہیں جس طرح اپنے دیس میں بیربل اور مُلا دو پیازہ ۔

ایک روز مُلا نصر الدین نے دیکھا کہ چوک میں ایک توتے کا نیلام ہو رہا ہے ۔ لوگ بڑھ چڑھ کر بولی لگا رہے ہیں ۔ ہوتے ہوتے وہ توتا پانچسو روپے میں نیلام ہو گیا ۔ مُلا نے حیرت سے پوچھا ۔ "اس میں ایسی کیا خوبی ہے جو اتنے مہنگے داموں بکا" توتے کے مالک نے جواب دیا " میرا توتا باتیں کرتا ہے ۔"

یہ سنتے ہی مُلا دوڑے دوڑے اپنے گھر گئے اور ایک پالتو مرغ بغل میں دبا کر الٹے پیروں لوٹے اسے فروخت کرنے کے لیے چوک میں آبیٹھے ۔ کسی نے اس کی قیمت دریافت کی ۔ تو انھوں نے ایک سَو روپے بتائی ۔ گاہک نے تعجب سے پوچھا "اس معمولی مرغ میں ایسی کونسی خوبی ہے جو اتنی رقم مانگتے ہو ؟"

مُلا نے مرغ کو چمکارتے ہوئے کہا " میرا مرغا غور و فکر کرتا ہے ـــــ !"

ایک رات مُلا نصر الدین نے خواب میں دیکھا کہ انھیں ایک ہزار روپے کی مالیت کا ایک نہایت عمدہ گھوڑا کہیں سے مفت ہاتھ لگ گیا ہے ۔ پر بھلا وہ ان کے کس کام کا تھا ـــــ ؟ انھیں تو سواری کرنی بھی نہیں آتی تھی ۔ لہذا وہ اُسے بیچنے کے لیے چوک میں کھڑے ہو گئے ۔ ایک گاہک نے اس کی قیمت پوچھی تو انھوں نے ایک ہزار روپے بتا دی ۔ ساتھ ہی گھوڑے کی خوبیاں گنوانے لگے ۔ خریدار نے بھی دلچسپی لینی شروع کی ۔ گھوڑے کا سر سے پیر تک جائزہ لیا اور خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر بولا ـــ " دو روپے لو گے ؟"

مُلا کے تلووں سے جو لگی تو تالو سے نکل گئی ۔ جھلا کر بولے ـــــ " ایک ہزار روپے کا مال دو روپے میں مانگ کر کسی کے مال کو کیوں کوستے ہو ،

میاں! دو روپے کم دیتے تو میں شاید گھوڑا تمھارے ہاتھ فروخت کر دیتا۔۔۔!!"

پھر مُلّا بڑبڑائے ـــــ "جاؤ جاؤ اپنا راستہ لو بڑے آئے گھوڑے کے خریدار، کبھی خواب میں بھی گھوڑا دیکھا ہے تم نے۔"

گاہک نے سنجیدگی سے کہا ـــــ "ناراض نہ ہو بھائی! چلو تین روپے لے لو۔۔۔!!"

مُلّا کو اور بھی غصہ آگیا۔ اور تُو تُو میں میں کے بعد باقاعدہ لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس گڑبڑ میں مُلّا کی آنکھ کھل گئی۔ اب جو انھوں نے دیکھا کہ نہ گھوڑا ہے نہ خریدار تو انھوں نے جھٹ سے آنکھیں بند کیں اور ہاتھ پھیلا کر کہا "اچھا لاؤ! تین ہی روپے دے دو۔۔۔!!"

مُلّا کا خچر گم ہو گیا۔ انھوں نے قسم کھائی کہ اگر اس کو پاؤں گا تو ایک دینار میں بیچ دوں گا۔ اتفاق سے وہ خچر مل گیا۔ اب قسم پوری کرنی تھی۔ لہٰذا ایک بلی کو پکڑا اور اس کی گردن میں رسی باندھ کر خچر کے گلے میں لٹکا دیا اور چوک میں آکر آواز لگائی "خچر ایک دینار میں اور بلی سو دینار میں بیچتا ہوں بشرطیکہ دونوں معاملے ایک ساتھ طے ہو جائیں۔"

ایک دن مُلّا نصیر الدین نے اپنی بیوی سے کہا "تھوڑا سا پنیر لے آؤ، پنیر معدہ کو قوت بخشتا ہے اور بھوک کو زیادہ کرتا ہے۔"

ان کی بیوی نے کہا "پنیر نہیں ہے۔"

مُلّا بولے ـــــ "اچھی بات ہے پنیر معدہ میں سکڑن پیدا کرتا ہے اور دانتوں کی جڑوں کو کمزور کرتا ہے۔"

بیوی نے کہا ـــ "ان دو مختلف باتوں میں کس کو مانوں؟"

مُلّا نے کہا "پنیر موجود ہو تو پہلی بات مانو نہ ہو تو دوسری بات۔"

ایک دن مُلّا کی بیوی کپڑا دھو رہی تھیں۔ ایک کوّا صابن اٹھا کر درخت پر لے گیا۔ بیوی نے مُلّا کو بلا کر کہا ـــ "لو دیکھو! کوّا صابن لے گیا!!"

مُلّا نے بے توجہی سے کہا ـــ "تو کیا ہوا تم دیکھ نہیں رہی ہو کہ کوّے کا کپڑا ہم لوگوں کے کپڑوں سے زیادہ کالا ہے اس کو صابن کی زیادہ ضرورت ہے۔"

مُلّا وضو کر رہے تھے کہ بایاں پاؤں دھونے سے پہلے پانی ختم ہو گیا۔ نماز پڑھتے وقت وہ ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے تعجب سے پوچھا "کیوں خیریت تو ہے؟"

انھوں نے کہا "میرا بایاں پاؤں بے وضو تھا۔"

مُلّا سے لوگوں نے پوچھا ——"عربی میں ٹھنڈے شوربے کو کیا کہتے ہیں ——؟"
مُلّا کو وہ لفظ یاد نہیں تھا بولے —"عرب کے لوگ کسی وقت بھی شوربے کو ٹھنڈا نہیں ہونے دیتے۔"

بقیہ حاجی بابا....

سائنس داں صاحب، آپ کو اللہ نیکی دے،

آپ بھی سالم بچ گئے اور آپ کا یہ ایٹمی ری ایکٹر اور اسٹرانومی والی دوربین بھی، جو دن میں تارے دکھا دیتی ہے۔"
اس شریف آدمی نے یہ سنا تو اپنا سر تھام لیا۔ کچھ بُدبُدایا، شاید کہتا ہو —— لاحول ولا قوۃ!
ہم نے دبنگ ہو کر کہا۔" سنیے اب ہم آئے ہیں تو راکٹ کے زور سے چاند کا سفر دیکھے بغیر نہیں ٹلنے والے ——!

(آیندہ پڑھیے سفر کی روداد)

نونہالانِ وطن اے نونہالانِ وطن

جناب عبدالمنان غم بہرائچی

رشکِ گل، رشکِ چمن، رشکِ جہاں بن کر رہو
ظلمتِ عالم میں مثلِ کہکشاں بن کر رہو
رہ کے زیرِ آسماں بھی آسماں بن کر رہو
نونہالانِ وطن اے نونہالانِ وطن

زندگی کی تلخیوں سے تم نہ گھبراؤ کبھی
رنج وغم کو اپنے خاطر میں بھی مت لاؤ کبھی
اور فریبِ عالمِ فانی میں مت آؤ کبھی
نونہالانِ وطن اے نونہالانِ وطن

عظمتِ آدم کے ہو تم ہی حقیقت میں امیں
رازدارِ زندگی ہو محرمِ اسرارِ دیں
دیکھنا اس پر نہ کوئی آنچ آجائے کہیں
نونہالانِ وطن اے نونہالانِ وطن

تم ہی پر ہے ساری قوموں کی ترقی کا مدار
اپنے مستقبل کو تم پھر بناؤ شاندار
آئے گی پھر تو یقیناً جھوم کر فصلِ بہار
نونہالانِ وطن اے نونہالانِ وطن

بچوں کے لیے اچھی معلوماتی کتابیں
(پاکستانی مطبوعات)
آسمان کی سیر گلن او بلو ۲/۵۰ آؤ معلوم کریں محمد مظفرالدین ۲/۵۰
فرانسس این کرسٹی ۴/۰۰ بچوں کے لیے سائنسی تحقیقی راہیں جارج بار ۲/۵۰
سب سے بڑا سب سے چھوٹا ہرمین اور نینا شنائیڈر ۴/۰۰ بجلی کی کہانی علی ناصر زیدی ۴/۰۰
بجلی کی پہلی کتاب ۲/۵۰ پیٹر ریحان مسعود خاں ۱/۵۰
پانی کی دنیا ۱/۲۵ پرانی دنیا کے لوگ سید حشمت علی رضوی ۱/۵۰
مولوی عبدالحق ۱/۲۵ چاند کا مسافر عشرت رحمانی ۲/۰۰
خوراک کی کہانی ۱/۵۰ خلا میں سفر کی پہلی کتاب جین بنڈک ۲/۵۰
دنیا کے گرد اسی دن میں ورن ۲/۲۵ دنیا میں بسنے والے (پہلی کتاب) علی ناصر زیدی ۲/۵۰
(دوسری کتاب) علی ناصر زیدی ۲/۰۰
ملنے کا پتہ
پرنسس بلڈنگ۔ نزد جے جے ہسپتال۔ بمبئی ۳ (بی آر)

جناب شفق سہسرامی

ٹھنڈی آگ

(۲)

اختر خاں سے بیوٹی پلیس کا چلنے کا وعدہ لے کر وہ کمرے میں آ گئے۔ کچھ دیر بعد کرنل سعید بھی آگئے انھوں نے لطیفے اور کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ کافی دیر تک دونوں ہنستے رہے۔ جب وہ اپنے کمرے میں آئے تو شمیم نے کہا "مجھے شک ہے کہ وہ جنات نہیں ہیں۔ آج میں فائر کر کے دیکھوں گا کہ انھیں گولی لگتی ہے یا نہیں۔؟"

"کیوں جان دینا چاہتے ہو یار" ظفر بولا، ہم لوگ گھومنے آئے ہیں گھومیں پھریں گے تم یہ کہاں کا چکر لے بیٹھے ہو۔ "وہ کوئی ہوں ہمیں ان سے کیا۔"

"میری تو سب سے اچھی تفریح یہی ہو گی۔ اگر تم ساتھ نہ دینا چاہو تو نہ دینا۔ میں تنہا ہی دیکھ لوں گا" شمیم بولا۔

"جب تم نہیں مانتے تو میں تیار ہوں۔"

جب ہر جگہ ساتھ دیا ہے تو اب یہاں کیسے پیچھے ہٹ جاؤں۔ خواہ جان جائے لیکن تم فائر کس چیز سے کرو گے تمھارے پاس رائفل ہے ——؟"
ظفر نے پوچھا۔

"رائفل تو نہیں ہے خالو جان سے مانگا جائے تو دیں گے نہیں، پھر کیا پتہ گولی سے وہ مر ہی جائیں۔ اس لیے اپنے ائر ریوالور سے فائر کروں گا۔ دیکھوں کیا نتیجہ نکلتا ہے۔"

رات کا کھانا کھا کر دونوں کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیے۔ جب ایک بجے قدموں کی آوازیں آنے لگیں تو وہ تیار ہو کر نکلے۔ دونوں جنات کمپاونڈ میں گھوم پھر رہے تھے۔

شمیم نے نشانہ لگا کر ایک جن پر فائر کر دیا۔

ہلکی سی کراہ گونجی پھر اندھیرا چھا گیا۔

کچھ دیر تک دونوں نئے واقعے کا انتظار کرتے رہے لیکن جب دیر ہو گئی اور کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوا تو انھوں نے ٹارچ لے کر کمپاونڈ چھان مارا لیکن وہاں تو سناٹے کی حکمرانی تھی۔ دونوں اپنے بستروں پر سو گیے لیکن اس بار ظفر نے دروازہ بند کر دیا تھا۔

ایک گھنٹے بعد ہی دونوں جنات پھر نمودار ہوئے اور کمپاونڈ سے ورانڈے میں آئے ان کے منھ سے بار بار آگ نکل رہی تھی۔ آنکھوں سے بھی غصے کے مارے شعلے نکل رہے تھے۔ ورانڈے سے ہوتے ہوئے وہ کمرے کے پاس آ کر رک گیے۔

کمرے میں سبز بلب کی روشنی میں دونوں بے خبر سو رہے تھے۔ انھوں نے شیشے سے انھیں سوتے دیکھا ان کے آنکھوں کے شعلے اور تیزی سے نکلنے لگے۔ لیکن پھر ایک جن نے دوسرے کو اشارہ کیا دونوں لوٹ کر کمپاونڈ میں چلے گیے۔ پھر کمپاونڈ تاریک ہو گیا۔

صبح کو وہ پھر کمپاونڈ میں ٹہل کر جب واپس آنے لگے تو اچانک شمیم کی نظر خون کی بوندوں پر پڑ گئی۔ اس نے ظفر کو بھی دکھایا۔ دونوں بوندوں کے پیچھے چلتے ہوئے اپنے کمرے کے دروازے تک آئے۔ پھر وہ کمپاونڈ میں پہنچے خون کی بوندیں اب گیٹ سے باہر کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں انھیں دیکھ کر آگے بڑھتے رہے۔

"میں نے کہا تھا کہ مجھے شک ہے کہ وہ جنات نہیں" شمیم بولا۔ "دیکھو میری گولی اسے لگی تھی۔ خون کی بوندیں اسی کی ہیں۔ اگر جنات ہوتے تو نہ تو ان

کے گولی لگتی اور نہ خون بہتا کیوں کہ جنات کے متعلق
کہا جاتا ہے کہ وہ آتشی مخلوق ہیں۔ تم نے ہلکی سی کراہ
بھی سُنی ہوگی۔ ضرور آدمی ہیں مجھے اسی وقت شک
ہوا تھا جب یہ سنا تھا کہ وہ تالاب میں گرا کر مارتے
ہیں۔ جب وہ جنات ہیں تو جلا کر مار ڈالتے۔ ڈوبا
کر مارنا کیا معنیٰ رکھتا ہے۔ یہ لوگ آدمیوں کو خوف زدہ
کرنے کے لیے جانیں لے رہے ہیں لیکن تعجب
تو اس کا ہے کہ وہ اچانک غائب کہاں ہو جاتے ہیں"۔
شمیم سوچنے لگا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے بھی یقین ہو گیا ہے"
ظفر بولا۔" اب بے فکر رہو انھیں دیکھ لیا جائے
گا۔ میں تو صرف بھوت وغیرہ سے ڈرتا ہوں اب
ان کی ٹانگیں چیر کر پھینک دوں گا"

دونوں باتیں کرتے خون کی مدد سے آگے
بڑھتے رہے۔ "ارے یہ سڑک تو پرانے قبرستان
کو جاتی ہے" ظفر چونک کر بولا۔

"معلوم ہوتا ہے بدمعاشوں کا اڈا پرانے
قبرستان ہی میں کہیں ہے" شمیم بولا۔ خون کی بوندیں
ایک پختہ قبر کے پاس جا کر ختم ہو گئیں۔ یہ قبر اور قبروں
سے اچھی تھی۔

"ارے خون تو یہاں غائب ہو گیا" ظفر بولا۔

معلوم ہوتا ہے۔ بے چارہ خود ہی قبر میں اپنے پیروں
سے چل کر آ گیا۔ بھئی مان گیے نہ کفن کی ضرورت نہ دفن
کی۔ خدا سب کو ایسی موت دے"

"کیا فضول بکواس لگا رکھی ہے۔ ائر ریوالور
کی گولی سے آدمی ہلاک نہیں ہو سکتا" شمیم بولا
"سمجھ میں نہیں آتا وہ قبروں کے پاس کیوں آیا"

"میں نے بتایا نا کہ خود اپنے پیروں سے چل
کر......" ارے دفعتاً ظفر چونک پڑا۔

"کیا بات ہے ۔؟" شمیم نے جلدی سے پوچھا۔

"میں نے اپنی قبر خود کھودتے تو سنا تھا لیکن
اپنے پیروں سے چل کر قبر میں آتے کبھی نہیں سنا تھا"
شمیم ہنسنے لگا۔ آؤ واپس چلیں میں نے قبر اچھی طرح
دیکھ لی ہے۔ اس میں کوئی راستہ نہیں ہے جس سے
وہ داخل ہوتا۔

"میں کہتا ہوں اسی میں ہو گا۔ پکار کر دیکھو"
ظفر بولا"

"بے وقوفوں والی بات کیوں کرتے ہو" شمیم
نے قبر کی طرف اشارہ کیا "دیکھو ایسا معلوم ہوتا
ہے۔ جیسے یہ تازہ ہو"

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن قبر ہے کوئی ہسپتال
نہیں کہ مرہم پٹی کرانے چلا آیا ہو۔ آخر وہ یہاں آیا

ہی کیوں ہے" ظفر نے الجھ کر پوچھا۔

"وہی تو سوچنا ہے" شمیم نے ارد گرد دیکھتے ہوئے کہا۔

"او جاسوس کے بچے، تم گھومنے پھرنے آئے ہو کہ جاسوسی کرنے" ظفر نے دانت پیسے "یہ کام پولیس اور جاسوس کے لیے چھوڑ دو"

"میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ میری سب سے اچھی تفریح یہی ہے۔ تم ساتھ نہ دینا چاہو تو میں مجبور نہیں کروں گا"

تم بار بار یہ کیوں کہتے ہو۔ کیا میں بزدل ہوں۔ ظفر جھلا گیا۔ اب تو مجھے بھی ضد ہو گئی ہے اگر تم نہ بھی سوچو گے تو میں سوچوں گا"

دونوں گھر لوٹ آئے۔ کرنل سعید، اختر خاں سے باتیں کر رہے تھے۔

"بھئی میں تم لوگوں کے ساتھ 'بیوٹی بلیس' نہ جا سکوں گا" اختر خاں نے کہا "یہ روپیہ رکھ لو تم لوگ تنہا چلے جاؤ"

"نہیں خالو جان ہم لوگ آج نہیں جائیں گے" شمیم نے جواب دیا "جب آپ کو فرصت ہو گی دکھا دیجیے گا"

"میں تم لوگوں کو دکھا دوں گا۔ کرنل سعید نے سگار سلگاتے ہوئے کہا۔ جس دن کہو گے چلوں گا"

"شکریہ کرنل چاچا۔ آپ نے کہانی پوری نہیں کی" ظفر بولا۔

"کونسی کہانی" — کرنل نے ذہن پر زور دے کر یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

"وہی 'ٹھنڈی آگ' کی جو کہانی تھی"

"پھر کبھی سُن لینا بیٹے۔ اختر خاں نے مداخلت کی، اس وقت ہم ضروری باتیں کر رہے ہیں" وہ دونوں وہاں سے اٹھ گیے۔

شام کو انھیں نے "بیوٹی بلیس" کا پروگرام تنہا ہی بنا لیا۔ جب وہاں سے لوٹ رہے تھے۔ رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ آسمان میں تارے جھلملانے لگے تھے لیکن کیلاش روڈ بالکل سنسان ہو گئی تھی جناتوں کے ڈر سے۔

وہ دونوں اطمینان سے ٹہلتے آرہے تھے۔ اچانک انھوں نے گھر کے دروازے میں آگ لگی دیکھی پورا دروازہ جل رہا تھا اس سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔

بے اختیار وہ دوڑ پڑے۔ قریب پہنچے تو انھوں نے پھاٹک کے بدلے بغل کی دیوار سے

آگ کے شعلے بلند ہوتے دیکھے۔ لیکن اُن کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انھوں نے آگ سے لکھا ہوا ایک پیغام دیکھا۔ لکھا تھا۔

"اختر خاں۔
تمھیں آگاہ کیا جاتا ہے کہ تم لڑکوں کو روکو، وہ میرے راستے میں آرہے ہیں۔ ڈرو اس وقت سے جب شاہ جن کا غصہ تمھیں اور تمھارے گھر والوں کو فنا کردے، کل لڑکوں نے گولی چلائی تھی لیکن وہ بے وقوف کیا جانیں کہ ہم انسان نہیں آتشی مخلوق ہیں جن پر آگ کا کوئی حربہ کارگر نہیں ہوسکتا۔ ہم تمھیں تنبیہ کرتے ہیں کہ لڑکوں کو منع کردو، ورنہ میرا قہر و غضب تم لوگوں کو فنا کردے گا۔ میرا راستہ کاٹنے کا انجام موت ہے۔
"شاہ جن"

تحریر پڑھ کر دونوں نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر تحریر پر نظر گاڑ دی۔ ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے روشنائی کا کام آگ سے لیا گیا ہو۔

شمیم اپنا ہاتھ تحریر کے پاس اس طرح لے گیا جیسے وہ آگ کی حرارت کا اندازہ کرنا چاہتا ہو۔ لیکن جب آگ میں ذرہ برابر حرارت نہیں معلوم ہوئی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا سوچنے لگے ــــ" ظفر نے پوچھا۔

"سوچ رہا ہوں یہ کیسی آگ ہے جس میں حرارت نہیں ہے"

"حرارت نہیں!" ظفر نے حیرت سے دُہرایا پھر اپنا ہاتھ بھی وہاں لے گیا۔ واقعی حرارت نہیں ہے۔ کیا یہ "ٹھنڈی آگ" ہے

شمیم کچھ نہیں بولا۔ اس کی آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر بعد اس نے ظفر سے کہا "تم جاؤ میں آتا ہوں"

"تم یہاں کیا کروگے" ظفر نے پوچھا۔

"کہو تو خالو جان کو بلا لاؤں"

"اس کی ضرورت نہیں ہے تم جاؤ میں آرہا ہوں۔ کسی کو خبر مت دینا"

ظفر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد شمیم بھی اندر چلا آیا۔ لیکن اب تحریر دروازے پر نہیں تھی۔

"تحریر کا کیا ہوا ــــ" ظفر نے پوچھا۔

"میں نے بجھا دی" شمیم نے لاپرواہی سے

جواب [illegible]

[illegible]ادی، کیسے ___؟"

"پھر کبھی بتاؤں گا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جنات آج رات بھی تشریف لاتے ہیں یا نہیں۔ میرا خیال ہے وہ ضرور آئیں گے۔ کیوں کہ انھیں اپنی وارننگ کا نتیجہ دیکھنا ہے۔ اب تو تم جان گیے ہو کہ وہ جنات نہیں ہیں۔ ڈرنا مٹ ہم دونوں مہدی کی باڑھ میں چھپ کر دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ آخر وہ کس چیز کی تلاش میں ہیں چپ سادھے رہنا۔"

"ٹھیک ہے لیکن اگر انھوں نے دیکھ لیا تو" ___ ظفر نے پوچھا۔

"انھیں تو یقین ہے کہ خالو جان نے ہم لوگوں کو ڈانٹ دیا ہوگا اور ہم آتشی تحریر دیکھ کر ڈر گیے ہیں۔ اس لیے بے فکر رہیں گے۔"

دونوں مہدی کے پیچھے چھپ گیے۔

جب گھڑی نے ایک بجایا تو پھاٹک کے باہر انھیں جنات نظر آئے۔ وہ پھاٹک پر چڑھ کر اندر اتر آئے۔ جب وہ مہدی کی باڑھ کے قریب سے گذرے تو شمیم نے دیکھا ایک جنات لنگڑا رہا تھا۔ کچھ آگے بڑھ کر جنات رک گیے۔ انھوں نے گھوم کر کمروں کی طرف دیکھا شاید انھیں ظفر اور شمیم کا خیال تھا۔ لیکن جب انھیں کوئی نظر آیا تو وہ مطمین ہو گیے۔ پھر ایک جنات نے دوسرے کو آہستہ سے مخاطب کیا۔ "معلوم ہوتا ہے ڈر گیے، اسی لیے آج نظر نہیں آرہے ہیں ___؟"

"شاید انھیں تحریر نے خوف زدہ کر دیا ہے۔" دوسرے نے جواب دیا۔

"یہی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن لڑکے کمال کے دلیر ہیں۔ ہم لوگ اتنے دنوں سے آرہے ہیں کسی نے کچھ نہ کہا۔ یہاں تک کے پولیس بھی ڈر گئی۔ لیکن انھوں نے گولی چلادی۔ خیریت یہ ہوئی کہ گولی پیر میں لگی۔ کہیں سر میں لگی ہوتی تو ـ سچ کہتا ہوں بہت غصہ آیا تھا اگر تم نے منع نہ کیا ہوتا تو دونوں کا گلا گھونٹ کر مار ڈالتا۔"

"نہ جانے کیوں مجھے اُن پر ترس آگیا۔ تم نے دیکھا نہیں کیسے معصوم انداز میں سو رہے تھے۔ لیکن سردار بھی کمال کا آدمی ہے۔ دیکھو ڈر کے مارے کیسے چھپے ہیں" یہ کہہ کر وہ آہستہ سے ہنسا۔

"ہنسو مت انھیں کسی نے سُن لیا تو....." پہلے نے منع کیا۔

"کیا ہوگا جو سُنے گا سمجھے گا کہ جنات ہنس رہے ہیں۔ پھر کس میں اتنی ہمت ہے جو یہاں آ کر

بات سننے کی کوشش کرے۔"

پہلا بھی آہستہ سے ہنسا "وہ یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن تحریر کیا ہوئی سردار نے مجھ سے کہا تھا کہ جا کر صاف کر دینا۔ لیکن جب میں پہنچا تو وہ صاف تھی۔ کیا تم نے صاف کر دی تھی؟"

"نہیں تو، میں تو صبح سے تمھارے ساتھ ہوں۔"

"پھر تحریر کیا ہوئی، کہیں لڑکوں نے تو صاف نہیں کر دی۔" دوسرا بولا۔

"یار لڑکے ہیں غضب کے چالاک ہمیں تو اُن سے ڈر لگنے لگا ہے۔ کیا پتہ کب کیا کر دیں۔"

"چھوڑو ان باتوں کو آؤ پہلے کام کریں۔"

وہ دونوں زمین پر بیٹھ کر کچھ تلاش کرنے لگے۔ کافی دیر تک تلاش کے بعد وہ جلد ہی کھڑے ہو گیے۔

"وہ پتہ نہیں کمبخت یہاں ہے بھی کہ نہیں" ایک بولا "سردار سے کتنی بار کہا کہ اس گھر کا پیچھا چھوڑ دیں۔ یہاں تو کوئی نشان بھی نہیں ملتا۔"

"سردار کو یقین ہے کہ وہ چیز اسی کمپاونڈ میں ہے۔ اسی لیے تلاش کروا رہا ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن اب سردار کو یقین دلانا ہی پڑے گا۔ چھ مہینے ہو گیے تلاش کرتے۔ آؤ واپس چلیں تحریر کے بارے میں بھی تو سردار کو بتانا ہے۔ ورنہ اس کا غصہ ہم پر ہی اترے گا۔"

دونوں لوٹ گیے۔

ظفر اور شمیم نے ان کا تعاقب کیا وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ ان کا اڈہ کہاں ہے لیکن شاید جنات کو کسی طرح کا شک ہو گیا اس لیے وہ ایک تاریک گلی میں گھس گیے اور جب شمیم اور ظفر وہاں پہنچے گلی سنسان پڑی تھی۔ وہ ناکام واپس لوٹ آئے۔

ناشتہ سے فارغ ہو کر انھوں نے مچھلی کے شکار کا پروگرام بنایا، اسی تالاب میں، جس میں ڈوب کر آدمی مرتے تھے۔ انھوں نے مچھلی پھنسانے کے کانٹے کے علاوہ چھوٹا سا جال بھی لے لیا تھا۔ دوپہر تک وہ مچھلی پھنساتے رہے۔ اچانک ظفر کی نظر اس قبر کی طرف چلی گئی۔ جس کے پاس خون ختم ہوا تھا۔ قبر پر ایک بہت خوب صورت چڑیا بیٹھی تھی۔ ظفر کا دل اسے پکڑنے کے لیے مچلنے لگا "شمیم دیکھنا کتنی خوب صورت چڑیا ہے۔ اسے تو پکڑ کے دم لوں گا۔"

پھر کیا ہوا۔ ظفر اور شمیم نے چڑیا پکڑی یا نہیں یہ سب کچھ جاننے کے لیے اگلے شمارے کا انتظار کیجیے۔

جناب محمد طاہر قریشی

برسات کا موسم

(بڑے لڑکوں کے لیے)

چند مناظر

آگیا برسات کا موسم گئے گرمی کے دن
قلبِ مضطر ہو گیا ٹھنڈی ہوا سے مطمئن

آسماں پر ابر کا اک شامیانہ تن گیا
لُو کے ماروں کے لیے جو وجہِ راحت بن گیا

بادلوں سے یک بیک گرنے لگی پانی کی دھار
دیکھتے ہی دیکھتے وہ بن گئی اک آبشار

وہ سیہ بادل میں بجلی کا لپکنا بار بار
برق کی ضو سے نگاہوں کا جھپکنا بار بار

پھر وہ بجلی کی چمک کے ایک دو لمحوں کے بعد
گونج اٹھی دشت و جبل میں ہر طرف آوازِ رعد

یا سیہ فیلوں پہ سیمیں چابکوں کی یورشیں
چابکوں کی مار کھا کر ہاتھیوں کی شورشیں

ایک لمحہ کے لیے بجلی کی ضو سے دشت و در
جگمگاتے اس طرح جیسے فلک پر ہو قمر

رعد کی آواز سے پیدا دلوں میں لرزشیں
اور کیچڑ میں زمیں پر پاؤں کی وہ لرزشیں

ڈھل گئیں ساری چھتیں ہر سمت پرنالے چلے
نالے پرنالوں کا پانی سوئے دریا لے چلے

پُر ہوئے تالاب جھیلیں بھر گیا ندیوں کا پیٹ
پیش افتادہ زمینوں کو گیے دریا سمیٹ

آب بارش بن کے آیا دہر میں آبِ حیات
زندگی سے ہو گئی معمور ساری کائنات

ہو گیے پیدا جہاں میں جانور لاکھوں نئے
ان کی آوازوں سے سارے شہر بھر گونج اٹھے

اور جو زندہ تھے ان میں جانِ تازہ آگئی
محفلِ پژمردہ ہستی پہ رونق چھا گئی

چھا گئی تھی گرد جو پیڑوں کے پتوں پر دھلی
نونہالانِ چمن کی شکل و صورت اب کھلی

سبزہ جو سوکھا ہوا تھا ہو گیا پھر سے ہرا
آج ہر فرد و بشر کا دل امنگوں سے بھرا

بانسری کی روح پرور لے سے کوئی نغمہ ساز ۔۔۔ کر رہا ہے سننے والوں کے دل و جاں کو گداز
آم کے پیڑوں پہ کوئل کوکتی ہے جابجا ۔۔۔ پی کہاں، آتی ہے باغوں سے پپیہے کی صدا
کیسے اٹھلاتے ہوئے پھرتے ہیں صحرا میں ہرن ۔۔۔ سبزۂ نورس کو کھا کر خوب ہیں فربہ بدن
گنگناتے ہیں عنادل ناچتے پھرتے ہیں مور ۔۔۔ مینڈکوں نے اپنی ٹرٹر سے مچا رکھا ہے شور
بوجھ سے آموں کے کچھ کمزور شاخیں جھک گئیں ۔۔۔ ٹوٹ کر پیڑوں سے کچھ ڈالیں زمیں پر ٹک گئیں
دیکھو باغوں میں لگے ہیں جابجا آموں کے ڈھیر ۔۔۔ کھا رہے ہیں لوگ اب آموں کو ہو کر خوب سیر
جامنیں پک پک کے ٹپ ٹپ جابجا گرنے لگیں ۔۔۔ ٹولیاں لڑکوں کی ان کی کھوج میں پھرنے لگیں
بادلوں سے اب فضا میں رہتی ہے کافی نمی ۔۔۔ اور سایہ کی وجہ سے سخت گرمی میں کمی
پھر بھی بادل ہٹ کے لیکن جب نکل آتی ہے دھوپ ۔۔۔ جو نہ ہوں سایہ میں ان کے جسم جھلاتی ہے دھوپ
پھر تو گرمی کے سبب سے کھولنے لگتا ہے خون ۔۔۔ یاد پھر لوگوں کو آجاتا ہے جس سے ماہ جون
دھوپ کی تیزی سے سب کی خیرہ ہوتی ہے نگاہ ۔۔۔ اس میں پڑ جاتے ہیں صحرا کے ہرن بالکل سیاہ
دہر میں لیکن نہیں ہے کوئی شے بھی مستقل ۔۔۔ ایک دن بھر جاتا ہے ہر چیز سے فطرت کا دل

موسم سرما بھی یونہی ایک دن آجائے گا
طبع طاہر کے سوا ہر چیز پر چھا جائے گا

جناب ابوالکلام

دہلی سے نیویارک

نہر سوئز کے کناروں پر انگریزوں نے بعض مقامات پر اپنے لیے کئی تفریح گاہیں بنا رکھی ہیں۔ ان تفریح گاہوں میں سے اسماعیلیہ بھی ایک مقام ہے۔ خوب ہری بھری جگہ ہے۔ صاف ستھری۔ عمدہ عمارتیں۔ موٹر کشتیاں۔ جہاز پر سے ہم نے انگریزوں اور ان کے بچوں کو ادِھر ادُھر گھومتے پھرتے تفریح کرتے دیکھا بس کچھ نہ پوچھو تم بہت یاد آئے۔ کاش ہمیں بھی اپنی زندگی میں کبھی کبھار ایسی جگہ رہنے اور تفریح کرنے کو ملے۔ مثال دے کر اگر تمھیں سمجھاؤں تو یہ سمجھو جیسے اودے پور کے مہاراجہ صاحب نے اپنی تفریح کے لیے اودے پور کی پیچھولا جھیل میں جگ مندر اور جگ نواس جیسے محل بنا رکھے ہیں۔ بس یہی کیفیت نہر سوئز کی ان تفریح گاہوں کی بھی ہے۔

نہر سوئز کے بیچ بیچ میں چند مقام ایسے بھی ملے۔ جنھیں ہم چھوٹی موٹی جھیلیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ جھیلیں جہازوں کے لیے فلیٹ فارم کا کام دیتی ہیں۔ جہاز چاہیں تو یہاں رک سکتے ہیں۔ اور آرام کر سکتے ہیں۔ اس کا تجربہ ہمیں بھی ہو گیا۔ ٹھیک اس جھیل کے قریب ہمارا جہاز خراب ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا۔ جہاز کو اس جھیل میں ایک طرف کھڑا کر دیا۔ اور ٹھیک کرنے لگے۔ خرابی وہی پرانی تھی یعنی اسٹیرنگ وھیل خراب ہو گیا تھا۔ جہاز ایک دائرہ بنا کر اس پر برابر چلا جا رہا تھا۔ ہمارے جہاز کی یہ حالت قریب ایک گھنٹہ رہی۔ اگر ایسی کشادہ جگہ نہ ملتی تو جہاز اور نہر دونوں کی کیا حالت ہوتی۔

ہم نے یہ بھی دیکھا کہ ان جگہوں پر کچھ رسیاں (TUGS) بھی تیار رہتی ہیں۔ کیوں کہ اگر کوئی جہاز خدانخواستہ کہیں خراب ہو جائے تو نہر کا راستہ بند ہو جائے تو آمد و رفت جہازوں کی بند ہو جائے تو کتنی دشواریاں ہو جائیں۔ ایسی حالت سے نپٹنے کے لیے رسیاں رہتی ہیں۔ یہ اتنی قوت رکھتی ہیں کہ خراب جہاز کو اپنے ساتھ باندھ کر اور اسے کھینچ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا سکتی ہیں۔

ایک گھنٹے کے بعد ہمارا جہاز پھر ٹھیک ہو گیا

اور پورٹ سعید کی طرف پھر چل پڑا۔ لیکن رفتار اس قدر سست کہ بھائی اب جی گھبرانے لگا ہے۔ حالانکہ جہاز برابر چل رہا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جہاز چل نہیں رہا ہے بلکہ ایک جگہ پر کھڑا ہے۔ پتہ چلا ہے کہ آج رات بھی یہی رفتار رہے گی اور کل صبح ۸ بجے تک شاید پورٹ سعید کے درشن ہو سکیں۔ سوئز نہر کو اب جی بھر کے دیکھ لیا ہے۔ کچھ تھک سے گئے ہیں۔ اب اس میں دلچسپی باقی نہیں رہی۔

ہاں جب کبھی کوئی بڑی جھیل آجاتی ہے اور اس میں کوئی دوسرا جہاز کھڑا ملتا ہے تو دلچسپی ضرور بڑھ جاتی ہے۔ اور ایسے جہاز کے دیکھنے کو تو بہت جی چاہتا ہے جس پر مسافر ہی مسافر ہوتے ہیں۔ تم ہی سوچو اس جہاز پر ہم صرف ۱۵ مسافر ہیں۔ سفر لمبا ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے اکتا گئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ بات چیت کرنے کو اور ساتھ رہنے کو کاش اور زیادہ لوگ ہوتے۔

ہاں ایک بات تو میں تمھیں بتانا بھول ہی گیا۔ جب ہمارا جہاز سوئز بندرگاہ پر رکا ہوا تھا تو اس وقت ہمارے جہاز پر کوئی مصری TRAVELLING AGENT آئے اور ہمیں مشورہ دینے لگے کہ ہم یہاں سوئز پر جہاز سے اتر جائیں اور سوئز سے پورٹ سعید تک کا سفر بس کے ذریعہ کریں۔

ہم نے پوچھا ہم ایسا کیوں کریں تو انھوں نے ہمیں سمجھایا کہ سوئز نہر کو پار کرنے میں ہمارے اس جہاز کو قریب ۱۴ گھنٹے لگیں گے۔ جہاز کی رفتار بہت سست ہوگی اور آپ جی اکتا جائے گا۔ راستہ میں کوئی خاص چیز بھی دیکھنے کو نہیں ملے گی۔ لیکن یہاں سے پورٹ سعید تک بس کے ذریعے سفر کرنے میں ہم آپ کو قاہرہ دکھائیں گے۔ یہ شہر دیکھنے کے قابل ہے اور مصر کا دار السلطنت ہے۔ اس کے علاوہ آس پاس بہت سی چیزیں قابلِ دید ہیں۔ کرایہ بھی سمجھو ہندوستانی سکے میں ۱۲۵ روپے کے قریب۔

ہم نے اس سلسلے میں کپتان صاحب سے مشورہ کیا تو انھوں نے اجازت دے دی اور ہمیں بتایا کہ اگر ہمارے پاس پورٹ میں مصر میں داخل ہونے کا اجازت نامہ ہے تو ہم جا سکتے ہیں۔ پورٹ سعید پر پھر جہاز پر سوار ہو سکتے ہیں۔

کپتان صاحب سے بات کرنے کے بعد ہم مسافروں نے آپس میں ایک میٹنگ کی اور میرے سوا دوسرے ساتھی اس خیال کے تھے کہ قاہرہ دیکھنے چلنا چاہیے۔ میں اس تجویز کے خلاف تھا۔ میری دلیل یہ تھی کہ مانا قاہرہ دیکھنے کے قابل ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا کہ پھر زندگی میں شاید ایسا موقع نہ ملے۔ اخراجات بھی اس سفر کے بہت کم ہیں۔ سوئز نہر میں جہاز کی رفتار دھیمی ہونے کی وجہ سے ہم سب بور بھی ہو جائیں گے لیکن خدا نخواستہ کسی بھی وجہ سے اگر ہم پورٹ سعید

وقت پر [illegible] سکے تو کیا ہوگا۔ جہاز ہمارا انتظار تو کرے گا نہیں۔ [illegible] چل دیا اور ہم پورٹ سعید ہی پر چھوڑ دیے گیے تو پھر امریکہ کیسے پہنچیں گے؟ خدا نہ کرے کہ ایسا ہو لیکن بس کا کیا بھروسا جیسی دہلی کی بسوں کا ہم حال جانتے ہیں کہیں راستہ میں بس فیل ہو گئی، کوئی ایکسیڈنیٹ ہو گیا تو ایسا خطرہ کیوں مول لیں۔ میری اس دلیل سے میرے ساتھی متفق نہ تھے لیکن مجھے اکیلا چھوڑ کر بھی وہ جانا نہیں چاہتے تھے اس لیے یہ سمجھو قاہرہ دیکھنے کی اسکیم فیل ہو گئی۔

آج ۱۶ ار جون ہے اور ہمیں بتایا گیا ہے کہ صبح ۸ یا ۹ بجے ہم پورٹ سعید پہنچ جائیں گے۔ یہ خبر سُن کر ہم سب کو بہت خوشی ہوئی کہ اب اس سست رفتاری سے جلد ہی نجات مل جائے گی ناشتے کے بعد ہم سب لوگ ڈیک پر چڑھ گیے۔ اور پورٹ سعید کا نظارہ کرنے کے لیے بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ آہستہ آہستہ پورٹ سعید کی عمارتیں اور بندرگاہ پر کھڑے جہاز قریب تر آنے لگے اور تھوڑی ہی دیر میں ہمیں پورٹ سعید کا ایک اچھا خاصہ خاکہ نظر آنے لگا۔ پورٹ سعید کے بندرگاہ پر جو خاص چیز ہمیں اس وقت دکھائی دے رہی ہے وہ ہے کسی مشہور کا مینار؛ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ پورٹ سعید اچھا خاصا شہر ہے اونچی اونچی اور پکی نئے طرز کی عمارتیں۔ صاف ستھری اور چوڑی سڑکیں۔ بازار وغیرہ سب اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ یہ بندرگاہ بھی کلکتہ اور بمبئی کے بندرگاہ سے کم نہیں ہے۔

جہاز چلتا چلتا رک گیا ہے پائلیٹ اور ڈاکٹر کا انتظار ہے وہ دیکھو دونوں موٹر بوٹیں ہمارے جہاز کی طرف آ رہی ہیں۔ ڈاکٹر پہلے جہاز پر چڑھ کر معائنہ کرے گا۔ بعد میں پائلیٹ ہمارے جہاز کو راستہ دکھاتا ہوا بندرگاہ تک لے جائے گا۔ یہ سب کارروائی چند منٹوں میں ہو گی اور اب ہم اس وقت پورٹ سعید پر آ کے کھڑے ہیں۔ جہاز پانی میں لنگر گرا رہا ہے۔ پہلے اس نے اپنا داہنا لنگر گرایا اور بعد میں اس نے بایاں گرایا۔

تم سوچتے ہو گے یہ لنگر کیا بلا ہے۔ تو سُنو یہ جہاز کے اگلے سرے پر مچھلی کے کانٹوں کی شکل سے ملتے جلتے بھاری بھاری (۱۰۰ من کے قریب) کانٹے ہوتے ہیں جنھیں لنگر کہتے ہیں۔ یہ لنگر بھاری بھاری لوہے کی زنجیروں سے بندھے ہوتے ہیں اور یہ زنجیریں بجلی کے موٹروں کے ذریعہ لنگروں کو ڈھیلا کر کے پانی میں گرا دیتی ہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے انھیں واپس اسی طریقہ سے اوپر کھینچ لیتی ہیں۔

ان لنگروں کا کام یہ ہوتا ہے کہ جہاز کو جہاں کھڑا کر دیا جائے وہاں سے ہلنے جلنے نہ دیں۔ اگر لنگر اس میں مدد نہ کریں تو ذرا سے ہلنے جلنے سے ایک جہاز دوسرے جہاز سے ٹکرا سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ

بغیر لنگر کے جہاز کھڑے ہونے پر کہیں سے کہیں بہہ کر جا سکتا ہے۔ ہوا کے جھونکوں سے یا پانی کی لہروں کی وجہ سے تیسرے یہ کہ جہاز بندرگاہ کی دیوار سے بھی ٹکرا کر خود اپنے کو اور بندرگاہ کی دیوار کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس لیے لنگر کا استعمال کیا جاتا ہے۔

ہم سب لوگ جہاز کی سست رفتاری سے اس قدر تھک گیے ہیں۔ اکتا گیے ہیں کہ کہیں جانے کو طبیعت ہی نہیں چاہتی میرا پروگرام یہ ہے کہ کھانا کھا کر ذرا آرام کیا جائے اور اس ڈایری کو پورا کیا جائے تاکہ میں اس ڈایری کو تمھیں یہاں سے بھیج سکوں۔ معلوم یہ ہوا کہ پورٹ سعید سے جو ہمارا جہاز چلے گا تو راستہ میں یہ پھر کہیں نہیں رکے گا۔ یہاں سے سیدھا بوسٹن (امریکہ) جا کر دم لے گا اس سفر کو طے کرنے میں قریب قریب ۱۱ یا ۱۲ دن لگیں گے، اس لیے جی چاہتا ہے کہ اس سفر کے اب تک کے حالات تمھیں لکھ بھیجوں تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے۔ تم جو یہ سمجھے بیٹھے ہو کہ زندگی چین سے کٹ رہی ہوگی۔ ایسا نہیں ہے۔ اس سفر میں بھی ہم پر وہی گذر رہی ہے۔ جیسی ہم ہندوستان میں ہوتے تو گزرتی۔ فرق صرف اتنا ہے امریکہ پہنچنے کی ایک لگن ضرور ہے۔ نہ جانے یہ لگن امریکہ پہنچنے کے بعد کیا صورت اختیار کرے۔ دعا کرو کہ ہم سب بخریت منزل مقصود پر پہنچ جائیں اور اللہ میاں ہمیں اپنے نیک ارادوں میں کامیاب فرمائے۔ آمین۔

اب آیندہ جو ڈایری تمھیں ملے گی وہ امریکہ سے ڈاک میں ڈالی جائے گی اس لیے کہ راستہ میں کوئی ڈاک روانہ نہ کی جا سکے گی اور وہ ڈائری انشاءاللہ آخری ہوگی۔ اس لیے کہ اس وقت تک دہلی سے نیویارک کا سفر خدا نے چاہا تو طے ہو چکا ہوگا۔

بچوں کی کوششیں

ایک بُرے لڑکے کا بُرا نتیجہ

صابی نام کا تھا اک لڑکا   شوق سے جو گلی کھاتا تھا
باپ تھا اس کا جتنا اچھا   اتنا ہی وہ نالایق تھا
اک دن اس کا باپ یہ بولا   بیٹا مجھے پردیس ہے جانا
گھر میں تمھاری ماں ہے تنہا   دھیان ذرا بیمار کا رکھنا
سن کر صابی ہنس کر بولا   جب میں گھر میں ہوں پروا کیا
باپ سے خالی جب گھر پایا   جامے میں پھولا نہ سمایا
اک دن صبح سویرے اٹھا   ہاتھ بھی دھوئے منہ بھی دھویا
رات کا رکھا کھانا کھایا   ماں کو اس نے سوتا چھوڑا
میز سے پھر اک تالا اٹھایا   دھیرے دھیرے باہر آیا
ہولے سے دروازہ کھولا   چپکے چپکے تالا لگایا
اسلم، طارق، عذرا، اسنیٰ   سب کو لے کر شہر سے نکلا
جنگل میں اک شور مچایا   اس سے جھگڑا اس سے جھگڑا
اس کا ہر ساتھی چلایا   ہائے خدایا! ہائے خدایا
ایسے ایسے کھیل وہ کھیلا   اس کو مارا اس کو توڑا
شام کو جب وہ گھر کو لوٹا   دروازے کا تالا کھولا
اور جب اندر جاکر دیکھا   اپنی ماں کو مردہ پایا
چاروں طرف جب غور سے دیکھا   پھن کاڑھے اک سانپ کھڑا تھا
سانپ نے جب لڑکے کو دیکھا   اس کے پاؤں میں بھی کاٹا
اس نے ہائے کا نعرہ مارا   ماں کے پہلو میں دم توڑا

ہے تم کو اب یہ سمجھانا
تم اپنی ماں کو نہ ستانا

محمد عثمان وائی تمتی۔ مدرستہ الاصلاح اعظم گڑھ

ہمارا عزم

مٹا کر فرق دنیا سے   غریبی کا امیری کا
عمل کی روشنی لے کر   اسے جنت بناؤں گا
ابھی میں ایک بچہ ہوں   مگر پتلا ہوں ہمت کا
نہیں ڈرتا مصیبت سے   نہ ڈر ہے مجھ کو دشمن کا
ہے روشن شمع سے محفل   تو میں بھی شمع اک بن کر
اسی طرح میں دنیا سے   اندھیروں کو مٹاؤں گا

ظہیر فراق۔ روہتاسی

جھوٹ نہ بولو

خدا اس سے راضی نہ ہوگا کبھی
کہ جس کو ہے عادت بری جھوٹ کی

جو کوئی کرے جھوٹ کو اختیار
رہے گا نہ اس کا ذرا اعتبار

نہ ہو اس کی عزت وہ ہوگا حقیر
رہیں دور اس سے صغیر و کبیر

جہاں میں تو جھوٹا وہ کہلائے گا
قیامت کو دوزخ میں بھی جائے گا

نہیں جھوٹ سے سرخروئی کہیں
کوئی فائدہ اس سے ہوتا نہیں

محمد سلطان عبدالقوی
مدرسہ ثانوی جامونگر

سلام اے پرچمِ آزادی

آج یہ ہر طرف نور کا سا عالم کیوں چھایا ہوا ہے۔ در و دیوار پر روشنی ہے ... یہ صبح ہی صبح پرندوں نے کیسے نغمے چھیڑے ہیں .... یہ بچوں اور جوانوں کے چہرے کیسے کھلے ہوتے ہیں ... اور یہ بوڑھے چہروں کی جھریاں کیا کہتی نظر آتی ہیں .....؟

اوہ! آج پندرہ اگست ہے۔ جی ہاں پندرہ اگست دیس کے لوگوں کے پکے ارادے اور کوشش پیہم کا انعام ... ! آج آزادیِ ہند کو اکیس سال پورے ہو رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ہم صدیوں سے آزاد ہیں۔ حالانکہ دو سو سال کی غلامی کی زنجیروں کو ہم نے آج سے اکیس سال پہلے توڑ کر بھارت کو آزادی دلائی تھی۔ اور جب ہمارے ہر دل عزیز وزیرِ اعظم جواہر لال نہرو (جو آج ہمارے درمیان نہیں ہیں مگر جن کی یاد ہمیشہ ہمارے دلوں میں تازہ رہے گی) نے لال قلعہ پر ترنگا لہرایا تو لاکھوں بھارت واسیوں نے یک زبان ہو کر کہا

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

مگر اس ترنگے کو اونچا کرنے کا سہرا کس کے سر ہے .....؟ بھارت ماتا کو جو عظمت آج حاصل ہے وہ کس کی مرہونِ منت ہے .....؟ جب ہم آج کے دن چراغاں کرتے ہیں تو ان شہیدوں کی یادیں بھی ان روشن دیوں کے ساتھ دل میں جگمگانے لگتی ہیں جنہوں نے جلیانوالا باغ میں گولیوں کی برسات کے درمیان بھی انقلاب زندہ باد کے نعرے لگائے .... دیوں کی جھلملاتی لو میں اس باپو کی مسکراتی شکل آنکھوں میں پھر جاتی ہے جس نے "ہندوستان چھوڑ دو" تحریک چلائی۔ بھارت واسیوں کو سات سمندر پار کے حاکموں سے نجات دلانے کے لیے برت رکھا۔ جیل یاترائیں کیں — وہ آزاد — اور علی برادران یاد آجاتے ہیں جنھوں نے بھارت سے برطانیہ تک بلا خوف و خطر آزادی کے نعروں سے گونج پیدا کر دی۔ تلک اور بنرجی، دادا بھائی نوروجی مولانا آزاد، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے جنھوں نے رات دن کلفتیں اٹھائیں اور آخری دم تک — زندگی کی آخری سانسوں تک — صرف اسی لیے جدوجہد کی کہ وطن آزاد ہو۔ ان کے ساتھ دیس کے وہ لاکھوں گم نام لوگ جنھوں نے ان نامور شہید

ہستیوں [illegible] کا ہو گیا ہے۔ آزادی کے لیے جدوجہد کی ہے جن کے نام کو صفحاتِ تاریخ پر جگمگاتے نظر نہیں آتے مگر جن کے بغیر تاریخِ ہند نامکمل ہے۔ کیا ہم نیتا جی کو بھول سکتے ہیں جنھوں نے آزاد ہند فوج کو یہ ترانہ دیا ؎

قدم قدم بڑھائے جا خوشی کے گیت گائے جا
یہ زندگی ہے قوم کی تو قوم پر لٹائے جا

کیا ہم آزادی کے ان شہیدوں کو بھول سکتے ہیں جنھوں نے ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں خون کی ہولی کھیلی اور اپنی جانیں گنوائیں۔ آج کے دن آسمان پر چمکتے سورج کے چاروں طرف انھیں کے خون کی سرخی ہے جو ہمیں پکار پکار کر کہتی ہے کہ "ہمیں بھی یاد کر لو"۔ ۔ ۔ ہم جنھوں نے بھارت کی نیا کو طوفانوں سے نکال کر ساحل سے قریب کر دیا۔ آسمانِ ہند کے یہ چمکتے ہوئے ستارے، جب تک یہ دنیا قائم ہے اپنی جگمگاہٹ سے ملک کو روشن کرتے رہیں گے اور ان کے کارنامے ہمیشہ ہمارے جوانوں کو آزادی اور حبِ وطن کا سبق دیتے رہیں گے۔

یہ پندرہ اگست ہر سال آتی ہے۔ یہ مبارک دن آج بھی آیا ہے اور قیامت تک آتا رہے گا ــــ اور ہم کہیں گے

آزاد ہوا دیس غلامی سے ہمارا !
چمکا ہے بڑی شان سے بھارت کا ستارا

عزیزہ پٹیل
سوہالی پردہی

لچھمی پور کا بھوت

شامو آج وقت سے پہلے اسکول سے آگیا۔ لرزتا کانپتا جیسے کسی کو دیکھ کر ڈر گیا ہو۔ آتے ہی چارپائی پر لیٹ گیا۔ اسے سردی لگ رہی تھی۔ ماں نے رزائی اڑھائی اوپر سے لحاف ڈالا، اس کے اوپر سے کمبل۔ بڑی مشکل سے کپکپی بند ہوئی۔ اسے تیز بخار آگیا تھا۔

ماں نے سوچا ہو نہ ہو شامو نے لچھمی پور کا بھوت دیکھ لیا ہے، وہی جو برگد پر رہتا ہے۔ یہ پیڑ اسکول کے راستے میں پڑتا ہے۔ اس نے فوراً ٹونے ٹوٹکے شروع کر دیے۔ لوبان سلگایا، اگربتی جلائی، سرہانے تلوار رکھی دو تین دن یوں ہی گزر گئے۔ شامو کا بخار اتر جاتا تھا مگر دے کر پھر چڑھ آتا تھا۔

اسکول کے ماسٹر صاحب کو شامو کی بیماری کی خبر ملی۔ رحیم کو لے کر اس کے گھر آئے حال معلوم کیا اور پاس کے قصبے سے ڈاکٹر کو بلوایا۔ ڈاکٹر نے دوا دی، انجکشن دیا۔ کہیں ایک ہفتے میں شامو اسکول جانے کے قابل ہوا۔

کوئی دو ہفتے بعد گرام پنچایت میں اطلاع آئی کہ آج تیسرے پہر کو اس گاؤں میں ایک ڈاکٹر صاحب آرہے ہیں۔ ایک خاص بخار کے بارے میں باتیں بتائیں گے۔ آبادی میں ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا۔ تیسرے پہر تک سارا گاؤں چوپال میں اکٹھا ہو گیا۔ شامو کا باپ بھی تھا شامو بھی تھا، اس کی ماں بھی تھی۔ یہ سوچ رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کہیں اسی بخار کی باتیں نہیں بتائیں گے جو ابھی شامو کو چڑھ چکا ہے۔

اور ڈاکٹر صاحب نے سچ مچ وہی بات بتائی۔

انھوں نے کہا۔ سردی دے کر جو بخار آتا ہے اور جس میں
کپکپی پیدا ہوتی ہے اس کا نام ملیریا ہے۔ یہ دیس کے
گاؤں میں بہت پھیلتا ہے۔ گاؤں والے بھائی گاؤں کو
صاف ستھرا رکھیں تو اس بخار سے نجات مل جائے۔

انھوں نے کہا یہ بخار انافلیز مچھر کے کاٹنے سے
پھیلتا ہے۔ یہ مچھر کاٹتے وقت ملیریا کے جراثیم خون میں
داخل کر دیتا ہے۔ یہ جراثیم اکٹھا ہو کر خون کے لال دانوں
پر حملہ کر دیتے ہیں اور آدمی کو سردی لگ کر بخار آجاتا ہے۔

رامو نے کھڑے ہو کر پوچھا "تو ڈاکٹر صاحب
اس بخار سے بچنے کی بھی کوئی تدبیر ہے؟" ڈاکٹر صاحب
نے جواب دیا۔ اصل میں انافلیز مچھر کی مادہ کا اس بخار کے
پھیلانے میں بڑا ہاتھ ہے۔ یہ گاؤں کے ان گڑھوں میں رہتی
ہے جن میں پانی بھر جاتا ہے۔ تالابوں میں رہتی ہے جھیلوں میں
رہتی ہے، گندی جگہوں اور کوڑے کرکٹ میں رہتی ہے یہی
نہیں ان ٹوٹے برتنوں اور ٹین کے خالی ڈبوں میں بھی رہتی
ہے جن میں پانی بھر جاتا ہے۔

تو بھئی ٹوٹے برتن، خالی ڈبے گھر میں نہ رہنے
دیجیے۔ چھوٹے چھوٹے گڑھوں کو مٹی سے پاٹ دینا
چاہیے۔ بڑے گڑھوں یا تلیوں میں مٹی کا تیل ڈالنا
چاہیے تاکہ مچھر کے بچے سانس نہ لے سکیں اور مر جائیں۔
گھر میں مچھر ہوں تو گندھک اور نیم کی پتیوں کا دھواں
کیجیے، گاؤں کی نالیاں صاف رکھیے۔ ان میں پانی رکنے
نہ پائے۔ نالیاں پکی ہونی چاہئیں۔ رات کو سوتے وقت
بدن کے کھلے ہوئے حصوں پر کڑوا تیل یا اینٹی مسکیٹو
کریم مل لیجیے مچھر قریب نہ آئیں گے۔ گھر کے دروازوں
پر باریک جالی یا چق لگوائیے۔ ملیریا کے زمانے میں کبھی
کبھی کونین یا پیلوڈرین کھائیے۔ اور ہاں مچھروں کو مارنے
کے لیے ڈی ڈی ٹی چھڑکوائیے۔

گاؤں کے لوگ اس موذی بخار سے تنگ
آگئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر سے ان میں بڑا جوش
پیدا ہو گیا۔ دوسرے ہی دن سے گاؤں کی صفائی شروع
ہو گئی۔ گڑھے پاٹے گئے۔ پکی نالیاں بنائی گئیں۔ گرام پنچایت
کی مدد سے گھروں میں ڈی ڈی ٹی چھڑکوائی گئی۔ کوڑا کرکٹ
آبادی سے بہت دور ڈلوایا گیا۔ اس صفائی اور دوسری
احتیاطوں کی بدولت لچھمی پور کو ملیریا سے ہمیشہ کے لیے
نجات مل گئی۔

لچھمی پور میں برگد کا درخت اب بھی ہے پر اس کا بھوت
غائب ہو گیا ہے۔ شامو، کبیر اور رحیم جب بھی اس درخت
کے پاس سے گزرتے ہیں تو انھیں یہ بھوت یاد آجاتا ہے
اور وہ خوب قہقہے لگاتے ہیں۔

محمد یٰسین الدین کوثر۔

حلوے کی گٹھلی

یہ پڑھ کر ہر کوئی چونکے گا کہ حلوے میں اور گٹھلی!
ہوا یوں کہ شبرات کو جب حلوہ بنا تو سوچا کہ حلوے کی ٹکلی بنائی
جائے۔ مگر صحیح اندازہ نہ ہو سکا اس کی وجہ سے قوام میں زیادہ
سوجی پڑ گئی اور حلوہ ٹھیک سے نہ جما، بلکہ گانٹھیں سی پڑ گئیں۔ اس میں
اور پانی ڈالا تو وہ پتلا ہو گیا۔ جب ہم سب اس کو کھا رہے تھے تو میری چھوٹی
بہن (جو چار سال کی ہے) بولی "امی حلوہ میں گٹھلیاں بہت ہیں" اور
ان گانٹھوں کو وہ گٹھلیوں کی طرح تھوک رہی تھی۔

ناصر اشرف۔ درجہ پنجم۔ جامعہ نگر

آدھی ملاقات

"پیام تعلیم" کا ایک شمارہ شاید دو تین ماہ قبل
موصول ہوا تھا۔ میں شرمندہ ہوں کہ اس کی موصولی کی
اطلاع نہ دے سکا۔ برا نہ مانیے گا جناب!
بچوں کے لیے واقعی آپ ایک عمدہ دلچسپ
معیاری جریدہ شایع کر رہے ہیں۔ جس کے لیے آپ
مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اگر میں کسی طرح آپ کے کام
آسکوں تو حکم فرمائیں گے۔
امید ہے آپ بہ عافیت ہوں گے۔

ڈاکٹر کیول دھیر
میڈیکل آفیسر بے تو

اس ماہ کا پرچہ "پیام تعلیم" بہت اچھا اور بہت
دلچسپ ہے۔ اس پرچے میں مضمون پنچ تنتر کا شایع ہوا ہے۔
وہ بہت اچھا اور بہت دلچسپ ہے۔ اگر اسی طرح کے
مضمون شایع ہوتے رہے تو یہ پرچہ کافی ترقی اور بلندی
پر پہنچ جائے گا۔ انشاءاللہ۔

محمد نعیم اختر د شیر گھائی

حسب معمول پرچہ کا معیار بڑھتا ہی جا رہا ہے۔
صرف کتابت کی کچھ غلطیاں ملتی ہیں اگر پروف ریڈنگ
پر اور زیادہ توجہ دی جائے تو پرچہ بالکل بے عیب
ہو جائے۔ پچھلے شمارے میں ظ۔ صاحب کا مضمون
اور ترجمہ شدہ نظم بہت پسند آئی امید ہے وہ آیندہ بھی
ایسے ہی پیارے ترجمے پیش کریں گے۔ جناب بزمی بہاری
کی نظم بڑی اثر کن اور حقیقت آمیز ہے۔ ذاکر حسین نمبر
اور اسماعیل میرٹھی نمبر کے متعلق کیا فیصلہ ہوا۔

عبدالرحیم نشتر ــــــ کامٹی

کل محترم برق صاحب بہاری کے توسط سے
"پیام تعلیم" کا تازہ پرچہ باصرہ نواز ہوا۔ دل کو از حد سرور
حاصل ہوا۔ واقعی آپ کا رسالہ ہر اعتبار سے بہترین اور
کامیاب ہے اور بچوں کے لیے بیحد مفید۔ میری دلی دعا
ہے کہ خداوند کریم آپ کو سدا خوش و خرم رکھے اور "پیام تعلیم"
کو زیادہ سے زیادہ ترقی سے ہم کنار فرمائے۔ آمین

محمد قیام الدین ساقی غوث پوری
لائبریری انجمن نونہال محلہ بسار بگہہ

جیسے ہی بک اسٹال پر پہنچا کیا دیکھتا ہوں ہر
طرف "پیام تعلیم" بکھرا لیکن سوا ہوا پھولوں کے درمیان رکھا
میں اتنی بھاری پرچوں کی تعداد دیکھ کر دنگ رہ گیا اور
مالک سے دریافت کیا سب کاپیاں فروخت ہو جاتی
ہیں۔ اس نے کہا۔ ابھی اور مانگ ہوتی ہے یہ ساری
کاپیاں تو بس گھنٹوں میں ہوا سے باتیں کرنے لگتی ہیں
اور سچ ہے میں نے تقریباً آدھ گھنٹہ کھڑے ہو کر تماشہ

کیا اور مالک کا کہنا سچ نکلا کیونکہ آدھ گھنٹے میں آدھی سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوچکی تھیں ہر گاہک آتا اور صرف یہ کہتا ـــــ اجی ذرا پیام تعلیم تو دینا! اور قیمت دے کر الٹے پاؤں واپس ہوجاتا۔ دلی مبارکباد۔

خیال انصاری۔ مالیگاؤں

مجھے افسوس ہے کہ سالنامے کے بارے میں کچھ نہ لکھ سکا معذرت خواہ ہوں۔ سالنامے کو آپ نے امید سے زیادہ خوبصورت بناکر پیش کیا ہے۔ کتابت۔ طباعت۔ گٹ اپ۔ نظمیں کہانیاں اور دوسری دلچسپیاں مضامین بڑے متنوع اور رنگا رنگ تھے۔

جون ۶۷ء کا تازہ شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے اس میں بھی اچھی کہانیوں اور اچھی نظموں کی کمی نہیں ہے۔ خدا کرے "پیام تعلیم" قدم بہ قدم اسی طرح آگے بڑھتا رہے۔

فوق فاروقی۔ بھوپال

جون کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ حسن طباعت و رنگ کتابت کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ فن ترتیب و تزئین جامعہ کا اپنا حصہ ہے۔ سرورق کی تصویر ایک ایسی پرخلوص و پروقار ہستی کی ہے جس کی ذات پر آج نونہالان ہند جتنا بھی ناز کریں کم ہے۔ یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ ادارہ "پیام تعلیم" اس عظیم شخصیت کے متعلق ایک خاص نمبر بطور خراج عقیدت پیش کر رہا ہے۔ مجھے امید ہے یہ نمبر اپنی انفرادیت کا واحد شمارہ ثابت ہوگا۔

حالیہ شمارہ کے تمام [illegible] خوشنما دلچسپ و کارآمد ہیں۔ خصوصاً بزمی صاحب کی نظم "تقاضا" تو بڑی درد انگیز و رقت آمیز ہے۔ ظ۔ انصاری اور ربانی صاحبان کی تخلیقات نے بھی گہرا اثر چھوڑا ـــــ ادھر پرچے کچھ تاخیر سے نکل رہے ہیں۔ خیال رکھیے گا۔

اطہر عزیز (کٹک)

آج جون کا "پیام تعلیم" ملا۔ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیوں میں ہیبت ناکی کا بدلہ۔ جبر و ضرب کی ایک کہانی۔ برائی کا بدلہ بہت زیادہ پسند آئیں اور نظم میں تقاضا، ساجن کے گھر چلی بندریا، دل کی آواز بہت پسند آیا۔ ان سب ہی کو میری طرف سے دلی مبارکباد عرض ہے ـــــ سید ظفر آفتاب حسین۔ لال باغ۔ دربھنگہ

رسالہ (جولائی ۶۷ء) اپنی پہلی فرصت میں پڑھ ڈالا۔ مجھے نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے، اس رسالہ میں دو ایک مضمون دوسرے رسالوں کے چربے ہیں۔ جیسے کیف احمد صاحب صدیقی کی نظم "جرم" محمد آبادی کی نظم کا چربہ ہے جو دہلی کے رسالہ "کھلونے" میں چھپ چکی ہے۔ اور بچوں کی کوششوں میں ایک مضمون "نیلام" بھی کھلونا دہلی ۵۷ء سے لیا ہے۔ مجھے دلی صدمہ ہے کہ صرف اپنے نام کی خاطر ایسی چھوری حرکتیں ہوتی ہیں۔ میں چند ماہ سے آپ کے آرٹسٹ کو کچھ دبا دبا سا پا رہا ہوں اس رسالہ میں بھی آرٹسٹ نے کچھ تھکے دماغ سے کام لیا ہے۔ جہانگیر احمد شاہین ـــــ بریلی

قلمی دوستی

نام ۔ عارف خان ۔ عمر ۱۶ سال
مشغلہ ۔ خط و کتابت سے دلچسپی ۔ انگلش ریکارڈنگ کرنا اور تمام میگزینوں کو پڑھنا۔
پتہ ۔ عارف خان ۔ ۱۳۱۵ ایم ایم جامع مسجد دہلی ۶

نام ۔ محمد اعظم ۔ عمر ۱۳ سال
دلچسپی ۔ حساب کے سوال حل کرنا ۔ سائیکل چلانا ٹکٹ جمع کرنا۔
پتہ ۔ معرفت محمد قاسم میسرز ٹنگزوے ایس ایس روڈ گوہاٹی ۔ آسام ۱

نام ۔ محب الحق رحمانی ۔ عمر ۱۶ سال (خریداری نمبر ۹۳۳)
مشغلے ۔ درسی کتابوں کے علاوہ مذہبی اور معلوماتی کتابیں پڑھنا۔ قلمی دوستی کرنا۔ ادبی پروگراموں میں شرکت کرنا۔
پتہ ۔ معرفت پرواز بک ڈپو ۔ جامع مسجد بلگرٹ ۔ ضلع آکولہ (مہاراشٹر)

نام ۔ خورشید حسن خان ۔ عمر ۱۳ سال
شغل ۔ ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا ۔ پیام تعلیم پڑھنا
صبح کو ٹہلنے جانا۔
پتہ ۔ محلہ بازوزئی دوم ۔ شاہ جہاں پور (یو۔ پی)

نام ۔ اقبال احمد خاں ۔ عمر ۱۲ سال
مشغلہ ۔ کورس کی کتابیں پڑھنا ۔ قلمی دوستی کرنا ۔ پیام تعلیم پڑھنا ۔
پتہ ۔ ہمدرد لائبریری محلہ چوکھنڈی سہسرام ۔ شاہ آباد ۔ بہار ۔

نام ۔ احمد تبسم ۔ عمر ۱۵ سال ۔
مشغلے ۔ افسانہ و کہانی پڑھنا ۔ قلمی دوستی ۔ رسالہ و اخبار پڑھنا اور ایک اچھے دوست کی تلاش ۔
پتہ ۔ احمد تبسم معرفت قمر جمیل محلہ چوکھنڈی سہسرام ۔ شاہ آباد

نام ۔ سید شوکت علی ۔ عمر ۱۵ سال
مشغلے ۔ قلمی دوستی قایم کرنا ۔ نماز پڑھنا ۔ پیام تعلیم کا بغور مطالعہ کرنا ۔ جماعت میں اول آنا وغیرہ ۔
پتہ ۔ معرفت سید قاسم نیوز پیپرس ایجنٹ اچل پور شہر ۔ ضلع امراؤتی (برار)

نام ۔ محمد عالم ۔ عمر ۱۴ سال
مشغلہ ۔ فٹ بال کرکٹ وغیرہ کھیلنا
پتہ ۔ ۴۰ مہاتما گاندھی روڈ کلکتہ

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

جناب۔ ایم۔ وائی کھتری۔

مہاراشٹر ایس، ایس۔ سی بورڈ کا شاندار نتیجہ

اس مرتبہ مہاراشٹر ایس، ایس، سی کے امتحان میں ایک لاکھ ۷۴ ہزار ۴۴۳ طلباء نے شرکت کی۔ نتیجہ ۸۶۹۵ ۴ رہا۔ بمبئی کے کنگ جارج انگلش ہائی اسکول کے طالب علم پائی گریش اپیندر نے ۸۰۰ میں سے ۶۹۴ نمبر حاصل کیے اور تمام طلباء میں اول رہے۔

اُردو کا پہلا انعام (مبلغ ایک سو روپے)، انجمن خیر الاسلام گرلس ہائی اسکول مدنپورہ بمبئی ۸ کی سلمیٰ عبدالعلی بی نے حاصل کیا۔

اُردو کا دوسرا انعام انجمن اسلام گرلس ہائی اسکول بائیکلہ، بمبئی ۸ کی عابدی معراج بی نے حاصل کیا۔ دوسرا انعام پچاس روپے کا تھا۔

فرنچ کا پہلا انعام (مبلغ ایک سو روپے) جہانگیر پیٹیٹ ہائی اسکول فور گرلس، فورٹ، بمبئی نمبر کی چن والا عصمت بی نے حاصل کیا۔ اسی زبان کا دوسرا انعام (مبلغ پچاس روپے) سینٹ جوزف ہائی اسکول عمر کھاڑی، بمبئی نمبر کی زہرہ بی نے حاصل کیا۔

عربی کا پہلا انعام (مبلغ ایک سو روپے) سر حاجی امیر صاحب ہائی اسکول بیوڑی کے دیوکر ناظم احمد زبلی صاحب نے حاصل کیا۔

فارسی کا پہلا انعام (مبلغ ایک سو روپے) سر جے جے فورٹ بوائز ہائی اسکول فورٹ، بمبئی کے کلستری مہربان رستم نے حاصل کیا۔ اسی زبان کا دوسرا انعام (مبلغ پچاس روپے) جمہور ہائی اسکول، مالیگاؤں کے انصاری اقبال اور عبدالوہاب نے حاصل کیا۔

آرٹ کے مضمون کا پہلا انعام (مبلغ دو سو روپے) کنڈل ہائی اسکول، کنڈل، ضلع رتناگیری کے روفیکر عثمان غنی نجم الدین نے حاصل کیا۔

مراٹھی کے لیے رام گنیش گڈکری گولڈ میڈل پونا کی نلنی کرشنا راؤ نے حاصل کیا۔

فارسی کے لیے "جعفر قاسم ولسی گولڈ میڈل" جے جے فورٹ بوائز ہائی اسکول فورٹ جیراج بھائی پیر بھائی اسکالرشپ انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی کے کلستری مہربان رستم نے حاصل کیا۔

جیراج بھائی پیر بھائی اسکالرشپ انجمن اسلام ہائی اسکول، بمبئی کے شیخانی محمد صالح حاجی حسن نے حاصل کیا۔

آر۔ ایم سایانی لیجسلیٹیو اسکالرشپ سینٹ جوزف ہائی اسکول عمر کھاڑی، بمبئی کے بیجلی سلطان علی صدر الدین نے حاصل کیا۔

دی لارڈ سینڈ ہرسٹ اسکالرشپ

انجمن [illegible] ہائی اسکول، بوری بندر، بمبئی ۱ کے شہانی نور محمد [illegible] نے حاصل کیا۔

اے [illegible] عبدالحسین سنگا پوروالا اردو اسکالر شپ انجمن خیرالاسلام اردو گرلس ہائی اسکول، مدنپورہ بمبئی ۸ کی سلمیٰ عبدالعلی بی نے حاصل کیا۔

دی سر فرینک ساؤتھ اسکالر شپ برائے فارسی انجمن اسلام ہائی اسکول، بوری بندر، بمبئی ۱ کے انصاری برکت حسین عبدالرحیم نے حاصل کیا۔

اے. آر، دو باش گولڈن جوبلی میموریل پرائز (فرنچ)، جہانگیر پیٹیٹ ہائی اسکول فار گرلس فورٹ، بمبئی ۱ کی چی والا عصمت بی نے حاصل کیا۔

بزم ادب اینگلو اردو ہائی اسکول دھولیہ کا عظیم الشان جلسہ اور مشاعرہ

جشنِ مہاراشٹر کے موقع پر بزم ادب کی جانب سے ایک شاندار جلسہ تقسیم اسناد زیر صدارت جناب خورشید حسین مرزا صاحب منعقد ہوا۔ خصوصی مہمان کی حیثیت سے عبدالحمید الزبیری صاحب تشریف لائے تھے۔

مہمانوں کا استقبال جناب مفیدالدین صاحب نے کیا۔ بعد میں سکریٹری بزم ادب، نہال احمد صاحب نے اپنی سالانہ رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد عبدالحمید صاحب نے بزم کی آمدنی و اخراجات کا جائزہ پیش کیا۔

بزم ادب کے عہدے داران، نمائندگان اور طالبات و طلباء کو جنھوں نے اردو میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے تھے، جناب خورشید حسین مرزا صاحب نے انعامات اور اسناد دیں۔ تقریباً ۵۰ طالبات اور طلباء نے اسناد حاصل کیں۔ اس کے بعد مشاعرہ ہوا۔

پنویل میں جلسہ تقسیم انعامات

مورخہ ۲۰ رجون ۱۹۸۱ء کو پنویل میں مولانا آزاد لائبریری کی جانب سے ایک جلسہ تقسیم انعامات منعقد ہوا۔

جلسے کی صدارت جناب کردیکر صاحب (ہیڈ ماسٹر، اردو اسکول پنویل) نے فرمائی۔

جناب خطیب صاحب نے پہلی جماعت سے لے کر میٹرک تک کے اول اور دوم نمبر سے کامیاب ہونے والے طلباء کو انعامات تقسیم فرمائے۔

لائبریری کے سکریٹری جناب امیرالدین پٹیل نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیے۔

لائبریری کے صدر جناب محمد نور مسلا نے جلسے کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔

جناب ابراہیم ماسٹر، جناب عبدالغفار پٹیل، جناب ستار ملکوت، جناب اے. آر. پٹیل، جناب سرگرو نے تقریریں کیں اور منتظمین لائبریری کے اس کام کو سراہتے ہوئے ان سے اس طرح کے پروگرام ہمیشہ کرنے کی تلقین کی۔

آخر میں عمر خان دیشمکھ نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

جلسہ تقسیم انعامات

جنتا کالونی، مانخورد میونسپل اردو اسکول کے اوّل تا ہفتم ۲۴ جماعتوں کی طالبات اور طلبا جو اوّل دوم اور سوم نمبر سے کامیاب ہوئے۔ ان کی حوصلہ افزائی اور مزید تعلیمی ترقی کے لیے ۱۸ر جون ۱۹۷۷ء بروز اتوار شام ۵ بجے اردو ایجوکیشن سوسائٹی۔ جنتا کالونی بلاک نمبر ۹ کے زیر اہتمام ایک عظیم الشان جلسہ تقسیم انعامات بمقام جھولا میدان منعقد ہوا۔

جلسہ کی صدارت جناب شام کشن نگم دہلوی نے فرمائی اور افتتاح ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی صاحب نے کیا۔ جناب ایم۔ وائی تاجی، جناب غلام احمد آرزو، جناب ابراہیم فطرت، جناب خواجہ غلام جیلانی اور جناب انور اشفاق صاحب نے تقریریں کیں۔

مہمانانِ خصوصی کے حیثیت سے جناب خلش جعفری، جناب محمد یاوا، جناب الحاج زکریا اکاڈی ج۔ پی، جناب جانسن جیکب میونسپل کونسلر نے شرکت فرمائی۔

شعراء حضرات میں مرزا عزیز جاوید، غنی گوالیاری، شکیب بنارسی، ثاقب عظیمی، کلیمی شولاپوری اور تاصب گلبرگوی تشریف رکھتے تھے۔

انعامات کی تقسیم میونسپل کارپوریشن کے سابق ایجوکیشن چیرمین ڈاکٹر علی محمد آزاد صاحب نے فرمائی۔

امینیہ ہائی اسکول و اسکوڈ اگاما دگوآ کا سالانہ جشن

(از سکریٹری بزم ادب امینیہ ہائی اسکول)

گوآ میں یہ پہلا اسکول جس میں اردو میں پڑھائی ہوتی ہے اور جو ترقی کرتے کرتے اب ہائی اسکول بن گیا ہے۔ ۲۲ر مارچ شام کے تقریباً ۶ بجے اسکول کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا۔ یہ اسکول کی تاریخ میں پہلا سالانہ جلسہ ہے۔ اس جلسہ کی صدارت جناب وائی۔ ڈی جوشی صاحب نے کی۔ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب ڈاکٹر احمد صاحب (دہلی) نے مجلس کی رونق بخشی۔ انھی نے انعام تقسیم کیے۔

انفرادی چمپین شپ لڑکوں میں چاند خان متعلم ہفتم (آزاد ہاؤس) نے اور لڑکیوں میں خورشیدہ بیگم متعلم ہفتم (ٹیپو ہاؤس) نے حاصل کی۔ جنرل چامپین شپ آزاد ہاؤس نے حاصل کی۔ ٹیپو ہاؤس دوسرے نمبر پر رہا۔ اقبال ہاؤس تیسرے نمبر پر۔

ابراہیم خان متعلم دہم اور امینہ بی متعلمہ ہشتم کو بہترین طالب علم اور بہترین طالبہ کا امتیاز بخشا گیا۔ میدانِ شعر و سخن آزاد ہاؤس نے مارا۔ اور تقریر و خطابت کا میدان اقبال ہاؤس کے ہاتھ رہا۔

تقریر میں اول نمبر پر محمد شفیع متعلم ... اقبال ہاؤس آئے۔ تحریری مقابلے میں عبدالشکور متعلم دہم (آزاد ہاؤس) اول نمبر آئے۔

بقیہ ص ۲ پر

اِدھر اُدھر سے

ننھے انگلستانی آرٹسٹ انڈیا ہاؤس لنڈن میں۔

پچھلی ۲۰ مئی (۱۹۶۰ء) کو انڈیا ہاؤس لندن میں ایک دلچسپ تقریب منائی گئی۔ اس میں تمام انگلستان کے ہونہار آرٹسٹ جمع ہوئے جنھوں نے شنکر ویکلی دہلی کے آرٹ انٹرنیشنل بالمثنی مقابلے (۱۹۵۹ء) میں حصہ لیا تھا اور ان کی بنائی ہوئی تصویریں انعام کی مستحق قرار پائی تھیں۔ چار سال سے لے کر پندرہ سال کی عمر تک کے آرٹسٹوں نے اس مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ قائم مقام ہائی کمشنر کی بیوی مسز بی۔ این چٹرجی نے انعام تقسیم کیے۔

انعام پانے والوں میں سے ایک مارگریٹ ڈوروتھی وان ہوک چار سال سے مسلسل انعام حاصل کر رہا ہے۔

ان بچوں نے انڈیا ہاؤس میں تصویروں کی نمائش دیکھی اور انھیں ہندوستان کے جنگلی جانوروں کی فلم بھی دکھائی گئی۔

(پی۔ آئی۔ ایس)

شطرنج کی پانچ سالہ ماہر

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے شمالی سرحدی شہر فلینس برگ کی ایک پانچ سالہ لڑکی یوٹا ہیپل کو شطرنج کھیلنے میں غیر معمولی مہارت حاصل ہے۔ پچھلے دنوں فلینس بورگ کے قریب گلکس بورگ کے تاریخی قصبے میں شطرنج کے مقابلوں کا ایک یادگار ہفتہ منعقد ہوا تو اس ننھی بچی کی خداداد قابلیت نے دیکھنے والوں کو ششدر کر دیا۔ اس بچی کے مقابلے میں برلن کے بانس یوا ہیم ہینٹ جیسا مشہور جرمن چیمپین کھیل رہا تھا اور وہ ڈٹ کے ان کا مقابلہ کرتی رہی کہیں بیالیس چالوں کے بعد اسے ہار ماننی پڑ گئی۔ پھر بھی ایسا لگتا تھا کہ یوٹا سے کہیں زیادہ ہینٹ صاحب کو تھکنا پڑا تھا۔ یوٹا نے ہینٹ صاحب کو پانچ سال بعد پھر ایک مرتبہ اپنے ساتھ شطرنج کھیلنے کی دعوت دی ہے۔

(اطلاعات جرمنی)

پانچ برس کی عمر میں پڑھائی

میونخ کے مشہور ماہر نفسیات پروفیسر لوکرٹ نے کہا ہے کہ بچے کو پانچ سال کی عمر سے پہلے ہی پڑھنا لکھنا اور حساب سکھانے کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ ان کا کہنا ہے کہ پانچ سال کا بچہ ہر بات سیکھنے کی کوشش میں رہتا ہے اور اس کی قدرتی خواہش سے فائدہ اٹھا کر اس کی ذہنی صلاحیتوں کو فروغ دیا جانا چاہیے۔

ان کا یقین ہے کہ ابتدائی مرحلے پر پڑھائی شروع کر دینے سے بچہ اسکول میں جلد ترقی کر سکے گا۔

(یو۔پی۔ایس)

واشنگٹن میں پتنگ بازی

ہمارے دلّی، لکھنو اور یوپی کے دوسرے شہروں میں پتنگ بازی کا وہ زور شور نہیں جو اب سے ۲۵۔ ۳۰ برس پہلے نظر آتا تھا۔ پر آپ کو تعجب ہوگا کہ یہ شوق اب ہوتے ہوتے واشنگٹن تک پہنچ گیا ہے۔

ابھی پچھلے دنوں واشنگٹن میں اسمتھ یونین انسٹی ٹیوٹ نے پتنگ بازی کی پہلی تقریب منائی۔ اس دن واشنگٹن کی سرکاری عمارتوں اور واشنگٹن کی یادگار والی عمارتوں کے درمیان نہ جانے کتنی پتنگیں آسمان پر منڈلا رہی تھیں۔

اسمتھ یونین کی خلائی اور فضائی میوزیم کے اسسٹنٹ ڈائرکٹر پال گاربر کو بہت دنوں سے اس مشغلے سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ مشرقی ملکوں میں لگ بھگ ڈھائی ہزار سال پہلے پتنگیں لڑانے کا رواج غالباً پرندوں کو اڑتے دیکھ کر انسان کے دل میں پیدا ہوا۔ مشرقی یا ایشیائی ملکوں کے لوگ طرح طرح کی شکلوں کی پتنگیں بناتے تھے۔ اپنے اپنے ملکوں کے پرندوں کی۔ مچھلیوں کی، اژدھے کی

اور آدمی کی۔ بعض میں تو بانس کی سیٹیاں لگائی جاتی تھیں جو اوپر پہنچ کر زور سے بجتی تھیں۔

(ہفت روزہ انصاف بجانتی)

مسجد — جو دنیا کے انتہائی شمال میں واقع ہے۔

دنیا کے انتہائی شمال میں جو مسجد واقع ہے وہ لینن گراڈ میں ہے۔ یہ مسجد ۱۹۱۲ء میں ماہر فن تعمیر کریچنسکی کے مجوزہ ڈیزائن کے مطابق سمرقند کے مشہور گور امیر مسجد کے نمونے پر تعمیر کی گئی ہے۔ سمرقند کی یہ مسجد پندرھویں صدی میں تعمیر کی گئی تھی۔

اس مسجد میں گزشتہ ۵۵ برس سے عبادت کا سلسلہ جاری ہے صرف دوسری عالمی جنگ کے کٹھن زمانے میں، جب کہ فاشسٹ فوجوں نے لینن گراڈ کی ناکہ بندی کر دی تھی، عبادت نہیں کی جا سکی۔ جنگ کے بعد مسجد مسلمانوں کے لیے دوبارہ کھل گئی۔ لینن گراڈ اور اس کے مضافات میں ۳۰ ہزار مسلمان رہتے تھے۔

اکثر غیر ملکوں کے لوگ لینن گراڈ کی مسجد دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ حال ہی میں ہندوستان، پاکستان متحدہ عرب جمہوریہ یمن اور صومالیہ سے آئے ہوئے مسلمانوں نے بھی یہ مسجد دیکھی۔ اسلامی ملکوں کے طلبہ جو لینن گراڈ کے اعلیٰ تعلیم کے اسکولوں میں پڑھتے ہیں اس مسجد کو اکثر دیکھنے آتے ہیں۔

(فوٹو فیچر)

سگرٹ کی بلا

دہلی کی سرکار نے سگرٹ پر ڈیوٹی لگادی ہے۔ سگرٹوں کے دام بہت بڑھ گئے ہیں۔ سگرٹ پینے والے پریشان ہیں، بہت پریشان ہیں۔ سگرٹ ہو یا بیڑی یا سگار یہ سب انسان کی تندرستی کو گھن لگانے والی چیزیں ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے ڈاکٹر بڑے بڑے سائنس داں سگرٹ کے نقصان کے سلسلے میں تحقیقات کر رہے ہیں۔

ایک جرمن ڈاکٹر ایچ کلنش نے اپنے تحقیقاتی مضمون میں لکھا ہے کہ سگرٹ پینے سے دل کا کام بڑھ جاتا ہے جس کی وجہ سے خون کا دباؤ بھی بڑھ جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا کہ نصف سگرٹ پینے سے (جس کا دھواں باہر نکال دیا گیا ہو) دل کی حرکت میں ۲۰ حرکت فی دقیقہ کے حساب سے اضافہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک منٹ میں ۷۰ حرکتوں سے ۹۰ حرکتوں تک پہنچ جاتی ہے اور خون کا دباؤ تقریباً ۲۰ ملی میٹر بڑھ جاتا ہے۔ یہ تجربے اس وقت کیے گئے تھے جب سگرٹ پینے والا آرام کر رہا تھا۔ اگر سگرٹ پینے والا کوئی کام کر رہا ہو تو یہ نتائج بہت زیادہ بڑھ جاتے ہیں۔ یہ اثرات (حرکتِ قلب اور خون کے دباؤ پر) سگرٹ پینے کے تقریباً ۴ منٹ بعد ظاہر ہوتے ہیں۔ اور حرکتِ قلب اور خون کی رفتار تقریباً آدھ گھنٹے بعد اپنی اصلی حالت پر لوٹتی ہے۔ اس طرح ایک آدھا سگرٹ پینے سے دل کی حالت ایسی ہو جاتی ہے جیسی ۲ منٹ سائیکل چلانے کے بعد ہوتی ہے۔ کلنش کی رائے کے مطابق ایک دن میں ۲۰ سگرٹ پینے سے دل کی حرکت اتنی بڑھ جاتی ہے جتنی کہ گھنٹے لگاتار سائیکل چلانے سے ہوتی ہے۔

پروفیسر کلنش نے اس نظریے کی تردید کی کہ نکوٹین خون کی نبضوں کو سکیڑ دیتی ہے اور اس طرح سے حرکت قلب بند ہو جاتی ہے جسے ہارٹ اٹیک (HEART ATTACK) کہتے ہیں۔ لیکن اگر کسی دوسری وجہ سے دل کی اندرونی رگوں کو خون اچھی مقدار میں نہ پہنچتا ہو تو سگرٹ پینے سے اسے زیادہ کام کرنا پڑتا ہے۔ اسے کافی مقدار میں آکسیجن (اور اس لیے خون) کی ضرورت ہوتی ہے اور اس بنا پر وہ دھیما پڑ سکتا ہے اور پھر رک بھی سکتا ہے۔

(نیو سائنٹسٹ)

بقیہ تعلیمی سرگرمیاں..

مصوری میں احمد نجیب متعلم دہم (ڈیپو ہاؤس) نے پہلا نمبر حاصل کیا۔

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر احمد صاحب نے اپنی گرانقدر آراء سے نوازا اور اسکول کے انتظام کو سراہا۔ جناب وائی۔ ڈی چوگلے صاحب نے صدارتی تقریر میں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ ادارہ کے ہیڈ ماسٹر صاحب جناب ڈاکٹر اختر عالم صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

تقسیم اسناد و انعامات اور تقریروں کے فوراً بعد ایک تفریحی پروگرام پیش کیا گیا جو رات کے ۱۱ بجے تک جاری رہا۔ یہ تفریحی پروگرام امید سے بہت زیادہ کامیاب رہا۔ آخر میں ادارہ کی طرف سے ایک تائیل سونگ بعنوان "اے امینہ زندہ باد" پیش کیا گیا۔

راکٹ کا معائنہ : خلائی پرواز سے پہلے نوجوان انجینیر کے ہاتھوں

بچوں کے لئے مذہبی کتابیں
ارکان اسلام
مصنف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۲۵ نئے پیسے
عقائد اسلام
مصنف
مولانا اسلم جیراجپوری
قیمت
۵۰ نئے پیسے
آں حضرتؐ
مصنف
الیاس احمد مجیبی
نئے پیسے
سرکارِ دو عالم
محمد حسین حسان ڈیڑھ روپے
ہمارے رسول
مصنف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۸۰ نئے پیسے
ہمارے نبی
مصنف
سید نواب علی رضوی
قیمت: ۴۰ نئے پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی
نبیوں کے قصے
مصنف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت: ۸۰ نئے پیسے
مسلمان بیبیاں
مصنف
اعجاز الحق قدوسی
قیمت: ۵۰ نئے پیسے
رسول پاک
عبدالواحد سندھی ۱/۵۰
پاک کہانیاں
دو حصے
مرتبہ مقبول احمد سیوہاروی
قیمت
دو روپے ۱۰ نئے پیسے
چار یار
مصنف
الیاس احمد مجیبی
قیمت
ایک روپیہ ۳۰ نئے پیسے
خلفاء اربعہ
مصنف
خواجہ عبدالحئی فاروقی
قیمت
ایک روپیہ ۲۵ نئے پیسے

ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ

پیامِ تعلیم

دہلی

جلد ۴

اکتوبر ۱۹۶۸ء

شمارہ ۱۰

ایڈیٹر، محمد حسین حسان ندوی

آرٹسٹ، گلیڈون میسی

صدر دفتر

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جامعہ نگر۔ نئی دہلی

بمبئی آفس

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

پرنسس بلڈنگ جے جے اسپتال بمبئی

قیمت فی پرچہ

پیسے

قیمت سالانہ

چھ روپے

بچے ذاکر نمبر آپ کو کیسا لگا؟ ہمارے جامعہ نگر
کے حلقے میں تو اسے پسند کیا گیا، بہت زیادہ پسند کیا گیا۔

مگر بھئی اس کے شایع ہونے میں امید سے
بہت زیادہ دیر ہو گئی۔ اتنی دیر ہو گئی کہ آپ نے بیقرار
ہو کر خطوں کی بھرمار کر دی اور ہم اس نمبر کی تیاریوں
میں کچھ ایسے لگے رہے کہ بہت سے پیامیوں کو جواب
بھی نہ دے پائے۔

اس مرتبہ دیر کا سبب اللہ میاں کی رحمت بھی
تھی۔ کئی سال سے پورے دیس میں وہ جو کہتے ہیں
جم کر بارش نہیں ہوئی تھی، سو اس مرتبہ
اس کی پوری کسر نکل گئی۔ دلی میں تو اگست کا
پورا مہینہ اسی طرح گزر گیا۔ آسمان پر بادل چھائے
رہے۔ شاید ہی کبھی کبھار سورج نے اپنا چہرہ
دکھایا ہو۔ اگست تو اگست ستمبر کے دوسرے ہفتے
میں بھی یہی حال رہا۔

آپ شاید سوچتے ہوں بھلا بادلوں سے اس
دیر کا کیا تعلق! تو بھئی بات یہ ہے کہ پیام تعلیم کی
چھپائی جس طریقے یا سسٹم پر ہوتی ہے اس میں
سورج کی روشنی بنا کام نہیں چلتا۔ خوشنویس کی
لکھی ہوئی کاپیوں کا عکس اس روشنی کی بدولت
پلیٹوں پر آتا ہے اور پریس والوں کی اصطلاح
کے مطابق کاپیاں جمتی ہیں۔ سو اس روشنی کے لیے
ہمارے پریس والوں کی نظریں برابر آسمان ہی پر
لگی رہتی تھیں اور جوں ہی تک ذرا کے ذرا بھی
اپنا منہ دکھاتا تھا یہ فوراً اپنے کام میں لگ جاتے

بھی اس پریشانی میں چھپائی کا کام ہوا۔ پریس
نے چوکسی نہ دکھائی تو نہ جانے کتنی دیر اور لگتی۔

اچھا تو اب ہم "ذاکر نمبر" کے بارے میں
پ کی رائے کے منتظر ہیں۔ آپ نے رسالہ تو پڑھ
یا ہوگا تو بس اپنی جچی تلی رائے لکھ کر بھیج دیجیے۔
پ کو ہمارا اعلان تو یاد ہے نا؟ پیام تعلیم کے انھیں
فحوں میں ہم نے لکھا تھا: "جس پیامی کی رائے سب
ے زیادہ جچی تلی، سب سے زیادہ معقول ہوگی انعام
کے طور پر اس کے نام پیام تعلیم ایک سال کے لیے جاری کر دیا
جائے گا"

ذاکر نمبر کے سلسلے میں جو مضمون چھپنے سے رہ
گئے تھے وہ اس پرچے میں شائع کیے جا رہے ہیں کچھ مضمون
اگلے پرچوں میں آئیں گے۔

افسوس ہے کہ اپنے مستقل عنوان ہم ذاکر نمبر میں شامل
نہ کر سکے۔ ان کا سلسلہ اس پرچے سے پھر شروع کر رہے ہیں۔
اسکولوں کی تعلیمی سرگرمیوں کی رپورٹیں بڑی تعداد میں بہت سی
جمع ہو گئی ہیں۔ انھیں ہم تھوڑا تھوڑا کر کے شائع کریں گے
کھتری صاحب اور دوسرے حضرات مطمئن رہیں۔ علمی دوستی

وغیرہ بھی۔ دہلی سے نیو یارک والا مضمون ابوالکلام صاحب
وقت پر تیار نہ کر سکے۔ یہ آخری مضمون بہت دلچسپ ہے۔ اگلے
پرچے میں پڑھیے گا۔

ہمارا یہ پرچہ اور اگلے دو پرچے (نومبر، دسمبر ۷۶ء)
۴۸ صفحوں کے ہوں گے۔ ذاکر نمبر کی تیاری میں ہم نے بہت
خرچ کر ڈالا ہے۔ اس کفایت سے بوجھ کچھ کم ہو جائے
گا۔ پھر ہمیں سالنامہ بھی تو نکالنا ہے۔ اسی شان سے
بلکہ پچھلے سال سے بہتر ہی نکالنا ہے۔ پچھلا سالنامہ
تصویروں سمیت لگ بھگ دو سو صفحوں کا تھا۔

اس سالنامے کی تیاری ہم نے شروع بھی کر دی
ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہ ٹھیک وقت پر شائع ہو۔ یہ جبھی ممکن ہے
کہ ہمارے مضمون نگار حضرات اور شاعر حضرات ہمیں ٹھیک وقت
پر مضمون بھیج دیں۔ یہ سمجھیے کہ ۳۰ نومبر کے بعد جو مضمون یا نظم
ہمیں ملے گی اسے ہم سالنامے میں شائع نہ کر سکیں گے۔ اس سالنامے
کے بارے میں تفصیلی بات چیت ہم شاید اگلے پرچے میں کر سکیں۔

ٹھنڈی آگ کی آخری قسط شائع ہو رہی ہے اگلے پرچے
میں اسی طرح کی ایک اور کہانی کا سلسلہ شروع کیا جائے گا۔ اس کہانی کو
آپ نے بہت پسند کیا۔ ہماری اگلی کہانی بھی بہت دلچسپ ہوگی۔

جناب سعادت نظیر

میرا اسکول

میرا اسکول سب سے بہتر ہے
کتنا پیارا یہ علم کا گھر ہے!

موہنی ہے یہاں کی رعنائی
زندگی لے رہی ہے انگڑائی

یہ عمارت، یہ باغ، یہ میداں
یہ کتب خانہ، یہ ہنر کا جہاں

پھول سے چہرے اس میں ملتے ہیں
آرزو کے گلاب کھلتے ہیں

کس قدر ہونہار بچے ہیں
جھوٹے موتی نہیں یہ سچے ہیں

دیکھو ان میں کوئی جواہر ہے
کوئی آزاد کوئی ذاکر ہے

کوئی ٹیگور ہے کوئی اقبال
کیا کہوں کیسے کیسے ہیں یہ لال؟

وقت کیا چیز ہے؟ یہ جانتے ہیں
سچی باتوں کو دل سے مانتے ہیں

ان کے جوہر نکھرتے جاتے ہیں
نقش کیا کیا ابھرتے جاتے ہیں

کل یہی ہوں گے قوم کے معمار
ہر اندھیرے میں روشنی کے منار

یہ سبھا میرے ہونہاروں کی
خوش نما بزم ہے ستاروں کی

جو بھی ان میں ہے وہ مرا دل ہے
اپنی محفل میں شمعِ محفل ہے

تایا جان یوسف ناظم

قربان میاں کے کارنامے

قربان میاں میں اور چاہے ہزاروں برائیاں ہوں لیکن انھوں نے جھوٹ بولنے کی کبھی ہمت نہیں کی ہمت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قربان میاں نے جھوٹ بولنے کے بارے میں کبھی سوچا تک نہ تھا۔ یوں باتوں باتوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر کبھی کچھ کہہ دیا ہو تو کہہ دیا ہو۔ لیکن سچ مچ کا جھوٹ انھوں نے کبھی نہیں بولا —— انھیں خوامخواہ کا سچ کہنا بھی بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا۔ اسکول میں کسی بچے سے پٹ جائیں تو گھر میں جاکر ضرور سب سے کہیں گے کہ آج سلمان نے مجھے خوب ٹھوکا۔

اب سلمان ان سے کچھ نہیں تو دو سال چھوٹا ہوگا۔ قد میں، جسم میں، عمر میں، ہر چیز میں ان سے کم لیکن قربان میاں ان سے بھی پٹ جائیں گے۔ خیر پٹ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ ان سب کے سامنے اس واقعہ کا ضرور ذکر کریں گے۔ جنھوں نے انھیں پٹتے نہیں دیکھا —— ان کی بھی

کا کوئی واقعہ ہو چاہے وہ گھر میں ہوا ہو یا اسکول میں، بازار میں ہوا ہو یا کھیل کے میدان میں۔ قربان میاں ہر کسی کو سنائیں گے۔ ان کے دوست کمال کو قربان میاں کی اس عادت سے بڑی کوفت ہوتی۔ کیوں کہ کمال اس معاملے میں ان سے بالکل الگ تھا۔ بس کی کیو توڑ کر آگے نکلنے کی کوشش کرے گا اور ہر شخص کی ڈانٹ کھائے گا۔ لیکن اسکول میں ہمیشہ دوستوں سے کہے گا —— "آج کیا مزا آیا! میں بس کی کیو میں سب سے پیچھے تھا اور اگر دو تین بسیں بھی آجاتیں تو بھی میرا نمبر نہ لگتا لیکن میں پہلی ہی بس میں سوار ہوگیا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلا۔ ایک دو آدمیوں نے دیکھا۔ وہ چیخے چلائے بھی لیکن جب تک بس ہوا ہو چکی تھی۔"

اپنے گھر پر بھی بھائی بہنوں پر وہ رعب جماتا رہتا۔ کبھی یہ بات کبھی وہ بات لیکن سب کو معلوم تھا کہ کمال کے ساتھ اصل میں ہوتا کیا ہے اور وہ کرتا کیا

ہے۔ بڑی بڑی باتیں کرنے پر کمال کو اکثر منہ کی کھانی پڑتی۔ لیکن وہ عادت سے مجبور تھا۔ بس اسی نے قربان میاں کو ورغلانا شروع کیا۔ وہ ہمیشہ ان سے کہتا قربان میاں یہ کیا ناسمجھا حرکت ہے۔ جب دیکھو تم اپنا مذاق اُڑواتے ہو ——— میاں دوستوں میں اور بھائی بہنوں میں اپنا سر اونچا رکھنا ہے تو کبھی اپنی ہنسی کی بات نہ کیا کرو۔ سب کے سامنے یہ کہا کرو کہ تم نے آج یہ کارنامہ کیا کل وہ ہنگامہ کیا۔ تم اگر ہمیشہ سب کے سامنے یہی کہتے رہے کہ تم کو آج اس معاملے میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا یا اس معاملے میں تم کسی کے پیچھے رہ گئے تو تمھاری کوئی عزت نہ رہ جائے گی اور سب لوگ یہی سمجھیں گے کہ قربان میاں بس یونہی سے آدمی ہیں۔" قربان میاں کمال کی چکنی چپڑی باتوں میں آگئے اور انھوں نے سوچا کیوں نہ میں بھی اسی کی طرح باتیں بنانے کی کوشش کروں کسی کو نقصان پہنچے گا نہیں اور میری عزت ہو گی۔ قربان میاں نے بڑائی ہانکنے کا پروگرام تو بنا لیا۔ لیکن تم جانتے ہو قربان میاں کوئی کام کرنا چاہیں اور وہ ان سے ٹھیک سے ہو سکے ایک تو انھیں جھوٹ بولنے کی عادت نہیں دوسرے ان کا الٹا دماغ کس بات کو کس کے سامنے کیسے بگھارنی چاہیے۔ انھیں اتنا اندازہ نہیں بس کمال کی بات ان کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ بڑی بڑی باتیں کرنی چاہیے لیکن کیا باتیں کرنی چاہیں انھیں کچھ نہیں معلوم۔ بہر حال اپنی عقل کے مطابق رات بھر انھوں نے شیخی کا پروگرام بنایا اور دوسرے دن ناشتے پر جب گھر کے سب لوگ جمع تھے قربان میاں نے یوں بات چھیڑی۔

"ابا جی۔ کل میرے ساتھ اسکول میں بڑا واقعہ ہو گیا۔" قربان میاں کا یہ اعلان سن کر سبھی ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ابا میاں نے پوچھا "کیا واقعہ ہو گیا۔ تمھارے ساتھ۔ کیا پھر کسی سے پٹ گئے؟" قربان میاں نے کہا "نہیں ابا جان اب کے میں نے ہی پیٹ دیا۔"

امی:۔ کس کو پیٹ دیا تم نے۔ کیا اسکول میں کوئی بلی کا بچہ گھس آیا تھا۔

قربان میاں:۔ امی! کیا میں اتنا گیا گذرا ہوں کہ کسی کو پیٹ نہیں سکتا۔

امی:۔ ارے تو بتاؤ نا وہ کون غریب تھا جس پر تم نے ہاتھ صاف کیا۔

قربان میاں:۔ امی لیکن پہل میں نے نہیں کی۔ شروعات انھیں کی طرف سے ہوئی تھی۔ پہلے تو انھوں نے مجھے ڈانٹا اور جب میں نے کہا آپ ڈانٹتے کیوں ہیں تو انھیں نے مجھے طمانچہ مار دیا۔

امی:۔ یہ کس کا ذکر کر رہے ہو تم۔

قربان میاں:۔ وہی تو بتانے والا ہوں۔

جب انھوں نے طمانچہ مارا تو پھر میں کیوں چپ بیٹھتا
میں نے پہلے تو ان کی چھتری چھین لی اور پھر اسی چھتری
سے ان کی پیٹھ پر نشان بنا دیے۔ وہ تو اچھا ہوا ہمارے
اسکول کا چپراسی ان کی مدد کو آگیا ورنہ میں تو چھتری ٹوٹنے
تک مارتا رہتا۔

ابا۔ (غصے سے) قربان میاں کیا بک رہے
ہو تم۔ چھتری سے تم نے کس کو پیٹ دیا۔ تم اسکول
میں پڑھنے جاتے ہو یا فری اسٹائل کشتی لڑنے۔ بتاؤ
کس سے لڑائی ہوئی تمھاری؟

قربان میاں نے پہلے تو طے نہیں کیا
تھا کہ کس کا نام لیں گے۔ ابا کو غصے میں دیکھ کر ان
کے اوسان اور خطا ہو گیے۔ بس ہکلانے لگے۔

قربان میاں:۔ جی جی — نہیں ابا میاں
— ہوا یہ کہ ......

ابا میاں۔ ارے بولتے کیوں نہیں۔ کیا
ہوا۔ صبح صبح حماقت کی باتیں شروع کر دیں اس
لڑکے نے۔ بتاؤ نا کس سے جھگڑا ہو گیا۔

قربان میاں۔ (گھبرا کر)۔ جی ابا۔ وہ
ہیڈ ماسٹر صاحب۔ ....

ابا میاں۔ ارے نالائق تم نے اپنے
ہیڈ ماسٹر کو مارا۔؟

قربان میاں۔ جی نہیں ابا میاں۔ میں۔
میں یہ کہہ رہا تھا۔

ابا میاں۔ اب اور کیا کہنے کو رہ گیا ہے۔
تمھارا تو نام بھی اسکول سے خارج کر دیا گیا ہوگا۔

ابا میاں یہ سمجھ کر کہ قربان میاں نے واقعی
اپنے ہیڈ ماسٹر صاحب کی گت بنا دی، غصے میں
ناشتہ چھوڑ کر اٹھ گئے۔ اور پھر امی، باجی اور
بھیا نے قربان میاں کی وہ خبر لی کہ ان کے آنسو نکل
پڑے۔ اور قربان میاں نے جب یہ کہا کہ میں یونہی
کہہ رہا تھا تو ان پر اور ڈانٹ پڑی کہ بیوقوفی کی
بھی کوئی حد ہوتی ہے۔

قربان میاں کو شیخی بگھارنا بہت مہنگا پڑا۔

جناب شفیق [illegible]

ٹھنڈی آگ

(آخری قسط)

شمیم نے فوراً جیب سے ریوالور نکال لیا اور نشانہ لیتے ہوئے بولا "جاؤ اٹھالو میں مار دیتا ہوں۔"

ظفر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا "گولی مت مارو، زندہ پکڑوں گا۔"

"پاگل ہوئے ہو زندہ کیسے پکڑو گے؟"

"تم یہ جال لے لو، بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ اس وقت سناٹا ہے اس لیے بے فکری سے بیٹھی ہے تم اس طرف سے جال لے کر جاؤ۔ میں اس طرف سے جاتا ہوں قبر کے نزدیک پہنچ کر اس پر جال پھینک دینا میں پکڑ لوں گا۔"

شمیم بھی تیار ہو گیا۔ دونوں محتاط قدموں سے قبر کے نزدیک چلے گئے۔ چڑیا اب بھی ویسے ہی بیٹھی ہوئی تھی شمیم نے اس پر جال ڈال دیا ظفر نے فوراً اسے پکڑ لیا۔ لیکن پکڑنا تھا کہ ایک زوردار دھماکے کے ساتھ چڑیا کے چیتھڑے اڑ گئے اور اس میں سے دھواں نکل کر اتنی تیزی سے پھیلا کہ انھیں بھاگنے کا موقع ہی نہ ملا۔ دھوئیں میں عجیب سی مہک تھی جس سے ان کا دم گھٹنے لگا۔ پھر انھیں کچھ یاد نہیں لہرا کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔

جب ان کی آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو ایک کمرے میں پایا۔ لیکن وہ کمرہ ان کا نہیں تھا۔ اس کمرے میں

فرنیچر قسم کی کوئی چیز نہیں تھی۔ وہ دونوں کھردری
زمین پر پڑے ہوئے تھے۔

شمیم نے اٹھ کر دروازے پر زور آزمائی کی
لیکن وہ اتنا کمزور نہیں تھا جسے شمیم جیسے لڑکے
توڑ دیں۔ کسی طرف سے باہر نکلنے کا راستہ نہیں
تھا۔ کمرے میں صرف ایک روشن دان تھا جو زمین
سے کافی اوپر تھا۔ اس کے علاوہ اس میں موٹی
موٹی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں ایک لیمپ
روشن تھا۔ جس کی زرد روشنی کمرہ میں بڑی بھیانک
لگ رہی تھی۔

"ظفر۔ معلوم ہوتا ہے کہ رات ہو گئی۔ ہم
لوگ جب بے ہوش ہوئے تھے۔ اس وقت تو ایک
بجا تھا" ابھی وہ اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ باہر قدموں کی
چاپ سنائی دی۔ پھر دروازے کے کواڑ میں کنجی
لگنے کی آواز ہوئی۔ دروازہ کھل گیا۔ دو نقاب پوش
کمرے میں داخل ہوئے۔ ان میں ایک کے ہاتھ
میں پستول تھا۔ جس کا رخ دونوں کی طرف تھا۔

"یہی دونوں ہیں سردار" ریوالور والے
نے دوسرے سے کہا۔

سردار کی آنکھیں نقاب کے اندر انھیں
گھور رہی تھیں۔ "میں نے تم لوگوں کو منع کیا تھا کہ
میرے راستے میں نہ آؤ۔ لیکن تم نہیں مانے تم لوگ
ابھی بچے ہو، کھیلنے کودنے کے دن ہیں۔ اس چکر
میں کہاں پھنس گئے ہو۔ نہ جانے کیوں مجھے تم لوگوں
پر ترس آرہا ہے۔ نہیں تو یہاں سے تمھاری لاش
ہی باہر جاتی۔ اس بار چھوڑ دیتا ہوں۔ آئندہ خیال
رہے۔ اب اگر پھر تم لوگوں نے کچھ کیا تو جان سے مارے
جاؤ گے" سردار نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "تم
لوگوں نے دیکھ ہی لیا کہ کس طرح قید ہو گئے۔ اس
طرح تمھیں ختم بھی کر سکتا ہوں"

"سردار وہ چڑیا کیسے پھٹ گئی تھی" ظفر نے
سوال کیا۔

"وہ پلاسٹک کی چڑیا تھی جس میں دھوئیں کا بم
رکھا ہوا تھا۔ جیسے ہی تم نے پکڑا۔ بم پھٹ گیا
میں تم لوگوں کی بہادری کی تعریف کرتا ہوں ورنہ یہاں
کی پولس بھی ہمارا کچھ نہ کر سکی۔ جاؤ لیکن اگر تم نے پولس کو
خبر کی یا پھر ٹانگ اڑائی تو سمجھو تمھاری موت تم
سے زیادہ دور نہ ہوگی۔ انھیں لے جاکر چھوڑ دو" یہ کہہ
کر وہ نکل گیا۔

دوسرے نقاب پوش نے دونوں کی آنکھوں پر
پٹیاں باندھیں۔ پھر انھیں لے کر چلا۔ شمیم کا ہاتھ نقاب
پوش نے پکڑ رکھا تھا۔ اور ظفر کا شمیم نے کچھ دیر

چلنے ... زینے پر چڑھنے لگے پھر رک گئے۔ نقاب پوش ... انھیں ٹھہرنے کے لیے کہا۔ کچھ دیر بعد وہ پھر چلنے لگے لیکن اب انھیں تازی اور ٹھنڈی ہوا لگی۔ انھوں نے گہری گہری سانسیں لیں اور نقاب پوش سے پوچھا "ہمیں کتنی دور اور چلنا ہوگا" لیکن جواب نہ پاکر شمیم نے پٹی کھول دی وہ تالاب کے کنارے کھڑے تھے۔ شمیم نے ظفر کی پٹی بھی کھول دی۔ مچھلی پکڑنے کا سامان جوں کا توں تھا۔ ایک کانٹا تالاب میں پڑا ہوا تھا۔ شمیم نے اسے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوا۔ ظفر اور شمیم دونوں نے مل کر کھینچا تو ایک بڑی سی مچھلی کانٹے میں پھنسی باہر آگئی۔ دونوں خوشی سے دیوانے ہوگئے۔ وہ کانٹا سمیٹ کر وہاں سے چلے رات کے آٹھ بج چکے تھے۔ گھر کے لوگ پریشان تھے۔ ان کو دیکھ کر لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا اور سوالوں کی بوچھار کر دی۔ کرنل سعید بھی گھبرائے ہوئے آئے "بیٹا ارے بھئی تم لوگوں نے ہم سب ہی کو پریشان کر دیا۔ اتنی رات تک گھر سے بغیر اطلاع دیے غائب رہا جاتا ہے"۔

شمیم نے کسی کو کچھ نہیں بتایا اتنی دیر کیوں ہوئی۔ رات میں جب وہ سونے گیا تو ظفر نے کہا "کیوں میاں شمیم دیکھ لیا نا اپنی بہادری کا مزہ اب کیا ارادے ہیں ـــــ؟"

"صبح پولیس اسٹیشن چلا جاؤں گا" شمیم نے جواب دیا۔

"کیوں کیا سردار کی دھمکی بھول گئے جو پولس میں خبر کروگے" ظفر نے کہا "میں تو نہیں جاؤں گا" لیکن صبح جب شمیم جانے لگا تو مجبوراً وہ بھی ساتھ ہوگیا۔ دونوں تھانے پہنچے تو انسپکٹر نے پوچھا "کیا بات ہے ــــ؟"

"میں آپ سے کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آپ کچھ وقت دے سکتے ہیں" شمیم نے پوچھا۔

"ضرور، ضرور مجھے خوشی ہوگی۔ کہیے کیا بات ہے ــــ؟"

"آپ نے ان جناتوں کے بارے میں تو ضرور سنا ہوگا جو پرانے قبرستان میں رہتے ہیں اور آدمیوں کو تالاب میں ڈبوکر مار دیتے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا وہ واقعی جنوں کی حرکت ہے" شمیم نے پوچھا۔ "میں تو انھیں جنات ہی سمجھتا ہوں" انسپکٹر نے سادگی سے جواب دیا "مجھ سے ایک بار اختر خاں کی کوٹھی میں ملاقات بھی ہوچکی ہے میں نے انھیں آواز دی وہ غائب ہوگئے سارا کمرا دھند

چھان مارا — لیکن وہ نہیں ملے ۔ میرے ساتھ تو
پولیس کے نوجوان بھی تھے ۔ لیکن میرے ڈانٹتے ہی
وہ ایسے غائب ہوئے جیسے انھیں زمین نگل گئی۔"
"لیکن آپ کو تعجب ہوگا وہ جنات نہیں انسان
ہیں" شمیم بولا۔ پھر اس نے اب تک کی ساری بات
انسپکٹر سے کہہ دی۔
شمیم کی بات سن کر انسپکٹر کچھ دیر تک سوچتا
رہا پھر بولا "آپ کہتے ہیں تو یقین کر لیتا ہوں لیکن
وہ غائب کس طرح ہو جاتے ہیں۔
"یہی تو سمجھ میں نہیں آتا۔ پہلے آپ گرفتار
کر لیجیے۔ پھر معلوم ہو جائے گا" شمیم نے کہا۔
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن آپ کو یہ معلوم تو نہیں
کہ ان کا اڈا کہاں ہے۔ بغیر معلوم کیے ہم کیسے
انھیں گرفتار کر سکتے ہیں۔"
"آپ چلیے تو مجھے ان کا اڈا معلوم ہے" شمیم
نے اطمینان سے کہا۔ انسپکٹر کے ساتھ ظفر بھی حیرت
سے اسے دیکھنے لگا۔
"حیرت میں نہ پڑیے۔ آج رات میرے ساتھ
چلیے میں انھیں گرفتار کرا دوں گا" شمیم بولا "اپنے
ساتھ صرف پانچ پولیس والوں کو لیجیے گا۔"
"اگر وہ گرفتار ہو گئے تو آپ کو حکومت سے
بہت انعام ملے گا۔"
"مجھے انعام کا لالچ نہیں ہے انسپکٹر صاحب
اپنے وطن کی خدمت کرنا ہمارا فرض ہے۔ میں تو اپنا
فرض نبھا رہا ہوں" شمیم نے فخر سے جواب دیا۔
رات میں پولیس بہت احتیاط سے شمیم کی رہنمائی
میں پرانے قبرستان پہنچی۔
شمیم نے ساری بات انسپکٹر کو سمجھا دی تھی
اور کہہ دیا تھا وہ لوگ جنوں سے بالکل نہ ڈریں
وہ جن نہیں ہیں۔ اگر کوئی جن نظر آجائے تو
اسے فوراً گرفتار کر لیجیے گا۔
قبرستان پہنچ کر شمیم اس قبر کے پاس گیا
جس پر چڑیا بیٹھی تھی۔ شمیم نے قبر کے سرہانے لگی
ہوئی تختی کو سپاہیوں سے نیچے دبانے کو کہا جب
سپاہیوں نے مل کر اسے نیچے دبایا تو انسپکٹر ارے
کہہ کر چونک پڑا۔ کیونکہ قبر آہستہ آہستہ بغیر آواز کے
ایک طرف سرک گئی تھی اور اندر زینے نظر آرہے
تھے۔ انسپکٹر نے ریوالور نکال لیا۔
شمیم ظفر اور انسپکٹر پہلے اترے ان کے
پیچھے پولیس کے نوجوان تھے۔ شمیم رہنمائی کرتا ہوا
ایک کمرے تک لایا۔ پوری عمارت تاریک پڑی
تھی۔ صرف ایک کمرے میں روشنی تھی۔ جب وہ

کمرے [illegible] پہنچے اور شیشے سے اندر دیکھا تو
جلد سب [illegible] تھے۔ ایک نقاب پوش کرسی پر
بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سامنے پانچ جن ہاتھ باندھے
کھڑے تھے۔ ان کے بدن سے شعلے نکل رہے تھے۔
نقاب پوش کی پشت دروازے کی طرف تھی وہ کہہ رہا
تھا۔ "تم دونوں اب تک پتہ نہیں لگا سکے۔ وہ چیز
خرم خان کے گھر ہی میں ہے۔ مجھے یقین ہے تم
لوگوں نے اچھی طرح چھان بین نہیں کی ہوگی۔"

"نہیں سردار ہم نے ایک ایک انچ زمین
چھان لی ہے۔" ایک جن بولا۔

"تلاش جاری رکھو اور ہاں آج دونوں
کے پولیس اسٹیشن گئے تھے۔ اب وہ خطرناک
ہو گئے ہیں۔ آج انھیں ختم کرکے تالاب میں ڈال
دو۔" سردار نے کہا۔

اچانک دروازے پر ٹھوکر پڑی۔ دروازہ
کھل گیا۔ وہ سب چونک پڑے۔ دروازے میں
شمیم اور پولیس کھڑا تھا۔ جنوں کو دیکھ کر پولیس
والے خوفزدہ ہو گئے۔ لیکن شمیم نے انھیں للکارا
ایک جن کو چھو کر دکھایا کر دیکھو انھیں چھونے
سے کچھ نہ ہوگا۔

سردار گھبرا کر کرسی سے کھڑا ہو گیا تھا
اس کا ہاتھ اٹھا ہوا تھا۔ جب پولیس والے پھر بھی
آگے نہ بڑھے تو شمیم نے ہتھکڑیاں اپنے ہاتھوں
سے جنوں کے ہاتھوں میں ڈال دیں۔ انسپکٹر نے
سردار کو گرفتار کر لیا۔ تب پولیس والوں کی بھی
ہمت ہوئی انھوں نے شمیم کے ہاتھوں سے ان کی
رسیاں لے لیں۔ اور جب انسپکٹر نے نقاب پوش
کی نقاب اتاری تو شمیم اور ظفر کی چیخ نکل گئی۔

"کرنل چاچا!"

کرنل سعید کا سر ندامت سے جھکا ہوا تھا
اور جب وہ وہاں سے رخصت ہو رہے تھے
تو راستے میں شمیم نے سب انسپکٹر سے ٹھنڈی آگ کے
متعلق بتایا کہ یہ فاسفورس ہے جو اندھیرے میں آگ
کی طرح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اس میں حدت نہیں
ہوتی۔ کرنل سعید نے اسی کا سہارا لے کر جناتوں
کا ڈھونگ رچایا تھا۔ اور اسے راستہ ایسے معلوم
ہوا جب آنکھوں پر پٹی باندھی جا رہی تھی تب اس
نے خوب کس کر آنکھیں بھینچ لی تھیں جس سے پیشانی کا
چمڑہ بھی سمٹ کر آنکھوں پر آ گیا اور پٹی باندھنے
کے بعد اس نے آنکھیں ڈھیلی کر دیں چمڑہ پھر اپنی
جگہ چلا گیا لیکن اپنے ساتھ کپڑے کو بھی اٹھاتا گیا
اور مجھے نیچے سے سب معلوم ہونے لگا۔ یہ تو

بقیہ صفحہ ۳۲ پر

نیچے کے سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ
اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری
ختم ہو جاتی ہے

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ــــــ ہے۔

منیجر

دو ضروری باتیں

۱۔ اکتوبر کے مہینے سے پیام تعلیم کی سالانہ قیمت چھ روپے اور فی پرچہ ساٹھ پیسے ہوگی مگر جو پائی ذاکر نمبر سے خریدار بنیں گے ان سے پانچ ہی روپے لیے جائیں گے۔ ذاکر نمبر کے علاوہ ہمارا دوسرا خاص نمبر یعنی سالنامہ بھی اسی قیمت میں ملے گا۔

۲۔ ذاکر نمبر ہم نے تھوڑی تعداد میں چھپوایا ہے۔ آپ منگانا چاہتے ہیں تو جلدی کیجیے قدر داں اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے ہیں۔

منیجر پیام تعلیم

پرو[illegible] نظامی

آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم

(بڑے لڑکوں کے لیے)

آکاش کے پردوں سے برستی ہیں پھواریں
کلیاں بھی حسیں موتیوں سے خود کو سنواریں
باغوں میں بہر سمت ہیں پھولوں کی بہاریں
خوشبوؤں کا، سبزہ کا، نباتات کا موسم
آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم

لوٹ آئے ہیں گذرے ہوئے خوشیوں کے زمانے
کلیوں کے لبوں پر ہیں بہاروں کے فسانے
ندیوں کی زبانوں پہ ہیں رنگین ترانے
ماحول میں بکھرے ہوئے نغمات کا موسم
آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم
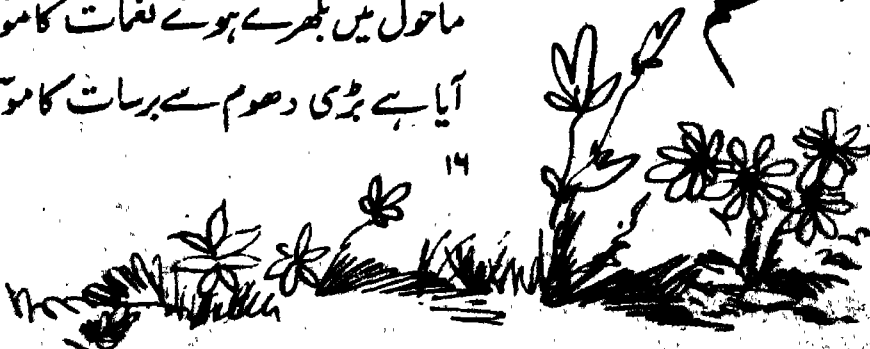
ہم دوشِ ہوا کھیت میں لہراتی ہیں فصلیں
جس سمت بھی دیکھو تو نظر آتی ہیں فصلیں
اٹھلاتی ہیں، مسرور ہیں، بل کھاتی ہیں فصلیں
ہر چیز کی افراط کا، بہتات کا موسم
آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم

ہر پھول کی پتی پہ عجب موتی جڑے ہیں
پانی میں نہائے ہوئے سب پودے کھڑے ہیں
آموں کے درختوں پہ کئی جھولے پڑے ہیں
مشاطۂ فطرت کے طلسمات کا موسم
آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم

ہر منظرِ دل کش میں کوئی راز چھپا ہے
تا حدِّ نظر سبزہ کا قالین بچھا ہے
آغوش ابھی فطرتِ رنگین کی وا ہے
رنگین دنوں اور حسیں رات کا موسم
آیا ہے بڑی دھوم سے برسات کا موسم

جناب [illegible] خان

آپ کی سمجھ کے پھیر

آپ آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں۔ آپ کے ساتھی اِدھر اُدھر چھپ گیے ہیں، آپ انھیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، کونا کونا جھانک رہے ہیں، کسی ساتھی کو چھینک آئی، آپ نے سنا جھٹ آواز کی جانب چل پڑے، لیجیے قریب ہی سے کوئی کھلاڑی چھلانگ لگا باہر آیا، آپ اس کی طرف دوڑ پڑے پھر کیا؟ راستے میں کیلے کا چھلکا آیا آپ کا پیر اس پر پڑا اور پھسل گیا۔ آپ گر پڑے اور رونے لگے کیوں؟ چوٹ جو لگ گئی! کیسے پتہ چلا؟ درد کا احساس جو ہوا۔

تو دیکھیے۔ اپنے ساتھیوں کو ڈھونڈھنے کے لیے آپ کی آنکھیں کام آئیں کیا کام آئیں ان میں دیکھنے کی طاقت ہے۔ وہی جس کو بصارت کہتے ہیں وہ کام آئی۔ آپ کے کانوں نے چھینک کی آواز سنی اور آپ چونک گیے۔ پھسل کر گرے تو قوت احساس کی بدولت آپ کو درد محسوس ہوا۔ آپ کی امی نے گلاب جامن کا نام لیا کہ آپ کے منھ میں پانی بھر آیا اور جب اس کو اٹھا، منھ میں رکھ لیا۔ مزے لیتے رہ گیے۔

دیکھا آپ نے سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی جس کے سہارے آپ کو اپنی اردگرد کی زندگی کا پتہ چلتا ہے —— ہے نا!

آپ نے کبھی ریڈیو کے اندر جھانک کر دیکھا ہے؟ کتنے ہی باریک باریک تار ایک دوسرے سے الجھے یہاں وہاں چلے گیے ہیں۔ ادھر آپ نے بٹن گھمایا، بلب جل اٹھا۔ سوئی گھمائی، میٹھے نغمے بکھرنے لگے، خبریں سنیے تقریر سنیے اور کیا اور کیا۔ جیسے کوئی جادوگر چھپا بیٹھا ہے جو دنیا کے کونے کونے سے آپ کی انگلی کے اشارے پر جو چاہیے مہیا کر دیتا ہے۔

پھر اسی طرح کا جال ہمارے بدن میں پھیلا ہوا ہے۔ باریک باریک کتنے ہی تار لگے ہوئے ہیں۔ آنکھوں، ناک، کان، زبان، ہاتھوں پیروں میں۔ اور ان سب کا تعلق؟ کسی جادوگر سے ہے؟

بھلا بتایئے تو؟ ارے جناب وہ ہے دماغ۔

آپ نے انگارا چھوا، فوراً ہاتھ کی رگوں نے پیغام نشر کیا، دماغ تک ابھی وہ پہنچا ہی تھا کہ گرمی کا احساس ہوا اور جھٹ سے حکم ملا "چھوڑو ہاتھ کھینچ لو" بس آنکھ جھپکتے ہی آپ نے ہاتھ کھینچ لیا۔ بھلا اس پلک جھپکنے میں کتنا وقفہ لگا ہوگا۔

ان بے حد حساس رگوں کے جال کو اعصاب کہتے ہیں۔ یہ جال ریڑھ کی ہڈی اور دماغ سے نکل کر سارے بدن میں پھیلا ہوا ہے۔ یہی وہ کنٹرول روم ہے جہاں جادوگر بیٹھا آپ کے دل پر آپ کے جسم پر حکومت کرتا ہے، ان کے عمل پر قابو رکھتا ہے۔ اسی نظام کے تحت آپ محسوس کرتے ہیں، ہر کام کرتے ہیں اور اسی عمل کے نتیجہ میں کوئی اور فعل بھی سرزد ہوتا ہے جس کو ردِ عمل کہتے ہیں۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی، اتنی مستعدی اور خوبی سے ہوتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس جادوگر کو شرارت سوجھتی ہے اور وہ اپنی چھڑی الٹی گھما دیتا ہے بس پھر کیا، سارا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ چیزیں الٹی دکھائی دیتی ہیں، ایک کی دو نظر آتی ہیں، چھت سے ناشپاتی کی بو آنے لگتی ہے۔ آئیے میں بھی آپ کو ایسے ہی چند تجربے بتاؤں۔ آپ بھی حیران رہ جائیں اور اپنے دوستوں کو بھی الّو بنائیں۔

آس پاس کی چیزوں اور ان کے مقام کے بارے میں جس قدر مدد آنکھوں سے ملتی ہے شاید ہی کسی اور طرح ملتی ہو۔ آنکھ میں جو شیشہ لگا ہوا ہے، وہی جس کو آنکھ کی پتلی کہتے ہیں اس کی راہ سے مختلف لمبائی اور گہرائی کی بے شمار لہریں گزرتی رہتی ہیں اور ہمارے آگے روشنی اور سایے، رنگ اور حرکت شکل اور مقام کی وسیع دنیا پھیل جاتی ہے۔ یہ جادو ہی تو ہے جو آنکھیں، اعصابی نظام کے ساتھ مل کر اتنا حیرت انگیز عمل سر انجام دیتی ہیں۔

آپ نے کیمرہ دیکھا ہے نا؟ وہی ڈبا جس سے آپ کی تصویر کھینچی جاتی ہے۔ اس کے دہانے پر لگے ہوئے شیشے پر بھی کبھی نظر ڈالی ہے وہی جس کے ذریعہ ہو کر عکس اندر لگی ہوئی فلم پر پڑتا ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا اس میں جو عکس دکھائی دیتا ہے وہ الٹا ہوتا ہے۔ آپ کے ساتھی سر کے بل کھڑے دکھائی دیتے ہیں، چلتے ہیں تو فضا میں ٹانگیں ہلتی نظر آتی ہیں۔ بالکل یہی حال آپ کی آنکھ کا ہے اس میں جو پتلی لگی ہوئی ہے اس سے بھی تصویریں الٹی ہی بنتی ہیں۔ آپ مسکرا دیے؟ جی ہاں میں ٹھیک کہہ رہا ہوں، ہاں یہ دوسری بات ہے کہ آپ ہمیشہ الٹی کی بجائے سیدھی تصویر دیکھتے

[illegible] میرا [illegible] معلوم نہ تھا ہے۔ نہ سائنس دان جان سکے ہیں! کیوں نہ آپ میں سے کوئی ذہانت کے اس حیرت انگیز عمل کو دریافت کرنے کی کامیاب کوشش کرے!

آپ میری بات سن کر مسکرا رہے تھے نا۔ ایک معمولی سا تجربہ کریں گے تو خود آپ کو یقین آجائے گا! اس کے لیے آپ کو بس ایک گتے کا ٹکڑا یا پوسٹ کارڈ چاہیے۔ اس کے درمیان ایک پن سے سوراخ بنا لیجیے، اب اس کو چھ سے آٹھ انچ تک کے فاصلے پر اس طرح پکڑیے کہ سوراخ آپ کی ایک آنکھ کے مقابل آجائے۔
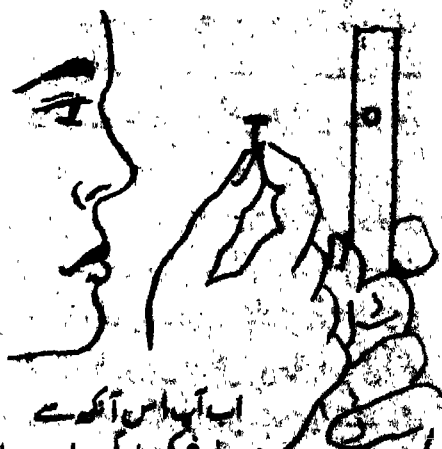
اب آپ اس آنکھ سے سوراخ کی راہ کسی بلب یا آسمان کی طرف دیکھیے اور آہستہ آہستہ اس پن کو اوپر کی طرف اس طرح لائیے کہ اس کا سرا آنکھ اور سوراخ کے درمیان آجائے۔ ارے یہ کیا؟ پن کا سرا الٹا نظر آنے لگا! کیوں نہ نظر آئے آنکھ کے پیچھے لگے پردے پر جو تصویر بنتی ہے وہ ہمیشہ الٹی ہوتی ہے اب پن کے سرے کو دھیرے سے دائیں سے بائیں ہلائیے۔ آپ کو ایسا لگے گا کہ پن دائیں سے بائیں ہل رہی ہے اور آپ حیران رہ جائیں گے. ہے نا یہ آنکھ اور دماغ کی شرارت! پر نہیں یہ تو ان کا اصل عمل ہے۔

میں نے پچھلی مرتبہ بتایا تھا کہ آنکھ اس وقت تک نہیں دیکھ سکتی جب تک روشنی نہ ہو، فرض کیجیے، روشنی دھیمی پڑنے لگے تو کیا ہو بتا ہی دوں! کچھ نہیں رنگوں کے ساتھ بھی شرارت شروع ہو جائے گی۔ کیسے؟ اچھا چلیے یہ بھی بتا دوں۔

اس کے لیے آپ کو شام کے وقت یعنی سورج چھپتے وقت کسی لہلہاتے کھیت یا چمن کے قریب کھڑا ہونا پڑے گا۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ جیسے جیسے شام کا دھندلکا بڑھنے لگتا ہے اسی طرح پہلے سرخ چیزیں

...مٹ دالے لگتی ہیں، پھر نیلے اور بنفشی رنگ
...ی چیزیں ان کی بہ نسبت زیادہ روشن دکھائی
...ینے لگتی ہیں اور آخر میں جو رنگ نظروں سے
...جھل ہوگا وہ ہوگا سبز۔ اس طرح جب روشنی
...لکل مدھم پڑ جاتی ہے تو رنگوں میں تمیز ہی نہیں
...ی جا سکتی۔

اس کا اندازہ آپ اپنے کمرے میں بھی
کر سکتے ہیں۔ آپ اپنے ابا یا بھائی جان سے ایک
ٹارچ اور کوئی رنگین تصویروں کا رسالہ مانگ
لیجیے۔ ٹارچ کے شیشہ پر ہلکے سفید سوتی کپڑے
کی دو چار تہیں چڑھا لیجیے۔ یا جھلی کاغذ منڈھ
لیجیے۔ اب اندھیرے کمرے میں رنگین تصویروں
پر ٹارچ جلا کر روشنی ڈالیے۔ آپ دیکھیں گے کہ
سبز اور نیلی تصویریں تو معمول سے زیادہ تیز چمکنے
لگی ہیں۔ لیکن سرخ اور زرد تصویریں گہری ہو گئی
ہیں۔ اب آہستہ سے ٹارچ کے شیشے پر پڑی ہوئی
پرتیں اتارتے جائیے اور پتہ چلائیے کہ کب رنگوں
میں تبدیلی آتی جاتی ہے!

اسی طرح کے ایک اور آسان تجربے سے
آپ سرخ رنگ کو سبز رنگ میں تبدیل کر سکتے
ہیں گو سچ مچ تو ایسا نہیں ہوگا۔ بس نظر کا دھوکا ہوگا۔
ایک بلور کے گلاس کو الٹ کر اس کے
پیندے پر سرخ روشنائی کے چند قطرے ٹپکائیے۔
اوپر کی جانب سے اس پر نظر ڈالیے۔ یقیناً سرخ
ہی نظر آئے گی۔

اب گلاس کو آہستہ
آہستہ اس طرح اوپر اٹھائیے
کہ روشنی پیندے کی سطح سے
لوٹ کر آپ کی آنکھوں
آئے۔ بس اس
مقام پر آپ کو
سرخ روشنائی سبز
دکھائی دے گی۔

بعض دھاتوں کے پتلے ٹکڑوں اور چند خاص
مرکبات سے بنے ہوئے رنگوں کی خصوصیت
ہوتی ہے کہ وہ روشنی کی چند خاص لہروں کو
نگل لیتی ہیں اور دوسرے رنگوں کو لوٹا دیتی ہیں۔

اگر میں آپ سے پوچھوں۔ آپ کو دو دو
آنکھوں کی کیا ضرورت ہے تو آپ مجھے شک
کی نظروں سے دیکھنے لگیں۔ ہے نا ——!
اچھا اب یوں کیجیے۔ دو پنسلیں لیجیے جن کی
نوکیں بنی ہوئی ہوں۔ انھیں اپنے ہاتھوں میں
تھام لیجیے۔ ہاتھوں کو پھیلا کر دور کر لیجیے اور
ایک آنکھ بند کر کے پنسل کی نوکوں کو ایک
دوسرے سے ملانے کی کوشش کیجیے۔

دیکھا آپ نے، نہیں ملا سکے نا! اچھا اب اس آنکھ کو کھول لیجیے اور دوسری آنکھ سے دیکھتے ہوئے نوکوں کو ملانے کی ایک اور کوشش کیجیے۔ اس بار بھی شاید ہی آپ کو کامیابی ہو۔ ہوتا یہ ہے کہ جب آپ دو آنکھوں سے دیکھتے ہیں تو کسی چیز کی گہرائی اور حجم کا اندازہ آسانی سے لگ جاتا ہے۔ لیکن ایک آنکھ سے چیزیں سپاٹ اور ایک ہی سطح پر نظر آتی ہیں۔

یہ تو تھیں آنکھوں کی شرارتیں۔ جو آپ سے کی گئیں۔ اب آئیے آپ کو دوستوں کو بے وقوف بنانے کی ترکیب بتائیں۔

ایک ہی طرح کے تانبے، پیتل یا اسٹین لیس سٹیل کے دو گلاس لیجیے، ایک میں ریت بھر لیجیے۔ دوسرے کو خالی رہنے دیجیے۔ دونوں کو کپڑے سے ایک ہی طرح ڈھانپ لیجیے۔ انہیں کھانے کی میز پر برابر رکھ دیجیے۔ اپنے دوست سے باتوں باتوں میں کہیے کہ ان دونوں گلاسوں کو علیحدہ علیحدہ تھام لیں اور آپ کے اشارے پر ایک ہی مرتبہ جھٹ سے یکساں اونچائی تک اوپر اٹھالیں۔ اشارہ پانے پر آپ کو پتہ چلے گا کہ خالی گلاس والا ہاتھ تو تیزی سے اوپر اٹھ گیا ہے لیکن ریت بھرے گلاس والا ہاتھ کچھ اتنا اونچا نہیں اٹھا ہے۔ کیوں؟
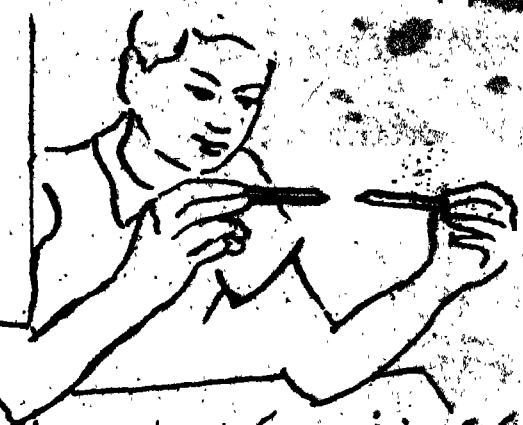
بات یہ ہے کہ جب بھی ہم کسی چیز کو اوپر کی طرف اٹھاتے ہیں تو انجانے ہی اس کے وزن کا اندازہ اپنے ذہن میں کر لیتے ہیں اور اسی کے مطابق عمل کرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ اندازہ غلط ہو جاتا ہے تو ہم سے بڑی مزیدار حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔

ایک اور سوال اور پوچھوں؟ کیا آپ ہمیشہ اپنی انگلیوں سے چھو کر ہی ہر چیز کا اندازہ کر سکتے ہیں؟ — چلیے پتہ لگائیں، اپنی دوسری انگلی کو پہلی پر کراس کر لیجیے اپنی آنکھیں بند کر لیجیے اور کسی بڑی سی گولی یا پنگ پانگ کی گیند کو ان سے دھکا دینے کی کوشش کیجیے۔

اول پہلی انگلی سے پھر دوسری سے، حالاں کہ
آپ کا ذہن بتاتا رہے گا کہ گولی ایک ہے۔ پر آپ
کی انگلیاں، بلکہ آپ کی چھونے کی حس کہے گی نہیں
دو ہیں۔ اس معمولی سے تجربے کو حضرت عیسیٰؑ کی
پیدائش سے تین سو سال پہلے مشہور یونانی سائنسداں
ارسطو نے کیا تھا اور آج تک اس کی اصل وجہ
نہیں معلوم ہو سکی۔ شاید انگلیوں کے ایک دوسرے
پر ہونے سے یہاں سے جو پیغام دماغ کی جانب
چلتا ہے اس کی راہیں بدل جاتی ہیں اور گڑ بڑ
مچ جاتی ہے۔

کسی دن آپ کو ارنڈ کا تیل پلانا پڑے تو
دادی اماں آپ کے نتھنوں کو بند کر دیتی ہیں۔ کس
لیے؟ تاکہ آپ اس کی بو کو نہ سونگھیں اور مزے
لے لے کر تیل پی لیں۔ اس معمولی حقیقت کا پتہ چلاتے
ہوئے سائنس والوں نے بتایا ہے کہ بہت ساری
غذاؤں اور دواؤں کا مزہ اصل میں ان کی بو کا مزہ
ہوتا ہے۔ زبان سے چکھ کر تو بس مٹھاس، کھٹاس،
نمکین اور کڑواہٹ یا تلخی کو پہچانا جا سکتا ہے۔ گوبھی
کے سالن یا قورمے کا مزہ اور پھلی اور انناس کا مزہ
تو ان کی بو کا مزہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کو
زکام ہوا ہے تو کھانے پھیکے اور بے مزہ معلوم
ہوتے ہیں۔ یہ دراصل آپ کی ناک کا قصور ہے،
کھانوں کا نہیں!

اب ایک ترکیب آزمائیے۔ اپنے دوست
کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیجیے۔ ان کی ناک کے قریب
ناشپاتی کا ٹکڑا لے جائیے اور منھ میں سیب کا ٹکڑا
دیجیے اور پوچھیے وہ کیا کھا رہے ہیں؟ بلا شبہ وہ
ناشپاتی کا نام لے دیں گے اور آپ مسکراتے رہ
جائیں گے۔

ان کی آنکھوں پر سے پٹی
مت ہٹائیے بلکہ کبھی
ان کے آگے اور کبھی ان کے پیچھے لگاتار چٹکی بجاتے
رہیے اور پوچھیے کہ آواز کس سمت سے آرہی ہے۔
شاید ہی وہ صحیح سمت بتا سکیں۔ کیوں؟ جب
تک آنکھیں نہ کھلی ہوں یا یہ نہ معلوم ہو کہ آواز
کہاں سے آرہی ہے۔ آواز کی سمت کا صحیح اندازہ
نہیں لگایا جا سکتا۔ ہاں اگر آواز کا ذریعہ کسی ایک
کان سے قریب ہو تو پتہ چل سکتا ہے۔ پر جب
دونوں کانوں میں آواز ایک وقت پہنچتی ہے تو
پتہ چلانا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ کہاں سے اور کدھر

کسی طرح کی ایک اور ترکیب ہے اپنے دوست کو بے وقوف بنانے کی! آنکھیں، ناک یا کان ہی نہیں بلکہ آپ کے دوسرے حواس بھی دھوکا دے سکتے ہیں۔ اگلی بار جب آپ کے دوست اونی کوٹ پہن کر آئیں تو ان سے کہیے گا کہ کوٹ پر خوب دھول جمی ہوئی ہے جس کو آپ برش سے جھاڑ کر دوستی کا حق ادا کر دیں گے۔ برش اپنے دوست کو دکھا کر ان کے پیچھے کھڑے ہو جائیے۔ آپ ان کے کوٹ پر، برش نہیں، بلکہ اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو ہلکے ہلکے اس طرح پھیریئے گویا کوٹ جھٹکا جا رہا ہے، ساتھ ساتھ اپنے کوٹ پر برش چلاتے رہیے۔ آپ کے دوست کو لگے گا برش ان ہی کے کوٹ پر پھیرا جا رہا ہے اور دھول جھاڑی جا رہی ہے، کیوں کہ ایک تو انھوں نے برش دیکھا ہے۔ دوسرے ان کے ذہن میں جھاڑنے کے عمل کی ایک تصویر سی بنی ہوئی ہے تیسرے برش چلنے کی آواز آ رہی ہے اور جھٹکا بھی محسوس ہو رہا ہے۔ وہ بڑے خوش ہوں گے کہ مفت میں ان کا کام بن گیا۔ حالاں کہ خوش تو آپ کو ہونا چاہیے کہ ان کے حواس نے انھیں دھوکا دیا اور وہ مفت میں اُلو بن گئے!

آپ کے ماسٹر صاحب یا بھائی جان آپ کو پیٹتے ہیں تو آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ مار کا اثر جسم کے مختلف حصوں پر مختلف ہوتا ہے۔ کہیں زیادہ چوٹ آئی ہے تو کہیں کم! بھلا کیوں؟ اس لیے نہیں کہ مار کی شدت یکساں نہیں تھی بلکہ اس لیے کہ چھونے کی حس مختلف حصوں میں مختلف ہوتی ہے۔ انگلیوں کے سرے زیادہ حساس ہوتے ہیں تو بازو کی پچھلی طرف کم۔ ایک اور بات ہے، انگلیوں، ناک، کان، ہونٹ اور زبان کے سروں میں دماغ تک پیغام پہنچانے والی رگوں کے سرے ملے جلے اور قریب قریب ہوتے ہیں اور اس طرح وہ فوراً دماغ تک پیغام پہنچا دیتی ہیں لیکن کم احساس رکھنے والے عضو یا جسم میں یہ سرے دُور دُور ہوتے ہیں۔

اس کا پتہ چلانے کے لیے کسی گتے یا دستانے میں سے ایک ایک انچ کے فاصلے سے دو نوک دار سوئیاں گذار دیئے دوست کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہلکے سے سوئیوں کی نوک سے بازو کی اُلٹی طرف چھوئیے اور پوچھیے کتنی سوئیاں ہیں؟

ما کہیں گے سوئی ایک ہے خواہ ان کا درمیانی فاصلہ ایک انچ سے کچھ زیادہ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس کے برخلاف چاہے فاصلہ بالکل کم ہی کیوں نہ ہو، ان سے انگلیوں کے سرے پر یا زبان کو چھوا جائے تو فوراً پتہ چل جائے گا کہ سوئیاں دو ہیں۔
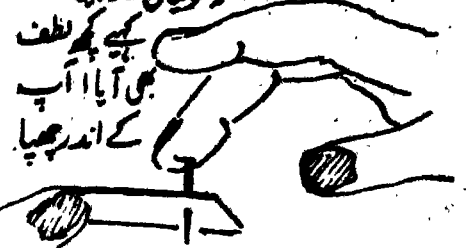
کہیے کچھ لطف بھی آیا! آپ کے اندر چھپا جادوگر ایسی شرارتیں ہر دن تھوڑی ہی کیا کرتا ہے! وہ تو آپ کا دوست ہے اسی کی مدد سے تو آپ کو اردگرد کی دنیا کی پوری جان کاری ہوتی ہے۔ ہر رات سو کر اٹھنے کے بعد جب آپ ایک ایک دن آگے بڑھتے ہیں تو آپ کو لگتا ہے کہ آپ ہر دن زیادہ عقل مند ہو رہے ہیں، تجربہ کار بن رہے ہیں آپ کی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے، کل سے زیادہ جان گئے ہیں! — کتنے ہی راز کتنی ہی معمولی لیکن نظروں سے چھپی باتیں آس پاس کی دنیا کی اور خود اپنے جسم اور ذہن کی آپ پر ظاہر ہو رہی ہیں۔ اب یہی دیکھیے

کل تک تو آپ نے ان سب باتوں کے بارے میں نہیں پڑھا تھا جو میں نے بتائی ہیں، اب پڑھا ہے اور سمجھا ہے، سمجھا ہے تو بہتر طریقے سے جینے کا ارادہ بھی کیا ہے۔ اپنے زندگی کے بارے میں زیادہ سے زیادہ اور صحیح معلومات حاصل کرنے کی ہمیشہ کوشش کرتے رہیے۔ اپنے ابا سے امی سے بھائی جان سے، باجی سے اور ماسٹر صاحب سے ہر کسی سے پوچھتے رہیے —

اور ہاں اگلی بار یا تو میں آپ کو موسم کے مذاق کے بارے میں بتاؤں گا۔ یا آپ چاہیں تو کچھ تھوڑے چند ایسے تجربے بھی بتاؤں جس سے آپ اپنی ذہنی قوتوں اور حواس کا اندازہ کر سکیں۔ آپ اپنی خواہش ایڈیٹر صاحب کو بتا دیجیے گا۔

منیر

خط و کتابت کرتے وقت
اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے تاکہ جواب
یا تعمیل میں تاخیر نہ ہو۔

حب حافظ باقری

مرغی اور چوزے

ککڑ کڑ کڑ کڑ پیارے چوزو! میری آنکھ کے تارے چوزو!

چوں چوں چوں چوں آئے امی! حکم بجا ہم لائے امی!

اچھا! میرے ننھے چوزو! ننھے چوزو، منے چوزو!

آؤ تمھیں سینے سے لگاؤں اپنے سر آنکھوں پہ بٹھاؤں

میرے پیچھے پیچھے آنا راہ میں تنہا مت رک جانا

بات مری ہر بچہ مانے دیکھو یہاں بکھرے ہیں دانے

ٹک ٹک کر کے سب چگ لینا اک دانا بھی چھوڑ نہ دینا

آؤ اس گیلی مٹی تک اس میں دبی ہوگی کچھ دیمک

کھودو اسے پنجوں سے کریدو مٹی کو پھیلا کر رکھ دو

پھر چن چن کر تم سب کھانا دیمک کا بھی لطف اٹھانا

ایک چوزے نے کیڑا پایا دوسرے چوزوں نے بھی دیکھا

چوزے کی بس جاتا پانی کیڑا، بھاگی، چھینا، جھپٹی

اب ہر ایک کی کوشش یہ تھی — چھین کے ٹڈّا کھائے خود ہی
اس نے چھینا اور یہ بھاگا — اس سے جھپٹا اور وہ بھاگا
یوں تھی ان کی چھینا جھپٹی — جیسے کھیل رہے ہوں ہاکی
مرغی چیخی کٹ کٹ چوزو! — بھاگو دوڑو دوڑ کے آؤ
چیل آتی ہے تاک لگائے — تم پہ نہ جھپٹے اور لے جائے
ماں نے اپنے پر پھیلائے — بچے دوڑے دوڑے آئے
ماں کے پروں میں چھپ گئے آکر — رکھ لیا ماں نے خوب چھپا کر
کہنے لگی "باہر نہ نکلنا — خطرہ ہے دیکھو نہ بھلنا"
تھا ان میں اک نٹ کھٹ بچا — نٹ کھٹ بچا ہٹ کا پکا
اس نے ماں کا حکم نہ مانا — باہر آیا دیکھ کے دانا
اُس پہ جھپٹا چیل نے مارا — پنجے میں داب کے یہ جا وہ جا
مرغی چیخ کے اس پر لپکی — چیل کو لیکن وہ کیا پاتی
رہ گئی چپ وہ غم کی ماری — ماں کیا کر سکتی تھی بچاری

بات بڑوں کی جو ٹھکرائیں
وہ بچے نقصان اٹھائیں

سید حسین حسان

جانوروں کی حفاظت
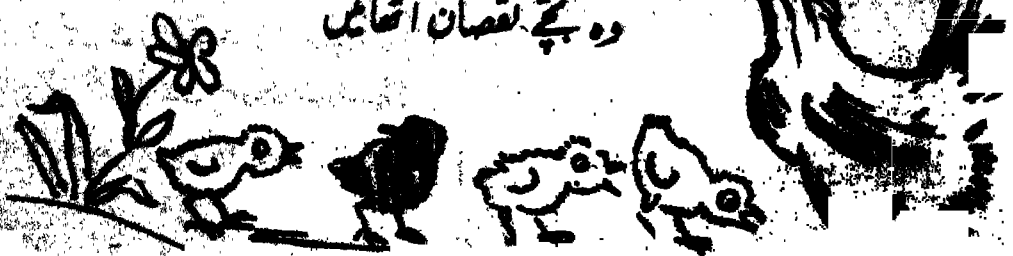
ہمارے سائنس داں کہتے ہیں کہ لگ بھگ بیس لاکھ سال پہلے انسان نے اس دنیا میں جنم لیا۔ اس وقت یہ بے چارا بہت کمزور تھا۔ بہت ہی کمزور! نہ اس کے منہ میں درندوں جیسے بڑے بڑے خوفناک دانت تھے۔ نہ ہی اپنے جسم کو گرم رکھنے کے لیے لمبے لمبے بال بھی نہیں تھے، نہ پنجے تھے۔ بدن کی کھال بھی موٹی نہیں تھی۔ جنگلی جانوروں سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے یہ زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا نہ پانی میں زیادہ دیر تک ٹک سکتا تھا۔ ایک کانٹے کے چبھ جانے سے یا کیڑے کے کاٹنے سے ان میاں کی جان خطرے میں پڑ سکتی تھی۔

پر اس کے پاس ایک چیز تھی بہت ہی عجیب و غریب! بتائیے کیا؟

یہ اس کا دماغ تھا۔ جی ہاں دماغ! اس دماغ

کی بدولت اپنے سے دس گنے جانور پر قابو پالینا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس دماغ نے جوں جوں ترقی کی اس کو جینے کے ڈھب آتے گئے۔ اب وہ اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جانوروں کا شکار کرتا تھا۔ اس نے اپنے رہنے کے لیے گھر بنائے۔ جنگلی جانوروں کو پالتو بنایا۔ کچھ کو اپنی غذا کے لیے رکھا اور کچھ کو سواری کرنے اور بوجھ اٹھانے کے لیے سدھایا۔ پھر اس نے کھیتی باڑی کے لیے جنگل کے تھوڑے سے حصے کو صاف کیا باقی صدیوں یوں ہی رہنے دیا۔ اس میں جنگلی جانور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی سروکار نہ تھا۔

مگر اب سے کوئی تین سو سال پہلے دنیا میں انسانی آبادی تیزی سے بڑھنے لگی۔ یوں سمجھیے کہ ۱۶۵۰ء میں یہ لگ بھگ سینتالیس کروڑ تھی۔ سو سال بعد یعنی ۱۷۵۰ء میں اٹھتر کروڑ چالیس لاکھ۔ ۱۸۵۰ء میں ایک ارب نو کروڑ چالیس لاکھ۔ ۱۹۶۰ء میں دو ارب اسی کروڑ ہو گئی۔ سائنس دانوں کا اندازہ ہے کہ ۲۰۰۰ء میں موجودہ آبادی (تین ارب) دگنی ہو جائے گی۔

لوجناب سترھویں صدی سے انسان نے جگہ کی تلاش میں اپنے وطن سے قدم باہر نکالا۔ ادھر ادھر پھیلنا شروع کیا۔ ایک براعظم کی آبادی گنجان ہو گئی تو دوسرے براعظم کی طرف رخ کیا۔ ہوتے ہوتے انٹارکٹک کو چھوڑ کر دنیا میں تقریباً ہر جگہ حضرت انسان کے قدم پہنچ گئے۔ بستیاں بس گئیں، شہر آباد ہو گئے۔

اور بھئی جوں جوں انسان نے پھیلنا شروع کیا جنگلی جانوروں کے لیے دنیا تنگ ہوتی گئی۔ انسانوں کی بھیڑ کے سامنے بے چارے جنگلی جانوروں کی بھیڑ کیا ٹک پاتی۔ شروع میں یہ ناگہانی آفت اس طرح آئی کہ کھیتی باڑی کے لیے مشینوں سے جنگل کے جنگل کاٹ دیے گئے اور ان لق ودق میدانوں میں ہل چلائے گئے یہ ہل بے چارے چھوٹے موٹے جانوروں اور کیڑوں کوڑوں کے ٹھکانوں پر چلے یوں کہیے کہ ان کے سینوں پر چلے۔ ان کا ٹھکانا، پیٹ بھرنے کا سامان سب ختم! یوں یہ بن آئی مرنے بڑے جانوروں کا کھاجا یہ چھوٹے موٹے جانور اور کیڑے کوڑے تھے۔ یہ ختم ہوئے تو یہ بڑے بھی فاقوں کی نذر ہو گئے۔

مگر کبھی کبھی تو انسان کی محض جہالت اور نادانی کی وجہ سے جانوروں کی نسلیں کی نسلیں تباہ ہو گئیں۔ مثلاً آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے نوآبادکار

یورپ سے پہنچے تو جانور بھی ساتھ لائے۔ یہ دیکھ کر تعجب ہو اس [illegible] کے جنگلی جانوروں پر کیا بیتی۔ شاید اپنے [illegible] سوروں نے اس علاقے کے بہت نایاب جانوروں کو ختم کر دیا۔ آسٹریلیا میں خرگوش کانگرو کی چھوٹی نسل کی غذا کھا گئے اور یہ نسل ہی ختم ہو گئی۔ یورپ سے لائی ہوئی چڑیوں نے اس علاقے کی کمزور چڑیوں کا صفایا کر دیا۔ ابھی تھوڑے دنوں پہلے ویسٹ انڈیز میں چوہوں کی مصیبت سے نجات پانے کے لیے نیولے لائے گئے مگر کچھ ہی دنوں بعد یہ نیولے خود ایک مصیبت بن گئے۔

دیکھنے کو نہیں ملیں گی۔

چند سال کی بات ہے کہ اود بلاؤ کی کھال کے ہیٹ اور سیل کی کھال کے کوٹ کا فیشن چل پڑا تھا۔ ظاہر ہے ان دونوں کی کھالوں کا فراہم کرنا بہت نفع کی تجارت تھی۔ لاکھوں لاکھ اود بلاؤ ختم کر دیے گئے اور بے چارے سیل جنھوں نے پہلے انسان کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی، جوں ہی بچے دینے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں میدان میں جمع ہوتے، لوگ ڈنڈوں سے مار مار کر انھیں ختم کر دیتے اور ان کی کھال کھینچ لیتے۔

سیاحوں کی لاپرواہی اور پیسے کی ہوس کی بدولت [illegible] خوبصورت پرندے [illegible] کی بہت سی قسمیں ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں۔ اب یہ کبھی

مائیں اور ان کے بچے بے دردی کے ساتھ ختم کر دیے جاتے۔ کسی اللہ کے بندے کو یہ نہ سوجھا کہ ان کی آئندہ نسل کیسے چلے گی۔ پیسے کی ہوس میں آدمی اندھا ہو جاتا ہے۔ آئندہ کی بات اسے بالکل نہیں سوجھتی۔

جنوبی امریکا کا خوب صورت پرندہ چل چلا
ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اور جب شتر مرغ کے
پر الدار عورتوں کی ٹوپیوں کی زینت بننے لگے تو
گھوڑ سواروں نے اس کا پیچھا کرنا شروع کیا۔ بیچارا
دوڑتے دوڑتے تھک جاتا تو گرفتار ہو جاتا۔
کچھ دنوں کے لیے ایک
فیشن اور چلا تھا۔ عورتوں کے
ہینڈ بیگز کے شوقین بہت
پرندوں کی کھالوں سے سجائے جاتے
تھے۔ بدنام شکاریوں نے [illegible]
کے [illegible] کو [illegible]
[illegible]

کا خوب شکار کرایا اور جب یہ فیشن بدلا ہے
تو ان بے چاروں کی لاشوں کے تودے کے
تودے سمندر کے ساحل پر پڑے تھے۔
پر سبھی انسان تو ایک سے نہیں ہو سکتا!
کچھ سمجھدار لوگ اسے بہت ہی غلط سمجھتے تھے۔
انھوں نے ایک تحریک چلائی۔ اس کا مقصد
یہ تھا کہ جنگل کے بچے کھچے باسیوں کی حفاظت
کی جائے۔ تحریک بہت کامیاب ہوئی۔ دنیا کے
اکثر ملکوں میں نیشنل پارک بن گئے
جن میں جنگلی جانور آزادی

نے تھم[illegible] ہیں۔ کوئی شخص ٹیڑھی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا۔ ہمارے دیس میں اس طرح کے نیشنل پارک بنائے گئے ہیں۔ ہر سال اکتوبر میں جانوروں کا ہفتہ بھی منایا جاتا ہے۔

اس تحریک میں آپ بھی دلچسپی لیں تو کتنا اچھا ہے۔ انگلستان کے بچوں نے تو کئی سال ہوئے (۱۹۶۳ء) اس طرح کی ایک جماعت بنا لی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جنگلی جانوروں کی زندگی اور اس کی حفاظت کے معاملے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں۔ اس جماعت میں لڑکے لڑکیاں دونوں شامل ہیں — ۵ سال سے ۱۰ سال تک کے لڑکے لڑکیاں اس میں شامل ہیں۔ کیا آپ نے بھی کوئی ایسی جماعت بنائی ہے؟

(خیال انگریزی سے لیا گیا)

جناب اظہر افسر

پانچ منٹ کا ناٹک

اہم افراد صرف دو
اور
ایک آدمی

منظر

(ریلوے اسٹیشن، ٹرین بس چھوٹنے ہی والی ہے۔
مسافر ادھر سے ادھر دوڑ رہے ہیں۔ خوانچے والے آوازیں
لگا رہے ہیں)

ایک آدمی: (گھبراتا ہوا) اے بھائی سنو
ارے بھائی کوئی شولاپور بھی جا رہا ہے۔
(آدمی پکارتا رہتا ہے مگر کوئی نہیں سنتا۔ آخر
ایک جہاندیدہ مسافر چلتے چلتے رک جاتا ہے)

مسافر: بھئی گاڑی شولاپور جا رہی ہے تو
کیا شولاپور کے نہیں جائے گا۔

آدمی: کیا آپ شولاپور کے رہنے والے ہیں؟

مسافر: ہاں میرا وطن شولاپور ہے۔

آدمی: واہ صاحب واہ آپ شولاپور میں رہتے
ہیں اور مجھے پہچانتے تک نہیں۔

مسافر: نہیں میں نہیں پہچانتا۔ آپ ہیں کون۔

آدمی: (لمبا سانس لیتا ہے) ہا۔ ہا کیسے پہچانیں
گے آپ بھلا اگر آپ میری عنایتوں کو بھلا
(ٹرین کھسکنے لگتی ہے)

میں شولاپور میں رہتا ہوں۔

مسافر: وہ تو مجھے معلوم ہے۔

آدمی: اور پرکاش بستی میں میرا گھر ہے۔

مسافر: وہ بھی معلوم ہے بابا۔ آگے کہو۔

آدمی: میرے گھر پہنچ کر میرے گھر والوں سے کہنا کہ یہاں آنے کے بعد میں دو تین مہینوں سے ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں۔ گرمیوں میں لو لگ جاتی ہے۔ سردیوں میں ہوا لگنے کی وجہ سے نمونیہ ہو گیا تھا۔ اب بھی کبھی کبھی۔۔۔۔ کبھی کبھی کیا اکثر بخار رہتا ہے، سر میں ہمیشہ درد رہتا ہے۔ کھانسی بہت ہے (کھانسنے لگتا ہے)، دل کمزور ہو گیا ہے۔ جگر بڑھ گیا ہے (ٹرین سیٹی دیتی ہے اور سرکنے لگتی ہے)

آدمی: تو میں کہہ رہا تھا۔ جگر بڑھ گیا ہے ہڈیاں سوکھ گئی ہیں، اور بدن میں خون بالکل نہیں رہا۔ اور۔۔ اور اگر آپ کے پاس۔

مسافر: (جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتا ہے) بس بس ٹھیک ہے۔ میں ساری بات سمجھ گیا ہوں۔ تمہارے گھر والوں سے کہہ دوں گا تم مر چکے ہو۔ خدا حافظ۔

آدمی: (ہاتھ ملتے ہوئے) حسرت سے، کی۔ ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ سارا ناٹک بیکار گیا۔

(پردہ گرتا ہے)

...... بقیہ ٹھنڈی آگ

بہت معمولی بات ہے۔ جسے چھوٹے بچے بھی جانتے ہیں۔ میں نے سب کچھ دیکھ لیا۔

کرنل سعید نے اس بات کا اقرار کر لیا کر وہی اپنے آدمیوں کو اختر خاں کی کوٹھی میں بھیجتا تھا۔ اصل میں اسے معلوم ہوا تھا کہ کمپاؤنڈ میں کوئی خزانہ دفن ہے لیکن وہ اس کا سراغ نہیں لگا سکا۔ کمپاؤنڈ میں ایک تہہ خانہ تھا ڈرانے پر جنات اسی میں چھپ جاتے تھے۔

شمیم اور ظفر کو بہت انعام ملا۔ ان کی بہت شہرت ہوئی اور وہ جب اپنے گھر لوٹے تو ان کے والد نے انھیں سینے سے لگا کر بہت پیار کیا

!!

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

(مسلسل)

بگلا بولا۔ "دوست بات یہ ہے کہ میں اس تالاب کے کنارے پیدا ہوا، بچپن سے یہیں رہتا ہوں۔ اسی تالاب کے کنارے میری ساری زندگی گزری ہے۔ اس تالاب کے جانور اور اس تالاب میں رہنے والوں کے لیے میرے دل میں بڑا درد ہے۔ مگر میں نے سنا ہے یہاں بہت جلد قحط پڑنے والا ہے۔ یہ زمین بارہ سال تک ایک ایک بوند پانی کو ترسے گی۔"

کیکڑے نے پوچھا: "آپ نے کس سے سنا ہے؟"

بگلے نے جواب دیا: "ایک جیوتشی نے مجھے بتایا کہ بارہ سال تک بارش نہیں ہوگی۔ اس تالاب میں تو پانی پہلے ہی کم ہے یہ بہت جلد سوکھ جائے گا اور میرے بچپن کے ساتھی ایک ایک کر کے ختم ہو جائیں گے۔ مجھے تو بس اسی کا کھٹکا ہے اور اسی لیے میں اداس اداس رہنے لگا ہوں۔ اس تالاب کے رہنے والے بڑے اطمینان سے زندگی گزار رہے ہیں۔ حالانکہ دوسرے چھوٹے تالاب کے جانور بڑے تالابوں کا رخ کر رہے ہیں۔"

(تالاب کے کنارے
مچھلیاں، کچھوے، کیکڑے ایک
بگلے کو گھیرے کھڑے ہیں)

کیکڑے نے بگلے کی یہ بات سنی تو ساری مچھلیوں کو خبر کر دی۔ خبر سنتا تھی کہ مچھلیوں اور کچھوؤں نے بگلے میاں کو گھیر لیا۔ سب کو اپنی جان کی فکر پڑی تھی اور سب بگلے بابا سے اس مصیبت سے نجات کا راستہ پوچھنے لگے۔

بگلے میاں نے موقع غنیمت جان کر کہا، "یہاں سے تھوڑی دور پر ایک بہت بڑا تالاب ہے اتنا بڑا ہے کہ بارہ برس کیا چھبیس برس بھی پانی نہ برسے تب بھی نہ سوکھے اگر تم لوگ وہاں پہنچ جاؤ تو جان بچ سکتی ہے۔"

مچھلیوں نے کہا، "مگر ہم وہاں جا کیسے سکتے ہیں؟"

بگلے میاں نے فوراً اپنی خدمات پیش کیں اور کہا، "ایک ایک کر کے چلو تو میں اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے جا سکتا ہوں۔"

یہ بات سننی تھی کہ مچھلیاں، کیکڑے، کچھوے سبھی بگلے میاں کے سر ہو گئے کوئی بگلے میاں کو ماما کہہ کر دُہائی دینے لگا تو کوئی چاچا اور کوئی بھائی کہہ کر۔ ہر ایک منت سماجت کرتا تھا کہ بگلے میاں پہلے اسے لے جائیں۔ اب تو بگلے میاں کی بن آئی۔ باری باری سب کو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر لے جاتے۔ کچھ دور ایک چٹان پر پٹک کر بے دم کر دیتے اور پھر مزے سے انھیں نوالہ بنا لیتے دوسرے دن پھر واپس آکر اپنی پسند کا شکار لے جاتے۔

ایک دن وہی کیکڑا بگلے میاں کے پاس آیا کہنے لگا، "ماما سب سے پہلے تو آپ کی ملاقات مجھ سے ہوئی تھی اس دن آپ کتنے غمگین کتنے اداس بیٹھے تھے۔ جیسے برسوں کے بھوکے پیاسے ہوں۔ پر اب تو آپ کے چہرے پر رنگ آ رہا ہے۔ میں نے مچھلیوں کو آپ کی بات نہ بتائی ہوتی تو بھلا

مچھلیاں آپ کی بات کیسے سنتیں۔ مگر اب آپ نے مجھی کو بھلا دیا۔ اب تو آپ کے بہت سے پرانے ساتھی بڑے تالاب تک پہنچ چکے ہیں۔ آپ مجھے بھی کیوں نہیں لے چلتے!"

کیکڑے کی بات سن کر بگلا بہت خوش ہوا۔ اس نے دل میں کہا۔ "روز روز مچھلیاں کھاتے کھاتے جی بھر گیا ہے۔ آج یہ کیکڑا مزہ دے جائے گا!" یہ سوچ کر اس نے کیکڑے کو اپنی گردن پر بٹھا لیا اور اسی چٹان کی طرف لے اڑا۔

کیکڑا، بگلے کی گردن پر بہت ہوشیاری سے بیٹھا تھا اور بہت چوکنا تھا۔ اڑان کا لطف اٹھانے کے ساتھ ساتھ وہ آس پاس کی چیزوں کو غور سے دیکھتا بھی جاتا تھا۔

ایک چٹان پر اسے دور ہی سے مچھلیوں کی ہڈیاں اور کانٹے بکھرے ہوئے نظر آئے۔ وہ بھانپ گیا۔ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ مگر اس نے اس بات کو ظاہر نہ ہونے دیا اور بگلے سے پوچھا: "ماما وہ تالاب اب کتنی دور رہ گیا ہے۔ میرے بوجھ سے آپ کی گردن دکھ گئی ہوگی"

بگلے میاں نے سوچا شکار اب پوری طرح اپنے قبضے میں ہے۔ اس کا آخری وقت قریب ہے۔ اسے کیوں نہ اصل بات بتا دوں۔ یہ سوچتے سوچتے وہ اس موت کی چٹان کے اور قریب آ گیا۔ اب کیکڑے میاں کچھ گھڑیوں کے مہمان تھے۔

مچھلیوں کی ہڈیاں اور کانٹے اور بگلے میاں کا پہلے سے تندرست ہونا۔ ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر اسے بگلے میاں کی نیت کا اندازہ لگانے میں ذرا بھی دیر نہ لگی۔ اس نے اپنے ہوش حواس باقی رکھے اور بگلے میاں اس بات کا جواب دینے بھی نہ پائے تھے کہ اس نے اپنے نکیلے دانت اس کی نرم اور ملائم گردن میں گاڑ دیے۔ بگلے میاں بس تم بول گئے۔ کیکڑے نے بگلے کی گردن دھڑ سے الگ کی اور آہستہ آہستہ تالاب کی طرف چل پڑا۔ وہاں مچھلیاں بگلے کی راہ تک رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں آج بگلے ماما کو اتنی دیر کیوں ہو گئی۔

کیکڑا مچھلیوں کی اس بات پر ہنسا اور بگلے کا سر دکھا کر سارا قصہ بیان کر دیا۔

گیدڑ نے جب یہ کہانی سنی تو کوّے سے پوچھا۔ "دوست کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ اس بگلے کی طرح اس سانپ کا بھی پاپ کٹے!"

گیدڑ نے کہا "ایک کام کرو۔ تم راج محل میں جاؤ وہاں سے رانی کا قیمتی ہار اڑا لاؤ اور اسے سانپ کے بل کے پاس پھینک دو۔ راجہ کے سپاہی ہار کی تلاش میں تمہارا پیچھا کریں گے۔ سانپ کے بل میں سے اسے نکال لیں گے اور سانپ کو مار بھی دیں گے۔"

دوسرے دن کوّے کی مادہ راج محل میں جا کر رانی کا کنٹھا اٹھا لائی اور اسے سانپ کے بل کے اندر ڈال دیا۔ سانپ نے چمکتا ہوا ہار دیکھا تو اس پر اپنا پھن پھیلا کر خوش ہونے لگا۔ اتنے میں راجہ کے سپاہی وہاں آ پہنچے اور اور سانپ کو ڈنڈوں سے مار کر ہار اٹھا کر لے گئے۔

بقیہ صـ ۴۳ پر

از حمیرہ اسعد عباسی چھتر پور

ندامت

میرا کل شام نتیجہ نکلا
ہائے افسوس میں ناکام رہا
پاس تھے خالد و رگھبیر و ظفر
پر نہ تھا گر تو میرا نام نہ تھا

سچ تو یہ ہے کہ ہمارا اس سال
کوئی پڑھنے سے تعلق ہی نہ تھا
کتنے مضمون مجھے پڑھنا ہیں
ٹھیک سے یہ بھی تو معلوم نہ تھا
اکثر اسکول سے غائب ہو کر
تاش کھیلے کبھی کیرم کھیلا
ہر نئے فلم کو دیکھا میں نے
کلچرل شو بھی نہ کوئی چھوڑا

چھٹیاں جب ہوئیں تیاری کی
تب کتابوں کی طرف دھیان دیا
پر وہاں تھے نہ لتا کے نغمے
اور رفیع کا بھی کوئی گیت نہ تھا
ممتحن ہائے کسی پرچے کا
جانی واکر تھا نہ محمود ہی تھا
کس کو غم ہوگا بھلا دنیا میں
ایسی صورت میں جو میں فیل ہوا

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ

ابن بطوطہ

(مسلسل)

اصفہان سے چل کر یبرا (؟) اور یزد ہوتے ہوتے شیراز پہنچ گئے۔ یزد خندق کے کنارے آباد ہے۔ ایک بڑی شاندار مسجد اور سرائے بھی ہے۔ سرائے ملک اسحاق نے بنوائی ہے۔ ملک اسحاق شاہ شیراز کے باپ کا نام ہے۔ یزد کا پنیر بہت عمدہ ہوتا ہے۔ ایک ٹکڑا دو سے چار اونس تک کا ہوتا ہے۔

شیراز:۔ عجم کے شہروں میں شیراز سے بڑھ کر کوئی شہر نہیں ہے۔ باغ، نہریں، بازار، آدمی بڑے خوبصورت ہے۔ ہر قسم کے سامان کے الگ بازار۔ گوشت کی دکانیں برابر برابر چلی کھانے کی دکانیں الگ، لکڑی کے سامان کی دکانیں الگ، پھلوں کی دکانیں الگ۔ یا تو دمشق کے بازاروں کا حسن دیکھنے کے قابل ہے یا پھر شیراز کے بازاروں میں جی لگتا ہے۔

شہر کا پھیلاؤ بھی خوب ہے۔ چاروں طرف باغ ہیں۔ شام کے وقت لوگ ان باغوں میں جاتے ہیں اور تفریح کرتے ہیں۔

یہاں کی ایک نہر بھی بہت مشہور ہے۔ اس کا نام رکن آباد ہے۔ اس کا پانی میٹھا اور صاف ہے گرمیوں میں ٹھنڈا اور جاڑوں میں گرم رہتا ہے۔ نہر ایک پہاڑی چشمے سے نکلی ہے۔

شہر کی مسجدوں میں سب سے بڑی مسجد مسجد العتیق ہے۔ گرمی کے موسم میں لوگ صحن میں آکر بیٹھتے ہیں۔ مغرب اور عشاء کی نمازیں یہیں پڑھتے ہیں۔ صحن سنگ مرمر کا ہے۔ اسے پہلے خوب دھویا جاتا ہے۔ اس سے پتھر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں اور پھر لوگ ان پر بیٹھتے ہیں۔

مسجد کے شمالی دروازے کے باہر [illegible]

اس دروازے کا نام باب حسن ہے۔ منڈی میں ہر قسم کے تازہ اور عمدہ پھل ملتے ہیں۔

شیراز والے بہت نیک اور دین دار ہیں۔ عورتیں گھر سے نکلتی ہیں تو سر سے پیر تک برقعے میں لپٹ کر نکلتی ہیں۔ کیا مجال جو ذرا سا حصہ بھی نظر آ جائے۔ خیرات خوب کرتی ہیں۔ پیر، جمعرات اور جمعہ کو جا کر مسجد میں وعظ سنتی ہیں۔ کبھی کبھی دو دو ہزار عورتیں مسجد میں جمع ہو جاتی ہیں گرمی ہو تو چھوٹے چھوٹے پنکھے ہاتھوں میں لیے ٹہلتی رہتی ہیں۔ عورتوں کا اتنا بڑا مجمع میں نے کسی شہر میں نہیں دیکھا۔

حضرت شیخ مجد الدین:۔ شیراز کی سیر سے زیادہ مجھے حضرت شیخ مجد الدین شیرازی سے ملنے کا شوق تھا جن کی شہرت عجم کے ہر شہر میں میں نے سنی تھی۔ ان کا ایک مدرسہ ہے۔ مدرسے کا نام "مجدیہ" ہے۔ جس وقت میں حاضر ہوا تو شہر کے بڑے بڑے عالم ملنے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ عصر کی نماز کے بعد شیخ تشریف لائے۔ آنکھوں سے معذور ہیں۔ دو بھتیجے اور حقیقی بھائی ساتھ ہیں۔ شیخ شیراز کے قاضی ہیں مگر کام دونوں بھتیجے کرتے ہیں۔ ایک محب الدین دوسرا علاء الدین ہے۔ بھائی کا نام روح العین ہے۔ مجھ سے ملے تو بہت خوش ہوئے بغل گیر ہوئے اور دیر تک مصر، شام اور حجاز کے حالات پوچھتے رہے۔ چھوٹا سا ایک مکان میرے ٹھہرنے کے لیے کھلوا دیا۔

دوسرے دن شاہِ عراق کا قاصد حاضر ہوا۔ ناصر الدین نام ہے بہت دولت مند اور نامور امیروں میں سے ہے۔ خراسان کا رہنے والا ہے۔ شیخ کے سامنے آیا تو ٹوپی اتار دی اور جب تک شیخ کے سامنے بیٹھا رہا اپنے دونوں کان پکڑے بیٹھا رہا۔ غلام، خادم اور پانچ سو سوار ساتھ تھے۔ سب کو شہر کے باہر ٹھہرا کر فقط پانچ آدمیوں کے ساتھ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ شیخ کے سامنے آیا تو اکیلا تھا۔ چاروں ساتھیوں کو باہر چھوڑ دیا۔

حضرت شیخ مجد الدین کا ایک واقعہ سننے کے قابل ہے

کرامت:۔ عراق کا بادشاہ محمد خدابندہ بڑے دبدبے کا بادشاہ تھا۔ یہ مسلمان نہ تھا مگر مسلمانوں سے میل جول رکھتا تھا۔ ایک شیعہ جمال الدین اس کے ساتھ رہتا تھا۔ خدا نے اسے سیدھا راستہ دکھایا اور وہ مسلمان ہو گیا۔ مسلمان ہوا تو جمال الدین کی تعظیم و تکریم زیادہ کرنے لگا۔ جمال الدین نے اسے شیعہ بنا لیا۔ اسے

ایسے قصے سنائے جنھیں سن کر بادشاہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو بُرا کہنے لگا۔ جمال الدین نے بتایا کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ دونوں رسول اللہؐ کے وزیر تھے۔ حضرت علیؓ داماد اور اصلی وارث تھے۔ ان دونوں نے خلیفہ کا حق مارا گیا اور خود خلیفہ بن بیٹھے۔

بادشاہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا۔ سمجھا کہ جمال الدین ٹھیک کہتا ہے۔ اس نے صوبوں کو حکم بھیج دیا کہ سب لوگ شیعہ بن جائیں۔ عراق عرب، عجم، فارس، آذربائیجان، اصفہان، کرمان اور خراسان سب جگہ فرمان بھجوا دیے۔

سب سے پہلے بغداد، شیراز اور اصفہان میں حکم پہنچا۔ یہاں کے اکثر لوگ حنبلی تھے۔ انھوں نے کہہ دیا کہ ہم اس حکم کی تعمیل نہیں کرسکتے۔

جمعہ کا دن آیا تو سب لوگ ہتھیار باندھ کر جامع مسجد پہنچے کہ امام کچھ گڑبڑ کرے اور خطبے میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا نام نہ لے تو اس کی گردن اڑا دی جائے۔

بادشاہ نے خطیب کے پاس حکم بھیجا تھا کہ خطبے میں حضرت علیؓ کے سوا کسی صحابی کا نام نہ لیا جائے۔ خطیب نے جب یہ رنگ دیکھا کہ ہزاروں آدمی تلواریں باندھے تیار ہیں تو گھبرا گیا اور خطبے میں دستور کے مطابق چاروں صحابیوں کا نام لیا۔ یہی صورت اصفہان اور شیراز میں بھی پیش آئی۔ بادشاہ کا حکم کسی نے نہ مانا۔

بادشاہ کو یہ خبریں ملیں تو آگ ہوگیا اور حکم دیا کہ سب شہروں کے قاضی حاضر ہوں۔

سب سے پہلے شیراز کے قاضی حضرت شیخ مجدالدین پہنچے۔ بادشاہ گرمی کا موسم گزارنے قراباغ چلا گیا تھا۔ قاضی مجدالدین قراباغ پہنچائے گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ انھیں میرے کتوں کے سامنے ڈال دیا جائے۔ یہ کتے بہت خونخوار تھے۔ آدمی کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے تھے۔ یہ ظالمانہ کھیل ایک بڑے میدان میں کھیلا جاتا تھا۔

پہلے مجرم کو میدان میں چھوڑتے پھر کتوں کو چھوڑ دیا جاتا۔ مجرم بھاگتا تو کتے اسے بھاگنے نہ دیتے۔ اسے گھیر گھیر کر لاتے اور ختم کر دیتے۔

حضرت قاضی مجدالدین بڑے اطمینان سے جا کر میدان میں کھڑے ہو گئے کتے چھوٹتے ہی حضرت قاضی صاحب کے پاس پہنچے تو دُم ہلانے اور قاضی صاحب کے پاؤں چاٹنے لگے۔ پاؤں چاٹتے جاتے تھے اور قدموں پر لوٹتے جاتے تھے۔

بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی کہ اس کے خونخوار کتے قاضی صاحب کے سامنے عاجز

ہوکر پڑے ہیں تو گھبرا گیا۔ محل سرا سے ننگے پاؤں دوڑتا ہوا آیا اور قاضی صاحب کے قدموں پر اوندھے منہ گر پڑا اور پاؤں چومنے لگا۔ اپنے کپڑے اتار کر قاضی صاحب کو پہنائے۔

پھر وہ قاضی صاحب کا ہاتھ پکڑ کر محل سرا میں لے گیا اور اپنی بیگموں سے کہا کہ قاضی صاحب سے برکت حاصل کریں۔ اوران کے دامن کو بوسہ دیا۔

بادشاہ نے قاضی صاحب کی خدمت میں نذر پیش کی اور انھیں نہایت اعزاز کے ساتھ اصفہان واپس کیا۔ شیعہ مذہب سے توبہ کی۔ اپنی حکومت کے پورے علاقے میں احکام جاری کر دیے کہ اہل سنت کے سلک پر چلیں۔

بادشاہ نے قاضی صاحب کو بہت بڑی جاگیر بھی عطا کی۔ یہ جاگیری علاقہ کوسوں لمبا ہے۔ فقط ایک علاقے میں نو گاؤں آباد ہیں۔ اور شیراز کے بہترین مقامات میں سے ہیں۔ جاگیر کی آبادیوں میں سے ایک جگہ میمن ہے میمن کا وہ حصہ جو شہر کے قریب ہے اتنا ٹھنڈا ہے کہ برف گرتا رہتا ہے۔ دوسرا حصہ جو ہرمز کی حدوں سے ملتا ہے خوب گرم ہے

خط وکتابت کرتے وقت خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجیے۔ منیجر

..... بقیہ پنچ تنتر

اس دن سے کوّے کا جوڑا سکھ چین سے زندگی گزارنے لگے۔ اس کے بچوں کو بھی اب کسی طرح کا خطرہ نہیں تھا

یہ کہانی سنا کر دمنک نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ عقل کے آگے طاقت کی ایک نہیں چلتی۔ جس کے پاس عقل کی طاقت ہے۔ صحیح معنی میں وہی طاقت ور ہے۔ عقل مند بے عقلوں کو اسی طرح ہرا دیتے ہیں۔ جیسے خرگوش نے شیر کو ہرا دیا تھا"

کرکٹ بولا:- ایں ——— ؟ یہ کیا کہا تم نے؟

دمنک نے پھر شیر اور خرگوش کی کہانی سنائی۔

(یہ کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے)

ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ

بڑوں کی کہانیاں

مساوات کا گیت

ایک سنیاسی گاؤں
گاؤں پھر رہا تھا۔ وہ سارے ہندوستان کا سفر کرنے
کا خواہش مند تھا۔ کیونکہ وہ ملک کے کونے کونے میں
اپنا پیغام پہنچانا چاہتا تھا۔

ایک روز دوپہر کے وقت وہ ایک گاؤں سے
گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک آدمی بیٹھا حقہ پی رہا
ہے۔ تھکے ماندے سنیاسی کا جی چاہا کہ وہ بھی کچھ دیر
بیٹھ کر حقہ پی لے۔ اس لیے وہ اس کے پاس آیا اور بولا
کہ اسے بھی حقہ پینے دیا جائے۔ سنیاسی کے منہ سے یہ
بات سنتے ہی وہ آدمی فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا۔ گویا سنیاسی
نے کوئی ایسی بات کہی ہے، کوئی ایسا دشوار کام کرنے
کو کہا ہے جو اس کے بس سے باہر ہو۔ وہ آدمی بڑے
ادب سے کہنے لگا: "سنیاسی بابا یہ کیسے ہو سکتا ہے
میں اچھوت ہوں۔" سنیاسی یہ سن کر واپس جانے لگا
دو قدم چلتے ہی اسے خیال آیا کہ یہ اس نے کیا کیا۔
اس کا فلسفہ ہے کہ دنیا کے سب انسان برابر ہیں۔
کوئی چھوٹا اور کوئی بڑا نہیں ہے۔ سب ہی خدا کے
پیارے ہیں۔ وہ تو مساوات کا گیت تمام دنیا کو سنانے
نکلا ہے۔ اسے لڑکپن کی ایک اور بات یاد آگئی۔ لوگ
کہتے تھے کہ مسلمان کا چھوا کھانے سے ذات چلی
جاتی ہے۔ اس لیے اس نے اپنے ایک مسلمان
دوست کے ساتھ کھانا کھایا تھا اور کھانے کے بعد
وہ ایک آئینہ کے سامنے آکر کھڑا ہو گیا تھا یہ دیکھنے
کے لیے کہ ذات جانے سے اس کے رنگ اور چہرے
میں کوئی تبدیلی تو نہیں ہوئی ہے۔ آج اسے لڑکپن
کا وہ واقعہ پھر یاد آگیا اور اسے ہنسی آگئی۔ ساتھ ہی
وہ الٹے قدم لوٹا اور حقہ پینے کے لیے اس اچھوت
کے پاس چلا آیا۔

"لاؤ — میں تمہارا جھوٹا حقہ پیوں گا۔"
یہ کہہ کر اس نے حقہ لے لیا اور پینے لگا —

تم حیران ہو گئے کہ یہ نوجوان سنیاسی جو
دنیا کے تمام انسانوں کو بھائی بھائی اور تمام
مذہب کو ایک سمجھتا تھا کون ہے؟ — یہ وہی
ہے جس نے دنیا بھر میں مساوات اور انصاف کا
گیت گایا۔ محبت، پیار، ملن کے گیت — اس
کا اصلی نام نریندر ناتھ تھا لیکن دنیا بھر میں وہ
سوامی وویکانند کے نام سے مشہور ہوا۔

جناب سید محمد شفیع تمنا کلکتوی

پوچھتے ہو تو سنو کیا ہے پیامِ تعلیم
علم و عرفان کا دریا ہے پیامِ تعلیم

صرف بچوں کا ہی محبوب رسالہ یہ نہیں
ہاں بڑوں کو بھی تو پیارا ہے پیامِ تعلیم

اپنے دامن میں ہر اک رنگ کے موتی بھر کر
نونہالوں میں لٹاتا ہے پیامِ تعلیم

سب کو دیتا ہے سنو علم و عمل کا پیغام
راستہ نیک دکھاتا ہے پیامِ تعلیم

اپنی آنکھوں سے لگاؤ تو سمجھ جاؤ گے
نور کا ایک فرشتہ ہے پیامِ تعلیم

کس لیے صاف میں کہہ دوں نہ تمنا سب سے
ہاں اندھیرے کا اجالا ہے پیامِ تعلیم

جناب رشید احمد صدیقی

ذاکر صاحب ایک اچھے دوست

پروفیسر رشید احمد صدیقی کے نام سے پیامی بھائی اچھی طرح واقف ہوں گے۔ اُردو کے اچھے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ وہ ذاکر صاحب کے ساتھیوں اور اچھے دوستوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ذاکر صاحب کے بارے میں سب سے زیادہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ دو ایک مضمونوں کے علاوہ ان کی ایک کتاب ہے جس کا نام ہے " ذاکر صاحب" اس میں بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں اس سے ہم ایک واقعہ پیامی بھائیوں کی دل چسپی کے لیے نقل کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوگا کہ ذاکر صاحب میں جہاں اور بہت سی اچھائیاں ہیں وہاں وہ ایک بہت اچھے دوست بھی ہیں۔ یہ کتاب بڑوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس لیے بچوں کے لحاظ سے ہم نے جہاں تہاں زبان آسان کر دی ہے، خاص طور پر فارسی ترکیبوں کو ہندوستانی بنا دیا ہے۔ مگر صرف دو ہی ایک جگہ ایسی تبدیلی کی ہے۔ رشید صاحب کے لکھنے کا ایک خاص طریقہ ہے۔ وہ بات میں بات پیدا کرتے ہیں، جسے لوگ بہت پسند کرتے ہیں لیکن پیام تعلیم کے اس خاص نمبر میں زیادہ جگہ نکالنا مشکل تھا۔ اس لیے کچھ کاٹ چھانٹ بھی کرنی پڑی رشید صاحب ذاکر صاحب کو "مرشد" کہتے ہیں۔

ایڈیٹر

ہندوستان کی حکومت کی طرف سے تعلیم کے کچھ ماہر ایک تعلیمی کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن جانے والے تھے۔ ان میں ذاکر صاحب بھی تھے۔ روانگی سے کچھ پہلے علی گڑھ تشریف لائے میں نے کہا: " ذاکر صاحب آپ لندن جا رہے ہیں، ایک چیز میرے لیے لیتے آئے گا۔

بولے " وہ تو ضرور لاؤں گا "

میں نے کہا۔ " کیا ؟"

فرمایا۔" گلاب "
میں پھڑک گیا اور بولا۔" مرشد آپ کی ان ہی باتوں سے تو اب تک ..... کا میر نہیں بن سکا۔
فرمایا۔ اس میں کیا شک ہے، میں گلاب لایا اور آپ نے انڈین نیشنل آرمی (یعنی ہندوستانی قومی فوج) میں بھرتی ہونے کی عرضی دی۔

ذاکر صاحب لندن سے واپس آئے۔ اور گلاب بھی لائے، جس نے سنا اس نے تعجب کیا۔ لیکن طے کوئی نہ کر سکا کہ اس میں بے تکا کون تھا، فرمائش کرنے والا یا فرمائش لانے والا۔ لندن سے واپسی کے بعد سے اب تک میں ذاکر صاحب سے مل نہ سکا، لیکن مجھے اندازہ ہے کہ وہ کانفرنس کے کاموں میں کیسے پھنسے رہے ہوں گے۔ اور گلابوں کے حاصل کرنے اور لانے میں کتنے اور کیسے کیسے ہل اور دلچسپ مرحلے پیش آئے ہوں گے اور ذاکر صاحب نے اپنی ذہانت، نیکی اور مستقل مزاجی سے کس کس کو کس طرح رام کیا ہوگا۔

یہی فرمائش میں نے کسی اور سے کی ہوتی تو وہ مجھے خوش کرنے کے لیے وعدہ فرما لیتے لیکن واپس آنے پر ملاقات ہوتی تو جھپٹ کر بغل گیر ہو جاتے گردن یا آس پاس کا بوسہ لے کر رونی صورت بنا کر فرماتے، رشید صاحب! کیا بتاؤں لندن پہنچتے ہی بیمار ہو گیا یا کاموں میں ایسا پھنسا کہ مرنے کی مہلت نہ ملی، آج اس وزیر کا مہمان، کل اس خواجہ سرا کا میزبان، فلاں نامہ نگار کو انٹرویو دیا، فلاں اڈیٹر کے ٹیلیفون آئے، وغیرہ وغیرہ، پھر بڑے چاؤ سے فرماتے، رشید صاحب آخر آپ کو لندن سے گلاب منگوانے کا کیا خبط سمایا، میرے باغ میں سینکڑوں گلاب ہیں جن کا میری بیوی بہترین گل قند تیار کرتی ہیں، آپ کو جتنے درختوں کی ضرورت ہو منگا لیجیے۔ اب ان سے کون کہے کہ مجھے نہ گل قند کے گلاب چاہییں اور نہ گلقند بیوی۔

گلاب کا لانا بظاہر ایک معمولی سی بات ہے، لیکن اس کی تہہ میں ذاکر صاحب کی بے بہا سیرت کا موتی تارے کی طرح دمکتا نظر آتا ہے۔ ایک دوست کی معمولی سی فرمائش پوری کرنے کے لیے بڑی سے بڑی دشواری اٹھانے کی ایک خاص قسم کی خوشی ہوتی ہے جس سے واقف ہونا ہر ایک کا مقدر نہیں۔ مجھے گلاب پانے کی بڑی خوشی ہوئی۔ گو یہ فرمائش کسی اور نے پوری کی ہوتی تو بھی خوشی ہوتی، لیکن ذاکر صاحب کا بیچ میں ہونا میری خوشی کا خاص موجب ہوا۔ کیونکہ ذاکر صاحب میں جب کوئی خوبی پاتا ہوں تو اپنے آپ کو داد دیتا ہوں کہ میں بڑی بات اور بڑے آدمی کو پہچانتا ہوں اور ان کی قدر کرتا ہوں۔

جناب ملا واحدی
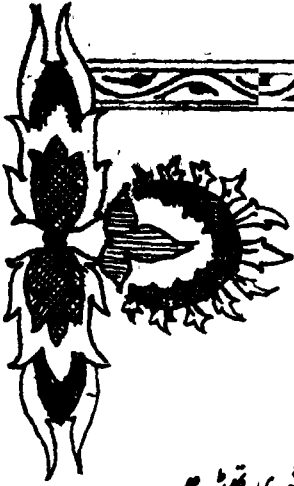
ذاکر صاحب

(ایک معزز شہری کی نظر میں)

ملا واحدی صاحب دلی کے معزز بہت ہی معزز شہری تھے پڑھے لکھے سنجیدہ بزرگ تھے نظام المشائخ کے نام سے ماہوار رسالہ نکالتے تھے ایک ہفتہ وار یا پندرہ روزہ ادبی اخبار خطیب نکالتے تھے۔ یہ دونوں اپنے زمانے میں بہت مقبول تھے پڑھے لکھے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ ان کے علاوہ اچھی اچھی کتابیں شائع کرتے تھے۔ آخر میں میونسپل کمشنر بھی ہوگئے تھے۔ دلی والے ہندو مسلمان سب ان کی عزت کرتے تھے۔ ۱۹۴۷ء کا سیلاب انھیں بھی پاکستان بہالے گیا۔ کراچی جا کر ٹکے اور وہیں کے ہو رہے۔ علمی شغل اب بھی جاری ہے۔ کتابیں لکھتے ہیں۔ رسالوں کے لئے مضمون لکھتے ہیں۔ ذاکر صاحب پر ان کا یہ مضمون پاکستان کے کسی رسالے میں چھپا تھا۔ روحیل کھنڈ اخبار بریلی نے نقل کیا۔ اس مضمون کے کچھ حصے ہم یہاں بیان کرتے ہیں۔

ایڈیٹر

جناب نیاز فتح پوری (مرحوم) میرے ہاں ۱۹۱۴ء اور ۱۹۱۵ء میں رہ چکے تھے۔ جب میں نے روز آنہ اخبار خطیب نکالا تو عارضی طور پر انھیں پھر بلالیا۔ اس وقت اگرچہ وہ ریاست بھوپال کے ملازم تھے لیکن رسالوں میں ان کے مضامین چھپتے رہتے تھے اور ان کی تحریروں کی دھاک بیٹھ چکی تھی۔

نیاز صاحب مرحوم سے ملنے علی گڑھ کے متعدد طالب علم آیا کرتے تھے۔ سب کے نام یاد نہیں۔ دو

نام یا ایک عبدالرؤف جو بعد میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے اور پھر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ دوسرے ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں ڈاکٹر آف اکانومکس کی ڈگری لے کر اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پرنسپل بن کر لوٹ آگئے۔ اور مجھ سے برابر ملتے رہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے ملنے کا انداز جس سے جس طرح کا شروع سے ہوتا ہے اسے وہ ہمیشہ نبھاتے ہیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی پرنسپلی قبول کرتے وقت ڈاکٹر صاحب کے سامنے سرکار انگریزی کی آٹھ سو ماہوار کی ایک آفر تھی۔ محکمہ تعلیمات ہی کی۔ مگر ڈاکٹر صاحب نے اسے ٹھکرا دیا۔ اور صرف پچاس روپیہ ماہوار پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کام کا آغاز کیا۔

خود جامعہ ملیہ اسلامیہ کا اس زمانے میں یہ حال تھا کہ چند دن تو اسے مکان تک میسر نہیں ہوا ڈاکٹر حسین۔ اور ان کے ساتھی غذا جانے کس طرح طالب علموں کو تعلیم دیتے تھے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین کے تمام ساتھی بھی قریب قریب ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے قابل تھے۔ اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسے مجنون تعلیم۔ وہی پچاس روپے ماہوار تمام ساتھی لیا کرتے تھے۔

میں ایک دفعہ اس زمانے میں ڈاکٹر ذاکر حسین کے مکان پر گیا ہوں کسی کا استقبال کرنے ڈاکٹر صاحب ریلوے اسٹیشن تشریف لائے تھے۔ میں بھی خواجہ حسن نظامی کے ہم رکاب تھا۔ خواجہ صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو اپنی گاڑی میں واپس پہنچایا۔ ہمیں ڈاکٹر صاحب نے جس کمرے میں بٹھایا اس کا فرنیچر یہ تھا: ایک بانس کی چارپائی اور دو تین مونڈھے ڈاکٹر صاحب اسی حالت میں مگن تھے۔

پھر جامعہ ملیہ اسلامیہ چل پڑا (چل پڑی) میں اس کے جلسوں میں اکثر جایا کرتا تھا۔ مجھے ڈاکٹر صاحب کی تقریر بہت پسند تھی۔ اس قدر سوز و درد سے بولتے تھے کہ میرے ہی نہیں ہر شخص کے دل پر اثر ہوتا تھا۔ سنا ہے بے تکلف اور نوجوان دوستوں کی صحبت میں بیٹھتے ہیں تو خوب ہنستے ہیں خوب ہنساتے ہیں لیکن میں نے تو تقریر میں روتے رلاتے سنا اس قدر رولانے والی تقریریں نے کسی سے نہیں سنی۔

ڈاکٹر ذاکر حسین سے عموماً جامعہ ملیہ اسلامیہ ہی کی بات چیت ہوتی تھی۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے لئے ڈاکٹر صاحب نے اپنے آپ کو قربان کر دیا تھا۔ وہ جامعہ کے عاشق تھے اور ان کے عشق کو دوسرے بھی جانتے تھے اور انھیں حسرت موہانی کے برابر سمجھتے تھے۔

جناب کیتا مہیش

ذاکر پیارے

سارے وطن کے راج دلارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے
بھارت ماں کی آنکھ کے تارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

بنیادی تعلیم کے بانی، حُبِّ وطن کی زندہ کہانی
علم کے دریا امن کے دھارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

معمولی استاد سے بڑھ کر، بن گئے سارے مُلک کے رہبر
غم سے کبھی ہمت ہی نہ ہارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

گاندھی جی کی راہ کے رہرَو اور جواہرلال کے پیرَو
امن و اماں کے پالن ہارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

آزادی کے دیپ جلائے، تو نے وطن سے دور بھگائے
عہدِ غلامی کے اندھیارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

تو ہے مُلک کا رہبر سچا، کیوں نہ وطن کا بچہ بچہ
نام ترا عزت سے پکارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

ہندو مُسلم سکھ عیسائی کیفؔ سبھی ہیں بھائی بھائی
سب کی امیدوں کے سہارے صدرِ حکومت ذاکر پیارے

بچوں کی کوششیں

ہم نے دوا بنائی

یہ اب سے لگ بھگ پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ میں اس وقت کوئی نو برس کا تھا۔ میرے ایک ساتھی نے مجھے ایک دوا بنانے کی ترکیب بتائی۔ عجیب و غریب دوا! یہ دوا اس جگہ لگا دی جائے جہاں سانپ نے کاٹا ہے تو آدمی بچ جاتا ہے۔

میرے ساتھی نے مجھے بتایا کہ یہ دوا برسات کے دنوں میں بنائی جاتی ہے۔ مینڈک برسات ہی میں تو نکلتے ہیں۔ ان کے پھیپھڑے میں ایک تھیلی ہوتی ہے۔ اس تھیلی میں چھوٹی کالی گولیاں ہوتی ہیں۔ بس یہی گولیاں اس دوا کا اصلی جزو ہیں۔ مینڈک جب ٹرٹر کرکے چلاتا ہے تو گولیوں کی تھیلی باہر نکل آتی ہے۔ چلانا بند کر دیتا ہے تو پھر اندر پھیپھڑے میں چلی جاتی ہے۔ ہمارا خیال تھا کہ اسی گولی والی تھیلی کو کاٹ لیں گے۔

خدا خدا کرکے برسات آئی۔ ایک دن ہم لوگوں نے ایک مینڈک پکڑا۔ گولی والی تھیلی اس کے منہ کے اندر تھی۔ اسے نکالنے کے لیے ایک سلائی [illegible] مینڈک کو [illegible] پھینک دیا گیا۔ خیال تھا کہ گرمی سے گھبرا کر وہ منہ کھول دے گا ــــ مگر یہ کیا ــــ پانی میں گرتے ہی مینڈک اتنی زور سے اچھلا کہ پاس کے تالاب میں جا گرا۔ اور پھر اس نے منہ نہیں نکالا۔

میں دوا بنانے کے لیے سب سے زیادہ بےتاب تھا۔ جلدی سے دوڑا دوڑا گیا اور ڈھیلے لے کر تالاب میں پھینکنے لگا۔ اسی دوڑ دھوپ میں پیر پھسل پڑا، [illegible] چت ہوگیا۔ سارے کپڑے خراب ہو گئے۔ گھر پہنچا تو ابا نے پہلا سوال کیا میں نے تو گھر سے باہر نکلنے کو منع کیا تھا پھر تم کہاں گرے؟ کیسے گرے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے سب حال بتا دیا۔ پھر تو ابا کا غصہ اور بھی [illegible] مرمت ہوئی۔

آج بھی برسات کے دنوں میں مینڈک ٹرٹر کرتے ہیں تو یہ واقعہ یاد آ جاتا ہے اور اپنے بھولے پن اور حماقت پر ہنسی آتی ہے۔

ــــــــ (شاہ نواز [illegible])

ایمان داری کا انعام

احمد ایک غریب لڑکا تھا مگر [illegible]

اس کا باپ محنت مزدوری کرتا تھا۔ مگر بہت سمجھ دار تھا۔ اس نے احمد کا نام ایک ہائی اسکول میں لکھوا دیا تھا۔

احمد کے باپ کو [illegible] کے بعد جو پیسے بچتے تھے ان میں سے تھوڑے سے پیسے احمد کے اسکول کی فیس کے ضرور بچا لیا تھا۔ یہ تھوڑے تھوڑے مہینے کے آخر میں پانچ روپے بن جاتے تھے۔ اسکول کی فیس اتنی ہی تھی۔

پھر ایک دفعہ پیسوں میں کمی رہ گئی۔ کل تین روپے ہو پائے۔ اب تو احمد اور اس کا باپ دونوں بہت پریشان ہوئے۔

احمد کے گھر کے پاس ہی اسٹیشن بھی تھا۔ ایک دن جی کڑا کر کے احمد اسٹیشن چلا گیا۔ اس نے سوچا میں خود محنت مزدوری کر کے یہ پیسے پورے کروں گا۔

اسٹیشن پر ایک شریف عورت اس سے سامان اٹھوانے پر راضی ہو گئی۔ احمد نے یہ سامان اس کے گھر تک پہنچا دیا۔ عورت بہت شریف تھی۔ اس نے بٹوے میں سے ایک نوٹ نکال کر اسے دیا اور کہا یہ تمہاری مزدوری ہے۔ احمد بہت خوش ہوا۔ فیس میں اب صرف ایک روپے کی کمی رہ گئی تھی۔

لیکن گھر پہنچ کر اس نے نوٹ کو غور سے دیکھا تو وہ دو روپے کا نکلا۔ وہ فوراً بھاگتا ہوا اسی عورت کے گھر گیا اور نوٹ واپس کرتے ہوئے بولا۔ غلطی سے آپ نے ایک روپے کی جگہ دو روپے کا نوٹ مجھے دے دیا ہے۔

عورت احمد کی ایمان داری سے بہت خوش ہوئی۔ بولی نوٹ واپس کرنے کی ضرورت نہیں۔ ایک روپیہ تمہاری مزدوری کا ہے اور ایک روپیہ تمہاری ایمان داری کا انعام ہے۔

اب فیس کے پانچ روپے پورے ہو چکے تھے، احمد نے دوسرے ہی دن اسکول میں داخل کر دیے۔ سال کے آخر میں اسکول کا نتیجہ نکلا۔ احمد اپنی جماعت میں اوّل آیا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر میں ایمان داری سے کام نہ لیتا تو یہ سال برباد ہو جاتا۔ آج وہ سچ مچ بہت خوش تھا

—— ناگوری محمد ابراہیم۔ باندرہ اسکول بمبئی۔

کس کی مدد کی جائے؟

انگریزی کا ایک ناول ہے ٹریژر آئی لینڈ یعنی خزانوں کا دیس۔ اس ناول کا ہیرو جیم اپنے ساتھیوں کو خبر کیے بغیر اس جہاز پر قبضہ کرنے چلا جو دشمنوں کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

وہ جہاز میں پہنچا تو دیکھا کہ ایک آدمی پڑا کراہ رہا ہے۔ جیم نیک آدمی تھا اس سے اس آدمی کی حالت دیکھی نہ گئی۔ اس کے زخموں پر پٹی باندھی، دوا پلائی، دوا علاج سے وہ اچھا ہو گیا۔

ایک دن وہ اپنا جہاز چلا رہا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ وہی آدمی حملے کے لیے کھلا چاقو لیے دوڑا چلا آ رہا ہے۔ جیم حیران رہ گیا۔ اس نے دل میں سوچا بد فطرت آدمی کے ساتھ کتنی ہی بھلائی کی جائے وہ نیکی نہیں کر سکتا۔ فوراً پلٹ پڑا۔ اس کا مقابلہ کیا اور قابو پا کر نیچے گرا دیا۔

—— حسین [illegible]

انوکھی تدبیر

کہتے ہیں ایک بادشاہ تھا۔ یہ بڑا ظالم تھا۔ آس پاس کے تمام بادشاہ اس سے عاجز آگئے تھے۔

ایک دن وہ اپنے وزیر کے ساتھ ایک دریا میں کشتی پر سیر کر رہا تھا۔

بادشاہ نے دیکھا کہ اپنے ملک کا دریا دوسرے ملک (جہاں کا بادشاہ اس کا دشمن تھا) کو بھی جا رہا ہے فوراً غصہ میں بھر کر کہا آج رات ہونے تک اس دریا کو روک دینا چاہیے اور اس دریا کے پانی سے اپنا ہی ملک سیراب ہونا چاہیے۔

وزیر بڑا سٹپٹایا لیکن شاہی حکم کو کیسے ٹالتا۔ کئی ہزار مزدوروں نے شام تک دریا پر بند باندھ کر دریا کو روک دیا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا۔

اب وزیر نے ایک تدبیر نکالی اور گھنٹہ گھر کے نوکر سے جا کر کہا کہ وہ کل گھڑی کو دو تین گھنٹہ تیز کر دے گھنٹہ گھر بادشاہ کے سونے کے کمرے کے پاس ہی تھا۔

ٹن ٹن ٹن ٹن۔ ٹن ٹن ٹن ٹن آٹھ بج گئے۔

بادشاہ ہر روز آٹھ بجے اٹھتا تھا تو حسب معمول آج بھی اٹھا لیکن سورج ابھی تک نہ نکلا تھا۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔

بادشاہ نے فوراً وزیر کو بلوایا اور وجہ دریافت کی۔

وزیر نے کہا۔ حضور جو آپ نے دریا کو کل روک دیا ہے شاید اسی طرح اُس ملک کے بادشاہ نے سورج کو روک لیا ہوگا۔

بادشاہ سوچ میں پڑگیا اور بولا اگر ایسا ہے تو پل کو توڑ دیا جائے۔

پھر کیا تھا ہزاروں مزدوروں نے دو گھنٹوں میں بند توڑ دیا۔ اتنے میں سورج بھی نکل آیا۔

سورج کو دیکھ کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور پھر کبھی آس پاس کے بادشاہوں سے بدسلوکی نہ کی۔ اس طرح عقلمند وزیر نے اس انوکھی تدبیر سے بادشاہ کو کتنا اچھا سبق دیا۔

مبشر احمد

دنیا کی کچھ بڑی چیزیں

۱۔ دنیا میں سب سے بڑا سنیما ہال نیویارک میں ہے اس کا نام روکسی ہے اور اس میں ۶۰۰۰ آدمی بیٹھ سکتے ہیں۔

۲۔ دنیا میں سب سے بڑا ریلوے اسٹیشن نیویارک میں ہے جس کے ۶۷ پلیٹ فارم ہیں۔

۳۔ دنیا میں سب سے بڑی سرنگ سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کے درمیان ہے جس کی لمبائی ۱۲ میل ۲۶۸ گز ہے۔

۴۔ دنیا میں سب سے بڑی سڑک گرانڈ ٹرنک روڈ ہے۔ یہ کلکتے سے پشاور تک جاتی ہے۔

۵۔ دنیا میں سب سے بڑا ڈاک خانہ لندن میں ہے۔

۶۔ دنیا میں سب سے بڑا پھول جاوا میں ہوتا ہے جس کا قطر ۳ فٹ ہوتا ہے۔

۷۔ دنیا میں سب سے بڑی خلیج 'میکسیکو' ہے

۸۔ دنیا میں سب سے بڑی گھڑی 'بگ بین' ہے جو لندن میں ہے۔

۹۔ دنیا میں سب سے بڑا بحرِ اعظم 'بحر پاسفک' ہے۔

۱۰۔ دنیا میں سب سے بڑا جزیرہ 'گرین لینڈ' ہے۔

۱۱۔ دنیا میں سب سے بڑا ملک 'چین' ہے (آبادی کے لحاظ سے)

۱۲۔ دنیا میں سب سے بڑا شہر 'ٹوکیو' ہے (آبادی کے لحاظ سے)

۱۳۔ دنیا میں سب سے بڑا عجائب گھر لندن کا 'برٹش میوزیم' ہے۔

۱۴۔ دنیا میں سب سے بڑا پارک امریکا کا 'یلو اسٹون نیشنل پارک' ہے۔

—— نصرت حسین

سچی مسرت

ایک بوڑھا آدمی تھا۔ یہ ڈلیاں، ٹوکریاں، پٹارے وغیرہ بنایا کرتا تھا اور اسی سے اپنی گزر اوقات کیا کرتا تھا۔ دن بھر گھر میں بیٹھا کام کرتا رہتا اور شام کو بازار جاکر انھیں بیچ آتا۔ کبھی کبھی سوچا کرتا کہ کس طرح اپنی آمدنی بڑھائے کہ زندگی اور بھی سکھ چین سے گزرے۔

ایک دن بوڑھا بہت سی ٹوکریاں اور پٹارے لیے بازار جا رہا تھا۔ راستے میں گاؤں کے زمیندار کی نظر اس پر پڑی۔ زمیندار نے اپنے پاس بلایا اور اس کی کاریگری کی بہت تعریف کی۔ ایک خوبصورت سے پٹارے کے دام پوچھے۔ بوڑھے نے مسکراتے ہوئے کہا جو آپ کی مرضی ہو۔ اس نے سو روپے کا نوٹ اسے دیا۔ پہلے تو وہ سمجھا کہ زمیندار مذاق کر رہا ہے لیکن جب زمیندار نے کہا کہ میں مذاق نہیں کر رہا ہوں۔ یہ تمھاری کاریگری کا انعام ہے۔ اسے رکھ لو تو اس نے وہ روپے لے لیے اور خوش خوش گھر کو روانہ ہوا۔ آج وہ پھولے نہیں سما رہا تھا اور اسی خیال میں ڈوبا ہوا تھا کہ اللہ نے اس کی سن لی ہے جو اتنا بڑا انعام ملا۔ لیکن ایک فکر بھی پیدا ہو گئی کہ اس روپے کو رکھے کہاں؟ اس نے رات کو سوتے وقت خوب احتیاط سے کھڑکیاں اور دروازے بند کیے۔ سونے کی جگہ پر گڑھا کھودا روپے وہیں دفن کر دیے۔ اسی پر بستر بچھا کر سو رہا۔ لیکن اس رات وہ چین کی نیند نہ سو سکا۔ سوتے سوتے چونک پڑتا کہ کوئی چور تو گھر میں داخل نہیں ہو گیا۔ اسی کشمکش میں صبح ہوئی۔ کام پر اس کا دل نہیں لگ رہا تھا اور نہ چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ آخر ایک دن وہ اس نوٹ کو لے کر زمیندار کے گھر پہنچا اور کہا حضور میں یہ انعام آپ کو واپس کرنے آیا ہوں۔ اس نے کئی دنوں سے دل کی خوشی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ چرائی ہے۔ مجھے ایسا انعام نہیں چاہیے۔ اسے آپ رکھ لیں اور میرا آرام واپس کر دیں۔ زمیندار نے ہنس کر روپے لے لیے اور پٹارے کی اصل قیمت دے دی۔ جب وہ گھر پہنچا تو ایسا لگا جیسے دل پر کا کوئی بوجھ اٹھا ہوا تھا اور ابھی ابھی اسے مکمل اطمینان حاصل ہوا ہو۔

—— [illegible]

قلمی دوستی

- نام: ارشاد احمد رہتاسوی عمر: ۱۴ سال
پتہ: دکھنواری۔ موضع اکبرپور۔ ڈاک خانہ
رہتاس۔ ضلع شاہ آباد
مشغلہ: کہانی لکھنا۔ نیے نیے پرچوں کا مطالعہ کرنا

- نام: اے رشید۔ عمر: ۱۴ سال
پتہ: ڈاک خانہ شری پور۔ ضلع بردوان
(مغربی بنگال)
مشغلہ: قلمی دوستی پرچوں کا تبادلہ

۱۰۔ نام: اے عبدالرحیم عمر: ۱۴ سال
پتہ: ۸ بڑی گلی۔ میل وشارم
(این۔ اے۔ ڈی۔ ٹی)
مشغلہ: ٹکٹ جمع کرنا۔ پیام تعلیم پڑھنا۔
قلمی دوستی وغیرہ

۱۲۔ نام: ابوالحسنات عمر: ۱۴ سال
پتہ: معرفت عبدالرحمٰن [illegible] [illegible]
[illegible] مظفرپور (بہار)

۱۳۔ نام: نزہت سلطانہ عمر: ۱۳ سال
پتہ: [illegible] [illegible] پاکستان [illegible]

ورنگل۔
مشغلہ: کہانیاں پڑھنا اور سنانا۔ [illegible]
پیام تعلیم پڑھنا

۶۔ نام: سید محمد نعیم اختر عمر: ۱۴ سال
پتہ: معرفت سید محمد اسماعیل جامعی۔ قاضی محلہ
شیرگھاٹی۔ (ضلع گیا)

۷۔ نام: رضوانہ عباسی عمر: ۱۴ سال
پتہ: معرفت جناب اے لے عباسی [illegible]
چھتر پور (مدھیہ پردیش)
مشغلہ: پیام تعلیم کی کہانیاں اور مضمون پڑھنا
ڈرامے اور مباحثے میں حصہ لینا۔
(حیدرآباد یا بمبئی کی پیامی بہن سے دوستی کی خواہش
ہے)

نام: محمد نثار عمر: ۱۲ سال
پتہ: معرفت محمد ظفر بی اے صابن گھر پورہ
امراوتی۔
مشغلہ: اخبار اور کتابیں پڑھنا۔ کتابیں اور
پیسے کے جمع کرنا۔ قلمی دوستی۔

مرتبہ: ام۔ وانی لکھنوی۔

اسکولوں کی تعلیمی اور تفریحی سرگرمیاں

یوم والدین کا جلسہ

۲۵ر جنوری ۲ بجے شام کو سینٹ زیویرز ہائی اسکول میں کوچہ گرلس ہائی اسکول کا جلسۂ یوم والدین اور تقسیم انعام موسیقی اور ڈراموں پر مشتمل یہ کلچرل پروگرام بے حد کامیاب ہوا

اس پروگرام کی ابتداء قرأت اور حمد سے ہوئی۔

اردو ڈرامہ "گوشۂ عافیت" اس پروگرام کا بہترین آئٹم تھا۔ کرداروں نے بڑی کامیاب اور فطری اداکاری کی۔ اس ڈرامہ کی قوالی نے آئٹم کو اور زیادہ رنگین اور دلچسپ بنا دیا۔

ننھے منے بچوں کا "گربا ڈانس" اور ثانوی جماعت کے "کولی رقص" پر حاضرین جھوم جھوم اٹھے۔ یہ رقص اعلیٰ فن کا مظاہرہ پیش کیے گئے۔

ہندی ڈرامہ "ریڑھ کی ہڈی" بہت پسند کیا گیا طنز و ظرافت کی حسین آمیزش تھی۔

انگریزی ایکٹ 'THRE. BAGS FULL' کو دلچسپ پیش کیا گیا۔ اداکاروں کا لب و لہجہ اچھا تھا۔ غزلوں اور نظموں کا مجموعی انتخاب بڑا معیاری تھا۔ ایک مختصر تقریر کے بعد انعامات تقسیم کیے گئے۔

اسکول کی پرنسپل محترمہ محفوظ سنواروالا نے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ والدین اپنے بچوں کی تعلیمی

ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں میں دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ نے کہا کہ والدین کو چاہیے کہ اہم معاملات اور پیچیدہ مسائل کے حل کے لیے اسکول سے براہ راست رابطہ قائم رکھیں۔ اکثر معاملات میں والدین کا تعاون نہایت ضروری ہے۔

مسز طیب جی نے اپنے صدارتی خطبہ میں کہا کہ اردو سے گہری دلچسپی اور اس ادارے کی روز افزوں ترقی مجھے اس محفل میں کھینچ لائی ہے۔ آپ نے مزید کہا کہ مجھے مسرت ہے کہ اس ادارے میں تقریباً سوا ہزار طالبات زیور تعلیم سے آراستہ ہو رہی ہیں اور ۱۹۴۲ء میں قائم کردہ اس ادارے کا ثانوی مدرسہ اب عنقریب اپنی سلور جوبلی منائے گا۔

مہمان خصوصی محترمہ مسز نورجہاں رضوی نے پروگرام کو سراہتے ہوئے کہا کہ زمانہ بڑی سرعت سے ترقی کر رہا ہے۔ اب تعلیم کا مقصد صرف ذہنی نشوونما ہی نہ ہونا چاہیے۔ تعلیم ایسی ہو کہ بچوں کی شخصیت کا ہر پہلو نکھر اور سنور سکے

قومی گیت کے بعد شام ۵ بجے یہ پروگرام ختم ہوا [illegible]

بھیونڈی میں تقریری مقابلہ

۳۰ر جون ۱۹۸۰ء ساڑھے تین بجے دوپہر "بزم نسواں ہلال شہر" کی جانب سے بھیونڈی میں ایک تقریری مقابلہ منعقد کیا گیا۔ جلسہ کی صدارت رئیس ہائی اسکول بھیونڈی گرلس سیکشن کی صدر صاحبہ محترمہ مسز خورشید شیخ نے فرمائی۔ جج کے فرائض مسز عزیزہ گوانداز، مسز زہرہ چیلی اور مسز شاکرہ بوبیرے نے ادا کیے۔ اناؤنسنگ کے فرائض محترمہ صفیہ ہانی نے ادا کیے۔

پہلا انعام رئیس ہائی اسکول کی طالبہ شاداں زید۔ عابد نے حاصل کیا۔

دوسرا انعام میونسپل اردو گرلس اسکول نمبر ۸ کی طالبہ نسرین فرید نے حاصل کیا۔

تیسرا انعام میونسپل اردو گرلس اسکول کی طالبہ فرخندہ کو ملا۔

مقابلے میں حصہ لینے والی اور طالبات کو حوصلہ افزائی کے لیے اسلامی کتابیں انعام کے طور پر دی گئیں۔ یہ انعام صدر صاحبہ محترمہ مسز خورشید شیخ نے تقسیم فرمائے۔

تقسیم انعامات کے بعد صدر صاحبہ نے حضرت محمد صلعم کے حالات (پیدائش تا وصال) بیان فرمائے جسے سامعین نے نہایت عقیدت سے سنا۔ تقریر کے بعد صدر صاحبہ اور مہمانوں کی خدمت میں پھولوں کے ہار پیش کیے گئے۔

اناؤنسر محترمہ صفیہ ہانی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

ٹیچرس سرکل کا تحریری مقابلہ

ماہ اپریل ۱۹۸۰ء میں ٹیچرس آرٹس سرکل کی جانب سے مضامین اور کہانیوں کا مقابلہ رکھا گیا تھا۔ اس مقابلے میں بمبئی کے کئی ہائی اسکولوں اور پرائمری اسکولوں کے لڑکوں اور لڑکیوں نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیا اور پرنسپل نے، صدر مدرسین نے اور اساتذہ نے تعاون کیا۔ اس کے دو گروپس کے ججوں اور انعام پانے والے طلبا و طالبات اور اسکول کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

پہلا گروپ :۔ معیار ہشتم تا میٹرک (سینیر گروپ)

عنوان :۔ میرا پسندیدہ شاعر

جج صاحبان :۔ جناب شاہد علی خاں صاحب منیجر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ بمبئی۔ محترمہ رفیعہ شبنم صاحبہ بی اے آنرز

انعام پانے والے طلبا :۔ اس گروپ کے لیے منیر الزماں ثرائی انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول مدنپورہ بمبئی نے حاصل کی۔

پہلا انعام :۔ حسن بانو بنت سید۔ انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول بمبئی۔ جماعت دہم الف۔

دوسرا انعام :۔ سیدہ بنت منظر علی۔ انجمن خیر الاسلام گرلز ہائی اسکول بمبئی۔ جماعت دہم ب

تیسرا انعام :۔ محمد سلیم ابن ابراہیم۔ باندرہ اردو ہائی اسکول بمبئی، جماعت یازدہم

کنسولیشن پرائز :۔ عثمان ابن علی، مدنپورہ نائٹ ہائی اسکول جماعت دہم ب

دوسرا گروپ :۔ معیار چہارم تا ہفتم (جونیر گروپ)

ثانی :۔ "میری دل پسند کہانی"

صاحبان :۔ [illegible]علاؤالدین چیناجڑے ۔ ایم ۔ اے ۔ ایل ایل بی
جناب [illegible]ن خورشتر مدیر روزنامہ "انقلاب"
محترمہ ز[illegible] اکبر ۔ بی اے ، آنرز

پہلا انعام :۔ محمد عثمان ابن عبدالغنی ۔ نیشنل ہائی اسکول ، کلیان جماعت ہفتم

دوسرا انعام :۔ شاہین ناز بنت رفیع الدین ۔ انجمن خیرالاسلام گرلز ہائی اسکول بمبئی ۔ جماعت ہفتم ۔

تیسرا انعام :۔ عبدالخالق ابن عبدالرشید ، ٹیگور نگر پرائمری میونسپل اردو اسکول بمبئی جماعت چہارم

حوصلہ افزائی پرائز :۔ دانش الحق ابن عبدالغنی ، ناگپاڑہ میونسپل اردو اسکول ۔ جماعت ہفتم ۔

حوصلہ افزائی پرائز :۔ نسرین فاطمہ بنت رضوی ، وکرولی پارک میونسپل اردو اسکول بمبئی ۔ جماعت ہفتم ۔

قلابہ اردو اسکول میں اسکول پارلیمنٹ قایم کی گئی

۵ ر جولائی ۶۷ء کو زیر سرپرستی جناب عبداللہ صاحب (صدر مدرس) اور دیگر معاونین کی نگرانی میں اسکول پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آیا ۔

چناؤ میں طلباء نے بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہوئے وزارت کے لیے مندرجہ ذیل نمائندوں کا انتخاب کیا ۔

۱ ۔ وزیر اعظم کوثر فاطمہ ۲ ۔ وزیر تعلیم منور نادی ۳ ۔ وزیر خارجہ محمد اقبال ۴ ۔ وزیر صحت و صفائی نورالحسن ۵ ۔ وزیر لائبریری مشتاق احمد ۶ ۔ وزیر نظم و نسق قمر جہاں

مرسلہ محمد اقبال

بالارام اسٹریٹ میونسپل اردو اسکول میں اسکول کابینہ کا چناؤ ۔

۲۹ ر جولائی ۶۷ء کو بالارام اسٹریٹ میونسپل اسکول میں کابینہ کا چناؤ ہوا پنجم سے ہفتم تک کے طلباء نے ووٹ دیے طلباء کی تعداد ۵۱۲ تھی ۔

یہ چناؤ دو پارٹیوں کے درمیان ہوا ۔ ایک پارٹی کا نام تھا "الہلال" جس کا نشان گھوڑا تھا ۔ دوسری پارٹی نونہال تھی جس کا نشان گائے تھا ۔ "الہلال" پارٹی کو صرف ۸۲ ووٹ ملے "نونہال" پارٹی کو ۴۵۹ ووٹ ملے ۔ نونہال پارٹی کے کل ۱۵ امیدواروں میں سے تیرہ امیدوار جیت کر آئے ۔ کامیاب امیدواروں کے نام یہ ہیں ۔

(۱) عبدالحمید اسمٰعیل (ہفتم الف) نونہال ۲ ۔ ناظم علی معشوق علی (ہفتم ب الہلال) ۳ ۔ فریدہ اسمٰعیل (ہفتم ج نونہال) ۴ ۔ نیلوفر نیاز الدین (ششم الف الہلال) ۵ ۔ نور محمد غلام رسول (ششم ب الہلال) ۶ ۔ بلقیس عبدالرشید (ششم ج الہلال) ۷ ۔ کامران محمد یٰسین (ششم د الہلال) ۸ ۔ عبدالقادر عبدالغفار (ششم ہ الہلال) ۹ ۔ رقیہ فرید خان (پنجم الف الہلال) ۱۰ ۔ محمد عارف یعقوب (پنجم ب الہلال) ۱۱ ۔ دلاور حسین امداد علی (پنجم ج الہلال) ۱۲ ۔ رخسانہ عبدالحق (پنجم د الہلال) ۱۳ ۔ ضیاء الرحمٰن مطلوب الرحمٰن (پنجم د الہلال) ۱۴ ۔ رشیدہ ناظم علی (پنجم د الہلال) عبدالمجید حبیب (پنجم د الہلال)

مرسلہ محمد اقبال

ڈھی ملاقات

ذاکر نمبر ملا

برادرم حسین حسّان صاحب۔ تسلیم۔

کل ذاکر نمبر ہاتھ میں آیا تو ساری دوپہر پڑھنے میں گذار کر ہوش اس وقت آیا جب یوم محروم میں شرکت کا وقت آچکا تھا۔ ملک بھر کے بچوں کے ساتھ ساتھ میں بھی پیام تعلیم کے ذاکر نمبر کی بے چینی سے منتظر تھی۔ دوستوں کی اس محفل میں شرکت کی دعوت مجھے بھی ملی تھی۔ مصروفیت، بیماریاں اور پریشانیاں تو دم کے ساتھ ہیں اور وہ لکھنے میں بہت زیادہ حارج نہیں ہوتیں مگر اسی سوچ میں وقت گزرتا گیا کہ چونتیس سال کے ان واقعات اور تعلقات کو جو ذاکر صاحب سے رہے ہیں کس طرح سمیٹوں، اس محبت اور عقیدت کو جوان سے ہے کس طرح ظاہر کر سکوں گی؟ یا کون سا گوشہ چنوں اس کا۔ اور اسی حیص بیص میں وقت نکل گیا، دوسرے دوست بازی لے گئے اور میں اس بزم میں شرکت سے محروم رہ گئی جس کا قلق ہے اور رہے گا۔

ذاکر صاحب پر یوں تو برسوں سے لکھا جا رہا ہے۔ ان کے قریبی دوستوں نے بھی لکھا ہے اور عقیدت مندوں نے بھی اور اب تو جب سے وہ صدر جمہوریۂ ہند ہوئے ہیں، ذاکر صاحب پر مضامین اور رسالوں اخباروں کے نمبروں کی اردو میں تو بھرمار ہو رہی ہے۔ ان میں بعض اچھی چیزیں، اچھے مضمون بھی ہوتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر معاملہ بھرتی کا نظر آتا ہے اور ایک دو کے سوا کوئی نمبر ایسا نہیں جو ذاکر صاحب کی بھرپور شخصیت تو کیا سامنے لاتا، ان کی پوری تصویر ہی سامنے کھینچ سکتا۔ شاید اس کی بڑی وجہ یہ ہو کہ لکھنے والے زیادہ تر ایسے ہیں جنھوں نے ذاکر حسین صاحب کو یا دور سے دیکھا یا سنا اور پڑھا ہے۔ وہ ان سے مرعوب اور متاثر تو ضرور ہیں مگر ان سے زیادہ واقف نہیں۔ لیکن ہمارے پیام تعلیم کا ذاکر نمبر بچوں ہی کے لیے نہیں بڑوں کے لیے بھی اتنا ہی مفید، معلوماتی اور قابل قدر ہے جس نے ذاکر صاحب کی (صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین کی نہیں) شخصیت کا بڑا دلکش اور دلپذیر مرقع پیش کیا ہے۔

مضمون یوں تو ماشا واللہ سبھی اچھے ہیں کئی نظمیں بہت پر اثر ہیں مگر بعض مضامین خاص طور پر مجھے بہت پسند آئے ان میں آصفہ مجیب کا مضمون "ذاکر صاحب" سعیدہ خورشید کا "میاں" غلام حیدر نقوی کا

"ہاتھی کی پیٹ" عبدالسلام قدوائی کا "کھانے کا خوان" حفیظ الدین صاحب کا "امتحان" سید احمد علی صاحب کا "اچھے ساتھی اچھے رہنما" ادارہ کا "کام کرنے والے" خاص طور پر بہت پر اثر ہیں۔ انھیں چھوٹی چھوٹی باتوں سادہ سادہ واقعات نے ذاکر صاحب کی سادہ اور پرکار شخصیت میں غضب کی کشش اور حسن پیدا کیا ہے۔

جو لوگ مفکر، ماہر تعلیم، ماہر معاشیات، سیاست داں صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کو جاننا پہچاننا چاہتے ہیں بہت سے دوسرے رسالوں، اخباروں اور کتابوں کے ذریعے ان کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔ البتہ جو ہمارے ــــ جامعہ کے ــــ پرانے ساتھی، کارکن، دوست، سرپرست، رہنما ذاکر صاحب سے ملنا چاہتے ہیں وہ پیام تعلیم کے اس ذاکر نمبر کی معرفت بھی ان سے مل کر انھیں جان پہچان سکتے ہیں۔ بڑے قریب سے۔

اس نمبر کی کامیابی پر آپ کو، ادارہ مکتبہ جامعہ کو اور اس کے سب لکھنے اور پڑھنے والوں کو مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

صالحہ عابد حسین

محترمی حسین حسان صاحب۔ سلام مسنون

"ذاکر نمبر" پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ اتنے اچھے اچھے مضامین کو اکٹھا کر کے آپ نے وہی کام کیا ہے جس کی آپ سے امید تھی اور جو آپ ہی کر سکتے تھے۔

یوں تو سب ہی مضامین اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں لیکن مجھے خاص طور پر وہ مضامین اچھے لگے جن میں زندگی اور زندہ دلی کی باتیں بتائی گئی ہیں۔ ہمارے دیس کے صدر کو آج سارا جہان پہچان رہا ہے۔ تعلیمی دنیا میں نظر رکھنے والوں نے انھیں پہلے ہی تاڑ لیا تھا۔ لیکن اس انسان کو وہی اچھی طرح جانتے اور پہچانتے ہیں جو اُس کے اُنس سے واقف ہیں اور جنھوں نے اس کی انسانیت دیکھی ہے۔ آپ کے لکھنے والوں میں قریب قریب سبھی ایسے ہیں جنھوں نے اپنی بات اس ذات سے کوئی نسبت رکھنے کی بنا پر کہی ہے۔ اس طرح آپ ایک بڑے آدمی، بہت بڑے آدمی، کی زندگی کی جن چھوٹی چھوٹی باتوں کو سامنے لائے ہیں، وہ چھوٹوں کو بڑا بنانے میں یقیناً مددگار ثابت ہوں گی۔

مجھے صرف ایک مضمون "پھول کی پتی"[1] کھٹکا کیوں کہ اس کا رنگ مصنوعی اور نہک خیالی ہے۔ آپ نے ایک مشہور ادیب کے دو مضمون شامل فرمائے

---

[1] ہاں بھئی اس مضمون نگار بچی نے جو کچھ لکھا ہے، اپنے تخیل کے زور سے لکھا ہے اور حقیقی داستانوں کے مقابلے میں اس فرضی داستان کا شامل ہونا کچھ بے جوڑ سا ہو گیا ہے۔

(ایڈیٹر)

ہیں۔ پہلا مضمون، بڑوں کے سمجھنے کا ہے، بچوں کے پڑھنے کا نہیں۔ دوسرے مضمون میں اتو خانی اور ان کی بکری دونوں ذاکر صاحب کی کہانی 'ابو خاں کی بکری' سے نام کا تعلق رکھتے ہیں۔ اب رہ گئے 'چاچی بُبا'! ان کا مذاق اور مزاج مجھے نہ پہلے کبھی پسند آیا اور نہ اب۔ چند غیر متعلق نظمیں بھی شامل ہیں لیکن وہ بوجھ نہیں بنتیں — آپ نے رسالہ کو تکرار سے بہت کچھ بچالیا ہے اس سے آپ کی محنت کا اندازہ ہوتا ہے۔

دو تین جگہ لکھنے والے کے نام کے ساتھ اس کا کچھ اتا پتا بھی درج ہو گیا ہے، ایسا نہ ہوتا اچھا ہے یا پھر کوئی ایک ڈھنگ اپنایا جائے تو ٹھیک رہے۔ یوں رسالہ خوب چھپا ہے۔ سب سے اوپر کا ورق کیا کہنا! لکھائی کی غلطیاں بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ بہت معمولی سی کاٹ چھانٹ کے بعد اگر آپ ذاکر نمبر کو کتابی شکل دے دیں تو اچھا ہو۔

مجھے یقین ہے کہ آپ کو اور لکھنے کو بڑے بڑوں سے داد ملے گی۔ میں نے تو ایک چھوٹے ساتھی کی حیثیت سے آپ کی مروّت کا فائدہ اٹھا کر بس اپنی بات کہی ہے۔ والسلام

عبداللہ ولی بخش قادری

"ان کی بھی سنیے"

بھائی جی!

آپ کو تو السلام علیکم لیکن آپ کے پیامِ تعلیم کے 'ذاکر نمبر' پر ہزار بار لعنت ہے۔ ڈیپارٹمنٹ کے اپنے کمرے میں صبح دس بجے کے قریب بیٹھا لکچر تیار کر رہا تھا۔ ½ ۱۰ بجے کلاس لینا تھی۔ 'ذاکر نمبر' ڈاک سے آیا تھا، چپراسی لا کر دے گیا.........

اب رسالہ ہاتھ سے رکھ کر گھڑی دیکھتا ہوں تو ڈیڑھ بجا ہے۔ چپراسی کمرے کی کھڑکیاں بند کر کے جا چکا ہے۔ ½ ۱۰ بجے لڑکوں نے کلاس میں انتظار کیا ہوگا۔ ممکن ہے میرے کمرے میں جھانک جھانک کر لوٹ گئے ہوں۔ کبھی چھٹی نہیں دیتا۔ آج موقع غنیمت سمجھ کر بھاگ لیے ہوں گے۔ اب بھلا بتائیے لعنت نہ بھیجوں تو اور کیا کروں؟

آپ کا

سلمان

(علی گڑھ یونیورسٹی)

۱؎ بچوں کے لیے لکھنا، مضمون نگار نے بچوں کے لیے لکھا ہے اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے بچوں کی سطح تک اترنے کی پوری کوشش کی ہے جو لیے میں نے اپنے نوٹ میں اشارہ کر دیا ہے کہ بچوں کے ادیب اور شاعر بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

اِدھر اُدھر سے

شیرنی کٹہرے سے باہر

اگست کے آخری ہفتے میں دہلی کے چڑیا گھر میں بہت دلچسپ تماشا رہا۔ ہوا یہ کہ دن کے کوئی نو بجے چڑیا گھر کے اس حصے کی صفائی کی گئی جہاں پانچ شیر اور اتنے ہی چیتے رہتے ہیں۔ ایک شیرنی بھی یہیں ایک کٹہرے میں رہتی ہیں۔ چڑیا گھر والوں نے ان کا نام رتنا رکھا ہے۔ صفائی کرنے والا رتنا کے کٹہرے کا باہر والا دروازہ بند کرنا بھول گیا اور اندر کے پنجرے کا دروازہ کھول دیا تاکہ رتنا باہر کے حصے میں آ جائے اور اندر کے حصے میں صفائی ہو جائے۔

یہ بی رتنا قریب تین برس کی ہیں۔ یہیں دہلی چڑیا گھر میں ۱۹۶۳ء میں پیدا ہوئی تھیں اور جب سے اسی پنجرے یا کٹہرے میں ان کے دن بیت رہے تھے۔ آپ جانیے کھلی ہوا میں سیر سپاٹے کو ہر ایک کا جی چاہتا ہے۔ پھر آج کل تو برسات کا موسم ہے۔ دروازہ جو کھلا پایا تو نکل پڑیں گشت کو۔ اور شاہانہ انداز میں دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں۔ سفید شیر کو پنجرے میں دیکھ کر ذرا رکیں اور پھر چل پڑیں۔ اتفاق سے آج اتوار تھا اور لوگوں کی بھیڑ تھی۔

شیروں کی دیکھ بھال کرنے والے نے رتنا کو اس طرح آزادی سے گھومتے پھرتے دیکھا تو بے چارہ دھک سے رہ گیا اور لگا چیخنے چلانے "شیرنی بھاگ گئی"۔ چاروں طرف شور مچ گیا بہت سی عورتیں سفید شیر کے پنجرے کے پاس کھڑی تھیں وہ ایسی بدحواس ہوئیں کہ جوتے چھوڑ کر بھاگ گئیں۔

چڑیا گھر کے ڈائرکٹر نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور دوسرے افسروں کو بلا کر حکم دیا کہ ہانکا کیا جائے۔ تین طرف سے لگ بھگ سو آدمی شور مچاتے ڈھول بجاتے، پٹاخے چھوڑتے آگے بڑھے کچھ لوگ رتنا کے قریب پہنچ گئے اور لاٹھیاں ہلانے لگے مگر مہارانی رتنا نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ ایک صاحب نے ذرا اور بہادری دکھائی اور اپنی لاٹھی سے اسے چھو دیا۔ اب اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا جیسے اس آدمی کی گستاخی پر حیران ہو۔ اس کے بعد تین آدمی اور آگے بڑھے رتنا اس وقت بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے لوگوں کی یہ بے جا مداخلت شاید اچھی نہیں لگی اور پنجرے کی طرف چلی گئی۔ شاید تھک بھی گئی ہوگی۔ اتنی دور چلنے پھرنے کا اور سیر کرنے کا یہ پہلا ہی موقع تو تھا۔

شاباش کھلاڑیو!

ہندوستان لڑکوں کی کریکٹ ٹیم کچھ دن ہوئے، انگلستان پہلی مرتبہ گئی تھی۔ وہاں اس کا ریکارڈ بہت اچھا رہا۔ کل اٹھارہ ٹیسٹ میچ کھیلے ان میں سے نو جیتی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ ہونہار کھلاڑی ہندوستان کی بڑی ٹیسٹ ٹیموں میں شامل ہو کر شاندار کارنامے دکھائیں گے۔

انوکھا آدمی

عام انسانوں کی طرح اس کا دل دھڑکتا ہے۔ اس کی نبض چلتی ہے۔ خون کا دوران بھی عام انسانوں جیسا ہے۔ اس کی چمکتی ہوئی آنکھیں جھپکتی ہیں۔ رگیں پھڑکتی ہیں۔ اس کا گوشت پوست سب بالکل انسان جیسا ہے۔ اس کی کھال کو چھوئیے تو یہ لگے گا کہ کسی انسان کی کھال چھو رہے ہیں۔ اس کا منہ کھلتا اور بند ہوتا ہے اس کا ڈیل ڈول، آنکھ، ناک، کان، زبان، حلق، تالو، غرض سب کچھ انسانوں جیسا ہے۔ پھر بھی یہ انسان نہیں ہے۔

یہ امریکی سائنس دانوں کی ایک ایجاد ہے۔ آپ اسے مصنوعی انسان کا جیتا جاگتا ڈھانچہ کہہ لیجیے۔ یہ ڈھانچہ ڈاکٹری کے طالب علموں کو انسانی جسم کے فعل و عمل سے باخبر کرنے اور انسانی جسم پر مختلف تجربے کرنے کی غرض سے بنایا گیا ہے۔ آپ اسے "آدمی نما انسان" بھی کہہ سکتے ہیں۔

اس آدمی نما کے جسم میں سوئی چبھوئیے تو اس پر اسی طرح کا اثر ہوتا ہے جیسے کسی عام آدمی پر۔ اس سے ڈاکٹری کے طالب علموں کو کافی آسانی ہو گئی ہے۔ عام انسان کے مقابلے میں اس کے ذریعہ تجربہ کرنے میں کافی سہولت رہتی ہے۔ آپ کسی انسان کے درجہ حرارت کو اپنی مرضی کے مطابق گھٹا بڑھا نہیں سکتے ہیں۔ مگر آدمی نما کے جسم کے درجہ حرارت کو حسب ضرورت زیادہ کم کیا جا سکتا ہے اور کسی خاص درجہ حرارت پر جتنی دیر چاہے رکھا جا سکتا ہے۔ اس سے انسانی جسم پر درجہ حرارت کے کم زیادہ ہونے کے اثرات تفصیل سے سمجھانے میں ڈاکٹروں کو بہت مدد ملتی ہے۔ اسی طرح خون کے دوران کے اتار چڑھاؤ دل کی دھڑکن کی کمی اور زیادتی یہاں تک کہ حرکت قلب کے رک جانے کے اثرات کے مطالعے میں یہ آدمی نما عام انسان سے زیادہ مددگار ثابت ہو رہا ہے۔ یہ آدمی نما عام انسانوں کی طرح قے بھی کر لیتا ہے۔

امریکہ کی جنوبی کیلیفورنیا کی یونیورسٹی کے ماہرین نے اسے تیار کیا ہے۔

اپنے ڈھنگ کا یہ پہلا آدمی نما ہے۔ سائنس داں ابھی اس پر کام کر رہے ہیں۔ ان کے تجربوں سے اس کی نسل سدھرتی جائیں گے اور وہ دن دور نہیں جب کہ یہ مصنوعی انسان ڈاکٹری کالجوں میں عام ہو جائیں اور وہ پیسہ چھوڑئیے، کھانے اور کرایہ بھی لیں۔ سائنس داں اپنی کوششوں میں لگے ہوئے ہیں۔

چاند کے گڑھے کی تصویر

امریکہ نے کچھ دن پہلے آربیٹر نام کا مصنوعی سیارہ چاند کی تصویریں اتارنے کے لیے بھیجا ہے اس نے چاند کی سطح کے مشہور تاچو گڑھے کی تصویر اتار کر بھیجی ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ۵۴ میل کی گولائی اور تین میل گہرائی والا یہ گڑھا چاند کی سطح پر شہاب کے ٹکرانے سے بنا ہوگا۔ یہ گڑھا کافی چمکدار ہے اس سے پھوٹنے والی شعاعیں ایک ہزار میل تک پھیلی ہوئی ہیں۔ چاند کی سطح پر تاچو کی گولی جیسے سوراخ سے چاند کی سجاوٹ ایسی ہو گئی ہے جیسے نیلم میں کوئی ستارہ جڑا ہو۔

تاچو کا گڑھا چاند کی سطح کے ان ۲۶ علاقوں میں سے ایک ہے جو سائنس دانوں کے لیے سب سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ اس کا نام ڈنمارک کے سولہویں صدی کے ماہر فلکیات تاچو براہے کے نام پر رکھا گیا ہے۔

آگ اور پٹرول کا میل

آگ اور پٹرول ہمیشہ سے ایک دوسرے کے جانی دشمن سمجھے جاتے ہیں مگر اب روسی سائنس دانوں نے آگ کی مدد سے پٹرول نکالنے کی ایک عجیب و غریب ترکیب دریافت کر لی ہے۔

تیل آمیز ریتیلے پتھر سے بھرے ہوئے ٹیوب کو تجربے کے طور پر جب لیباریٹری کے چولھے پر تپایا جا رہا تھا اس وقت کسی کو یقین نہیں تھا کہ آگ جو پٹرول کی جانی دشمن ہے اس کی مدد سے پٹرول پتھر سے الگ بھی کیا جا سکتا ہے۔ تجربے میں پہلے تو ایسا لگا کہ آگ ریت میں ملے ہوئے تیل کو پکڑ رہی ہے مگر یہ آگ کچے پٹرولیم سے بننے والے ایندھن میں لگی تھی جب کہ صاف پٹرول ٹیوب کے سرے پر لگے ہوئے برتن میں گر رہا تھا۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ عرق کھینچا جاتا ہے۔

اس نئے طریقے سے تیل کے کنوؤں سے اب تین گنا تیل نکلنے لگا ہے۔

برقی لہروں سے پیٹ کی اندرونی سوجن کا علاج

روسی ڈاکٹر نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے پیٹ کی اندرونی سوجن کا علاج برقی لہروں کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔

یہ برقی لہریں جسم کے اندرونی حصوں سے گزرتی ہوئی نسوں کے اندرونی حصوں پر اثر انداز ہو کر سوجن کو ٹھیک کر دیتی ہیں۔ آنت کی بیماری کے علاج میں اب یہ طریقہ یہاں کافی مقبول ہو رہا ہے۔

پبلشر ... نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے لبرٹی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

نومبر

نقل کرنے سے پہلے : ڈاکٹر فضل الرحمن

نقل کرنے کے بعد : ڈاکٹر فضل الرحمن

شارق (کاشی) ۳ سال

رشید جہاں (بہار شریف)

صوفیہ سلطانہ (دہلی) ۹ سال

شبیر احمد (بمبئی) ۱۱ سال

افضل امام (کلکتہ) ۳ سال

انور شاہین (بہار شریف)

فردوس - جنا فردوس (کراچی)   محمد مصطفیٰ کمال (دہلی) ۹ سال   عارف عرفی (جامشورو)

شاہد خان رحیم یار خان

فہرست

بچوں سے باتیں

آپ کا ذاکر نمبر تو سچ مچ چھوٹوں اور بڑوں کو سب کو بہت
پھا لگا۔ اس کے بارے میں خطوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ ان میں سے
ہت سے خط تو اسی پرچے میں چھپ رہے ہیں، انھیں ضرور پڑھیے۔
ہت سے خط بعد میں آئے ہیں انھیں اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

ہمارے بہت سے بزرگوں نے تو اسے ایک تاریخی یادگار
رار دیا ہے۔ ایک صاحب انگریزی میں قبلہ ذاکر صاحب پر کتاب
کھ رہے ہیں۔ انھوں نے ذاکر نمبر سے فائدہ اٹھانے کی اجازت
انگی ہے۔ ایک صاحب نے تو زبانی بات چیت میں یہاں تک فرمایا
ہ اسے کورس کے طور پر بچوں کو پڑھانا چاہیے۔ بہر حال ہمیں
وشی ہے کہ یہ اچھا کام ہم سے بن پڑا۔ آپ بھی اسے بہت حفاظت
ے اپنے پاس رکھیے۔ اب یہ کسی قیمت پر نہ مل سکے گا۔

ہم الجمعیۃ (ہفتہ وار دہلی) اردو ٹائمز (اردو روزنامہ بمبئی) اور
ماری زبان (ہفتہ وار علی گڑھ) کے بھی احسان مند ہیں۔ ان تینوں
نے بہت موزوں الفاظ میں اس پر اپنی رائے لکھی۔ ہفت روزہ
لجمعیۃ نے تو اپنے بعض کے پرچے میں ذاکر نمبر کے اقتباسات
بھی شائع کیے ہیں۔ امید ہے کہ ہمارے دوسرے کرم فرما بھی
س طرف توجہ فرمائیں گے۔

ہمارے دفتر نے رسالہ بھیجنے میں پوری پوری احتیاط
برتی جاتی ہے۔ منیجر صاحب خود اس کام کی نگرانی کرتے ہیں پھر بھی
شکایتیں آتی رہتی ہیں مگر "ذاکر نمبر" کے سلسلے میں تو کمال ہو گیا۔
اتنی شکایتیں آئی ہیں، اتنی شکایتیں آئی ہیں کہ منیجر صاحب پریشان
ہو گئے۔ آپ خود سوچیے اتنا ضخیم پرچہ اتنی تعداد میں دوبارہ
بھیج کر ہمیں کتنا نقصان اٹھانا پڑا۔ پھر آپ کو "ذاکر نمبر" کے
انتظار میں کتنی کوفت اٹھانی پڑی۔

اور اب تھوڑے دنوں بعد پیام تعلیم کا سالنامہ آپ کی
خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ منیجر صاحب اس سلسلے میں ابھی
سے پریشان ہیں۔ ان کے خیال میں اس کا بس ایک ہی حل ہے کہ
سالنامہ رجسٹری سے بھیجا جائے۔ تو آپ پہلی فرصت میں
رجسٹری کے ساٹھ پیسے (خریداری نمبر کے حوالے کے ساتھ)
ہمیں بھیج دیجیے۔ جن پیامیوں کے چندے نومبر اور دسمبر میں
ختم ہو رہے ہیں وہ چھ روپے کی بجائے چھ روپے ساٹھ پیسے
بھیجیں۔

سالنامے کی تیاری کا کام شروع ہو گیا ہے۔ خدا کی ذات
سے امید ہے کہ "ذاکر نمبر" کی طرح یہ نمبر بھی آپ کو بہت پسند
آئے گا۔ انشاء اللہ۔

مگر اس موقع پر ایک بات خاص طور سے آپ سے کہنے کی ہے۔ ذاکر نمبر کی تیاری میں مکتبے نے دل کھول کر خرچ کیا ہے۔ نفع نقصان کا ذرا بھی خیال نہیں کیا ہے۔ ہمارے جنرل منیجر جناب تاباں صاحب نے قدم قدم پر ہماری ہمت بڑھائی ہے۔ اس پرچے کی اس شاندار کامیابی میں ان کی نوازشوں کو بھی بڑا دخل ہے اور اب سالنامہ بھی اسی شان سے نکالنا ہے۔ کوئی عجب نہیں جو سالنامے پر ذاکر نمبر سے زیادہ ہی خرچ آئے۔

اور آپ جانتے ہیں کہ اس مہنگائی کے زمانے میں عام پرچوں کو معیار کے مطابق نکالنا مشکل ہو رہا ہے۔ ایسے ضخیم نمبر نکالنا تو سچ مچ بڑی ہمت کا کام ہے۔ مگر یہ ہمت کب تک قایم رہے گی۔ محترم تاباں صاحب کب تک ہمارا دل بڑھاتے رہیں گے؟

اس مشکل کا حل آپ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اپنے پرچے کو اتنا پسند کرتے ہیں تو اسے اپنے ساتھیوں میں مقبول بنانے کی پوری کوشش کیجیے۔ کم از کم ایک خریدار دیجیے۔ ایک یا دو خریدار بنانے والوں کا نام ہم شکریے کے ساتھ پیام تعلیم میں شایع کریں گے۔ اور جو پیامی پانچ یا چھ خریدار بنائیں گے پرچے میں ان کا نام بھی شایع کیا جائے گا اور (خریداروں کا چندہ وصول ہونے کے بعد) ایک سال کے لیے پیام تعلیم ان کے نام جاری کیا جائے گا۔ کیا اچھا ہو کہ ابھی سے آپ کوشش شروع کر دیں۔ یہ پیام تعلیم کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ آپ کا رسالہ مضبوط بنیادوں پر قایم ہو جائے گا۔

اور ہاں بھئی ہمارے منیجر صاحب نے خوش خبری سنائی ہے کہ جو صاحب پیام تعلیم کے نئے خریدار بنیں گے ان کی خدمت میں ۱۹۶۷ء کا ضخیم اور قیمتی سالنامہ مفت پیش کیا جائے گا۔ امید ہے کہ اس موقع کو آپ ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔

ذاکر نمبر کے بارے میں اپنی رائیں بھیجنے میں جلدی کیجیے۔ کہ ہمیں دسمبر میں انعامی مقابلے کا فیصلہ کرنے میں سہولت ہو۔

لوری

جناب فوق فاروقی

نندیا رانی — تری مہربانی
منے راجا کی آنکھوں میں آجا

منا سوئے تو سوئیں ستارے
نیند میں ڈوب جائیں نظارے
ہاتھ پھیلا کے تجھ کو پکارے

نندیا رانی — تری مہربانی
منے راجا کی آنکھوں میں آجا

دن ڈھلے روز جب شام آئے
تیری ہی دوستی کام آئے
تیرے بن کیسے آرام آئے

نندیا رانی — تری مہربانی
منے راجا کی آنکھوں میں آجا

تجھ کو پہچانتا ہے جنم سے
خوب واقف ہے تیرے کرم سے
اپنی لوری سنا آ کے چھم سے

نندیا رانی — تری مہربانی
منے راجا کی آنکھوں میں آجا

جناب زکی انور

مرغوں کے انڈے

پروفیسر صاحب کی آمدنی کم تھی خرچ زیادہ۔
ان کی تین لڑکیاں تھیں تین لڑکے۔ بڑی لڑکی غزالہ دسویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ منجھلی کا نام قرۃ العین تھا پانچویں جماعت میں پڑھتی تھی۔ چھوٹی رشو بہت چھوٹی تھی اور اپنی توتلی اور ٹوٹی پھوٹی زبان میں بہنوں کے پڑھنے کی نقل اتارا کرتی تھی۔ دو لڑکے کالج میں تھے تیسرا گھر پر ہی پڑھتا تھا۔

منجھلی قرۃ العین جس کا پیار کا نام جولی تھا، تھی تو آٹھ نو سال کی لیکن ہوشیاری میں غزالہ ہی نہیں بلکہ اپنے بھائیوں کے بھی کان کاٹتی تھی۔ شریر بھی ایک نمبر کی، اور پڑھنے میں بھی تیز۔

پروفیسر صاحب نے گھر کے اخراجات پورا کرنے کے لیے ایک چھوٹا سا پولٹری فارم یعنی مرغی خانہ قایم کر رکھا تھا جس سے انھیں خاصی آمدنی ہو جاتی تھی۔

ایک بار ہوا یہ کہ ان کے مرغی خانے میں چوری ہو گئی۔ دس بڑے بڑے مرغ اور پندرہ مرغیاں چور لے گیا۔ چور جانا پہچانا تھا، محلّے کا ہی ایک آوارہ لڑکا تھا۔

پروفیسر صاحب ہنگاموں سے بہت گھبراتے تھے۔ انھوں نے تھانے میں چوری کی خبر کرنا مناسب نہ سمجھا لیکن چور نہایت آسانی سے پکڑا جا سکتا تھا۔ اور ابھی مال بھی برآمد ہو سکتا تھا اس لیے پروفیسر صاحب کے منجھلے لڑکے مطیع میاں نے جلدی سے تھانے میں خبر کر دی۔

داروغہ جی آئے اور اس بدمعاش لڑکے کے

گھر کی تلاشی لی گئی اور تمام مرغے اور مرغیاں ایک سب سے کنارے کی کوٹھری میں، ایک ٹوٹے پھوٹے لکڑی کے بکس میں مل گئیں۔ پھر کیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا کہ وہ بدمعاش لڑکا گرفتار ہو گیا، مرغے اور مرغیاں مل گئیں، قصہ ختم ہوا۔

لیکن قصہ ختم نہیں ہوا

داروغہ جی نے کہا

"پروفیسر صاحب مرغ اور مرغیاں تو ہم تھانے لے جائیں گے اور جب تک مقدمہ ختم نہیں ہوگا واپس نہیں مل سکتے۔"

پروفیسر صاحب بولے — "داروغہ صاحب! چھوڑیے بھی، اب اس ہنگامے کی کیا ضرورت، چور آپ کے ہاتھ لگ ہی گیا۔ میرا مال واپس کر دیجیے۔"

لیکن داروغہ جی نہیں مانے۔

جب پروفیسر صاحب نے قصہ ختم کرنے کے لیے بہت زور دیا تو وہ پروفیسر صاحب کو الگ لے جا کر بولے کہ اگر وہ انھیں کم سے کم پانچ مرغ بھی عنایت کر دیں تو وہ قصہ ختم کر دیں گے۔

پروفیسر صاحب کے نزدیک پانچ مرغ کا سوال نہیں تھا، اصول کی بات تھی۔ یہ رشوت تھی اور وہ رشوت کے طور پر مرغ کا ایک پر بھی نہیں دے سکتے تھے۔

بہت دیر تک دونوں میں اسی بات پر بحث ہوتی رہی۔ پروفیسر صاحب انھیں یہ سمجھاتے رہے کہ رشوت لینا ہی نہیں دینا بھی جرم ہے اور داروغہ جی یہ سمجھاتے رہے کہ اسی میں ان کا فائدہ تھا۔

لیکن معاملہ طے نہیں ہو سکا اور تھانیدار صاحب تمام مرغ اور مرغیاں ایک کانسٹبل سے بندھوا کر تھانے کی طرف چلے۔ چلتے چلتے انھوں نے ایک بار پھر کہا:

"پروفیسر صاحب! آپ سخت غلطی کر رہے ہیں۔ محض پانچ مرغوں کی خاطر دس مرغ اور پندرہ مرغیاں ضائع کر دیں گے کیوں کہ ان پرندوں کے مر جانے یا بھاگ جانے کی ذمہ داری سرکار نہیں لیتی...... اور پھر آپ سے کیا پردہ۔ ان مرغوں اور مرغیوں کے تھانے جانے کے بعد بھی میرے حصے میں پانچ مرغ تو ضرور ہی آئیں گے۔ مجھے کوئی نقصان نہیں۔"

"کوئی پرواہ نہیں" پروفیسر صاحب بولے "میں اپنا اصول نہیں توڑ سکتا، آپ شوق سے انھیں لے جائیے۔"

قرۃ العین اپنے پاپا کے ساتھ کھڑی سب کچھ دیکھ رہی تھی، سن رہی تھی اور دل ہی دل میں داروغہ جی کو کوس رہی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی سوچ رہی تھی کہ کس طرح داروغہ جی سے یہ مرغ اور مرغیاں واپس لی جائیں۔

چنانچہ کچھ ہی دیر میں اس نے ترکیب سوچ لی.... اور داروغہ جی ابھی کچھ ہی دور گئے ہوں گے کہ وہ دوڑتی ہوئی ان کے پاس پہنچی اور ہانپتی ہوئی بولی۔ "داروغہ جی — مجھے میری ممی نے آپ کے

پاس بھیجا ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ "پاپا سچ مچ کنجوس ہیں۔ میری ممی نے پاپا سے چھپا کر مجھے بھیجا ہے۔ آپ بڑے شوق سے پانچ تو کیا سات مرغ رکھ لیجیے اور باقی واپس کر دیجیے۔ ممی نے آپ کو سلام بھی کہا ہے اور کہا ہے کہ مرغیاں تو دراصل انھوں نے پالی ہیں۔ نقصان ان کا ہوگا۔ پاپا کا تو نقصان ہوگا نہیں۔ میری ممی آپ کا بہت احسان مانیں گی اگر آپ پانچ ہی نہیں بلکہ دو اور یعنی ممی کی طرف سے یعنی سات مرغ لے کر باقی واپس کر دیں۔"

داروغہ جی مسکرانے لگے پھر انھوں نے مرغ کے ٹوکرے میں سے بڑے بڑے سات تندرست مرغ نکال کر کانسٹبل کے حوالے کر دیے کہ وہ ان کے گھر دے آئے اور باقی مرغ اور مرغیاں قرۃ العین کے حوالے کیں اور چلے گئے۔

اسکول میں اس نے اپنے تایا زاد بھائی خیام کو سارا قصہ سنایا اور بولی،

"خیام! میں نے وہ سات مرغ داروغہ جی کے یہاں سے واپس لینے کی ترکیب بھی سوچ لی ہے اور پھر داروغہ جی کو مزا چکھانے کے لیے ایک شاندار جرمانہ بھی ان سے وصول کروں گی لیکن اس کام کے لیے مجھے دو لڑکوں کی ضرورت ہے۔ ایک تو تم ہو۔۔۔۔ دوسرا کون ہو جس پر بھروسہ کیا جا سکے؟"

"[illegible] پریشانی کی کیا بات ہے" خیام نے کہا "ڈیوڈ کے ہوتے ہوئے اور کس کی ضرورت ہو سکتی ہے۔"

چنانچہ قرۃ العین، خیام اور ڈیوڈ نے مل کر لنچ کے وقفے میں سارا پلان مرتب کر لیا اور شام کے پانچ بجے جب داروغہ جی گھومنے کو نکلے تو کچھ ہی دیر کے بعد خیام ان کے یہاں پہنچا اور اس نے دروازے پر دستک دی۔

ایک ملازم باہر نکلا اور اس نے پوچھا کہ کس سے ملنا تھا۔ خیام نے بتایا کہ اسے داروغہ جی کی بیوی سے ایک ضروری کام تھا۔ ملازم واپس چلا گیا اور کچھ ہی دیر بعد داروغہ جی کی بیوی آئیں تو خیام نے بڑے رازدارانہ انداز میں کہا ــــ

"مجھے داروغہ جی نے بھیجا ہے۔ میں ان کے دوست شرما جی کا نوکر ہوں۔ میم صاحبہ، بات یہ ہے کہ آج صبح داروغہ جی کسی پروفیسر کے ہاں سے سات بڑے بڑے مرغ لائے ہیں ......"

"ہاں ہاں، پھر کیا ہوا؟" ان کی بیوی نے جلدی سے پوچھا۔

"بات یہ ہے کہ" خیام ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہنے لگا ــــ "پروفیسر نے رشوت کی روک تھام کرنے والے محکمے کو خبر کر دی ہے۔ داروغہ جی نے کہا ہے کہ آپ جلد سے جلد وہ مرغ میرے مالک شرما جی کے گھر بھجوا دیں لیکن انھوں نے تاکید کی ہے کہ گھر کے کسی ملازم کے ذریعے مرغ ہرگز نہ بھجوائیں۔"

اچھا اب میں چلتا ہوں۔ مجھے داروغہ جی نے جلد بلایا ہے"

"ٹھیرو" داروغہ جی کی بیوی نے کہا "تم ہی وہ مرغ لیتے جاؤ۔"

"نہیں مالکن" وہ بولا "مجھے تو داروغہ جی نے سیدھے تھانے بلایا ہے۔ انھیں خبر کرنی ہے کہ مرغ اب گھر میں نہیں ہیں۔ پتہ نہیں کس وقت انسپکٹر انکوائری کرنے آجائیں۔"

پھر اس وقت دوسرا آدمی کون ملے گا؟ داروغہ جی کی بیوی پریشان سی نظر آئیں اور تب خیام مرغ لے جانے پر تیار ہوگیا۔ وہ چاہتا تو یہی تھا اور اسی لیے تو یہ ڈراما کھیلا جا رہا تھا۔

داروغہ جی کی بیوی نے ٹوکری لا کر دی اور خیام ٹوکری سر پر رکھ کر چلتا بنا۔

کچھ ہی دیر بعد داروغہ جی مٹھائی کی ایک ٹوکری لیے واپس آئے تو ان کی بیوی نے بہت ہی بوکھلاہٹ کے ساتھ خیریت پوچھی۔ داروغہ جی پریشان ہوگئے اور تب ان کی بیوی نے سارا قصہ کہہ سنایا۔ داروغہ جی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح بھاگے اور سیدھے پروفیسر صاحب کے گھر پہنچے۔ لیکن مرغ تو خیام نے ڈیوڈ کے گھر رکھ دیے تھے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ پروفیسر صاحب کے گھر کے بچے شناخت کے لیے داروغہ جی کی بیوی کے پاس لے جائے گئے۔ لیکن ان میں خیام

ع تحیرات

تھا کہاں۔ خیام تو دوسرے مکان میں رہتا تھا!

اس چکر میں شام ہوگئی اور داروغہ جی تھانے کو روانہ ہوگئے۔ لیکن ابھی ان کو گئے ہوئے مشکل سے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ ڈیوڈ ان کے گھر پہنچا اور ہانپتا ہوا بولا ——

"میم صاحب، میم صاحب، وہ مرغ ٹھگ کر لے جانے والا بدمعاش لونڈا پکڑا گیا۔ وہ ..... وہ پکا چور ہے ..... لیکن۔ لیکن ایک بہت بڑے وکیل کا بیٹا ہے۔ داروغہ جی نے کہا ہے کہ آج جو لڈو وہ لائے ہیں وہ ایک پیتل کی دیگچی میں رکھ کر جلدی سے دیجیے۔"

"لیکن تم کون ہو —— بدمعاش کہیں کے" داروغہ جی کی بیوی نے گرج کر پوچھا۔

"آپ مجھے نہیں جانتی ہیں —— حد ہوگئی" ڈیوڈ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔ "آپ تو میری دکان پر کئی بار گئی ہیں۔ میں منگلی حلوائی کا چھوٹا بیٹا ہوں۔ میں گیند کھیل کر آ رہا تھا۔ چوک پر بھیڑ لگی ہوئی ہے۔"

"مجھے بے وقوف بناتا ہے، بدمعاش کہیں کا۔" داروغہ جی کی بیوی بولیں۔ "اگر ایسا ہی تھا تو تیری دکان سے انھوں نے مٹھائی کیوں نہیں منگوالی۔"

"اوہ! ڈیوڈ اکتائے ہوئے انداز میں بولا۔ "آپ تو خواہ مخواہ بحث کر رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے چوک سے میری دکان کتنی دور ہے۔ میں جانتا ہوں میرے باپ کا کیا جاتا ہے۔ داروغہ جی نے مٹھائی دیگچی میں

باقی ص ۲۹ پر

جناب حرمت الاکرام

برکھا کے انداز

(مشرقی یوپی اور بہار میں پہلے سوکھے نے تباہی پھیلائی، پھر سیلابوں نے قیامت برپا کی۔)

سوکھا گیا تو برکھا بولی دیکھ مرے انداز

(۱)

بستی بستی قریہ قریہ ناچیں موت کے سائے
گردابوں نے گھڑیالوں کی صورت منھ پھیلائے
بے بس دھرتی پر پانی کی شہ زوری مسکائے
کون اٹھائے سرکش طوفانی دھاروں کے ناز
سوکھا گیا تو برکھا بولی، دیکھ مرے انداز

(۲)

کسی بہن سے بھائی چھوٹا، بچھڑا کسی کا ناتھ
اپنی اپنی سب کو پڑی ہے کون دے کس کا ساتھ
بیٹے کو یہ ہوش کہاں ہے پکڑے ماں کا ہاتھ
جھپٹ پڑے ہیں انسانوں پر موجوں کے شہباز
سوکھا گیا تو برکھا بولی، دیکھ مرے انداز

(۳)

دیکھتے دیکھتے ظالم موسم چلا ہے کیسی چال
ماتم کرتی ہیں فصلیں کس طرح نہ پوچھ یہ حال
چکراتی ناویں کہتی ہیں عجب ہے یہ سُر تال
چھیڑ رہی ہیں دیوانی لہریں اُف کیسا ساز
سوکھا گیا تو برکھا بولی، دیکھ مرے انداز

...

روئی کے گالوں کی طرح سے کٹ کٹ کے گرتے ہیں کگار
کہتی ہے مٹی وہ آئے جسے ہو مجھ سے پیار
پانی کا یہ ریلا ہے یا رانا کی تلوار
ساون سے بھادوں کب دبتا گونجی ہے آواز
سوکھا گیا تو برکھا بولی، دیکھ مرے انداز
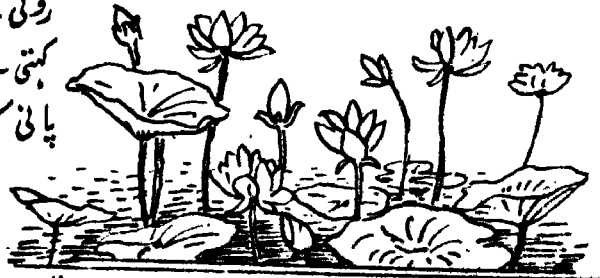
جناب مصطفیٰ رشید سیوہاروی۔

امام بخاریؒ

خدا کے رسول حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جن باتوں کو لوگوں نے سنا اور انھیں یاد رکھا ہے انھیں حدیث کہتے ہیں۔

قرآن پاک کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے حدیثوں کا پڑھنا بھی ضروری ہے۔ رسول اللہ نے ہر ایک آیت کو اپنی زبان مبارک سے پڑھ کر اپنے دوستوں کو جنھیں صحابی کہتے ہیں، اور ان لوگوں کو جنھوں نے قرآن کے بارے میں حضور سے کوئی سوال کیا ہے، سمجھایا ہے۔ ان ہی حدیثوں کو پڑھ کر بڑے بڑے عالموں نے قرآن پاک کی تفسیریں لکھی ہیں، اور اب بھی اگر کوئی عالم ان حدیثوں کو نہیں پڑھتا اور قرآن مجید کا ترجمہ کرنے لگتا ہے تو اس ترجمے کو مسلمان پسند نہیں کرتے۔

جس زمانے میں عرب شہروں میں حدیثوں کا چرچا تھا اور دین دار لوگ سینکڑوں کوس جا کر بڑے بڑے عالموں سے حدیثیں پڑھتے تھے، چالاک لوگوں نے اپنی طرف سے حدیثیں بنا کر لوگوں کو سنانی شروع کر دی تھیں۔

سننے والوں میں کچھ ایسے بھولے بھالے تھے

(۲)

کہ جو کوئی بھی یہ کہتا کہ یہ خدا کے رسولؐ نے فرمایا ہے، بے چون و چرا اس کی بات مان لیتے اور تعظیم سے گردن جھکا دیتے تھے۔

حدیث سنانے والوں میں کچھ بزرگ ایسے بھی ہوتے تھے جو سوچتے نہ تھے کہ رسول اللہ نے یہ بات کب اور کیوں فرمائی تھی، اور رسول اللہ ایسی کوئی بات فرماتے بھی تھے یا نہیں جس کا قرآن پاک کی تعلیم سے میل نہ ہو۔

اسے سمجھانے کے لیے فقط ایک بات ہم تمھیں سناتے ہیں۔

رسول اللہ کی وفات کے بعد بی بی عائشہ سے کسی نے کہا، رسول اللہ کے صحابی ابوہریرہؓ کہتے ہیں، رسول اللہ نے فرمایا ہے جو کوئی مرنے والے پر نوحہ کرتا ہے اور بیان کر کے روتا ہے اس سے مرنے والے پر عذاب ہوتا ہے۔

بی بی عائشہ نے فرمایا ابوہریرہ نے بغیر سوچے سمجھے یہ بات کہہ دی بھلا رسول اللہ ایسی بات کیوں

فرماتے جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہے۔

قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ کسی کے فعل کا ذمہ دار دوسرا نہیں ہوتا اور ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ رونے والا اور عذاب مُردے کو ہو یہ قرآنی تعلیم کے خلاف ہے۔ بی بی عائشہ نے سمجھایا کہ اصل بات یہ تھی کہ ایک یہودی عورت کا جنازہ جا رہا تھا اور لوگ جنازے کے ساتھ بیان کرتے اور روتے جاتے تھے۔ حضورؐ نے فرمایا اس پر عذاب ہو رہا ہے اور یہ رو رہے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ انھیں خبر بھی نہیں ہے کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ کی یہ حدیث جن لوگوں نے سنی وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ رونے سے مرنے والے پر عذاب ہوتا ہے۔ یہ ذرا سی غلط فہمی تھی۔

ان حدیث بیان کرنے والوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھیں بے پرکی اڑانے میں مزا آتا تھا، کچھ ایسے تھے جو یہودیوں کے پاس بیٹھنے والوں میں تھے، مگر ان کی حدیثوں کو بھی سن کر ایک نے دوسرے سے بیان کر دیا اور پھر ان کی شہرت ہو گئی۔ اور اس لیے کہ ان میں رسول اللہ کا نام نامی تھا، کسی نے چھان بین کی ہمت نہ کی۔

پھر ایسے لوگوں سے جو روپیہ کے لالچی تھے بادشاہوں نے حدیثیں بنوائیں تاکہ ان کی بادشاہت مضبوط ہو جائے۔

خدا کے نیک بندے جو دین و مذہب میں ملاوٹ پسند نہ کرتے تھے ان باتوں سے بڑے رنجیدہ تھے اور سوچتے تھے کہ اس کا علاج کیا ہونا چاہیے۔ اگرچہ اس واقعہ کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے مگر یاد دلانے کے لیے ایک مرتبہ پھر لکھا جاتا ہے کہ اسی زمانے میں ایک بزرگ تھے جن کا نام تھا اسحٰق ابن راہویہ۔ یہ امام بخاری کے استادوں میں بھی تھے۔ ایک دن اسحٰق ابن راہویہ باتوں باتوں میں کہنے لگے کیا اچھی بات ہو کہ خدا کا کوئی نیک بندہ ان حدیثوں کو جن کی کوئی سند نہیں ہے چھانٹ کر صحیح اور سچی حدیثوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دے، اگر ایسا ہو جائے تو یہ دین کی بڑی خدمت ہوگی؛ اتفاق کی بات کہ امام بخاری بھی اس مجلس میں موجود تھے اور ان کے جی کو یہ بات لگ گئی اور یہ کتاب جس کا نام صحیح بخاری ہے مرتب کی۔

پھر دیکھیے کہ ان کی خدمت، دین کی کتنی عظیم الشان خدمت ہے کہ بارہ سو برس ہو گئے ہیں دنیا کے تمام مسلمان اس کتاب کو پڑھتے اور پڑھاتے ہیں اور اپنے دین کو اس کتاب کی روشنی میں اجلا بناتے ہیں۔

امام بخاری کا حافظہ

جیسا کہ آپ کو پہلے معلوم ہو چکا ہے امام بخاری کو بچپن ہی سے حدیثیں یاد کرنے کا شوق تھا دس سال کی عمر میں مکتب میں کوئی حدیث سنتے تو فوراً یاد کر لیتے، ان کے ایک ساتھی جن کا نام حاشد تھا،

بیان کرتے ہیں کہ امام بخاری مدرسہ میں ہمارے ساتھ
ساتھ جایا کرتے تھے۔ حدیث کے استاد (شیخ الحدیثؒ)
حدیثیں بیان کرتے تو ہم سب لوگ انھیں لکھ لیتے تھے
مگر امام بخاری ایک حدیث بھی نہ لکھتے تھے اور جب کبھی
ہم ان سے کہتے کہ بھائی تم حدیث سن کر لکھتے نہیں تو سننے
کا فائدہ کیا ہے، تو بخاری ہماری بات سن کر چپ ہو جاتے
اسی طرح پندرہ دن گزر گئے۔ پندرہ دن بعد ہم نے
انھیں پھر ٹوکا اس لیے کہ ہم نے پندرہ ہزار حدیثیں لکھ
لی تھیں۔ امام بخاری جھنجلا کر بولے، آپ لوگوں نے
مجھے تنگ کر دیا ہے اچھا اب آپ لوگ اپنی حدیثیں نکالیے
اور دیکھتے رہیے میں اوّل سے آخر تک تمام حدیثیں
سناتا ہوں۔

امام بخاری نے حدیث کی تلاوت شروع کی اور
تمام حدیثیں پندرہ کی پندرہ ہزار سنا دیں۔ نہ کسی سند
میں بھول چوک ہوئی نہ کہیں زیر زبر کی غلطی ہوئی — ہم
سب لوگ دنگ رہ گئے۔

امام بخاری نے حدیثیں جمع کرنے کے شوق میں
دور دور سفر کیا اور بڑی بڑی مصیبتیں جھیلیں۔ شام، مصر،
جزیرہ، بصرہ، حجاز، کوفہ، بغداد۔

حجاز میں چھ سال گذارے اور کوفہ اور بغداد تو
نہ جانے کتنی مرتبہ آئے اور گئے۔ امام بخاری بلخ بھی
گئے ہیں۔

امام بخاری کی عمر ۱۸ سال کی تھی جب انھوں
نے مدینہ منورہ میں روضۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
کے قریب بیٹھ کر ایک ایسی کتاب لکھی جس میں وہ تمام
فیصلے جمع کیے ہیں جو صحابہ نے اور صحابہ کے دیکھنے
والوں نے جنھیں تابعین کہتے ہیں اپنے زمانے میں
کیے تھے۔ اور اسی عمر میں ایک دوسری کتاب چاند
کی روشنی میں بیٹھ کر پوری لکھی تھی جس کا نام تاریخ کبیر
ہے۔ صحابہ کے فیصلوں کو جس کتاب میں جمع کیا ہے
اس کا نام "قضایا الصحابہ والتابعین" ہے۔

یاد رکھنا چاہیے کہ حدیث کی قسموں میں ایک
وحدانی ہے ایک ثنائی ہے اور ایک ثلاثی ہے۔
وحدانی وہ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا
ارشاد مبارک فقط ایک واسطے سے حاصل ہوا ہو۔ جیسے
کوئی کہے۔ مجھ سے بیان کیا سیدنا حضرت عمرؓ نے
اور ان سے ارشاد فرمایا نبی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم
نے۔ اس میں فقط ایک واسطہ حضرت عمر کا ہے۔

ثنائی اسے کہتے ہیں جس میں دو واسطوں سے
ارشاد رسول حاصل ہوا ہو۔ جیسے:۔ مجھ سے بیان کیا
سالم نے، سالم سے فرمایا سیدنا عمرؓ نے اور سیدنا عمرؓ
سے ارشاد فرمایا فخر کائنات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
نے۔

ثلاثی وہ ہے جس میں تین واسطے بیچ میں ہوں۔
حدیث کے یہ تینوں درجے اعلیٰ اور برتر سمجھے
جاتے ہیں۔ امام بخاری نے بائیس حدیثیں اپنی کتاب

میں ایسی لکھی ہیں جو نرالی ہیں اور ان پر امام کو بڑا فخر ہے۔

امام بخاری نے یوں تو اور بھی بہت سی کتابیں تصنیف فرمائی ہیں لیکن صحیح بخاری ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

ایک اور کتاب بھی ان کی بہت عمدہ ہے۔ اس کا نام "ادب المفرد" ہے۔ ادب المفرد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عادات مبارک کا تفصیلی حال ہے۔ یہ بھی ہندوستان کے عربی مدارس میں پڑھائی جاتی ہے اور مصر و ہندوستان میں چھپی ہے۔

صحیح بخاری کی ترتیب سے پہلے امام بخاری ایک سو کتابیں تصنیف کی تھیں مگر صحیح بخاری پر امام صاحب کو ناز تھا۔ فرمایا کرتے تھے کہ صحیح بخاری کو میں نے اپنی نجات کا ذریعہ بنایا ہے اور یہی کتاب ہے جو دنیا میں قرآن پاک کے بعد سب سے زیادہ مشہور مقبول اور مقدس مانی جاتی ہے اور جسے اصح الکتاب بعد القرآن (یعنی قرآن پاک کے بعد سب سے صحیح کتاب بخاری شریف ہے) کی سند مل گئی ہے۔

عزت اور نیکنامی کا سودا

امام بخاری کا یہ واقعہ بڑا عبرت انگیز اور تعجب خیز ہے۔

ایک دفعہ دریائی سفر کے لیے امام بخاری جہاز میں سوار ہوئے۔ ایک ہزار اشرفیاں ساتھ تھیں راستہ میں ایک مسافر سے بے تکلفی اور مخلصانہ دوستی ہو گئی اور امام صاحب نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ میرے پاس ایک ہزار اشرفیاں ہیں۔ یہ سن کر مسافر کی نیت بدل گئی۔ رات بھر سوچتا رہا کہ اشرفیوں پر کیسے قبضہ کیا جائے۔

صبح ہوئی تو رونا چیخنا اور واویلا شروع کر دی کہ میرے پاس ایک ہزار اشرفیاں تھیں کسی نے انھیں نکال لیا ہے اور مجھے لوٹ لیا ہے۔ امام بخاری نے یہ سنتے ہی چپکے سے ہزار اشرفیوں کی تھیلی سمندر میں ڈال دی۔ مسافر نے جہاز کے کپتان سے کہا کہ تمام مسافروں کی تلاشی لی جائے تلاشی ہوئی تو کسی مسافر کے پاس سے اشرفیاں اور تھیلی نہ نکلی۔ چالاک مسافر حیران رہ گیا اور سب مسافر اسے بڑا بھلا کہنے لگے۔ جہاز کنارے پر جا کر لگا اور سب مسافر اترے تو مسافر نے امام صاحب سے کہا کہ آپ کی تھیلی اور اشرفیاں کہاں ہیں؟ امام صاحب نے فرمایا: میں نے انھیں سمندر میں پھینک دیا تھا کیوں کہ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری نیک نامی عزت اور وقار پر چند اشرفیاں نکلنے سے دھبہ لگے اور لوگ میری طرف انگلیاں اٹھائیں۔

امام بخاری بڑے ذہین تھے۔ بڑے عبادت گذار تھے، فیاض اور سخی تھے، بڑے خود دار تھے۔

بخارا کا حاکم اور امام بخاری

بخارا کا حاکم جس کا نام احمد تھا اس نے امام صاحب سے درخواست کی کہ آپ شاہی دربار میں

باقی صـ۲۲ پر

جناب یوسف پاپا

چمگادڑ

بتاؤ پیارے بچو تم نے چمگادڑ کو دیکھا ہے
یہ چمگادڑ ہمیشہ رات میں باہر نکلتے ہیں
ہے اس کی ایسی فطرت کیوں سبب اس کا بتاؤں گا
نہ جانے کتنی صدیوں کی پرانی یہ کہانی ہے
کہانی یوں ہے کہ جب بھی یہ چوپایوں میں جاتا تھا
وہ کہتا تھا میاں بے کار مجھ کو آزماتے ہو
اسی صورت مرے بچے بھی میرا دودھ پیتے ہیں
مگر جب بھی پرندوں میں کبھی موصوف جاتے تھے
یہی کہتے تھے جو کرتے ہو تم وہ میں بھی کرتا ہوں
تمہارے پاس پر ہیں اور میرے پاس بھی پر ہیں

کبھی پتھر اٹھا کر اس کی جانب تم نے پھینکا ہے
یہ خود اور ان کے بچے سب اندھیرے ہی میں پلتے ہیں
اندھیرے ہی میں کیوں رہتا ہے یہ قصہ سناؤں گا
کہانی کیا ہے چمگادڑ کی فطرت کی نشانی ہے
انھیں کی قوم کا اک فرد خود کو بھی بتاتا تھا
کہ جیسے دودھ تم سب اپنے بچوں کو پلاتے ہو
یہی خوراک ہے ان کی، یہی پی پی کے جیتے ہیں
تو اونچی نسل کا خود کو پرندہ ہی بتاتے تھے
ہوا میں تم بھی اڑتے ہو ہوا میں میں بھی اڑتا ہوں
جو بے پر ہیں یہاں پر ہاں وہ بے شک ہم سے باہر ہیں

اسی انداز میں دونوں سے وہ باتیں بناتا تھا
وہ جس کے پاس جاتا تھا اسے اپنا بتاتا تھا

چرندے یہ سمجھتے تھے کہ چمگادڑ چرندہ ہے
پرندے یہ سمجھتے تھے کہ چمگادڑ پرندہ ہے

مگر مدت کے بعد اک دن یہ ظاہر ہو گیا سب پر
کہ اس کی شخصیت دہری ہے وہ ہر شے سے ہے بدتر

بڑا منحوس وہ دن تھا کہ جس دن یہ ہوا ظاہر
کہ چمگادڑ بڑا جھوٹا ہے مکاری میں ہے ماہر

اسی دن پھر چرندوں اور پرندوں نے وہ پھٹکارا
کہ تنہا رہ گیا دنیا میں وہ بدبخت ناکارہ

ندامت وہ ہوئی طاری کہ سر اس کا نہ اٹھ پایا
اسی تاریخ سے دن میں کبھی باہر نہ وہ آیا!

سبب یہ ہے اندھیرے ہی میں وہ باہر نکلتا ہے
کسی کو اپنی صورت تک دکھلانے سے جھجکتا ہے

وہ فطرت جس کو چمگادڑ نے بے دردی سے چھوڑا تھا
بڑی محنت سے جس کی بندشوں کو اس نے توڑا تھا

اسی فطرت کو اس کلجگ میں انسانوں نے اپنایا
ترقی کا یہی زینہ جہاں والوں کے ہاتھ آیا

یہ عالم ہے ہزاروں مل رہے ہیں چار سو ایسے
سمجھ میں کچھ نہیں آتا کوئی ان سے بچے کیسے!

غضب یہ ہے کہ ان کے پیشوا شب میں نکلتے ہیں
مگر یہ سب تو دن میں بے دھڑک سڑکوں پہ چلتے ہیں

ندامت کا ذرا بھی شائبہ ان میں نہیں ملتا
یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور ان کا دل نہیں ہلتا

کسی نے جب سے چمگادڑ کو یہ قصہ سنایا ہے
کہ انسانوں نے اپنا پیشوا اس کو بنایا ہے

اسی دن سے وہ ساری رات چلاتا ہے ہنستا ہے
اسے شک ہے کہ اس دنیا میں اب انساں بھی بستا ہے

مرے بچو! تم اس چمگادڑ کی فطرت سے کترانا!
کبھی تم بھول کر بھی عادتیں ایسی نہ اپنانا!
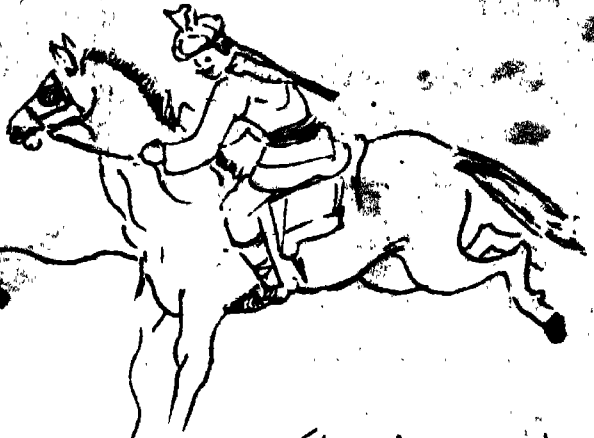
نیم تن

اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔
ایران کا ایک بادشاہ تھا۔ یوں تو دنیا کی سب نعمتیں اسے میسّر تھیں۔ پر وہ بہت اداس اداس رہتا تھا۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ کبھی کبھی تو اس پر بہت وحشت سوار ہوتی یا جنگل میں چلا جاتا وہاں اکیلے میں خوب پھوٹ پھوٹ کر روتا۔

ایک دن وہ جنگل میں یونہی مارا مارا پھر رہا تھا۔ اچانک ایک بزرگ سامنے آگئے۔ لمبی سفید داڑھی نورانی چہرہ انھوں نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور پوچھا "بادشاہ سلامت کدھر کے ارادے ہیں؟" بادشاہ نے اپنی بپتا سنائی۔ بزرگ نے پوچھا "آپ کے کتنی بیویاں ہیں؟" بادشاہ نے جواب دیا "چار" بزرگ نے بادشاہ کو چار سیب دیے اور کہا:۔ "چاروں کو ایک ایک کھلا دیجیے اور پھر خدا کی قدرت کا تماشا دیکھیے۔"

بادشاہ کی تو جیسے دل کی کلی کھل گئی۔ سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ وہ بہت ہی خوش تھا بہت ہی خوش۔ اسے یقین تھا کہ اب اللہ میاں اسے اولاد کی دولت سے ضرور نوازیں گے۔

اب سنیے، بادشاہ سلامت کی تینوں بیویوں نے تو پورے پورے سیب کھائے، چوتھی نے تھوڑا سا کھایا باقی ایک طاق میں رکھ دیا۔ اس نے سوچا باقی دن میں کسی وقت کھا لوں گی۔ ہونے والی بات ایک کوّے کی اس پر نظر پڑ گئی وہ اسے لے اڑا۔ اب تو یہ بے چاری لرز گئی ڈر

کے مارے بادشاہ سلامت کو بھی نہ بتایا نہ جانے
کیا آفت مچائیں گے۔

کچھ دنوں بعد چاروں بیویوں کے بچے
ہوئے۔ پہلی کے لڑکی ہوئی۔ دوسری دو کے
لڑکے ہوئے۔ پر چوتھی کے جو بچہ ہوا وہ تو بہت
ہی چھوٹا تھا بہت ننھا منا۔ یوں سمجھیے کہ اور
بچوں سے آدھا۔ بادشاہ کو بہت غصہ آیا۔ اس
نے ماں بیٹے دونوں کو گھر سے نکال دیا۔ محل
کے قریب ایک جھونپڑا رہنے کے لیے دے دیا۔

بادشاہ نے تینوں بیگموں، ان کے تینوں بچوں
کو بڑے چاؤ سے، بڑے چونچلے سے پروان
چڑھایا۔ پر اس چوتھے بچے کو محل میں بھی نہ
گھسنے دیا۔ اس بے چارے کا نام ہی نیم تن مشہور
ہو گیا تھا۔ آپ اپنی زبان میں آدھے میاں کہہ
سکتے ہیں۔ ہوتے ہوتے لڑکی اور دونوں لڑکے
ماشاءاللہ خوب جوان ہو گیے۔

اس علاقے میں ایک ظالم دیو رہتا تھا۔
یہ بہت خونی دیو تھا جتنا ہیبت ناک تھا اتنا
ظالم اور سفاک تھا۔ ایک دن اس کی نظر اس
شہزادی پر پڑی۔ شہزادی اسے بہت اچھی لگی۔
اس نے اپنے جی میں کہا۔ میں شادی کروں گا تو
اسی شہزادی سے کروں گا۔

خدا کا کرنا ایک دن شہزادی اپنے بھائیوں کے
ساتھ شکار کھیلنے گئی۔ دیو تو موقع کی تاک میں تھا۔ اچانک آسمان
سے نیچے آیا اور شہزادی کو اٹھا کر اپنے غار لے گیا۔

بادشاہ تو اس منحوس خبر کو سنتے ہی رنج و غم میں
ڈوب گیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ اس نے بڑے
بیٹے کو سپہ سالار بنا کر بہت بڑی فوج دیو کے مقابلے
کے لیے بھیجی تاکہ شہزادی کو اس کے پنجے سے چھڑا
لائے اور دیو کو سخت سزا دے۔

یہ فوج ابھی بہت دور تھی مگر دیو نے دیکھ
لیا۔ اس نے شہزادی سے پوچھا: "وہ سامنے کیا ہے؟"

شہزادی: سامنے گرد و غبار اڑتا نظر آ رہا ہے۔
آگے آگے ایک شہسوار ہے گھوڑے پر سوار ہے

دیو: اس وقت وہ کیا کر رہا ہے۔

شہزادی: پانی پی رہا ہے۔

دیو: کیسے پی رہا ہے؟

شہزادی: آہستہ آہستہ ایک ایک گھونٹ پی رہا ہے۔

دیو: تو پھر خوب ہنسو خوب کھیلو۔ اتنا ہنسو
کہ ہنسنے کی طاقت نہ رہے جیت ہماری ہے!

دیو نے اپنے ہتھیار لیے اور غار سے باہر
نکل آیا۔ شہزادے نے جونہی دیو کی بھیانک شکل

دیکھی تھر تھر کانپنے لگا۔ سارے ہتھیار ایک طرف گر گئے۔ دیو شہزادے کو بالوں سے پکڑ کر غار میں لے گیا اور بالوں سے لٹکا دیا۔ فوج بھی بھاگ کھڑی ہوئی۔ اور بادشاہ تک خبر پہنچائی گئی۔ بادشاہ نے اب کے دگنی فوج اکٹھا کی۔ دوسرے شہزادے کو سپہ سالار بنایا اور دیو سے لڑنے کے لیے بھیج دیا۔ فوج غار کے قریب آئی تو دیو نے پوچھا۔

"یہ سامنے کیا نظر آ رہا ہے۔"

شہزادی: گرد و غبار اڑتا نظر آ رہا ہے آگے آگے ایک شہسوار ہے۔ گھوڑے پر سوار ہے۔

دیو :۔ یہ اس وقت کیا کر رہا ہے۔

شہزادی:۔ انگور کھا رہا ہے۔

دیو :۔ کیسے کھا رہا ہے۔

شہزادی:۔ ایک ایک کر کے کھا رہا ہے۔

دیو :۔ پھر تو خوب ہنسو۔ اتنا ہنسو کہ ہنسنے کی طاقت نہ رہے۔ جیت ہماری ہے۔

دیو نے اپنے بدن پر ہتھیار سجائے اور غار سے باہر نکلا۔ اور تھوڑی دیر میں فوج کے سپاہی گھر کی طرف بھاگتے نظر آئے اور شہزادے صاحب پہلے شہزادے کی طرح غار میں لٹکا دیے گئے۔

شہزادہ نیم تن اپنی بہن اور بھائیوں کو دیو کے پنجے سے چھڑانے کے لیے بے چین تھا۔ پر وہ جانتا تھا کہ بادشاہ سے مدد مانگنا بے کار ہوگا۔ وہ چپکے سے شاہی اصطبل پہنچا۔ ایک اچھا سا گھوڑا کھول لایا اور اس پر بیٹھ کر دیو کے غار کی طرف اسے سرپٹ دوڑا دیا۔

دیو نے شہزادی سے پوچھا۔

"اب تمھیں کیا نظر آ رہا ہے۔"

گرد وغبار اٹھتا نظر آرہا ہے۔ پر شہ سوار بس ایک ہی ہے۔ وہی گرد اڑاتا آرہا ہے۔

دیو :- اس وقت وہ کیا کر رہا ہے۔

شہزادی :- ایک چشمے سے پانی پی رہا ہے۔

دیو :- کیسے پی رہا ہے۔

شہزادی :- "بس غٹا غٹ پی رہا ہے" پانی کیچڑ مٹی سب کچھ پیے جارہا ہے۔ اور ہاں اس وقت انگور کھا رہا ہے۔ گچھے کے گچھے کھاتے چلا جارہا ہے پتے، ڈنٹھل سب ہی پیٹ میں ڈال رہا ہے"

دیو بڑی زور سے چیخا :- پھر تو ہمیں جی بھر کے رونا چاہیے۔ اتنا رونا چاہیے کہ رونے کی طاقت نہ رہے اب کے بار ہماری ہے۔

اور جب شہزادہ نیم تن غار کے پاس پہنچا دیو نے غار سے نکلتے ہی شہزادے پر وار کر دیا۔ شہزادہ نیم تن نے دیو کا وار بچا کر تلوار کا ایسا بھرپور ہاتھ مارا کہ دیو کے دو ٹکڑے ہوگیے۔ کہنے لگا اب میں دوسرا وار نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ آدھا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

دونوں بھائی ابھی تک غار میں بندھے ہوئے تھے۔ شہزادے نے انھیں آزاد کیا اور ماں بہن اور دونوں بھائیوں کو لے کر فتح کے شادیانے بجاتا۔ گھر کی طرف لوٹا۔

اس وقت بادشاہ کی خوشی کا کیا پوچھنا۔ شہزادے کی محبت اس کے دل میں جاگ اٹھی۔ اور وہی اس کا چہیتا بن گیا۔ بادشاہ کے مرنے کے بعد وہی گدی پر بیٹھا۔

(انگریزی سے لیا گیا)

بقیہ امام بخاری:

تشریف لاکر مجھے اور شہزادوں کو صحیح بخاری کا درس دیں۔ مگر امام صاحب نے گوارا نہ کیا اور قاصد سے کہہ دیا کہ میں دربار شاہی میں نہیں آسکتا اس میں علم کی بے عزتی ہے۔ دوبارہ درخواست کی کہ شاہزادوں کے لیے کوئی خاص وقت مقرر فرما دیجیے کہ حاضر ہو کر سماعت حدیث کریں۔ امام صاحب نے فرمایا: نبوت کی تعلیم سب کے لیے عام ہے۔ کسی کے لیے خاص وقت مقرر نہیں کیا جاسکتا۔

فرمایا کرتے تھے امیروں کی صحبت سے علم کی بے قدری اور ذلت ہوتی ہے جس سے دین میں نقصان آتا ہے۔

امام صاحب نے ۲۵۶ھ ہجری میں وفات پائی۔ عمر شریف تیرہ دن کم باسٹھ سال کی تھی۔

پیدائش ۱۳ شوال ۱۹۴ھ ..... وفات ۲۵۶ھ

الیگزنڈر لسکن
ترجمہ: اظہر انصاری

ابّا جان اور ڈاکٹر

ابا جان جب چھوٹے تھے تو انھیں اکثر زکام ہو جایا کرتا تھا۔ وہ خوب چھینکتے اور کھانستے۔ عموماً ان کا گلا خراب رہتا۔ کبھی کبھی کان میں درد بھی ہو جاتا۔ ایک دن ان کے ماں باپ انھیں ڈاکٹر کو دکھانے لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے مطب کے دروازے پر ایک بورڈ لگا تھا، لکھا تھا — "کان، ناک اور گلے کے ماہر"

"کیا یہ ان کا نام ہے؟" ننھے ابا جان نے پوچھا۔

"نہیں، وہ کان، ناک اور گلے کی بیماریوں کا علاج کرتے ہیں۔ خاموش رہو"

ڈاکٹر نے ان کی ناک، کان اور گلے کا معائنہ کیا اور رائے ظاہر کی کہ آپریشن کی ضرورت پڑے گی۔ چنانچہ ابا جان کو لا کھڑے گئے۔ ان کے ایڈینائیڈ گلانڈ خراب تھے۔

ایک بہت ہی بوڑھے، یک دم سفید بالوں والے پروفیسر نے حکم دیا،

"اپنا منہ کھولو!" اور جب ابا جان نے اپنا منہ کھولا تو بوڑھے نے یہ تک نہ کہا کہ "شکریہ"۔ اس کے برخلاف اس نے اپنی انگلیاں ان کے حلق کے اندر ڈال دیں اور انھیں گھمانے لگا۔ یہ حرکت کافی تکلیف دہ تھی۔ جوں ہی پروفیسر نے کہا "اوہو یہ رہے" اور یہ کہہ کر اسے اور دبایا کہ اچانک اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی۔ اس نے اپنا ہاتھ جھٹک کر انگلیاں ابا جان کے منہ سے نکالیں۔ جتنے لوگ موجود تھے انھوں نے دیکھا کہ ڈاکٹر کے انگوٹھے سے خون بہہ رہا تھا۔ سب اچنبھے میں کھڑے تھے۔ ڈاکٹر بولے "آیوڈین"

انھیں آیوڈین دی گئی۔ انھوں نے اسے اپنے انگوٹھے پر ڈالا اور پھر کہا "پٹی"

انھیں پٹی دی گئی۔ انھوں نے اسے اپنے انگوٹھے پر باندھا اور بہت ہی دھیمے لہجے میں گویا ہوئے۔

"میں چالیس سال سے مطب کر رہا ہوں۔ پہلی بار کسی نے مجھے کاٹ کھایا ہے۔ بہتر ہوگا اگر کوئی اور اس کا آپریشن کرے۔ میں اس سے دست بردار ہوتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھے، صابن سے ہاتھ دھوتے

اور چلے گئے۔

دادا جان بے حد خفا ہوئے، کہنے لگے: "ہم تمھیں ان ڈاکٹر صاحب کو دکھانے یہاں لے گئے تھے وہ تمھارا علاج کر کے تمھیں ٹھیک کر دیتے۔ تم نے یہ کیا کیا؟ ہم تمھیں بتانا چاہتے ہیں کہ ایک دندان ساز کا مطب پیچھے والی منزل میں واقع ہے۔ جو لڑکے ڈاکٹروں کو کاٹ کھاتے ہیں ان کو وہاں (علاج کی خاطر) لے جاتے ہیں۔ تمھارا علاج پہلے وہیں سے شروع کرنا پڑے گا۔ تمھیں یاد ہوگا کہ ہم نے تمھیں آپریشن کے بعد آئس کریم کھلانے کا وعدہ کیا تھا۔

جب ابا جان نے آئس کریم کا نام سنا تو وہ بہت متفکر ہو گئے اس لیے کہ انھیں آئس کریم کھانے کی اجازت نہ تھی۔ دادا جان اور دادی جان کو ہمیشہ خوف لگا رہتا تھا کہ آئس کریم کھانے سے کہیں ابا جان کا گلا اور نہ خراب ہو جائے۔ ابا جان کو آئس کریم بے حد پسند تھی۔ ان کو بتایا گیا تھا کہ اس طرح کے آپریشن کے بعد آئس کریم کھانا بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ اس کے کھانے سے خون کا بہنا بند ہو جاتا ہے۔ پرانے زمانے میں ایسا ہی کیا جاتا تھا۔ چنانچہ آئس کریم کا تصور کرتے ہوئے ابا جان نے کہا:

"اب میں ہرگز ہرگز کسی کو نہیں کاٹوں گا۔"

تاہم اس نوجوان ڈاکٹر نے جس نے ابا جان کا آپریشن کیا ان کو تنبیہ کی

"یاد رکھنا تم نے وعدہ کیا ہے۔"

اور ابا جان نے اپنا وعدہ پھر سے دہرایا "میں بالکل نہ کاٹوں گا۔"

تب ابا جان کو ایک آرام کرسی پر بٹھایا گیا۔ وہاں نرس نے ان کے دونوں ہاتھ اور پاؤں مضبوطی سے پکڑ لیے۔ یہ اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ ابا جان کاٹ کھاتے بلکہ اس لیے کہ ابا جان ڈاکٹر کے کام میں مخل نہ ہوں۔ تکلیف بہت ہوئی پر ابا جان کا دل تو آئس کریم میں لگا ہوا تھا اس لیے انھوں نے اف تک نہ کی۔ ڈاکٹر نے کہا:

"بہت خوب! قصہ ختم ہوا۔ شاباش۔ تم تو روئے بھی نہیں۔" ابا جان بہت خوش تھے کہ اچانک ڈاکٹر نے پھر کہا:

"ارے ہاں تھوڑا سا کام اور رہ گیا ہے۔ کیا تم ایک سیکنڈ اور صبر کر سکتے ہو؟"

"اچھا" ابا جان نے جواب دیا اور پھر آئس کریم کے خیال میں گم ہو گئے۔

"اب معاملہ ختم ہو گیا" ڈاکٹر بولا "تم بہت اچھے لڑکے ہو اب تمھیں آئس کریم ضرور ملنی چاہیے۔ تم کونسی آئس کریم کھانا پسند کرو گے؟"

"ونیلا" ابا جان زور سے چلائے اور دادا جان کو گھورنے لگے لیکن دادا جان اب بھی خفا لگتے تھے۔

"تم کو آئس کریم مل سکتی ہے لیکن اسی وقت جب تم کاٹو نہیں۔"

جب ابا جان کو محسوس ہوا کہ ان کو آیس کریم نہیں ملے گی تو ابا جان رونے لگے۔ ہر شخص کو ان پر رحم آیا لیکن دادا جان اٹل رہے۔ ابا جان کو یہ زیادتی بڑی لگی چنانچہ ان کو یہ واقعہ اب تک یاد آتا ہے۔ انھوں نے اس وقت سے اب تک ہزاروں بار آیس کریم کھائی ہوگی — ونیلا، چاکلیٹ، اسٹرابیری — لیکن وہ اس آیس کریم کو اب تک نہیں بھولے جس کا وعدہ آپریشن کے وقت ان سے کیا گیا تھا۔

آپریشن کے بعد سے ابا جان کی صحت اچھی ہوگئی۔ اب وہ اتنے بیمار نہ رہتے جتنے رہا کرتے تھے۔ وہ کم چھینکتے اور کم کھانستے۔ ان کے گلے کی تکلیف انھیں کم ستاتی۔ کان میں درد بھی نہ ہوتا۔

آپریشن نے ابا جان کو بہت فایدہ پہونچایا۔ ان کی سمجھ میں آگیا کہ انسان کو آرام کی خاطر کبھی کبھی تکلیف بھی اٹھانی پڑتی ہے۔ بعد کو بہت سے ڈاکٹروں نے ابا جان پر اپنے حربے آزمائے لیکن ابا جان نے کسی کو نہیں کاٹا اس لیے کہ ان کو یقین ہو چلا تھا کہ یہ سب لوگ ان کے آرام کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ہر ڈاکٹر کو دکھانے کے بعد ابا جان آیس کریم لینے ضرور جاتے — ایک ایسی عادت جس سے اب تک چھٹکارا نصیب نہیں ہوا۔

*

جناب انوار انصاری

دیوالی

جگ مگ جگ مگ دیپک جلتے
گھر آنگن دیپک سے سجتے
کوئی دیپک جلا رہا ہے
کوئی دیپک سجا رہا ہے
آکاش میں جیسے جگتے تارے
دھرتی پر دیسے دیپک پیارے
دیپک جلتے جگ مگ
گھر آنگن سب جگ مگ
آج مٹھائی بنتی گھر گھر
بھیڑ سبھی کے دروازے پر
آج سبھی مل خوشی مناتے
مل مل من کی خوشی بڑھاتے
بچے خوشی میں گھوم رہے ہیں
مستی میں سب جھوم رہے ہیں
کتنا اچھا تہوار ہمارا
سب کے من کو ہے پیارا

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں (مسلسل)

قلعے میں بیٹھا دشمن

دمنک گیدڑ نے تب شیر اور خرگوش کی کہانی سنائی۔

ایک جنگل میں بھاسُرک نام کا شیر رہتا تھا۔ بہت طاقتور بہت ہی خونخوار جنگل کے سارے جانور اس کے سائے سے کانپتے تھے۔ وہ روزانہ جنگل کے بہت سے ہرن اور ریچھ وغیرہ ہڑپ کر جاتا تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے درجنوں خرگوش اس کا لقمہ بن جاتے۔

بھاسُرک شیر کے غضب سے سبھی جانور ہر وقت پریشان رہتے تھے۔ نہ جانے کب کہاں کس کی باری آجائے۔ ایک دن جنگل کے سب جانوروں نے ایک جلسے میں اس بات پر غور کیا۔ سب نے کہا کہ موت تو ایک نہ ایک دن سبھی کو آنی ہے مگر بھاسُرک کی وجہ سے یہ جو ہر دم موت کا کھٹکا لگا رہتا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر کی جائے۔

ہر جانور نے اپنا نمائندہ شیر کی خدمت میں بھیجا کہ وہ شکار کے پیچھے بھاگنا چھوڑ دے۔ روزانہ ایک شکار اس کے پاس خود پہونچ جایا کرے گا۔ شیر اس تجویز سے خوش ہوا۔ سوچا پڑے پڑے کھانے کو ملتا رہے تو جنگل کی خاک کون چھانتا پھرے۔ دونوں فریقوں نے اپنے وعدے پر قایم رہنے کا عہد کیا۔

اس دن سے جنگل کے جانور بے فکر ہو کر جنگل میں سیر گشت کرنے لگے۔ شیر کا ڈر سر سے نکل جانے سے سبھی خوش تھے۔ شیر بھی خوش تھا کہ روزانہ گھر بیٹھے ایک شکار مل جاتا ہے۔ اس نے یہ دھمکی تو دے ہی رکھی تھی کہ جس دن شکار نہ پہنچا وہ جنگل میں نکل آئے گا اور ایک ایک جانور کی تکا بوٹی کر کے رکھ دے گا۔ اس لیے اسے پورا اطمینان تھا۔ بہت دن گزر گئے اور شیر کو کوئی شکایت نہ ہوئی۔

ایک دن شیر کے پاس ایک خرگوش کے جانے کی باری تھی۔ ننھی سی جان زندگی کے کچھ لمحے اور بڑھانے کی خاطر جنگل میں ذرا دور تک گھومنے نکل گیا۔ سوچا آج موت تو یقینی ہے کیوں نہ آخری بار جنگل

کہ اچھی طرح سیر کیا جائے۔

کچھ دور جا کر اسے ایک پرانا کنواں نظر آیا کنوئیں میں جھانک کر دیکھا تو اسے اپنی پرچھائیں دکھائی دی۔ وہ بار بار کنوئیں میں جھانکتا اور ہر بار اسے اپنی پرچھائیں دکھائی دیتی۔ اب نہ جانے اس کے دل میں کیا بات سمائی کہ وہ خود بخود مسکرانے لگا۔ اور دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا بھاسُرک شیر کے پاس باادب پہنچ گیا۔

ادھر شیر کی انتڑیاں قل ہو اللہ پڑھ رہی تھیں۔ وہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔ خرگوش کو آتا دیکھا تو اس پر برس پڑا۔ اس نے اتنی دیر کیوں کی!

خرگوش بہت انکساری سے بولا: جناب میں تو بہت سویرے گھر سے نکل پڑا تھا۔ میرے ساتھ چار اور بھی خرگوش نکلے تھے کہ ایک خرگوش سے آپ کا کیا بھلا ہوگا۔ مگر راستے میں ایک شیر مل گیا اور کہنے لگا "موت کی آخری گھڑی میں خدا کو یاد کر لو، میں تم لوگوں کو چٹ کر جاؤں گا"۔

ہم پانچوں خرگوشوں نے کہا کہ ہم لوگ تو اس جنگل کے سوامی بھاسُرک شیر کے پاس جا رہے ہیں وہ ناشتے کے لیے ہم لوگوں کا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مگر وہ شیر کب ماننے والا تھا گرج کر بولا کہ بھاسُرک کون ہوتا ہے اس جنگل کا راجہ تو میں ہوں۔ اس نے چار خرگوشوں کو تو پکڑ لیا اور مجھے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ جا کر بھاسُرک کو بلا لائے میں خود اس سے نبٹ لوں گا۔

یہ سننا تھا کہ شیر آپے سے باہر ہوگیا۔ غصے میں اسے بھوک پیاس تک کا ہوش نہ رہا۔ خرگوش سے کہنے لگا ذرا مجھے وہاں لے تو چل۔ اب تو میں اس کا خون پی کر ہی اپنی بھوک مٹاؤں گا۔ اس جنگل میں کسی دوسرے کا دخل میں کبھی پسند نہیں کروں گا۔

خرگوش نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کہا: سچ ہے سوامی کہ اپنی بقا کے لیے جنگ کرنا آپ جیسے سورماؤں کا فرض ہے۔ مگر دوسرا شیر اپنے قلعے میں بیٹھا ہوا ہے۔ قلعے میں بیٹھے ہوئے دشمن پر قابو پانا بڑا مشکل ہوتا ہے اور قلعے کے بغیر راجہ بے دانت کے سانپ اور بے مستک ہاتھی کی طرح کمزور ہو جاتا ہے۔

بھاسُرک بھلا غصے کے عالم میں نصیحت کی باتیں کب سننے والا تھا کہنے لگا کچھ بھی ہو اگر دشمن کو ابھی جڑ سے نہ کاٹا گیا تو وہ ہمارے لیے ایک ایسی مہلک بیماری بن جائے گا جس کا کوئی علاج نہیں ہوتا۔

خرگوش چپ رہا۔ اب آگے آگے خرگوش اور پیچھے پیچھے بھاسُرک شیر۔ دونوں چل پڑے۔ کنوئیں کے پاس پہنچ کر خرگوش نے کہا۔ سوامی! سچ ہے وہ شیر آپ کو آتا دیکھ کر قلعے میں چھپ گیا ہے۔ شیر نے جو قلعے میں جھانک کر دیکھا تو اسے اپنی پرچھائیں پر دشمن کا شبہ ہوا۔ وہ زور سے گرجا۔ جواب میں پرچھائیں والا شیر بھی گرج پڑا۔ کنوئیں کے اندر سے گرج کی

آنے والی آواز کچھ زیادہ ہی خوفناک تھی اس سے وہ دل میں کچھ ڈرا مگر یہ سمجھ کر کہ دوسرا شیر مجھے للکار رہا ہے اس سے دو دو ہاتھ کرنے کے لیے کنویں میں کود پڑا۔ اور پانی میں کچھ دیر چھٹپٹانے کے بعد مر گیا۔

خرگوش نے مصیبت کے وقت ہوش و حواس قایم رکھے اور عقل سے کام لے کر شیر کا خاتمہ کر دیا۔ یہ خبر سن کر جنگل کے سبھی جانوروں نے خوشی منائی۔ جنگل میں منگل کا سماں بندھ گیا۔

یہ کہانی سنا کر دمنک گیدڑ اپنے دوست کرکٹ گیدڑ سے بولا:۔ اگر تیری صلاح ہو تو میں بھی اپنی عقل لڑا کر پنگ لک شیر اور سنجیوک بیل میں پھوٹ ڈلوا دوں ان دونوں میں پھوٹ پڑے بغیر ہم لوگوں کی ایک نہیں چلے گی۔

اب کرکٹ گیدڑ اس کی بات مان گیا کہنے لگا۔ "اے دمنک تو اپنی سی کوشش ضرور کر۔ خدا کرے تو اس میں کامیاب ہو۔"

دشمن سے ہمدردی رکھنا بے وقوفی ہے

وہاں سے چل کر دمنک پنگ لک شیر کے پاس آیا۔ اس وقت وہ تنہا بیٹھا ہوا تھا۔ پنگ لک نے دمنک کو بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ خیریت تو ہے، بہت دنوں بعد نظر آئے۔

دمنک نے موقع غنیمت جانتے ہوئے پہلا وار کیا۔ بولا: "جب آپ کو ہم سے کوئی سروکار نہیں رہا تو کیا آتے؛ پھر بھی آپ کے فایدے کی ایک بات آپ کے کان میں ڈالنے چلا آیا ہوں۔ بزرگوں نے کہا بھی ہے کہ فایدے کی بات بغیر پوچھے بتا دینی چاہیے۔ مگر زبان کھولتے ہوئے ڈر بھی لگتا ہے۔ آپ جان کی امان دیں تو عرض کروں۔" سنجیوک نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ جو کہنا ہے بے خوف کہو، میں جان بخشی کا قول دیتا ہوں۔

دمنک گیدڑ آہستہ سے بولا — "مالک یہ سنجیوک بیل، جسے آپ اپنا دوست سمجھتے ہیں، آپ کا پکا دشمن ہے۔ ایک دن مجھ سے تنہائی میں کہہ رہا تھا کہ پنگ لک کے دم خم میں نے دیکھ لیے ہیں۔ اس میں کچھ بل بوتا نہیں ہے۔ موقع دیکھ کر میں اسے جان سے مار ڈالوں گا اور پھر تجھے وزیر بنا کر اس جنگل پر چین سے راج کروں گا۔

دمنک کے منہ سے یہ الفاظ سنتے ہی پنگ لک کے اوپر گویا بجلی گر گئی۔ وہ ایسا خاموش ہوا جیسے کہ بے ہوشی چھا گئی ہو۔ دمنک نے جب شیر کی یہ حالت دیکھی تو دل میں سوچنے لگا کہ پنگ لک کی سنجیوک سے بہت گہری دوستی ہے۔ جو راجہ اس طرح اپنے وزیر کے بس میں ہو جاتا ہے وہ برباد ہو جاتا ہے — یہ سوچ کر اس نے پنگ لک کے دل سے سنجیوک بیل کا جادو مٹانے کا اور بھی پکا ارادہ کر لیا۔

پنگ لک شیر کے جب ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو اس نے بہت باندھ کر کہا: "اے دمنک! سنجیوک تو ہمارا دوست ہے۔ اس کے دل میں میری طرف سے کوئی کھوٹ نہیں ہو سکتی۔" دمنک نے سمجھاتے ہوئے کہا: "آقا یہی تو اس دنیا کی ریت ہے۔ اپنے وفا شعار ہی کل دغا دے سکتے ہیں۔ یہ کوئی انہونی بات نہیں۔"

پنگ لک نے کہا: "مگر میرے دل میں سنجیوک کی طرف سے غیریت پیدا نہیں ہوتی ہے۔ لاکھ برائی ہونے پر بھی اپنے عزیز ساتھیوں کو چھوڑا نہیں جاتا۔"

دمنک نے ناصحانہ انداز اختیار کرتے ہوئے کہا: "یہی تو حکمت عملی اور راج کاج کی مصلحت کے خلاف ہے۔ جس کے ساتھ بھی آپ محبت سے پیش آئیں گے وہی آپ کا عزیز بن جائے گا۔ یہ تو آپ کی فراخ دلی ہے اس میں سنجیوک کی خصوصیت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کی نظرِ عنایت اس پر پڑی اور وہ آپ کا عزیز دوست بن گیا ورنہ اس میں کیا گن ہیں۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بہت تعلیم یافتہ ہے اور دشمنوں کے خلاف وہ آپ کے لیے بہت مددگار ثابت ہوگا تو یہ آپ کی بھول ہے۔ وہ گھاس پات کھانے والا ہے اور آپ کے سبھی دشمن گوشت خور ہیں۔ ان کے مقابلے میں یہ کیا ٹک سکتا ہے۔ آج وہ دھوکے سے آپ کی جان لینے کی تاک میں ہے۔ اچھا ہو کہ اس کی سازش کے رنگ لانے سے پہلے ہی آپ اس کا کام تمام کر دیں۔"

پنگ لک یہ سن کر سوچ میں پڑ گیا کہنے لگا: "دمنک جسے ہم نے پہلے باکمال سمجھ کر اپنایا اسے بھرے دربار میں آج نالائق کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر تیرے کہنے ہی سے میں اسے جان کی اماں کا قول دے چکا ہوں۔ میرا دل کہتا ہے کہ سنجیوک میرا دوست ہے۔ میرے دل میں اس کی طرف سے ذرا بھی غبار نہیں ہے۔ اگر اس کے دل میں رنجش آ گئی ہے تو بھی میں اس کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتا۔ اپنے ہاتھوں لگایا ہوا زہر کا پودا بھی اپنے ہاتھوں نہیں کاٹا جاتا۔"

دمنک گیدڑ نے بہت میٹھے انداز میں اپنی نصیحت جاری رکھتے ہوئے کہا: "حضور آپ کی یہ باتیں محض جذباتی ہیں۔ سیاسی حکمت عملی اس کی بالکل اجازت نہیں دیتی۔ دشمنی کا جذبہ رکھنے والے کے ساتھ ہمدردی دکھانا سیاسی نقطۂ نظر سے بہت بڑی بے وقوفی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس کی دوستی میں آ کر آپ نے ساری سیاسی مصلحتوں کو نظرانداز کر رکھا ہے۔ سیاسی دور اندیشی سے کام نہ لینے کی وجہ سے ہی جنگل کے بہت سے جانور آپ کی طرف سے لاپرواہ ہو گئے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ میں اور سنجیوک میں دوستی کا ہونا بالکل بے جوڑ اور غیر فطری بات ہے۔ آپ گوشت خور اور وہ سبزی خور، بھلا دونوں کا کیا جوڑ۔ اگر آپ اس سبزی خور سے اس طرح رسم و راہ بڑھائیں گے تو جنگل کے دوسرے جانور آپ کا سہارا چھوڑ دیں گے۔ یہ بھی آپ کی حکومت

کے لیے بڑا ہو گا۔ اس کی صحبت میں رہ کر آپ میں بھی
وہی کمزوریاں پیدا ہو جائیں گی جو سبزی خوروں میں ہوتی
ہیں۔ شکار سے آپ کو نفرت ہو جائے گی۔ آپ کی دوستی
تو اپنے ہم مزاج لوگوں سے ہی ہونی چاہیے۔ اسی لیے
شریف انسان رذیلوں کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ کیا آپ
نے کھٹمل اور جوں کی کہانی نہیں سنی ہے کہ کھٹمل کی
صحبت میں رہ کر جوں کو اپنی جان گنوانی پڑی تھی۔

پنگ لک شیر نے کہا: "دمنک تو نے یہ کیا بات
کہی؟ ذرا اس کو بھی تفصیل سے سنا۔"

دمنک گیدڑ نے کہا: "اچھا تو پہلے کھٹمل اور
جوں کی کہانی سنتے چلیے۔"

(باقی آئندہ)

بقیہ مرغوں کے انڈے

رکھ کر اس نے منگوائی ہے کہ دیگچی اس لونڈے کے ہاتھ
میں تھما کر یہ ثابت کریں گے کہ اس نے آپ کے گھر چوری
کی ہے۔ مرغ تو سب کے سب مل گئے ہیں لیکن مرغ سے
ثبوت پکا نہیں ہو گا۔ خیر نہ دیجیے، میں تو چلا۔"
اور وہ جانے لگا۔

داروغہ جی کی بیوی نے پیتل کی ایک دیگچی لڈو
رکھ کر اس کے حوالے کر دی لیکن تھیں تو بہرحال داروغہ
کی بیوی۔ انھوں نے اپنا ایک ملازم بھی اس کے پیچھے
لگا دیا۔

ڈیوڈ نے دیکھ لیا تھا کہ ملازم اس سے کچھ
دور اس کے پیچھے پیچھے چلا آ رہا تھا۔ اور اب وہ اس سے بچ
کر نکل بھاگنے کی کوشش میں تھا۔

اور جلد ہی یہ موقع اسے ہاتھ آ گیا۔ چوک میں بڑی
بھیڑ تھی اور ڈیوڈ اس بھیڑ میں گھس گیا — اور پھر —
داروغہ جی کا ملازم کافی دیر تک آنکھیں پھاڑے اسے تلاش
کرتا رہا لیکن وہ نظر نہ آیا۔

وہ نظر آتا بھی کہاں سے اس وقت تو غزالہ، رشو
خیام اور قرۃ العین کے علاوہ پڑوس کے کچھ اور بچے مرغ
کے انڈوں کا جشن منا رہے تھے اور سوچ رہے تھے کہ
مرغیوں کے انڈوں سے یہ مرغوں کے انڈے زیادہ
مزے دار تھے۔ بڑے مزے کے لڈو تھے۔ خالص
دیسی گھی کے!

امّاں میری

جناب اطہر عزیز

کتنی ہمدرد و نگہبان ہیں امّاں میری

میں تو اسکول گیا اور چلا بھی آیا
سب سبق یاد کیا اور سنا بھی آیا
کچھ پڑھا خود تو کچھ اوروں کو پڑھا بھی آیا
پھر بھی کیوں جانے پریشان ہیں امّاں میری
کتنی ہمدرد و نگہبان ہیں امّاں میری

پیار کرنے میں نہیں رکھتی ہیں وہ اپنی مثال
رات دن اُن کو لگا رہتا ہے بس میرا خیال
قابلِ دید ہے غصے میں نگران کا جلال
حسنِ اخلاق کی پہچان ہیں امّاں میری
کتنی ہمدرد و نگہبان ہیں امّاں میری

جانے کیوں آج تو ملتا نہیں ابّا کا مزاج
جیسے اس گھر میں چلا آتا ہو ان کا ہی راج
ختم کرنا ہی پڑے گا انھیں یہ الٹا رواج
سارے گھر والوں کی جب شان ہیں امّاں میری
کتنی ہمدرد و نگہبان ہیں امّاں میری

نت نئی چیزوں سے ہے کوئی نہ رغبت مجھ کو
تیری دنیا کی ہے یارب نہ ضرورت مجھ کو
خواہشِ زر ہے نہ دولت کی ہے چاہت مجھ کو
میری دولت مرا ایمان ہیں امّاں میری
کتنی ہمدرد و نگہبان ہیں امّاں میری

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

(مسلسل)

ہندوستان سے واپسی پر بھی مجھے قاضی صاحب کی قدم بوسی نصیب ہوئی تھی۔ اس وقت حضرت قاضی صاحب شہر مز میں تشریف رکھتے تھے۔ یہ شیراز سے ۲۵ دن کی مسافت پر ہے۔ اتنے بوڑھے ہو گئے تھے کہ چلنا پھرنا مشکل تھا۔ ہڈی سے چمڑا لگ گیا تھا مگر جوں ہی میں نے سلام کیا شیخ نے پہچان لیا۔ اٹھ کھڑے ہوئے اور گلے ملے۔

دوسرے دن قدم بوسی کو گیا تو شیراز کا بادشاہ اپنے کان پکڑے شیخ کے سامنے بیٹھا تھا۔ یہ حد سے بڑھ کر ادب ہے۔

ایک دفعہ سلطان کی ماں اور بہن میں جھگڑا ہوا تو قاضی صاحب ہی کو ثالث بنایا۔ دونوں نے اقرار کیا کہ جو فیصلہ قاضی صاحب فرمائیں گے ہم دونوں کو منظور ہو گا۔

شیراز والے حضرت شیخ کو قاضی نہیں لکھتے مولانا الاعظم لکھتے ہیں۔

شاہ شیراز:۔ میرے زمانے میں شیراز کا بادشاہ ابو اسحاق محمد شاہ تھا۔ یہ بادشاہ صورت اور سیرت میں، نیکی اور اخلاق میں بلند درجہ رکھتا ہے۔ بہت بڑے ملک کا مالک ہے۔

بادشاہ کو اصفہان والوں پر بڑا بھروسا ہے۔ شیراز والوں پر اطمینان نہیں ہے۔ بڑے عہدے شیراز والوں کو نہیں دیتا نہ خدمت گزاری کا کام لیتا ہے۔ شیراز والوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت بھی نہیں ہے شیراز والے جلد بغاوت پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔

ایک دفعہ میں نے دیکھا کہ پولس والے ایک آدمی کی گردن میں رسی باندھے گھسیٹے لیے جا رہے ہیں۔ اس کا قصور یہ تھا کہ شاہی حکم کے خلاف رات میں کمان لٹکائے جا رہا تھا۔

دیوان کسریٰ:۔ ایک دفعہ شیراز والوں کو سلطان نے حکم دیا کہ کسریٰ کے محل جیسا محل تیار کیا جائے

شیراز والوں نے بادشاہ کے حکم اتنی عزت کی کہ چبوترے کے ٹوٹے [illegible] جن پر ریشم منڈھا ہوا تھا۔ گدھوں کی جھولیں بھی ریشم کی بنائیں۔ چاندی کے پھاوڑے تیار کیے۔ یہ لوگ کھدائی کے وقت عمدہ عمدہ کپڑے پہنتے اور ریشم کے پٹکے باندھ کر کھدائی کرتے تھے۔

سلطان ایک اونچی جگہ بیٹھ کر ان کی مستعدی دیکھتا اور خوش ہوتا۔ جس وقت دیواریں زمین سے تین گز اونچی اٹھ گئی تھیں تو میں نے اسے دیکھا تھا۔

عمارت بنانے کا کام امیر جلال الدین فلکی کے سپرد تھا۔ فلکی خاندان بڑا دولت مند ہے۔ فلکی کا باپ وزیر کا نایب ہے۔ فلکی کا ایک بھائی بہار الملک میرے ساتھ ہندوستان بھی گیا تھا اور شرف الملک امیر بخت بھی۔ شاہِ ہند نے ان سب کو خلعت دیے تھے اور روزینہ مقرر کر دیا تھا۔

شیراز کا بادشاہ شاہِ ہند کی نقل تو اتارتا ہے مگر وہ بات کہاں میسر آسکتی ہے۔

شاہِ شیراز کی سخاوت کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ شیخ زادہ خراسانی کو جب وہ ہرات کا سفیر بن کر آیا تھا ستر ہزار اشرفیاں دی تھیں مگر شاہِ ہند نے نہ جانے کتنے خراسانیوں کو قمیں کی رقمیں دے ڈالیں۔

بادشاہِ ہند کی سخاوت: بادشاہِ ہند کی سخاوت کے قصے بیان کیے جائیں تو پوری کتاب تیار ہو جائے پھر بھی دو تین واقعے لکھتا ہوں:-

جتنا سونا چاہو اٹھا لو: ایک دفعہ خراسان کا ایک بڑا عالم شاہِ ہند کے دربار میں حاضر ہوا۔ اس کا نام امیر عبداللہ تھا۔ شاہ خوارزم کی بیوی نے کچھ تحفے دے کر اسے شاہِ ہند کے پاس بھیجا تھا۔ شاہِ ہند نے یہ تحفے قبول کر لیے اور ان سے دوگنے شاہ خوارزم کی ملکہ کے پاس بھیج دیے۔ امیر عبداللہ کو اپنا مصاحب بنا لیا اور روزینہ مقرر کر دیا۔

ایک دن شاہِ ہند نے عبداللہ سے کہا، خزانے میں جاؤ اور جتنا سونا تم سے اٹھے اٹھا لو۔ عبداللہ نے تیرہ تھیلیاں لیں اور سب میں ٹھونس ٹھونس کر سونا بھرا۔ پھر یہ سب تھیلیاں ہاتھوں اور پاؤں میں باندھ لیں۔

عبداللہ بڑا طاقت ور تھا۔ تھیلیاں باندھ کر کھڑا تو ہو گیا مگر چلا نہ گیا۔ خزانے کے باہر آ کر گر پڑا۔ شاہِ ہند نے تلوایا تو تیرہ من سونا تھا (من پندرہ رطل مصری کا یعنی ساڑھے سات سیر کا ہوتا ہے۔) یہ سب سونا شاہِ ہند نے عبداللہ کو بخش دیا اور وہ اسے اپنے گھر لے گیا۔

سخاوت کا دوسرا واقعہ: امیر بخت شرف الملک میرے ساتھ شاہِ ہند کے پاس آیا تھا اتفاق سے بیمار ہو گیا۔ شاہِ ہند دیکھنے آیا۔ شرف الملک تعظیم کے لیے اٹھنے لگا تو بادشاہ نے روک دیا اور حکم دیا کہ ترازو اور سونا منگوایا جائے۔

شرف الملک سے کہا کہ ترازو کے ایک پلڑے
میں بیٹھو اور ایک طرف سونا رکھا جائے۔
شرف الملک بولا اگر مجھے پہلے سے خبر ہوتی تو
بہت سے بھاری کپڑے پہن لیتا اور یوں وزن بڑھا لیتا۔
بادشاہ نے مسکرا کر اجازت دے دی کہ جتنے کپڑے
پہن سکو پہن لو اور پلڑے میں بیٹھو۔
شرف الملک نے تلے اوپر بہت سے کپڑے
پہن لیے اور ترازو کے پلڑے میں بیٹھ گیا۔ جب سونا
برابر ہو گیا تو بادشاہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ شرف الملک کے
صدقہ کر دینا۔

تیسرا واقعہ۔ عبدالعزیز ایک بڑے
محدث دربار میں آتے تھے۔ ان کی تعلیم دمشق میں ہوئی
تھی فقہ اور حدیث کے بڑے فاضل تھے۔ ایک دن شاہ
ہند نے عبدالعزیز سے ایک حدیث پوچھی۔ عبدالعزیز نے
بہت سی حدیثیں اسی مضمون کی سنا دیں۔ بادشاہ عبدالعزیز
کے حافظے اور ذہانت سے اتنا متاثر ہوا اور عبدالعزیز
کی اتنی قدر کی کہ تخت سے اتر کر قدم چومے اور ایک ہزار
اشرفیاں کشتی میں بھر کر اپنے ہاتھ سے نذر پیش کی۔

چوتھا واقعہ۔ ایک مرتبہ ایک خراسانی
دربار میں حاضر ہوا اس کا نام شیخ عبدالرحمن اسفراینی تھا
پچاس ہزار سونے چاندی کے سکے، گھوڑے، غلام اور
خلعتیں انعام میں دیں۔
اس وقت تو شیراز کے حالات میں شاہ ہند کا
ذکر آگیا ہے۔ ہندوستان کے سو سال کے حالات کے
کا تو معلوم ہو گا کہ یہ بادشاہ کیسا سخی ہے اور کیسے کیسے
حیرت انگیز کام کرتا ہے۔ پھر بھی شاہ شیراز بہت اچھا
آدمی ہے اور سخی بھی ہے۔

شیراز کے مزار

شیراز کے مزاروں میں احمد بن موسیٰ کا مزار بڑا مبارک
ہے۔ یہ بزرگ چھ واسطوں سے سیدنا علی کرم اللہ وجہہ
کی اولاد ہیں۔ شیراز والے اس مزار کا بڑا احترام کرتے ہیں
سلطان کی ماں تاش خاتون نے ایک بڑی خانقاہ اور
مدرسہ بنوا دیا ہے جس میں مسافروں کو کھانا ملتا ہے۔
طاش خاتون ہر پیر کی رات کو یہاں حاضر ہوتی
ہے۔ شہر کے معزز لوگ، عالم اور قاری وغیرہ جمع ہوتے
ہیں۔ قرآن پاک ختم کیا جاتا ہے۔ سب بیٹھ کر حلوا اور پھل
کھاتے ہیں۔
ظہر کی نماز کے بعد سے قرآن خوانی، وعظ، ذکر
و شغل شروع ہو جاتا ہے۔ پھر مزار کے دروازے پر
نفیری اور قرنا بجتا ہے۔ طاش خاتون ایک کھڑکی میں بیٹھی
رہتی ہے اور وہاں سب رسموں کو دیکھتی رہتی ہے۔

عبداللہ بن خفیف: یہ بھی اپنے وقت کے
بزرگ اور قطب تھے۔ شیخ بہاء الدین بھی عبداللہ بن خفیف
کے مزار پر حاضری دیتے ہیں اور قبر کو بوسہ دیتے ہیں

خانقاہوں میں ہر جمعرات کو حاضری ہوتی ہے۔ شہر کے مشائخ دین دار لوگ اور عالم بھی آتے ہیں۔ قوالی اور مجلسِ وعظ بھی ہوتی ہے۔ سلطان کے باپ محمد شاہ کی قبر بھی یہیں ہے۔

یہ عبداللہ بن خفیف وہی بزرگ ہیں جنھوں نے لنکا کا راستہ معلوم کیا تھا۔

لنکا کے ہاتھی:-

شیخ عبداللہ لنکا گئے تو تیس درویش ان کے ساتھ تھے۔ اتفاق سے راستہ بھول گئے اور بھوک سے بے تاب ہو گئے۔

لنکا کے جنگلوں میں چھوٹے بڑے ہاتھیوں کے غول کے غول پھرتے تھے۔ بھوک کی بے قراری میں درویشوں نے ہاتھی کا ایک بچہ پکڑ کر ذبح کیا۔ شیخ نے ہر چند منع کیا کہ اسے نہ کھاؤ۔ مگر نہ مانے اور بچے کا گوشت کھا گئے۔

رات کو سوئے تو ہاتھیوں کے غول کے غول نمودار ہوئے اور سب کو گھیر لیا۔ ہاتھی ہر ایک کا منہ سونگھتے تھے اور مار ڈالتے تھے۔ اس طرح سب کو مار ڈالا۔ شیخ کا منہ سونگھا تو ہٹ گئے۔

ایک بڑے ہاتھی نے سونڈ میں لپیٹ کر شیخ کو اٹھا کر اپنی پیٹھ پر بٹھا لیا پھر سب چل پڑے اور شہر میں آ گئے۔

شہر والوں نے جنگلی ہاتھی دیکھے تو بہت گھبرائے لیکن ہاتھی کسی سے نہ بولے۔ بڑے ہاتھی نے شیخ کو اتار کر آہستہ سے زمین پر بٹھا دیا اور چپ چاپ واپس چلے گئے۔

شیخ نے بستی والوں کو یہ عجیب ماجرا سنایا تو وہ لوگ انھیں اپنے گھروں میں لے گئے اور ان کی بڑی خاطر مدارات کی۔

یہ سب لوگ بتوں کو پوجتے تھے۔ بستی کا نام حورالجیزان تھا۔ بستی سمندر کے کنارے آباد ہے۔ کنارے پر غوطہ لگانے والے لوگ یعنی غوطہ خور ہیں جو غوطہ لگاتے ہیں اور قیمتی پتھر سمندر کی تہہ سے نکال لاتے ہیں:

ایک دن بادشاہ کے سامنے شیخ نے بھی غوطہ لگایا اور تہہ سے نکل کر دونوں مٹھیاں بادشاہ کے سامنے کر دیں کہ جس مٹھی کو چاہے لے لیجیے۔

بادشاہ نے کہا جو کچھ دائیں مٹھی میں ہے وہ ہمارا ہے۔ شیخ نے مٹھی کھولی تو تین یاقوت اتنے قیمتی نکلے جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ بادشاہ بے حد خوش ہوا اور یاقوت اپنے تاج میں ٹانک لیے۔ اب یہی تاج ہر ایک کو وراثت میں ملتا ہے۔

میں بھی اس جزیرے میں گیا ہوں۔ اس جزیرے کا نام سیلان (سیلون) ہے۔ یہاں کے لوگ بدمذہب ہیں۔ درویشوں کی بڑی خاطر کرتے ہیں۔ اپنے گھروں میں ٹھہراتے ہیں اور ایسا برتاؤ کرتے ہیں جیسے درویش انھی کے خاندان کے ہیں۔ ہندوستان کے دوسرے ہندو مسلمانوں کی [illegible]

گڑیا کی رخصتی پر

تاب وقار واثقی

دیکھ بہن، یہ میری گڑیا
سچ مچ ہے جادو کی پڑیا
دکھ جو اٹھائے اس کی خاطر
وہ ہیں میری شکل سے ظاہر
نازوں کی پالی، بھولی بھالی
سمجھو ہے پھولوں کی ڈالی
گھر کے سارے کام کرے گی
جگ میں اونچا نام کرے گی
گھر کو بنا دے گی یہ جنت
ہوگی تم پہ خدا کی رحمت
روٹی کپڑے جیسا دو گی
لے کر اسی کو یہ خوش ہوگی
لڑنے کی عادت ہی نہیں ہے
شکوے کی حاجت ہی نہیں ہے
لیکن اتنا دھیان بھی رکھنا
سن لو بہن یہ میری تمنا

اسبق یہ بھول نہ جائے
ٹیڈی گرل نہ بننے پائے

جناب محمد سلامت اللہ

مُلّا نصرالدین کے لطیفے

ایک بار آپ نے اپنے وعظ میں فرمایا "اے مسلمانو... دن رات اس خدائے تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کیا کرو جس نے اونٹوں کو پر اور بازو نہیں عطا کیے۔ ورنہ اگر وہ بھی فضا میں پرواز کرنے لگتے تو کیا جب وہ تمہارے گھر کی چھتوں پر گر پڑتے۔ چھتیں تمہارے اوپر ٹوٹ پڑتیں اور تم دب کر ختم ہو جاتے۔"

ایک دن تقریر میں فرمانے لگے کہ اس شہر کی آب و ہوا بالکل میرے ہی شہر جیسی معلوم ہوتی ہے۔ لوگوں نے بڑے تعجب سے دریافت کیا "آپ کیسے پہچان گئے؟" فرمایا "میں دیکھتا ہوں کہ جتنی شکل و صورت کے ستارے ہمارے شہر کے تھے بالکل ویسے ہی اس شہر کے آسمان کے معلوم ہوتے ہیں اور جتنی تعداد ہمارے شہر کے آسمان کے ستاروں کی تھی اتنی ہی اس شہر کے آسمان کے ستاروں کی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے ہمارے اور تمہارے شہر کی آب و ہوا کا یکساں ہونا بھی ضروری ہے۔"

ایک دن مُلّا صاحب سو رہے تھے، خواب میں ایک شخص ان کو ۹ روپے دینے لگا اور یہ اس سے دس روپیوں کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ لڑائی جھگڑے کی نوبت آ گئی۔ دھینگا مشتی شروع ہو گئی تو اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھا ہاتھ [illegible] [illegible] بہت پچھتائے اور جلدی سے [illegible] [illegible]

اور ہاتھوں کو اپنے فرضی مقابل کی طرف بڑھا کر کہنا
شروع کر دیا کہ "اے بھائی! الاؤ تو ہی دید دوں
کے لیے پریشان نہ ہو"

ایک دن مُلّا نصرالدین حمام میں داخل ہوئے،
ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مُلّا صاحب نے
گنگنانا شروع کر دیا، اپنی آواز بہت ہی بھلی لگی
اور یک بیک ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اللہ
نے ان کو اتنی سُریلی آواز عطا فرمائی ہے اور اس
سے وہ دوسرے مسلمان بھائیوں کو لطف اٹھانے
کا موقع نہ دیں، کتنی بڑی ناانصافی ہوگی۔
اس خیال کا ذہن میں آنا تھا کہ مُلّا صاحب دوڑتے
ہوئے جامع مسجد پہنچے اور مسجد کے مینار پر چڑھ
گئے اور زور سے الاپنے لگے ظہر کی اذان کا وقت
بالکل قریب ہو چکا تھا، نیچے لوگوں کی بھیڑ جمع ہو
گئی تھی، ان کو مُلّا صاحب کی یہ حرکت دیکھ کر بڑا عجب
ہوا۔ ایک شخص سے رہا نہ گیا تو اس نے چلّا کر کہا "تمہارا
بُرا ہو، اے بے وقوف، تمھیں یہ کیا سوجھی ہے کہ لوگ
کو چلا چلا کر پریشان کیے ڈال رہے ہو۔ دیکھتے نہیں
ظہر کی اذان کا وقت ہو چکا ہے"
مُلّا صاحب نے اوپر سے جواب دیا "اے میرے
بھائی! اگر کوئی مہربان شخص مجھ پر محض اتنا احسان
کر دیتا کہ اس مینار کے اوپر ایک غسل خانہ تعمیر
کرا دیتا تو میں تم کو اپنی اتنی سُریلی آواز سناتا کہ تم
اس کو سن کر بالکل مست ہو جاتے اور اس کے
مقابلے میں بلبل کی چہچہاہٹ بھی تم کو پسند نہ آتی"

ایک دن مُلّا نصرالدین اپنے شہر کی جامع مسجد
میں تقریر کرنے منبر پر چڑھ کر بیٹھ گئے اور لوگوں
سے سوال کیا "لوگو! تمھیں معلوم ہے کہ میں تم
سے کیا کہنے والا ہوں" لوگوں نے جواب دیا "نہیں!"
مُلّا صاحب نے فرمایا "میں ایسے جاہلوں
کے سامنے کچھ کہنے میں فائدہ نہیں سمجھتا، جو یہ بھی
نہ جانتے ہوں کہ مقرر ان کے سامنے کیا کہنے والا
ہے" اور منبر سے اتر کر گھر کی راہ لی۔
دوسرے دن پھر لوگ جمع ہوئے اور آپ
تقریر کرنے کے لیے منبر پر بیٹھ گئے اور لوگوں کے
سامنے پھر وہی سوال دہرایا۔ اس بار لوگوں نے
ہاں، ہاں کی آواز بلند کرنا شروع کی۔
اس بار مُلّا صاحب نے فرمایا "جب تم لوگوں
کو معلوم ہے کہ میں تمہارے سامنے کیا بیان کرنے والا
ہوں تو پھر انھیں باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟"

باقی صفحہ

جناب جی نکولائیوا

چھوٹی دُم، لمبے کان

بہت زمانہ گزرا کہ خرگوشوں کے بال سفید
تھے۔

اُن کے کان چھوٹے اور دُمیں لمبی ہوتی تھیں
خطرناک جانور ان کی لمبی دُموں کو پکڑ لیتے
اس لیے ایک روز خرگوشوں نے دور کہیں
جاکر چھپنے کا فیصلہ کیا۔

یوں ہی وہ کودتے ہوئے آگے بڑھے
انہوں نے جلتے ہوئے درخت دیکھے
اور شعلوں کو دھکیلتی ہوئی لکڑیوں
تک پہنچے جہاں ان کی دوست گلہریاں
تھیں۔

خرگوشوں نے واپس جاکر گلہریوں کو خطرے
سے آگاہ کرنے کا فیصلہ کیا اور پھر انہوں نے
اپنے دوستوں کے ساتھ جھیل پار کی۔

خرگوش بہت تیز دوڑے، لیکن شعلے ان
سے زیادہ تیز تھے۔

شعلوں نے خرگوشوں کو پکڑ لیا اور ان
کی لمبی دُموں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

دُمیں جلنا شروع ہو گئیں۔ وہ جلتی رہیں
اور آخر کار صرف ایک مختصر سا ٹکڑا باقی رہ گیا
آگ کے دھوئیں سے ان کے سفید بال بھورے
ہو گئے۔

شاخیں اور ٹہنیاں شعلوں میں جل گئیں تو خرگوشوں کے کان کپکپانے لگے اور خوف سے بھیل آخرکار خرگوش ایک دلدل میں پہنچ گئے جسے شعلے پار نہیں کر سکتے تھے۔

انھوں نے اپنی دوست گلہریوں کو خطرے سے آگاہ کیا اور ان کے ساتھ جھیل پار کی۔

اس وقت سے سردیوں کے موسم میں خرگوشوں کے بال سفید ہوتے ہیں اور گرمیوں میں وہ بھورے ہو جاتے ہیں۔ ان کے کان لمبے ہوتے ہیں اور دُمیں چھوٹی ہوتی ہیں۔

اب خطرناک جانوروں کے لیے خرگوش کو پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

بقیہ ملا نصرالدین کے لطیفے

تیسرے دن پھر آپ تقریر کی غرض سے تشریف لائے اور لوگوں کے سامنے اپنا پرانا سوال دہرایا۔ اس بار لوگوں نے جواب دینے میں قدرے توقف سے کام لیا۔ کسی نے کہا "ہاں" کسی نے کہا "نہیں"!

مُلّا صاحب جواب سننے کے بعد بولے "مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ بہت سے لوگ میری باتوں سے واقف ہیں۔ اب انھیں کے سر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ناواقف لوگوں کو میری باتوں سے واقف کر دیں۔

بخشی جنتری
بحمد اللہ خصوصیاتِ ذیل کیساتھ شایع ہوگئی ہے
★ مکمل آفسیٹ کے ذریعہ انتہائی دیدہ زیب طباعت ★ پاکٹ سائز ۴۸ صفحات ★ ارزاں قیمت
★ بہترین مضامین مثلاً ترجمۃ القرآن ★ نعت شریف ★ پیش گوئی ★ تاثیرات منازل فلکی دو آدہ رج)
★ اسماء تاریخی ★ شادی کی مبارک تاریخیں ★ ہجری، عیسوی، ہندی، بنگلہ شک سمت جنتری
★ سائنس کی محیر العقول ایجاد ہوائی قلعے ★ ازدواجی زندگی سے متعلق سوال نامہ ★ فالنامہ... وغیرہ وغیرہ
غرضیکہ کوزہ میں دریا کو سمو دیا گیا ہے۔ ان تمام اضافی خوبیوں کے باوجود قیمت صرف پانچ روپیہ فی سیکڑہ۔ یکمشت ایک ہزار اور زاید کے لیے ۴۵ روپیہ فی ہزار۔ (دو سو سے کم کا آرڈر قبول نہیں کیا جائے گا۔) آرڈر کے ساتھ چوتھائی رقم پیشگی بھیجیے۔
شایع کردہ:۔ ایس۔ اے۔ بی۔ بخشی کمپنی ۳۲ کولو ٹولا اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱
اسٹاکسٹ: جنرل نیوز ایجنسی۔ بلیماران دہلی۔ صفی اللہ بک سیلر، مدنپورہ بمبئی ۸۔ ناز بک ڈپو، بمبئی ۳۔ محمد سمیع بکسیلر طلاق محل کانپور۔ حاجی محمد حسین دفتری ڈال منڈی بنارس۔ اپنا کتب خانہ کیٹھار۔ ظفر بک ڈپو۔ گیا۔ نور محمد اینڈ سنز، کمپنی باغ مظفر پور۔ آصف علی خاں بھونڈی گلی پریمی کتاب منزل پٹنہ وغیرہ وغیرہ تقریباً ہر بڑے شہر میں موجود ہیں۔

جناب محمود قمر برنی

پکنک

مستی بھری فضاؤں میں پکنک منائیں ہم
خوشیاں بھرے ترانوں کو مل جل کے گائیں ہم

ہر فن کی روشنی سے منور ہے انجمن
رنگینوں سے اور بھی محفل سجائیں ہم

جنگل میں آج رنگ ہمارے ہی دم سے ہے
پھر کیوں نہ مست ہو کے ہنسیں اور ہنسائیں ہم

استاد بھی شریک ہیں بچوں کے ساتھ ساتھ
بچپن کی یادیں ان کو بھی تازہ کرائیں ہم

مِل جُل کے گیت گانے کا مقصد یہی ہے صرف
قصے یہ اونچ نیچ کے دل سے بُھلائیں ہم

مذہب ہر ایک قوم کا انسانیت سے پیار
اپنے دلوں سے رنگ دوئی کا مٹائیں ہم

رونا نہیں ہے شیوہ ہمارا اے دوستو
انسانیت کی بات جہاں کو سکھائیں ہم

شہری اگرچہ بننا ہے اچھا ہمیں قمر
ہر انجمن میں فرض کو اپنے نبھائیں ہم

مولانا خلیل جامعی

ڈاکٹر ذاکر حسین جامعہ میں

لگ بھگ چالیس برس پہلے کی بات ہے،

نان کوآپریشن اور خلافت کی تحریکیں زوروں پر چل رہی تھیں۔ شہر شہر اور بستی بستی میں خلافت کی حفاظت اور ہندوستان کی آزادی کا چرچا تھا۔ انھیں دنوں ایک ایسے مقام پر جانا ہوا جو علی گڑھ سے دس پندرہ میل دور تھا۔ طے ہوا کہ واپسی پر علی گڑھ اتریں۔ ایسا ہی کیا گیا۔ کچھ مقامی کارکنوں کے ہمراہ مسلم یونیورسٹی کی سیر کی، اس کے بعد نیشنل مسلم یونیورسٹی جامعہ ملیہ اسلامیہ کی سمت روانہ ہوئے جو اس وقت خیموں میں آباد تھی۔ ایک آدھ مختصر سا بنگلہ بھی جامعہ کے تصرف میں نظر آیا۔ یہاں بڑی سنجیدگی، بڑی سادگی اور بڑی خاموشی نظر آئی۔ دل پر ایک خاص اثر ہوا۔ اِدھر اُدھر آتے جاتے طالب علموں پر نظر پڑی۔ انھیں دیکھ کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ اس جگہ کو چھوڑ آئے ہیں جہاں کی تعلیم سے فراغت پاکر ایک اچھے مستقبل کی توقع کی جاسکتی تھی اور جہاں اب ہیں وہاں کے مستقبل کا کچھ پتا نہیں۔ کتنے دل والے ہیں یہ لوگ! اس خیال نے دل میں ایک عجیب سا تاثر پیدا کیا جس میں ایک خاص کشش تھی اور پھر ایک عرصے کے بعد جامعہ میں داخلے کا موقع بھی مل گیا

جامعہ کی زندگی میں داخل ہونے کے بعد عام طور پر جن دلچسپ منزلوں سے ہر نو وارد کو گزرنا پڑتا تھا اتفاق کی بات میں ان سے بالکل محفوظ رہا اور پہلے ہی دن سے ایسا محسوس ہوا کہ میں ہمیشہ سے یہیں رہتا تھا۔ استادوں اور طالب علموں کی سادگی، محبت، برابری کا برتاؤ، ہمدردی شفقت اور ایک دوسرے کی تکلیف کا احساس اور اس تکلیف کے دور کرنے کی کوشش۔ غرض ان خوبیوں نے جامعہ میں ایک خاص کشش پیدا کردی تھی۔

جامعہ کی زندگی کا دلچسپ مگر بہت اہم پہلو میرے زمانۂ قیام میں یہ تھا کہ جامعہ کی بنیاد جس خیال کے تحت پڑی تھی اس نے جامعہ کو ایک خاص حیثیت دے دی تھی، وہ یہ کہ حکومت یعنی انگریز سرکار اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی اس لیے سرکاری اور سرکار پسند لوگ

عام طور پر اپنے بچوں کو جامعہ میں نہیں بھیجتے تھے اور ویسے بھی انھیں جامعہ کی تعلیم سے بچوں کے لیے کسی اچھے مستقبل کی امید نہ تھی۔ طالب علموں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور جو تھی ان میں بھی کافی لڑکے اپنا خرچ پورا کرنے کے لیے جامعہ کے اندر یا باہر کچھ وقت اجرت کا کام کرتے تھے۔

یوں تو جامعہ میں شعبۂ تعلیم کے ساتھ ساتھ دوسرے شعبے مثلاً لائبریری، مکتبہ، پریس وغیرہ سبھی تھے لیکن روپے کی کمی کے باعث ہر چیز ادھوری ادھوری تھی، تعلیمی نظم بھی اسی کا شکار تھا۔ لیکن اس ساری کمی کے باوجود جو چیز کامل و اکمل تھی وہ تھی استادوں، طالبعلموں اور ہر شعبے میں کام کرنے والوں کا عزم، استقلال، پکا ارادہ، کام کرنے کی دھن۔ بے ساز و سامان قافلہ کے میر کارواں تھے ذاکر صاحب جو نہ صرف یہ کہ استقلال کے کوہ گراں بلکہ اپنے ساتھیوں کے حوصلوں کو بڑھانے کی خاص فکر رکھتے تھے۔

جامعہ میں اس وقت اس طرح کی گروہ بندیاں نہ تھیں جیسی دوسری جگہوں پر ہوا کرتی ہیں لیکن ہاں طبیعتوں کی مناسبت کے لحاظ سے اسٹاف میں بھی اور طالب علموں میں بھی متعدد گروپ ضرور بن گئے تھے۔ یہ گروپ اپنے اپنے طور پر مختلف اوقات میں تبادلۂ خیال اور تفریح کے لیے یکجا ہو جایا کرتے تھے۔

ذاکر صاحب کبھی اطلاع دے کر اور کبھی بغیر اطلاع دیے ایسے مجمع میں پہنچ جاتے تھے۔ کافی وقت تفریحی گفتگو اور کام کی باتوں میں صرف کرتے اور باتوں باتوں میں اپنے مطلب کی بات کہہ جایا کرتے۔ اس قسم کی نشستوں میں شرکت کر کے وہ جامعہ کے بہت سے کاموں کے لیے اپنے ساتھیوں کو آمادہ کر لیا کرتے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس میں کوئی شک نہیں کہ وسائل کی کمی طرح طرح کی دشواریوں کا پہاڑ لا کر کھڑا کر دیا کرتی تھی۔ کبھی دیکھیے تو آٹے دال والا تقاضے کے لیے سر پر کھڑا ہے کبھی کوئی دوسرا۔ اور اس قسم کے موقع جب جب پیش آتے (اور وہ پیش آتے ہی رہتے تھے) میرا تاثر یہ رہا کہ ذاکر صاحب کافی متفکر اور پریشان ہو جایا کرتے تھے۔ تقاضا کرنے والوں کا اندازِ گفتگو کبھی کبھی بڑا تلخ ہوتا تھا۔

یہ حالات ایسے تھے جن کا احساس صرف اسٹاف کے لوگوں کو ہی نہ تھا بلکہ طالب علموں کو بھی تھا کیوں کہ بہت سے کاموں کی ذمہ داریاں ان پر بھی تھیں اس لیے ہر کوئی ان دشواریوں کے حل کے بارے میں فکرمند ضرور رہتا اور اگر کسی سے کچھ بن پڑتا تو وہ ضرور کرتا۔

چند ماہ جامعہ میں گزارنے کے بعد دو چار دن کی رخصت لے کر پرانے احباب سے ملنے میرٹھ گیا بھائی فاضل مرحوم کے یہاں قیام ہوا۔ میری موجودگی جامعہ کے موضوع پر گفتگو کا خصوصی سبب بنی۔ چند ماہ جامعہ میں رہ کر جو دیکھا تھا وہ سب کہہ ڈالا۔

مرحوم نے بڑی خاموشی سے میری گفتگو سنی۔

وہ بڑے عملی انسان تھے اس لیے مجھے امید ہوئی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ ایک دو روز بعد میں جامعہ واپس آگیا۔

دو تین ہفتوں کے بعد بھائی فاضل کا خط آیا "حکیم محمد میاں صاحب جن کے طبی کمالات کا دور دور شہرہ ہے، حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے ساتھی، حکیم محمود احمد خاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ تمام قومی تحریکوں میں حصہ لیتے ہیں۔ چونکہ تنہا ہیں اور اللہ کا دیا ان کے پاس بہت کچھ ہے اپنا یہ سرمایہ کسی ادارے کو دے دینا چاہتے ہیں لہٰذا تم اور ڈاکٹر صاحب دونوں آؤ تب حکیم صاحب سے فیصلہ کن گفتگو ہوگی۔" میں نے ذاکر صاحب سے اس دعوت کا ذکر کیا اور ایک مقررہ تاریخ پر ہم دونوں تھرڈ کلاس میں میرٹھ کے لیے روانہ ہوگئے۔

ذاکر صاحب کی گفتگو بڑی شگفتہ، بڑی سنجیدہ لیکن بڑی لطیف اور لطف انگیز ہوتی ہے۔ گاڑی جب غازی آباد سے میرٹھ کے لیے روانہ ہوئی تو فرمانے لگے میرٹھ آنے میں تو ابھی کافی دیر ہے، کچھ دیر کے لیے سو کیوں نہ لیا جائے؟

ہم تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے جس میں عام طور پر مسافروں کی بھیڑ رہتی ہے لیکن اتفاق سے اس وقت ہماری بوگی میں مسافر برائے نام تھے۔ جگہ کافی تھی، مگر میں سوچنے لگا کہ یا اللہ یہاں ڈاکٹر صاحب سوئیں گے کیسے؟ نہ بستر، نہ تکیہ۔ ٹرین کی سیٹوں سے تو بانوں کی کھرّی چارپائی زیادہ آرام دہ ہوتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب فوراً سمجھ گئے، فرمانے لگے "فکر نہ کیجیے، شیروانی اتار کر آدھی سر کے نیچے رکھ لیں گے آدھی بچھا لیں گے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے جھٹ شیروانی اتاری اور آرام فرمانے لگے۔ میں نے بھی اسی پر عمل کیا۔ ڈاکٹر صاحب تو لیٹتے ہی سو گئے اور میں کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔

گاڑی بھاگی چلی جا رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ جامعہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کو کتنی مشقتیں اٹھانا پڑتی ہیں۔ سونے کو پورا وقت بھی نہ مل پاتا ہوگا جب ہی تو ایسی جگہ پر بھی اور اتنے مختصر سفر میں لیٹتے ہی سو گئے۔

ایک گھنٹہ سو کر ڈاکٹر صاحب بیدار ہو گئے اٹھ کر بیٹھ گئے۔ فرمانے لگے "سوئے نہیں؟" عرض کیا: "کوشش تو بہت کی مگر نیند نہ آئی۔"

اتنے میں ایک اسٹیشن پر گاڑی رکی۔ دیکھا ایک تربوز والا تربوز کی قاشیں آواز لگا کر بیچ رہا ہے۔ فرمانے لگے "کتنی نفع بخش ہے یہ تجارت ۷۰ - ۷۵ فی صدی سے کم فائدہ نہیں ہوتا۔" میں نے عرض کیا: "جی ہاں پچہتر فی صدی نفع سے جو رقم بنتی ہے اس کا مقابلہ اس وقت سے کیا جائے جو اس تجارت پر صرف ہوتا ہے تو نفع کی افادیت کیا رہ جاتی ہے۔" فرمانے لگے "ہاں وقت تو واقعی بہت صرف ہوتا ہے۔"

باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ میرٹھ چھاؤنی کا اسٹیشن

آگے بھائی فاضل اسٹیشن پر موجود تھے۔ انھوں نے بتایا [illegible] صاحب نے دوپہر کے کھانے کا انتظام اپنے یہاں کیا ہے اور یہ کہ معاملہ کی گفتگو کھانے سے پہلے ہی ہوگی۔

حکیم صاحب کا دولت کدہ محلّہ لال کورتی میں تھا۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد مطب کا وقت ختم ہوگیا، حکیم صاحب اسی کمرے میں تشریف لے آئے جہاں ہم لوگ پہلے سے موجود تھے۔ بہت دیر تک جامعہ اور اپنی جایداد منقولہ اور غیر منقولہ کے بارے میں گفتگو کرتے رہے لیکن گفتگو ناتمام رہی۔ ناتمام رہنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جن شرطوں کے ساتھ حکیم صاحب اپنی جایداد جامعہ کو دینا چاہتے تھے، ان کی تعمیل و تکمیل جامعہ کے بنیادی مقاصد کے تحت نہیں ہوسکتی تھی۔

حکیم صاحب سے رخصت ہو کر ہم لوگ فیض عام ہائی اسکول آئے۔ بھائی فاضل کو یہ فکر پیدا ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب کو بالکل خالی ہاتھ کیسے رخصت کیا جائے۔ انھوں نے اپنے ایک پرانے شاگرد کو جو ٹھیکیداری کرتے تھے بلوایا اور ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری کا مقصد بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ اتنی جلدی تو کچھ نہیں ہوسکتا، البتہ فوری طور پر سو روپے جامعہ کے لیے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔

ان سو روپوں کے دینے اور لینے کا منظر اتنی مدت گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک میری نظروں کے سامنے ہے۔ ڈاکٹر صاحب بار بار ان کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ راستے میں حتیٰ کہ جب دلی اسٹیشن پر اتر کر قرول باغ کے لیے تانگہ پر روانہ ہوئے ڈاکٹر صاحب نے کئی بار فرمایا: "خلیل صاحب چند گھنٹوں کے اندر سو روپے مل گئے تو سفر کیا برا رہا۔ اگر ہر روز ایسا سفر کرنا پڑے تب بھی کیا مضایقہ۔"

میرٹھ سے واپسی پر ٹرین میں راستے بھر یہ گفتگو رہی کہ جامعہ کی مالی دشواریوں کے حل کے کیا کیا ذریعے ہو سکتے ہیں۔ میں نے عرض کیا: "اس سفر سے ایک تجربہ ہوا، کسی ایک شخص کا خواہ وہ کتنا ہی دولت مند کیوں نہ ہو، سہارا لینا فضول ہے۔ اس کے بجائے ایسے لوگوں کو جہاں جہاں ممکن ہو تلاش کرنا چاہیے، جن کو جامعہ کا ہمدرد بنایا جاسکے، جو مستقل طور پر، خواہ تھوڑی ہی سہی، جامعہ کی امداد کرتے رہیں۔" فرمانے لگے تجویز بڑی اچھی ہے۔ اس کے لیے کوشش ہونا چاہیے۔

جامعہ پہنچ کر میں نے بھائی فاضل کو اس تجویز کے ساتھ ایک تفصیلی خط لکھا۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ پہلے سے کسی قدر زمین ہموار کرلیجیے، پھر میں میرٹھ آجاؤں اور ہم آپ اس کام کو ایک نظم میں لے آئیں۔ کچھ دنوں بعد اسی مقصد کے لیے میرٹھ جانا ہوا۔ جامعہ کے چند ہمدرد بھی بن گئے جنھوں نے ماہانہ ایک مخصوص امداد کا وعدہ کیا۔ ایک سادہ کاغذ پر امداد کرنے والوں کے نام، پتے، ماہانہ رقم لکھائی اور جو رقم اس وقت وصول

ہوئی تھی وہ سب لاکر میں نے خواجہ فیاض احمد صاحب مرحوم رجسٹرار جامعہ کے حوالہ کردی۔ اب اس کام کو منظم کرنے، پھیلانے اور اس کے لیے رسیدیں اور ضروری کاغذات کی ترتیب و طبع کا مرحلہ تھا یہ دفتری کام تھے اور خواجہ فیاض احمد صاحب مرحوم اس کے ماہر۔

ہمدردان جامعہ کی تشکیل و تنظیم ابھی ایک خیالی مرحلے ہی میں تھی کہ ایک نیا مرحلہ پیش آگیا وہ یہ کہ اسلامیہ نیشنل ہائی اسکول رنگون (برما) جس کا الحاق جامعہ سے تھا وہاں سے کئی استادوں کی مانگ ہوئی ان میں سے ایک عربی استاد کی بھی تھی۔

جامعہ میں اس وقت مدارس عربیہ کے فراغت یافتوں کی کافی تعداد تھی لیکن ڈاکٹر صاحب کا حکم میرے بارے میں ہوا کہ اسے بھیج دیا جائے۔ خواجہ فیاض احمد صاحب نے کہا بھی کہ اس کے بجائے کسی دوسرے کو بھیج دیجیے اور میں بھی یہی چاہتا تھا لیکن ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ بھیجا جائے تو اسی کو ورنہ پھر کسی کو نہیں۔ اب تعمیل حکم کے سوا چارہ نہ تھا مجبوراً رنگون روانہ ہوگیا اور جس مقصد سے جامعہ آیا تھا وہ پورا تو کیا ہوتا ادھورا بھی نہ ہو سکا۔

میں رنگون میں تھا کہ معلوم ہوا، شفیق الرحمٰن صاحب مرحوم نے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے اور حق یہ ہے کہ جس تندہی اور جانفشانی سے اس کام کو پورے ہندوستان میں پھیلایا، بڑھایا اور منظم کیا وہ انھی کا حق تھا۔

ہنگامی تحریکوں میں جن میں جذبات کو زیادہ سے زیادہ اپیل کرنے کی طاقت ہو، لوگ دھڑلے سے چندہ دیتے ہیں یا پھر ان اداروں کو جو پچاس ساٹھ سالہ بہترین کارکردگی کا ریکارڈ رکھتے ہوں۔ جامعہ میں یہ دونوں باتیں نہ تھیں۔ نہ وہ کوئی ہنگامی تحریک تھی نہ اس کی پشت پر پچاس سالہ ریکارڈ۔ ہاں اسے چند سر پھرے خادم ضرور مل گئے تھے۔ انھیں میں ایک شفیق صاحب مرحوم بھی تھے۔ وہ جس جس طرح اور جس جس ڈھنگ سے کشکول گدائی لے کر در در گھومے اور نہ دینے والوں کی ناہموار باتوں اور طنزیہ تیروں کی زد کو سہہ جانے میں جس صبر و تحمل کا ثبوت دیا وہ انھی کا حصہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ مجھ جیسا ناتواں شاید ہی ان مصائب کو جھیل پاتا۔

جامعہ جیسے اداروں کے لیے عوام سے تعلق کی ایک خاص اہمیت ہے اور اس کا بہترین ذریعہ ہمدردانِ جامعہ جیسا کوئی شعبہ ہی ہو سکتا ہے۔ جامعہ کی تاسیس تحریک آزادی کا ایک اہم رخ ہے آج بھی اس کی بقا کی بہت بڑی ضمانت اسی رخ کی بقا ہے۔

اردو لکھیے ———

اردو پڑھیے ———

اردو بولیے ———

ایک دن کیا ہوا

جناب اقبال مہدی

ابا کام پر جا رہے تھے۔ گھر سے سائیکل نکال کر انہوں نے سڑک پر کھڑی کی اور کچھ لینے گھر کے اندر گئے۔

سلیم اور سلمہ انہیں رخصت کرنے نکلے تھے وہیں کھڑے رہے۔ دونوں کو سائیکل چلانا سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ابا کہتے ابھی چھوٹے ہو سائیکل سنبھال نہ سکو گے۔ بڑے ہو جاؤ گے تب سکھا دیں گے۔ لیکن ان کا دل نہ مانتا۔ جب بھی موقع ملتا سائیکل سے دل بہلاتے۔

اس وقت بھی موقع پا کر دونوں سائیکل سے کھیلنے لگے۔ سلیم گھنٹی بجانے لگے اور سلمہ نے پائیڈل ہاتھ سے گھما کر سائیکل کا پچھلا پہیہ گھمانا شروع کیا۔ "بولی" دیکھیے بھائی جان! میں اسے گھما سکتی ہوں اور تیز گھماؤں! یہ دیکھیے۔"

سلمہ کو یہ کام زیادہ دلچسپ معلوم ہوا لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ زیادہ دلچسپ کام سلمہ کرے اس لئے فوراً سلمہ کو ڈانٹا۔ "یہ نہ کرو سائیکل خراب ہو جائے گی۔" سلمہ نہ مانی سلیم اور بگڑا اس نے بریک لگا کر پہیے کو روک دیا۔ بولا "دیکھا میں اس کو روک سکتا ہوں۔"

سلمہ چکرائی وہ بھیا کا کہنا ٹال سکتی تھی لیکن بھیا بریک کا کہنا نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے پہیہ گھمانے کے لئے پھر پائیڈل گھمایا۔ پہیہ گھوما سلیم نے پھر بریک لگایا۔ پہیہ رک گیا۔

اب تو دونوں میں مقابلہ شروع ہو گیا۔ سلمہ پائیڈل گھمانے کے لیے زور لگاتی۔ سلیم بریک لگانے کے لئے زور لگاتا۔ پہیہ کبھی گھومتا کبھی رک جاتا زور آزمائی کے ان جھٹکوں کو سائیکل برداشت نہ کر سکی وہ سلمہ پر گر پڑی اور سلیم سائیکل پر۔ پہلے تو دونوں کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہوا کیا۔ جب ہوش بجا ہوئے تو گھبرائے۔ ڈرے بھی۔ اور رونے لگے۔

سڑک پر گذرنے والوں نے جلدی سے سائیکل اٹھائی ان دونوں کو اٹھایا۔ دونوں کے چوٹ آئی تھی سائیکل کا پائیڈل بھی مڑ گیا تھا۔ اتنے میں ابا بھی آ گئے پہلے دونوں کی مرہم پٹی کرائی پھر سائیکل کی مرمت۔ تب کام پر گئے۔ انھیں اس کی وجہ سے دیر بھی ہو گئی۔ امی بولیں کہنا نہ ماننے اور آپس میں لڑنے کا مزہ چکھ دونوں کو چوٹ کی تکلیف تھی، شرمندہ بھی تھے

شربت بنائیے

جناب م۔ ن۔ خان

جون کے شمارے میں جادو کے گلاس آپ کو مل چکے ہیں آپ میں سے بہت سوں نے جادو کے گلاس تیار کیے ہوں گے اور دوستوں کو کھیل دکھا کر اپنی جادوگری کا رعب بھی جما یا ہوگا۔ آج ہم آپ کو ایک اور نئی چیز بنانا سکھاتے ہیں اور وہ چیز ہے "رنگ بدلنے والے شربت" اس کے لیے ان چیزوں کی ضرورت پڑے گی۔

۱۔ فنو فتھلین ۲۔ کاشٹک سوڈا

۳۔ نمک کا تیزاب ۴۔ تین گلاس اور دو چمچے

فنو فتھلین سفید پاؤڈر کی طرح ہوتا ہے یہ کسی کیمسٹ کی دوکان سے یا آپ کے اسکول سائنسی تجربہ گاہ سے مل جائے گا کاشٹک سوڈا کسی پنساری کی دوکان سے خرید لیجیے کھیل دکھانے کے لیے تین شیشے کے گلاس لیجیے ہر گلاس کو پانی سے آدھا آدھا بھر دیجیے اب پہلے گلاس میں ۱/۲ چمچہ فنو فتھلین۔ دوسرے گلاس میں ۱/۲ چمچہ کاشٹک سوڈا۔ تیسرے گلاس میں ۲۵-۳۰ بوند تیزاب گھول لیجیے بس کھیل تیار۔

تینوں گلاسوں میں بھرا ہوا پانی ایک جیسا یعنی سادہ پانی نظر آئے گا اب آپ اپنے دوستوں سے کہہ سکتے ہیں کہ ہم جادو کے ذریعہ ان شربتوں کا رنگ بدل دیں گے لیکن دیکھیے کسی پیامی پر اپنی جادوگری جتانے کی کوشش مت کیجیے گا۔

اچھا تو آپ دکھائیے کھیل! پہلے گلاس کا کچھ پانی یا شربت دوسرے گلاس کے شربت میں ملا دیجیے دیکھنے والے حیران رہ جائیں گے کہ سفید شربت ایکدم گہرا گلابی ہوگیا ہے اب اس گلابی شربت کو تیسرے گلاس والے شربت میں ملا دیجیے یہ گلابی شربت پھر اپنی پہلی شکل میں آجائے گا یعنی رنگ غائب ہو جائے گا کیسا ہے دلچسپ کھیل۔

لیکن بھئی اس کے لئے کچھ احتیاطیں بھی برتنی ضروری ہیں۔

۱۔ فنو فتھلین اور سوڈے کو آپس میں ملنے نہ دینا چاہیے۔

۲۔ دونوں چیزوں کو الگ الگ چمچوں سے نکالنا چاہیے۔

۳۔ نمک کا تیزاب اپنے جسم اور کپڑوں سے بچا کر استعمال کرنا چاہیے

ذاکر نمبر ملا

محبی حسین حسان صاحب۔ تسلیم۔

پیام تعلیم کا ذاکر نمبر موصول ہوا شکریہ۔ میں
اس پرچے کے چند مضامین پڑھے بعض بہت اچھے ہیں۔
مضمون جو ذاکر صاحب کی کہانی "ابو خاں کی بکری" کی بنا
تیب دیا گیا ہے، تخلیقی انشا کی عمدہ مثال ہے۔
رسالے کی ترتیب میں خوش سلیقگی کارفرما ہے۔ کتابت
طباعت دیدہ زیب ہے۔ میرے خیال میں یہ پرچہ نہ صرف
ستان کی دوسری زبانوں میں نکلنے والے بچوں کے بہترین
ائل میں شمار کیا جا سکتا ہے بلکہ یورپ اور امریکا کے
قسم کے پرچوں کا ہم پلہ ہے۔
امید ہے کہ یہ بچوں اور بڑوں بھی میں مقبول ہوگا اور
تعلیم کی مستقبل کی ترقی کا ضامن ہوگا۔

سلامت اللہ
(پرنسپل ٹیچرس کالج جامعہ)

محترم بھائی، آداب قبول فرمائیں
پیام تعلیم کا ذاکر نمبر موصول ہوا۔ کئی رات تک
اس کے اوراق میں ڈوبا رہا۔ واقعی آپ نے ایک بڑا کام
کیا ہے ——— ہر لحاظ سے میں اسے ایک بڑا کام سمجھتا
ہوں۔ نہ صرف بچوں کے لیے اس کی حیثیت واہمیت ایک معلم
جیسی ہے بلکہ اس میں شایع ہوا ہر مضمون اجالے کی ایسی کرنیں
ہیں جو ہمارے نونہالوں کی زندگی کو اجالا بخشیں گی ———
ان سب کے علاوہ 'ذاکر نمبر' کی تواریخی اہمیت بھی ہے۔ راشٹرپتی
کا درجہ ملک کا پہلا درجہ ہے۔ دیش کے بچوں کو اپنے راشٹرپتی
کے بارے میں علم ہونا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف اپنے علم میں اضافہ
کر سکیں بلکہ تحریک حاصل کر کے آگے بھی بڑھ سکیں۔ آنے
والے 'کل' کو جانے ان نونہالوں میں سے کون ہمارا راشٹرپتی بنے۔
واقعی آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میری تو خواہش
ہے کہ آیندہ بھی آپ ایسے خاص نمبر شایع کریں جن میں ہمارے
قومی رہنماؤں کی زندگی ——— خصوصاً بچپن ——— کی
جھلک ہو۔ نہرو نمبر ——— ذاکر نمبر ——— کا یہ سلسلہ جاری
رہنا چاہیے۔

آپ کا اپنا
کیول دھیر

مکرمی، آداب

پیام تعلیم کا ذاکر نمبر موصول ہوا۔ اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ یہ نمبر نکال کر آپ نے واقعی بہت بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کے دل میں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جو محبت اور لگن ہے اس کے لیے ہم ان کے ہمیشہ احسان مند رہیں گے۔ اس نمبر کے ذریعے ذاکر صاحب کے حالاتِ زندگی کے بہت سے گوشے پہلی بار سامنے آتے ہیں جو بہت ہی دلچسپ اور مفید بھی ہیں۔ اس شاندار کارنامے کے لیے آپ کی اور ادارۂ پیام تعلیم کی خدمت میں ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

رام لال
لکھنؤ

محترمی ندوی صاحب

"پیام تعلیم" کا ذاکر نمبر ملا۔ آپ نے نہایت ہی شاندار نمبر نکالا ہے۔ دلی مبارکباد قبول کیجیے۔

بچوں کی بہبود محترم المقام ذاکر صاحب کو ہمیشہ محبوب رہی ہے اس لیے بچوں کے ایک جریدے کا ذاکر نمبر شایع کرنا بہت ہی عمدہ بات ہے۔ جناب عبداللہ ولی بخش قادری کا مقالہ "بچوں کے ذاکر صاحب" مجھے بہت ہی پسند آیا ہے۔

والسلام
جگن ناتھ آزاد

بھائی تاباں صاحب تسلیمات

پیام تعلیم کا ذاکر نمبر ملا۔ بہت شکریہ۔ آپ نے لاجواب کام کیا ہے جس کے لیے میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔

غلام احمد ایڈوکیٹ،
حیدرآباد

مکرمی حضرت حسین حسان سلمکم اللہ تعالیٰ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

"پیام تعلیم" کا ذاکر نمبر میرے پوتے عارف سلمہٗ کو مالیر کوٹلہ میں مجھ سے پہلے ملا اور مجھے مکتبہ جامعہ بمبئی سے بعد میں۔ مجھے کھلے دل سے آپ اور آپ کے ادارہ کو اس نمبر کی کامیاب اشاعت پر دلی مبارکباد دینی چاہیے۔ منثور مضمون، نظمیں سرورق اور اندر کی تصویریں خاص چیز ہیں۔ سب مضمون اچھے ہیں اور مفید ہیں۔ بحیثیت مجموعی ذاکر صاحب کی گوناگوں خوبیوں اور محاسن کا یہ بڑا دل پذیر مرقع ہے۔ اگر موصوف کی مذکورہ خوبیاں بچوں میں پیدا ہو جائیں تو وہ ہم جیسے کہن سال بوڑھوں کے لیے ایک پیارا نمونہ بن جائیں۔ ہر مضمون لکھنے والے کی افتادِ مزاج اور پسند و ناپسند کی بھی غمازی کرتا ہے۔

آپ نے میرے مضمون کے "چھ منزلہ لفظی ملبے" کے نیچے دبی ہوئی "علم کی تلاش" کی روایت کو خوب مرمت بھی کی، خوب ترتیب دی۔ جزاکم اللہ

مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی

مکرمی حسین حسان صاحب السلام علیکم

"پیام تعلیم" کا ذاکر نمبر جو میری لڑکی عفت آرا کے پاس آیا تھا دیکھنے کو ملا۔ بہت کامیاب نمبر نکالا ہے

... نمبر بیاسب ہی مضامین قابل تعریف ہیں اور ان
... کر صاحب کی شخصیت اچھی اور پوری روشنی
... مضمون میں بھی آپ ... خوب جمع کی ہیں۔ ہر لحاظ سے
... اچھا نمبر ہے اور اسے نکالنے پر آپ قابل مبارکباد

خیر اندیش
اسلوب احمد انصاری
شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

محب مکرم سلام مسنون
"پیام تعلیم" نے "ذاکر نمبر" نکال کر جامعہ ملیہ
... کی سب سے زیادہ اہم، باوقار، پرکشش اور ہمہ گیر شخصیت
"ذاکر" ... اس جامع نمبر کے لیے آپ خاص طور پر ادارہ
کے تمام احباب دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔
اس نمبر کی ترتیب "احسان" کے "حسن انتخاب" کی
... وار ہے۔ سب مضامین مفید اور جامع ہیں۔ ان کے
... سے ذاکر صاحب کی سیرت و شخصیت کا قریب قریب
... سامنے آجاتا ہے۔ حیات ذاکر کے لیے "پیام تعلیم" کا
... نمبر سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔
"ذاکر صاحب اور اردو" پر کوئی مضمون نظر سے
... اسی طرح ذاکر صاحب کے تعلیمی نظریات تجربات
... خدمات کی بھرپور ترجمانی نہیں کی گئی۔ امید ہے کہ "پیام تعلیم"
... نمبر کا سلسلہ جاری رکھے گا اور آئندہ ان کے متعلق مفید
... معلومات فراہم کرتا رہے گا۔
ذاکر صاحب کی شہرت، عزت اور عظمت اس

لیے نہیں ہے کہ وہ صدر جمہوریت ہند ہیں بلکہ اس لیے ہے کہ
ملک و ملت کے لیے انھوں نے بے لوث خدمت اور بے انتہا
محنت کی ہے۔ جہالت کی تاریکی میں علم کی شمع روشن رکھی، وہ
صدر جمہوریہ سے پہلے بھی شفیق استاد تھے اور اب بھی ہیں۔
انھوں نے اپنی تعلیم سے، اپنے خطبات سے، اپنے افکار و کردار
سے ہر دل میں علم کی لو لگائی ہے۔ ان کا یہ احسان ناقابل فراموش
ہے۔
"پیام تعلیم" ان کی تعلیمات کی توسیع و اشاعت کا
بہترین اور مؤثر ترجمان رہا ہے اور آئندہ بھی اس کو رہنا
چاہیے۔

مخلص
شجاعت علی سندیلوی

برادر گرامی۔ تسلیم
مکتوب ملا۔ "ذاکر نمبر" اگلے سب خاص نمبروں
سے مواد کے اعتبار سے بہت بہت وقیع نکلا ہے۔ ذاکر صاحب
کی شخصیت، منصب، اہلیت، اخلاق، کردار اور قد و قامت
پوری طرح واضح ہوتی ہے۔ مضمون نگاروں نے اپنا اپنا حق
ادا کر دیا ہے۔ حسب سابق اب بھی آپ کی تحریر اس نمبر میں نہیں
ملی مگر ہر تحریر کے بین السطور سے آپ نمایاں ضرور رہے ہیں۔
عبداللطیف صاحب، محترمہ سعیدہ، سلمیٰ صاحبہ، محترمہ آصفہ
مجیب، مولانا شہاب، مجیب احمد صاحب، فکری صاحب
قدوائی صاحب، حفیظ صاحب، احمد علی صاحب، بشر صاحب
ڈاکٹر ... کے مضامین خوب ہیں۔ ... صاحب کی ڈائری
سے کہیں بچوں کے لیے لکھنا والا مضمون ٹھیک ہے ...

ترتیب اور دیگر دلچسپیاں بھی لائق ستائش ہیں۔ اس مخصوص نمبر کی اشاعت پر میری اور میرے بچوں کی طرف سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ سب رس میں تبصرہ بھی جلد ہی آجائے گا۔

مارکیٹ میں پرچہ فروخت ہو رہا ہے اور عام طور پر پسند کیا جا رہا ہے۔

وقار خلیل

......جی ہاں! ذاکر نمبر نظر نواز ہوا۔ بڑے کام کی چیز ہے۔ مضامین دلچسپ اور افادہ بخش ہیں جن سے ذاکر صاحب کی حیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ میں نے اسے پوری توجہ سے پڑھا اور بلا شبہ پسند کیا۔ آپ اور مکتبہ جامعہ لائق صد مبارکباد ہیں۔

عزت الاکرام

مرزا پور

مکرمی۔ السلام علیکم

اتنا شاندار ذاکر نمبر نکالنے پر مبارکباد قبول فرمائیے آپ نے تو بڑوں کے پرچوں کو بھی مات کر دیا۔ سبھی مضامین اچھے ہیں۔ ظ۔ انصاری صاحب کے دونوں مضامین پُر لطف ہیں۔ یہ اچھا ہوا کہ آپ نے سلمیٰ صدیقی صاحبہ کا مضمون شامل کر لیا۔

یوسف ناظم بمبئی۔

برادر محترم السلام علیکم

پیام تعلیم کا ذاکر نمبر ملا ماشاء اللہ اچھا

ہے اور وہ شخصیت بھی تو اچھی ہے۔ مجھے علم نہ تھا ورنہ کچھ کوشش کرتا۔ ذاکر صاحب کے ساتھ وقت گزارنے کا کافی موقع ملا تھا اور بہت قریب سے موصوف کو دیکھا ہے۔ ۔۔۔ میں اکثر علاج کے سلسلے میں بمبئی تشریف لاتے تھے۔ میں پابندی سے برابر ملتا تھا۔ ہم لوگ دریا کے کنارے سیر و تفریح کے لیے چلے جاتے تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے تک یہ پر لطف صحبت رہتی تھی۔ بمبئی کے اسکولوں کے لیے کتابیں مرتب کرنے کی تجویز انھی دنوں میں نے پیش کی تھی۔ ان دنوں یہاں انجمن حمایت اسلام کی کتابیں چل رہی تھیں۔ میں مصر تھا کہ مکتبہ جامعہ کا حق ہے کہ وہ کتابیں مرتب کرکے نئے حالات کے مطابق جاری کر لے۔ بات طے ہو گئی لیکن یہاں لیگ کا زور تھا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ مجھ پر چھوڑ دیں میں ان مخالفتوں کو دیکھ لوں گا۔ مکتبہ جامعہ کی کتابیں اسکول کے کتب خانے کے لیے میں نے منگوائی تھیں۔ کتابیں برابر آرہی تھیں اور لوگ ان کو پسند کر رہے تھے یہاں کے لوگ جامعہ سے روشناس ہو رہے تھے۔ عبدالغفار مدھولی کو بھی ان مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا اور میں ساتھ تھا۔ اس طبقے کی نبض کو میں پہچان گیا تھا۔ اب زمانہ ہوا۔ وہ دور گزر گیا۔ کبھی تو

خراب جانے دیجیے۔ بمبئی تشریف لائیے! ضرور! بچوں کو دعائیں۔ یہ طویل سفر نہیں، طویل سفر تو دہرا ہے۔

والسلام

عمادی

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجیے۔

نام:۔ سعید اختر انصاری۔ عمر ۹ سال
پتہ:۔ معرفت حکیم عبدالجلیل۔ محلہ سکراول پورب
ٹانڈہ ضلع فیض آباد
مشغلہ۔ تعلیمی تاش کھیلنا، قلمی دوستی، سیر و سیاحت

نام:۔ اس۔ اے۔ ام۔ سہسرامی۔ عمر ۱۶ سال
پتہ:۔ معرفت ام۔ یٰسین ایگ مرچنٹ۔ ڈاک خانہ
پیرو۔ شاہ آباد
مشغلہ۔ پیام تعلیم پڑھنا، شعر و شاعری

نام:۔ خواجہ عزیز احمد عمر ۱۱ سال
پتہ:۔ عزیز منزل شیر پورہ ورنگل
مشغلہ۔ مطالعہ کرنا۔ اسٹامپ (Stamp) بنانا

نام:۔ سعید نواز۔ عمر ۱۱ سال
پتہ:۔ حافظا منزل۔ منڈی بازار۔ ورنگل
مشغلہ۔ کتابیں پڑھنا اور جمع کرنا۔ قلمی دوستی

نام:۔ محمود احمد۔ عمر ۱۳ سال
پتہ:۔ محمود منزل۔ شیر پورہ۔ ورنگل
مشغلہ۔ لائبریری قائم کرنا، قلمی دوستی، کیرم کھیلنا۔

نام:۔ نزہت سلطانہ عمر ۱۳ سال
پتہ:۔ ارشد منزل پاپیاپیٹ مکان ۶؍۲۴۶ ورنگل
مشغلے:۔ سلائی کا کام، کہانیاں پڑھنا اور دوسروں
کو سنانا۔ مطالعہ

نام:۔ انور محی الدین عمر ۱۳ سال
پتہ:۔ چار باؤلی۔ ورنگل
مشغلہ:۔ لائبریری قائم کرنا۔ اچھے اچھے رسالے پڑھنا۔

نام:۔ محمد یوسف وانی عمر ۱۶ سال
پتہ:۔ بسنت باغ سری نگر
مشغلہ:۔ کورس کی کتابوں کے علاوہ کہانیاں اور
بچوں کی دوسری کتابیں پڑھنا

نام:۔ شمیم احمد خاں۔ عمر ۱۱ سال
پتہ:۔ معرفت حکیم مستقیم الدین خاں محلہ چوکھنڈ
سہسرام شاہ آباد۔ (بہار)
مشغلہ:۔ پیام تعلیم پڑھنا۔ قلمی دوستی

بچوں کی کوششیں

تلاش

یہ گرمیوں کی چھٹیاں — کہاں گئیں اجی میاں
نہیں ہے ہم کو کچھ خبر — یہ ہو گئیں اِدھر اُدھر
مجھے پتہ نہیں چلا — یہ قافلہ کدھر گیا!
چلو کہ ڈھونڈیں انھیں — چلو چلیں چلو چلیں
لگیں گی ہاتھ پھر کبھی — پتہ نہیں یہ کچھ ابھی
گئے ہوئے دنوں کو لاؤ — جو سوتے ہیں انھیں جگاؤ
یہ آؤ دیں دُعا انھیں۔
کہ خوش رہیں جہاں رہیں

مشہود انوار سہیل
ششم (ب) جامعہ

کنجوس سپاہی

ایک سپاہی تھا۔ وہ بڑا خوبصورت اور طاقتور تھا مگر اس میں ایک برائی تھی۔ وہ بہت کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کی یہ عادت دن بدن بڑھتی جارہی تھی۔

ایک دن وہ ایک کپڑا لے کر ایک درزی کے پاس گیا۔ اسے اپنے لیے ایک قمیض بنوانی تھی۔ درزی نے سپاہی کو دیکھا اور پھر کپڑے کو۔ کپڑا کم تھا۔ درزی فوراً سمجھ گیا کہ یہ بہت کنجوس ہے۔ اس نے مسکرا کر سپاہی کی طرف دیکھا اور بولا،

"حضور کتنی قمیصیں سلوائیں گے؟"

سپاہی نے جب "کتنی" لفظ سنا تو سمجھ گیا کہ اس کپڑے میں ایک سے زیادہ قمیصیں بن سکتی ہیں درزی سے بولا:

"تم کتنی بنا سکتے ہو؟"

"اگر تنگ اور چست چاہیے تو بآسانی دو قمیصیں بن سکتی ہیں" درزی نے کپڑے کی طرف دیکھ کر کہا۔

"بآسانی" کا لفظ سن کر سپاہی اور لالچ میں آگیا اور بولا:

"استاد ذرا غور کرو، اگر تین ہو جائیں تو سبحان اللہ"

درزی سمجھ گیا کہ سپاہی کنجوس ہونے کے ساتھ

ساتھ بھی ہے۔ فوراً بولا:
"اگر تنگی اور کوتاہی کا خیال نہ کیا جائے تو چار کیا زیادہ بھی نکل سکتی ہیں۔"

سپاہی نے ہنس کر کہا۔ "ہم لوگ سپاہی ہیں جتنے چست اور تنگ کپڑے پہنیں میدان جنگ میں اتنے ہی زیادہ چست و چالاک ہوتے ہیں۔" سپاہی نے خوشی خوشی کپڑا درزی کو دیا اور کہا۔

"مہربانی کر کے اس کپڑے کی پانچ قمیص نہایت خوبصورت اور تنگ و چست تیار کر دینا۔ میں ایک ہفتے کے بعد آ کر لے جاؤں گا۔"

یہ کہہ کر سپاہی چلا گیا۔

سپاہی بڑا خوش تھا کہ ایک کپڑے کی پانچ قمیص بن جائیں گی۔ وہ خود کو شاباشی دینے لگا۔ ایک ہفتے کے بعد وہ درزی کے پاس پہنچا اور قمیص مانگیں۔

درزی نے اس کے سامنے پانچ چھوٹی چھوٹی قمیص رکھ دیں اور کہا

"لیجیے آپ کے کپڑے کی پانچ قمیص میں نے تیار کر دیں!"

سپاہی حیرت میں پڑ گیا اور غصے سے بولا۔

"یہ کس کی ہیں؟"

"آپ ہی کی ہیں اور کس کی ہیں!" درزی نے کہا

سپاہی حیرت سے قمیص دیکھنے لگا۔

"اچھا پانچوں قمیص لیجیے اور دس روپے سلائی کے دیجیے!" درزی نے سپاہی سے کہا

سپاہی نے چپ چاپ دس روپے دے کر قمیصیں اٹھائیں اور سوچنے لگا کہ سچ ہے۔ میرے تھوڑے سے کپڑے میں پانچ قمیص سوائے اس ناپ کے کیوں کر بن سکتی تھیں۔ آج میں نے اپنی کنجوسی اور لالچ سے بہت نقصان اٹھایا ہے۔

اس کے بعد اس نے لالچ اور کنجوسی چھوڑ دی۔

سید اختر حسن عابدی
کیمپ امراوتی

جھوٹ مجھے دے دو

سوناپور ـــــ ننھی منی پہاڑیوں سے گھرا ہوا ایک خوبصورت گاؤں تھا اور اس وقت کی ریاست کا وہی صدر مقام تھا۔ سوناپور کے باسی بہت مالدار تھے۔ ہر طرف خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ اس ننھی سی حکومت کے بادشاہ سلامت بہت سیدھے سادے اور نیک دل تھے لیکن اس خوبصورت بستی میں، جہاں معصوم دیہاتی رہا کرتے تھے، ایک چور بھی رہتا تھا۔ احمد خاں ـــــ جس کا نام سن کر اور اس کی خونی آنکھوں کے تصور سے ہی ہر شخص کانپ اٹھتا تھا۔ بادشاہ سلامت اسے رنگے ہاتھوں خود پکڑنے کی فکر میں تھے۔

ایک دفعہ ایک دور کی بستی سے ایک بزرگ تشریف

تے۔ مالدار تو مالدار غریبوں نے بھی ان کی خوب خاطر تواضع
حسب منشا و حسب حیثیت نذرانے بھی پیش کیے۔ بزرگ
نہ ہر جگہ بھائی چارگی، امن پسندی اور نیکی کو پھیلانے کی
رغیب دی۔ یہ خبر اڑتے اڑتے احمد خاں ڈاکو کے کانوں
ت پہنچی۔ پہلے تو اس نے سوچا کیوں نہ بزرگ کا مال
لوٹ لیا جائے لیکن ان کے جلال اور بزرگی کے قصے جب
ن لیے تو ان بزرگ کو اپنے یہاں بلانے کی سوچی۔
بزرگ کے پاس گیا اور قدم بوسی کے بعد اپنا مدعا بیان کیا۔
ن کے پاس چند لوگ احمد خاں کے ستائے بیٹھے تھے
ہنے لگے: "حضرت آپ اس بدمعاش کے ساتھ مت جائیے، یہ
رہے۔"

بزرگ نے شفقت کے ساتھ فرمایا۔ "ہے تو تمھارا
ھائی ہی — مجھے تم بھی پیارے ہو، یہ بھی پیارا ہے۔"
اپنے کئی مریدوں کے ساتھ احمد خاں کے گھر پہنچے
، تو اس نے سب کی خوب دعوت کی۔ طرح طرح کے کھانے کھلوائے
ر جب بزرگ واپس ہونے لگے تو اس نے ایک بڑی رقم کی
لی نذرانے میں پیش کی لیکن بزرگ نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔
"آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟" احمد خاں نے بزرگ سے سوال کیا۔
"میری مانگ پوری کرو گے؟" بزرگ نے فرمایا۔
"جی ہاں۔"
"وعدہ کرتے ہو؟" بزرگ کی آواز شہد سے میٹھی تھی۔
"جی ہاں۔" احمد نے جواب دیا۔
"تو سنو،" بزرگ کہنے لگے۔ "تمھارے پاس تین چیزیں
ہیں۔ پہلی یہ کہ تم جھوٹ بولتے ہو۔ دوسری یہ کہ تم لوگوں کو
دھوکا دیتے ہو اور تیسرے یہ کہ تم چوری کرتے ہو۔"
"بالکل بجا فرمایا آپ نے۔" احمد خاں نے گردن
جھکاتے ہوئے جواب دیا۔
"تو وعدہ کرو کہ تم ان میں سے ایک چیز مجھے دے
دو گے —"

"دے دیا سرکار۔" احمد خاں نے بزرگ سے اقرار کیا۔
"تم کبھی جھوٹ نہ بولو گے!" بزرگ نے کہا۔
"نہیں" — احمد خاں کے منہ سے نکلا۔ بزرگ
خوشی خوشی اپنے شہر چلے گئے۔
ایک رات کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ احمد خاں کا
ارادہ آج بادشاہ کے محل میں چوری کرنے کا تھا۔ وہ اسی
ارادے سے نکلا۔ راستے میں اسے ایک آدمی ملا۔ "کہاں
جا رہے ہو؟ کون ہو تم؟"
"میں چور احمد خاں ہوں۔ بادشاہ کے محل میں ڈاکا
ڈالنے جا رہا ہوں —"
چونکہ احمد خاں نے بزرگ سے جھوٹ نہ بولنے کا وعدہ
کیا تھا اس کی زبان سے سچی بات نکلی — آدمی کے بھیس میں
خود بادشاہ سلامت ہی تھے جو بھیس بدل کر رعایا کے حالات
معلوم کرنے گشت پر نکلے تھے — تھوڑی دور جانے
کے بعد احمد خاں کو ایک اور آدمی ملا۔ "کون ہو تم؟ کہاں جا رہے
ہو؟" اس نے گرجتے ہوئے پوچھا۔
"میں احمد خاں ہوں۔ اس علاقے کا سب سے بڑا ایچ…

[illegible] احمد خاں سے [illegible] نہیں جانتے۔" احمد خاں نے ایک زہریلی مسکراہٹ [illegible] کہا۔

"بہت خوشی کی بات ہے۔ میں بھی تو چور ہوں اور بادشاہ کے محل کو چوری کی غرض سے جا رہا ہوں" اس شخص نے کہا۔ تب دونوں خوب ہنسے اور مل کر محل کو روانہ ہوئے۔ محل میں پہنچ کر وہ بادشاہ کی خوابگاہ میں پہنچے۔ بادشاہ کی سنہری کے پائے میں تین ہیرے لگے تھے انھوں نے جلدی جلدی اپنا کام کیا۔ کہیں بادشاہ یا کوئی اور آنہ جائے، اس ڈر سے وہ صرف دو ہی ہیرے نکال سکے اور ایک ایک ہیرے کی تقسیم کے بعد وہ اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ بادشاہ سلامت جب گشت سے واپس خواب گاہ میں آئے تو دیکھا کہ احمد خاں نے چوری کی ہے اور جلدی میں صرف دو ہیرے نکال لے گیا ہے — انھوں نے وزیر کو جگایا جو پاس ہی دوسرے کمرے میں سویا ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت نے کہا: "ہماری خوابگاہ میں چوری کی گئی ہے۔ جاؤ تلاشی لو کہ کیا مال چوری ہوا ہے۔"

وزیر دوڑا دوڑا خواب گاہ میں گیا۔ دیکھا کہ صرف دو ہیرے چوری گئے ہیں تو اس کی نیت بدل گئی۔ اس نے بچا ہوا ایک ہیرا نکال کر خود رکھ لیا اور بادشاہ کو تین ہیروں کی چوری کی اطلاع دی۔ بادشاہ سلامت نے صبح ہی صبح سپاہی بھیجے کہ احمد خاں کو گرفتار کیا جائے۔ سپاہی احمد خاں اور اس کے ساتھی کو پکڑ لائے۔ بادشاہ نے پوچھا: "احمد خاں تم نے محل میں چوری کی؟"

"جی ہاں حضور" احمد خاں نے صاف کہہ دیا۔

"کیا کیا چرایا؟" بادشاہ نے پھر پوچھا

"آپ کی سنہری پر لگے ہوئے دو ہیرے"

"کہاں ہیں وہ ہیرے؟" بادشاہ کے پوچھنے پر احمد خاں اور اس کے ساتھی نے ہیرے بادشاہ کو دے دیے۔

بادشاہ نے کہا "لیکن ہمارے وزیر اعظم کی رپورٹ کے مطابق تین ہیرے غائب ہیں؟ ایک ہیرا کہاں گیا؟ — لیکن احمد خاں اور اس کے ساتھی نے کہا حضور ہم جلدی میں صرف دو ہیرے ہی نکال سکے۔ بادشاہ نے وزیر اعظم کی تلاشی کا حکم دیا۔ ایک ہیرا وزیر کی شیروانی سے برآمد ہوا۔ بادشاہ سلامت احمد خاں کی سچائی سے بہت خوش ہوئے اور وزیر کے جھوٹ بولنے پر ناراض ہو کر اسے جیل بھیج دیا اور احمد خاں کو وزیر اعظم مقرر کیا اور اس کے ساتھی کو بھی ایک اعلیٰ عہدہ دیا۔ احمد خاں نے سارا مال (جو لوٹ کا تھا) لوگوں میں تقسیم کیا اور سیدھا بزرگ کے شہر گیا۔ اس نے بزرگ سے کہا حضرت آپ نے صرف ایک جھوٹ چھوڑنے کو کہا تھا تو میں وزیر اعظم بن گیا — دھوکا، چوری وغیرہ بھی میں آج سے چھوڑ رہا ہوں مستقبل میں نہ جانے کیا بنوں گا۔"

محمد فاروق علی اعظم گڑھی

مرتبہ: ام۔ وائی کھتری

اسکولوں کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیاں

آر سی ٹیچرس ٹریننگ کالج میں پارلیمنٹ کا قیام

۱۸ر جولائی ۱۹۶۸ء کو زیر سرپرستی پرنسپل جناب عبدالقیوم صاحب، جناب رشید احمد اور جناب مشتاق احمد کی نگرانی و ہدایت میں کالج پارلیمنٹ کا انتخاب عمل میں آیا۔

تمام طلبا نے سنجیدگی کے ساتھ انتخاب میں حصہ لیتے ہوئے مندرجہ ذیل نمایندوں کا انتخاب کیا۔

وزیر اعظم :۔ عبدالحمید قاتل۔ وزیر ثقافت و دارالمطالعہ محمد ناظم انصاری۔ وزیر صحت و صفائی و طعام : اختر اللہ۔ وزیر جماعت :۔ محمد اشرف خاں۔ وزیر خارجہ، نشر و اشاعت محمد سعید۔ وزیر باغبانی عبدالعزیز۔ وزیر کھیل، سائنس لیباریٹری :۔ قادر بادشاہ۔

مرسلہ محمد یوسف

اسلام پورہ اردو پرائمری اسکول (بمبئی) میں بچوں کی پارلیمنٹ

۲۳ر جولائی ۱۹۶۸ء کو اسلام پورہ اردو پرائمری اسکول بمبئی میں پارلیمنٹ کے ممبران کا انتخاب ہوا۔ مندرجہ ذیل عہدیداران پر مشتمل کابینہ بنائی گئی۔

صدر :۔ میمونہ بنت شیخ آدم۔ نائب صدر :۔ عبدالرشید محمد شریف۔ وزیر اعظم :۔ زینت بنت غلام محمد بیگ۔ وزیر تعلیم :۔ اکرام عثمان خاں۔ وزیر مالیات :۔ ثریا ابراہیم خاں۔ وزیر تہذیب و تمدن :۔ عبدالصمد وزیر خاں۔ وزیر قانون :۔ شمشاد قمرالدین۔ وزیر صحت و صفائی :۔ سعید شیخ یعقوب۔ وزیر زراعت و خوراک :۔ پروین عبدالغنی۔ وزیر تجارت قمرالنسا عبدالشکور۔ وزیر دفاع (نظم و ضبط) :۔ ولی محمد شیخ علی۔ وزیر سیر و تفریح و نشر و اشاعت :۔ بشیر احمد عبداللہ قاسم

سال رواں کے لیے کلاس کے سرپنچ مندرجہ ذیل منتخب ہوئے۔

ہفتم :۔ زاہدہ بیگم عبدالغنی۔ ششم :۔ محمد اسلم محمد عباس۔ پنجم :۔ رفیق موسیٰ مجاور۔

نیز انتظام مدرسہ میں سہولت کی خاطر ہر کلاس کو ہاؤس میں تقسیم کیا گیا۔

(۱) نہرو ہاؤس کے لیے کمال الدین موسیٰ مجاور کو
(۲) آزاد ہاؤس کے لیے ہدایت اللہ گلاب کو اور
(۳) گاندھی ہاؤس کے لیے سید محمود ولی عنایت علی خاں کو لیڈر یا سربراہ بنایا گیا۔

مرسلہ محمد یوسف

کھاڑی مسجد [illegible] اردو اسکول میں جشن آزادی

کھاڑی مسجد پرنسپل اردو اسکول میں آزادی کی بیسویں سالگرہ بڑے جوش و خروش سے منائی گئی۔ جلسہ کی صدارت مس [illegible] نے فرمائی۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر مصطفٰی انصاری صاحب نے رسم پرچم کشائی انجام دی۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا "آزادی کے مستقبل کو قائم رکھنا آج کے طالب علموں کا کام ہے۔ مستقبل میں ان ہی بچوں کے کندھوں پر ملک کا بوجھ ہوگا۔ اس بوجھ کو اٹھانے کے لیے انھیں آج ہی سے تیار ہو جانا چاہیے۔"

معاون مدرس عبداللطیف صاحب نے اپنی تقریر کے دوران آزادی کی مختصر تاریخ بیان کی اور کہا کہ "بچو! ملک کو آگے بڑھانا، ترقی دینا آپ کا کام ہے۔ ملک اسی وقت ترقی کرے گا جب آپ ذوق و شوق سے تعلیم حاصل کریں گے اور ملک کا ساتھ دیں گے۔"

اول تا پنجم بچوں نے آزادی پر نظمیں پڑھیں۔ لڑکیوں نے گربا ڈانس پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔

آخر میں اسماعیل انصاری صاحب نے مہمانوں اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس کے بعد چند بچوں نے قومی ترانہ گایا اور قومی ترانے کے بعد جلسہ برخاست ہوا۔

مرسلہ محمد اقبال

اگت پوری میں سیرت پاک کا انعامی جلسہ

اردو اسکول کمیٹی اگت پوری کی جانب سے حسب روایت گزشتہ دنوں مسجد جلالیہ میں سیرت النبیؐ پر انعامی تقریری مقابلہ بطور مہمانان خصوصی کی حیثیت سے مالیگاؤں سے ڈاکٹر پیر محمد رحمانی صاحب، مولانا عبدالحمید مظہری صاحب اور حاجی صاحب تشریف لائے تھے۔ صدارت کے فرائض ڈاکٹر رحمانی اور جج کے فرائض مولانا مظہری صاحب نے انجام دیے۔ جلسے کی ابتدا حافظ دین محمد صاحب نے تلاوت قرآن سے کی۔

کمیٹی کے صدر حاجی محمد اسماعیل میمن صاحب نے مہمانان خصوصی کا استقبال کیا۔ سیکریٹری سید ہاشم عارف صاحب نے اسکول کمیٹی کی رپورٹ پیش کی۔ مدرس قاضی [illegible] صاحب کو اسکول کمیٹی کی جانب سے اکیاون روپئے کے نقد انعام دیے گئے۔ بچوں کی سیرت پاک پر تقریریں ہوئیں۔ بعد میں مولانا مظہری صاحب نے تقریروں پر تبصرہ فرمایا اور ایک اچھی سی تقریر کی۔ صدر جلسہ ڈاکٹر رحمانی صاحب نے بھی سیرت پاکؐ پر تقریر کی اس کے بعد صدر صاحب نے ان طلبا کو انعام دیا جن کی تقریریں اچھی تھیں — ہر جماعت میں اول اور دوم آنے والے طلبا، اور طالبات کو اسکول کمیٹی کی طرف سے انعامات دیے گئے۔

جناب عبدالرزاق میمن، جناب غلام غوث مچھلی فروش، جناب عبدالقادر گھڑی ساز، جناب عبدالرزاق اور جناب محمد یوسف رحمت اللہ کی جانب سے بعض بچوں کو خصوصی انعامات دیے گئے۔

آخر میں اسکول کمیٹی کے صدر صاحب نے مہمان خصوصی اور حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔

مرسلہ محمد یوسف

آر سی۔ ماہم ٹیچرس ٹریننگ کالج میں یوم تلک

مورخہ ۱۳؍ جولائی ۱۹۶۶ء سہ پہر چار بجے آر سی ماہم ٹیچرس ٹریننگ کالج میں محب وطن لوکمانیہ تلک کی برسی کے موقع پر ایک جلسہ منعقد کیا گیا۔ صدارت کے فرائض کالج کے ہونہار طالب علم محمد اسماعیل نے انجام دیے مہمان خصوصی کی حیثیت سے بیٹ آفیسر شمیم صاحب اور آر سی اسکول کے صدر مدرس صاحب نے شرکت کی۔

جلسہ طالب علم منور علی کی انقلابی نظم سے شروع ہوا۔

محمد سعید، ضیاء الدین، جمشید اسماعیل، عبدالحمید قوال اور قادر پاشا نے بہترین تقریریں کرتے ہوئے لوکمانیہ تلک کے حالات زندگی اور حب الوطنی پر روشنی ڈالی۔ بیٹ آفیسر شمیم صاحب نے جلسہ کو بہت سراہا اور اپنی تقریر میں تلک کی زندگی کے نشیب و فراز سے آگاہ کرتے ہوئے عملی زندگی کے پہلوؤں کو اجاگر کیا۔

وزیر ثقافت نے صدر، مہمانان اور اسکول کے اسٹاف کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسہ کا اختتام کیا۔

مرسلہ محمد سعید وزیر نشر و اشاعت

تہذیب الاخلاق ہائی اسکول کا جلسۂ عام

مالیگاؤں۔ تہذیب الاخلاق ہائی اسکول کا تقسیم انعامات کا ایک جلسۂ عام سیٹھ عبدالملک صاحب کی صدارت میں ہوا۔

ڈاکٹر پیر محمد ملا نے تقریر کی اور بتلایا کہ تعلیمی محاذ پر ڈٹ کے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ لوگوں کا فرض ہے کہ وہ تعلیمی معاملات میں دلچسپی لیں۔

ڈاکٹر انصاری بلدیہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہمیں سماج کی ترقی کے لیے جدوجہد کرنی چاہیے۔ اگر ہمارا سماج ترقی پذیر نہیں ہوا تو آئندہ نسلیں برباد ہو جائیں گی۔ صدر جلسہ نے کہا کہ اسکول نے کم مدت میں ترقی کی ہے۔ ہمارے حالات تنگ ضرور ہیں لیکن ہمیں اللہ کے بھروسے کام کرنا چاہیے۔ اور یقین رکھنا چاہیے کہ ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔

رحمانیہ ہائی اسکول میں جلسہ

مورخہ ۱۳؍ اگست حسب دستور سابق رحمانیہ ہائی اسکول میں زیر صدارت عزت مآب جناب محمد محمود خاں صاحب صدر مدرس مدرسہ ہذا انتخابی جلسہ منعقد کیا گیا۔ اس جلسہ میں طلباء و طالبات کی اتفاق رائے سے مندرجہ ذیل عہدیداران منتخب کیے گئے۔

۱۔ محمد اقبال ایلچپوری جنرل کیپٹن نہم۔ ۲۔ محمد اشفاق وائس کیپٹن دہم۔ ۳۔ سکندر حمید ہاکی کیپٹن نہم۔ ۴۔ ایم اے حمید وائس ہاکی کیپٹن نہم۔ ۵۔ یونس بیگ والی بال کیپٹن نہم۔ ۶۔ سید مصطفیٰ علی وائس والی بال کیپٹن۔ ۷۔ عبدالستار فٹ بال کیپٹن ہشتم۔ ۸۔ محمد اقبال وائس فٹبال کیپٹن نہم ۹۔ کاظم حسین ہینڈ ڈ کیپٹن نہم۔ ۱۰۔ محمد شکیل احمد وائس ہینڈ کیپٹن دہم ۱۱۔ سید شوکت علی صدر بزم ادب اردو۔ ۱۲۔ محمد عبدالحی نائب صدر بزم اردو ۱۳۔ محمد اقبال سیکریٹری بزم ادب اردو۔ ۱۴۔ سید اختر نائب سیکریٹری بزم ادب ۱۵۔ سید شوکت علی ایڈیٹر ۱۶۔ صالح الرحمٰن قلمی ۱۷۔ سید محبوب علی نائب ایڈیٹر ۱۸۔ یونس بیگ پکنک مانیٹر۔ ۱۹۔ محمد اشفاق نائب پکنک مانیٹر

اِدھر اُدھر سے

سی بچے ہم سے کس قدر آگے ہیں

شری رن بیر جی ایڈیٹر ملاپ اپنے ایک ایڈیٹوریل میں لکھتے ہیں: چند برس پہلے میں روس گیا — آٹھویں جماعت کے ایک بچے کا تکنیکی گیان (ٹکنالوجی کا علم) دیکھ کر حیران رہ گیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ راکٹ کو جب زمین سے چھوڑا جاتا ہے تو وہ کبھی زمین کے گرد کیسے گھومنے لگتا ہے، کبھی چاند تک کیسے پہنچتا ہے، کبھی چاند کے گرد چکر کیسے لگاتا ہے اور کبھی چاند سے بھی آگے نکل کر کروڑوں میل کی دوری پر کیسے پہنچتا ہے۔

سوچا کسی بہت بڑے سائنس داں سے یہ بات پوچھوں گا لیکن اس سے پہلے کہ کسی سائنس داں سے O ایک چودہ یا پندرہ برس کے بچے نے یہ سب باتیں اس طرح بتا دیں جیسے وہ اپنے ضلع کا جغرافیہ سنا رہا ہو۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ وگیان اور ٹکنیک (سائنس اور ٹکنالوجی) کی تعلیم کے معاملے میں دوسرے دیش ہم سے کتنا آگے بڑھ چکے ہیں۔

(ملاپ [illegible])

ایک موٹر نے جہاز کو بچالیا

لیجیے ایک دل چسپ خبر سنیے:-

روس کے ایک ہوائی اڈّے پر ایک ٹوٹے ہوئے پہیے والے ہوائی جہاز کو پٹرول کی گاڑی کا سہارا دے کر صحیح سلامت اتار لیا گیا۔

ہوائی اڈّے پر اترنے والے جہاز نے جب کنٹرول روم کو بتایا کہ اس کا ایک طرف کا پہیہ کام نہیں کر رہا ہے تو ہوائی اڈّے والوں کو بڑی فکر ہو گئی۔ یہ جہاز اترتے وقت ایک طرف کو الٹ سکتا تھا اور اس کے بعد اس میں آگ بھی لگ سکتی تھی — اچانک اس جہاز کو بچانے کی ایک تدبیر سوجھ گئی: ٹوٹے والے پہیے کی طرف والے پنکھ کو نیچے سے پٹرول گاڑی کا سہارا دے کر جہاز کو بچانے کی کوشش کی جائے۔

کافی دیر تک چکر کاٹنے کے بعد جیسے ہی جہاز نے زمین کو چھوا، پٹرول موٹر کا ڈرائیور کافی ہوشیاری سے موٹر کو چلا کر جہاز کے پنکھ کے نیچے آ گیا۔ اب جہاز کا ایک طرف کا وزن اس موٹر کے اوپر آ گیا [illegible]

سے جہاز کی رفتار کے ساتھ موٹر چلا کر اور اس کے ساتھ ہی موٹر کو روک کر جہاز کو ایک طرف دھکے سے بچایا

دنیا کا سب سے بڑا جہاز

امریکہ کے شہر جارجیا میں اس وقت دنیا کا سب سے بڑا ہوائی جہاز بنایا جا رہا ہے۔ ۲۳۶ فٹ لمبا یہ جہاز اب تیاری کی آخری منزلیں طے کر رہا ہے۔ اس جہاز کے دونوں پنکھوں کی چوڑائی ۲۲۳ فٹ اور تیار ہو جانے پر اس کا وزن ۳۶۴ ٹن ہوگا۔ یہ جہاز جو اگلے سال جون میں پہلی بار اڑان کرے گا، امریکہ کے فوجی استعمال کے لیے بنایا جا رہا ہے۔

پانی کے اندر شادی

پچھلے دنوں لاس اینجلس کے ایک غوطہ خور نے عجیب و غریب ڈھنگ سے اپنی شادی رچائی۔

غوطہ خور دولہا میاں کے نکاح کی رسم پانی کے اندر ادا ہوئی۔ باراتی اور قاضی تالاب کے کنارے بیٹھے ہوتے تھے۔ دولہا اور دلہن غوطہ خوروں کے لباس میں تالاب کے اندر پہنچ گئے۔ خاص طرح کے لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے نکاح کی رسم ادا ہوئی۔ امریکہ میں یہ اپنے ڈھنگ کی پہلی شادی تھی۔ اس سے پہلے پیراشوٹ سے لٹکتے ہوئے شادیاں ہو چکی ہیں لیکن پانی کے اندر شادی کی یہ پہلی مثال ہے۔

پانی کے کنویں میں مٹی کا تیل

بہار کے چھپرا قصبے کے ایک کنویں سے مٹی کا تیل نکلنے کی خبر ملتے ہی وہاں لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ جسے دیکھیے بالٹی اور رسّی لیے کنویں سے مٹی کا تیل نکالنے چلا آ رہا ہے۔ یہ بات اکتوبر کے پہلے ہفتے کی ہے۔ ہوتے ہوتے وہاں اتنی بھیڑ جمع ہو گئی کہ پولیس کے لیے اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔

پھر اچانک معلوم ہوا کہ کنویں سے تیل نکلنا بند ہو گیا۔ اب تو جو لوگ تیل نہیں نکال پاتے تھے انھیں بڑی مایوسی ہوئی۔ سرکاری افسروں کو بھی اس بات پر حیرانی ہے کہ کنویں سے اچانک تیل کیسے نکل پڑا۔

اس بارے میں دو طرح کے خیال ظاہر کیے جا رہے ہیں۔ کچھ لوگوں کا تو یہ کہنا ہے کہ زمین دوز تیل کے چشمے کی کسی دھار کے مل جانے سے کنویں میں تیل آ گیا ہوگا مگر زیادہ تر لوگوں کا خیال ہے کہ تیل کے کسی بیوپاری نے ذخیرہ اندوزی کے جرم سے بچنے کے لیے تیل کے پیپے کنویں میں چپکے سے انڈیل دیے ہوں گے۔ بہر حال تحقیق جاری ہے۔

پلاسٹک کی موٹر

مغربی جرمنی کے ایک شہر ڈوسلڈورف میں ان

لوں پلاسٹک کے سامان کی ایک نمائش لگی ہوئی ہے جس میں پلاسٹک کی بنی ہوئی ایک موٹر خاص طور سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس موٹر میں انجن اور پہیے صرف لوہے کے ہیں اور باقی تمام چیزیں پلاسٹک کی ہیں جس کی وجہ سے موٹر کا وزن کافی ہلکا ہو گیا ہے

مغربی جرمنی کی ایک کمپنی نے رنگین پلاسٹک کا ایک ایسا گھول (محلول) تیار کیا ہے جو کوڑے کرکٹ پر ڈال دیا جائے تو ان پر فوراً گھاس پھوس اگ آتے ہیں۔

اس نمائش میں پلاسٹک کے بنے ہوئے عمارتی سامان بھی رکھے گئے ہیں۔ لوہے اور دوسری دھاتوں کی بنی ہوئی روزمرہ کے استعمال کی بہت سی چیزیں اب پلاسٹک کی بنائی جا رہی ہیں۔ دھات کے مقابلے میں یہ چیزیں سوگنا ہلکی ہیں۔ پلاسٹک کا پورا کا پورا مکان تو ابھی تیار نہیں ہوا ہے مگر اس نمائش کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اب جلد ہی پورے پورے مکان بھی پلاسٹک کے بننے لگیں گے۔

رابن سن کروسو کی داستان حقیقت کے روپ میں

رابن سن کروسو کی داستان آپ نے پڑھی ہوگی اس میں ڈینیل ڈیفو نے ایک ایسے آدمی کی داستان پیش کی ہے جس کا جہاز کسی بڑے جہاز سے ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتا ہے اور وہ کسی طرح ایک تختے پر بیٹھ کر ایک غیر آباد جزیرے پر قدم رکھتا ہے اور وہاں تنہا زندگی گزارتا ہے۔ خیر یہ تو داستان کی بات تھی اب نائس (NICE) کی ایک خاتون نے اس داستان کو حقیقت کا روپ دینے کی ٹھانی ہے۔

انھوں نے اعلان کیا ہے کہ وہ تہیٹی سے ۶۰ میل دور بحر الکاہل کے غیر آباد جزیرے ہیتا میں جاکر رابن سن کروسو کی طرح کی زندگی گزاریں گی اور ساری دنیا سے کسی بھی طرح کا کوئی واسطہ نہ رکھیں گی۔

ہیتا میں جنگلی سنترے بہت افراط سے ہوتے ہیں۔

نیچے کے سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو جاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ــــــ ہے۔

منیجر

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے برقی آرٹ پریس دریا گنج دہلی میں آفسٹ پر چھپوا کر جامعہ نگر سے شائع کیا۔

ایک میرے لیے بھی گرا دو: فوٹو فضل الرحمٰن

D. 1457.　　　　November, 1967.

Payam -i- Taleem

New Delhi-25.